بیادِ بانیٔ الفرقان

حضرت مولانا

محمد منظور نعمانی

علیہ الرحمہ

۱۳۲۳ھ — ۱۴۱۷ ✧ ۱۹۰۵ء — ۱۹۹۷

کمپیوٹر کمپوزنگ ——— پرنٹ لائن کمپیوٹرس۔ لکھنؤ فون 85305

کور ڈیزائننگ ——— ایڈورٹائزر انڈیا ——— لکھنؤ فون 16284

طباعت ——— کاکوری آفسیٹ پریس۔ لکھنؤ فون: 70143

اس خاص نمبر کی قیمت اور سالانہ زر تعاون

برائے ممالک	قیمت عام ایڈیشن	قیمت اعلیٰ ایڈیشن	اس نمبر سے سالانہ چندہ
ہندوستان	115/-	135/- مع محصول ڈاک	150/-
پاکستان	150/-	200/- مع محصول ڈاک	200/-
بیرونی ممالک	6 پاؤنڈ یا 9 ڈالر	6½ پاؤنڈ یا 10 ڈالر	15 پونڈ یا 23 ڈالر

ایڈیٹر ——— خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی

باہتمام ——— محمد حسان نعمانی

محمد حسان نعمانی پرنٹر پبلشر نے کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱/۱۱۴ نظیر آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ لیکون للعٰلمین نذیرا

۶۶

اشاعت کا چھیاسٹھواں سال

۱۳۵۳ھ

۱۹۳۴ء

آغازِ اشاعت

اوّل و آخر فنا ظاہر و باطن فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

(اقبالؔ)

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۱۵۰/-

قیمت عام ایڈیشن ۱۱۵/-

عکس تحریر

مکرمی محترمی! دامت فیوضکم و برکاتکم

جامعہ عربیہ ہتورا (ضلع باندا)

Madarsa Islamia
Hathaura
Dt. Banda
U.P.

فہرستِ مضامین

گلہائے تازہ

(خاص نمبر کے لئے لکھے گئے مضامین) ۵

فکر نعمانی کی جھلکیاں
آئینہ الفرقان میں

مرتبہ - عتیق الرحمن سنبھلی ۹

اپنے خطوط کے آئینہ میں

کارزار حیات میں

ناشر کی چند ضروری گذارشات

قارئین الفرقان کی خدمت میں

الحمد لله الذی بعزته وجلاله تتم الصّٰلحٰت

الفرقان کی یہ خاص اشاعت بیادِ بانیٔ الفرقان حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ انشاءاللہ یہ خود بتائے گی کہ بانیٔ الفرقان علیہ الرحمہ اپنے تابندہ نقوش کو موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے کی جو ذمہ داری ہم پر چھوڑ گئے تھے۔ ہم نے اس کی ادائیگی ممکنہ کوشش ضرور کی ہے۔ خاص طور پر برادر مکرم مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی زید مجدہم نے جس طرح طبیعت کی ناسازی اور شدید گرمی (لندن میں قیام کیوجہ سے جس کے وہ اب عادی نہیں رہے ہیں) کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے دن ورات محنت کی ہے وہ ہم جیسوں کے لئے واقعی قابل تقلید ہے۔ اور یقیناً اُنھیں کام کی لگن ورثہ میں ملی ہے اور بلاشبہ وہ بانیٔ الفرقان کے سچے وارث ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں کامل صحت کے ساتھ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔

ہم اپنی اس کوشش میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ اُمید ہے آپ اپنی رائے سے نوازیں گے۔

یہ خاص اشاعت پونے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم نے الفرقان کے آخری شائع ہونے والے شمارہ (مارچ ۱۹۹۸ء) میں ۵۰۰ صفحات کا اعلان کیا تھا۔ پھر پوسٹر شائع کیا تو ۶۰۰ صفحات کا اندازہ تھا لیکن کئی مضامین روکنے اور متعدد مضامین مختصر کرنے کے باوجود اب یہ پونے سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اب یہ چار ماہ کے بجائے پانچ ماہ کا مشترک شمارہ ہے۔ لہذا نوٹ فرمالیں کہ۔

☆ **یہ خاص اشاعت اپریل تا اگست ۱۹۹۸ء کا مشترک شمارہ ہے۔**

☆ **اگلا شمارہ بابت ماہ ستمبر ۱۹۹۸ء انشاءاللہ اگست کے آخری ہفتہ میں شائع ہوگا۔**

کسی اسبابی تدبیر کے بغیر یعنی سرمائے کا کوئی خصوصی انتظام کئے بغیر ہم نے اس ضخیم نمبر کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا۔ اور جب اس کے صفحات میں اضافہ ناگزیر معلوم ہوا تو بھی ہم نے صرف رب کریم کے بھروسہ سرمائے کی کمی کو آڑے نہ آنے دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ادارے پر قرض

کا بہت بڑا بوجھ آن پڑا ہے۔ امید ہے کہ وہی مسبب الاسباب ہم کو اس سے سبکدوش کرے گا۔

اسوقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہے اس ضخیم نمبر کو قارئین تک بحفاظت پہونچانے کا۔ اس سلسلے میں ہم نے پہلے الفرقان کے ذریعے اور پھر خطوط لکھ کر الفرقان کے قارئین کرام سے استدعا کی تھی کہ اس نمبر کو محفوظ طریقے پر منگانے کے لئے رجسٹری فیس ارسال کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ اندرون ملک کے صرف بیس پچیس فیصد خریداران الفرقان نے اس پر توجہ دی اور بیرونی ممالک کے ایسے خریداروں کی تعداد جنھوں نے رجسٹری فیس بھیجی ہو پانچ فیصد سے کسی طرح زائد نہیں ہے۔

یقین جانئے کہ ادارہ اس وقت اس پر بالکل قادر نہیں ہے کہ ایسے تمام خر... اپنے خرچ پر یہ نمبر رجسٹرڈ بھیجے۔ اور سادہ ڈاک سے بھیجنے پر ضائع ہونے جس کی تلافی تو ممکن ہی نہیں۔ لہذا ہمیں یہ طے کرنا پڑا ہے کہ :-

برائے ہندوستان

(۱) جن خریداران نے رجسٹری فیس ارسال کردی ہے ان کی خدمت میں یا... نمبر رجسٹرڈ روانہ کیا جارہا ہے۔

(۲) جن حضرات نے رجسٹری فیس نہیں بھیجی ہے لیکن ان کا زر تعاون جمع ہے ان کو یہ نمبر محصول ڈاک مع پیکنگ خرچ -/20 روپے کی وی پی سے روانہ کیا جائے گا۔

(۳) جن خریداران کی مدت خریداری مارچ ۹۸ء تا اگست ۹۸ء کے کسی شمارہ پر ختم ہوتی ہے ان کی خدمت میں یہ خاص اشاعت سالانہ چندہ کی وی پی سے روانہ کی جائے گی۔ اس طرح یہ خاص نمبر انھیں بحفاظت پہونچ جائے گا، اور ان کا سال آئندہ کا چندہ بھی جمع ہو جائیگا۔

برائے پاکستان

(۱) جن پاکستانی خریداران نے رجسٹری فیس ارسال نہیں فرمائی ہے لیکن اُن کا زر تعاون جمع ہے ان کو یہ نمبر رجسٹرڈ بھیجا جارہا ہے، ایسے تمام حضرات نمبر ملتے ہی -/35 روپے ادارہ اصلاح و تبلیغ کو روانہ فرمادیں۔

(۲) جن حضرات کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے ان کا نمبر روک لیا گیا ہے۔ وہ اپنا زر تعاون مع رجسٹری فیس مبلغ دوسو روپے ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ، لاہور بھیج کر رسید ہمیں روانہ فرمائیں۔

دیگر بیرونی ممالک

(۱) بیرونی ممالک کے ان تمام خریداروں کی خدمت میں یہ خاص اشاعت رجسٹرڈ

ارسال کی جا رہی ہے۔ جن کا سالانہ زر تعاون جمع ہے، ایسے حضرات سے گزارش.
رجسٹرڈ محصول کے سلسلہ میں ۲پونڈ یا ۳ڈالر خاص نمبر ملتے ہی ارسال فرمادیں۔
(۲) جن بیرونی خریداران کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے ان کا خاص نمبر روَ
ہے، امید ہے کہ ہماری مجبوری کو سمجھتے ہوئے کچھ خیال نہ فرمائیں گے۔ اور جلد از جلد بقا
رجسٹری فیس ارسال فرمادیں گے، تاکہ یہ خاص اشاعت بھیجی جا سکے۔
برطانیہ و یورپ کے خریداران کیلئے درج ذیل پتہ پر رقم بھیجنے میں یقیناً سہولت؛

Mr. Razıur Rahman, 90-B Hanley Road
London N4 3DW, (U.K)

ایک ضروری گزارش

اگر آپ سے کوئی اس خاص نمبر کے نہ پہونچنے کی شکایت کرتا ہے تو براہ کرم ۱۲
صفحات پڑھوادیں، ممکن ہے انکا نمبر مذکورہ بالا وجوہات میں سے کسی وجہ کی بنا پر رکا ہوا ہو۔
یہ خاص نمبر دو قسموں میں شائع کیا گیا ہے۔ (۱) عام ایڈیشن (۲) اعلیٰ ایڈیشن
تمام خریداران کی خدمت میں عام ایڈیشن ہی بھیجا جا رہا ہے سوائے ان کے کہ ج
نے اعلیٰ ایڈیشن کے لئے اضافی رقم ارسال کی ہے ——— اعلیٰ ایڈیشن عمدہ مضبوط جلد
آراستہ ہے اور بحفاظت رکھنے کے شائقین کے خیال سے تیار کرایا گیا ہے۔
آخر میں ہم تمام مضامین نگار حضرات اور مشتہرین کے تعاون کے لئے ممنون ہیں اور امید کر
ہیں کہ ان کا یہ تعاون صرف خاص نمبر تک ہی محدود نہیں ہوگا بلکہ اس کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا
بڑی ناشکری ہوگی اگر ہم اُن حضرات کا شکریہ ادا نہ کریں جنھوں نے کسی طرح سے بھی
نمبر کی تیاری میں اپنا تعاون دیا۔ بالخصوص وہ حضرات جنھوں نے الفرقان کی وہ فائلیں یا وہ شمارے
کرائے جو ہمارے پاس محفوظ نہیں تھے اور وہ حضرات جنھوں نے بانیٔ الفرقان کے خطوط فراہم
سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کار خیر میں ان کی شرکت کو قبول فرمائے۔ اور
کو اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے ——— آمین
یہ عاجز اور ادارہ الفرقان کے تمام کارکنان آپ کی دعاؤں کے محتاج اور طالب ہیں۔

والسلام ——— ناظم ادارہ الفرقان

نگاہِ اوّلیں

عرض مرتّب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ ربّ العالمین والصلوٰة والسلام علیٰ سیّدنا ونبیّنا ۔
وأصحابهِ واهل بیتهِ اجمعین امّا بعد ۔

یہ عاجز مرتّب گواہی دیتا ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف اللہ وحدہٗ ہے۔ اور اُسی کو زیبا ہے۔ پس اگر کبھی اس خاص اشاعت کے سلسلے سے یہ خیال اور شیطان۔۔۔ ذہن کے کسی گوشے میں گزرا ہو کہ اسکے ذریعے سے ہمارے والد ماجد علیہ الرحمہ کی بزرگی و بڑائی کا نقش لوگوں کے دلوں میں قائم ہوگا، تو ربّ غفور ورحیم سے التجا ہے کہ اپنے کرم سے معاف فرمادے۔ جہاں تک اصلی ارادے اور نیت کا تعلق اور اس کا شعور ہے وہ سوائے اسکے کچھ نہیں رہا کہ ان کی زندگی میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا تذکرہ اور جن کا تحریری شکل میں محفوظ کردیا جانا، لوگوں کیلئے مفید ـــ بلکہ بے حد مفید ـــ ہوگا۔ اور خود ہمارے لئے ایک مستقل نصیحت اور وصیت کا کام دے گا۔ اور اسی لئے اس کی پوری احتیاط کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جو کچھ چھپے اس کا اصلی رخ اسی افادیت کی طرف ہو ـــ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پوری احتیاط کے باوجود یہ نظر آیا کہ یہ بات عملاً ممکن نہیں کہ قابل تقلید اور قابل استفادہ باتوں کے حوالہ سے کسی شخصیت کا تذکرہ ہو اور اسکی بڑائی اور عظمت کا کوئی پہلو اس تذکرے سے پیدا نہ ہو اور اسکے لئے ذہن نے اس آیت قرآنی سے تسلی پائی کہ۔

وللہ العزة ولرسولہ — اور عزت تو اللہ کیلئے ہے اور اسکے رسول کیلئے
وللمؤمنین (المنافقون-۸) — اور ایمان والوں کے لئے۔

کہا نہیں جاسکتا کہ یہ احتیاط جس کا ذکر کیا جارہا ہے کہاں تک کامیاب رہی اور واقعہ میں کہاں تک اس کا حق ادا کیا جاسکا لیکن اگر کچھ کوتاہی رہی تو خاکسار مرتب کی معذرت یہ ہے کہ

اتنے ضخیم نمبر کا سارا ادارتی کام، علاوہ اپنے تقریباً سو صفحے کی تحریری حصے کے، بالکل تن تنہا کرنا پڑا ہے اور قارئین الفرقان ناواقف نہیں ہیں کہ وہ ایک کمزور صحت کا انسان ہے۔ پھر اس پر مستزاد اب عمر کا ستر (۷۰) کے ہندسے کو چھولینا بھی، ساڑھے تین سو صفحات کے بیرونی مضامین اس نمبر میں شامل ہیں۔ کتابت کو دینے سے پہلے ان کا ایک ایک لفظ اپنی ذمہ داری کے ماتحت پڑھنے کی کوشش کی گئی تاکہ کہیں نوٹ لکھنے کی ضرورت ہو تو وہ نوٹ لکھا جائے، کچھ ساقط کرنا ضروری نظر آئے تو اس کو ساقط بھی کیا جائے۔ حشو وزوائد ہوں تو دوسروں کے لئے جگہ نکالنے کی خاطر یہ غیر ضروری حصے حذف کئے جائیں۔

اس سے بھی زیادہ بھاری کام دو اور تھے۔ ایک الفرقان کے شروع سے اس وقت کے تمام فائلوں کا مطالعہ جب تک حضرت بانیٔ الفرقان کی تحریریں اس میں نکلتی رہیں، اور یہ کوئی ساٹھ برس کے فائل تھے۔ اس مطالعے سے اس نمبر کے لئے دو کام لئے جانے تھے۔ ایک آپ کی پوری زندگی کا اشاریہ (یا خلاصہ) مرتب کرنا جو سب سے آخری مضمون "بانوے/چورانوے سالہ زندگی منزل بہ منزل" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔ دوم، آپ کی تحریروں اور تقریروں میں سے ایک ایسا انتخاب جس سے آپ کی فکری شخصیت کو سمجھنے میں لوگوں کو مدد ملے اور اس میں بجائے خود وہ افادیت بھی ہو جس کیلئے آپ ساری زندگی حریص و مضطرب رہے۔

دوسرا تقریباً ایسا ہی بھاری کام آپ کے سیکڑوں خطوط میں سے مختلف نوعیتوں کے خطوط کا ایک انتخاب مرتب کرنا تھا۔ یہ کام اس لحاظ سے پہلے کام سے بھی زیادہ بھاری تھا کہ جہاں بعض خطوط بے حد افادۂ عام کی نوعیت رکھتے ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ ہر خط قابل اشاعت نہیں ہوتا۔ پھر نمبر میں جگہ کی محدودیت کو دیکھتے ہوئے قابل اشاعت خطوط میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا فیصلہ کرنا۔ کسی طرح بھی اندازہ کرانا مشکل ہے کہ یہ کام کس قدر دقت طلب اور محنت طلب ہوا۔ جبکہ اس میں تھوڑی سی مدد برادران عزیز مولوی محمد زکریا صاحب سنبھلی اور مولوی محمد عارف صاحب سنبھلی سے بھی مل گئی تھی۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

جگہ کی محدودیت کا جو اندازہ شروع میں تھا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ باہر کے مضامین کی تعداد اور اس کا دباؤ بڑھا تو اس اندازے کے مطابق کئے گئے انتخاب پر بار بار نظر ثانی کرنا پڑی ورنہ خطوط کی تعداد اس سے کافی زیادہ ہوتی جتنی اس وقت ہے۔ یہی معاملہ حضرت بانیٔ الفرقان کی تحریروں کے انتخاب میں بھی پیش آیا کہ اصلی انتخاب کو کمی در کمی کا شکار ہونا پڑا۔

تاہم خاکسار مرتب کا خیال یہ ہے کہ اس اشاعت خاص کی جان یہی دو انتخابی حصے ہیں

اور انھیں میں اس اشاعت کی اصلی روح اور اصل مقصدیت ہے۔ اور صرف یہی خیال تھا جس کے ماتحت یہ دونوں بھاری کام اپنی کمزور بساط کو اچھی طرح جاننے کے باوجود اٹھا لئے۔ ان دو کاموں کے بغیر اس نمبر کی وہ افادیت اور معنویت اپنے نزدیک نہ تھی جس کے بارے میں یہ گمان ہو سکے کہ اگر حضرت والد مرحوم کسی طرح اس نمبر کو دیکھ سکیں تو انھیں اس رسمیت کی شکایت اپنے بیٹوں سے نہ ہو جس سے وہ ہمیشہ نفور رہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ ان کی روح مبارک کے لئے ایک صدقۂ جاریہ کی صورت بنے۔ اللهم صدق ظنا وتقبله منا انك انت العليم ٥ نمبر کی اشاعت میں جو ایک ماہ کی تاخیر ہوئی اس میں بھی زیادہ تر دخل تھا۔ کہ اپنی کمزور صحت نے اس کام کے دوران میں کئی بار جھٹکا کھایا جس نے مؤخر ہوتی چلی گئی۔ مگر اس حصے کے بغیر نمبر کی اشاعت طبیعت کو کسی طرح ق

باہر سے آنے والے جو مضامین شامل اشاعت ہیں الحمد للہ وہ بالعموم اسی افادی نوعیت کے حامل ہیں جس کو ہم نے اس نمبر کے لئے ضروری سمجھا۔ افسوس کہ یہاں ان مضامین کے تعارف یا کم از کم خصوصیات کی طرف اشاروں کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ بس ہم شکر گذار ہیں کہ ان حضرات نے ہمارے ساتھ تعاون فرمایا اور اپنے مضامین سے نمبر کے افادی پہلوؤں میں اضافہ کیا۔

ناسپاسی ہو گی اگر اس نمبر کے سلسلے میں تعاون کا تذکرہ کرتے ہوئے محترم بھائی قطب الدین ملا صاحب کا ذکر نہ کیا جائے۔ انھوں نے اپنے اس قلبی وروحانی تعلق کی بنا پر جو انھیں حضرت والد مرحوم سے تھا اور ان کے خانوادے سے ہے۔ بیلگام (کرناٹک) سے لکھنؤ کا سفر اسی خدمت کے لئے کیا اور مکمل ایک ماہ ہمارے ساتھ گذار کر گئے جس سے کتابت کی تصحیح میں خاص طور پر بڑی مدد ملی۔ اس ضمن میں مجھے یہ بھی لازم ہے کہ اپنے بڑے بیٹے (اور والدِ مرحوم کے بڑے پوتے) میاں عبید الرحمٰن سلمہ کا دعا سے ذکر کروں کہ انھوں نے بھی کامل ایک ماہ کا وقت اپنی ملازمت (آل انڈیا ریڈیو، مانیٹرنگ سیکشن، دہلی) سے رخصت لیکر لکھنؤ میں میرے ساتھ اسی نمبر کے سلسلے میں مدد دینے کو گذارا۔ اور ان کی مدد میرے لئے بہت ہی راحت اور سہولت کا باعث ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کو ان کی دین و دنیا کے لئے نافع بنائے۔

اپنے نقطۂ نظر سے اس نمبر میں صرف ایک کمی رہ گئی ہے کہ الفرقان کے صفحات میں حضرت بانیٔ الفرقان کے جو چھوٹے بڑے مضامین اول دن سے آخر تک نکلے ان کا ایک اشاریہ (انڈیکس) نہیں آسکا۔ محترم بھائی قطب الدین ملا صاحب نے بہت عرصہ پہلے اپنے ذاتی تقاضے سے یہ انڈیکس تیار کیا تھا اور وہ انھوں نے اس موقع کے لئے ہمیں پہونچا بھی دیا تھا مگر اس پر کچھ کام کی ضرورت تھی جس کے بعد وہ اس نمبر میں شامل کیا جاسکے۔ اس کام کے لئے میرے پاس بالکل وقت نہ نکل سکا اور کوئی دوسرا مجھے میسر نہ تھا جو اس کام کو انجام دے دیتا۔ کوشش کی جائے گی کہ یہ کام کبھی آئندہ ہوسکے۔ ملا صاحب کے تیار کردہ انڈیکس کی رو سے الفرقان کے ان مضامین کے صفحات ۵۹۸۷ ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے انڈیکس کی ضخامت کیا ہو گی۔

نمبر یقیناً اس سے بہتر ہو جاتا اگر ادارتی سطح کے امور کا کوئی مددگار میسر ہوتا۔ تاہم میرے لئے یہ بات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سراپا نیاز ہونے کی ہے کہ تنہائی کے باوجود سوائے ایک انڈیکس کی کمی کے یہ مکمل اسی نقشے پر تیار ہوا ہے جو نقشہ اس کیلئے ذہن میں پہلے دن بنا تھا۔

نمبر کو اس کے مندرجات کی مختلف مناسبتوں کے اعتبار سے چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں

(۱) مسافرِ آخرت منزلِ آخرت کی طرف

(۲) خبر وفات کی صدائے بازگشت

(۳) گلہائے تازہ

(۴) فکرِ نعمانی کی جھلکیاں

(۵) اپنے خطوط کے آئینے میں

(۶) کارزارِ حیات میں!

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کو نافع بنائے، ہمارے لئے بھی اور قارئین کے لئے بھی۔ اور اگر اس میں کوئی شے اُس کے لئے ناپسندیدہ ہو تو اس سے درگذر فرمائے۔

عتیق الرحمٰن سنبھلی

بروز جمعہ

۲۳؍ صفر ۱۴۱۹ھ / ۱۹؍ جون ۱۹۹۸ء

نوٹ - افسوس ہے کہ بعض قابلِ اشاعت مضامین شاملِ اشاعت ہونے سے رہ گئے ہیں۔ انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں وہ دیئے جائیں گے۔

مسافرِ آخرت

منزلِ آخرت کی طرف

یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ٥
فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ٥
(القرآن سورۃ الفجر[۸۹])

(ترجمہ) اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو (ادھر چل کر) میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

LUCKNOW MONDAY, MAY 5 1997 — QAUMI AWAZ

عالم دین مبلغ و مفکر مولانا محمد منظور نعمانی نے داعی اجل کو لبیک کہا

جامع خطیب، احادیث کے ماہر سے برصغیر محروم

لکھنؤ ۴ اپریل۔ نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے ملک پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ ایک ملت دوست اسلامی مفکر مصنف مجدد اور عظیم خطیب اور ماہر حدیث مولانا محمد منظور نعمانی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے مولانا کافی عرصہ سے صاحب فراش تھے لیکن ان کا وجود ہی دینی و اسلامی حلقوں میں تقویت کا باعث تھا۔

وہ نرسنگ ہوم میں بھرتی تھے جہاں ماہر ڈاکٹروں کا علاج ہو رہا تھا لیکن فرشتۂ اجل نے آج شب میں ساڑھے ۸ بجے آکر انہیں اس دار فانی سے سفر کرنے کی خبر دی۔

معروف اسلامی مفکر مولانا محمد منظور نعمانی کی پیدائش ۱۹۰۵ء میں ضلع مرادآباد کے مردم خیز قصبہ سنبھل میں ہوئی تھی ان کی ابتدائی تعلیم سنبھل میں دارالعلوم میں ہوئی تھی اور بعد کو دارالعلوم دیوبند میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے سند عالمیت حاصل کی۔

مولانا گزشتہ ۶ دہائی سے اسلام کے صحیح عقائد اور اس کی روح کو عام کرنے میں کوشاں تھے اس کے لیے وہ باقاعدہ اپنے قلم اور زبان سے سعی کر رہے تھے انہوں نے اسلام کی صحیح تصویر اور اس کی عظمت دنیا کے سامنے رکھی اس مقصد کے تحت انہوں نے [illegible] لکھی جس میں اسلام کیا ہے؟ بہت مقبول ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو کر لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی۔ مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی ۸ جلدوں کی تصنیف معارف الحدیث ہے۔ چونکہ مولانا منظور نعمانی کا خاص موضوع حدیث رسول ہے اس لیے اس پر انہوں نے ۷ جلدیں مکمل کر لی تھیں ۸ ویں جلد تکمیل کے مراحل میں تھی کہ صحت نے دغا دی۔ پھر بھی اپنی نگرانی میں جو کام آخری وقت تک کرایا تھا وہ کافی ہے اور امید ہے ۸ ویں جلد منظر عام پر آجائے گی۔

مولانا کی مشہور کتابیں دین و شریعت، قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اور ایرانی انقلاب وغیرہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بہت مقبول ہوئیں ان کی کئی تصنیفات کے تراجم دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں وہ اردو کے دینی اصلاحی اور اسلامی رسالہ "الفرقان" کے بانی ایڈیٹر تھے اور یہ رسالہ ان کے مقصد کا ترجمان تھا اس رسالہ کو روز اول سے ہی ادبی دینی اور علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو گئی تھی اور آج اس کا اپنا ایک اہم مقام ہے۔

مولانا نے اسلام کی خدمات میں اپنی عمر کے ۶۴ برس صرف کیے وہ رابطہ عالم اسلامی کے ۱۹۶۲ء سے بانی ممبر تھے انہوں نے اس کے کئی اجلاس میں مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ہمراہ شرکت کر کے اس کے بانی ممبر میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔

مولانا منظور نعمانی مسلم پرسنل لا بورڈ، دینی تعلیمی کونسل، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بانی ممبروں میں تھے۔ ندوہ، دارالعلوم دیوبند کے مشاورتی کونسل کے [illegible] ممبر تھے اس کے علاوہ [illegible] کہ بھینگی گئی [illegible] مولانا کے پس [illegible] اور ۴ لڑکے ہیں [illegible] عتیق الرحمن سنبھلی [illegible] اور دینی تعلیم کے فروغ [illegible] سے اہم رول ادا کر رہے ہیں ان کے دوسرے بیٹے مسٹر حفیظ نعمانی روزنامہ ان دنوں کے چیف ایڈیٹر ہیں ان کے تیسرے بیٹے حسان احمد نعمانی الفرقان سے منسلک ہیں مولانا کے چھوٹے بیٹے مولانا سجاد نعمانی الفرقان کے ایڈیٹر اور رحمان فاؤنڈیشن کے مالک جیسے بھی ہیں وہ دستاویز [illegible] ڈائرکٹر اور آل انڈیا ملی کونسل کی مجلس عاملہ کے ممبر اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی ممبر ہیں۔

مولانا نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یگانگت کے جذبے کے فروغ کے لیے بڑی جدوجہد کی تاکہ ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رہے۔

نماز جنازہ صبح ۹ بجے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوگی اور تدفین عیش باغ کے قبرستان میں ہوگی۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر بزرگ ہستی مولانا قاری صدیق احمد باندوی لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے اور باوثوق ذرائع کے مطابق نماز جنازہ کل ندوہ میں وہی پڑھائیں گے۔

قومی آواز

روزنامہ ان دنوں لکھنؤ 6-5-97

کلمہ توحید کی گونج میں حضرت مولانا نعمانی کو ابدی آرام گاہ میں سلا دیا گیا

اللہ کے ولی حافظ محمد اقبال نے غسل دیا اور عارف باللہ قاری محمد صدیق نے نماز جنازہ پڑھائی

لکھنؤ ۵ مئی۔ آج صبح فجر کی نماز کے بعد سے قدوۃ جلیل حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے مکان واقع نظیر آباد میں تعزیت کرنے والوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا جو اس قدر تیزی سے بڑھا کہ ہجوم بڑھتا گیا جس وقت جنازہ باہر پہنچ گیا عقیدت مندوں کو کاندھا دینے کی آسانی کے لئے چارپائی میں دونوں طرف احتیاط مضبوط لکڑی کے بانس باندھ دئے گئے تھے اس کے باوجود ضعیف اور کمزور عقیدت مند اس سعادت سے محروم رہ گئے۔

ہزاروں عقیدت مند صبح سے ہی ندوہ میں جمع ہو کر صفیں بنائے بیٹھے تھے اور ہزاروں فرزندانِ توحید اپنے کاندھوں پر جنازہ لے کر ندوہ جا رہے تھے جہاں مولانا مرحوم کے رفیق محترم حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی اکابرین دار العلوم جنازہ کا بے قراری کے ساتھ استقبال کرنے کیلئے جمع تھے۔ اس لئے کہ حضرت مولانا کے غم میں دار العلوم بند کر دیا گیا تھا جنازہ اپنے مقررہ وقت پر ندوہ میں داخل ہوا ندوہ کے وسیع و عریض میدان میں صفیں آراستہ ہو گئیں جن میں نہ کوئی محمود تھا اور نہ ایاز۔ حضرت مولانا علی میاں کی فرمائش پر عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق صاحب نے اپنے بزرگ دینی بھائی کی آخری نماز پڑھائی یہ وہ نماز تھی جس کا اس وقت سے انتظار تھا جب پیدائش کے وقت ان کے کان میں اذان دی گئی تھی۔

حضرت مولانا کو آخری غسل ... مولانا کے بھتیجے حافظ محمد اقبال صاحب نے جو ندوہ سے آ کر دیا جس کی وصیت حضرت مولانا نے دو سال پہلے لکھوا کرا دی تھی نماز کے بعد تقریباً سات کلومیٹر کا سفر گرمی کے سخت موسم کے باوجود پیدل ہی کیا گیا اور مجمع برابر بڑھتا رہا یہاں تک کہ حضرت مولانا نعمانی کے بیٹوں اور عزیزوں کے کنٹرول سے باہر ہو گیا جنازہ کی آمد سے پہلے معروف لکھنؤ کے ہر اوسط اہل تعلق کو امید تھی کہ دوسری نماز عیش باغ کی مسجد کے برابر میدان میں ہوگی لیکن نہ کوئی کسی کو روک سکا اور نہ مشورہ دے سکا یہاں تک کہ جنازہ آخری آرام گاہ تک پہنچ گیا۔

وزیر اعلیٰ کے پرنسپل سکریٹری مسٹر پی ایل پونیا اور سکریٹری مسٹر سراج حسین صاحبان نے زبردست انتظامات کئے تھے اتنے طویل راستے میں ان کے حکم اور ٹریفک کنٹرول کرنے کے لئے پولیس کے افسر ہر جگہ مستعد نظر آئے جنازہ عیدگاہ کے قریب پہنچا اس وقت دونوں جانب ٹریفک بند کر دیا گیا اور انسانوں کا سیلاب بہتا ہوا عیدگاہ کے پاس جا کر رکا۔ انتہائی ستائش کی بات ہے کہ کسی ہدایت کے بغیر نظم و ضبط اور محبت و تعلق کا جو ثبوت لکھنؤ والوں نے دیا وہ مولانا مرحوم کو عقیدت و محبت کا سب سے بڑا نذرانہ تھا اس کے باوجود سیکڑوں زبانوں پر شکایت تھی کہ شہر میں اعلان نہ کرنے کی وجہ سے کم از کم ... [illegible] حضرات کو جو صرف اخبار پڑھتے ہیں لیکن اگر اعلان کر دیا جاتا تو مجمع سنبھالا نہ جا سکتا۔

جو لوگ حضرت مولانا نعمانیؒ سے ... طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں ... تمام عمر نام و نمود ... تھی اور اگر اعلان کیا جاتا ... روح پر ظلم ہوتا اس لئے کسی کے دل میں اس کا ... آیا اس لئے ان کے آخری سفر میں بھی ... والوں نے ان کے مزاج اور طبیعت کو ملحوظ رکھا اور کسی اعلان کے بغیر شہر اور دوسرے شہروں کے سیکڑوں اہل تعلق شریک ہوئے جن میں مدیر بھی تھے سکریٹری بھی تھے تاجر و وکلا بھی تھے اہل علم۔ الغرض سب ہی تھے اور مہمان بھی، طلبا بھی تھے اور لیڈر بھی تھے ماہرین تعلیم بھی تھے اور تاجر بھی تھے مستورات بھی تھیں اور غیر مسلم بھی تھے ان کے خاص معالج بھی تھے اور سیاسی لیڈر بھی تھے لیکن جس سکون کے ساتھ مولانا کو قبر میں اتارا گیا ان کے بیٹوں اور بھتیجوں نے جس طرح انہیں ان کی ابدی آرام گاہ میں سلایا وہ پرسکون منظر اس لئے دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کہ مجمع میں اکثریت اہل علم اور باشعور حضرات کی تھی۔ حضرت مولانا کو کلمہ توحید کی گونج میں لٹایا گیا۔

منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى کی گونج میں مٹی ڈال دیا گیا

محمد ارشاد ندا خیالی نوگانوی

(برمرقد نعمانیؒ)

اُٹھا سر سے ہمارے آہ ایسا ظلِ ربانی
وہ جس پر ناز کرتی ہے سدا تاریخِ انسانی

وہ تھا در اصل حزب اللہ کی تفسیر قرآنی
رہا تا عمر نصب العین جس کا دیں کی سلطانی

اُسی کو دیکھ کر آتی سمجھ "دین و شریعت کی"
کہ یہ "اسلام کیا ہے؟" اور کیا شئی ہے مسلمانی

(۲)

کہا خالق نے عزرائیل سے اس کو بلا لاؤ
پسند اب آگئی جس کی مجھے ہر ایک قربانی

مٹایا جس نے جان و مال اپنا راہ میں میری
مرا عاشق، میرا شیدا، وہی "منظور نعمانیؒ"

ہلا دیں جس نے بنیادیں جہان شرک و بدعت کی
کچھ ایسی غیب سے اس کو ملی توفیق یزدانی

[illegible]

مری خاطر مشقت پر مشقت کا وہ عادی تھا
کبھی دیکھی نہ جس نے راہ حق میں اپنی آسانی

فنا ہو جائیں سب دل سے نقوش آلامِ دنیا کے
یہاں ایسی کروں اس پر لذائذ کی فراوانی

کچھ اس انداز سے لینے نسیم خوشگوار آئی
گھٹائیں ٹوٹ کر برسیں ہوا ماحول نورانی

فرشتوں کی قطاریں وجد میں
چل اب پاکیزہ جنت کی طرف اے

عجب انداز سے ہونٹوں کا کھلنا یاد ہے اب تک
کہ جیسے پی رہے ہوں کوثر و تسنیم کا پانی

پھر اک ہچکی میں دیدی جان پیدا کرنے والے کو
مٹائی جس کی خاطر آپ نے یہ ہستی فانی

جمال و نور کی بارش نے حیراں کر دیا سب کو
جو دیکھی بعد مرنے کے رخ انور کی تابانی

فلک پر پہنچے عزرائیل لیکر روح اقدس کو
تو رضواں نے کہا "قربان تم پر میری دربانی"

یہ کون آیا ہے باطل سے ہزاروں بار ٹکرا کر
فروغ کلمہ حق میں مٹا کر ہستیٔ فانی

مچی ہے دھوم کس کے واسطے یہ خیر مقدم کی ؟
ہوئی جاتی ہیں حورانِ جناں کیوں آج دیوانی

یہ بندہ جاہ و ثروت پر سدا ٹھوکر لگاتا تھا
نہ کی دنیائے تخت و تاج و سطوت کی ثناخوانی

یہ ارباب سیاست سے ہمیشہ دور رہتا تھا
نہ کرنے دی شریعت میں کبھی باطل کو من مانی

یہی بندہ تھا جس نے کی تھی اس فتنے کی سرکوبی
بشکل انقلاب اٹھا تھا جو از خاک ایرانی

کیا اس نے نہ اپنا ایک پل برباد دنیا میں
جہادِ زندگانی میں ہر اک لمحہ تھا طوفانی

اسی بندہ نے رخ موڑا تھا سیلِ قادیانی کا
غرض ہر طرح کی باغ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگہبانی

(۳)

یہ کیسے لٹ گئی دنیا اچانک قلب مضطر کی
نہیں جاتی، نہیں جاتی، دل محزوں کی حیرانی

چھنایوں ساتھ اک کمرے میں ہر پل آٹھ برسوں کا
نہ سمجھے گا کوئی برباد الفت کی پریشانی

بھٹکتا پھر رہا ہے کوئی اب سنسان راہوں میں
غم فرقت کی سینے میں لئے "میراث نعمانیؒ"

تمھیں نے پھیر لیں نظریں جو اس دنیائے فانی سے
نظر آتی ہے اب دنیا کی ہر ایک چیز انجانی

اکیلا جان کر جب ظلمتیں مجھ پر لپکتی ہیں
تو اشک خوں رلاتا ہے وہی ماحول نورانی

سجایا تھا جسے ذکر و تلاوت
ہوئی کیسے گوارا آپ کو اس گھر کی ویراں!

ابد تک اپنی محرومی پہ اشک خوں بہائے گی
وہ ناداں قوم جس نے آپ کی قیمت نہ پہچانی

قلم سے آگ نکلے اور آنکھیں خون برسائیں
نہ کم ہوگی کسی صورت یہ بحر غم کی طغیانی

تڑپ کر یاد کرتی ہیں فضائیں آج سنبھل کی
سکھائی جس زمیں کو آپ نے توحید ربانی

بہت ویران لگتی ہے زمیں شہر نگاراں کی
بچھائی تھی جہاں تم نے بساط بزم عرفانی

یہ مرکز یاد کرتا ہے، وہ مسند یاد کرتی ہے
دیا تھا آپ نے برسوں جہاں پر درس قرآنی

تڑپ جاتے تھے جس کا نام سن کر آپ پل بھر میں
مبارک ہو اب اس خلاق دو عالم کی مہمانی

پکارے گا ہر اک پل کان اب "ارشاد" کہہ کہہ کر
یہ کہتی ہے ندا، رو رو کے میری چاک دامانی

وہ باتیں یاد آتی ہیں وہ لمحے یاد آتے ہیں
ملیں شفقت بھری گودی میں جب لذات روحانی

(۴)

خداوندا، دیا تھا جتنا گہرا ساتھ دنیا میں
عطا کر خلد میں بھی "اتنا گہرا قرب لافانی"

خدائے پاک ان کی قبر کو تو نور سے بھر دے
بنا اس کو ریاض جنت الفردوس کا ثانی

خداوندا! نہ کر محروم ان کی "خیر و نسبت سے"
لٹا دے ہم غریبوں پر وہی برکات روحانی

اب ان کا ساتھ ہم کو جنت الفردوس میں دے دے
جہاں کی زندگی باقی جہاں کا عیش لافانی

☆☆☆

ڈاکٹر محمد ولی الحق انصاری
سابق صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی

تاریخ ہائے وفات حضرت منظور نعمانیؒ

حضرت منظور رخصت ہو گئے جن کی ہر اک بات میر

کلکِ کوثر ریز تھا ان کا قلم علم کا ساگر تھی ان کی ہر

مرد کامل، نیک سیرت، نیک طبع پیکر علم و عمل قدسی صفات

آفتابِ علم اس میں چھپ گیا کیا تھی ۲۷ ر ذی الحجہ کی رات

پوچھی جب تاریخ بول اٹھا ولیؔ

(نام کے اعداد) ہیں سال وفات

منظور (۱۱۹۶) + نعمانی (۲۲۱) ۱۴۱۷ھ

آہ ۶ + منظور ۱۱۹۹۶ + نعمانی ۲۲۱ + جنت ۴۵۳ + مکانی ۱۲۱ ۱۹۹۷ء

جناب حکیم محمد افہام اللہ

قطعہ تاریخ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

موت العالم موت العالم گفتہ انداے عزیز — حیف از دار فانی شیخ نعمانی برفت

او محدث او مصنف او مناظر بہر دیں — کارہائے دین کردہ سوئے جنت او برفت

گر تو خواہی دیدن زخائر باقیات الصالحات — "مکتب فرقان" برو آں زخائر را بجست

من زہی سال ہمنشینش رکن شوری دیوبند — حیف آں صاف گو صاف باطن رکن شوری برفت

سال رحلت را چوں جستم غیبی ندا شد بر غریبؔ

عدد ہائے حروفِ "منظور نعمانی" بشفت

۱۴۱۷ھ

زبیر احمد راہی قاسمی
بیت الفرید سرونج (مدھیہ پردیش)

(تاریخ وفات)

نکتہ داں منظور نعمانی

۱۹ ۹۷

(بروفات علامۂ عصر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

پس رحلت ہوا ہے ان پہ ایسا فضلِ ربانی مقیم جنت الفردوس ہیں منظور نعمانی!

گلے از گلشنِ محمود و قاسم خوشنما خوشتر! یکے از باقیات انور و شبیّر عثمانی!

بہ رشک کوثر و تسنیم اندازِ بیاں اُن کا ہے دریائے رموزِ معرفت تفسیر قرآنی

معارف میں حدیث پاک کے وہ گل کھلائے ہیں! رہے گی جس سے روشن تا قیامت شمع ایمانی

فاتح دین حق میں معرکے ایسے بہت آئے پئے تسلیم باطل نے جھکائی اپنی پیشانی!

ادھر امداد غیبی تھی دمِ تحریر انھیں حاصل! ادھر تقریر میں ملتی رہی تائید ربانی

بہت اللہ کے بندے ہیں لیکن آج دنیا میں نہیں ملتا کوئی "اللہ والا" اب بآسانی!

ھیں چھیالیس سے ستانوے تک میں نے دیکھا ہے　　نظر میں "جلوۂ حق" اور جبیں پر "نورِ ایمانی"

ستانِ حسین احمد (۱) کا تھا وہ بلبل شیدا　　رہی ہے محفلِ الیاسؒ میں ان کی غزل خوانی!

زاری عمر ساری دینِ فطرت کی حمایت میں　　ہیں انکی کوششیں اس باب میں بے مثل ولا ثانی

تیق وحضرت حسانؔ ہیں نگران "الفرقاں"　　وراثت میں ملی ہے ان کو یہ "میراثِ نعمانی"

ہ ہمعصر مجید (۲) و مصطفےٰ (۳) ہمراہی طیب (۴)　　ہوا محروم جنکی برکتوں سے عالم فانی

سراپاے خصال مومنانہ "عارف کامل"　　عیاں انوار ایمان ویقین از لوحِ پیشانی!

مقامات شہود حق" تک جنکی رسائی تھی!　　فقیری میں بھی کی ہے اُن خداوالوں نے سلطانی

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را"　　زہے حُبِّ رسولِ پاکؐ، عشق ذات ربانی

ندارم باک اگر گویم بالفاظ دگر راہی

جہاں خالی شُدہ از اہلِ دل از مرگ نعمانیؒ

☆☆☆

---

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ۔ (۲) قطب عالم شیخ طریقت حضرت مولانا محمد عبدالمجید خان مفتی سرونج۔ (۳) حضرت مولانا مصطفےٰ حسن علوی کاکوری۔ (۴) حضرت حکیم الاسلام بیرہ قاسم مولانا محمد طیب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

خبرِ وفات کی صدائے بازگشت
اسلامی جرائد و رسائل میں

پھر اکرا بیلس بھی یہ کہتا رہا ہو گا کہ ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

ایسے بیدار مغز وہوش مند عالم کی وفات مسلمانوں کی بدنصیبی، قوم وملت کا زیاں اور علم دین کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی مراد آباد ضلع کے قصبہ سنبھل میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے یہیں اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، دار العلوم مئو میں بھی درسیات کی تحصیل کی اور آخر کے دو سال دار العلوم دیوبند میں گزارے۔ اس وقت مولانا انور شاہ کشمیری صدر المدرسین اور شیخ الحدیث تھے ان سے اور دوسرے اساتذۂ فن سے درس لیا۔ شاہ صاحب کے تلمذ پر ان کو ہمیشہ فخر رہا اور اپنے تمام اساتذہ میں انھیں سے سب سے زیادہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے ان سے بیعت بھی ہوئے حضرت شاہ عبد القادر رائپوری سے بیعت اس کے بعد ہوئے تھے۔

مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد چند برس تک عربی مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دی، اس زمانے میں بعض داخلی وخارجی فتنوں کا بڑا زور تھا، ان فتنوں سے اسلام کے عقیدہ توحید ورسالت کی بیخ کنی اور شرک وبدعت کے فروغ کے علاوہ علمائے دیوبند کی ذات ومسلک بھی مجروح ہو رہا تھا، اس لئے مولانا طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کی سرکوبی کی تیاری کرنے لگے تھے اور اب تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی انکے خلاف محاذ آرائی میں حصہ لینا شروع کیا، چنانچہ ان کی ابتدائی زندگی بعض فرقوں کے مقابلوں اور ان سے مناظروں کے لئے وقف رہی اور اسمیں وہ بڑے کامیاب رہے۔ اسی سلسلے میں انھیں اپنے مخالفوں کے نظریات کے ابطال کے لئے ایک علمی ودینی ماہنامہ رسالہ نکالنے کا خیال بھی آیا جو محرم ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء سے اب تک ان کے انتقال کے بعد بھی الفرقان کے نام سے برابر شائع ہو رہا ہے اور وہ ملک کا مشہور علمی، دینی اور اصلاحی رسالہ خیال کیا جاتا ہے۔

مولانا کی یہ جرأت وہمت بھی قابل داد ہے کہ انھوں نے شروع میں رسالہ ایسی جگہ سے شائع کیا جو ان کے حریفوں کا خاص مرکز تھی۔ ان کی مہم جو اور حوصلہ پسند طبیعت کو ہمیشہ اپنی سرگرمی عمل کے لئے نئے میدانوں اور خوب سے خوب تر راہوں کی تلاش وجستجو رہتی تھی، عمر کی پختگی اور بعض تجربوں کے بعد جب وہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی دینی تحریک سے متوسل

ہو گئے تو مسلمانوں کی اصلاح کے اس محدود تصور پر قانع نہیں رہ سکے جس کی بناپر بعض طبقوں کی اعتقادی و عملی غلطیوں کی بحث و تمحیص کا اور ان کی افراط و تفریط کی تغلیط و تردید الفرقان کا خاص موضوع بن گیا تھا بلکہ یہی دینی دعوت ان کے دل و دماغ پر چھا گئی اور وہ ان کی زندگی اور ان کے اعمال کا خاص محور اور الفرقان کی اصل دعوت بن گئی۔

الفرقان کے متعدد خاص نمبر بھی شائع ہوئے جو بہت مقبول ہوئے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ پر اس کے خاص نمبر بڑی اہمیت و منفعت کے حامل
یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں اور عظیم داعیوں کے
کارناموں اور ان کی دعوت و تعلیم کو جس بہتر انداز میں ان میں پیش کیا گیا۔
اور صاحب الفرقان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کے حج نمبر سے حاجیوں کو
تبلیغی و دعوتی اسفار اور الفرقان کی ادارت کے ساتھ ساتھ مولانا ہمیشہ تصنیف
میں بھی مشغول رہتے جس کا انھیں اچھا ذوق، خاص سلیقہ اور خداداد ملکہ تھا، وہ اردو کے بہت اچھے اہل قلم تھے۔ ان کی تحریریں نہایت سلیس، شگفتہ اور رواں ہوتی تھیں۔ جن کی زبان آسان اور بڑی عام فہم ہوتی اور پیش کرنے کا انداز اتنا موثر اور دل نشیں ہوتا تھا کہ عام آدمی کو بھی انکے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے اس پر ان کی مکمل گرفت ہوتی تھی، اسلئے اپنے مدعا و مقصود کو کسی ایچ پیچ کے بغیر اچھی طرح واضح کر دیتے تھے۔

مولانا کی چھوٹی بڑی بے شمار تصنیفات ہیں اور وہ سب اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے درجنوں ایڈیشن بھی نکلے اور ملک کی مختلف زبانوں کے علاوہ انگریزی اور عربی وغیرہ میں ترجمے بھی ہوئے، ان کی جن کتابوں کا فیض بہت عام ہوا ان کا تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا۔

اسلام کیا ہے؟

یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے بعد کے خاص حالات میں لکھی گئی ہے اس میں ایک عام مسلمان کیلئے مکمل دین کو آسان اور موثر دعوتی زبان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ رسالہ مسلمانوں کے لئے رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنے اور غیر مسلموں میں بھی اسلام کی اصل صورت واضح ہو جائے۔

دین و شریعت

اس کا موضوع بھی وہی ہے مگر یہ کسی قدر اونچی سطح کے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

اس میں قرآن مجید کی عمومی دعوت کا خلاصہ بڑے موثر اور دل نشیں انداز اور آسان وعام فہم زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔

آپ حج کیسے کریں ؟

اس کو لکھنے کے دو خاص مقصد تھے، ایک تو یہ کہ معمولی خواندہ آدمی کو بھی حج کے مناسک وارکان ادا کرنے میں سہولت ہو، دوسرا مقصد یہ تھا کہ حج کے اعمال کو ادا کرنے کے وقت جن دینی جذبات سے حاجی سرشار ہونا چاہئے ان کی تحریک کا سامان کیا جائے۔ ان مقاصد کے لحاظ سے یہ کتاب بہت کامیاب ہوئی۔

آسان حج

اس میں وہی مضمون مزید مختصر اور آسان کر کے لکھا گیا ہے، راقم کو حج بیت اللہ کے سلسلے میں مولانا کے ان رسالوں سے بڑا فائدہ پہونچا۔

کلمہ طیبہ کی حقیقت

اس میں کلمہ کی حقیقت و مفہوم بہت سادہ اور آسان زبان اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

نماز کی حقیقت

اس میں آسان زبان اور دل نشیں انداز میں نماز کی روح بتائی گئی ہے، یہ رسالہ بھی بہت نفع بخش ہے۔

معارف الحدیث

یہ مولانا کی سب سے اہم اور مفید کتاب ہے جو اردو کی علمی وحدیثی ذخیرہ میں ایک بہت قیمتی اضافہ ہے، اس کو بڑی شہرت وقبولیت نصیب ہوئی اس کی سات جلدیں خود مولانا نے مرتب کر کے شائع کی ہیں ۔ آٹھویں جلد ان کے برادرزادہ مولوی محمد زکریا استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو مرتب کر رہے ہیں۔ یہ کتاب دور حاضر کے خاص حالات اور ایک عام پڑھے لکھے شخص کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، یہ دراصل حدیث نبوی کے ضخیم

دفتر سے ایک انتخاب ہے جو ترجمے کے ساتھ ایسی سادہ اور مختصر تشریح پر مبنی ہے جس سے حدیث کا اصل مغز و مدعا اچھی طرح ذہن نشیں ہو جاتا ہے اور یہ کتاب انسان کی عملی و روحانی ترقی و اصلاح کا ذریعہ بھی بن گئی ہے، گو اس میں فنی مسائل اور مہمات امور سے براہ راست تعرض نہیں کیا گیا ہے، تاہم اس سے احادیث کی بہت سی علمی و فنی گرہیں صاف طور پر حل ہو گئی ہیں، حدیثوں کے فقہی پہلو اور فقہاء کے اختلافات کا تذکرہ بقدر ضرورت اس طرح کیا گیا ہے کہ افتراق باہمی کے رجحان کی ہمت شکنی ہو، اس لحاظ سے یہ کتاب اہل علم اور طلبہ حد لئے بھی بہت کار آمد ہے۔

ان کتابوں سے مسلمانوں کو بڑی رہنمائی اور تقویت ملی اور ان کی حیثیت جاریہ کی ہے۔

مولانا کا شمار اس عہد کے ممتاز اور صف اول کے علماء میں ہوتا تھا، دینی رسوخ اور پختگی حاصل تھی۔ تفسیر، فقہ، کلام اور کتب معقولات پر انکی وسیع اور تھی۔ لیکن حدیث سے ان کو زیادہ شغف اور مناسبت تھی جسکی تحصیل ہندوستان کے مشہور اور نابغہ روزگار محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے کی تھی اور کئی برس تک خود بھی دار العلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کا درس دیا، ان کی کتاب معارف الحدیث بھی حدیث میں ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔

کم لوگوں کو تحریر و تقریر دونوں پر قدرت ہوتی ہے مگر مولانا کو تقریر کی بھی اچھی مشق تھی، مناظروں میں ان کی کامیابی میں اسکو بھی بڑا دخل تھا۔ تبلیغی جماعت کے اجتماعات اور دوسری ملی و دینی تحریکوں میں بھی وہ اپنی تقریروں کی اثر انگیزی اور دلپذیری کے بناء پر مدعو کئے جاتے تھے، آخر میں وہ مختصر تقریریں کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ راقم کو ایک مرتبہ انجمن تعلیمات دین کے جلسے میں انکی تقریر سننے کا اتفاق ہوا جو مختصر ہونے کے باوجود واضح، مدلل اور دل نشیں تھی۔

مولانا قوم، ملک اور ملت کے مسائل سے کبھی بے تعلق اور بیگانہ نہیں رہے تقسیم کے بعد مسلمانوں کو جس بحران اور پیچیدگی کا سامنا کرنا اور آئے دن جن نت نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان کے حل کے لئے جو مخلصانہ کوششیں اور تدبیریں ہوئیں ان میں انکا بھی بڑا عمل دخل رہا، ۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کا قیام عمل میں آیا تو جو علماء ان میں پیش پیش رہے اور اس کے لئے مختلف جگہوں کے انھوں نے دورے کئے ان میں یہ بھی تھے اور آخر تک اس سے انکا

گہرا تعلق رہا۔

اسی زمانے میں انھوں نے اپنے بعض رفقاء کے تعاون سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا تاکہ آئے دن فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو مایوسی، انتشار پست ہمتی اور احساس کمتری پیدا ہو رہا تھا، اسے ختم کر کے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے، ہفت روزہ ندائے ملت کا اجراء اسی احساس کا نتیجہ تھا جس نے بڑی حد تک مسلمانوں کو قوت، جرأت، اور ہمت عطا کی، اب بھی یہ اخبار ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی سرکردگی میں نکل رہا ہے اور مفید خدمت انجام دے رہا ہے

۱۹۶۴ء میں جمشید پور اور راوڑ کیلا وغیرہ کے فسادات نے ملت کے درد مندوں کو گہری تشویش اور سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا، اسی کے نتیجے میں ڈاکٹر سید محمود کی رہنمائی میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی۔ اس کے قیام میں مولانا منظور صاحب کا بھی مکمل تعاون رہا اور اس کے وفود میں شامل ہو کر انھوں نے بھی ملک کے اکثر مقامات کا دورہ کیا جس سے بڑی اچھی فضا بنی مگر بدقسمتی سے یہ اتحاد بہت عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹر سید محمود بہت ملول و متفکر ہوئے، ایک مرتبہ انھوں نے اس صورت حال کا درد و حسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے بعض حضرات کے رویہ کی شکایت کی مگر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کی سیاسی بصیرت، اصابت رائے اور معاملہ فہمی کا اعتراف کیا۔

۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل میں بھی وہ شریک رہے اور اس کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور اپنی تحریروں اور الفرقان کے ذریعہ اس تحریک میں جان و قوت پیدا کی۔

مولانا حالات حاضرہ اور گرد و پیش کے واقعات سے پوری طرح باخبر رہتے، اخباروں کا مطالعہ پابندی سے کرتے سیاسی اشخاص اور ملی رہنماؤں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی ان کے یہاں رہتا۔ وہ مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے لئے انگریزی اخبار کی اشاعت ضروری سمجھتے تھے اور اس کے لئے اپنی جیسی کوشش بھی کی مگر ابھی تک یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔

مولانا ہندوستان کے دو سب سے بڑے اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن رکین تھے اور بعض نازک موقعوں پر ان کی خداداد ذہانت و صلاحیت اور بروقت قوت فیصلہ سے ان تعلیم گاہوں کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں بڑی مدد ملی۔ وہ رابطہ عالم اسلامی کے بھی ممبر تھے اور جب تک ان کی صحت اچھی رہی اس کے جلسوں

میں پابندی سے شریک ہوتے اور اسی بہانے حج وعمرہ اور زیارت حرمین کا ثواب بھی لوٹتے رہے۔
دارالمصنفین سے بھی مولانا کا تعلق تھا، مولانا سید سلیمان ندوی سے بعض مسائل میں استفسارات کرتے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم سے بھی ان کا مخلصانہ ربط و تعلق تھا، اس کے موجودہ صدر محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تو وہ "رفیق مکرم" ہی تھے۔ الفرقان میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ پر اپنا خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا تو اس خاکسار نے بھی حضرت سے عقیدت کی بناپر ایک مضمون اس میں اشاعت کے لئے بھیجا جس کی وصولی کی رسید فوراً دیتے ہوئے مولانا نعمانی نے اس کی تحسین فرمائی جو میرے لئے سرمایہ فخر ہے۔
مولانا نے بڑی مصروف و مشغول زندگی گذاری، وہ مدۃ العمر دین و ملت کی سربلندی اور مسلمانان ہند کی اصلاح ورہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے، مولانا سیرت اور خوش خلقی سے متصف تھے، طبیعت میں دردمندی اور قلب میں رقت و ذکی الحس تھے اس لئے واقعات و حالات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے، دینی مسائل میں ان کا ذہن کھلا ہوا تھا، جزئیات میں متوسع تھے، شرعی امور میں تشدد و تصلب کے بجائے، سہولت، تخفیف و عافیت پیدا کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔
اس دور کے اکثر اکابر علماء و مشائخ سے ان کے تعلقات تھے اور وہ بالالتزام ان کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ ان کی سبق آموز زندگی کے واقعات و حالات سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور انھیں قلم بند کر کے دوسروں کو بھی ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ اس ضمن میں ان کی یہ خوبی قابل ذکر ہے کہ جن اکابر کی وہ بڑی عزت اور خاص احترام کرتے تھے ان کی کمزوریوں اور کمیوں پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی اور کسی نہ کسی پیرائے میں بے جھجک وہ اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے، اس طرح یا تو وہ بزرگ اپنی کمی و کوتاہی کی اصلاح و تلافی فرما لیتے یا اگر خود مولانا کو کسی وجہ سے غلط فہمی ہو گئی ہوتی تو وہ دور ہو جاتی اور ان کی تسلی و تشفی کا سامان ہو جاتا۔
مولانا کی سیرت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جس کام کو ٹھیک اور بہتر سمجھتے تھے اس میں تن من دھن سے لگ جاتے لیکن جیسے ہی اس کی غلطی ان پر منکشف ہو جاتی وہ اس سے فوراً اور بے تکلف کنارہ کش ہو جاتے، اس میں نہ انھیں اپنی سبکی کی پرواہ ہوتی اور نہ اپنے قدیم رفیقوں اور دوستوں کی خفگی کا خیال ہوتا، پچھلے دس برسوں سے وہ علیل تھے، بالآخر وقت موعود آگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر و شکیب عطا کرے۔ آمین

ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

ملک و بیرون ملک کے علمی و دینی حلقوں میں یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی گئی ہوگی کہ عالمی شہرت کے حامل نامور مصنف اور تبحر عالم دین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ۲۶؍ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ، ۴؍مئی ۱۹۹۷ء کو بوقت ۸ بجے شب اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

انا لله وانا اليه راحعون، اللهم اعفر له وارحمه واعف عنه، و اكرم نزله ووسع مدخله و انزل على روحه و حسده شاٰبيب رحمتك واحعله من عبادك المقربين۔ آمين يا ارحم الراحمين۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ عصر حاضر کی ان ممتاز ہستیوں میں سے تھے جن کی زندگی ایک مستقل تاریخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی و عملی انحطاط کے اس دور میں جب کہ جانے والا اپنا کوئی بدل چھوڑ کر نہیں جاتا موصوف کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس پر اظہار کرب والم کے تمام الفاظ بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ صرف مولانا مرحوم کے اعزہ کا نہیں پورے ملک کا، برّ صغیر کا بلکہ پورے عالم اسلام کا حادثہ ہے۔

مولانا نعمانی قدس سرہ کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت عہد کی دلکش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہند، حضرت حکیم الامت، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت محدثِ عصر علامہ انور شاہ کشمیری، وغیرہ علم و عمل کے مجسم پیکروں کے جلوۂ جہاں آرا کو دیکھا تھا اور ان میں سے اکثر کے علمی و عملی حسنات و برکات سے براہ راست استفادہ کیا تھا۔

ان کے رگ و پے میں یہ یقین پیوست تھا کہ اکابر علماء دیوبند اس عہد میں "ما انا علیہ و

اصحابی" کی عملی تفسیر تھے اور ان کا فہم دین اس دور میں خیر القرون کے مزاج وذوق سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اسی لئے وہ اکابر دیوبند رحمہم اللہ کے علم و عمل اور فکر و نظر کے مظہر اتم اور امین و نقیب تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم کے لئے داخلہ کو "باب رحمت" میں داخلہ سے تعبیر کرتے تھے۔ دارالعلوم اور اس کے اکابر سے ان کی وابستگی وگرویدگی عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ دارالعلوم کی خدمت کو ایک دینی وملی فریضہ تصور کرتے تھے اور جس بات کو وہ دارالعلوم کے حق میں مفید و بہتر باور کرتے تھے اس کے اظہار و بروئے کار لانے میں اپنے وپرائے کسی کی پروانہیں کرتے تھے۔

ولادت اور دور تعلیم و تحصیل

مولد، موصوف ۱۸ر شوال ۱۳۲۳ھ کو اپنے آبائی وطن سنبھل ضلع مرا
ایسے خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے جس میں دینداری بھی تھی۔ چنانچہ مولا
کتاب تحدیث نعمت میں لکھتے ہیں۔

"سب سے پہلے اللہ تعالی کے جس احسان عظیم کا ذکر کا نا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے گھرانے میں پیدا فرمایا جس میں دنیوی معیشت کے لحاظ سے خوشحالی کے ساتھ اس کی توفیق سے دینداری اور خداترسی بھی تھی۔ میرے والد صوفی احمد حسین صاحب مرحوم ایک متوسط درجے کے دولت مند تھے، زمینداری بھی اچھی خاصی تھی اور تجارتی کاروبار بھی خاصا وسیع تھا، اسی کے ساتھ ان کی آخرت کی فکر دنیا کی فکر پر غالب تھی اور وہ کاروبار میں مشغولی کے ساتھ "الذاکرین اللہ کثیراً" میں سے تھے" (ص ۲۱۔۲۲)

ابتدائی تعلیم اپنے وطن سنبھل کے مختلف مدارس میں مختلف اساتذہ سے حاصل کی جن میں مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم خود لکھتے ہیں۔

"۱۳۳۸ھ کی بات ہے جبکہ میری عمر پندرہ سال ہو گئی تھی والد صاحب کو معلوم ہوا کہ شہر کے فلاں مدرسے میں ایک نئے پنجابی استاذ آئے ہیں، اور وہ بہت توجہ سے پڑھاتے ہیں۔ والد صاحب نے مجھے ان کے پاس بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے، اللہ ان کو بہترین جزاء دے، ان کی بدولت میری گاڑی اب پہلے دن سے پٹری پر پڑ گئی اور بدشوقی اور بے دلی دور ہو گئی۔ ذہن اور حافظہ بھی اللہ نے بہت اچھا دیا تھا۔ اس لیے طالب علمی کے سفر کا بہت بڑا حصہ تیزی سے طے کر لیا۔" (ص: ۲۴)

متوسطات اور فنون کی اکثر کتابیں اپنے وطن کے مشہور صاحب درس عالم حضرت

مولانا کریم بخش سنبھلی سے مدرسہ عبد الرب دہلی اور دار العلوم مئو ضلع اعظم گڑھ میں پڑھیں۔ دار العلوم مئو میں بعض کتابیں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب محدث اعظمی اور حضرت مولانا عبد اللطیف نعمانی سے بھی پڑھیں، پھر تکمیل کے لیے شوال ۱۳۴۳ھ میں دار العلوم دیوبند حاضر ہوئے اور دو سال یہاں رہ کر فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم دین کی تحصیل و تکمیل کی۔

دار العلوم دیوبند میں داخلہ کے عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"بہر حال میرے طالب علمی کا سفر بہت ہی تیزی سے طے ہوتا ہوا اس منزل پر آگیا کہ توفیق الٰہی سے ۱۳۴۳ھ میں علوم دین، فقہ اور حدیث کی آخری اور تکمیل تعلیم کے لیے مجھے دار العلوم دیوبند جانا نصیب ہو گیا جو ہندوستان ہی میں نہیں پورے عالم اسلام میں اس وقت ان علوم کی تدریس و تعلیم کا عظیم ترین مرکز تھا اور جہاں ان علوم کے وہ ماہر اساتذہ جمع تھے جو اپنے فن میں امتیاز و کمال رکھتے تھے اور ساتھ ہی صلاح و تقویٰ میں اسلاف کا نمونہ تھے"

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں

"یہ داخلہ میرے لیے تو باب رحمت کا داخلہ تھا ہی، میرے والد کے لیے بھی اس کے ذریعہ اہل حق سے عقیدت و تعلق اور اصلاح عقائد کا راستہ کھل گیا۔"

دار العلوم دیوبند میں مولانا مرحوم نے پہلے سال مشکوۃ شریف، ہدایہ آخرین وغیرہ وہ کتابیں پڑھیں جن کا دورۂ حدیث سے پہلے پڑھنا ضروری ہے اور دوسرے سال دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے شعبان ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہو گئے، اسی دوران خارج اوقات میں حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ سے معقول کی اہم ترین کتاب "شرح اشارات طوسی" کا ایک معتد بہ حصہ پڑھا، آپ کے دار العلوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، حضرت مولانا سراج احمد رشیدی، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (اجازۃً) حضرت محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت محدث کشمیری قدس سرہ سے آپ کو خصوصی عقیدت و محبت تھی اور ان کے علم و عمل سے بے حد متاثر تھے۔

چنانچہ تحدیث نعمت میں لکھتے ہیں:

"دوسرے سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ یوں تو اس وقت دارالعلوم کے سبھی بڑے اساتذہ باکمال، اپنے اپنے فن کے امام اور صلاح و تقوی اور تعلق باللہ میں بھی صاحب مقام تھے۔ لیکن ان میں صدر المدرسین شیخ الحدیث استاذنا العلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا خاص الخاص مقام تھا جنھوں نے نہیں دیکھا وہ غالبًا یہ تصور بھی نہ کر سکیں گے کہ چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں اس شان کا کوئی تبحر عالم ہو سکتا ہے جن اصحاب نظر نے حضرت ممدوح کو کچھ مدت تک قریب سے دیکھا ہے ان سب کا احساس یہی ہوگا کہ علوم دین کے بحر ذخار اور ورع و تقوی کے لحاظ سے ان خاصان خدا میں سے تھے جن کی منکرات ومعصیات سے حفاظت فرمائی جاتی ہے۔ صورت بھی اللہ تعالی نے ایسی حسین معصومانہ بنائی تھی کہ دیکھنے والا بے ساختہ کہہ اٹھے۔ان ھذا الا ملك كريم"۔

(ص ۳۳۔ ۳۴)

اسی حسن عقیدت کی بنا پر امتحان سے فارغ ہوتے ہی حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست نہیں بلکہ نیازمندانہ اصرار کیا جسے حضرت شاہ صاحب نے خلاف عادت قبول فرمالیا اور توبہ کی تلقین اور تسبیحات و شغل پاس انفاس کی تعلیم فرمائی۔ مولانا مرحوم نے اپنے تعلیمی دور کی بہت ساری تفصیلات ایک رسالہ "میری طالب علمی" میں جمع کر دی ہیں جو مکتبہ الفرقان سے شائع ہو چکا ہے۔ طلبہ و علماء کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔

دورِ عمل

تعلیم و تحصیل سے فراغت کے بعد اپنے وطن مدرسہ محمدیہ سنبھل سے درس و تدریس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد یہاں سے مدرسہ چلہ امروہہ چلے گئے اور تقریبًا تین سال تک وہاں بھی تدریسی مشغلہ جاری رہا۔ لیکن ملک کے حالات اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اس قدر تشویشناک تھے کہ ان حالات میں مولانا مرحوم جیسے حساس اور دعوت و تبلیغ کا ذوق و مزاج رکھنے والے کے لیے مدرسہ کی چہار دیواری میں محصور ہو کر صرف درس و تدریس پر قناعت کر لینا مشکل تھا اس لیے وہ تعلیمی و تدریسی مشغلہ کو تادیر قائم نہ رکھ سکے۔

اس وقت کے حالات کا تذکرہ خود مرحوم کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام کو چند شدید قسم کے فتنوں سے سابقہ تھا جن میں بعض داخلی تھے اور بعض خارجی۔ خارجی فتنہ آریہ سماج کی شدھی سنگھٹن تحریک کا تھا۔ داخلی فتنوں میں ایک طرف قادیانیت کی یلغار تھی۔ ہر طرف ان کے مناظر اور مبلغ پھیل رہے تھے اور امت کے عقیدۂ ختم نبوت کی جڑیں کھودنا چاہتے تھے اور دوسری طرف بریلوی مکتب شرک وبدعت نے سر اٹھا رکھا تھا ہمارا ضلع مراد آباد اس زمانے میں بریلوی فرقے کے مشہور زعیم ور ہنما مولوی نعیم الدین صاحب کی وجہ سے اس فتنے کا خاص مرکز تھا۔ گلی کوچے بلکہ گھر گھر یہی چرچا تھا"۔

چنانچہ ان فتنوں کے مقابلہ کے لئے مولانا مرحوم میدان عمل میں نکل نہیں بلکہ کود پڑے اور بالخصوص بریلوی فرقے کا ایسا کامیاب تعاقب کیا کہ اس فرقہ کے بڑے بڑے جغادری مولانا موصوف کا نام سن کر گھبرا جاتے تھے اور جلسۂ مناظرہ میں آنے سے پہلے ان کے دل تھرا جاتے تھے۔

اس زبانی بحث ومناظرہ کے ساتھ یہ ضرورت سمجھی گئی کہ اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے ایک رسالہ بھی جاری کیا جائے تاکہ دین خالص اور سنت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی جو آواز مولانا بلند کر رہے ہیں اسے ملک کے ہر ہر گوشے میں مزید مؤثر انداز میں پہنچایا جائے۔ "الفرقان کا اجراء" کے تحت مولانا خود رقم طراز ہیں

"ماہنامہ 'الفرقان' جس کی اشاعت کا اس وقت (رمضان ۱۴۱۴ھ) باسٹھواں سال چل رہا ہے اس کا اجراء بھی فی الواقع احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے اس عاجز بندے کے فکر و عمل کی ایک کڑی تھی۔ اس دور میں بار بار تقاضا ہوتا رہا تھا کہ ایک ماہنامہ جاری کیا جائے لیکن ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر اور مقدر ہے اس کے لئے عملی شکل نہیں بن پاتی تھی حتی کہ وہ وقت مقرر آگیا اور ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ میں استخارہ مسنونہ کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ انشاء اللہ محرم ۵۳ھ سے ایک ماہنامہ الفرقان نامی بریلی سے جاری ہوگا۔" (ص ۴۹)

الفرقان کے اجراء اور پھر اس کی بقاء کے لئے مولانا موصوف نے کس قدر مشکلات برداشت کیں اور انتھک محنتیں کیں وہ بجائے خود ان کی زندگی کا ایک محیر العقول باب ہے۔ جس سے ان کی اولوالعزمی، رائے کی پختگی اور جہد و عزیمت کا پتہ چلتا ہے۔ الفرقان نے رد بریلویت

کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ برصغیر کے جرائد ورسائل کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں اور آج بھی اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے اس زمانہ کے الفرقان کے شمارے اہم ترین مآخذ و مصادر کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے صرفِ نظر کر کے اس موضوع کو مکمل نہیں کیا جاسکتا۔

اسی دور میں الفرقان کے دو خصوصی نمبر بھی منصۂ شہود پر آئے۔ ایک "مجدد الف ثانی نمبر" اور دوسرا "شاہ ولی اللہ نمبر" یہ دونوں خصوصی شمارے بھی اپنی افادیت و جامعیت کے لحاظ سے علمی و تحقیقی دنیا میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ ان دونوں شماروں میں حضرت مجدد الف ثانی اور حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ کے فکر و عمل، نظریات و تعلیمات اور ان کی خدمات کا ایسا جامع و مستند تعارف آگیا ہے جس سے عام تذکروں کا دامن خالی ہے۔ ان خصوصی نمبروں کی ترتیب واشاعت بھی مولانا مرحوم کا ایک قابل فخر علمی کارنامہ۔

زندگی کا ایک اور رخ

دین حق کی دعوت واشاعت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی جذبہ کی بنا پر انہوں نے مدرسہ کی یک گونہ یکسوزندگی کو خیرباد کہہ کر تقریر و تحریر اور بحث و مناظرہ کی وادی ہنگامہ خیز میں قدم رکھا تھا۔ اسی جذبہ خیر سے مغلوب ہو کر ایک زمانہ میں وہ مولانا مودودی صاحب سے بھی متاثر ہوگئے اور یہ تاثر آہستہ آہستہ اتنا بڑھا کہ وہ نہ صرف ان کے ہم سفر بن گئے بلکہ ان کی جماعت اسلامی کی تشکیل و تنظیم میں بنیادی کردار ادا کیا وہ خود لکھتے ہیں

> "اس جماعت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں، میں مودودی صاحب سے بھی کچھ آگے ہی تھا۔ نیز لوگوں کو بڑی قوت سے اس کی طرف دعوت دی تھی اور اعتراضات کے مقابلے میں اس کی بھرپور مدافعت کی تھی" (ص ۷۹)

لیکن ان کا علم صحیح و فہم سلیم فکر و نظر کی اس لغزش کو زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا اور وہ جلدی ہی اس راستہ سے الٹے پاؤں واپس ہوگئے جس کی مکمل روداد "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت" کے نام سے مرتب کر کے شائع بھی کر دی۔

اس کے بعد وہ اپنے اسی جذبہ دعوت و تبلیغ کے تحت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ سے وابستہ ہوگئے اور ان کی قائم کردہ جماعت تبلیغ کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں گھوم پھر کر دین حق کی دعوت واشاعت میں نمایاں

حصہ لیا اور جب تک پیروں سے معذور نہیں ہوگئے عملی طور پر تن دہی اور مستعدی کے ساتھ اس کام میں لگے رہے۔

اور اسی کے ساتھ اس وقت کے مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری سے تجدیدِ بیعت کر کے سلوک و احسان کی منزلیں بھی طے کرلیں اور حضرت رائے پوری کی جانب سے اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔

مولانا موصوف نے دین کے اس شعبہ کی راہ سے بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ لکھنؤ اور اسکے قرب وجوار کے اضلاع کے بہت سے لوگ مولانا سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے۔

تصنیف و تالیف

مولانا کا تعلق اگرچہ درس و تدریس سے کم ہی رہا لیکن ان کی علمی استعداد نہایت پختہ اور ٹھوس تھی اور ان کا مطالعہ بہت وسیع و عمیق تھا اس لئے ان کا علم مستحضر تھا اور علمی مسائل پر اس طرح تفصیلی و محققانہ گفتگو کرتے تھے گویا ابھی انہوں نے اس موضوع پر تیاری کی ہے۔ مولانا نے دینی موضوعات پر جو کتابیں تحریر فرمائی ہیں ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا علم کس قدر پختہ اور ہمہ گیر تھا۔ وہ بڑے سے بڑے اہم اور دقیق علمی مسائل کو اس طرح سادہ، سلیس عام فہم اور شگفتہ عبارت میں سمجھادیتے ہیں کہ قاری کو ان کی دقت کا احساس تک نہیں ہوتا بالخصوص اپنی مشہور سات جلدوں میں پھیلی ضخیم تالیف معارف الحدیث میں احادیث کے انتخاب اور پھر ان کی توضیح و تشریح میں جس ژرف نگاہی اور لطافت فہم کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی وسعت علم اور مہارت فن کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

مولانا نعمانی علیہ الرحمہ نے مختلف علمی و دینی موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً ڈھائی درجن کتابیں لکھیں جن میں معارف الحدیث، اسلام کیا ہے؟، دین و شریعت، ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت، شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا کی ان ساری کتابوں کی زبان نہایت شگفتہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اس لئے عام و خاص ہر حلقے میں مقبول ہیں۔ مولانا مرحوم کی تحریر کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کی اثر انگیزی ہے۔ ان کی گفتگو بھی نہایت مؤثر ہوتی تھی لیکن تقریر کے مقابلہ میں ان کی تحریر زیادہ پر کشش اور مؤثر ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے اس کا تعلق محض الفاظ و بیان سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے تھا۔ اور تاثیر کی یہ قوت زبان و بیان پر قدرت کی رہینِ منت نہیں بلکہ یہ انکے اخلاص اور سوز دروں کی کرشمہ سازی ہے۔

دار العلوم دیوبند اور دیگر اداروں سے مولانا کے روابط

دار العلوم سے مولانا کا ایک تعلق تو تحصیل و تعلیم کا تھا جس کا ذکر گذر چکا ہے دوسرا ضابطہ کا تعلق تعلیم سے فراغت کے اٹھارہ سال بعد ۱۳۶۳ھ میں مجلس شوریٰ کی رکنیت کی شکل میں قائم ہوا جو زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد قدس سرہ، حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی شاہجہاں پوری وغیرہ اساطین علم اور ارباب ورع و تقویٰ کی موجودگی میں یہ انتخاب بتارہا ہے کہ مولانا نعمانی قدس سرہ کے علم، فہم اور دیانت و امانت پر حضرات اکابر کو پورا پورا اعتماد تھا۔ اور اس اعتماد کو مولانا مر
مجروح ہونے نہیں دیا اور مشکل سے مشکل تر حالات میں بھی انھوں نے اپنے شعور
حد تک کسی بھی معاملہ میں دار العلوم کے مفاد پر کسی چیز کو مقدم نہ ہونے دیا۔ یہ
مولانا مرحوم کے مشورے اور رائے کو مجلس شوریٰ کے ارکان اہمیت دیتے تھے۔

اجلاس صد سالہ کے بعد دار العلوم میں جو ہنگامہ رونما ہوا اس موقع پر مولانا مرحوم کے اعتماد ہی پر اکثر ارکان شوریٰ انکے ساتھ رہے اور مولانا کے فیصلوں کی بھرپور تائید و حمایت کی۔

دار العلوم دیوبند کے علاوہ دار العلوم ندوۃ لکھنؤ اور دیگر بہت سارے مدارس دینیہ کے رکن اور سرپرست اور نگراں رہے۔ رابطہ عالم اسلامی سعودی عرب کے بھی رکن رکین تھے اور جب تک سفر کے لائق رہے اس کے اجلاس میں شرکت بھی کرتے تھے۔

ان علمی و ملی اداروں کے علاوہ مسلم مجلس مشاورت سے بھی مولانا کا بنیادی تعلق تھا۔ اور اس کی تشکیل و تاسیس کی جدوجہد میں براہ راست شریک رہے۔ چنانچہ اس مجلس کے قیام کے تحت لکھتے ہیں

> "اس مجلس کا بنیادی تخیل ایک پرانے نیشنلسٹ لیڈر ڈاکٹر سید محمود کی طرف سے ان دنوں سامنے آیا جبکہ جنوری ۱۹۶۴ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ تین صوبوں میں پھیلی ہوئی چار سو میل کی پٹی میں اس درجے کا بھیانک مسلم کش فساد ہوا کہ جس کا کوئی تصور انسانوں کی بستی میں نہیں کیا جاسکتا ڈاکٹر صاحب کا تخیل سامنے آیا تو دل نے اسے قبول کیا، یہ نہایت تعمیری ہونے کے ساتھ ایک انقلابی تخیل بھی تھا۔ دل و دماغ نے جب اس سے اتفاق کیا تو اپنی افتاد طبع کے مطابق اسے اوڑھ ہی لیا اور شعور کی حد تک آخرت کے اجر و ثواب کی امید میں اوڑھا۔" (ص ۹۳)

لیکن بعد میں اس مجلس سے وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں جو اس کے ابتدائے قیام میں

قائم کی گئی تھیں اور تجربے نے بتادیا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں کوئی خالص مسلم سیاسی تنظیم بار آور نہیں ہوسکتی(۱)۔ پھر اس کے لیڈروں نے بھی اجتماعی کاموں میں جس صلاحیت اور کردار کی بلندی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا مظاہرہ نہیں کیا تو مولانا اس سے دل برداشتہ ہوگئے اور اپنے آپ کو اس سے بے تعلق کرلیا۔

ابتداء میں مولانا جمیعتہ علماء ہند سے بھی وابستہ رہے اور اپنے احوال و ظروف کے اعتبار سے جمیعتہ کے کاموں میں عملی حصہ بھی لیتے رہے۔ لیکن بعد میں وہ اپنے تقریری و تحریری کاموں میں اس طرح منہمک ہوگئے کہ جمیعتہ سے یہ وابستگی باقی نہ رہ سکی البتہ جمیعتہ کے اکابر سے گہرے تعلقات ہمیشہ استوار رہے۔

انفرادی اور ذاتی طور پر مولانا مرحوم کے جن شخصیتوں سے گہرے روابط اور تعلقات تھے ان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی دامت برکاتہم سرفہرست ہیں اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی بھی مولانا مرحوم پر بھرپور اعتماد کرتے تھے اور ان کے مشوروں کو بڑے اہمیت دیتے تھے۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم پر بھی مولانا مرحوم کو بہت زیادہ اعتماد تھا اور انکے فہم، تدبر، سمجھ بوجھ اور ورع و پرہیزگاری کے بڑے معترف تھے۔ حضرت مہتمم صاحب کا مدارس کے انتظام و انصرام سے بظاہر کوئی عملی تعلق نہیں تھا اس کے باوجود مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے ان کے ذاتی اوصاف و کمالات کی بنا پر دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کے لئے مجلس شوریٰ کے ارکان میں سے انہیں کا نام پیش فرمایا۔ مولانا کی اس تجویز پر دارالعلوم دیوبند کے بعض قدیم اور بڑے اساتذہ نے دوران گفتگو خود بندہ سے اظہار حیرت کیا لیکن واقعات یہ بتاتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی یہ تجویز کس قدر درست تھی۔ جاننے والے جانتے ہیں ہنگامہ فرو ہوجانے کے بعد مجلس شوریٰ کی نگرانی اور حضرت مہتمم صاحب کے انتظام و انصرام کے تحت دارالعلوم نے جب اپنا سفر شروع کیا تو اس کی راہ میں کیسی کیسی اڑچنیں آئیں کیسے کیسے کٹھن حالات سے دوچار ہونا پڑا، خارجی اور داخلی فتنوں نے دارالعلوم کے تعلیمی و انتظامی ماحول کو کس طرح تاراج کرنا چاہا مگر حضرت مہتمم صاحب عزیمت کا پہاڑ بن کر ان کے سامنے کھڑے ہوگئے اور اپنے حسن تدبر اور خداداد صلاحیتوں سے دارالعلوم کی کشتی کو ان طوفانی تھپیڑوں سے اس طرح محفوظ و سلامت باہر نکال لائے کہ اسے سوچ کر بھی حیرت ہوتی ہے اور

---

(۱) [الفرقان] مجلس مشاورت کوئی سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ یہاں مصنف محترم نے سیاسی کا لفظ شاید بہت وسیع معنوں میں استعمال کردیا ہے۔

دل پکار اٹھتا ہے کہ حضرت مولانا نعمانی قدس سرہ کی یہ تجویز بلاشبہ الہامی تھی۔

حضرت مولانا نعمانی نوّر اللہ مرقدہ کی ایک اور صفت جس سے بندہ بیحد متاثر ہوا وہ ان کی آخرت کی جوابدہی کی فکر ہے۔ دارالعلوم کے اسی ہنگامہ کے دور میں بندہ کو مولانا سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ اور ہنگامہ سے نپٹنے سے متعلق طویل طویل گفتگو کی بھی نوبت آئی مگر مولانا کو کبھی آخرت کی جوابدہی کے فکر سے خالی نہیں پایا جبکہ ایسے معاملات میں عام طور پر اچھے دیندار اور پرہیزگار لوگ بھی تساہل سے کام لے لیا کرتے ہیں۔

اسی طرح مولانا کی دوسری خصوصیت جس سے بندہ بہت متاثر ہوا وہ حق ظاہر ہو جانے کے بعد اپنی رائے اور موقف سے رجوع ہے۔ اس سلسلے میں خود بندہ کے ساتھ ا آیا۔ دارالعلوم ہی سے متعلق ایک کام تھا۔ مولانا مرحوم کی رائے تھی کہ یہ کا اور فرماتے تھے کہ اگر میری صحت اجازت دیتی تو خود میں اس کام کو انجام دیتا لیکن بناء پر یہ کام وہ مجھ سے لینا چاہتے تھے اس سلسلے میں انھوں نے حضرت مہتمم دوسرے اکابر سے گفتگو بھی فرمائی تھی اور ان بزرگوں کے ذریعہ اپنی رائے بلکہ حکم سے ن ں بھی کر دیا مگر اس بارے میں میری رائے یہ تھی کی وقتی طور پر اگرچہ یہ کام دارالعلوم کے لیے مفید ہو جائے مگر بعد میں اس کے اثرات نہایت نقصان رساں ہونگے اس لئے میں اس کام کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا مگر حضرت مولانا مرحوم کو اس پر اصرار تھا۔ بالآخر انھوں نے اس پر گفتگو کے لئے مجھے لکھنؤ طلب کیا۔ میں حاضر ہو گیا تو انھوں نے اپنی بات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی اور اس کام کی افادیت و ضرورت کو بڑے مؤثر انداز میں میرے سامنے رکھا، خاموشی اور توجہ سے مولانا کی پوری بات سننے کے بعد میں نے مؤدبانہ عرض کیا کی اگر یہ اکابر کا حتمی فیصلہ ہے اور اس بارے میں اب کسی گفت و شنید کی گنجائش نہیں ہے تو بندہ اس کام کے لئے تیار ہے لیکن اگر اس سلسلے میں ابھی غور و فکر کی کچھ گنجائش ہے تو بندہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ حضرت مولانا نے زیر لب تبسم فرماتے ہوئے کہا جب تک کوئی کام کر نہ لیا جائے اس میں غور و فکر کی گنجائش تو رہتی ہی ہے کہو تمہارا اس سلسلہ میں کیا موقف ہے۔ میں نے مختصر طور پر اپنی رائے بیان کر دی جسے سنکر وہ ایک دم خاموش و ساکت ہو گئے، ان کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہیں۔ اس سکوت کے تھوڑی دیر بعد فرمایا کہ مولوی صاحب تمہاری بات بھی غور طلب ہے۔ اچھا اس وقت جاؤ، صبح ناشتہ پر گفتگو ہو گی۔ میں حسب حکم ناشتہ کے وقت حاضر ہو گیا اور مولانا کے کمرے میں پہنچا تو مجھے دعائیں دیں اور بار بار دعائیں دیں اور فرمایا

کہ بسااوقات بعض باتیں اس طرح دل دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں کہ دوسرے پہلو کی جانب توجہ ہی نہیں جاتی۔ جزاک اللہ تم نے دوسرے پہلو کو بھی سامنے کردیا۔ میں نے اس مسئلہ پر رات کو کئی بار غور کیااور بالآخراس نتیجہ پر پہنچاکہ تمہاراخیال صحیح ہے۔

میں مولانا کے اس طرز عمل سے بیحد متاثر ہوا کہ ایک فیصلہ کو جس پر وہ تقریباً تین چار ماہ سے منشرح تھے کس طرح ایک اپنے سے ہر حیثیت سے کمتر کی رائے پر بدل دیا۔ آج جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے ان کی یہ عظیم تر ادائیں بار بار یاد آرہی ہیں اور زبان پر یہ دعائیہ مصرع جاری ہے ع

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

حضرت مولانا نعمانی کی وفات بلاشبہہ پوری امت کے لیے ایک سانحہ ہے اور ہم میں سے ہر شخص پر ان کا حق ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق انہیں ایصال ثواب کرے۔

اللهم اكرم نزله ووسع مدخله وابدله داراً خيراًمن داره واهلاً خيراً من اهله ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس وباعد بينه و بين خطاياه كما باعدت بين المشرق والمغرب۔ اللهم لاتحرمنا اجره ولا تفتنا بعده۔

یوں تو عالم اسلام کا ہر فرد اس حادثے پر مستحق تعزیت ہے لیکن دارالعلوم دیوبند کے خدام خاص طور پر حضرت مولانا مرحوم کے اہل وعیال کی خدمت میں پیغام تعزیت پیش کرتے ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو مقعد صدق میں پیہم ترقیٔ درجات عطا فرمائیں، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشیں اور انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ تعلیمات وہدایات کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے ہم سب کو اس عمل پیرا ہونے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین۔

(دارالعلوم مئی، جون ۱۹۹۷ء)

☆☆☆

"امپیکٹ انٹر نیشنل"۔ لندن

جناب ایم۔ ایچ۔ فاروقی

ایک شخصیت نہیں، ایک ادارہ

AN INSTITUTION NOT AN INSTITUTION MAN

[ذیل کا تعزیتی مضمون مؤقر انگریزی ماہنامہ " امپیکٹ انٹر نیشنل" (لندن) کا ترجمہ ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ذہن میں یہ بات رکھنا مناسب ہوگی کہ صاحب مضمون کا تعلق پاکستان سے ہے اور ساتھ ہی جماعت اسلامی کے حلقے سے۔ مضمون پر ان دونوں رشتوں کا اثر اگر نمایاں ہے تو وہ ایک قدرتی بات ہے۔ یہ اثر خاص طور پر کانگریس، مسلم لیگ، مسٹر جناح، گاندھی جی اور جمعیۃ العلماء کے تذکرہ میں زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ بہت سے قارئین کے لئے اس تذکرہ کا انداز قابل اختلاف بلکہ کچھ ناخوشگوار بھی ہو سکتا ہے۔ خود ہمیں بھی اس میں ایک حد تک یک طرفہ پن محسوس ہوتا ہے تاہم یہ ایک زاویۂ نظر اور نقطۂ نظر ہے۔ اور ہمارے یہاں تو زاویہ ہائے نظر (خاص کر کانگریس اور مسلم لیگ کے معاملے میں) یک طرفہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ اسلئے اس کے مِن وعَن سامنے آنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے۔

نقطۂ نظر کی بات سے الگ جہاں کچھ واقعاتی نوعیت کی غلطیاں یا غلط فہمیاں ہمیں نظر آئی ہیں وہاں نوٹ دے کر اشارہ کر دیا گیا ہے۔ نوٹس کے علاوہ ذیلی سرخیاں بھی تمام تر الفرقان ہی کی قائم کردہ ہیں۔]

وہ سلطنت برطانیہ کی بالادستی کا زمانہ تھا۔ شمالی ہندوستان کے ضلع مراد آباد کا کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈبلیو۔ جے۔ ای۔ لپٹن (W.J.E.LIPTON) قصبہ سنبھل کے دورہ پر تھا۔ اس موقع پر اس نے سنبھل کے جن عمائدین سے ملاقات کی ان میں قصبہ کے ایک معزز

زمیندار، خوش حال تاجر اور مقامی میونسپل بورڈ کے ممبر صوفی احمد حسین بھی تھے۔ "لپٹن صاحب" کو یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ صوفی صاحب نے اپنے کسی بیٹے کو تعلیم کے لئے مقامی ہائی اسکول نہیں بھیجا ہے۔ اس نے صوفی صاحب سے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ اپنے بیٹوں کو یا کم از کم تیسرے صاحبزادے کو اسی سال اسکول میں داخل کرادیں[۱]۔ لپٹن صاحب نے کہا کہ وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خاص طور پر ہدایت کردیں گے کہ یہ بچہ پانچ سال میں ہائی اسکول ضرور پاس کرلے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اس کے بعد وہ اس بچہ کو نائب تحصیلدار بنادیں گے۔ یہ ایک بہت ہی پرکشش تجویز تھی کیونکہ نائب تحصیلدار کے عہدہ پر براہ راست تقرری اس وقت کسی ہندوستانی کے لئے ترقی کر کے بلند ترین سرکاری عہدہ تک پہونچ جانے اور بالآخر "خان بہادر" کا اعزاز حاصل کرلینے کی گویا پکی ضمانت تھی۔ لیکن صوفی احمد حسین صاحب نے خوبصورتی کے ساتھ لپٹن صاحب کو یہ بتادیا کہ وہ اپنے بیٹوں کو صرف دینی تعلیم دلوانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ قبر میں بھی ان کے کام آئیگی۔

وہ بچہ جس کے لئے انگریز کلکٹر نے یہ خصوصی پیشکش کی تھی بارہ سال کے محمد منظور تھے جو اس وقت تک عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کیلئے سنبھل ہی میں ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں جاتے رہتے تھے۔ نو برس بعد وہ دارالعلوم دیوبند سے باقاعدہ فارغ ہوگئے۔ دارالعلوم دیوبند صرف ایک عظیم الشان دینی درسگاہ ہی نہیں بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کا ایک اہم مرکز بھی تھا۔ دیوبند میں اپنے زمانۂ طالبعلمی (۱۹۲۴ تا ۱۹۲۶ء) کے دوران انھوں نے اپنے وقت کے جلیل القدر محدث علامہ انور شاہ کشمیریؒ (۱۸۷۴ تا ۱۹۳۳ء) سے علم حدیث حاصل کیا۔ اپنے آخری سال کے سالانہ امتحان سے فارغ ہوکر وہ اسی دن اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کی درخواست کی۔ کچھ پس وپیش کے بعد بالآخر درخواست کو شرف قبول ملا اور دوسرے ہی دن وہ دارالعلوم سے رخصت ہوکر وطن روانہ ہوگئے۔ اگرچہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے اس لائق ترین شاگرد کی رہنمائی کے لئے بہت زیادہ عرصہ حیات نہیں رہے تاہم دارالعلوم دیوبند کا فیض انہیں تازندگی حاصل رہا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد "مولوی محمد منظور نعمانی" اپنے وطن سنبھل کے مدرسہ محمدیہ میں مدرس ہوگئے۔

---

[۱] (الفرقان) یہاں یہ بتادینا مناسب ہوگا کہ صوفی صاحب سے یہ مسٹر لپٹن کی پہلی ملاقات نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے آشنا تھے۔

تحریک خلافت اور ترک موالات

وہ دور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا نازک دور تھا۔ خلافت عثمانیہ اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں کے بوجھ تلے دم توڑ رہی تھی۔ برطانوی حکومت اپنی اس یقین دہانی سے پھر گئی تھی جو برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج (۱۸۶۳۔۱۹۴۲ء) کے ذریعہ مسلمانوں کو دی گئی تھی کہ ان کے جنگی مقاصد میں ترکی سلطنت کو اس کے قدیم تاریخی مقامات سے محروم کرنا ہرگز شامل نہیں ہے۔ لیکن مرکزی خلافت کمیٹی نے خلافت کو ایک مقدس ادارے کی حیثیت سے قائم اور برقرار رکھے جانے کے لئے اپنی تحریک کو ختم کردینے سے انکار کردیا تھا۔ مگر اس دوران میں جبکہ تحریک خلافت نے مسلمانوں میں ہلچل مچارکھی تھی اور انگریزی حکومت کے تئیں بے اطمینانی کی فضا پیدا کردی تھی، اس تحریک کو ایک نئی تحریک (NON-COOPERATION) نے آدبوچا جسے موہن داس کرم چند (۱۹۴۸ء) اچانک میدان میں لے آئے تھے، گاندھی کی اس تحریک کا علانیہ کے ساتھ کی گئی دوہری ناانصافیوں کے ازالہ کے لئے انگریزوں پر دباؤ ڈالنا تھا۔ جن میں ایک ناانصافی تو یہ تھی کہ برطانوی حکومت مسلمانوں سے کئے گئے اپنے اس وعدہ سے منحرف ہوگئی تھی کہ ترکی کو اس کے مقدس تاریخی مقامات سے محروم نہیں کیا جائیگا اور دوسرے یہ کہ جلیانوالہ باغ قتل عام کو روکنے میں حکومت ناکام رہی تھی نیز اس سانحہ کے ذمہ دار جنرل ڈائر کو حکومت کی طرف سے کوئی سزا بھی نہیں دی گئی۔

خلافت کمیٹی کے ذمہ داروں کیلئے یہ کیسے ممکن تھا کے وہ گاندھی کی طرف سے ملنے والی اس غیر مترقبہ حمایت کو قبول نہ کرتے اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اس جدوجہد میں شریک نہو جاتے جو ان کے اپنے ہی مطالبات یعنی خلافت کی بحالی اور ملک کی آزادی کیلئے برپا کی گئی تھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ گیا اور مسلمان اپنی تحریک خلافت کیساتھ میدان میں یکہ و تنہا رہ گئے ۔ کیونکہ گاندھی جی نے جس طرح اچانک تحریک خلافت کی حمایت میں ترک موالات کی مہم شروع کی تھی اسی طرح آناً فاناً مسلمانوں سے کسی صلاح و مشورہ کے بغیر اس تحریک کو واپس لینے کا اعلان بھی کردیا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں شمالی ہندوستان کے قصبہ چوراچوری میں ایک ہجوم نے ایک پولیس اسٹیشن کو آگ لگادی تھی جس میں ۲۴ پولیس والے زندہ جل گئے تھے تشدد کا یہ تنہا واقعہ گاندھی جی کے لئے پوری تحریک کو لپیٹ کر رکھدینے کا بہانہ بن گیا۔ چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے

ایک قراداد منظور کی جسمیں کہا گیا کہ اس وقت ملک کی فضا عدم تشدد پر مبنی کسی سول نافرمانی کی تحریک کیلئے سازگار نہیں ہے اسلئے تحریک ترک موالات کو موقوف کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔

اس دوران میں ہزاروں مسلمان ترک موالات کی اس مہم میں بے دریغ قربانیاں دے کر بڑا نقصان اٹھاچکے تھے۔ اسکے بر خلاف ہندوؤں نے اس تحریک کا ساتھ دینے میں پورے بخل اور احتیاط سے کام لیا تھا۔ جہاں ایک طرف علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا نظام مہینوں تک ہنگامہ آرائی کی نظر رہا وہیں دوسری طرف بنارس ہندو یونیورسٹی میں حالات نارمل رہے اور انگریزی حکومت کے ساتھ اس کا تعاون بھی جاری رہا۔ بہر حال گاندھی کو ترکی اور پنجاب میں انگریزی حکومت کی غلط کاریوں کی تلافی کرانے کے اپنے عہد وپیان سے پھر جانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی بلکہ وہ ہندوستان کے لئے 'سوراجیہ' حاصل کرنے کے اپنے مبینہ مقصد سے بھی دستبر دار ہوگئے۔

صرف محمد علی جناح

جلیانوالہ باغ کے قتل عام کا سانحہ ۱۹۱۹ء میں پیش آیا تھا لیکن گاندھی کو ترک موالات کا خیال اس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع نہیں کردی۔ مسلمانوں نے بھی نہیں سوچا کہ گاندھی جی کو جلیانوالہ باغ کی یاد آخر اتنے دنوں کے بعد کیوں آئی اور کیوں انہوں نے اپنی تحریک کو تحریک خلافت کے ساتھ جوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ دراصل گاندھی کا ایک ایسا خاصہ تھا جسے مسلمان بہت دیر میں اور بڑی مشکل سے سمجھ سکے۔ اس وقت کی مسلم قیادت میں صرف محمد علی جناح (۱۸۷۶۔۱۹۴۸ء) ایک استثنا تھے۔ انہیں ترک موالات کے مقاصد سے تو دلچسپی رہی لیکن گاندھی اور ان کے طریقۂ کار کے بارے میں وہ مشکوک تھے۔ (جناح اسوقت آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں کے ممبر تھے) بہر حال تحریک خلافت، جسے گاندھی پہلے ہی چلتا کر چکے تھے، بالآخر ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو اس وقت اپنے انجام کو پہونچ گئی جبکہ فری میسن غلبہ والی نئی انقرہ حکومت نے آخری عثمانی خلیفہ کو معزول کر کے خلافت کے خاتمہ کا اعلان کردیا۔

خاتمہ خلافت کے اثرات

ان تمام واقعات کا مسلمانوں کی نفسیات اور مسلم سیاست پر گہرا اثر پڑا تھا انہیں

خلافت کے صدمہ سے نکل آنے میں ایک دہائی سے بھی زیادہ عرصہ لگا۔ اس دوران میں مسلم سیاسی محاذ پر جو خاموشی چھائی رہی اس سے فائدہ اٹھاکر قادیانیوں اور آریہ سماجیوں نے مسلمانوں پر یلغار شروع کردی اور انہیں انتہائی فتنہ انگیز بلکہ تکفیری مباحثوں اور مناظروں میں الجھا دیا۔ قادیانی فرقہ مسلمانوں میں ایک اصلاحی تحریک کا دعویدار بن کر ابھرا تھا اسی طرح آریہ سماجیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ہندوؤں میں اصلاح کے علمبردار ہیں مگر دونوں کا اصل نشانہ اسلام تھا۔ ممکن ہے اس فتنہ انگیزی میں ان استعماری طاقتوں کا ہاتھ ہو جو مسلمانوں کو مسلم سرزمین خصوصاً فلسطین اور نام نہاد مشرق وسطیٰ میں سامراجی تسلط کو چیلنج کرنے کی سزا دینا چاہتے تھے۔ سامراجی حکمت عملی کا ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ما‍ٔ منافرت کے بیج بو دیئے جائیں اور اسطرح ان دونوں قوموں کو حصول آزا جدوجہد سے باز رکھا جائے۔

ادھر جزیرہ نمائے عرب میں جاری سامراجی ریشہ دوانیوں نے موجود دیوبندی بریلوی نزاع کی خلیج کو اور زیادہ گہرا کردیا تھا۔ انگریز جزیرۂ عرب میں ‌‌ چل رہا تھا۔ ایک طرف اس نے شریف حسین (۱۸۵۴۔۱۹۳۱ء) کو اپنا آلہ کار بنایا تھا تو دوسری طرف عبدالعزیز بن سعود (۱۸۸۰۔ ۱۹۵۳) کی پشت پناہی بھی کر رکھی تھی جبکہ ہندوستان میں دیوبندی اور بریلوی انہی دونوں مہروں کی حمایت اور مخالفت میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔

آج کی طرح اسوقت کی مسلم دنیا میں بھی عوامی رائے اور مسلم حکمت عملی عموماً ناقص معلومات بلکہ بعض اوقات غلط اور گمراہ کن اطلاعات کی بنیاد پر استوار ہوا کرتی تھی۔ دیوبندیوں نے عبدالعزیز ابن سعود کی حمایت کی انھوں نے شریف حسین کو خلافت عثمانیہ کے ایک باغی کی حیثیت سے دیکھا جبکہ عبدالعزیز بن سعود نجات دہندہ قرار پائے۔ دراصل دیوبندی طبقہ آل سعود کے مرشد اور دینی رہنما شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۹۲ء) کے علمی مقام و مرتبہ سے بہت متاثر تھا[۱]

دوسری طرف بریلوی (جو مولانا احمد رضاخاں بریلوی سے منسوب کئے جاتے ہیں) بزرگان دین کے مزارات سے والہانہ عقیدت رکھنے کی بنا پر اس بات سے سخت نالاں اور برہم

---

[۱] (الفرقان) نہ معلوم یہ خیال کیونکر پیدا ہوا ہے۔ ورنہ واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ زیادہ تفصیل کے لئے خود حضرت مرحوم (مولانا نعمانی) کی کتاب "شیخ محمد بن عبدالوہاب" دیکھنا چاہیے۔

تھے کہ حجاز پر قبضہ کے بعد عبدالعزیز ابن سعود نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی پیروی میں مقامات مقدسہ میں واقع قبروں اور مزاروں پر بنے قبوں کو مسمار کر دیا تھا۔ اگر چہ دیوبندی بھی اس معاملے میں سعودیوں کی طرف سے کی جانے والی زیادتی کی حمایت نہیں کرتے تھے، تاہم اس قضیہ سے دیوبندی بریلوی تنازعہ بھڑک اٹھا۔

مولوی منظور میدان عمل میں

اسلام پر قادیانیوں اور آریہ سماجیوں کی یورش اور دیوبندی، بریلوی اختلافات نے نوجوان اور حال ہی میں فارغ ہوئے مولوی محمد منظور کی بہترین مناظرانہ صلاحیت کو اجاگر کر دیا۔ ان مناظروں میں انہیں کامیابی بھی خوب ملی۔ لیکن جلد ہی انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ مناظروں کی افادیت عارضی اور محدود ہے اور اسکے نتیجہ میں تنازعہ محض ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے مشن کو مستقل اور ملک گیر پیمانے پر جاری رکھنے کے لئے ''الفرقان'' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ نکالنا شروع کیا۔

''الفرقان'' کا پہلا شمارہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا تھا۔ درمیان میں چار ماہ کے مختصر وقفہ کو چھوڑ کر گذشتہ ٦۳ سال سے ''الفرقان'' نہ صرف یہ کہ مستقل شائع ہو رہا ہے بلکہ بر صغیر ہند و پاک میں اسلام کی ترجمانی میں اس نے ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

''الفرقان'' نے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے چند مجاہد علماء کی زندگی اور ان کی خدمات پر خصوصی شمارے شائع کر کے جلد ہی اپنا نقش جما دیا تھا۔ ان خصوصی شماروں میں ''الفرقان'' کا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نمبر مجدد الف ثانی نمبر اور حضرت شاہ ولی اللہ نمبر سر فہرست ہیں۔ تحریک خلافت کے خاتمہ سے پیدا ہو جانے والے خلا میں ''خاکسار'' نام کی ایک نیم عسکری تحریک بھی اٹھی تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ علامہ عنایت اللہ مشرقی (۱۸۸۸ء۔ ۱۹٦۳ء) کی اٹھائی ہوئی یہ تحریک نظم و ضبط کے اپنے مخصوص مزاج و انداز کی بنا پر مسلمانوں کے لئے زبردست کشش کا باعث بننے لگی۔ لیکن چونکہ اس تحریک کا اصل محرک اسلام کے بجائے فاشزم کا وقتی عروج تھا اس لئے اسکا نتیجہ مسلمانوں کی توجہات کو طاقت و شوکت کے لاحاصل مظاہرے اور خواہ مخواہ کی محاذ آرائی میں لگا دینے کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔

مولانا محمد منظور نعمانی نے ۱۹۳۸ء میں ''الفرقان'' کا ایک خصوصی شمارہ اسی خاکسار تحریک کے تنقیدی جائزہ کے لئے بھی شائع کیا تاکہ وہ اس تحریک کے نظریات، اسکا لائحہ عمل اور مسلمانوں کے لئے اس کے سیاسی مضمرات پوری طرح واضح کر سکیں۔

ہندوستان ایک نئے سیاسی عہد کے دروازے پر

۱۹۳۵ء میں "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" کی منظوری سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ انگریزوں نے اپنی سلطنت کے نقشہ میں تبدیلی کا عمل شروع کر دیا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی اس لئے انگریزوں کی سیاسی وراثت بلا شبہ اسی کو منتقل ہونا تھی۔ کانگریس کی بنیاد دسمبر ۱۸۸۵ء میں ایک ریٹائرڈ انگریز آفیسر اے۔ او۔ ہیوم (۱۸۲۹ء۔ ۱۹۱۲ء) نے اصلاً ایک سماجی تنظیم کی حیثیت سے رکھی تھی۔ لیکن جلد ہی اسے سیاسی جماعت میں تبدیل کر دیا گیا۔ کانگریس کے پہلے صدر ڈبلیو۔ سی۔ بنرجی نے یہ انکشاف کیا تھا کہ کانگریس کی یہ قلبِ ماہیت گورنر جنرل ڈفرن (۱۸۲۶ء۔ ۱۹۰۲ء) کے ایماء پر عمل میں لائی گئی تھی مزید نے مسٹر ہیوم پر یہ پابندی بھی عائد کر دی تھی کہ جب تک وہ ہندوستان "کانگریس اسکیم" سے ان کے تعلق کو ظاہر نہیں کیا جائیگا۔

ڈفرن اور بنرجی کی ذریات کے باہمی رشتوں میں اتار چڑھاؤ آتے رہے ایک دوسرے سے قطع تعلق نہیں کیا۔ کانگریسی قیادت کا یہ مخلوط اینگلو انڈین کلچر انگریزوں کے لئے بہت بڑے اطمینان کا باعث تھا۔ مثال کے طور پر جواہر لال نہرو (۱۸۸۹ء۔ ۱۹۶۴ء) انگریز زیادہ تھے، ہندوستانی کم۔ بلکہ گاندھی جیسے ہندو بھی محض مذہبی رسومات کی حد تک ہی ہندو تھے ورنہ ان کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظریات کلیتاً مغربی تھے۔

مسلمانوں پر یہ بات پوری طرح واضح ہوتی جارہی تھی کہ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے ذریعہ صوبائی خود مختاری کا جو راستہ کھلا ہے وہ بالآخر ملک کو کانگریسی اقتدار یا دوسرے الفاظ میں ہندو اقتدار تک لیجانے والا ہے۔ لیکن مسلمان جو ابھی تک خلافت کے صدمہ سے سنبھل نہیں سکے تھے، اپنے مستقبل کے لئے کوئی لائحہ عمل متعین کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ بھی جو ۱۹۰۶ء میں کم و بیش کانگریس جیسے حالات میں ہی وجود میں آئی تھی اس وقت تک مسلمانوں میں قبول عام حاصل نہیں کر سکی تھی۔ قیام پاکستان کا مطالبہ رسمی حیثیت سے تو ۱۹۴۰ء میں سامنے آیا تھا لیکن اپنے لئے ایک آزاد ثقافتی اور سیاسی نظام کی ضرورت کا احساس مسلمانوں میں گذشتہ صدی کے اواخر سے ہی موجود تھا۔ ماضی قریب میں شاعر اسلام اور فلسفی علامہ اقبال (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء) نے اس مسئلہ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ء اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت میں اٹھایا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت الٰہی (۱۸۹۷ء۔ ۱۹۵۱ء) نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے

ہندوستان کو چار ثقافتی منطقوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تحریروں میں ڈاکٹر عبداللطیف کی پیش کردہ تجویز کو منظور کرنے کی وکالت کی تھی اور ۱۹۳۹ء میں چودھری خلیق الزماں (۱۸۸۹-۱۹۷۳ء) نے مسلم علاقوں کو بقیہ ہندوستان سے علیحدہ کردینے کی تجویز سامنے رکھی تھی۔ اسطرح مسلم رائے عامہ بتدریج پاکستان کے حق میں ہموار ہوتی جارہی تھی۔

مولانا نعمانی کا سیاسی ذہن

لیکن یہاں "نیشنلسٹ" کہے جانے والے مسلمان بھی تھے۔ (اور جو مسلم حقوق کی بات کرتے تھے ان کو "فرقہ پرست" کا طعن آمیز نام دیا جاتا تھا) ان "نیشنلسٹ" (قوم پرست) مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں طبقہ دینی علماء کی تنظیم "جمعیۃ العلماء ہند" تھی۔ ان علماء کے پاس برطانوی حکومت کے خلاف سرفروشانہ جدوجہد کی ایک طویل تاریخ تھی جس کی بناپر وہ انڈین نیشنل کانگریس سے زیادہ قربت اور ہم آہنگی رکھتے تھے۔ چنانچہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے تلخ تجربہ کے باوجود جمعیۃ العلماء نے کانگریسی قیادت پر اعتماد برقرار رکھا۔ مولانا منظور نعمانی کی سیاسی فکر پر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا گہرا اثر تھا۔ چنانچہ وہ بھی جمعیۃ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مولانا اگرچہ جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کے رکن نہیں تھے لیکن ہندوستانی سیاست سے ان کی واقفیت کی بناپر جمعیۃ کے اکابرین ان کی بڑی قدر کرتے تھے یہانتک کہ جمعیۃ العلماء کے اہم جلسوں میں انہیں خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔

۱۹۳۶ء کے صوبائی الکشن کے نتیجہ میں ہندوستان کے کل گیارہ صوبوں میں سے سات میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں اور یہ بات تقریباً طے شدہ تھی کہ آزادی ملنے کی صورت میں ملک کا اقتدار انڈین نیشنل کانگریس کے ہاتھ میں آئیگا۔ جمعیۃ العلماء ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے شرعی نظام قائم کرنا چاہتی تھی۔ مولانا نعمانی کے بقول جنگ آزادی میں کانگریس کے اشتراک عمل کا اصل سبب یہی تھا[1]۔ لیکن جمعیۃ العلماء، کوئی عوامی جماعت نہیں تھی صرف علما پر مشتمل ایک مخصوص مجلس تھی اور اسے خوب اندازہ تھا کہ تحریک آزادی میں کانگریس کی حمایت کرنے کے باوجود وہ کانگریس کی پالیسیوں پر اثرانداز نہیں ہوسکتی بلکہ اس وقت کی جمعیۃ کے تمام اراکین کو کانگریس میں شامل کرکے بھی یہ مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس

[1] (الفرقان) اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی جمیعۃ العلماء کو ان نیشنلسٹ مسلمانوں میں شامل کرنا جو گویا مسلم حقوق کی بات پسند نہیں کرتے تھے، ایک عجیب سی بات ہے۔

صورتحال کے پیش نظر جمیعۃ کی ایک اہم شخصیت اور نائب امیر شریعت بہار مولانا محمد سجاد نے ۱۹۴۰ء میں یہ تجویز پیش کی کہ جمیعۃ العلماء کی سرپرستی میں مسلمانوں کی جماعت قائم کی جائے جسکے ممبران کیلئے کانگریس کی ممبر شپ حاصل کرنا بھی ضروری قرار دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس راستے سے کانگریس کے اندر پہونچ کر جمیعۃ العلماء کیلئے کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونا ممکن ہو جائے گا۔

ایک یادگار واقعہ

اس زمانے میں مولانا نعمانی مستقل دہلی آتے رہتے تھے [۱] انہیں مولانا سجاد کی تجویز اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے فوراً ہی دیوبند کے قریب واقع تھانہ بھون جاکر مولانا تھانوی کی خدمت میں حاضر ہونے اور انہیں اس تجویز سے آگاہ کرانے کا ارادہ اشرف علی تھانوی (۱۸۶۴۔۱۹۴۳ء) علماء دیوبند کی محترم ترین شخصیات میں ہندوستانی سیاست کے تعلق سے جمیعۃ العلماء کی فکر سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ مسلم لیگ کی حمایت کا تھا اس لئے جمیعۃ کی طرف سے ایک عوامی جماعت کی تجویز پر انکی تائید حاصل کر لینا یقیناً ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ تھانہ بھون پہونچ کر مولانا منظور نعمانی نے جب اس تجویز کی تفصیلات مولانا تھانوی کے سامنے پیش کیں تو بظاہر وہ اسکی تائید پر آمادہ نظر آئے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر انہیں یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ ایسی عوامی جماعت کی تشکیل اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر ثابت ہوگی تو وہ بذات خود جمیعۃ اور کانگریس دونوں میں شامل ہونے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن وہ اس معاملہ پر جمیعۃ العلماء کے اکابرین سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔

مولانا منظور نعمانی فوراً دہلی کیلئے روانہ ہو گئے اور اسی دن شام کو جمیعۃ العلماء کے نائب صدر [۲] مفتی کفایت اللہ (۱۸۷۵ء۔۱۹۵۲ء) اور مولانا سجاد کی معیت میں تھانہ بھون واپس آگئے۔ دوسرے دن صبح کی ملاقات میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا (متوفی ۱۹۸۲ء) مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب (متوفی ۱۹۸۳ء) اور مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا ظفر احمد تھانوی (۱۸۹۳ء۔۱۹۷۴ء) بھی شریک ہوئے مولانا منظور نعمانی نے ان

---

[۱] (الفرقان) بریلی سے دہلی کا یہ سفر تقریباً ہر ماہ الفرقان کی طباعت کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ [۲] واقعہ میں صدر۔ ۱۹۴۰ء تک مفتی صاحب ہی صدر تھے۔ (الفرقان)

حضرات کے سامنے مولانا سجاد کی اس تجویز کی تفصیلات بیان کیں جسکے ذریعہ جمیعۃ العلماء کو توقع تھی کہ وہ کانگریس کی پالیسیوں پر اثرانداز ہو سکے گی اور آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاسکے گا۔ اس پر مولانا ظفر احمد تھانوی نے کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے کے معاملے میں بعض فقہی اشکالات اٹھاتے ہوئے فرمایا کہ فقہ حنفی کا ایک صریح مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان کسی جنگ کے فریقین میں سے کسی ایک فریق کی بھی حمایت اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ایسا کرنا اعلاء کلمۂ اسلام کیلئے ضروری نہو۔ وگرنہ انہیں کسی بھی ایسے نزاع میں فریق بننے کی اجازت نہیں ہے۔ اسکے جواب میں مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ اس وقت درپیش مسئلہ کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان کانگریس کی حمایت کریں یا نہ کریں آزادی کے بعد ملک میں جو بھی حکومت قائم ہوگی وہ جمہوری ہوگی اسلامی حکومت نہیں ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آزادی کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو جائیں اور حصول آزادی کے بعد ملک کے معاملات میں ان کا کوئی عمل دخل نہو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ اس جدوجہد میں شریک ہوں اور مستقبل کے ملکی نظام میں بھی شریک اور حصہ دار بنیں۔ انہوں نے کہا کہ جمیعۃ نے اسی دوسرے راستہ کو اختیار کیا ہے۔ مفتی کفایت اللہ نے یہ بات واضح کردی کہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل میں بعض "منکرات" سے بھی سابقہ پڑیگا۔ مثلاً کانگریس کمیٹیوں کے اجلاس میں خواتین کے ساتھ شرکت کرنا لیکن اس طرح کے منکرات سے مسلم لیگ کے جلسے بھی پاک نہیں ہوتے اس بناء پر جمیعۃ والے کانگریس کے ساتھ اپنے اشتراک کے سلسلے میں مطمئن ہیں۔

یہ میٹنگ ۳ گھنٹے سے بھی زیادہ وقت تک جاری رہی۔ لیکن اس دوران مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں فرمایا۔ آخر میں انہوں نے اپنے مہمانوں سے فرمایا کہ آپ لوگ اب کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر آرام فرمالیں۔ اس دن مولینا کا روزہ تھا۔ لیکن رات کو اپنے مہمانوں کے کھانے کا اہتمام مولانا نے خود فرمایا۔ مولانا تھانوی کی خاموشی سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اب وہ جمیعۃ کی اس تجویز کی حمایت کے حق میں نہیں رہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ وہ نوجوان عالم مولانا منظور کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے تھے خاص طور پر اس بات سے کہ وہ ہندوستانی مسلم سیاست میں اتنی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

بہرحال بعد میں جمیعۃ العلماء نے اپنی اس تجویز کو خود ہی خیرباد کہہ دیا کیونکہ اس دوران کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے متعصبانہ رویہ کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس سے دوری پیدا

ہونے لگی تھی اور اس کا امکان بہت کم رہ گیا تھا کہ مسلمان کسی کانگریس حامی مسلم جماعت میں شریک ہوں یا اسکی حمایت کریں۔ مولانا منظور نعمانیؒ نے اپنے رسالہ الفرقان میں خود بھی کانگریسی حکومتوں کے اس رویہ پر سخت تنقید کی تھی جو وہ مختلف صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ اپنائے ہوئے تھی۔

مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں شرکت سے معذرت

۳۸ء کے اواخر یا ۳۹ء کے اوائل میں مولانا منظور نعمانی کو مولانا اشرف علی تھانوی کی طرف سے ایک ٹیلی گرام ملا جس میں انہیں تھانہ بھون بلانے کے لئے صرف اس قدر در ج تھا
"تم سے مشورہ کی ضرورت ہے" غالبًا اسکی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کے صدر نوا
خاں (۱۸۸۶ء۔۱۹۵۸ء) نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں یہ گزارش
مسلم لیگ کی حمایت میں ایک بیان جاری کر دیں۔ اس درخواست کی وضاحت
مولانا تھانوی کو بتایا کہ جمعیۃ العلماء ہند اور اسکے صدر مولانا حسین احمد مدنی
۔۱۹۵۷ء) پورے زور شور سے کانگریس کی حمایت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اس کی دعوت دے رہے ہیں جس سے یہ تاثر ملتا ہے۔ کہ انکے نظریہ کو تمام علماء کی حمایت حاصل ہے اور اسکا عام مسلمانوں کی رائے پر بڑا اثر پڑ رہا ہے۔ لہٰذا ہم آپکی خدمت میں یہ درخواست لیکر حاضر ہوئے ہیں کہ آپ اپنی طرف سے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان فرما دیں۔ مولانا تھانوی نے جواب دیا کہ اگرچہ مسلم لیگ کے مقاصد سے انہیں پوری ہمدردی ہے لیکن ابھی اس بارے میں انہیں انشراح نہیں ہے کہ جس طرح کی حمایت ان کی طرف سے مطلوب ہے وہ اسکا اعلان بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ نواب اسمٰعیل خاں نے دریافت کیا کہ آپ کے اطمینان کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ مولانا تھانوی یہ یقین دہانی چاہتے تھے کے مسلم لیگ کی طرف سے کسی بھی صورت میں اسلام کے کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں کی جائیگی۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر آپ لوگوں کو منظور ہو تو میں اپنی طرف سے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں ایک عالم دین کو نامزد کر دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ کے دینی پہلو پر اس عالم کی رائے کو ماننا مسلم لیگ کی قیادت کیلئے ضروری ہوگا۔ اس گفتگو کے بعد نواب اسمٰعیل خاں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح سے مشورہ کیلئے روانہ ہو گئے۔ چند روز بعد وہ اس پیغام کے ساتھ واپس لوٹے کہ مسلم لیگ مولانا اشرف علی

---

(۱)(الفرقان) مولانا مدنی اس وقت صدر نہیں تھے۔ ان کی صدارت ۱۹۴۰ء سے شروع ہوئی تھی۔ البتہ بغیر صدارت کے بھی وہ جمعیۃ کے نہایت مؤثر رکن تھے۔

تھانوی کے نامزد کردہ عالم دین کو ورکنگ کمیٹی میں لینے کے لئے تیار ہے البتہ وہ لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کے مولانا اشرف علی تھانوی کسی ایسے صاحب فہم شخص کو نامزد فرمائیں گے جو سیاسی ذہن رکھتا ہو اور مسلم لیگ کو درپیش مسائل کو سمجھنے کا اہل ہو۔ وہ عالم دین جنہیں مولانا اشرف علی تھانوی مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں اپنی طرف سے نامزد کرنا چاہتے تھے مولانا منظور نعمانی تھے۔ یہ بات مولانا نعمانی کو مولانا ظفر علی تھانوی نے بتلائی۔ انہوں نے کہا کہ حضرت (مولانا اشرف علی تھانوی) آپ کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں اپنی نمائندگی کیلئے نامزد کرنا چاہتے ہیں لیکن مولانا منظور نعمانی نے ان سے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ وہ جمیعۃ العلماء سے وابستہ ہیں اور مسلم لیگ کی پالیسیوں کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔

مولانا مودودی سے ذہنی ربط

لطف کی بات یہ ہے کہ جمیعۃ العلماء کیساتھ اپنی کامل وابستگی کے باوصف مولانا منظور نعمانی رفتہ رفتہ ایک بالکل مختلف مکتب فکر سے قریب ہوتے جارہے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ "النجم" کے دفتر میں ایک نیا دینی ماہنامہ "ترجمان القرآن" ان کی نظر سے گزرا۔ 'النجم' مولانا عبدالشکور فاروقی متوفی ۱۳۸۱ھ۔ کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ ترجمان القرآن جو اس وقت حیدرآباد سے نکلتا تھا مولانا عبدالشکور صاحب کے فرزند مولانا عبدالمومن فاروقی نے مولانا منظور نعمانی کو دکھایا تھا۔ یہ کوئی نیا رسالہ نہیں تھا لیکن اب اسکی ادارت سید ابوالاعلیٰ مودودی ۱۹۰۳۔۱۹۷۹) نے سنبھالی تھی۔ مولانا منظور نعمانی اسی وقت سے ترجمان کے گرویدہ ہوگئے وہ اسلامی اور عصری مسائل پر اس کے مدیر کی غیر معمولی گرفت اور اس کے طاقتور اسلوب تحریر سے بیحد متاثر ہوئے۔ مولانا نعمانی ہر مہینے النجم کے دفتر میں ترجمان القرآن کے نئے شمارہ کی آمد کا بے صبری سے انتظار کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ انتظار انہیں بہت زیادہ عرصہ تک نہیں کرنا پڑا۔ اگلے ہی سال ۱۹۳۴ء میں جب انہوں نے ماہنامہ "الفرقان" جاری کیا تو انہیں ترجمان القرآن تبادلہ میں موصول ہونے لگا تاہم انہوں نے ترجمان القرآن کے پچھلے تمام شمارے بھی حاصل کر لینے کا خاص اہتمام کیا۔ مولانا مودودی جو اپنی معرکتہ الآراء تصنیف "الجہاد فی الاسلام" پر علمی اور سیاسی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرنے کے بعد کافی متعارف ہو چکے تھے مسلمانوں کو درپیش مسائل سے نپٹنے کیلئے کسی جزوی حکمت عملی کے بجائے ایک ہمہ گیر پروگرام کے داعی تھے مولانا منظور نعمانی نے اپنے رسالہ الفرقان میں متعدد مضامین "ترجمان القرآن" کے حوالہ سے شائع کئے اور ان کے ساتھ خط وکتابت شروع کردی۔

دونوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ ان کے رسائل میں جو نظریات پیش کئے جارہے ہیں ان کی ترویج کے لئے ایک باقاعدہ تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

مسئلہ داڑھی اور بالوں کا

لیکن کسی صاحب نے مولانا نعمانی کو بتایا کہ مودودی صاحب کی تحریروں کی عکاسی ان کی ذاتی زندگی میں نظر نہیں آتی، وہ داڑھی بھی نہیں رکھتے۔ پھر کچھ دنوں بعد انہیں مودودی صاحب کی زندگی میں کچھ خوشگوار تبدیلیوں کی اطلاع بھی ملی۔ تاہم مولانا نعمانی جب پہلی بار مولانا مودودی صاحب سے ملے تو انہیں سخت دھکا لگا۔ ان کے سامنے ایک بے داڑھی والا شخص تو نہیں تھا لیکن جو تھوڑی بہت تبدیلی آئی تھی وہ بس برائے نام تھی۔ مودودی مولانا نعمانی کی اس پریشانی کو بھانپ لیا۔ انہوں نے کہا "مولانا! جس دنیا سے میں جہاں سے نکل کر میں آیا ہوں آپ کو اسکی خبر نہیں ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ جاؤں، تبدیلی انشاءاللہ رفتہ رفتہ آئیگی۔"

مولانا منظور نعمانی مودودی صاحب کے افکار اُن کی غیر معمولی ذہانت اور ان کے طاقتور طرز تحریر کے بڑے مداح اور شیدائی تھے۔ وہ مودودی صاحب کے خیالات اور ان کے تجزیوں سے تقریباً پوری طرح اتفاق رکھتے تھے لیکن اس سب کے باوجود مودودی صاحب کی چھوٹی سی داڑھی اور ان کے بالوں کی وضع ان کیلئے پریشانی کا باعث تھی۔ تنہائی کی ایک ملاقات میں انہوں نے مولانا مودودی صاحب سے دریافت کیا کہ۔

"احکام شریعت کے بارے میں آپ کا کیا طرز عمل ہے؟"

"میں اپنے امکان کی حد تک شریعت کی پابندی کرتا ہوں"

"آپ تقلیدِ شخصی کو تو ضروری نہیں سمجھتے لیکن یہ بات تو آپ بھی ضروری سمجھتے ہوں گے کہ جس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے اس کے خلاف نہ کیا جائے؟"

"ہاں! میں اسے ضروری سمجھتا ہوں اور اس سے خروج کو جائز نہیں سمجھتا"

"کیا ایسی داڑھی رکھنا آپ کے نزدیک جائز ہے؟"

"میری رائے میں داڑھی اتنی ہونا ضروری ہے کہ دور سے نظر آئے۔ اور اتنی اگر چھوٹی سی بھی ہے تو حرام یا ناجائز نہیں سمجھتا۔" مودودی صاحب نے اپنی رائے کی تائید میں فقہ حنبلی کی کتاب "مغنی" کا حوالہ دیا۔

"میں نے مغنی نہیں دیکھی ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ داڑھی کو داڑھی جیسا نظر

آنا چاہئے۔ اور آپ کی داڑھی اس سے بہت کم ہے جتنی کو حدیث میں ضروری بتایا گیا ہے۔"

"میرا خیال یہ ہے کہ آپ کی بات صحیح ہے اور مجھے اپنی اصلاح کر لینی چاہئے"

"اور آپ کے بالوں کی وضع؟"

"کیا یہ آپ کے نزدیک "قزع" ہے جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے؟"

"میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ "قزع" ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اسطرح کے بال رکھنا صالحین کے طریقہ کے خلاف ہے اور خاص کر جو لوگ دین و شریعت کی پابندی کے داعی ہوں ان کیلئے ایسی چیزوں کی بالکل گنجائش نہیں ہے" اس پر بھی مودودی صاحب نے فرمایا کہ یہ بات آپ کی ٹھیک ہے۔

آخر میں مولانا نعمانی نے مودودی صاحب سے ان کی ذاتی زندگی کے بعض پہلوؤں کے بارے میں کچھ سوالات کئے اور مودودی صاحب نے بے تکلفی سے ان کے جوابات دیئے۔ اس کے بعد مولانا نعمانی نے اپنا اطمینان ظاہر کر کے مولانا مودودی سے کہا کہ اب آپ جماعت کی تشکیل کے لئے ہم خیالوں کو دعوت دیجئے اور اس کام کے لیئے کوئی تاریخ مقرر کر دیجئے۔

جماعت میں شرکت اور مفارقت

مجوزہ جماعت کی تشکیل کے لیئے یہ میٹنگ اگست ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوئی۔ مولانا منظور نعمانی نے نئی جماعت . جماعت اسلامی.... کی امارت کیلئے مولانا مودودی کا نام پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ دستور کے لحاظ سے امیر میں جو صفات ہونی چاہئیں، مثلاً تقویٰ، علم دین میں بصیرت، اصابت رائے اور حزم و عزم وہ سب مودودی صاحب میں موجود ہیں اور اس حیثیت سے وہ جماعت کے موجودہ ارا کین میں فائق و ممتاز ہیں۔ مولانا منظور نعمانی کو نائب امیر بنایا گیا اور "الفرقان" پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ جماعت کے نظریات اور اسکی دعوت کی وکالت کرنے لگا۔

تاہم جماعت کی تاسیس کے ۲۱ ماہ بعد مولانا نعمانی نے "الفرقان" میں اعلان کیا کہ اگرچہ وہ جماعت کی دعوت اور اس کے مقاصد کو اب بھی درست اور برحق سمجھتے ہیں لیکن انہوں نے افسوس اور قلق کے ساتھ جماعت کی باضابطہ ذمہ داری اور اسکی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے خود کو علیحدہ کر لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس اعلان سے ایسی کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ

جماعت سے میری بے تعلقی کسی اصولی اختلاف پر مبنی ہے بلکہ اسکی وجہ کچھ ذاتی قسم کے معاملات ہیں۔ لیکن اسکے ۱۵ برس بعد (الفرقان۔ رمضان ۱۳۷۷ھ۔ اپریل ۱۹۵۸ء) تک انہوں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ "ذاتی معاملات" کیا تھے کسی نے انہیں بتایا تھا کہ (ان دنوں) مودودی صاحب کے گھر میں ایک مرد باورچی ملازم تھا اور ان کی اہلیہ اس سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ یہ ایک "منکر" تھا۔(۱)

۸۰۔۱۹۷۹ء میں مولانا نے دوبارہ اس موضوع کی طرف اُس وقت توجہ کی جب انہوں نے "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سر گذشت اور اب میرا موقف" نامی کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کی رو سے "ذاتی معاملات" وہی تھے جنکا اوپر ذکر کیا گیا۔ ال ...
میں یہ انکشاف بھی کیا گیا کہ وقت گذرنے کے ساتھ خاص طور پر ۷۵ء کے ...
ان کے علم میں یہ بات بھی آئی کہ مودودی صاحب کی تحریروں اور جماعت
بعض "سنگین خامیاں" آگئی ہیں۔ مولانا نعمانی کو امید تھی کہ مودودی صاحب
فرمائیں گے لیکن ابھی ان کی یہ کتاب اشاعت کے مرحلہ میں ہی تھی کہ مو...
انتقال ہو گیا۔

جماعت سے مفارقت کا اصل راز

مولانا نعمانی کو اگرچہ اسکا علم نہ تھا۔ لیکن جماعت سے مولانا کی علیحدگی فی الواقع عظیم دینی واصلاحی تحریک "تبلیغی جماعت" کے بانی حضرت مولینا محمد الیاسؒ (متوفی ۱۹۴۴ء) کی دعاؤں کا ثمرہ تھی۔ یہ بات مولانا نعمانی کے علم میں اس وقت آئی جب وہ مولانا الیاس صاحب کے انتقال کے بعد ان کی تدفین میں شرکت کرکے واپس ہورہے تھے(۲)۔ ہوا یہ کہ مولانا

---

(۱)(الفرقان) غور کیا جائے تو یہ مولانا مودودی کا "ذاتی مسئلہ" کہلائے گا نہ کہ مولانا نعمانی کا۔ مولانا نعمانی کا ذاتی مسئلہ وہ تھا جو مودودی صاحب کے اس گھریلو مسئلے سے پیدا ہوا اور جس کی تفصیل سر گزشت میں کی گئی ہے۔ کہ یہ واقعہ علم میں آنے کے بعد اور خود مودودی صاحب سے اسکی تصدیق ہوجانے کے بعد مولانا نعمانی نے اپنے لئے یہ مسئلہ محسوس کیا کہ انھوں نے مودودی صاحب کا نام امارت کیلئے پیش کرتے ہوئے ان کے حق میں صاحب تقویٰ ہونے کی شہادت دی تھی۔ اور اس واقعہ کی روشنی میں جس کو مودودی صاحب بدلنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں، ان کی شہادت اب شہادت زور (جھوٹی شہادت) ہوجاتی ہے، تو وہ اب کیا کریں؟

(۲)(الفرقان) یہ واپسی تدفین سے نہیں تھی بلکہ مولانا الیاس صاحب کے انتقال کے بعد ایک اجتماع سے تھی۔

الیاس صاحب کے ایک خاص رفیق حاجی عبدالرحمٰن نے مولانا نعمانی سے درخواست کی کہ وہ بھی اسی بیل گاڑی پر سوار ہو جائیں جس پر بیٹھ کر وہ مرکز واپس جا رہے ہیں۔ حاجی عبدالرحمٰن اصلاً ایک نو مسلم تھے اور مکمل طور پر جماعت تبلیغ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے سرگوشی کے انداز میں مولانا نعمانی سے پوچھا "مولانا یہ تو بتایئے کہ آپ کون سی جگہ چلے گئے تھے جو "حضرت جی" (حضرت مولانا الیاس صاحب کو حضرت جی کہا جاتا تھا) آپ کے بارے میں اتنے فکر مند ہوئے تھے۔ اسکے بعد حاجی عبدالرحمٰن نے انہیں حسب ذیل واقعہ سنایا۔

قریباً دو ڈھائی برس پہلے (۱۳۶۰ھ یا ۱۳۶۱ھ ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء) کی بات ہے۔ گرمیوں کی ایک دوپہر میں "حضرت جی" میرے حجرہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے تم سے اس وقت ایک ضروری بات کرنی ہے۔ پھر مجھ سے دریافت فرمایا "تم مولانا منظور نعمانی کو جانتے ہو" میں نے کہا "مجھے تو یہ نام یاد نہیں آتا" فرمایا 'وہ جن کا ایک رسالہ نکلتا ہے اور جو بدعات اور اہل بدعت کا رد کرتے ہیں" میں نے کہا "ہاں ان کو تو میں جانتا ہوں۔ فرمایا کہ وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں۔ ہمیں ان کے لئے دعا کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو وہاں سے نکال لے۔ پھر ہم دونوں نے اسی وقت نماز پڑھ کر ان کے لئے دعا کی۔

حاجی عبدالرحمان کی زبانی یہ واقعہ سن کر مولانا منظور نعمانی کو خیال آیا کہ غالباً یہ اسی زمانے کی بات ہو گی جب وہ جماعت اسلامی کے اس وقت کے مرکز دارالاسلام میں قیام کی غرض سے جمال پور (مشرقی پنجاب) چلے گئے تھے۔ اگرچہ اس وقت تک مولانا الیاس یا ان کی تبلیغی جماعت سے مولانا نعمانی کا کوئی خاص تعلق نہیں تھا لیکن اسکے بعد بہت عرصہ نہیں گذرا کہ مولانا منظور نعمانی بالآخر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں غالباً اپنے خاص ذوق و مزاج کی مناسبت سے انہیں ہونا ہی چاہیئے تھا۔

یہاں سے "الفرقان" کی دعوت کا ایک نیا دور شروع ہوا جسکا خاص محور اور مرکزی نقطہ یہ قرآنی دعوت تھی کہ "اے مسلمانوں سچے مؤمن بن جاؤ"۔ اور "اے مسلمانوں پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ"۔

آزادی کے بعد کا ہندوستان اور مولانا نعمانی

۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو جن سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان میں تعلیم، پرسنل لا اور مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کے مسئلہ کے علاوہ پاکستان بنوانے کی پاداش میں مسلمانوں کی خونریزی اور بھیانک مسلم

کش فسادات کا ایک طویل سلسلہ بھی تھا۔ مولانا منظور نعمانی مسلمانوں کو در پیش ان مسائل و مشکلات کے بارے میں فکر مند ہی نہیں رہے بلکہ ان سے نپٹنے کی تمام اجتماعی کوششوں میں عملاً شریک ہوئے خواہ اتر پردیش کی دینی تعلیمی کونسل ہو یا ہندوستانی مسلمانوں کی کُل جماعتی تنظیم مسلم مجلس مشاورت ہو، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہو، یا ملی ہفتہ وار ''ندائے ملت'' کے اجرا کی مہم ہو مولانا نعمانی ہر جگہ پیش پیش تھے۔

۱۹۶۵ء میں مولانا منظور نعمانی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی مجلس تاسیس کے رکن منتخب ہوئے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کا پاسپورٹ گم ہو چکا تھا اور حکومت نے انہیں نیا پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال یہ مسئلہ تو کسی طرح حل ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد انہیں صدر جمہوریہ (۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (۱۸۹۷۔۱۹۶۹) کی طرف سے یہ پیغام موصول ہوا کہ وہ رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کیلئے سعودی عرب روانہ ہو میں ان سے ملاقات کریں۔ چنانچہ اسی سفر کے سلسلہ سے دہلی پہونچنے پر اا اس ملاقات کے دوران ذاکر حسین خاں صاحب نے مسئلہ کشمیر کا ذکر کیا تو مو ہندوستانیت میں تو کسی شک و شبہ کا سوال نہیں ہونا چاہیئے۔ البتہ جو رائے ا رکھتے ہیں وہ حکومت ہند کی پوزیشن سے قدرے مختلف ہے۔ اس لیئے اگر یہ مسئلہ رابطہ ں یسب میں آیا تو ہم اپنی رائے کے خلاف کوئی موقف تو اختیار نہیں کر سکتے لیکن ہمیں اپنی ہندوستانیت کا لحاظ رکھنا بھی قدرتی طور پر عزیز ہو گا۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق!

مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود مولانا منظور نعمانی نے اپنے علمی مشاغل کی طرف سے کبھی تساہل نہیں برتا۔ ماہنامہ ''الفرقان'' کی ادارت کے ساتھ ساتھ انہوں نے سو (۱۰۰) یا اس سے بھی زائد کتابیں اور رسائل اردو میں تصنیف کیئے جن میں سے بعض کے ترجمے انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ مولانا اپنی تمام کتابوں میں ''اسلام کیا ہے؟'' کو سر فہرست رکھتے تھے لیکن انہوں نے ''قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟'' ''آپ حج کیسے کریں؟'' ''اور آسان حج'' جیسی متعدد مقبول عام علمی اور تحقیقی کتابیں بھی لکھی ہیں۔۔ دین کی عام فہم تشریح و ترجمانی میں مولانا کا اہم ترین کارنامہ سات جلدوں پر مشتمل

---

(۱) واقعہ میں نائب صدر جمہوریہ (ڈاکٹر صاحب کا) دور صدارت بعد میں آیا۔

ان کی "معارف الحدیث" ہے۔

مولانا نے "معارف الحدیث" کی آٹھویں جلد نامکمل چھوڑی ہے جو انشاء اللہ اب بعد میں شائع ہو گی۔

مولانا منظور نعمانی کسی زمانے میں ایک زبردست مناظر رہے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں جب آیت اللہ خمینی نے شاہ ایران کا تختہ پلٹ دیا تو ان کی اس کامیابی کو بعض حلقوں نے "اسلامی" انقلاب کے ایک قابل تقلید نمونہ پر محمول کیا۔ مولانا منظور نعمانی کا موقف اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے اردو زبان میں "انقلاب ایران، امام خمینی اور شیعیت" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ مولانا نعمانی کی یہ ایک ایسی فاضلانہ اور محققانہ تصنیف ہے کہ اس میں اٹھائے گئے نکات اور ان کے تائیدی حوالوں کی آج تک تردید نہیں کی جا سکی۔

انقلاب ایران کے بعد عربوں اور ایرانیوں کے مابین پیدا ہو جانیوالی سیاسی چپقلش کے پس منظر میں ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کتاب کی اشاعت کے پیچھے سعودیوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن ۱۹۸۴ء میں جب کتاب کے مصنف نے رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں اس موضوع سے کسی کو دلچسپی نہیں (۱) بلکہ سعودی حکومت نے اس کتاب کے عرب میں داخلہ کی اجازت بھی برسوں بعد دی۔

مولانا محمد منظور نعمانی جماعتوں اور اداروں کی حد بندیوں میں محدود رہنے والے آدمی نہ تھے ـــــ دار العلوم دیوبند وہ واحد ادارہ ہے جسکی مجلس شوریٰ سے وہ آخر تک وابستہ رہے لیکن ایک مرحلہ پر وہ اسکی رکنیت سے بھی مستعفی ہونا چاہتے تھے۔ اس اقدام سے انہیں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نے باز رکھا ـــــ مولانا نعمانی بذات خود ایک ادارہ تھے۔

(ترجمہ عبید الرحمٰن سنبھلی)

☆☆☆

---

(۱) (الفرقان) یہ سفر فی الواقع اسی موضوع کی خاطر ہوا تھا۔ ورنہ سالہا سال سے رابطے کے اجلاس میں شرکت اپنی سخت معذوریوں کی بنا پر چھوٹی ہوئی تھی۔

"ترجمان دار العلوم" دہلی
مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

برصغیر ہند و پاک کی عظیم اسلامی شخصیت مولانا محمد منظور نعمانی
کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے اور ۹۲ برس کے مسلسل سفر کے بعد ۴ر مئی
ابدی نیند سو گئے۔ نور اللہ مرقدہ۔

مولاناؒ نے وسطانی تعلیم دار العلوم مئو اعظم گڈھ میں حاصل کی
کے لئے .. دار العلوم دیوبند گئے، سن کر گئے تھے کہ دیوبندی رسول اللہ کو نہیں مانتے، رسول کی توہین کرتے ہیں، بد عقیدہ بلکہ کافر ہیں، لیکن جب سنبھل کی فضا سے نکل کر دیوبند پہونچے تو وہاں صحابہ کرام کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھیں، حدیث و فقہ کا چرچا دیکھا، عجیب سے عجیب شخصیتیں دیکھیں، شاہ انور صاحبؒ کا علم حدیث کا طنطنہ نظر آیا اور پورا دار العلوم علوم و فنون ہی نہیں تربیت اور آداب نبوت کا مجسمہ نظر آیا۔

ایک ایسا طالب علم جو مئو سے حمد اللہ، شمس بازغہ، اور قاضی مبارک جیسی کتابوں سے منطق و فلسفہ سیکھ کر آیا ہو اور جس کی خاندانی شہرت بریلویت سے متاثر ہو، وہ دیوبند پہنچ کر حیران ضرور ہوا ہوگا مگر اس کے ضمیر نے گواہی دی کی یہاں علم دین اور نبوت کی روشنی ہے، اس لئے کہ اس کو دیوبند میں اتباع رسول کی دولت مل گئی، علوم نبوت کا خزانہ مل گیا، اور ایمان و اسلام کی لذت نصیب ہو گئی، اس لئے عمر بھر کے لئے مسلک دیوبند کا ترجمان دار العلوم کا نمائندہ اور اکابر اسلام کا عاشق زار بن گیا۔ پھر اس خوش نصیب پر یہ رنگ اس قدر غالب آیا کہ ۹۲ سال کی طویل عمر میں کبھی یہ رنگ پھیکا نہیں پڑا، بلکہ پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

(۲)

دیوبند سے مولاناؒ جب سنبھل لوٹ آئے تو وہاں مولانا احمد رضا خاں صاحب اور مولانا حشمت علی خاں صاحب کا بریلوی فکر اپنے شباب پر تھا۔ مولانا مرتضٰی حسن چاند پوری اور مولانا معظم علی صاحب جیسے حضرات مسلک دیوبند کی ترویج واشاعت میں سر سے کفن باندھ کر میدان میں کھڑے تھے، ایک طرف سے کفر و تکفیر کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، دوسری طرف مولانا مرتضٰی حسن کی چاندنی پھیلتی جارہی تھی، بحث و نظر، مناظرہ اور مجادلہ کا بازار ہی نہیں گرم تھا، میدان جنگ گونج رہا تھا، ایسے میں سنبھل کا یہ نوجوان تماشہ نہیں دیکھ سکتا تھا، اس لیے اپنی فطرت کے مطابق میدان میں اتر گیا اور اس جرات وہمت کے ساتھ اترا کہ اس نے اپنا دفتر ہی بریلی شریف میں کھول دیا۔ اور وہیں سے "الفرقان" جیسے ماہانہ پرچے کو جاری کر کے کفر و بدعت، بدزبانی اور مولانا حشمت علی خاں صاحب کی گالیوں پر بند باندھنا شروع کردیا، آج ہم دیکھتے ہیں کہ بریلویت کے ہر حملے کا جواب دے کر، ہر نامعقولیت کا پول کھول کر، ہر کفر کی بخیہ ادھیڑ کر اور ہر گالی کا مذاق اڑا کر مولانا نے اور ان کے ہمنواؤں نے کتابوں کا وہ ذخیرہ تیار کردیا جو ہمیشہ کے لئے اس جنگ کا خاتمہ کر سکتا تھا، چنانچہ آج وہ جنگ سرد ہو چکی ہے اور اس میں بڑا حصہ حضرت مولاناؒ کا ہے اور اسی معرکہ آرائی میں مولاناؒ نے اپنے کو سنبھلی کے بجائے نعمانی کہنا شروع کردیا۔ برد الله مضجعه

(۳)

مولاناؒ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جو بات سامنے آتی اس کا علمی یا جذباتی یا تجرباتی تجزیہ کر کے سمجھنا جانتے تھے کہ حق کیا ہے باطل کیا۔ مگر اتنا تو ہر صاحب عقل کر لیتا ہے

گھیر لیتا ہے جب ان کو باطل کہیں
دل کے اندر سے کہتا ہے کوئی بزن

یہ تھا مولاناؒ کا حال اور اسی حال میں انھوں نے پوری عمر گزار دی۔ ظاہر ہے کے ہر معرکے میں اپنا موقف بنانا اور پھر اس کے لئے جد و جہد کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے، اس لئے مولانا کو کئی بار ٹھوکریں لگیں۔ ناکامیابی ہوئی اور مسلسل ہوئی مگر وہ کسی حال میں نچلے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ یہی مرحلہ زندگی کا سب سے سخت اور خطرناک مرحلہ ہوتا ہے اور اس مرحلے میں خدا کی توفیق

میسر نہ آئے تو آدمی بہک جاتا ہے، یا برباد ہو جاتا ہے۔ اور توفیق میسر آجائے تو سنبھل جاتا ہے ،راستے پر آجاتا ہے، اور نفس مطمئنہ کی دولت تک پہنچ جاتا ہے۔

حضرت مولاناؒ اپنی ابتدائی زندگی میں مولانا مودودی صاحبؒ کے ساتھ بھی وابستہ ہوئے اور جماعت اسلامی کی تاسیس میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ وابستگی بڑی پرجوش اور سرگرم تھی لیکن اس کے باوجود جب ان کو محسوس ہوا کہ ان سے فکر و نظر کی غلطی سرزد ہوئی ہے، تو مودودی صاحب سے علاحدگی اختیار کرنے میں دنیا کی شرم یا کوئی اور چیز رکاوٹ نہ بن سکی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کسی تحریک سے وابستہ ہونے اور اس کی طرف دوسروں کو بھی پوری قوت سے دعوت دینے کے بعد اس سے علاحدہ ہونا نفسیاتی طور پر بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے اور یہ فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو تلاش حق کا سچا جذبہ اور اپنی غلطی کے اعتراف کی اخلاقی جرآت رکھتا ہو۔

(۴)

مولاناؒ کی قوت فیصلہ اور تلاش حق ان کا فن تھی، چنانچہ وہ "مدرسہ د
سرپرست تھے اور راقم الحروف مہتمم تھا۔ مولاناؒ کے بعض مریدین نے مو!
افضال یہاں لیڈری کرتا ہے، پڑھاتا کچھ نہیں، اس سے لڑکے بیزار ہو رہے ہیں
مولاناؒ کا ذہن میری طرف سے غیر مطمئن کرنے کی یہ باریک چال تھی، مگر مولاناؒ اس جال میں اس وجہ سے نہیں آئے کہ انھوں نے اس شکایت میں حقیقت کی جستجو شروع کردی، صبح کو مجھ سے فرمایا کہ سب سے بڑی جماعت کے بچوں کو میرے پاس بھیج دو۔ یہ اچانک حادثہ تھا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میرا امتحان لینے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ اس وقت شرح جامی میں گیارہ لڑکے تھے، میں نے انھیں درسگاہ میں بٹھا دیا اور مولاناؒ کو بلا کر وہاں سے چلا گیا۔ مولانا نے لڑکوں سے شرح جامی کی عبارت پڑھوائی، ترجمہ کرایا، مطلب پوچھا، چونکہ اس جماعت میں بڑے ہونہار لڑکے تھے سبھی نے بے دھڑک عبارت پڑھی، بے لاگ ترجمہ کردیا، اور مطلب بتا دیئے تو مولاناؒ کو حیرت ہوگئی اور بہت خوش ہوئے، پھر مجھے بلا کر بچوں کی تعریف کی اور اس طرح کی شکایت پر بھروسہ نہیں کیا۔ .. . . پھر انھوں نے شکایت کرنے والوں سے کیا کہا یہ مجھے معلوم نہیں مگر وہ لوگ حیران رہ گئے کہ ان کا نشانہ خطا کر گیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ پھر بھی باز نہیں آئے۔

یہ تھا مولاناؒ کا مزاج کہ حق کیا ہے، غلط کیا؟ اس کی کھوج کرتے تھے۔ معمولی سے معمولی

کام میں اور بڑے سے بڑے مرحلے میں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اسی تلاش و جستجو اور پھر اسکے استحکام پر خرچ کردی اسلیئے اپنی اس خصوصیت میں وہ تمام علماء میں ممتاز تھے۔

(۵)

مولاناؒ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ اور انکی اسی رکنیت کے زمانے میں دارالعلوم میں وہ انقلاب عظیم آیا جس نے دیوبند کی چولیں ہلادیں اور ممبران شوریٰ کو آزمائش میں ڈال دیا۔ جشن صد سالہ کے بعد جب عالمی مؤتمر ابناء قدیم اور تنظیم فضلائے دارالعلوم کے نام سے دارالعلوم دو گروپوں میں تقسیم ہو گیا تو مولانا نعمانیؒ غیر جانب دار تھے مگر حالات سے پوری واقفیت رکھنا چاہتے تھے۔

مولاناؒ کا ذہن مولانا اسعد صاحب کی طرف سے صاف نہیں تھا کہ وہ سیاسی ہیں مگر قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی امانت و دیانت سے مطمئن تھے۔ دارالعلوم کی کشاکش کے بعد جب پہلی مجلس شوریٰ ہوئی تو اسمیں مجلس شوریٰ نے چند ایسے فیصلے کیے جو دارالعلوم کیلئے بنیادی اور ضروری تھے مگر اسے دارالعلوم کی انتظامیہ نے پسند نہیں کیا۔ یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ حضرت مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ کو بلانا بند کردیا تو دستور کی دفعات کا حوالہ دیکر خود اراکین نے مجلس شوریٰ طلب کرلی اور وہ مجلس شوریٰ بھی دارالعلوم کی انتظامیہ کو پسند نہیں آئی تو انتظامیہ نے طے کرلیا کہ مجلس شوریٰ اور دستور اساسی دونوں منسوخ کرکے ایک اڈہاک کمیٹی مقرر کردی جائے، چنانچہ دہلی کے "نمایندہ اجتماع" نے مجلس شوریٰ توڑدی اور دستور اساسی منسوخ کرکے اڈہاک کمیٹی کے ممبران کا اعلان کردیا اور دستور کیلیے ایک کمیٹی بنادی گئی۔

اور وہ شخص جو بالکل غیر جانب دار تھا وہ الفرقان لے کر مقابل میں آگیا۔ اس نے حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے میں کبھی کی مطلق پروا نہیں کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ملک کو مطمئن کرنا ممکن نہیں تھا۔

آپ دو سال کا الفرقان پڑھیئے تو واضح ہو جائے گا کہ مولانا نعمانی کہاں سے چلے تھے اور کس کس طرح حضرت قاری صاحب کو معطل اور دارالعلوم سے علاحدہ کئے جانے تک کام کرتے رہے اور اس پر آنسو بہاتے رہے کہ حضرت قاری صاحب کے حواریوں نے ان کو کہاں لے جاکر کھڑا کردیا ہے۔ پھر پنچایت، وفود اور ثالثی وغیرہ کی تمام کاروائیاں سامنے رکھ دی ہیں۔ ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ دارالعلوم کے مسئلے میں حق کیا تھا، غلط کیا تھا، اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے حضرت قاری صاحبؒ کی حالت بہت قابل رحم بن گئی تھی۔ اور دارالعلوم تقسیم ہو گیا تھا۔

ان حالات میں اچھے اچھوں کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں مگر مولانا نعمانی صاحب لکھنؤ یا دیوبند کہیں خاموش نہیں ہوئے، برابر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔ یہ تھا مولانا نعمانی کا مزاج، ان کا موقف اور ان کا کردار عالی ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

یہ سب حضرات خدا کی بارگاہ میں حاضر ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائے، سب کی کمزوریوں کو معاف فرمائے اور دار العلوم دیوبند کو پھر جاگیر داری کے چکر سے نجات دلائے۔

(۶)

ہم حضرت مولانا نعمانیؒ کی رحلت کے غم میں برابر کے شریک ہیں ا... یقین دلاتے ہیں کہ انشاءاللہ مولانا کے لئے ایصال ثواب کی پوری کوشش کر... ان کا ہم پر حق ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صبر و سکون میسر فرمائے اور مولانا م... دینی و ملی خدمات کا بہتر سے بہتر صلہ عطا کرے۔ (ترجمان دار العلوم با...

☆☆☆

ماہنامہ "الرشاد" اعظم گڈھ

مولانا مجیب اللہ ندوی

بزمِ ملّتِ اسلامیّہ کا

ایک اور چراغ گل ہو گیا

ناظرین الرشاد کو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے جانکاہ حادثۂ وفات کی اطلاع ضرور مل چکی ہو گی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موت تو ہر انسان کے لئے مقدر ہے اور اس کی خبریں ہمارے کانوں میں روزانہ پڑتی رہتی ہیں مگر بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کانوں اور آنکھوں سے گزر کر دل و دماغ کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ تڑپا دیتی ہیں اور ان کی چبھن برسوں محسوس ہوتی ہے۔ انہیں میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کا حادثۂ وفات ہے، ان کی موت کسی عام انسان کی موت نہیں ہے بلکہ ایک عالم با عمل، ایک فاضل اجل، ایک داعی بے بدل اور ملت کے لئے درد مند اور پر سوز دل رکھنے والے کی موت ہے۔

دو تہائی صدی تک ملت کے مشکل مسائل کے حل کرنے کیلئے جن دو چار شخصیتوں کی طرف نگاہ اٹھتی تھی ان میں ایک نمایاں مقام انھیں بھی حاصل تھا، جماعت اسلامی کی تشکیل ہو، مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام ہو یا دینی تعلیمی کونسل کے قیام کا آغاز ہو یا تبلیغی جماعت کی ابتدائی نشو و نما ہو، ان سب میں پورے خلوص کے ساتھ حصہ لیا اور اس کے لئے نہ تو ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواکی اور نہ ذاتی نفع و نقصان کی ترازو میں اسے تولا اور نہ بڑے بڑے آدمی کے سامنے اپنی رائے دینے سے گھبرائے، جو بات صحیح سمجھ میں آئی اس میں دل و جان سے لگ گئے اور اگر غلط معلوم ہوئی تو اس سے برأت کا اظہار کرنے میں بھی تامل نہیں ہوا، بعض لوگ اس کو ان کی کمزوری پر محمول کرتے تھے مگر یہ ان کی حق پرستی کی بات تھی کہ

امت کے مسائل کے سلسلہ میں نہ انہیں خرید اجاسکا اور نہ وہ کسی کے سامنے جھکے اور نہ کسی کی کاسہ لیسی کی، وہ اس شعر کے مصداق تھے ۔

قیمتیں کھو کے جو بازار خوشامد میں چلیں
ایسے سکے میری خودداری نے کم ڈھالے ہیں

مولانا نے ابتدائے جوانی میں کچھ دن مناظرہ کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے مگر جلد ہی اس سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اور مثبت علمی و دینی کام ہی کو اپنا مشغلہ بنایا، علمی و دینی کام کی ابتدا انہوں نے رسالہ الفرقان کی اشاعت سے کی۔ مگر الفرقان اور مولانا کا باوقار تعارف اس وقت ہوا جب انہوں نے الفرقان کا مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ نمبر نکالا، یہ بھی ایک عزیمت کی بات تھی کہ انہوں نے ان کاموں کی ابتدا بریلی جیسے اظہار حق کے لئے ناموافق مقام سے کی، ا
ایک شخص مولانا سے ملنے گئے۔ ان کو پورا پتہ یاد نہیں تھا، انہوں نے کسی شخص
الفرقان کا دفتر کہاں ہے؟ وہ مخالف کیمپ کا کوئی دل جلا آدمی تھا، اس نے جواب
آسمان پر ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کتنے سخت ماحول میں ا
برسوں کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب کے مشورے سے لکھنؤ منتقل ہو...
سے الفرقان اور کتابوں کی اشاعت کا وسیع کام آپ نے شروع کیا۔

مولانا نے کئی درجن دینی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، جن میں بعض اپنی مثال آپ ہیں۔ عام پڑھے لوگوں کے لئے ان کی کتاب اسلام کیا ہے؟، ہزاروں ہزار کی تعداد میں چھپی اور بکی، پھر دین و شریعت میں اسلام کے عقائد اور دین و شریعت کی انہوں نے جس متوازن اور مدلل انداز میں تشریح کی ہے وہ عام علماء اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بہترین کتاب ہے، ان کتابوں کے علاوہ ان کی سب سے معرکۃ الآراء کتاب معارف الحدیث ہے، جس کی اب تک چھ جلدیں(۱) شائع ہوچکی ہیں۔ یہ حدیث نبوی کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے پڑھنے کے بعد اسلامی تعلیمات کے بارے میں مختلف قسم کے شبہات ان کی سادہ مگر فنی انداز کی تشریحات سے خود بخود دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر جن حدیثوں میں کچھ تناقض نظر آتا ہے اسکی ایسی متوازن توجیہ اور تطبیق کرتے ہیں کہ اس کا تناقض دور ہو جاتا ہے، حج کیسے کریں؟ بھی ان کی مقبول ترین کتاب ہے، ان کے علاوہ کئی درجن کتابیں ہیں۔

عام طور پر موجودہ دور میں جو علماء کسی دینی، علمی یا تعلیمی کام میں لگتے ہیں وہ عام ملت

---

(۱) جو جلدیں شائع ہو چکیں ان کی تعداد سات ہے۔ آٹھویں انشاء اللہ عنقریب شائع ہو گی۔ (الفرقان)

کے اجتماعی کاموں سے کم دلچسپی رکھتے ہیں، مگر آج سے ۵۰ ربرس پہلے کے علماء درس و تدریس یا دعوت و تبلیغ یا تصنیف و تالیف کے کام کے ساتھ ملت کے اجتماعی مسائل سے بھی نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ اس راہ میں قربانی کے لئے بھی تیار رہتے تھے۔ اب اُس دور کے زیادہ تر علماء کی رہنمائی سے یکے بعد دیگرے ہم محروم ہوتے جارہے ہیں جن میں مولانا موصوف بھی تھے۔

مولانا کی طبیعت میں حد درجہ رقت تھی۔ عام طور پر ان کی تقریروں اور مجلسی گفتگو میں اور بسا اوقات نماز میں بھی اس کا اظہار ہوتا رہتا تھا، راقم الحروف کے ساتھ ان کا سلوک انتہائی مشفقانہ تھا۔ جب تک وہ مرکز کی مسجد میں قیام پذیر رہے جب لکھنؤ جانا ہوتا تو راقم الحروف وہیں ٹھہرتا تھا، عام طور پر فجر کی نماز کے لئے وہ اکثر احقر کو آگے بڑھا دیتے، ایک بار سورہ "ق" پڑھی تو لا تختصموا لدیّ والی آیت پر نماز ہی میں زار و قطار رونے لگے، اور پھر نماز بعد دیر تک اس پر گفتگو فرماتے رہے۔ راقم الحروف کی جب کوئی تحریر جاتی تو بڑے شوق سے اس کو شائع فرماتے، احقر نے جامعۃ الرشاد میں تعلیمی سال کے اختتام پر طلبہ کے سامنے ایک وداعی تقریر کی جس کو مدرسہ کے ایک استاذ مولانا انعام الحق صاحب نے مرتب کر کے الفرقان میں بھیج دیا۔ حضرت مولانا نے اس پر ایک اچھا نوٹ لکھ کر اسے شائع کردیا۔ یہ پرچہ جب شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے رمضان المبارک میں کئی سو کے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر طالب علم اور استاذ کو پڑھنا چاہیے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ وہاں موجود تھے، ان کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا کہ دوسرے ہی دن انہوں نے احقر کو خط لکھا کہ تمہارا یہ مضمون انشاء اللہ عند اللہ مقبول ہوگا اور حضرت شیخ الحدیث کی اس عزت افزائی کا ذکر فرمایا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں دار العلوم دیوبند میں جب اختلافات شروع ہوئے تو میں نے ان کو قاری صاحب کی حمایت میں ایک سخت خط لکھا، انہوں نے اس کا برا نہیں مانا، کچھ دن بعد ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ تمہارے جذبات قابل قدر ہیں مگر حالات کی وجہ سے بعض اوقات رائے بدلنی پڑتی ہے۔

ان کی پاکیزہ زندگی ان کے وقیع دینی، ملی اور علمی کارنامے زبان حال سے یہ شعر پڑھ رہے ہیں ؎

جان کر من جملۂ ارباب میخانہ مجھے　　مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مجلّہ "المآثر"۔ مئو
مولانا ابو بکر غازی پوری

علم ودین کا ایک چراغ اور بجھا

۲؍ مئی کو سفر حج سے واپسی ہوئی، امسال منیٰ میں آتش زدگی کے واقعہ
پہلے ہی سے متاثر تھے، سینکڑوں حجاج کی موت کا نقشہ نگاہوں کے سامنے تھا، ا
کو دو روز بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ اطلاع ملی کہ جماعت دیو بند کے قابل
سب کے مخدوم حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ۴؍ مئی کو اللہ کو پیارے ہوئے۔ ا
الیہ راجعون۔

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ اطلاع تھی کہ وہ ادھر کئی سال سے صاحب فراش ہیں، لیکن ایسی کوئی اطلاع نہیں تھی کہ ان کی بیماری کا حال کچھ ایسا ہے کہ وہ ہم سے یوں دیکھتے دیکھتے رخصت ہو جائیں گے، مولانا مرحوم نے اسی بیماری میں بستر پر پڑے پڑے اپنی وہ مایہ ناز کتاب تصنیف کی جس نے قصر خمینیت کی چولیں ہلا دیں، ہندوستان کی ساکت فضا میں ایک گونج پیدا کر دی، حق بات کا کہنا اور حق کیلئے لڑنا مولانا مرحوم کا خاص امتیاز تھا۔ اس بارے میں کسی قسم کی مداہنت کا وہ کبھی، شکار نہیں ہوئے، نہ وقت کی مصلحتوں نے ان کو کبھی اظہار حق سے روکا، انھوں نے اسی اظہار حق کی خاطر بعض اپنے ان رفقاء سے بھی رشتہ توڑ لیا جن سے انکا زندگی بھر کا ساتھ تھا اور یہ بات کبھی کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ مولانا مرحوم کا رشتہ ان سے بھی ٹوٹے گا، مگر مولانا مرحوم کے نزدیک رشتہ اور قرابت سے زیادہ اہم چیز تھی عقیدہ و مسلک کی حفاظت، اسلاف کے ناموس کا دفاع، اس کے لئے مولانا نے ان کی پوری زندگی شاہد ہے کسی طرح کی کوئی سودے بازی نہیں کی، اور نہ جس چیز کو انھوں نے حق جانا اس کے اظہار سے کبھی ان کی زبان خاموش رہی، خواہ اس کیلئے ان کو بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑی ہو۔

مولانا مرحوم عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے اپنے اکابر دیو بندر حمہم اللہ کے سچے جانشین تھے، دیو بندیت اپنی پوری روح کے ساتھ مولانا مرحوم کے اندر رچی بسی تھی، یہی وجہ تھی کہ ان کے قلم اور ان کی زبان نے ہر باطل اور ہر فتنہ کا مقابلہ کیا اور کسی تساہل کا کبھی شکار نہ ہوئے بریلویت کی جڑ انھوں نے خود بریلی میں قیام کر کے اکھاڑ ڈالی، الفرقان کا اجراء اللہ کے اس شیر نے بریلی سے کیا جہاں اس عقیدہ و مذہب کے بڑے بڑے جغادری تھے اور حق یہ ہے کہ مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تن تنہا جس پامردی و جواں ہمتی سے اس فتنہ کا سدباب کیا یہ انھیں کا حصہ تھا، اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مناظروں اور انکی تحریروں نے اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا اور کم از کم رضا خانی علماء علم و عقل کی راہ سے اپنی بات کہنے سے عاجز ہو چکے ہیں، یہ مولانا نعمانی مرحوم کا وہ کارنامہ ہے جس کو ہندوستان کی تاریخ بھلا نہیں سکتی۔

مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مودودی کی تحریرات سے متاثر ہو کر اور محض اخلاص کے جذبہ سے جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی تھی، اور ایک زمانہ تک جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے افکار و نظریات اور عقیدہ و مسلک کا بھرپور دفاع کیا جب تک کہ خود ان پر یہ حقیقت واشگاف نہ ہو گئی کہ جماعت اسلامی کی دعوت دین اسلام کی دعوت دین سے بالکل الگ ہے، مولانا نعمانی جماعت اسلامی میں جب تک رہے پورے اخلاص کے ساتھ رہے ، انھوں نے اس بارے میں اپنے اکابر تک کی باتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب وہ جماعت اسلامی سے الگ ہوئے تو بھی ان کی یہ علاحدگی محض اللہ کے لئے اور مخلصانہ تھی، اور جتنی شدت کے ساتھ مولانا نعمانی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کا دفاع کر رہے تھے جب جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی گمراہیاں ان پر کھل گئیں تو انھوں نے اتنے ہی اخلاص اور اتنے ہی شدت کے ساتھ ان گمراہیوں کو ظاہر بھی کیا

آخیر زمانہ میں مولانا نعمانی کا یہ کارنامہ بھلایا نہیں جا سکتا جو انھوں نے خمینیت اور ایرانی انقلاب کے نام پر پیدا ہونے والے فتنہ کی حقیقت کو اپنی تحریرات سے ظاہر کر کے انجام دیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ ایران کے انقلاب سے بہت سے لوگ حواس باختہ تھے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ خمینی کی شکل میں ایک مہدی وجود میں آگیا ہے اور اب خدا کی زمین فتنوں اور برائیوں سے پاک ہو جائیگی۔ اور اسلام اپنی پوری طاقت کے ساتھ دنیا میں حکمرانی کرے گا۔ یورپ اور امریکہ کی حکومتوں میں زلزلہ پیدا ہو جائیگا اور امام انقلاب خمینی صاحب دنیا کا نقشہ بدل دیں گے، مگر جو لوگ حقیقت کی نگاہ سے اس انقلاب کو دیکھ رہے تھے اور جن کے سامنے شیعیت کی پوری تاریخ

تھی وہ خوب سمجھ رہے تھے کہ ایک نیا فتنہ ہے جو اسلام اور ملت اسلامیہ کے لئے بڑی مشکلات پیدا کرے گا، چنانچہ بعد کے واقعات نے اسکی پوری تصدیق کردی، خمینیت اور ایرانی انقلاب کی حقیقت سے مولانا نعمانی نے لوگوں کو متعارف کرایا، اور لوگوں کو اسکے فریب سے نکالا، مولانا مرحوم کا یہ کارنامہ تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ نے دین کا حقیقی داعی بنایا تھا، الفرقان کے پچاس سال سے زیادہ کی فائلیں اور مولانا کی تمام کتابیں اس کی شاہد ہیں کہ مولانا پر دین کی دعوت کا جذبہ غالب تھا، ان کی تحریر بڑی سنجیدہ باوقار اور سہل ممتنع اور مؤثر ہوتی تھیں، اپنی بات کو دل میں اتار دینے کا ان کو ملکہ حاصل تھا، کسی کی تحریر کی ایسی اثر انگیزی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی تحریرات تکلف سے پاک بہت سادہ مگر بے پناہ تاثیر کی حامل ہوتی تھیں، ان کی کتا
ہے' نے نہ معلوم کتنی زندگیوں میں اسلام کی روح پھونک دی، اللہ نے اس
دی دور حاضر کی دوسری کتابیں بہت کم ایسی ہیں جن کو ایسی مقبولیت حاصل ہو
نے اپنی زندگی کو عملی بنانے میں ان سے اتنا فائدہ اٹھایا ہو جتنا انھوں نے ا
اٹھایا ہے۔

مولانا مرحوم کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا، علم کی محفل میں ایسی نابغہ روزگار شخصیتیں بہت کم آتی ہیں اور جب وہ رخصت ہو جاتی ہیں تو ان کی جگہ پر نہیں ہوتی، مجلّہ المآثر کا شمارہ بالکل تیاری کے مراحل میں ہے اس کے مدیر محترم مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی ابھی سفر حج سے واپس نہیں ہوئے ہیں، یہ مجلّہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب محدث اعظمی کی یاد میں نکل رہا ہے، محدث اعظمی سے مولانا نعمانی کا رشتہ تلمذ کا تھا، المآثر کے سرپرست مولانا رشید احمد صاحب اعظمی کی خواہش تھی کہ اس شمارہ میں مولانا نعمانی پر ایک تعزیتی تحریر آجائے، انھوں نے راقم کو حکم دیا اور بعجلت تمام یہ چند سطریں تحریر کردی گئیں۔ بہر حال یہ احساس ستارہا ہے کہ اگر موقع ہوتا تو اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت تھی۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے، بال بال ان کی مغفرت فرمائے، ان کی لغزشوں کو درگزر کرے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

راقم الحروف، ادارہ المآثر اور مدرسہ مرقاۃ العلوم کے تمام ذمہ دار و مدرسین مولانا مرحوم کے صاحبزادگان کی خدمت میں اس حادثہ فاجعہ پر اپنے قلبی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو صبر و سکون کی دولت سے نوازے۔ (آمین)

ماہنامہ ''ختم نبوت'' ملتان (پاکستان)

ترجمانِ علماءِ حق کا وصال

اس ماہ مئی میں ہم سے جدا ہونے والی پہلی اہم شخصیت، اکابر اسلاف کی نشانی، محقق و مؤلف، علماء حق کے ترجمان، قدوۃ الاتقیاء والصلحاء حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی ہے، ماہ ذی الحجہ کو حج کے موقع پر اطلاع ملی کہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی پر بیماری کا شدید حملہ ہوا ہے اور ان کو اسپتال میں آئی سی یو میں داخل کر دیا گیا۔ چند دن بعد اطلاع ملی کی حضرت رحمۃ اللہ کا وقت موعود آ پہنچا اور حضرت مولانا نعمانی اپنے اسلاف کے پاس پہنچ گئے، ان کی وفات کی اطلاع ملتے ہی اہل حق انتہائی غمزدہ ہو گئے اور پوری دنیا میں تعزیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی موجودہ دور میں اکابر علماء کرام حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ حضرت جی کے قافلۂ اہلِ حق کے مجاہد سپاہی تھے، دار العلوم دیوبند کے فیض یافتہ تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے تدریس و تحقیق اور تالیف کے میدان کو اپنالیا۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی تالیف کے میدان میں اک دوسرے کے رفیق رہے، اس دوران آپ پر اسلام اور اہل حق کی حقانیت کے لئے مناظروں کا جذبہ پیدا ہوا اور ہندوستان میں آپ ایک عظیم مناظر کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آپ نے محسوس کیا کہ مناظروں کے ذریعہ اصلاح کا پہلو زیادہ مؤثر نہیں اس لئے ان سے آپ کی طبیعت اچاٹ ہو گئی اور آپ نے اپنی تمام تر توجہ تالیفات اور امت کی اصلاح کی طرف لگا دی۔ اس دوران آپ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ کے تبلیغی مشن کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت کی معیت میں اس سلسلے میں بہت زیادہ کام کیا۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ علیہ کے ملفوظات جمع

فرمائے۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے وقت جن علماء کرام کو آپ کا قرب حاصل ہوا ۔ ان میں مولا نا محمد منظور نعمانی بھی شامل تھے اور حضرت مولا نا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی میں آپ کا مشورہ شامل تھا۔ بعد ازاں آپ حضرت مولانا یوسف صاحب حضرت جی کی معیت میں تبلیغی کام سے متعلق رہے اور آپ کی وفات تک یہ سلسلہ جاری رہا ۔ دراصل مولانا محمد منظور نعمانی کے ذہن میں نوجوان نسل کی اصلاح کے لئے بہت زیادہ احساس تھا۔ اس بناء پر آپ نے تبلیغی کام کے ساتھ دنیا کی ہر اسلامی تحریک کا مطالعہ کیا اور جس تحریک کو مناسب سمجھا اس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اس احساس اور آپ کی عالمگیر فکر کی وجہ سے رابطہ عالم اسلامی میں آپ ابتداء سے شامل رہے اور رابطہ عالم اسلامی کے ذریعے پوری دنیا میں آپ نے تبلیغ دین کی اشاعت کی۔ اسی طرح دنیا کی بے شمار اسلامی تحریکات کے آپ تاسیسی رکن تھے۔ مولانا مودودی صاحب نے جب جماعت اسلامی کی تحریک کا آغاز کیا تو آ ـ
ابوالحسن علی ندوی نے ان کے ساتھ تعاون کے بارے میں سوچا لیکن جب محـ
نظریات علماء سلف سے نہیں ملتے بلکہ علماء سلف کے متعلق ان کا ذہن بھی صاف
ہے تو نہ صرف ان سے علیحدہ ہوئے بلکہ براءت کا بھی اعلان کیا اور ان کی تـ
کرتے رہے۔

۶۵ سال قبل آپ نے تحریری فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے "الفرقان" رسالہ کا اجراء کیا، اس رسالے نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے "نگاہ اولیں" اور بہترین مضامین کی وجہ سے ابتدا ہی سے علماء کرام میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ ہندوستان جیسے ظلمت کدۂ کفر میں اس رسالے نے ہمیشہ حق کی آواز بلند کی۔ ہر اسلامی موضوع پر بہترین تحقیق شامل کی۔ بقول مولانا عبدالرشید ارشد (صاحب بیس مردان حق) اس رسالے نے اپنے ۶۵ سالہ دور میں کبھی کوئی ایسی تحریر شائع نہیں کی جس کو ادب کی زبان میں ہلکی تحریر سے تعبیر کیا جاسکے۔ اپنے ۶۵ سالہ دور میں اس رسالے نے کئی نمبرات شائع کئے جو ایک علمی ذخیرہ ہیں۔ خاص طور پر ایرانی انقلاب کے بعد "خمینی سے متعلق فتوی" نے پوری دنیا کے سامنے ایرانی انقلاب کی تصویر واضح کردی اور امت مسلمہ کو ایک عظیم نقصان سے محفوظ فرمایا۔

تالیف کے میدان میں رب کائنات نے آپ کو خصوصی قبولیت کا درجہ عطا فرمایا۔ عام فہم زبان میں علمی مسائل کو امت کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ بڑے بڑے شبہات دور ہوگئے۔ "اسلام کیا ہے؟" آپ کی وہ عظیم تالیف ہے جس نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ دنیا کی

اکثر زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اس کتاب کو خالی الذہن ہو کر پڑھنے والا شخص اسلام کی حقانیت کی تصدیق کئے بغیر نہیں رکھ سکتا۔ اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کے دور میں اس کتاب نے پوری دنیا کے سامنے اسلام کی اصل تصویر پیش کی۔ معارف الحدیث کے عنوان سے آپ کے حدیث سے متعلق سلسلے نے جو اب کتابی شکل میں کئی جلدوں پر مشتمل ہے علماء کرام کے حلقے میں ایسی مقبولیت حاصل کی کہ کوئی عالم دین اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ انگریزی زبان میں اس کے تراجم نے یورپ اور امریکہ کے مسلمانوں کی بہت زیادہ رہنمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ دین و شریعت، قرآن آپ سے کیا کہتا ہے، تذکرہ مجدد الف ثانی، ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ ، تصوف کیا ہے؟، نماز کی حقیقت، نماز اور خطبہ کی زبان، آپ حج کیسے کریں؟، آسان حج، منتخب تقریریں، میری طالب علمی، آپ کون ہیں کیا ہیں اور آپ کی منزل کیا ہے؟، قرب الٰہی کے دوراستے، قرآن و حدیث کی سو دعائیں، انسانیت زندہ ہے، شاہ اسماعیل شہید اور معاندین اہل بدعت، فیصلہ کن مناظرہ، کلمہ طیبہ کی حقیقت، برکات رمضان، تاریخ میلاد، عقیدہ علم غیب، مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات، مسئلہ حیات النبیؐ کی حقیقت، ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت، آپ کی وہ قابل قدر تصانیف ہیں جس کی ضرورت ہر اہل علم محسوس کرتا ہے۔

اپنے استاد محترم محدث العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے قادیانیت کے خلاف جہاد کا جذبہ آپ کو علمی وراثت کے طور پر ملا تھا۔ اس لئے اس موضوع پر بھی آپ نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنے استاد محترم کے مشن پر قلم اٹھایا اور قادیانی کیوں مسلمان نہیں، قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ، کفر اور اسلام کے حدود اور قادیانیت، آپ کی وہ کتابیں ہیں جس کی وجہ سے قادیانیت کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ کرنا بہت آسان ہو گیا۔ تصوف کے میدان میں آپ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ تھے۔ صبر و شکر کے آپ مثالی پیکر تھے۔ بقول آپ کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی(۱) مرض وفات کے موقع پر.

”جو بندہ ساری زندگی زبان قال اور زبان حال سے اللہ تعالیٰ کا شکر سکھاتا رہا(یاد رہے کہ شکر کے سلسلے میں ان کا ایک خاص حال رہا ہے)وہ اب زبان قال بند ہو جانے پر صرف زبان حال سے صبر و شکر سکھا رہا ہے ۔ بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ وہ آنکھ کھولتے ہیں۔ پاس میں بیٹھے ہوئے اور یاس میں ڈوبے ہوئے کسی شخص کو دیکھتے

---

(۱) (الفرقان) یہاں نام میں سہو ہوا ہے، مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی پڑھنا چاہئے۔

ہیں اور ایک انگلی اٹھا کر کچھ اشارہ کرتے ہیں۔ شاید وہ اس حال میں بھی اسی وحدہ لاشریک کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کی طرف سدگاں حداکی طرف توجہ مبذول کرانے ہی میں ان کی ساری زندگی گزری۔“

(الفرقان جون ۱۹۹۷ء)

زندگی کے منازل کو کامیابی سے گزار کر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی ؒ اس عالم میں اہل حق سے رخصت ہوئے کہ اہل حق ان کی ضرورت بہت زیادہ محسوس کر رہے تھے۔ اکابر علماء کرام کی پے بہ پے روانگی قیامت کی طرف روانگی کا ایک عمل ہے کہ علم اٹھایا جانا حدیث مبارکہ کے مطابق علماء کرام کے اٹھائے جانے سے تعبیر ہے۔ آج اہل حق کے یہاں ہر شخص افسردہ ہے اور غمزدہ ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں اور دعاؤں سے محر وم ہو
امیر مرکزیہ مولانا خواجہ امیر خان محمد صاحب، نائب امیر مرکزیہ حضر
لدھیانوی، مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری، مولانا اللہ وسایا، قافلہ حضرت
امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مجاہدین مولانا محمد علی جالندھری
شجاع آبادی، رضاکاران حضرت بنوری رحمہم اللہ جانثاران مفتی احمد الرحمان رحمہ
کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر اشکبار ہیں اور پسماندگان کے اس غم کو اپنا غم تصور کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درجات کو بلند فرمائے اور آپ کے مشن اور صدقات جاریہ کو تا قیامت جاری وساری رکھے۔ (ماہنامہ ختم نبوت، ملتان، پاکستان)

ذرا توجہ فرمائیں!

اگر آپ کو یہ خاص نمبر رجسٹری فیس نہ بھیجنے کے باوجود رجسٹرڈ ملا ہے تو براہِ کرم رجسٹری فیس پندرہ روپئے بلا تاخیر روانہ فرمائیں ——— بہت سے خریداران کے رجسٹری فیس نہ بھیجنے کی وجہ سے الفرقان پر بیس پچیس ہزار کا فاضل بار پڑا ہے۔ آپ کے تعاون کے لئے ہم ممنون ہیں ——— ناظم ادارہ الفرقان

لادینیت کا متوالا بنانے کی سازشیں تیار ہو چکی تھیں اور جس دانش گاہ کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں، آپ اسی اہم یونیورسٹی کے قابل فخر سپوت تھے، اسی درسگاہ نے آپ کے گیسوئے برہم کو سلجھادیا تھا اور وہ جذبہ، وہ سوز، وہ فکر، وہ عقابی ذہن دیا تھا جس کا دنیا نے مشاہدہ کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جس نے دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی اتنی آمیزش کی جس کا ایک داعی کے لئے ہونا ناگزیر تھا اور تعلیم کی ثنویت، علم کی دوئی نے جو ایک دراڑ اور خلیج پیدا کردی تھی، اس عظیم دانش گاہ اور تحریک اسلامی کی مسند حدیث پر آپ نے گلباریاں فرمائی ہیں. اس لئے اس وفات کی ضرب سے یہ تمام جماعتیں دوچار ہوئی ہیں۔

در دست نہ تیر یست، نہ در دست کمان است
ایں سادگیٔ اوست کہ بسمل دوجہاں است

مولانائے محترم نے تصوف وسلوک کی راہ طے فرمائی۔ اس کا ایک دلچسپ و عجیب ماضی ہے جو آج بھی ان نوجوانوں کو جو تصوف کو ایک فرسودہ نظام سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور مغرب زدہ ماڈرن خیالات کے حاملین کہ عصر حاضر کی چمک دمک اور ظاہری ٹیپ ٹاپ نے جن کے دل کے ہنگاموں کو خموش کر دیا ہے انہیں تزکیۂ قلب، تزکیۂ نفس کی مؤثر دعوت دیتی ہے۔
آپ کے اوصاف حمیدہ اور کمالات جلیلہ ایک ضخیم کتاب کے متحمل ہیں کیوں کہ آپ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک کتب خانہ تھے۔ ۹۲ سالہ زندگی میں ایک سو کتابوں سے زائد تصانیف، مختلف موضوعات پر تحقیقی اور دلوں کو اپیل کرنے والے اسلوب میں پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ ایک اکیڈمی بھی اتنا کام مل کر انجام نہیں دے سکتی ہے۔ انہیں چیزوں نے آپکو موت کے بعد اور زندہ بنادیا۔

حدیث کے موضوع پر مرحوم کی خدمات ناقابل بیان ہیں، وہ کام کرنے کی ایک نئی طرح اور بنیاد ہے اور اس موضوع پر ایک اچھوتا کام ہے۔ معارف الحدیث جلد نمبر ۵، ص ۹ پر حضرت مولانا علی میاں ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالی نے مصنف محترم (حضرت مرحوم) کو خاص مناسبت اور اس سے بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا اور اس طرح یہ موضوع (حدیث) ان کے لئے محض علمی ذہانت کا نتیجہ نہ رہا بلکہ ذوق طبعی بن گیا اور ان تمام وجوہ سے جو اللہ تعالی کا خاص انعام ہیں ان کو اس موضوع پر لکھنے کا استحقاق حاصل تھا اور بلا کسی مدح وتملق کے عرض کیا جاتا ہے کہ وہ اس کا حق ادا کرنے میں بہت کامیاب ہوئے"۔

حضرت مرحوم کافی عرصہ سے بیمار تھے، اسی بیماری میں انہوں نے اپنے وقت موعود پر
باقی صفحہ ۹۳ پر

ماہنامہ "اشراق" لاہور
جناب منظور الحسن

مسلمانانِ ہند کے لئے ایک بڑا حادثہ

☆

۴ر مئی ۱۹۹۷ء کو دنیائے اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین م
وفات پاگئے۔ ان کا اس دنیا سے رخصت ہونا ملت اسلامیہ اور خاص طور پر
ایک بہت بڑا علمی حادثہ ہے۔ بر صغیر نے گذشتہ دو صدیوں میں جو عظیم
کئے، وہ ان میں ممتاز تھے، ہندوستان کے در و دیوار گواہ ہیں کہ اس مجسمہ
ایک ایک لمحہ دین اسلام کی نصرت و حفاظت میں گذرا، درس و تدریس، ارشاد و ہدایت، اور وعظ و نصیحت ہی ان کے شب و روز کے مشاغل تھے۔ وہ ہندوستان کے ان چند علماء میں سے تھے جنھیں علوم اسلامیہ میں فی الواقع رسوخ حاصل تھا۔ دینی حمیت کے معاملے میں ہندوستان میں ان کا ثانی شاید کوئی نہیں تھا، فتنہ قادیانیت ہو، خاکسار تحریک ہو یا مشرکانہ عقائد کے حاملین ہوں، وہ تمام زندگی ان کے مقابلے میں دین کے محافظ بن کر کھڑے رہے، ان فتنوں کے خلاف انھوں نے خطابت کے میدان میں بھی جنگ لڑی اور تحریر کے میدان میں بھی۔ اس جنگ میں معلوم ہوتا ہے، کہ خدا کی نصرت ہمیشہ ان کے شامل حال رہی۔

مولانا منظور نعمانیؒ اگرچہ پوری زندگی تصوف کے داعی اور مبلغ رہے۔ لیکن اس کے باوجود عام مشرکانہ اعمال اور بدعتوں کی بیخ کنی کے لئے انھوں نے بے پناہ خدمات انجام دیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے توحید پر ایمان کو راسخ کیا۔ ہندوؤں کی تقلید میں مسلمانوں میں در آنے والی قبر پرستی، غیر اللہ سے استعانت اور اس طرح کی دوسری قباحتوں سے مسلمانوں کو بچانے کی بھرپور سعی کی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی دینی خدمات کو قبول فرمائے اور انھیں آخرت میں بلند درجات سے نوازے۔ آمین۔

مولانا مودودی نے اپنے کام کے آغاز میں جب دار الاسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم

کرنے کا پروگرام بنایا تو مولانا نعمانی نے اس ادارہ میں شمولیت کی پر زور خواہش کی۔ مولانا نعمانی ادارے کے تاسیسی اجلاس میں تو شریک ہوئے لیکن مولانا کے طرز زندگی کے بارے میں کچھ تذبذب ہو جانے کی بنا پر انھوں نے ادارے کی رکنیت اختیار نہیں کی.....

بالآخر مولانا نعمانیؒ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت پر کسی قدر مطمئن ہو گئے۔ چنانچہ جب جماعت اسلامی کا تاسیسی اجلاس ہوا، تو اس میں مولانا منظور نعمانیؒ نے بھرپور شرکت کی۔ اس موقع پر جماعت کی امارت کے لئے انھوں نے ہی مولانا مودودی کا نام پیش کیا۔ مولانا منظور نعمانی اس موقع پر نائب امیر بھی منتخب ہوئے۔ اس کے بعد "الفرقان" "ترجمان القرآن" ہی کی طرح جماعت کا ترجمان بن گیا۔ لیکن جماعت کی تاسیس کے تقریبا دو سال بعد ہی انھوں نے جماعت سے علاحدگی اختیار کر لی۔ علاحدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا

"میری یہ علاحدگی کسی اصولی اختلاف کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کا باعث، دراصل کچھ شخصی قسم کی چیزیں ہوئی ہیں، جن کے باوجود وابستہ رہنا میں نے اپنے لئے صحیح نہیں سمجھا اور ان کا اطمینان بخش اصلاحی حل بھی میں نہیں پا سکا، نیز میری یہ علاحدگی صرف اس مخصوص نظام جماعت سے ہے۔ یعنی میں اب اس کا باضابطہ رکن نہیں رہا ہوں، اس لئے اگرچہ جماعت کی باضابطہ شرکت اور اس کی ذمہ داریوں سے میں سبک دوش ہو چکا ہوں، لیکن پھر بھی اس کے اصل مقصد کے ساتھ میری وابستگی ویسی ہی ہے اور میں اللہ پاک سے اس راہ میں جدوجہد کی بیش از بیش توفیق مانگتا ہوں۔ (مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت ص ۶۹)

لیکن بعد ازاں انھیں جماعت اسلامی کے فکر سے بھی، جو درحقیقت سید مودودی کا فکر تھا، بنیادی اختلاف پیدا ہو گیا۔ انھوں نے جماعت کے فکر کی بنیادی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" پر سخت تنقید کی۔ وہ لکھتے ہیں:

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ مودودی صاحب سے ایسی خطرناک غلطی (اللہ، رب، دین اور عبادت جیسی دین کی بنیادی اصطلاحات کے بارے میں یہ سمجھنا اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرنا کہ صدیوں سے جمہور علمائے امت، ان کا جو مطلب سمجھ رہے ہیں وہ غلط یا ناقص تھا۔) کیوں ہوئی؟ تو میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ بیسویں صدی کے اس دور میں جب کہ ساری دنیا میں سیاست اور سیاسی اقتدار کے مسئلہ نے دوسرے تمام مسائل سے زیادہ قیامت اور جنت ودوزخ کے مسئلہ سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔۔۔۔۔۔ اس سیاست زدہ فضا اور ماحول میں مولانا مودودی صاحب نے اپنی دعوت و تحریک کو خاص کر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہوں میں وقیع اور مقبول بنانے کے لئے ضروری سمجھا کہ کلمہ لاالہ الااللہ، اور عقیدہ توحید کی اور اس طرح اسلام کی ایک نئی سیاسی تشریح کی جائے اور اسی کو دعوت کی بنیاد بنایا جائے (مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت ص ۹۳۔۹۴)

مولانا نعمانیؒ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں ان کی شہرہ آفاق کتاب معارف الحدیث ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی اس کے علاوہ انھوں نے تفہیم دین کے سلسلے میں سادہ اور عام فہم اسلوب میں متعدد کتابیں تحریر کیں یہ کتابیں عوام الناس میں بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں "اسلام کیا ہے" "آپ حج کیسے کریں" "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے" اور "دین و شریعت" جیسی کتابیں اسلامی لٹریچر میں نہایت ممتاز اور منفرد درجہ رکھتی ہیں مولانا منظور نعمانی کی تحریروں کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے۔

> یہ مولانا کا بہت بڑا امتیاز تھا کہ آپ نے اس وقت انگریزی داں طبقہ کے سامنے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے اور خود نوجوان علماء کے سامنے دین کو ایسی زبان میں اور ایسی تعبیر کے ساتھ اور ایسی ترکیب و انتخاب کے ساتھ اور ایسی حسنِ تفہیم کے ساتھ پیش کیا جس کی مثال بہت کم ملے گی۔
>
> (الفرقان جون ۱۹۹۷ ص ۲۴)

مولانا منظور نعمانی کی دینی اور علمی خدمات اتنی وسیع ہیں کے انہیں شاید ممکن ہی نہیں اس لئے ان الفاظ کی تائید ہی پر کفایت کی جاسکتی ہے جو مولانا ابر نے مولانا منظور نعمانی کی وفات کے موقعے پر کہے ہیں:

> اللہ کی نعمت کے طور پر اور اس زمانے کے حالات کو دیکھ کر کہئے کہ ایک کرامت کے طور پر مولانا کا وجود تھا اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لیے جو اجتماعی جگہوں پر بہت کم کیے جاتے ہیں تصنیف کرنے والے دعوت سے گریز کرتے ہیں جلسوں میں تقریر کرنے والے کے لئے تصنیف مشکل کام ہے اس لئے کہ وہ یکسوئی کی طالب ہے بقدر ضرورت دینی ملی کاموں میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے تعمیری سیاست کے ذریعہ ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ جامعیت عطا فرمائی مولانا نے تمام سرگرمیوں کے ساتھ رسالہ الفرقان نکالا جو برصغیر کا ایک ممتاز دینی و دعوتی ماہنامہ تھا بلکہ وہ ایک ایسا مکتب خیال اور مدرسہ فکر تھا جس سے لوگوں کی رہنمائی ہوتی تھی توحید خالص اور سنت صحیحہ کا پیغام ملتا تھا۔
> مولانا کی وفات ملت کا ایک عظیم خسارہ ہے پھر ان کی معذوری جس کی مدت مہینوں سے متجاوز ہو چکی تھی وہ ملت کا نقصان تھا۔ مولانا کی وفات سے ملت کا ایک بڑا سرچشمۂ قوت بند ہو گیا اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے ان کے کارناموں کو زندہ رکھے اور ان کی تصنیفات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائے ——————— (الفرقان جون ۱۹۹۷ء ص ۲۰)

"ہفتہ وار جدید مرکز لکھنؤ"

جناب محمد مسعود

عالمِ اسلام کی بلند مرتبہ شخصیت

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

۴؍ مئی ۹۷ء کو ممتاز عالم دین، محدث اور صاحب طرز ادیب مولانا محمد منظور نعمانی کی وفات کے ساتھ علمی و تصنیفی سرگرمیوں اور عملی جد وجہد کے ایک طویل دور کا خاتمہ ہو گیا۔

مولانا منظور نعمانی بیک وقت امور دینیہ کے ممتاز و مستند عالم، ماہر حدیث، بلند مرتبت صحافی اور صاحب طرز ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ معرفت و سلوک کے میدان کے بھی رمز شناس تھے، توحید خالص، احیاء سنت و شریعت اور رد بدعت کے سلسلہ میں انھوں نے جس جرأت واستقامت کا ثبوت دیا اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ انھوں نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور اپنے ایک قدیمی فیصلہ کے مطابق کسی تنظیم میں کوئی عہدہ بھی قبول نہیں کیا لیکن سیاست کے اتار چڑھاؤ پر ان کی ہمیشہ نظر رہی اور ملت اسلامیہ پر جب بھی کوئی کڑا وقت آیا وہ تصنیف و تالیف کے گوشۂ عافیت سے نکل کر عملی میدان میں بھی آئے، وہ مسلم مجلس مشاورت کے نہ صرف بانیوں میں تھے بلکہ جب تک مشاورت اپنے اصل نہج پر چلتی رہی وہ اس کے مرکزی رہنماؤں میں سے تھے اور اس سلسلہ میں انھوں نے ملک کے دور دراز علاقوں کے سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ وہ جماعت اسلامی کے بھی بانیوں میں سے ایک تھے لیکن نظریاتی اختلافات کی وجہ سے انھوں نے بعد میں اپنے کو اس تنظیم سے الگ کر لیا اور اس بارے میں اپنے خیالات کا بھی پوری بیباکی کے ساتھ اظہار کر دیا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے بھی وہ بانی ممبروں میں تھے، اس کے علاوہ دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلماء اور رابطہ عالم اسلامی مکہ کی مجلس شوریٰ کے بھی وہ ایک

طویل عرصہ سے رکن تھے۔

مولانا نعمانی کی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں دار العلوم دیوبند کا خاص رول رہا ہے۔ اپنی تعلیم کے دوران یہاں انھیں جن اساتذہ سے فیض اٹھانے کا موقع ملا وہ اپنے اپنے فن کے امام تھے۔ مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی جیسے اکابرین دین کی صحبت نے ان کی شخصیت کو اس طرح نکھارا کہ وہ مسلک دیوبند کے ایک عظیم مبلغ بن گئے۔ اسلامی معاشرہ میں در آئیں بیجا رسوم اور بدعات کے خلاف اپنے مضبوط قلم اور تقریروں سے انھوں نے جو جہاد چھیڑا وہ دار العلوم دیوبند کی علمی وروحانی فضاؤں کا ہی نتیجہ تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے بد عقیدہ لوگوں کی اصلاح کے لئے مناظرے بھی کئے اور آریہ سماجیوں سے مناظرہ کر کے مسلمانوں کو گمراہ ہونے سے بچایا۔ مناظروں میں ان کی زبردست کامیابیاں علوم دینیہ پر ان کی مضبوط گرفت کے ساتھ دوسرے عقائد اور مذاہب کے بارے میں ان کی گہ
بین ثبوت ہے۔ تاہم انھیں جلد ہی اس کا احساس بھی ہو گیا کہ محض مناظ
درستگی اور اصلاح کا کام نہیں ہو سکتا اس لئے اس راستے سے ہٹ کر انھو
ذریعے احیاء سنت و شریعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور ۱۹۳۴ء میں بریلی ــ
کیا(۱) جو بعد میں لکھنؤ منتقل ہو گیا اور آج تک جاری ہے۔

''الفرقان'' کے ذریعہ مولانا نعمانی نے دینی علوم و مسائل کی اشاعت کی جو خدمت انجام دی اور تاریخ کی بلند مرتبہ اسلامی شخصیتوں سے اپنے قارئین کو روشناس کرانے کا جو فریضہ ادا کیا وہ بلاشبہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے ایک سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں اور علوم دینیہ کی بنیادی باتوں کو بہت ہی سادہ اور عام فہم زبان میں لوگوں تک پہونچایا۔ اسلام کیا ہے؟، دین و شریعت، تذکرہ مجدد الف ثانی، اور ملفوظات حضرت مولانا الیاس جیسی کتابوں نے اسلام کی صحیح اسپرٹ اور اس روح کو پیش کیا جو اصل مقصد تھا۔ اسلام کے صحیح عقائد کے سلسلہ میں انھوں نے سمجھوتہ تو دور خاموشی اختیار کرنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا اور اس سلسلہ میں جب ضرورت پڑی اپنی بات کو پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ سامنے لانے میں انھوں نے کبھی کوئی ہچک نہیں دکھائی چاہے اس کی زد کسی پر پڑتی ہو۔ اسی طرح معاشرت اور معاملات میں بھی حق گوئی سے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹے اور اپنے وقت کے بڑے سے بڑے عالم یہاں تک کہ خاص تعلق والے اپنے دوستوں سے ٹکرا گئے۔

---

(۱) الفرقان کی اشاعت مناظرانہ دور کے بعد نہیں اسی دور میں شروع ہو گئی تھی۔ (مرتب)

اس کے ساتھ ہی وہ اتنے وسیع القلب بھی تھے کہ جب کبھی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور کسی مرحلہ پر انھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ غلط تھے تو اپنی عالمانہ شان اور انا کو پس پشت ڈال کر انھوں نے کھلے بندوں اعتراف بھی کیا۔

اس کی متعدد مثالیں الفرقان کے شماروں اور ان لی تحریروں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مسلم مجلس مشاورت کے بانی صدر ڈاکٹر سید محمود کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے ایک جگہ کہا ہے کہ میں اگرچہ ذاتی طور پر ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے سو فیصدی متفق تھا کہ تقسیم کا مطالبہ مسلم لیگ کی بہت بڑی غلطی تھی لیکن اس کو مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ یہ بات عام تقریروں میں اس طرح کہی جائے۔ جبکہ ڈاکٹر سید محمود کا کہنا تھا کہ جب تک ہندوستانی مسلمان ذہنی طور پر اس کو تسلیم نہیں کر لیں گے کہ تقسیم کا مطالبہ ایک غلط مطالبہ تھا اسوقت تک وہ صحیح راستہ پر نہ آ سکیں گے۔ اس سلسلہ میں مولانا نعمانی آگے مزید کہتے ہیں۔ انھیں کے لفظوں میں

"اس موقع پر میں یہ اعتراف کر لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ گذشتہ آٹھ سال کے تجربے نے مجھے بھی اسی نتیجہ پر پہونچا دیا جس پر ڈاکٹر صاحب بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔"

صحافت کی تاریخ میں الفرقان اپنے خصوصی نمبروں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ و دیگر تاریخی شخصیتوں اور دور حاضر کی بڑی ہستیوں پر جو عالمانہ شان کے معیاری نمبر نکالے وہ جہاں ایک طرف مقصد سے ان کی گہری وابستگی کا ثبوت ہے وہیں ان کی صحافتی صلاحیتوں کی مثال بھی۔ حضرت مولانا یوسف صاحب اور مولانا نسیم احمد فریدی پر خصوصی نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔ اپنے جریدے اور دیگر تصانیف سے انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی فکر اور تحریک کو عام لوگوں تک پہونچایا اور آسان سادہ زبان میں ایسی ایسی معلومات فراہم کرا دیں جو برسوں برس لائبریریوں میں بیٹھ کر بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اپنی بات واضح اور دوٹوک لفظوں میں بے تکلفی سے کہہ دینے کی جس علمی نثر کو انھوں نے فروغ دیا وہ خالص زبان و ادب کی بھی ان کی ایک بڑی خدمت ہے۔ ان کی تصنیفات اگر صرف زبان سیکھنے کے لئے پڑھی جائیں تو طالب علم کو وہ ادراک حاصل ہوگا جو کم سے کم اس زمانہ کے مشہور راویوں کو پڑھنے سے نہیں ہو سکتا۔

یہ دار العلوم دیوبند کا ہی فیضان تھا کہ ان کے اپنے وقت کی بڑی روحانی و دینی شخصیتوں

سے قریبی روابط تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا جیسی شخصیات کے ساتھ ان کی قربت اور تبلیغی جماعت سے ان کی عملی وابستگی نے ان کی شخصیت کو اس طرح نکھار دیا کہ ان کے بے پناہ علم کی راہ میں نہ ان کا عمل مانع ہوا، اور نہ ہی ان کی علمی و تصنیفی مصروفیتوں کا ان کی عملی سرگرمیوں پر کوئی اثر پڑا، اپنی علمی و تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک صاحب حال بزرگ بھی تھے اور اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ عبد القادر رائے پوری کی مجلسوں نے انھیں معرفت اور سلوک کی ان منزلوں سے بھی روشناس کرایا جس کے بغیر دین و شریعت کی صحیح روح کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"واقعہ یہی ہے کہ تصوف جیسا کہ شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ") نے فرمایا ہے۔ دین و شریعت کی روح اور اس کا جوہر ہے اور صوفیائے کرام ہی اس دولت کے حامل وامیں ہیں اور جس طرح جسم کبھی روح سے ــــ سکتا اسی طرح امت مسلمہ اپنے دینی وجود میں کبھی تصوف اور صوفیائے ربانی سے بے نیاز "

سچ یہ ہے کہ مولانا منظور نعمانی کی شخصیت اتنی ہمہ جہت اور مختلف پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ انھیں احاطۂ تحریر میں لانا آسان نہیں ہے ۔ ۔ ۔
اور کارناموں پر تو اہل علم ہی روشنی ڈال سکیں گے ہم یہاں ان کے سب سے قریبی دوست اور ہم مسلک حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ان تاثرات کے ساتھ اپنی بات ختم کرتے ہیں۔

"مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا وجود ایک کرامت کے طور پر تھا اور اللہ نے ان کو جو جامعیت اور امتیاز عطا کیا تھا وہ کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔ ان کے انتقال سے ملت کا نقصان ہوا اور ایک بہت بڑا چشمۂ قوت بند ہو گیا۔ لیکن اللہ ان کے کارناموں کو زندہ رکھے اور ان کی تصنیفات سے لوگ استفادہ کریں۔" (شمارہ ۱۱ر مئی ۱۹۹۷ء)

صفحہ ۸۶ کا بقیہ

ہنستے، مسکراتے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور اپنے پیچھے بہت سی غمزدہ جماعتوں، تنظیموں، اداروں اور بہت سے افراد کو چھوڑ کر اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔

اب ان کی یادیں ہیں، خدمات جلیلہ ہیں، انکے تشنہ کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے، ان کے اسلوب و فکر کو زندہ رکھنا ہے اور اپنی بھی تیاری کرنی ہے کہ آج ہم تعزیت پیش کر رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دوش عظمت پر سوار ایک جنازہ کو دیکھ رہے ہیں جس پر رحمت پروردگار پھول برسا رہی ہے.... کل ہماری بھی باری ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں۔ اس میں نہ عمر کی قید ہے نہ وقت کی پابندی۔ (نئی دنیا ۳ر جون ۱۹۹۷ء)

گلہائے تاز

خاص نمبر کے لئے لکھے جانے والے مضامین
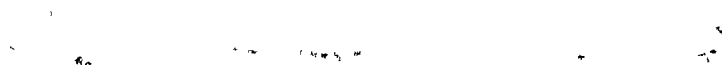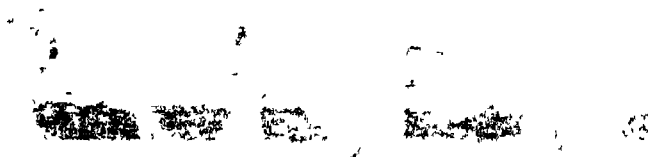
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

رفیقِ محترم

عالم ربانی، داعی الی اللہ وخادم دین مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی ذات کم سے کم
ہندوستان کے دینی و علمی حلقہ اور خصوصیت کے ساتھ راقم کے حلقۂ احباب
تعارف نہیں، شاید دو حقیقی بھائیوں میں بھی اتنی قریبی رفاقت، یکجہ
اور اتحاد فکر و عمل رہا ہو جو ہم دونوں میں تھا، سلوک و تربیت، تحریک ود
خیال کے علاوہ تقریباً ۱۵ سال کے قریب (لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع محمد
یکجائی رہی، پنج گانہ نمازوں میں معیت و شرکت، اجتماع سے خطاب و درس۔
یکجائی سالہا سال قائم رہی۔ دہلی کے مرکز تبلیغ اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضری، ان کی دعوت میں شرکت و ہم سفری، پھر رائے پور، سہارنپور کی حاضری، عارف باللہ، و مرشدِ زمانہ حضرت مولانا عبدالقادرؒ صاحب رائے پوریؒ سے انتساب وارادت، پھر رابطہ العالم الاسلامی مکہ معظمہ کی رکنیت اور شرکت میں رفاقت اور سفر حج وزیارت مدینہ طیبہ میں بار بار مصاحبت، اتحاد خیال و اتحاد عمل یہ سب وہ خصوصیتیں اور امتیازات ہیں جو ان دو شخصوں میں کم دیکھنے میں آتے ہیں جن کا مولد و منشاء، مدرسہ و دانشگاہ، شہر و وطن اور خاندانی انتساب الگ الگ ہو۔

مولانا ایک حادثہ کے نتیجہ میں جو دارالعلوم دیوبند سے واپسی پر سواری پر پیش آیا تھا، پھر اس میں دوسرے سفر میں اور اضافہ ہو گیا تھا تقریباً دس سال تک اضطراراً نہ صرف خانہ نشین بلکہ صاحب فراش رہے، اس طویل مدت اور اضطراری حالت میں بھی وہ افادۂ مسلمین اور خدمت دین سے کنارہ کش اور منقطع نہیں رہے مشہور دینی مجلہ "الفرقان" ان کے مضامین وافادات سے مزین و معمور رہا، اور بھی کچھ املائی و تلقینی خدمات وافادات جاری رہے لیکن یہ مجبوری و معذوری بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۲۶ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ (مطابق ۴ مئی ۱۹۹۷ء) کو انھوں نے سحر نرسنگ ہوم میں جہاں وہ کئی دن سے زیر علاج واستراحت تھے داعی اجل کو لبیک کہا اور

سفر آخرت اختیار کیا، ۲۷ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ (۵ مئی ۹ بجے صبح دار العلوم ندوۃ العلماء میں عالم ربانی مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی نے نماز جنازہ پڑھائی، راقم انتقال کے دن رائے بریلی میں تھا صبح آٹھ بجے لکھنؤ حاضر ہو گیا اور نماز جنازہ میں شرکت کی، دار العلوم ندوۃ العلماء کے وسیع میدان میں صفیں لگ گئیں، خود دار العلوم میں مقیم افراد (طلبہ واساتذہ) کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہی ہے، اس کے علاوہ ملحقہ مدارس و مکاتب اور شہر کے محلوں سے بہت بڑی تعداد میں لوگ آگئے، شہر کی انتظامیہ نے ٹریفک کو روک دیا، پانی کے ٹینکر بھی مہیا کر دیئے، دو گھنٹہ میں یہ جنازہ آخری منزل تک پہنچا اور اس خادم دین، عالم ربانی کو سپرد خاک کیا گیا عفر الله له ورفع درجاته۔

۲۷ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ (مطابق ۵ مئی ۱۹۹۷ء) کو بعد نماز مغرب دار العلوم ندوۃ العلماء (جس میں مولانا نے کئی سال تدریس حدیث کا عمل بھی جاری رکھا اور جس کے وہ مستقل رکن انتظامی اور مشیر و معاون تھے) جلسۂ تعزیت و دعا منعقد ہوا، راقم نے وہاں جو تعزیتی تقریر کی اور اپنی طویل رفاقت اور علمی تجربات و مشاہدات کا خلاصہ پیش کیا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے

حمد و ثنا کے بعد!

"ومن احسن قولا ممن دعا الی الله وعمل صالحاً وقال انی من المسلمین"

شرکائے مجلس، برادران، ورفقائے عزیز!

میرے لئے اس وقت بڑی آزمائش کی بات ہے کہ میں اپنے رفیق مخلص، رفیق فاضل، رفیق مکرم، محبوب رفیق اور رفیق رفاقت طویلہ بلکہ رفاقت اطول حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمتہ اللہ علیہ (پہلی مرتبہ رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے بلکہ کہنا ضروری ہے) کے متعلق کچھ عرض کروں، یوں تو تعلقات و روابط کی کثرت، واقفیت کے وسیع میدان اور دینی خدمات کے مختلف انواع واقسام سے تعلق و ربط ہونے کی وجہ سے مجھے بارہا اس طرح کا ناخوش گوار فریضہ انجام دینا پڑا ہے اور ہندستان ہی نہیں مشاہیر عالم اسلامی اور مشاہیر مصلحین اور اہل کمال کے بارہ میں اپنے مشاہدات وتاثرات اور انکے فضل و کمال کا اظہار کیا ہے، لیکن اس وقت مجھے جو آزمائش پیش آرہی ہے اور اس سلسلہ میں جو مجاہدہ کرنا ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں، اسکی خاص طور پر دو وجہیں ہیں۔

ایک تو مولانا کا فضل و کمال، ملت اسلامیہ پر انکے حقوق واحسانات اور دوسرے میرا وسیع تعلق، یکجا زندگی گذارنا، یکجا رہنا، اس کی مدت تقریباً نصف صدی ہے، اس سب کی وجہ سے

مجھے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کا اندیشہ ہے اس کے ساتھ ان دقتوں اور ذمہ داریوں کا احساس بھی ہے جو مجھے متفکر بنائے ہوئے ہے، میں جو کچھ کہوں گا وہ ان کے حق کی ادائیگی نہیں ہوگی بلکہ اپنے فرض کی ادائیگی ہوگی اور یہ واقعہ ہے کہ فرض کی ادائیگی بڑی مشکل ہوتی ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مولانا ان راسخین فی العلم میں سے تھے جن کی مثال کم ملتی ہے، خصوصاً اس زمانہ میں علمی انحطاط اور علمی انتشار، تحریکوں کی کثرت، مشغولیتوں کی فراوانی اور ان کا تنوع اتنا ہے کہ علم میں رسوخ حاصل کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے، لیکن جو لوگ مولانا سے اجمالی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں اور اسکی تصدیق کریں گے کہ مولانا ہندوستان کے ان منتخب اور محقق ممتاز علماء میں شامل ہیں جنہیں علوم اسلامیہ میں رسوخ حاصل تھا، اور یہ معمولی بات نہیں ہے وسعت معلومات، وسعت مطالعہ، تصنیف و تالیف کی صلاحیت، یہ سب چیزیں بہت عام اور کثرت سے پائی جاتی ہیں، لیکن علمی رسوخ یہ بہت اونچی
ہے، میں خدا کے گھر میں بیٹھ کر اس کی شہادت دیتا ہوں کہ مو
کلام میں اور فرق منحرفہ و محرّفہ کے بارے میں جو وسیع معلوما
واقفیت اور ان کی کمزوریوں اور ان سے پیدا ہونے والے خطرا
ہندوستان کے کم علماء کو حاصل ہوگا، جن لوگوں نے یہاں ان سے ترمذی [illegible] اسکی شہادت دیں گے، پھر ان کی جو کتابیں ہیں وہ بتاتی ہیں کہ ان کو علم میں کتنا رسوخ حاصل تھا۔ پھر زمانہ کی نبض شناسی، نئی نسلوں کی ضروریات اور ان کی نفسیات اور تقاضوں سے گہری واقفیت اور ان کے ذہنوں کی گہرائیوں تک پہنچنا اور ان کو متاثر کرنا یہ اپنی جگہ پر ایک کمال ہے اس کے ساتھ علم میں رسوخ اور اس کو پیش کرنے کی صلاحیت، انتخاب کی صلاحیت، ذہنوں کی رعایت یہ ایک خاص چیز ہے، جن لوگوں نے مولانا کی کتابیں پڑھی ہیں خاص طور پر ان کی کتاب "معارف الحدیث" جو اس مسجد میں عصر بعد سنائی جاتی ہے کم از کم اردو لٹریچر میں یہ بے نظیر کتاب ہے، جس طرح حدیث و سنت کو پیش کیا گیا ہے جس طرح اس سے سبق لینے اور احادیث کے مختلف پہلوؤں اور مخفی گوشوں کو ابھارا گیا ہے وہ بے مثال ہے، ان کی عام فہم اور مقبول عام کتاب "اسلام کیا ہے"؟ نیز "آپ حج کیسے کریں"؟ "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے"؟ "دین و شریعت" وغیرہ وہ کتابیں ہیں جو ممتاز ہی نہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے منفرد ہیں، اپنے مقصد، حسن انتخاب، حسن تعبیر، حسن بیان، حسن تفہیم اور ذہنوں کی رعایت کی بنا پر اس کو توفیق الٰہی ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

مولانا نے دیوبند کے چوٹی کے اساتذہ مولانا سید انور شاہ کشمیری صاحبؒ جیسے حضرات سے تعلیم حاصل کی تھی اس لئے ان کو علم میں بڑا رسوخ اور کمال حاصل تھا، ان کا یہ رسوخ آخر عمر تک باقی رہا، ہمارے مشاہدہ اور علم میں یہ بات ہے کہ بعض حضرات کو ابتدائی دور میں رسوخ فی العلم حاصل ہوتا ہے لیکن جوں جوں ان کی مشغولیتیں بڑھتی جاتی ہیں زندگی کے تقاضے، راحت و آرام اور خانگی زندگی کے مطالبات بڑھتے ہیں، دینی و ملّی اور سیاسی جد و جہد میں حصہ لینا پڑتا ہے ان سے متاثر ہو کر بلکہ ان سے دب کر وہ ایسے ہو جاتے ہیں کہ صحیح عبارت کا پڑھنا بھی ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے لیکن مولانا کا رسوخ فی العلم آخر تک باقی رہا جو بہت کمیاب بلکہ نادر بات ہے، یہ نتیجہ ہے ان کے والدین کے حسن نیت، ان کے اساتذہ کرام کی للہیت و خلوص و ربانیت کا پھر مولانا کی محنت و خلوص اور مسلسل علمی اشتغال کا کہ ان کا تعلق علم سے برابر قائم رہا، آخر تک علمی رسوخ و پختگی باقی رہی اسکا میں عینی شاہد ہوں اور قریب ترین رفیق کی حیثیت سے مجھے خود اس کا تجربہ ہے۔

مولانا کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی حمیت دینی ہے، ایک ہے حمایت، دوسری چیز ہے، حمیت، حمایت میں وہ اندرونی جذبہ اور دل سوزی نہیں ہوتی، وہ دل کی تپش اور ذہن کی خلش اور وہ اضطراب و بے چینی نہیں ہوتی جو حمیت میں ہوتی ہے حالانکہ حروف دونوں کے متقارب ہیں اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیتِ دینی کا جو جوہر عطا فرمایا تھا وہ کم لوگوں کو ملتا ہے، ہو سکتا ہے دینداری، عبادت گزاری، تہجد اور شب بیداری اور ذکر و شغل میں دوسرے لوگ بڑھے ہوئے ہوں لیکن دینی غیرت و حمیت کی دولت و نعمت سے مولانا مالا مال تھے، حمیت یہ ہے کہ دل میں آگ سی لگ جائے، سوزش پیدا ہو جائے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیا خطرات درپیش ہیں مسلمانوں کی آبادی کا کیا حشر ہوگا خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کا کیا انجام ہوگا۔

تقسیم کے بعد مسلمانوں کے یہاں رہنے کے سلسلہ میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں بات واضح نہیں تھی کہ مسلمان اب کیسے رہیں گے لیکن مولانا کا ذہن بہت واضح تھا اور ان کے سامنے کام کا پورا نقشہ بنا ہوا تھا یہ اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو حمیت جیسی نعمت سے نوازا تھا یہ ایک نفسیاتی نکتہ اور تجربہ کی بات ہے کہ حمیت بھی ہمیشہ یکساں باقی نہیں رہتی اس لئے کہ علم جتنا بڑھتا اور معلومات و تجربات میں جتنی وسعت ہوتی جاتی ہے حمیت میں اسی اعتبار سے کمی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ احساس ہی ختم ہو جاتا ہے جو لوگ عجائب گھر اور میوزیم دیکھتے رہتے ہیں ان کے اندر استعجاب کا مادّہ باقی نہیں رہتا وہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ

سب چیزیں یکساں ہیں لیکن میں عینی شاہد کی حیثیت سے گواہی دیتا ہوں کہ اپنے وسیع علم و مطالعہ اور مشاہدہ کے ساتھ مولانا کے اندر دینی حمیت و غیرت بھری ہوئی تھی۔

میں نے مولانا کو سب سے پہلے "دارالمبلغین" میں مولانا عبدالشکور صاحب کے پاس دیکھا اسکے بعد تعارف و ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جب میری کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" شائع ہوئی تو جن خاص خاص لوگوں کو کتاب بھیجی ان میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ بھی تھے مولانا نے کتاب ملنے کے بعد خط لکھا اس میں انہوں نے تحریر کیا کہ 'یہاں جو وقت ڈاک کا ہوتا ہے وہی کھانے کا ہوتا ہے آپ کی کتاب آئی تو میں اسمیں اتنا مشغول ہو گیا کہ میرے لئے کھانا مشکل ہو گیا میں اس سے بہت متاثر ہوا، اس زمانے میں ہندوستان میں ایک نئی تحریک چلی تھی جس کے بانی علامہ مشرقی نام کے تو مشرقی تھے لیکن ذہنی و فکری لحاظ سے علامہ مغربی تھے وہ خاکسار تحریک تھی جو اس دور کی خطرناک ترین تحریک تھی اس وقت ہندو -
تحریک نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ مقبولیت حاصل کی،
مولانا کو غالباً سب سے پہلے اس کا احساس ہوا کہ اگر یہ تحریک
جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے اس کا رابطہ ہو جاتا ہے تو ایمانی ربط
نہیں رہیگا، معروف و منکر اور کفر و ایمان میں کوئی فرق باقی نہیں رہیگا ...
تھے وہ زیادہ تر سیاسی و تنظیمی مقاصد تھے مولانا اس وقت رائے بریلی تشریف لائے اور انہوں نے مجھے آمادہ کیا کہ میں اسکی ذمہ داری قبول کروں کہ ایک جماعت بنائیں اور تحریک چلائیں اور میں اسکی قیادت اور ترجمانی کروں میں نے مولانا سے عرض کیا کہ یہ کام اس شخص کے سپرد کر چاہئے جو انگریزی پر پوری قدرت رکھتا ہو انگریزی میں تقریر کر سکے بیان دے سکے اور اخبارات میں مضامین لکھ سکے انہوں نے کہا وہ کون ہے؟ تو میں نے اپنے پیر بھائی حاجی عبدالواحد صاحب مشورہ دیا جو انگریزوں کے دور میں پورے پنجاب میں ایم۔اے۔ انگریزی میں فرسٹ ڈویزن پا ہوئے تھے ان دنوں وہ فورٹ سنڈیمن میں تھے، چنانچہ ہم رائے بریلی سے پنجاب میل میں س ہو کر لاہور پہنچے وہاں مولانا مودودی سے ہم لوگوں نے ملاقات کی پھر حاجی عبدالواحد صاحب سے ملنے فورٹ سنڈیمن گئے جو کوئٹہ سے آگے تھا اور درہ بولان ہو کر راستہ جاتا تھا ہم تینوں مشورہ کیا پھر طے ہوا کہ اپنی جماعت بنانے سے پہلے ان دینی و دعوتی مراکز اور خانقاہوں کا کرنا چاہئے جہاں کام ہو رہے ہیں چنانچہ ہم لوگ سہارنپور ہوتے ہوئے رائے پور پہنچے، حضر مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے مشورہ پر ہم لوگ مرکز نظام الدین آئے وہاں

جماعت کے نظام کو بچشم خود دیکھا حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے ملاقاتیں کیں بالآخر ہم نے اپنی صلاحیتیں اس جماعت کی نصرت وحمایت اور استحکام کیلئے وقف کردیں ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے بڑے بڑے اجتماعات میں شریک ہوئے پورے ملک کا سفر کیا باہر بھی گئے جہاں تک تبلیغی جماعت کی افادیت اور ضرورت کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں، جو کچھ ہم سے تعاون ہو سکتا تھا وہ ہم نے کیا جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے یہاں دینی وجود کے متعلق جتنا مولانا کا ذہن صاف اور واضح تھا اتنا کسی بڑے سے بڑے عالم کا نہیں تھا مولانا نے یہاں کے جو حالات سمجھے اور خطرات اور اندیشوں کا ادراک کرلیا وہ مولانا ہی کا حصہ تھا۔

راوڑ کیلا اور جمشید پور کے بھیانک فسادات میں پانچ ہزار (۵۰۰۰) مسلمان مارے گئے کھیتوں اور گھروں کے اندر مسلمانوں کے سر تربوز اور خربوزہ کی طرح پڑے ہوئے تھے خون کے چھینٹے دیواروں پر لگے ہوئے تھے، مولانا نے سب سے پہلے ان علاقوں کا دورہ کیا انہوں نے مجھے آمادہ کیا کہ تم جاکر دیکھ آؤ، چنانچہ میں مولانا ابوالعرفان خان صاحب ندوی مرحوم کے ساتھ وہاں گیا، تعلیم یافتہ ہندوؤں سے ملاقاتیں کیں لوگوں کی رائے ہوئی کہ کوئی تنظیم قائم ہونی چاہئے تاکہ ملت کے دین اور تہذیب کی حفاظت کی تدبیر کی جائے، اور اس ملک کو اسپین بنانے سے بچایا جائے، چنانچہ "مسلم مجلس مشاورت" کی تجویز ہوئی، اس کے بڑے محرک اور داعی ڈاکٹر سید محمود تھے، ہم اور مولانا اس میں شریک ہوئے پھر کرناٹک وغیرہ کے سفر ہوئے۔

مولانا کا امتیازی وصف جو کم علماء کو نصیب ہوا ہے وہ فرق محرّفہ و منحرفہ سے گہری واقفیت اور ان کے خطرات و نقصانات کا احساس وادراک ہے، کون کون فرق محرّفہ ہیں اور کون غیر محرّفہ، ان فرقوں کیلئے محاذ بنانا اور اسکو اپنا فرض سمجھنا جتنا مولانا نے اس میدان میں کیا اتنا شاید مولانا مرتضٰی چاندپوری نے کیا ہو میرے سامنے انکا پورا کام نہیں ہے مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے قادیانیت کا مقابلہ کیا اور اسکے خطرات کا ادراک واحساس کیا، انہوں نے مونگیر میں قادیانیوں سے مقابلہ کیلئے مولانا مرتضٰی صاحب چاندپوری کو مدعو کیا جب تک مناظرہ ہوتا رہا مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سجدہ میں پڑے رہے جب انکو شکست فاش ہوئی اور جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگے تو مولانا نے سجدہ سے سر اٹھایا۔ قادیانی ہوں یا بریلوی ان سب کا مقابلہ مولانا نعمانی نے جتنا کیا اتنا شاید ہی کسی نے کیا ہو مولانا زبردست مناظر تھے وہ فرق باطلہ اور فرق منحرفہ کی کتابوں سے بہت گہری واقفیت رکھتے تھے اور ان کی بہت سی عبارتوں تک کے حافظ تھے وہ اس

طرح عبارت زبانی سناتے کہ جیسے دیکھ کر پڑھ رہے ہوں اس درجہ مولانا کا استحضار اور حافظہ قوی تھا کہ اس میں مولانا کا کوئی شریک نہیں۔ مولانا نے شرک وبدعات کا جم کر مقابلہ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کو شرک کے اثرات سے بچایا، بدعقیدگی، اشراک باللہ، عبادت قبور، استعانت بغیر اللہ، استغاثہ بغیر اللہ سے بچایا ہندوستان جیسے ملک میں یہ کام بڑا خطرناک اور نزاکتوں سے بھرا ہوا تھا، عالم عربی میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور مصر وشام میں شیخ حسن البناءؒ اور دوسرے علماء اٹھے اور انہوں نے کام کیا لیکن ہندوستان میں (حضرت سید صاحبؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور چند علمائے مصلحین کے بعد) کماً وکیفاً جتنا کام مولانا نے کیا وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے اور کسی کا کام ہو جو ہمارے علم میں نہیں۔

۱۹۵۱ء میں لکھنو میں تبلیغی مرکز کی عمارت بنی، ہم دونوں کے ایک مخلص نے اسکی تعمیر اس انداز سے کی کہ ہم دونوں یہاں ساتھ رہ سکیں، مولانا اس وقت بلوت
میں ہم دونوں منتقل ہو گئے، پھر تو شب وروز کا ساتھ ہونے لگا ناشتہ
نمازوں میں بھی ساتھ، خطاب اور سفروں میں بھی رفاقت رہی، مو
اخلاقی صفات، ذہنی کمالات اور تصنیفی سرگرمیاں سب کھلی کتاب کی
اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت کام لیا، حضرت رائے پوریؒ سے بیعت کا تعلق تھا وہ
قیامت میں جب اللہ تعالیٰ سوال کریگا کہ کیا لائے؟ تو میں دو آدمیوں کا نام لوں گا پہلا نام مولانا محمد منظور نعمانی کا لیا، انکے اندر اللہ تعالیٰ نے متضاد صفات وصلاحیتیں ودیعت فرمائی تھیں جنکے اندر تضاد تو نہیں لیکن عملاً تضاد معلوم ہوتا ہے کسی کو علمی اشتغال ہوتا ہے تو عملاً دعوت کے کام میں لگنا مشکل ہوتا ہے ہم سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو بڑے داعی ہیں لیکن مہینوں ہو جاتے ہیں کہ انکو کتاب دیکھنے کی نوبت نہیں آتی لیکن مولانا نے دونوں کو جمع کرر کھا تھا۔

مولانا اگرچہ دیوبند کے فاضل اور اسکی مجلس منتظمہ کے رکن تھے لیکن اسکے ساتھ ندوۃ العلماء کی تحریک سے بھی اور ندوۃ العلما کے ادارہ سے بھی انکا مخلصانہ تعلق رہا ہے انہوں نے یہاں کے ذمہ داروں کی درخواست بلکہ اصرار پر حدیث کی تدریس کی ذمہ داری قبول فرمائی، طلبہ نے ان سے فائدہ اٹھایا، ندوۃ العلماء کی انتظامیہ کے طویل عرصہ تک رکن رہے، مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام کے بنیادی رکن تھے، اس کی سرپرستی اور قلبی تعلق برابر باقی رہا، سنا ہے کہ اس بیماری میں جب ہوش وحواس بجا تھے کوئی عیادت کے لئے گیا تو انھوں نے کہا کہ جی چاہتا ہے کہ ندوہ جاؤں۔

مولانا نے نازک وقتوں میں بھی اپنی اصابت رائے اور تجربات سے ندوہ کو فائدہ پہنچایا، ندوہ کا جب پچاسی سالہ جشن ہونے والا تھا تو ہمیں فکر تھی کہ اس کی صدارت کے لئے کون موزوں شخصیت ہوگی تو مولانا نے (جب کہ ہم دونوں رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے گئے تھے، حج کا زمانہ بھی تھا) شیخ الأزہر الامام الاکبر عبدالحلیم محمود کی رائے دی، جو صوفی منش تھے اور متشرع قسم کے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کے طور پر اور اس زمانے کے حالات کو دیکھ کر نعمت نیز کرامت کے طور پر مولانا کا وجود تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ کام لیا جو اجتماعی جگہوں پر بہت کم کئے جاتے ہیں، تصنیف کرنے والے دعوت سے گریز کرتے ہیں، جلسوں میں تقریر کرنے والوں کے لئے تصنیف مشکل ہے، اس لئے کہ وہ یکسوئی کی طالب ہے، بقدر ضرورت دینی و ملّی کاموں میں اور سیاسی جدوجہد میں بھی حصہ لینا ضروری ہوتا ہے، تعمیری سیاست کے ذریعہ ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ جامعیت عطا فرمائی تھی۔

مولانا نے تمام سرگرمیوں کے ساتھ رسالہ "الفرقان" نکالا جو برصغیر کا نہ صرف ایک ممتاز دینی و دعوتی ماہنامہ تھا بلکہ وہ ایک ایسا مکتب خیال اور مدرسہ فکر تھا جس سے لوگوں کی ذہنی و فکری رہنمائی ہوتی تھی، توحیدِ خالص اور سنت صحیحہ کا پیغام ملتا تھا، ملّی و دینی شعور بیدار ہوتا تھا۔

مولانا کی وفات ملت کا ایک عظیم خسارہ ہے، پھر ان کی معذوری جس کی مدت مہینوں سے متجاوز ہوگئی تھی ملت کا نقصان تھا، مولانا کی وفات سے ملت کا ایک بڑا سرچشمۂ قوت بند ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، ان کے کارناموں کو زندہ رکھے اور ان کی تصنیفات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔

(۲)

شہری جلسے کی تقریر تعزیت

[ندوۃ العلماء کے تعزیتی جلسے کے بعد لکھنؤ شہر کے پیمانے پر ایک تعزیتی جلسہ ۱۱ر مئی ۹۷ء کو قیصر باغ بارہ دری میں آل انڈیا دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام حضرت مولانا مدظلہ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اس جلسے میں حضرت مولانا نے جو تقریر بحیثیت صدر کونسل ارشاد فرمائی اس کی جداگانہ افادیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوا کہ اس ضمن میں وہ بھی درج کردی جائے، یہ تقریر بھی ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ کرلی گئی تھی۔ اسی ٹیپ کی مدد

اس کو مرتب کر کے ذیل میں پیش کیا جارہا ہے ــــــــــــــــــــــ ادارہ]

حمد و ثنا کے بعد ا   میرے بزرگو، بھائیو، دوستو اور عزیزو!

ایک رفیق کار کی حیثیت سے، حالات پر نظر رکھنے والے ایک انسان کی حیثیت سے، ایک جہاں دیدہ سیاح کی حیثیت سے، ایک سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے، جس کے لئے سوانح نگاری اور تاریخ خاندانی مشغلہ ہو، پھر جس کے قلم سے متعدد عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات پر کتابیں بھی نکلی ہوں، اس حیثیت سے مجھے اپنے محترم و موقر، محبوب ا، ایک ط مقتدیٰ اور قابل تعظیم رفیق کار کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہئے العلماء کے تعزیتی جلسے میں سب بہت تفصیل سے عرض کر دیا تھا، ا کرتا ہوں کہ اس کے بعض پہلو ایسے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کا حق ادا

اس وقت میں ہندوستان کے ان خاص حالات کے حوالے سے ہمارے رفیق محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (۱) نے کیا، کہنا چاہوں گا کہ یہاں کے حالات مسلمانوں کے لئے ایسے پیچیدہ، نازک، حساس، بلکہ متضاد پہلو لئے ہوئے تھے، یہ حالات سب ملکوں میں پیش نہیں آیا کرتے، یہ حالات ایک ایسی روشن دماغ، درد مند، حقیقت پسند، حقیقت بین اور مبصر و جامع شخصیت کو چاہتے ہیں، جو وقت کی نزاکتوں کو متضاد عناصر کو، پوشیدہ خطروں اور مشتبہ بلکہ خطرناک نیتوں اور ارادوں کو دیکھ سکے اور ان کے مطابق کام کرے۔

مولانا منظور صاحب نعمانی کا میں سمجھتا ہوں کہ بڑا امتیازی کمال تھا، اللہ تبارک و تعالیٰ کا خاص انعام تھا کہ انھوں نے اس ملک کے خطرات کو سمجھا، اور یہ خطرات صرف غیر مسلموں کی طرف سے نہیں، وقت کی حکومتوں یا سیاسی تحریکوں اور تنظیموں ہی کی طرف سے پیدا ہونے والے نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کی اپنی حالت کی طرف سے جو خطرات تھے یعنی دینی تنزلی، کمزوری، بے حمیتی، بے عملی اور شرک و بدعات ان سب چیزوں کو سامنے رکھا اور اس حقیقت کو سمجھا کہ یہ ملک مسلمانوں کے لئے دوسرا اسپین نہ بن جائے۔

اسپین وہ ملک ہے جہاں مسلمانوں نے صدیوں تک بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی اور

---

(۱) جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل۔

پھر وہاں ایسے علماء پیدا ہوئے، ایسی دینی فضا چھائی رہی اور ایسا شریعت پر عمل رہا کہ جس طرح ان کے (اہل اندلس 'اسپین') کے فقہی مذہب یعنی مالکی مذہب کا مشہور مسئلہ تھا کہ اہل مدینہ کا عمل اس بات کی دلیل اور علامت ہے کہ یہی حکم شریعت اور سنت ہے۔[عمل اهل المدينةِ حُجَّةٌ] ایک مدت کے بعد وہاں کے علماء کا فتویٰ یہ ہو گیا اور یہی لوگوں کا مذہب بن گیا کہ قرطبہ جو ان کا دارالسلطنت تھا اس کا عمل بھی شرعی حجت اور اس بات کی دلیل ہے کہ یہی حکم شریعت ہے، نہ محض ایک مقامی رسم و رواج۔ چنانچہ وہاں کی تاریخ کے اس دور میں یہ فتویٰ لکھا ہوا ملتا ہے کہ [عمل اهل القرطبة حجة] تو یہی ملک، یہی اسپین جس کی دینی فضا کا یہ حال تھا، اور جس میں شیخ اکبر شیخ محی الدین ابن عربی جیسی شخصیت پیدا ہوئی کہ ان کے بارے میں کچھ بھی اختلاف ہو لیکن ان کا لقب شروع سے شیخ اکبر چلا آرہا ہے، پھر موطا امام مالک کے کیسے کیسے شارح وہاں پیدا ہوئے، کیسے کیسے ادیب و شاعر پیدا ہوئے۔ اندلس اور قرطبہ کی تاریخی عظمت جاننے کیلئے اور کچھ نہیں تو علامہ اقبال کی مسجد قرطبہ والی نظم ہی پڑھ لیں تو کافی ہے۔ اس جامع قرطبہ میں دو رکعت نماز پڑھ کے جو یہ نظم، یہ قصیدہ انھوں نے کہا ہے وہ انہی کی شاعری میں نہیں بلکہ مؤرخانہ شاعری جس میں تاریخی حقائق کا بیان ہوتا ہے اس میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی اسپین کا حال یہ ہے کہ کہیں اذان کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ کسی کو آپ نماز پڑھتا نہیں دیکھیں گے۔ جامع مسجد قرطبہ میں تو نماز پڑھنا گویا قانوناً ممنوع ہے۔

اللہ کی توفیق سے ہمیں اس اسپین میں جانے کا بھی موقع ملا ہے، حسنِ اتفاق کہ ڈاکٹر اشتیاق صاحب بھی ساتھ تھے۔ ہم دونوں وہاں گئے۔ طلیطلہ سے لیکر فرانس سے ملانے والی آخری سرحد تک، وہاں سے موجودہ دارالسلطنت میڈرڈ (Madrid) تک۔ سب سے بڑھ کر قرطبہ اور اسکی جامع مسجد میں بھی جانا ہوا، اور ہم نے بھی وہاں علامہ اقبال کی طرح کسی طور پر نماز پڑھ ہی لی۔

الغرض یہ اُس مسلم اسپین کا حال اندر اور باہر کے عوامل کی وجہ سے ہوا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مولانا کا بڑا امتیاز تھا کہ ایک طرف اُن کی نظر ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے انحرافات، اُن میں دین فہمی کی کمی، دین کے فرائض اور مطالبات کے سلسلے میں تغافل اور اُس کی خطرناکی پر تھی، اور دوسری طرف مسلمانوں کے ملّی وجود اور اُن کی ایک ممتاز ملت کی حیثیت کو باہر سے ہمسایہ قوموں سے جو خطرات لاحق ہو رہے تھے اور جو اسپین کے سے حلات اس سرزمین ہند میں بھی پیدا ہو جانے کا اندیشہ پیدا کر رہے تھے جہاں وہ مجدد اور اولیاء اللہ

پیدا ہوئے جس کی مثال عالم اسلام میں ملنی مشکل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسی شخصیت، حضرت شاہ ولی اللہ جیسی شخصیت، اسکے علاوہ سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی، ایک ہی وقت میں ایسے کئی اشخاص جہاں پیدا ہوئے وہاں خطرہ ہو گیا ہے کہ یہاں کے مسلمان صرف تاریخی طور سے مسلمان نہ رہ جائیں کہ تاریخ میں ان کا نام مسلمان لکھا جائے۔ لیکن عمل کے لحاظ سے، نمایاں امتیاز کے لحاظ سے ان میں کوئی بات باقی نہ رہے۔ عربی اور فارسی تو بڑی چیز ہے اردو تک سے مسلمان نا آشنا ہو جائیں۔ ہندو دیومالا (میتھالوجی) کے اثرات اُن کی نئی نسلوں پر طاری ہو جائیں۔ وہ اپنی ثقافت اور کلچر کھو بیٹھیں۔

مسئلے کے یہ دونوں پہلو اگرچہ متضاد نہیں ہیں، پھر بھی ان میں سے ایک ہی انسان کی توجہ کیلئے کافی ہے۔ اُسے دوسری طرف کیلئے فرصت کی نوبت ہی آنا مشکل
جامعیت اور اُن کا خاص امتیاز و کمال تھا کہ اُن کی توجہ مسلمانوں کے ا۔
تقاضوں پر بھی رہی اور اُن مخالفانہ منصوبوں اور خطرات پر بھی جو باہر
کر رہے تھے۔ جیسا کہ میں نے ندوۃ العلماء کے تعزیتی جلسے میں کہا تھا اللہ۔
تھی کہ ایک طرف حمایت کا جذبہ بھی تھا کہ دین کی حمایت کی جائے، دینی مراکز ں مایت ں جائے، دینی شخصیتوں کی حمایت کی جائے اور تاریخی شخصیتوں کی حمایت کی جائے۔ اور اس طرح حمیّت بھی تھی کہ وہ کسی مشرکانہ عقیدے کو، کسی کھلی ہوئی بدعت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔
اللہ نے اُن سے وہ کام لیا جو اپنے عہد کی ممتاز ترین شخصیتوں سے لیا کرتا ہے۔

یہ سب چیزیں میں نے تفصیل سے ندوۃ العلماء کے جلسے والی تقریر میں پیش کی ہیں۔
یہ ایک ایسے شخص کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں ہیں جو مشرق و مغرب کو دیکھے ہوئے ہے ع

مرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

یہاں سے لیکر مغرب اقصیٰ کے آخری حدود تک، اور جہاں تک غیر مسلم ممالک کا تعلق ہے امریکہ، کناڈا اور یورپ کو بار بار دیکھا اور اسلامی دنیا میں کوئی قابل ذکر نمایاں ملک نہیں رہا جہاں ہمارا گناہ گار قدم اور گنہ گار وجود نہ پہنچا ہو۔ اور اِس کے بعد ہمارا یہ اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اللہ تعالے نے مولانا میں یہ دونوں چیزیں بہ یک وقت پیدا کیں۔ دین کی حمایت بھی اور

غیرت وحمیّت بھی۔ اور اُن سے وہ کام لیا جو اپنے عہد کی ممتاز ترین ہستیوں سے لیا جاتا ہے۔

آخر میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ جلسہ بارہ دری میں، وسطِ شہر میں ہو رہا ہے میں اہل لکھنؤ سے تعزیت کرتا ہوں کہ ایک شہری کی حیثیت سے، یہاں کے ایک بہت بڑے دینی ادارے اور یہاں کی دینی تحریکات اور دینی سرگرمیوں کے ایک حقیر دینی سپاہی کی حیثیت سے میں اپنے ہم وطن شہریوں سے تعزیت کرتا ہوں کہ اللہ نے اس شہر سے ایک ہستی اُٹھالی جس کی وجہ سے رحمتوں کا نزول ہوتا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالی کی رحمتوں، نعمتوں کا نزول علمائے ربانی کے وجود سے ہوتا ہے۔ بہت سی بلائیں ٹلتی ہیں۔ اسکی مثالیں آپ کو تاریخ میں ملیں گی اور دینی نصوص میں بھی۔

میں اپنے ہم شہر بھائیوں سے تعزیت کرتا ہوں کہ یہاں سے ایک ایسی ہستی اُٹھالی گئی جس کی وجہ سے نہ صرف دینی رہنمائی مضامین کے ذریعے اور تقریروں اور مواعظ کے ذریعے سے ہوتی تھی بلکہ اُسکے رہنے سے بھی ایک برکت تھی اور اللہ تبارک وتعالی کی ایک نگاہِ کرم تھی۔ اس لحاظ سے میں اپنے سب بھائیوں سے تعزیت کرتا ہوں۔

[اسکے بعد مولانا نے بڑی دیر تک دعا فرمائی اور اِس دعا ہی پر جلسہ ختم ہو گیا۔]

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن
مہتمم دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

دارالعلوم دیوبند سے وابستہ دیرینہ یادوں کے نقوش و تاثرات

انسان کے اوصاف سعادت میں حق و صداقت کی پہچان اور اس کا اتباع ایک
انسان بڑے خوش نصیب اور وہ روحیں بہت سعید ہیں جنھوں نے اپنی زند
سانچے میں ڈھال لیا ہو اور پروردگار نے آخر حیات تک انہیں اس کی تو
تمام فیصلوں میں ہر طرح کی عصبیت اور جانبداری سے دامن بچا کر صرف ن د
نصب العین قرار دیں، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے

فَبَشِّرْ عِبَادِيَ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ اَحْسَنَه، (زمر آیت ۱۸) — پس میرے ان بندوں کو خوش خبری سنائیے جو (ہر) بات سنتے ہیں اور اس میں سے اچھی بات کا اتباع کرتے ہیں۔

یعنی اللہ کے جو بندے ہر طرح کی باتوں کو سننے کے بعد اچھی باتوں کو قبول کریں اور اسی کی پیروی کریں وہ خوش خبری کے مستحق ہیں پھر ان ہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا۔

اُولٰئِكَ الَّذِينَ هَدٰهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آیت بالا) — یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور یہی لوگ اہل عقل ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ مندرجہ بالا صفت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پروردگار کی ہدایت ان کے شریک حال ہو جاتی ہے اور عقل کے صحیح استعمال کی وجہ سے اولوالالباب اور اہل عقل کا خطاب بھی انہیں لوگوں کے لئے موزوں ہے۔
حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ، ہماری معلومات کی حد تک سعادت سے ہمکنار انہیں

توفیق یافتہ انسانوں میں تھے جنھوں نے ہمیشہ حق و صداقت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا اور ان کی زندگی اسی محور کے ارد گرد گھومتی رہی۔

دار العلوم دیوبند سے ان کے ابتدائی اور طالبعلمانہ تعلق میں بھی توفیق ایزدی کی یہی روح کار فرما نظر آتی ہے کہ ان کے والد مرحوم جناب صوفی احمد حسین صاحب ذوق و مشرب کے اعتبار سے اہل دیوبند سے قریب نہیں تھے لیکن اس کو توفیق خداوندی ہی کہا جائے گا کہ انہوں نے اس اختلاف کے باوجود اپنے فرزند کو حدیث پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دیوبند بھیجنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح مولانا نعمانیؒ کو خداوند قدوس نے طالب علمی ہی کے زمانہ سے اولئك الذين هدٰهم الله کے انعام کا مستحق بنادیا، پھر یہ کہ اس تعلق نے ان کے والد مرحوم کے ذوق و مشرب کو بھی بڑی حد تک تبدیل کر دیا۔

مولانا نعمانی ۲۳؍ شوال ۱۳۴۳ھ کو دار العلوم دیوبند میں حاضر ہوئے، (جب کہ ان کی عمر ۱۹ سال تھی) ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدرسة الشرع سنبھل سے معقولات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دیوبند پہنچے تھے، امتحان داخلہ دینے کے لئے جن کتابوں کے نام درج ہیں ان میں قاضی مبارک، امور عامہ، صدرا، توضیح وغیرہ شامل ہیں، ممتحن نے ان کتابوں میں کامیابی کے نمبرات دے کر انہیں مشکوٰۃ شریف کی جماعت میں داخل کیا، پورے سال وہ انہماک کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے اور امتحان سالانہ میں انہوں نے مندرجہ ذیل نمبرات حاصل کئے۔(۱)

۱۔	مشکوٰۃ شریف	۵۱
۲۔	هدایه اخیرین	۵۰
۳۔	جلالین شریف	۵۰
۴۔	دیوان حماسه	۵۰
۵۔	سبعه معلقه	۴۶
۶۔	شرح نخبة الفكر	۴۴
۷۔	سراجی	۴۳

۱۳۴۴ھ کے سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی کے بعد وہ ۱۳۴۵ھ میں دورۂ حدیث

(۱) یہاں یہ واضح رہے کہ دار العلوم میں نمبروں کی زیادہ سے زیادہ مقررہ حد ۵۰ ہے۔ لیکن پرچہ اگر بہت اچھا حل ہو تو روایت ہے کہ ممتحن کچھ نمبر بڑھا دیتا ہے۔

داخل ہوئے، یہ سال حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی صدارت کا آخری سال تھا، مولانا نعمانیؒ نے پورے سال تمام باکمال اساتذہ سے استفادہ کیا اور اس سال انہوں نے دورۂ حدیث میں امتیازی نمبرات حاصل کئے، پوری جماعت میں اول قرار دیئے گئے، دورۂ حدیث کے نمبرات کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔	مسلم شریف	۵۳
۲۔	بخاری شریف	۵۱
۳۔	ابو داؤد شریف	۵۱
۴۔	ترمذی شریف	۵۱
۵۔	موطا امام محمد	۵۱
۶۔	نسائی شریف	۵۰
۷۔	طحاوی شریف	۵۰
۸۔	موطا امام مالکؒ	۵۰
۹۔	شمائل ترمذی شریف	۴۹
۱۰۔	بیضاوی شریف	۴۸
۱۱۔	ابن ماجہ شریف	۴۵

طالب علمانہ زندگی کی یہ باتیں دارالعلوم کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا نعمانیؒ نے حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، پھر دارالعلوم کے اکابر اساتذہ سے علم و عمل کی جو دولت حاصل کی تھی اسکی اشاعت میں سرگرم عمل ہوگئے، مختلف مدارس میں کام کیا، مختلف دینی و ملی تنظیموں کی سرگرمیوں میں حصہ لیا، فرق باطلہ کے زعماء کو مناظروں کے میدان میں گھسیٹا اور شکست فاش دی، بریلی سے مجلہ الفرقان جاری کیا، ان سب خدمات کا تذکرہ اور ان کی تفصیلی سرگزشت دیگر مضامین میں آئے گی، میرا مقصد تو صرف یہ بیان کرنا ہے کہ فراغت کے بعد موصوف کا کوئی ضابطہ کا تعلق تو دارالعلوم سے نہیں تھا لیکن وہ جہاں بھی کوئی خدمت انجام دے رہے تھے ان سب کو دارالعلوم سے حاصل کردہ دینی حرارت کا مظہر اور دارالعلوم سے حاصل کردہ امانت کی تقسیم سمجھنا چاہئے۔

اسی وجہ سے وہ اپنی تمام سرگومیوں میں اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے برابر رابطہ قائم

رکھتے تھے، ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، یہاں تک کہ فراغت کے صرف اٹھارہ سال بعد ان کا دارالعلوم سے ضابطہ کا نہایت مستحکم تعلق قائم ہو گیا کہ وہ ۱۳۶۳ھ میں مجلس شوریٰ کے ممبر نامزد ہو گئے اور اس طرح اکابر دارالعلوم کی جانب سے ۴۰ سال سے کم عمر میں انہیں اعتماد کی سب سے بڑی سند اور اعزاز کا سب سے اونچا منصب عطا کر دیا گیا۔

جس مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۶۳ھ میں شوریٰ کی رکنیت کے لئے منتخب کیا، اس میں مندرجہ ذیل اکابر شریک تھے۔

۱۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب
۲۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
۳۔ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قائم مقام صدرالمدرسین
۴۔ جناب حاجی رشید احمد صاحب
۵۔ جناب حافظ محمد یوسف صاحب انصاری
۶۔ جناب مولانا حافظ محمد اشفاق صاحب
۷۔ جناب مولانا حکیم مشیت اللہ صاحب
۸۔ جناب مولانا حکیم محمد یٰسین صاحب
۹۔ جناب مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب
۱۰۔ جناب مولانا حکیم محمد صادق صاحب
۱۱۔ جناب شیخ ضیاء الحق صاحب

اس زمانہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ، صدر المدرسین تھے، لیکن حضرت موصوف کی گرفتاری اور نظر بندی کی وجہ سے صدارت تدریس کا کام قائم مقام کے طور پر شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب انجام دے رہے تھے، اس سلسلے میں جو تجویز منظور کی گئی اس کا پورا متن یہ ہے۔

تحویر نمبر ۱ ایجنڈے کا پہلا نمبر پیش ہوا، اس کے متعلق مہتمم صاحب کی رپورٹ پڑھی گئی، اس میں مولانا حفظ الرحمٰن کا نام ہے مگر ان کی معذوری ظاہر ہے کہ وہ نظر بندی کی حالت میں ہیں، دوسرا نام حضرت مولانا محمد حسن صاحب قاضی بھوپال کا ہے، مجلس ان کو ان کے تقدس اور خدمات قدیمہ دارالعلوم اور ان کے ضعف کی وجہ سے دفعہ ۱۳ کے تحت حاضری جلسہ سے مستثنیٰ کرتی ہے، ان کی تحریری رائے مجلس میں ان کی حاضری کے قائم مقام ہو گی، تیسرا نام

مولانا محمد صادق صاحب کا ہے وہ خود تشریف لے آئے ہیں لہٰذا ان کا معاملہ ختم ہو گیا، باقی تین حضرات خواجہ فیروز الدین صاحب، مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی اور مولوی محمد سہول صاحب کے متعلق مجلس نے کثرت رائے سے فیصلہ کیا کہ ان حضرات کو افسوس کے ساتھ رکنیت مجلس سے سبکدوش کیا جاتا ہے، جناب حاجی رشید احمد صاحب کی رائے یہ تھی کہ اس وقت ان کو توجہ دلائی جائے اور بصورت عدم شرکت ان کی علاحدگی کا مسئلہ آئندہ مجلس میں پیش ہو، خالی شدہ اسامیوں کو پر کرنے کے لئے مہتمم صاحب نے مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا بشیر احمد صاحب کھوری کے نام پیش کئے جو کثرت رائے سے منظور کئے گئے۔

یہ مجلس شوریٰ ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۰/ مئی ۱۹۴۴ء کو ہوئی۔ اس کے بعد حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ۲۰/ جماد[illegible]
نعمانی صاحب کے نام رکنیت شوریٰ کی اطلاع پر مشتمل مکتوب گرامی تح[illegible]

حضرة المحترم ..   .   . زید مجدکم السامی

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ منعقدہ [illegible] جمادی الاولیٰ ۶۳ھ نے جناب کا اسم گرامی رکنیت شوریٰ کے لئے منتخب کر کے پاس کیا ہے اسلئے ملتمس ہوں کہ مجلس کے اس انتخاب کو قبول فرما کر منظوری سے اطلاع فرمائی جائے اور مجالس کے جلسوں میں جو سال بھر میں دو دفعہ ہوتے ہیں شرکت فرما کر مفید مشوروں سے خدام دارالعلوم کو ممنون فرمایا جائے۔

جناب کی ذات گرامی کا سفر خرچ آمد و رفت ہر جلسہ کے موقع پر دارالعلوم کے ذمہ ہوگا جو کہ جناب پرچہ مصارف دے کر طلب فرمائیں گے۔

میری مکرر درخواست ہے کہ جلسوں میں شرکت سے گریز نہ فرمایا جائے کیونکہ ممبری کا مقصد محض نام اور نامزدگی نہیں بلکہ کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے معاملات سے باخبر رہکر کارکنوں کو مشورہ اور رائے سے امداد دیا جانا، ان کے تفکرات میں ہاتھ بٹانا اور جو عمل میں مبتلا ہیں ان سے معاملات کا صحیح علم حاصل کر کے اس پر رائے قائم کرنا اور ان کی اعانت فرمانا ہے، یہ بغیر جلسوں میں آئے بلکہ موقع بموقع یوں بھی دارالعلوم میں تشریف لا کر یہاں کے حالات و ضروریات سے مطلع ہوئے بغیر ممکن نہیں، اس لئے میری سہ کرر درخواست ہے کہ کم از کم

جلسوں کے موقع پر تو شرکت اشد ضروری ہے۔
یہاں کے اصول کے مطابق تین جلسوں میں بلا معذرت عدم شرکت پر مجلس دوسرے انتخاب پر غور کرتی ہے اس لئے درخواست بار بار کی گئی۔ امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔

والسلام

(احقر) محمد طیب غفرلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۰۔۵۔۱۳۶۳ھ

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمہ اللہ، کا مکتوب گرامی وصول کر کے، حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی رحمہ اللہ نے ۱۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۳ھ کو رکنیت شوریٰ قبول کرنے سے متعلق جو مکتوب گرامی تحریر فرمایا تھا حسن اتفاق کہ وہ بھی فائل میں محفوظ ہے اور اس کا ایک ایک لفظ حضرت مرحوم کے خلوص، للّٰہیت، فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کا آئینہ دار ہے، لکھتے ہیں۔

مخدومی دامت فیوضکم

سلام مسنون! گرامی نامہ مشتمل بر اطلاع رکنیت شوریٰ موصول ہوا، حیرت ہوئی کہ یہ کیوں کر ہوا اور میرے کن بزرگوں کی نیک گمانی اس کا باعث بنی۔

بہر حال اپنی نااہلیت اور عدم صلاحیت کے حقیقی احساس کے باوجود اس ذمہ داری کو اس اللہ کی مدد اور توفیق کے بھروسہ پر میں قبول کرتا ہوں جو جانتا ہے کہ یہ بوجھ بلا میرے علم اور بغیر مجھ سے دریافت فرمائے میرے بزرگوں نے مجھ پر ڈالا ہے، اس سے دعا ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کی نیک گمانی کی لاج رکھتے ہوئے اس سلسلے کے صواب وسداد کی مجھے ہمیشہ توفیق دے اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں میری مدد فرمائے۔ اللھم لاتجعلنی بدعائك شقیاً وکن بی رؤوفاً رحیماً۔ اللھم الھمنی رشدی وقنی شر نفسی۔ آپ سے بھی اسی دعا کا خواستگار ہوں۔
الحمدللہ بخیریت ہوں، خدا کرے مزاج گرامی بھی بعافیت ہو۔

خادم۔ محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

گرامی نامے میں پہلے حیرت واستعجاب کا اظہار ہے، پھر اس منصب کے لئے اپنی نااہلی کا اعتراف ہے، پھر حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کی روایت وان اعطیتھا عن غیر مسئلة اُعنت علیھا کے مضمون کے پیش نظر ذمہ داری کو قبول کرنے کی اطلاع ہے اور آخر میں بارگاہ خداوندی میں دل کی مخلصانہ دعائیں ہیں۔

راقم الحروف، مجلس شوریٰ کا رکن ہونے کی حیثیت سے، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے بارے میں یہ شہادت پیش کرتا ہے کہ شوریٰ میں ان کا طرز عمل مکتوب میں پیش کردہ دونوں باتوں یعنی توفیق سداد و صواب اور حقوق دارالعلوم کی ادائیگی کا مکمل آئینہ دار تھا، اور حقیقت حال تو آخرت ہی میں سامنے آئے گی تاہم قرائن و آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دعائیں بارگاہ خداوندی میں شرف قبول سے نوازی گئیں۔ اور توفیق صواب و ادائیگی حقوق میں ان کا کردار بہت نمایاں رہا۔ معذوری کے چند آخری سالوں کو مستثنیٰ کرکے وہ پابندی کے ساتھ شوریٰ و عاملہ کی تمام مجلسوں میں شریک ہوتے رہے اور ہر طرح کی ذہنی و عملی توانائی سے دارالعلوم کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے رہے۔

ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے داخلی و بیرونی مسائل سے متعلق جب بھی کوئی کمیٹی تشکیل کی گئی تو اس میں بہت اہمیت کے ساتھ ان کا نام شامل
کے بالکل ابتدائی سالوں میں وہ دارالعلوم کی دستور ساز کمیٹی کے
ملازمینِ دارالعلوم کی ترقیات یا گریڈ پر نظر ثانی سے متعلق کوئی کمیٹ
اصلاحات سے متعلق کوئی کمیٹی مقرر کی گئی وہ برابر اس کے رکن نامزد۔

راقم الحروف بھی ۱۹۶۲ء سے دارالعلوم کی شوریٰ کا رکن ہے، اور الرچہ
محمد منظور صاحب نعمانی سے غائبانہ تعارف تو بہت پہلے سے تھا لیکن ملاقات کا شرف مجلس شوریٰ ہی میں حاصل ہوا، پھر وہیں موصوف کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا، اور اس زمانہ سے لیکر آج تک کے ارکان شوریٰ میں راقم مولانا نعمانی صاحب مرحوم کے طرز عمل سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔

- موصوف کا مجلس شوریٰ میں شرکت کا طرز عمل یہ تھا۔

(الف) وہ دارالعلوم کے معاملات میں رائے قائم کرنے سے پہلے مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال کرتے اور غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کر لیتے اسکو صاف طور پر پیش کرتے تھے، کسی کی رعایت کی بنیاد پر چشم پوشی یا مداہنت ان کی عادت نہیں تھی۔

(ب) مجلس شوریٰ کے ارکان دو حصوں میں تقسیم تھے، ایک حزب اقتدار، اور ایک حزب مخالف، اور عام طور پر ممبران کی رائے میں اپنی جماعت کے رجحانات کی رعایت پائی جاتی تھی، لیکن مولانا نعمانی مرحوم کا ان دونوں جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ خصوصی تعلق نہیں تھا، ان کی رائے ہمیشہ دارالعلوم کے مفاد کے تابع رہتی تھی۔

(ج) انھیں اپنی رائے پیش کرنے کا بڑا سلیقہ تھا، مجلس کے آداب اور تمام اراکین مجلس کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی رائے پیش کرتے تھے، بڑے محتاط الفاظ استعمال فرماتے تھے، لب ولہجہ سے تواضع اور انکسار جھلکتا تھا، بسااوقات تاثر کی شدت میں آواز بھرا جاتی تھی، کبھی آنکھیں بھی نم ہو جاتی تھیں، اور اگر وہ کسی کے بارے میں یہ سمجھ لیتے تھے کہ وہ کسی وجہ سے ان کی بات پر سنجیدگی سے غور نہیں کرپائیں گے تو وہ ان سے تنہائی میں ملتے، اپنی رائے پیش کرتے، دوسرے کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور عام طور پر یہ ہوتا کہ دوسرے کو اپنی رائے پر مطمئن کر لیتے یا دوسرے کی رائے قبول کر کے خود مطمئن ہو جاتے۔ اسی لئے دارالعلوم کے معاملات میں ان کے اخلاص و دیانت، غیر جانبداری اور اصابت رائے کو دیکھتے ہوئے راقم الحروف کا بیشتر ان سے اتفاق رائے رہتا تھا۔

(د) موصوف میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی رائے کو کبھی اپنی ذات کا مسئلہ نہیں بناتے تھے، اگر اپنی رائے کی کمزوری واضح ہو جاتی تو اس کو برملا واپس لے لیتے تھے اور اگر کمزوری بھی واضح نہ ہوتی تو مجلس کے ضابطہ کے مطابق کثرت رائے کا احترام کرتے۔ میں نے کبھی انہیں اپنی بات کی پچ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(ہ) اصابت رائے میں ان کا خصوصی مقام تھا اور مجلس ان کی رائے کو بڑی اہمیت دیتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ مجلس میں اختلاف رائے ہوا تو مسئلہ مولانا نعمانی صاحب کے سپرد کر دیا گیا اور انہوں نے جو رائے پیش کی اسی کو فریقین نے قبول کر لیا۔

حضرت مولانا نعمانی صاحبؒ کی رائے پر محول کئے جانے والے یہ مسائل بڑی اہمیت کے حامل ہوتے تھے، جیسے ممبران شوریٰ کی خالی جگہوں پر انتخاب کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ ہر اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ انہی ممبران کے ذریعہ پروردگار عالم دارالعلوم جیسی عظیم الشان روایات کی حامل درس گاہ کا نظم چلا رہا ہے اور دارالعلوم کے حال اور مستقبل کا انحصار انہی حضرات کی رائے پر ہوتا ہے۔

ایک سے زائد بار ایسا ہوا کہ ممبران کے انتخاب میں شدید اختلاف رائے کی نوبت آئی تو مجلس شوریٰ نے اس کو مولانا نعمانی مرحوم کے حوالہ کر دیا اور انہوں نے جو نام پیش فرمائے وہ سب کے نزدیک قابل قبول قرار پائے۔

مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۵، ۲۶، ۲۷ ر رجب ۱۴۰۱ھ مطابق ۳۰، ۳۱ ر مئی و یکم جون ۱۹۸۱ء میں ایسی ہی صورت پیش آئی تو مسئلہ مولانا نعمانی مرحوم کے سپرد کر دیا گیا، اور پیش کردہ

تمام ناموں کی فہرست کے ساتھ انہیں یہ اختیار دیدیا گیا کہ خواہ وہ ان ناموں میں سے انتخاب کریں یا اپنے طور پر دارالعلوم کی شوریٰ کے لئے کسی نام کو موزوں سمجھتے ہوں تو اس کو لے لیں، اور اسی مجلس کی دوسری نشست میں ان ناموں کو پیش فرمادیں، چنانچہ مولانا نعمانی صاحب مرحوم نے غور و فکر کے بعد حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی(۱) مولانا محمد عثمان صاحب دیوبندی نبیرہ شیخ الہند، اور جناب حاجی علاء الدین صاحب پالنپوری رحمہم اللہ کے نام پیش کئے جنھیں مجلس نے کسی بھی بحث و تمحیص اور کسی بھی اختلاف کے بغیر قبول کرلیا۔

مولانا نعمانی صاحب رحمہ اللہ کے مجلس شوریٰ میں شرکت کے طرز عمل کی وضاحت سے راقم الحروف اپنے اس تأثر کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ شریعت میں مشورہ کے جو مقاصد ہیں کہ ایک دوسرے کی رائے سے استفادہ کرکے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو منقح کیا جائے، پھر بہتر صورت کو اختیار کیا جائے۔ مولانا نعمانی کا مزاج اور ان کا طریقۂ کار ان تمام ش
مجلس شوریٰ میں ان کی رائے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی اور کبھی
رائے کے مطابق تجویز منظور کرلی گئی۔

مددگار مہتمم کی حیثیت سے راقم الحروف کے دوش ناتواں
تنہا مولانا نعمانی مرحوم کی پیش کردہ تجویز کو قبول کرنے کی صورت میں [illegible]
جب اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم میں اختلاف کا آغاز ہوا تو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ نے مجلس شوریٰ پر ایک مفصل تحریر پیش کی جس میں حضرت اقدس نے اپنی معذوریوں کو پیش کرتے ہوئے لکھا کہ میرے قویٰ میں اضمحلال آگیا ہے۔ بصارت بھی

---

(۱) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی رحمہ اللہ کا نام آگیا ہے تو یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ماضی قریب میں مولانا مرحوم کی وفات کے بعد بعض اہل قلم کے مضامین میں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ دارالعلوم میں اختلافات کے بعد انھوں نے مجلس شوریٰ میں شرکت ترک کردی تھے، یہ بات واقعات کے بالکل خلاف اور محض غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش ہے۔

اول تو حضرت مولانا صدیق احمد صاحب رحمہ اللہ کا انتخاب ہی دارالعلوم میں اختلاف رونما ہونے بلکہ شدت اختیار کرنے کے بعد، دارالعلوم کی انتظامیہ کی تبدیلی سے صرف ایک سال پہلے ہوا تھا، انتظامیہ کی تبدیلی جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ میں ہوئی ہے اور حضرت مولانا کا انتخاب رجب ۱۴۰۱ھ میں۔ دوسرے یہ کہ موصوف اس کے بعد اکثر مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے، ممبری قبول کرنے کے بعد منعقد ہونے والی نصف سے زائد مجلسوں میں ان کی شرکت ہے اور جس مجلس میں شرکت نہیں ہے وہاں عدم شرکت کے عذر پر مشتمل گرامی نامے ہیں، پھر شعبان ۱۴۰۵ھ مین مجلس نے ان کا استعفیٰ بھی مولانا نعمانی مرحوم کی سفارش پر قبول کیا ہے، حضرت مولانا کے استعفیٰ نامہ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

کمزور ہوگئی ہے، ذہن بھی پوری طرح مسائل کو اخذ نہیں کرتا وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے اگر یہ صورت اختیار کرلی جائے کہ منصب اہتمام پر نام تو میرا ہی رہے اور کام کے لئے کسی دوسرے کا انتخاب کرلیا جائے تو یہ دارالعلوم کے لئے بہتر رہے گا۔

ابھی ممبران شوریٰ حضرت اقدس کی تحریر کے مضمرات پر غور ہی کررہے تھے کہ اچانک مولانا نعمانی مرحوم نے کسی بھی طرح کا استفسار کئے بغیر میرا نام پیش کردیا۔ خدا گواہ کہ میرے جسم پر لرزہ طارہ ہوگیا کہ ایک ذرہ بے مقدار دارالعلوم کی کیا خدمت کرے گا لیکن ہوا یہ کہ میرے علاوہ کسی بھی ممبر نے حضرت مولانا نعمانی مرحوم کی اس تجویز سے اختلاف نہیں کیا۔ حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی مرحوم تجویز لکھنے لگے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، مولانا نعمانی مرحوم نے بڑی خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اصرار کرکے مجھے سکوت پر مجبور کردیا اور فرمایا کہ تمھاری طرف سے طلب نہیں ہے اس لئے اللہ کی مدد شامل حال رہے گی۔ دارالعلوم کی خدمت کو کار آخرت سمجھ کر انجام دینا چاہئے اور گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد جب قضاو قدر کے فیصلے کے مطابق اختلافات کی خلیج وسیع ہوئی تو اس موقع پر حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مرحوم کا کردار نکھر کر سامنے آیا اور انھوں نے جس موقف کو درست سمجھا اس کی تائید و نصرت یا بالفاظ دیگر احقاق حق میں کسی مداہنت کو راہ نہیں دی کہ مولانا نعمانی صاحب ان اختلافات سے پہلے بڑی حد تک حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ سے قریب تھے اور ان دونوں بزرگوں کے درمیان کئی طرح کے مضبوط روابط تھے لیکن مولانا نعمانی صاحب نے دارالعلوم کے مفاد کے مقابلہ پر ان روابط اور تعلقات کی رعایت نہیں کی اور جس موقف کو صحیح سمجھا اس کے لئے اپنی پوری توانائی صرف فرماتے رہے۔ اس دور میں بار بار مشکل مراحل پیش آتے رہے اور ہر مرحلہ پر ان کے خلوص وللہیت اور اصابت رائے سے استفادہ کیا جاتا رہا —— موصوف سے کبھی مراسلت کے ذریعہ مشورہ کیا گیا اور بارہا ایسا ہوا کہ گفتگو کے لئے سفر کی نوبت آئی اور ہر مرتبہ یہ فائدہ رہا کہ مشکلات کی گرہ کھل گئی۔

دارالعلوم دیوبند سے مولانا نعمانی مرحوم کے تعلقات کی تفصیلات تو بہت ہیں لیکن راقم الحروف کو مضمون لکھنے کی عادت نہیں اس لئے طالب علمی کے دور سے شوریٰ کی رکنیت تک کی مختصر باتیں اور اس سلسلے میں کچھ تاثر پیش کردیا گیا، تاکہ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی قدس سرہ کے بارے میں وہ شہادت اوراق میں محفوظ ہوجائے جو احترام کے جذبات کے ساتھ میرے سینے میں محفوظ ہے۔

باقی صفحہ ۱۲۶ پر

مولانا محمد عاشق الٰہی برنی مدینہ منورہ

اپنے اسلاف کی یادگار

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ ومن تبعہ۔

امابعد اسید الاولین والآخرین حضرت رسول اکرم ﷺ چونکہ آخر ال
تمام انسان ان ہی کی شریعت پر چلنے کے لئے مامور ہیں، اور آپ کی تر۔
اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ کے بعد آپ کے علوم اور اعمال کی حفاظت کا انتظام فرمایا ہے۔ قرآن حکیم کے بارے میں قرآن مجید ہی میں ارشاد ہے "اِنَّا نَحنُ نزلنا الذِکرَ وَاِنَّا لہُ لحافِظُونَ" (ہم ہی نے نازل کیا ہے یہ ہدایت نامہ (قرآن) اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔)

قرآن حکیم کی حفاظت اس کے الفاظ و معانی کی، احکام اسرار و حکم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی حفاظت بھی امت مسلمہ کرتی رہی ہے اور غیر منصوص مسائل میں فقہاء نے استنباط و اجتہاد کا فریضہ ادا کیا۔ یہ سب چیزیں محفوظ ہیں اور ان کو محفوظ رکھنے والے بھی ہمیشہ رہے ہیں۔ قرآن و حدیث کو محفوظ رکھنا اور ان کو آگے بڑھانا اور پھیلانا احکام پہنچانا، عمل کرنا اور عمل کرانا امت کی ظاہری اور باطنی تربیت کرنا، تزکیہ نفوس کا کام انجام دینا۔ یہ سب امور امت کے ذمہ ڈالے گئے اور الحمد للہ اکابر امت نے ہمیشہ اس ذمہ داری کو پورا کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا" یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین"(اس علم (علم دین) کو ہر زمانے کے اچھے بندے سنبھال لیں گے۔ وہ غلو و افراط والوں کی تحریفوں سے، کھوٹے سکے

رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کو میراث نہیں دی اور یہ کہ خلافت بلا فصل کے حق دار رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کو خلافت نہیں دی لہذا یہ لوگ خلافت کے غاصب ہیں۔ شروع میں تو اتنی ہی بات تھی کہ حضرت ابو بکر نے میراث نہیں دی اور خلافت غصب کرلی۔ اس کے بعد شدہ شدہ شیعیت یہاں تک پہنچ گئی کہ دو تین حضرات کو چھوڑ کر سب صحابہ کو کافر کہا جانے لگا۔ پھر جب یہ بات سامنے آئی کہ قرآن میں تو حضرات صحابہ کی تعریفیں آئی ہیں اور ان کے بارے میں رضی اللہ عنھم و رضو عنه فرمایا گیا ہے۔ تو یہ عقیدہ بنالیا گیا کہ قرآن کریم میں تحریف کی گئی ہے احد یہ کہ اللہ تعالی کو بدا ہو گیا تھا (العیاذ باللہ)۔ شیعوں کے یہ عقائد تو عام طور سے مسلمان نہیں جانتے تھے، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ نے تحفہ اثنا عشریہ میں شیعیت کا تعارف کرایا اور ان کے فرقوں اور عقائد کی نشاندہی کی۔ ان کے بعد حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی رحمہ اللہ علیہ نے شیعیت کا تعارف

واشگاف کرنے اور امت مسلمہ کو ان سے واقف کرانے کا بیڑا اٹھایا

دے خوب کام کیا اور بڑا کام کیا۔

پس جب ایرانی انقلاب سامنے آیا جو سراسر شیعی انقلاب

تعارف کرانے میں بہت سے علمائے پاکستان نے حصہ لیا حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے ہندوستان میں اس کا بیڑا اٹھایا اور "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" کے نام سے اپنی مشہور کتاب لکھی۔ اس کتاب میں شیعیت کی اصل تصویر کھینچ دی اور خمینی کے معتقدات کا اس کی اپنی تصانیف کے آئینہ میں تعارف کرادیا۔ شیعوں کو ناگوار تو بہت ہوا لیکن اہل حق ہمیشہ حق ظاہر کرتے رہے ہیں۔ حضرت مولفؒ نے کسی کی ناگواری کی کچھ پروانہ کی اور الحمد للہ کتاب بارہا چھپی اور ان شاء اللہ چھپتی رہے گی۔ اور دنیا بھر میں اس کے تراجم ہوئے۔

جہاں تک علمی لکھا پڑھی اور زبانی مناظروں کا تعلق ہے شیعہ آج تک کسی بات کا جواب نہیں دے سکے اور اپنے عقائد کو قرآن و سنت سے بلکہ حضرت علیؓ کی سیرت سے اور ان کے اقوال سے بھی ثابت نہیں کر سکے۔ باوجودیکہ دلائل سے عاجز ہیں، اپنے مسلک و مذہب کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔ پھر بھی اپنے کو دین اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اگر کوئی کافر کہتا ہے تو برا مانتے ہیں۔ ہمارے اکابر نے فرمایا ہے کہ کافر ہونے والا خود کفر اختیار کرتا ہے علماء کا احسان ہے کہ بتادیتے ہیں کہ یہ عقیدہ کفریہ ہے۔ لہذا ان حضرات کا شکر گذار ہونا چاہے۔ لیکن گمراہ لوگوں کو حق اور حقیقت کی طرف آنے کی راہ ملتی ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں

سورہ جاثیہ میں أفرأيتَ مَن اتخذَ الٰهَه هواه.........الخ کہا گیا ہے اہل حق نے ہمیشہ اظہار حق اور اعلان حق کا فریضہ ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی اسی طرف توجہ فرمائی اور خوب شرح و بسط کے ساتھ شیعیت کا تعارف کرادیا۔ ورحمه الله تعالىٰ رحمة واسعة ۔

☆☆☆

صفحہ ۱۱۸ کا بقیہ

میں بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ وہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے اعمال کو حسنات کے ترازو میں جگہ دے، ترقی درجات سے نوازے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

والحمد لله اولاً و آخراً۔

☆☆☆

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی
چیرمین ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

عہد حاضر کا مجاہد اسلامیؒ

"نگاہ اولیں" "الفرقان" اور "مولانا محمد منظور نعمانی" کے
تعارف ہوا جب ان میں سے کسی کے معنی و تعریف سے خاکسار واقف
مولوی انعام علی رحمۃ اللہ کے پاس روز اول سے ماہنامہ "الفرقان"
لکھنوی "الفرقان" سے ہوئی جو آخری بھی بنی، بریلوی سے ملاقات
جہت، وضعدار اور صاحبِ قلب و نظر تھے، سب سے تعلق رکھتے تھے مگر تعلق خاطر لکھنؤ کے صاحبِ الفرقان اور حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم سے بیحد و بیکراں تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ دونوں صاحبین، شیخین اور امامین تھے۔ صاحبِ الفرقان سے غائبانہ اور "الفرقان" اور اسکی "نگاہ اولیں" سے مشاہدانہ تعارف و تعلق بابا جانِ گرامی نے پیدا کیا، اور ان کے معانی و مفاہیم، جہات و تعریفات اور حدود و قیود سے آگاہی بخشی۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ کی "زیارتِ اوّلیں" اس صدی عیسوی کی چھٹی دہائی کے دوسرے یا تیسرے برس ہوئی جب لکھنؤ میں عظیم تبلیغی اجتماع ہوا۔ اس میں شرکت کرنے غالباً اول مرتبہ ہمارے قصبہ کی ایک نمائندہ جماعت لکھنؤ پہنچی۔ امیر جماعت کے فرزند دلبند ہونے کی بنا پر کم، بیکراں محبت پدری کی وجہ سے زیادہ، خاکسار بھی اس کا ادنیٰ بلکہ ادنیٰ ترین فرد اور کمسن ترین رکن تھا۔ اس قابل یادگار و حاملِ اثرات دیرپا اجتماع کی بے پناہ برکاتِ دیگر کے علاوہ چند چیزوں نے جو "چیزے دیگری" قسم کی تھیں، دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے اسیر محبت و تعلق کر لیا۔ حضرت مولانا محمد عمران خان ندوی رحمۃ اللہ کی لبھاتی، گدگداتی، ہنساتی اور رلاتی تقریر اور حسین و جمیل شخصیت، مولانائے محترم حضرت سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا جادو بیاں خطاب اور پرکشش سراپا، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا پرسوز و دل سوز

سورہ جاثیہ میں أفرأیتَ مَن اتخذَ الٰهَه هواه.........الخ کہا گیا ہے اہل حق نے ہمیشہ اظہار حق اور اعلان حق کا فریضہ ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی اسی طرف توجہ فرمائی اور خوب شرح وبسط کے ساتھ شیعیت کا تعارف کرادیا۔ فرحمه اللّٰه تعالىٰ رحمة واسعة ۔

☆☆☆

صفحہ ۱۱۸ کا بقیہ

میں بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ وہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے اعمال کو حسنات کے ترازو میں جگہ دے، ترقی درجات سے نوازے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

والحمد لله اولاً و آخراً۔

☆☆☆

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی
چیرمین ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

عہد حاضر کا مجاہد اسلامیؒ

"نگاہ اولیں" "الفرقان" اور "مولانا محمد منظور نعمانی" کے۔
تعارف ہوا جب ان میں سے کسی کے معنی و تعریف سے خاکسار واقف۔۔۔
مولوی انعام علی رحمۃ اللہ کے پاس روز اول سے ماہنامہ "الفرقان" آتا تھا۔ میری پہلی شناسائی لکھنوی "الفرقان" سے ہوئی جو آخری بھی بنی، بریلوی سے ملاقات کبھی نہیں رہی۔ بابا جان ہمہ جہت، وضعدار اور صاحبِ قلب و نظر تھے، سب سے تعلق رکھتے تھے مگر تعلق خاطر لکھنو کے صاحبِ الفرقان اور حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم سے بیحد و بیکراں تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ دونوں صاحبین، شیخین اور امامین تھے۔ صاحبِ الفرقان سے غائبانہ اور "الفرقان" اور اسکی "نگاہ اولیں" سے مشاہدانہ تعارف و تعلق بابا جانِ گرامی نے پیدا کیا، اور ان کے معانی و مفاہیم، جہات و تعریفات اور حدود و قیود سے آگاہی بخشی۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ کی "زیارتِ اوّلیں" اس صدی عیسوی کی چھٹی دہائی کے دوسرے یا تیسرے برس ہوئی جب لکھنو میں عظیم تبلیغی اجتماع ہوا۔ اس میں شرکت کرنے غالباً اول مرتبہ ہمارے قصبہ کی ایک نمائندہ جماعت لکھنو پہنچی۔ امیر جماعت کے فرزند دلبند ہونے کی بنا بر کم، بیکراں محبت پدری کی وجہ سے زیادہ، خاکسار بھی اس کا ادنیٰ بلکہ ادنیٰ ترین فرد اور کمسن ترین رکن تھا۔ اس قابلِ یادگار و حاملِ اثرات دیرپا اجتماع کی بے پناہ برکاتِ دیگر کے علاوہ چند چیزوں نے جو "چیزے دیگری" قسم کی تھیں، دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے اسیر محبت و تعلق کر لیا۔ حضرت مولانا محمد عمران خان ندوی رحمۃ اللہ کی لبھاتی، گدگداتی، ہنساتی اور رلاتی تقریر اور حسین و جمیل شخصیت، مولانائے محترم حضرت سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا جادو بیاں خطاب اور پرکشش سراپا، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا پرسوز و دل سوز

بیان وسر اپا تواضع وانکسار تشخص اور اعلانات و آداب کرنے والے ایک حسین و جمیل حضرت کی دلآویز شخصیت اور سحر انگیز کلمات جو حضرت خضر علیہ السلام کی مانند راہ نما اور اہبر رہے مگر تلاش کے باوجود کبھی نہ مل سکے۔

اجتماع لکھنؤ کی زیارتِ نعمانی گرچہ لمحاتی وعارضی تھی، مگر جلد ہی اسے مستقل وجاودانہ ہونا تھا۔ ۹ر جولائی ۱۹۵۳ء کو اس راقم آثم کا دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ ہوا اور تعلیم کا سلسلہ ۱۹۶۰ء کی جولائی تک جاری رہا۔ اس مدت میں حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ سے گوناگوں تعلقات اور مختلف النوع روابط رہے۔ مولانا مرحوم کو تقریباً ہر رنگ وروپ میں دیکھا اور پرکھا۔ کبھی ان کو حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کے "ثانی اثنین" کی صورت ورفاقتِ جاودانہ میں، گہے مبلغ وواعظ ومرشد کی مسند باتمکین وہوش پر، گاہ گاہ ندوہ کے مربی شیخ اور مشیر باتدبیر کے منصب جلیل پر، اکثر وبیشتر استاذ کل اور مدرس علوم وفنون کا بوریائے توکل وغنا سجائے ہوئے، مستقل مصنف ومؤلف اور مقالہ نگار اسلامی کی حیثیت دلنواز سے، خطیب جادو بیان اور مدافع صحابہ کرام کے انداز میں، اور استقلال دوامی کے ساتھ مفکر اسلامی، مؤلف ایمانی اور خادم قرآن ربانی وسنت نبوی کی پیاری جون میں، مولانا مرحوم سے ندوہ کی تعلیم کے بعد گرچہ جسمانی روابط یا مشاہداتی تعلقات کم سے کم ہوتے چلے گئے تاہم روحانی ربط وتعلق اور فکری ہم آہنگی ودل بستگی میں کبھی خلل نہیں آیا۔

اشخاص وافراد میں بہت کم خوش نصیب اور کمتر اکتسابی ہوتے ہیں جو شخصیات بنتے ہیں اور پھر شخصیات سے بلند ہو کر عبقریات کے بلند منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی اشخاص، شخصیات وعبقریات میں تھے جو پوری صدی پر چھائے رہے۔ وہ بشر تھے اور ان میں بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہ حسنات بھی تھے اور سیئات بھی مگر ان کے حسنات کہیں زیادہ روشن تر و تابندہ تر تھے۔ خاکہ نگاری اور سوانح نگاری میں ان دونوں کو میزان میں تولا جاتا ہے مگر خاکسار راقم تو نذرانۂ عقیدت وہدیۂ محبت پیش کرنے بیٹھا ہے، اس میں مکروہات کا دخل کہاں؟ اور ہو بھی تو ایسی محبوب شخصیات کی خطایا بھی پیاری لگتی ہیں۔ ان کی نگاہ اولیں سے لے کر خاتمہ بالخیر تک جس رنگ وروپ، انداز وادا، حال وقال اور صورت وشکل میں دیکھا ہے ان کی کچھ تاثراتی قلمی تصویریں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، کچھ تعمیل ارشادِ صاحب الفرقان ثانی میں، کچھ رسم وآدابِ نگارش کی خاطر اور بہت کچھ اس دل کے تقاضے سے جو ان کی محبت وعقیدت سے لبریز اور ان کے مراحم خسروانہ اور الطاف بے پایاں سے مہر آمیز ہے۔

مبلغ و واعظ نعمانی

راقم سطور نے جب تک ہوش و خرد کے ناخن ذرا کم نکالے تھے مولانا مرحوم کو زیادہ تر ایک مبلغ و واعظ کے روپ میں زیادہ دیکھا۔ ندوہ میں مدتوں تک ہر جمعرات کو عصر تا عشاء تبلیغی ہفتہ واری اجتماع اس کی حسین و جمیل مسجد میں ہوا کرتا تھا۔ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مرحوم و مغفور خطاب عام و خاص کے مستقل ارکان دوگانہ تھے۔ باقی آتے جاتے رہتے تھے کہ مسافر بھی ہوتے تھے اور راہی بھی۔ طلبہ کو بعد نماز مغرب ہی خطاب تبلیغ سننے کی اجازت تھی کہ عصر و مغرب کے مابین ان کو مومن قوی بننے کی تعلیم و تربیت فٹ بال، والی بال وغیرہ کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ اس جسمانی مشق و
مہتمم ندوہ کی پشت پناہی ہی حاصل نہ تھی بلکہ مفتی زماں و مجتہد عصر
رحمہ اللہ کا فتوائے مُبرم بھی حاصل تھا۔ ان دونوں سے اگر کوئی روگردا
نگاہ حضرت مولانا محمد اسحاق ندوی سندیلوی رحمہ اللہ کے حصار بے پناہ

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ارباب حل و عقد کی دور اندیشی، کہ خطاب عام و خاص کے ارکان دوگانہ کی گوہر افشانی مغرب کے بعد ہی ہوتی تھی۔ طلبہ و اساتذہ اور عام سامعین ہمہ تن گوش اور سراپا ہوش بنے دونوں مبلغوں کے خطاب و خطبہ سے بقدر استطاعت استفادہ کرتے۔ مولانا نعمانی مرحوم کی تقریروں کی فنی خصوصیات کو کوئی دوسرا صاحب قلم و فن اجاگر کرے گا، ہمارے گوش و ہوش پر جو اثرات وار تسامات ہیں وہ ان کی سادگیٔ بیان کو پُرکاریٔ ادا میں لپیٹ کر "از دل خیزد بر دل ریزد" کے والہانہ، عاشقانہ اور مستانہ پیکر کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ، عام فہم اور سلیس ہوتی۔ فکر عظیم، تصور بلند اور مغز شاندار ہوتا، دونوں ملکر لذتِ تقریر کو فردوس گوش بناتے اور "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کا عینی مشاہدہ کراتے۔ مولانا مرحوم کی تقریر و بیان میں اصل گرمی اور سرخوشی ان کے سوز دروں اور قلب مجنوں کی گہرائی و گیرائی سے آتی تھی جو سامعین کی سماعت اور حاضرین کی حضوری سے گذر کر ان کے قلب و جگر تک پہونچتی تھی۔ راقم سطور نے ان کی صدہا تقاریر اور ان گنت بیانات سنے، کبھی ندوہ کی مسجد و منبر سے، کبھی دارالعلوم کے قدیم و جلیل ہال میں، کبھی امین الدولہ پارک کے سبزہ زار پر اور کبھی اس سے متصل سرکاری ہال میں۔ لکھنؤ کے دوسرے مقامات بھی ان کے بیان سے معزز اور ہم سامعین بہرہ مند ہوئے، اور ان سے ہمیشہ ہی مستفید و مستفیض اور بہرہ ور و شاد کام

ہوئے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ اسکی روحانی و فکری و علمی تعمیر میں خطابِ نعمانی کی کارگیری نہیں ہے؟

پیہم رواں مربی و شیخ

مبلغ و واعظ کے روپ میں حضرت مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ کارگر و کارساز ہوتے تھے اوران کے سامعین و مخاطبین دمساز وہمراز۔مگر یہ تعلق زیادہ تر یک طرفہ فعالیت کا تھا۔ طلبہ و ساکنین ندوہ کو ایک دو طرفہ تعلق و ربط کا موقع تب نصیب ہوتا تھا جب مولانا مرحوم چلتے پھرتے مل جاتے تھے۔ کبھی صحنِ مسجد میں، کبھی روش پر، کبھی شاہراہ پر اور کبھی عمارت کی غلام گردشوں میں۔ ایسا کم ہوا کہ مولانائے عالی مقام ندوہ میں موجود ہوں اور اصحابِ ندوہ ان سے کسی جگہ اور کسی مقام پر محروم رہیں۔ اسی لئے وہ چلتے پھرتے مولوی اور پیہم رواں مربی کہلاتے تھے۔

ان کی عادتِ شریفہ تھی کہ تبسم ان کے لبوں پر ہمیشہ سجا رہتا کہ ان کی فطرت بھی تھی اور "بوجہ طلق" کی تعمیل حکم نبوی بھی۔ کیا اساتذہ اور کیا طلبہ اور کیا دیگر کارکنان ندوہ۔ وہ ہر ایک سے خوش دل ملتے، خوش بیاں رہتے اور خوش فکر نظر آتے۔ ملاقات ہوتی تو سلام کا انتظار نہ کرتے خود پہل کر لیتے اگرچہ ہم وابستگانِ دامن نعمانی اس کا موقعہ ان کو کم دیتے۔ سلام کے جواب میں پیار بھرے انداز میں اور محبت آمیز حرکات و سکنات سے حال احوال پوچھتے، پھر سلسلۂ کلام دراز کرتے۔ ہنس ہنس کر، پیار پیار میں اور سوجھ بوجھ سے سب کچھ کہہ جاتے۔ ان کے کتھن میں نصیحت بھی ہوتی، سرزنش بھی، افادۂ علمی بھی ہوتا، فیض رسانی بھی۔ موقع و محل کی بات بھی ہوتی اور حقیقتِ جاودانی بھی، محبت و شفقت کا اظہار بھی ہوتا اور تعلق و یگانگت بھی۔ ان کو ایسے مواقع پر بھی طنز و تعریض اور استہزاء و تمسخر سے ہمیشہ گریزاں پایا۔ وہ نہ شرمندہ کرتے اور نہ خود شرمسار ہوتے۔ ایک عجیب دلربایانہ انداز ہوتا ان کا۔ ہمیں بات کڑوی لگتی تو بھی ان کے شیریں لہجہ کے سبب پی جاتے، طعن و نقد معلوم ہوتا تو انگیز کر لیتے کہ ان کے خندۂ لب کے اسیر تھے۔ مولانا مرحوم کی ان چلتی پھرتی ملاقاتوں نے ان کی شخصیت کو دلآویز اور پرکشش بنادیا۔ ان کو آتا دیکھ کر ہم بڑھ کر ان کے قدم لیتے، جاتا دیکھ کر لپک کر ہمقدم ہو جاتے۔ وہ ان بزرگانِ طریقت سے بالکل مختلف تھے جن کو آتے دیکھ کر لوگ راہ بدل دیتے اور جاتے دیکھ کر کنی کاٹ جاتے ہیں۔ اس پیہم رواں مربی سے ہم نے کیا کیا فکری، علمی، روحانی اور قلبی غذا پائی اس کا تجزیہ صرف مربیٔ اعلیٰ ہی کر سکتا ہے۔

شیخِ کل کے روپ میں

ہمیں نہیں معلوم اور نہ اسکی ضرورت ہے کہ اس زمانے میں حضرت مولانا نعمانی مرحوم کا سرکاری و منصبی مرتبہ و مقام ندوۃ العلماء میں کیا تھا، البتہ یہ یاد ہے اور پکا تجربہ بھی کہ مولانا موصوف کو شیخ کل اور شیخ المشائخ کا منصب عالی حاصل تھا۔ وہ ناظم ندوۃ العلماء کے معتمد ہوں نہ ہوں مگر معتمد دار العلوم کے دست راست اور معتمد خاص تھے۔ غالباً اس حیثیت سے اور اپنے علمی و فنی جلال و جمال کے سبب بھی وہ استاذِ نگراں اور شیخ وقت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کے اس کارِ منصبی یا منصبِ علمی پر نکتہ چینی بھی ہوتی تھی اور بعض خاص فکری حلقے نالاں بھی تھے۔ ہمارا مولانا مرحوم سے اس روپ میں جو تعلق تھا وہ حلقۂ درس اور [illegible] تھا۔

اس زمانے میں وہ ہمارے با قاعدہ استاذ نہ تھے لیکن کبھی [illegible]
دیتے وقت تشریف لے آتے۔ معلوم نہیں استاذ کی تربیت کے [illegible]
لئے۔ لیکن ان کی آمد ہماری خوشی بلکہ سرمستی کا باعث بن جاتی۔ [illegible]
گریزاں کے بعد مولانا مرحوم کچھ دیر ہی سکوت فرماتے، استاذِ درس کے کلام و بیان کے دوران ہی کسی مناسب و برمحل موقع پر سلسلۂ کلام اور زمامِ تدریس اپنے مشاق ہاتھوں میں لے لیتے۔ ہمارے با قاعدہ استاذِ فن و معلمِ کتاب ہمارے ہم سبق و ہم درس بن جاتے کہ ہمارے ساتھ وہ بھی شیخِ کل کی تدریس و تعلیم کے وقت سراپا گوش ہوتے۔ اس انتقالِ معلمی کے اولین لمحات ہماری سرخوشی و سرشاری کے ہوتے کہ وہ محظوظ و مسرور کرتے۔ لمحۂ سرشاری کے بعد جب گوش و نظر شیخِ کل کی تدریس و تعلیم کے فنی نکات، علمی جہات اور درسی نقاط کی طرف جاتی تو پھر علم و فکر کے بہتے سرچشموں سے استفادہ ہوتا۔

مولانا مرحوم بالعموم حدیث شریف کے اسباق و درس کے دوران ہی قدم رنجہ فرماتے تھے۔ شاید اس لئے کہ اس فنِ عظیم سے ان کو مناسبتِ خاص تھی یا اس استاذِ گرامی سے تعلق خاطر۔ اصل بات جو بھی رہی ہو، ہم طلبہ نے مولانا مرحوم کے ان "دخل در درسیات" خطبات سے بہت استفادہ کیا، نئے نئے گوشے سمجھے اور شاید فنی سمجھ بوجھ پیدا کی۔ ان کی تدریس و تعلیم کے انداز سے شاید ہمارے با قاعدہ استاذوں نے بھی بہت کچھ سیکھا کہ ظاہری اکرام و تکریم کی پُر تصنع علامات کے علاوہ چہرہ و بشرہ کی ریکھائیں اور چشم و نگاہ کی چمک ان کے اور ہمارے قلب و دل کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔

اسی ضمن خاص میں ایک حادثۂ فاجعہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر وہ ناگوار واقعہ نظر آتا ہے مگر بہ باطن آدم گری کا حامل ہے۔ ہمارے ایک استاذِ حدیث مولانا مرحوم کے پروردہ و ساختہ اور ان ہی کے لائے ہوئے تھے۔ ہمیں وہ مشکوٰۃ شریف کا درس دیتے تھے۔ قدم رنجہ فرماتے ہی اور شاید اس سے قبل ہی وہ اپنے چہرے پر خشونت طاری کرلیتے تھے۔ ہمارا یہ تاثر یوں سچا ہے کہ وہ عام حالات میں اور مخصوص لوگوں کے لئے سراپا محبت و لطافت ہوتے تھے۔ ہمارے استاذِ محترم اس راقمِ آثم پر توجہ خاص رکھتے تھے۔ میری طالبعلمانہ شوخی، دورانِ تعلیم و تدریس سبق پڑھنے میں عجلت اور سوال و جواب کی بے مہار عادت سے شاید نالاں تھے۔ میرے تمام ہم سبق و ہمدرس میرے دمساز و رفیق ہی نہ تھے مجھے اپنا نمائندہ اور سرخیل بھی بناکر "میدانِ جنگ" میں اتار دیتے تھے۔ استاذِ گرامی قدر کا ہرگز کوئی قصور نہ تھا، میری ہی تقصیرات طالبعلمانہ تھیں۔

اور چیزوں کے علاوہ استاذِ گرامی کا ایک طریقہ ہماری فہم و تعقل سے بالاتر تھا۔ وہ متن حدیث کا ٹھیٹھ ترجمہ کرواتے تھے۔ "ریاض الصالحین" اور دوسری کتبِ درسی کی تعلیم کے دوران ہماری عادت بامحاورہ اردو ترجمہ و تشریح کی پڑچکی تھی۔ وہ اتنی پختہ ہوچکی تھی کہ ہم ہزار کوشش کے باوجود لفظی ترجمہ کے عظیم الشان کام کو انجام دینے سے قاصر رہے، پھر کچھ طالب علمانہ ہٹ دھرمی اور استادانہ اصرار کا بھی معاملہ تھا۔ لفظ و محاورہ کی کشاکش جب ناگوار صورت و آہنگ اختیار کرگئی تو اس کی گونج ایوانِ بالا تک جا پہونچی۔ صاحبانِ اقتدار نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا اور اچانک ایک دن استاذِ گرامی قدر کی جگہ حضرت مولانا نعمانی بحیثیتِ حکم و ثالث درجہ میں تشریف لائے۔ اس دن کا سبق پڑھایا، مسائل پوچھے اور اشارہ کنایہ ہی میں نہیں صراحت و وضاحت کے ساتھ لفظی اور بامحاورہ ترجمے کے فضائل و مناقب بیان کرنے میں اصولِ تطبیق اور وجوہِ تلفیق سے کام لیا۔ استاذِ گرامی کی تصویب و تائید کی تو طلبہ و تلامذہ کی تغلیط بھی نہ کی۔ مولانا مرحوم نے غالباً استاذِ مکرم کو بھی نصیحت کی تھی۔ بعد کے دروسِ مشکوٰۃ میں انھوں نے ہمارے بامحاورہ ترجمے کو بخوشی انگیز کیا اور ہم نے ان کے لفظی ترجمہ کو۔ کچھ دنوں کی افہام و تفہیم کے بعد درسِ حدیث ایک دوسرے استاذِ مکرم کے حوالے کردیا گیا۔ غالباً اس میں بھی حکمتِ نعمانی کو پورا پورا دخل تھا۔ مولانا مرحوم کے ایسے حکیمانہ اندازِ تربیت اور ماہرانہ طریقۂ تعلیم کا باب کافی وسیع ہے۔

استاذ حدیث کی حیثیت

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی جزو وقتی تدریس کی سعادت بار بار ملتی رہی تھی مگر وہ خلاؤں کو پُر کرنے کے مترادف تھی۔ ان کی مستقل تعلیم سے بہرہ مند ہونے کی سعادت بہت دیر میں ملی لیکن بہر حال ملی۔ فضیلت اول میں حضرت مولانا مرحوم "صحیح مسلم" پڑھانے پر مامور کئے گئے۔ ہم نے جذباتِ تشکّر و امتنان کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے تقرر کو اپنی خوش بختی پر محمول کیا۔ ان کا طریقۂ تعلیم بہت دلچسپ تھا۔ حسبِ دستور مولانا اپنے خاص انداز سے بالکل صحیح وقت پر درجہ تشریف لاتے۔ مسند درس سنبھالتے، کسی ایک طالب علم کو متن کتاب پڑھنے کا حکم دیتے، متن کی تشریح و تعبیر کرتے۔ دورانِ تفسیر کتاب بار بار عینک چہرے سے اتارتے اور لگاتے رہتے، اس دوران بالعموم داہنی آنکھ پر نم ہو...
موتی چہرۂ مبارک پر ڈھلک آتے، بسا اوقات رقت شدید ہو جاتی...
چھا جاتی۔

نہ جانے کیا سبب تھا، خود نمائی کا عنصر یا حسنِ طلب کا
درجات تک بالعموم راقم ہی متنِ کتاب پڑھنے کی کوشش کرتا تھا اور ...
حضرات اساتذۂ کرام اپنی شفقت و محبتِ بیکراں سے اسے انگیز کر لیتے بلکہ بسا اوقات اسکی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ہمارے رفقاء درس نے یا تو بطورِ عافیت یا بسبب محبت و رفاقت اپنا حق بھی اپنے ساتھی کو دے دیا تھا۔ کچھ اس میں مقام و جلوسِ خاکسار کا دخل تھا کہ وہ ہر درجہ میں استاد گرامی کے دائیں ہاتھ پر ہمیشہ بیٹھا کرتا تھا۔ حسبِ دستور ہر روز میں سبق پڑھنے کی کوشش کرتا مگر استاذِ مکرم مجھے چمکار پچکار کر خاموش کر دیتے بلکہ بسم اللہ پر ہی روک دیتے، اور کسی دوسرے رفیق درس کو متنِ کتاب پڑھنے کا حکم دیتے۔ یہ صورت حال تقریباً روزانہ پیش آتی اور کم از کم خاکسار کو تلخی سے دوچار کر جاتی۔ رفقائے درس نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ آغاز از خود نہیں کریں گے۔ لہذا یہ کارِ منصبی خاکسار انجام دینے کی کوشش کرتا اور ناکام رہتا، اور قرعۂ فال کسی دوسرے دیوانہ کے نام پڑتا۔

ایک دن طالب علمانہ شوخی کا پھر مظاہرہ ہوا۔ تمام رفقاء درس نے خاکسار کے حق میں متن کی قرأت و تلاوت سے باقاعدہ گریز کیا۔ استاذِ گرامی قدر نے ماحول و فضا اور حالات کا اندازہ کر کے خاکسار کو پڑھنے کا حکم دیا۔ تعمیل ارشاد سے قبل بہر حال شاگردِ شاکی نے شکوہ پیش ہی کر دیا کہ جناب عالی اس حقیر کو سعادتِ قرأت سے کیوں محروم رکھتے ہیں؟ استاذِ مکرم نے جو کچھ فرمایا

اس کا خلاصہ عرض ہے کہ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم میں ہر ایک کی شراکت ضروری ہے ورنہ چند دوسروں کے حقوق پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ محرومی خواہ خود ساختہ و اختیار کردہ ہو ان کو مقام حرکیت و اقدام سے پیچھے ڈھکیل دیتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ مجہولیت و انفعالیت کے خول میں بند ہوتے جاتے ہیں، پھر ان کی صلاحیتوں کو زنگ لگنا شروع ہوتا ہے تا آنکہ وہ بالکل مردہ ہو جاتی ہیں۔ اس طریقۂ استادی میں کسی ذاتی رنجش یا صفاتی پرخاش کا دخل نہ تھا۔ استاذ مکرم کی دلیلوں اور توجیہوں نے دماغ و ذہن کو پوری طرح سے متاثر کیا مگر دل کے کونے میں ایک پھانس تھی جو لگی رہی۔

بلاشبہ افادۂ استاذ کا باب پورا کھلا رہا مگر استفادہ کا دروازہ کھلتا بند ہوتا رہا۔ اس ضمن میں ایک حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جس دن طرفین کے درمیان صلح کل سے زیادہ مہر و محبت کا تعلق ہوتا اس دن استاذِ مکرم حدیث کی تشریح و تعبیر کا نیا باب رقم کرتے، فنی و علمی نکات کا دریا بہا دیتے۔ شاید انہی لمحاتِ نادرہ کی مسیحائی ہے کہ فنِ شریف میں کچھ شد بد پیدا ہوئی۔ اب کفِ افسوس ملتے ہیں کہ صاحبِ معارف الحدیث سے صحیح کسبِ فیض کیا ہوتا تو یہ احساس محرومی نہ ہوتا!

مؤلف و مصنفِ اسلامی

مولانا مرحوم کے مقالات و شذرات کے مطالعہ اور فہم کی نوبت تو کافی دیر میں آئی، ان سے بطور مؤلف و مصنف تعارف و روشناسی "اسلام کیا ہے؟" سے ہوئی۔ بلا تکلف و تردد رقم کرتا ہوں کہ بچپن میں جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا اور اسلام فہمی کی راہ دکھائی ان میں مولانا مرحوم کی اس تالیفِ لطیف کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان گنت دوسرے عام و خاص افراد و طبقات کو بھی اس کتابِ مستطاب نے صحیح فہم اسلامی سے آشنا کیا۔ اثر انگیزی، سلاست و سادگی، صحتِ فکر و نظر، سادگی میں پُرکاری اور موضوعاتی جامعیت کے اعتبار سے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ انھیں خصوصیات سے وہ بہت مقبول و متداول رہی۔

بالعموم اسلام کی تعریف میں عقیدۂ توحید و رسالت اور آخرت کے علاوہ ارکانِ اربعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس کی بنا پر اخلاق و معاملات کا باب خارج ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا نے عام قارئین اور طلبہ کے لئے اسلام کا جامع تعارف پیش کیا جو بالکل نئی چیز ہے۔ کم از کم عمومی سطح پر۔ بیس ابواب پر مشتمل اور مختصر کتاب کلمۂ طیبہ اور ارکانِ اربعہ کے علاوہ معاملات، تقویٰ و پرہیزگاری، عمدہ اخلاق، اللہ اس کے رسول کریم ﷺ اور دین کی محبت، دین پر استقامت، اسکی

نصرت و حمایت، شہادت، آخرت و قیامت، جنت و دوزخ، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن پاک، دعا، درود شریف، توبہ واستغفار اور خاتمہ میں رضائے الٰہی کے حصول کے نصاب الٰہی سے بحث کرتی ہے۔

موضوعات کی جامعیت اس کتابِ لطیف کو مختصر ترین اسلامی نصاب کا درجہ عطا کرتی ہے۔ وہ ایک عام شخص کو دین کا جامع تصور بتاتی اور اسے اسلام سے پوری طرح متعارف کرتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اسکی سلیس و آسان زبان، مدلل تشریحات، قرآن پاک کی آیاتِ کریمہ اور حدیث شریف کی خوبصورت ترین مبادیات سے روشناس کراتی ہے۔ "اسلام کیا ہے؟" کی اثر انگیزی، روح و قلب کو گرمانے کی خصوصیات بلاشبہ اسے ایک لازوال قدر و قیمت عطا کرتی ہے۔ اس کتاب کا اس خاکسار راقم پر ہمیشہ گہرا اثر رہا۔

مولانا نعمانی مرحوم نے اسلام کیا ہے؟ کی موضوعاتی او ،
کتاب "دین و شریعت" میں پیش کی۔ اس کے پیش لفظ میں مولانا
"اسلام کیا ہے؟ کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد سے مجھے خیال تھا
کے درجہ کی ایک کتاب اور تیار ہونی چاہئے۔ جس میں اسلامی اصول
کیا جائے کہ دلوں سے عہدِ حاضر کے ملحدانہ شکوک و شبہات اور اہلِ زیغ و ضلال سے [illegible]
تحریفات کی بھی صفائی ہو ." یہ دراصل مولانا مرحوم کے چھ خطبات اور بعض تحریری اضافات پر مبنی کتاب ہے جس میں ایمانیات، عبادات، اخلاق، معاشرت و معاملات کے ساتھ ساتھ اسلام کے سیاسی نظام .. خلافت راشدہ.. پر بھی بحث ملتی ہے۔ آخر میں احسان و تصوف پر ایک باب ہے۔

مولانا مرحوم تالیف و تصنیف کے ذریعہ اسلام اور اسکی صحیح تعلیمات پیش کرنا چاہتے تھے اور ان کا مخاطب زیادہ تر کم تعلیم یافتہ یا جدید تعلیم یافتہ طبقہ تھا جو دینی مبادیات سے بالعموم ناواقف ہوتا ہے یا معمولی شد بد رکھتا ہے۔ یہ تو ان کی تالیفات کا مثبت اور بنیادی پہلو تھا۔ اس مقصد سے انھوں نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے علاوہ بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ ان میں "نماز کی حقیقت"، "کلمۂ طیبہ کی حقیقت"، "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟"، "تصوف کیا ہے"، "حج کیسے کریں" وغیرہ شامل ہیں۔ افادیت اور اثر انگیزی کے اعتبار سے ان تالیفاتِ نعمانی نے اپنے اصل مخاطبین کے روح و قلب کو گرمایا سو گرمایا، خواص کو بھی بہت فائدہ پہونچایا۔ اتنی وضاحت، صراحت اور سلاست کے ساتھ قلمِ نعمانی کے سوا اور کون رقم کر سکتا تھا؟

تالیفاتِ نعمانی کا دوسرا پہلو یہ رہا کہ مسلم یا غیر مسلم طبقات کے انحرافات اور ان کی اسلام دشمنی کو بھی اجاگر کیا جائے تاکہ عوام و خواص دونوں ان کے مکر و فریب سے واقف اور ان کی چالوں سے محفوظ رہیں۔ یہاں مولانا نعمانی "متکلم اسلام" بن جاتے ہیں۔ ابتداء میں انھوں نے بریلوی مکتبِ فکر کی مبادیات و اساسیات سے خوب خوب بحث کی۔ اور ان کے دجل و فریب اور تحریفات کو واضح کیا۔ ان کے دو اہداف قادیانیت اور شیعیت رہے جو اول الذکر سے زیادہ خطرناک ہی نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کی سوچی سمجھی سازشیں ہیں۔ قادیانیت پر ان کی کتابیں اور اس سے کہیں بڑھ کر "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" ان کو بے نقاب کرتی ہیں۔

نعمانی تالیفات کے انھیں دونوں محوروں میں ان کی دوسری نگارشات بھی آتی ہیں کہ یا تو وہ اسلام اور اس کے عظیم علمبرداروں کی خدماتِ جلیلہ اور ان کی عبقریاتِ نادرہ کو ان کے صحیح تناظر میں پیش کرتی ہیں یا ان کے حسین و جمیل چہروں سے اغیار و حاسدین کی اڑائی ہوئی خاک کو دور کر کے ان کو آئینہ بناتی ہیں۔ اوّل الذکر زمرہ میں حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت مولانا محمد یوسف، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا جیسے بزرگانِ دین و ملت پر ان کی اپنی نگارشات یا ان کی مرتب کردہ کتابیں بصورت خاص اشاعتوں یا رسائل کے شامل ہیں۔

دوسرے زمرہ میں وہ تالیفاتِ نعمانی آتی ہیں جو اِبطالِ اسلامی اور رجالِ دینی کے خلاف دشمنوں کے معاندانہ پرچار کی قلعی کھولتی اور ان کی مجلّا و مصفّا تصاویر پیش کرتی ہیں۔ شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید پر معاندین اہلِ بدعت کے الزامات اور ان جیسی دوسری تحریریں اور تقریریں اس میں شامل کی جاسکتی ہیں۔

مولانا مرحوم کی ان تالیفات کا مقصود اصلی صرف ایک تھا کہ اسلام اور اس کے جاں نثار خادموں اور عظیم علمبرداروں کو ان کے صحیح رنگ و روپ میں پیش کیا جائے۔ انھوں نے قرآن و حدیث کو اپنی تمام تالیفات کی بنیاد بنایا کہ یہی دونوں اصل کسوٹی ہیں جن پر کھرے کھوٹے کو پرکھا جاسکتا ہے اور جن سے معاندین و مخالفین بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دوسرے تمام مآخذ و مصادر کو مولانا مرحوم نے استعمال ضرور کیا ہے مگر ان کو معیارِ حق و باطل نہیں بنایا۔ وہ صرف معلومات، مشاہدات اور واقعات فراہم کرنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔ تصوف اور صوفیائے کرام پر ان کی تحریریں ان کے اسی طریقۂ کار کو واضح کرتی ہیں۔ اسلامی

تصوف ان کے نزدیک شریعت و دینِ اسلامی کی روح کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کی بعض تعبیرات و تشریحات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر روحِ احسانی کے وجود و کار فرمائی سے انکار نا ممکن ہے۔ تصوف اور صوفیہ نئی اصطلاح اور مصلحین کا نیا طبقہ ہو سکتے ہیں مگر ان کی بنیاد و اساس قرآن و حدیث پر تھی۔ مولانا نعمانی تصوف کے غیر اسلامی تجاوزات پر نقد و تنقید کرنے سے بھی نہیں چوکتے جو ایک قائلِ تصوف کے ایمانی و احسانی صلابت کی دلیل محکم ہے۔

نعمانی تالیفات میں ایک عظیم شاہکار کا درجہ ان کی "معارف الحدیث" کو حاصل ہے۔ حدیث نبوی پر اردو زبان و ادب میں بلاشبہہ صدہا کتابیں لکھی گئیں اور ان میں سے بہت سی موثر، کارگر، کارساز، آدم گر، تربیت کنندہ اور عظمت و جلالت کی حامل ہیں۔ مولانا مرحوم کی "معارف الحدیث" سچ مچ حدیث شریف کے زر و جواہر اور یاقوت و مرجان پیش کر تی

بیان، طرز ادا، سلاست و بلاغت، اسلوب و پیشکش کے علاوہ موضوعاتی

زبان میں ایک جامع و مختصر دائرہ معارف(NCYCLOPEDIA

"معارف الحدیث" کو مؤلفِ گرامی قدر و حقیقت شناس نے

انتخاب" قرار دیا ہے اور اس میں اردو ترجمہ اور تشریحات پیش فرمائی ہیں۔ –

یافتہ مسلمانوں کو اس کا مخاطب و ہدف بنایا ہے اور ان کی جدید ذہنی اور فکری سطح کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ ابتداء میں مولانا مرحوم کا خیال تھا کہ "معارف الحدیث" کی پانچ جلدیں ہوں گی مگر بعد میں ان کی تعداد زیادہ ہو گئی۔ یہ موضوع کی وسعت اور مخاطبوں کی بنا پر توسیع ہوئی۔

بقول مولانا مرحوم کتاب یا جلد اول کتاب الایمان پر مبنی ہے اور اس میں حدیثیں عام طور سے "مشکوٰۃ المصابیح" سے لی گئی ہیں۔ دوسری جلدیں مختلف موضوعات پر مبنی ہیں جیسے جلد دوم کتاب الرقاق اور کتاب الاخلاق کے لئے خاص ہے جبکہ جلد سوم کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ کے ابواب رکھتی ہے۔ جلد چہارم تین ارکان اسلام، کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج سے بحث کرتی ہے۔ پانچویں جلد میں کتاب الاذکار والدعوات کے عنوان سے احادیث جمع کی گئی ہیں۔ چھٹی اور ساتویں جلدیں کتاب المعاشرۃ والمعاملات کے لئے خاص ہیں۔ جلدوں کی ترتیب میں موضوعات کا کوئی خاص منصوبہ نہیں مد نظر رکھا گیا ہے۔ غالباً احادیث کی جمع و تدوین کی سہولت نے موجودہ ترتیب کو جنم دیا ہے۔

مولفِ گرامی کا طریقہ کار بہت سادہ، سہل اور موثر ہے۔ عنوان کے تحت متنِ حدیث راویٔ اول کے حوالہ سے پیش فرماتے ہیں پھر اس کا سیدھا سادہ بامحاورہ ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

حدیث کا اصل مصدر و ماخذ بھی بتاتے ہیں اور آخر میں اپنی تشریح سے مستفید کرتے ہیں۔ اس تالیفِ نعمانی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام اہم موضوعات پر ایک اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ مسلمان اور غیر مسلم کو بھی حدیث پر مبنی اسلام کی تعلیمات سے بہت خوبصورتی سے روشناس ہی نہیں کرتی اس کے دل و جگر میں صحیح اسلامی روح پیدا کرتی ہے۔

مدافعِ دینِ متین و ناقدِ عناصرِ باطلہ

مولانا نعمانی رحمہ اللہ کی جس طرز تالیف اور اداء تصنیف پر خاکسار ہمیشہ فدا رہا وہ دین متین کی خالص اسلامی تعبیر و تشریح اور شدید ترین اسلام دشمن عناصر سے اور ان کے باطل افکار اور گمراہ کن عقائد و اعمال سے اس کے سر چشمہ صافی کی حفاظت و صیانت کی سعئ مشکور ہے۔ کور دید گانِ قوم اور نگاہِ کج و فکرِ زیغ کے حاملین الزام تراشی کریں گے کہ "کند جنس باہم جنس پرواز" کا معاملہ ہے یا فکری اور ذہنی موافقت کا مسئلہ ہے کہ وہ مساعئ نعمانی اور موافقتِ خاکساری کی فہم سے یکسر قاصر ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی امت کو جس قدر ضرر و نقصان ان مسلم دشمن عناصر اور اسلام کش قوتوں سے پہونچا وہ کسی غیر سے نہیں پہونچا۔ ان میں غالباً کیا یقیناً سر فہرستِ شر و اضلال وہ مسلم فرقۂ باطلہ ہے جو اپنے عقائدِ دینی اور افکارِ خلافت و امامت میں اس قدر تجاوز کر چکا ہے کہ وہ سرحد ایمان اور حدودِ اسلام سے خارج ہو چکا ہے۔

نہ مولانا مرحوم کو اور نہ خاکسار راقم کو اور نہ ہی کسی صحیح فکر و عقیدہ کے حامل کو اس حقیقت سے انکار ہے ار نہ اس بات کو ماننے میں ادنیٰ تامل کہ ہر شخص اور ہر طبقہ اور ہر قوم کو اپنا دین و ایمان اور عمل اختیار کرنے کا حق اور اس حق کو پوری طرح استعمال کرنے کی آزادی ہے بشرطیکہ وہ دوسروں کے دین و ایمان اور عمل و شریعت پر ڈاکہ نہ ڈالے۔ وہ اپنے کو وہی کہے جو وہ ہے اور زور زبردستی سے اسلام اور اپنے مسلم ہونے کا دعویٰ نہ کرے۔ مگر عجب ستم ظریفی ہے کہ تمام فکری، عقلی، دینی، عقیدی اور عملی انحرافات و تجاوزات کے باوجود کوئی فرد، طبقہ یا قوم اس فکر و عمل کے علمبردار ہونے کا مدعی ہو جس کی جڑیں کھودنا اس کا فرض منصبی بن چکا ہے۔ اس سے زیادہ طرفہ ستم یہ ہے کہ تمام غیر مسلم عناصر اور اسلام مخالف طبقات ان انحرافات و تجاوزات کی پشت پناہی اور تائید کرنے پر اور ان کے حاملین و ماہرین کو خالص اسلامی علمبردار بنا دینے پر تل جاتے ہیں۔ ستم بالائے ستم بلکہ عجب بر عجب کا معاملہ ان مسلم مفکرین اور مومن اہل قلم کا ہے جو اپنے ذاتی خیالات و افکار اور جماعتی و اداری اقدار جیسے شخصی وجوہ و علل کی بنا پر غیر اسلامی انحرافات و تجاوزات بلکہ تحریفات تک کو قبول کر کے ان کو اسلامی اور دینی رنگ و

روپ دینے کی کوشش مردود کرتے ہیں۔

ان کی عظیم تر تالیف "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" نہ صرف ان کی حفاظت و صیانتِ دین کی پکی شہادت فراہم کرتی ہے بلکہ ان کے اندازِ تحقیق، طریقۂ تدقیق، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی جدت و واقعیت پر دلالت بھی ہے۔ مقدمہ کتاب میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ " .. ان سے دو متقابل و متضاد تصویریں بنتی ہیں. ایک تصویر وہ ہے جو اہلِ سنت کے عقائد کی روشنی میں دنیا کے سامنے آتی ہے۔ دوسری وہ جو فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے عقائد و بیانات اور ان کی دین کی تشریح اور تاریخ اسلام کی تعبیر اور اس کے خاص تصور سے تیار ہوتی ہے۔ ان دونوں تصویروں میں کوئی مماثلت و اتفاق نہیں ہے۔ "

اس متن کی تشریح و توضیح میں اتنے اضافہ کی ضرورت ہے کہ تصویر اول

صحیح عقائد و افکار کی روشنی میں ہو اور کتاب و سنت اور تعامل و آثار صحا

سے پوری طرح ہم آہنگ و متفق ہو۔ ساتھ ہی تمام ادوارِ تاریخ اسلا

مطابق ہو۔

ایرانی انقلاب کے قائد و امام خیمنی اور ان کے پیروؤں اور متبعین ...

کو اسلامی انقلاب بنا کر پیش کیا، سادہ لوح سنی علماء اور دانشوروں نے اسکو نہ صرف قبول کیا بلکہ قائدِ انقلاب سے زیادہ جوش و خروش اور جذبہ و ہوش کے ساتھ اسکو ایرانی انقلاب کے بجائے خالص اسلامی انقلاب سمجھا۔ طرفہ ستم کہ بعض علماء اہل سنت و مفکرین اسلامی اور دانش وران عالم اسلام نے اس کو آدرش انقلاب کا روپ سروپ دے کر عالم اسلام اور جہان دیگر میں درآمد کرنے کی وکالت کی بلکہ اسلامی نشاۃ کو ایسے ہی اسلامی انقلاب پر منحصر و مبنی بتایا۔

ذہن نعمانی نے اس انقلاب کی خطرناکی اور اسکو اسلامی انقلاب بنانے کی زہرناکی کو بروقت محسوس کر لیا کہ وہ اس اسلام دشمن اور مسلم مخالف قوتِ باطلہ کی رگ رگ سے واقف، اس کے ہر جال سے آگاہ اور اس کی ہر تعلیم کے عالم تھے۔ مؤلف گرامی قدر نے اسی بنا پر اپنی کتابِ لطیف کا نام بڑا پُر کار رکھا کہ اس منصوبۂ باطل کے تین محور تھے. اول ایرانی انقلاب کی حقیقت آشکارا کی کہ وہ خالص شیعی انقلاب ہے۔ دوم امام خمینی کے صحیح شیعی افکار و اعمال سے پردہ اٹھایا کہ وہ مسلمانوں کے نہیں ایرانی امامیوں یا اثنا عشری شیعوں کے امام ہیں اور آخر میں شیعیت کی اصل حقیقت بیان کی جو اس فکر کے اماموں بالخصوص امام خمینی کی تحریروں کی روشنی میں ابھرتی ہے اور قارئین کو کسی تردد و شبہہ میں نہیں چھوڑتی کہ وہ سراسر غیر اسلامی شئے ہے۔

مولانائے محترم و مرحوم کی اس عظیم الشان تالیف کا تنقیدی و تحلیلی تجزیہ و مطا
لعہ مقصود نہیں کہ تاریخی مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا مگر موضوع کی خطرناکی مؤلف کی ژرف
نگاہی، اور مسلم عوام و خواص کی ناواقفی اسکی متقاضی ہے کہ اس پر کلام کو کچھ طول دیا جائے۔
ہمارے ہاں ایک رواج عام یہ بھی ہو گیا ہے کہ بلا مطالعہ و مناقشہ اور بنا علم و فکر اپنے سے مخالف نقطۂ نظر یا مختلف خیال و رائے رکھنے ولاے کی جاہلانہ تردید کردی جاتی ہے یا اخباری بیانات و ارشادات کی بنا پر پوری تالیف کو مسترد کردیا جاتا ہے۔ یا ایک دو تسامحات کے سبب پورے کلیے کا انکار کردیا جاتا ہے۔ کون بشر دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ معصوم و بے خطا ہے سوائے ان کے جن کا عقیدہ معصومیت اِنسان پر ہے۔

مؤلف گرامی قدر نے ایرانی انقلاب کو بہت مختصر بحث میں عقیدۂ امامت پر مبنی ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ خالصتاً شیعی انقلاب ہے جس سے ایران اور دوسرے ممالک و دیار کے شیعوں کو اتفاق ہو تو ہو مگر اہلِ سنت اس سے اساسی اختلاف رکھنے پر مجبور ہیں کہ وہ ان کے تصورِ خلافت ہی نہیں کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ مؤلف دور بیں کو اسے شیعی انقلاب ماننے میں کوئی باک نہیں اور نہ ہی اسکی پریشانی ہے کہ اہلِ تشیع اس کو کیا مانتے ہیں۔ انھیں تمام صالح فکرِ اسلامی کے حاملینِ عالی مقام کی مانند اس پر اعتراض ہے کہ اسکو اسلامی انقلاب بناکر عالمِ اسلام کو گمراہ کیا جارہا ہے اور وہ بھی غلط بنیادوں پر۔ وہ ملت اسلامیہ کو اس کے خطرناک عناصر سے محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح مؤلف حقیقت رقم نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ امامِ خمینی نے اپنے شیعی عقائد و افکار اور تصورات کو کبھی چھپایا نہیں، ان کی تمام تالیفات بالخصوص "الحكومة الاسلامية"، "تحرير الوسيلة" اور "كشف الاسرار" میں ان کے تمام سیاسی، فقہی، دینی اور تہذیبی افکار بلا کم و کاست موجود ہیں جو ان کو خالص اثنا عشری مفکر اور قائد ثابت کرتے ہیں۔ کائنات پر شیعی ائمہ کی تکوینی حکومت، ائمہ اثنا عشری کی انبیاء و رسل پر فضیلت، ان کی معصومیت و محفوظیت، ان کی پیروی کی وجوبیت کے علاوہ خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے بارے میں ان کے شیعی عقائد و افکار اور ان کے خطرناک نتائج پر مولانا نعمانی نے کلام کر کے مدلل انداز سے واضح کیا ہے کہ وہ شیعی قائد تھے۔ پھر ان کے شیعہ و غیر شیعہ، سنی نما اور دوسرے طبقات ان کو خالص سنی اسلامی قائد و مفکر اور امام کیوں بناکر پیش کرتے اور امت کو گمراہ کرتے ہیں؟

محقق نعمانی نے ایرانی انقلاب اور اس کے امام خمینی کے دو عارضی ارکان پر مختصر بحث

کرنے کے بعد اپنی مفصل و مدلل بحث مستقل رکن ثالث، شیعیت پر مرکوز رکھی ہے اور اہل فکر و نظر خوب جانتے ہیں کہ یہ وہ خارِ مغیلاں ہے جو پہلوئے اسلام میں ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے۔ مشہور مارکسی مؤرخ پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے ایک بار برسرِ منبر اور خلائق عالم کے روبرو اپنے کلمۂ حق کو اس طرح بیان کیا تھا: "فسطائیت مر چکی، نو آبادیاتی نظام کا جنازہ نکل رہا ہے، سرمایہ دارانہ نظام لب گور ہے، ایک دن اشتراکیت دم توڑ دے گی اور پھر اشتمالیت بھی فنا ہو جائے گی مگر یہ شیعیت، کبھی فنا نہ ہو گی۔" یہ محض مرحوم کی جذباتیت نہ تھی بلکہ مورخ دوربیں کی حقیقت بنی تھی۔ مگر ہمارے قدیم و جدید علمائے دین اور دانشورانِ ملت نے بالعموم اس حقیقت مسلّمہ کو نہیں سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے اس تصور فہم میں کچھ دخل شیعی مصاد ، آ[illegible]
کمیابی یا نایابی سے زیادہ شیعہ علماء و خواص کے نظریۂ کتمان کا ہے۔

مولانا مرحوم نے اپنی اس عظیم کتاب کے دو تہائی حصہ کو شیعی
لئے وقف کیا ہے۔ شیعیت و مسیحیت، آغاز و ارتقائے شیعیت، شیعہ فر۔
مباحث کے بعد مؤلف گرامی قدر نے اثنا عشریہ کی اساس و بنیاد مسئلہ اما
ہے۔ اس بنیادی عقیدہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے یا مستنبط کئے جانے والے شیعی نظریات پر کلام کیا ہے۔ حضرات خلفاء ثلاثہ، صحابۂ کرام، بالخصوص ازواج مطہرات کے بارے میں شیعہ افکار کو بالخصوص امام خمینی کی تحریروں سے مدلل کر کے پیش کیا ہے۔ نبوّت کے تسلسل، عقیدۂ رجعت، قرآن مجید میں تحریف اور بعض ایسے ہی اہم اور بنیادی امور پر امام خمینی کی تحریروں سے شہادتیں فراہم کی ہیں۔

مؤلف گرامی قدر کو شیعی افکار و رجحانات اور عقائد و اعمال سے بحث نہیں کہ وہ ان کا دین و ایمان ہے اور وہ جانیں اور ان کا ربِ عادل جانے۔ مگر ان کا بنیادی نکتۂ بحث یہ ہے کہ اسلامی مفکرین بالخصوص علماء اور دانشوروں اور ان کے بعد عامۃ المسلمین کو ان غیر اسلامی افکار و اعمال سے آگاہ کر کے ان کے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنے اور اغیار کے خطرناک حملوں سے محفوظ کرنے کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ اس سے ہر صاحبِ فکرِ سلیم اور حاملِ عقلِ صحیح کو اتفاق ہوگا کہ اپنے دین و ایمان اور عقیدہ و فکر اور نظام و ادارہ کی حفاظت کا حق سب کو حاصل ہے تو مسلمانوں کو بھی ضرور حاصل ہونا چاہئے۔ مولانا منظور نعمانی مرحوم کی یہ کتابِ جلیل اسی سعیٔ بلیغ کی ایک بروقت نشانی ہے جو امت اسلامیہ کی حفاظت و صیانت کی فکری و عملی شہادت بن گئی ہے۔

مدیر الفرقان یا مجاہد اسلامی

ماہنامہ الفرقان کا اجراء انھیں دونوں بنیادی ضروریات کے لئے عمل میں آیا تھا۔ ابتداء میں اس کا زور باطل نظریات اور فاسد افکار اور غیر اسلامی اعمال و عملیات کی تردید کر کے اسلام، دین اور امتِ اسلامی کی حفاظت و صیانت کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ تردید و تغلیط سے گذر کر صحیح اسلامی تعلیمات اور بنیادی افکار کی ترویج و اشاعت کی طرف ہو گیا۔ مگر یہ زور یا شد و مد کا صرف اِنتقال علمی تھا۔ ورنہ الفرقان نے کبھی بھی ابطالِ باطل اور احقاق حق کا دوگونہ فریضہ نظر انداز نہیں کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو کبھی کوئی دور بیں و دور اندیش حقیقت پسند و اصول پرست مفکر و مدبّر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ یہ تو ہمارے عقیدہ و ایمان کا بنیادی محور ہے: انکارِ باطل سے اثباتِ حق تک پہونچنا کلمۂ توحید کا اصل مغز ہے۔ مدیرِ الفرقان کی حیثیت سے مولانا منظور نعمانی نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک اسلامی قلمی جہاد کیا ہے جو فکری، عقیدی، علمی اور دینی اعتبارات سے برصغیر پاک و ہند میں زریں الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

یہاں مجلہ الفرقان کی تاریخ بیان کرنی مقصود ہے نہ اسکی خدمات کا تذکرہ مطلوب ہے اور نہ ہی اسکا موضوعاتی تجزیہ۔ مگر علمی و فکری اسلامی جہاد میں اس کے مرتب کردہ نقوش اجاگر کرنے کے لئے اس کے بعض سنگ ہائے میل کی طرف نشاندہی ضروری ہے۔ اور یہ نشاندہی تاثراتی اور علمی انداز میں اس کے بعض امتیازات کے تذکرہ سے کی جارہی ہے۔

ماہنامہ الفرقان نے اپنے مدیر کبیر کی شخصیت کی ہمہ جہتی کے مانند چومکھی لڑائی لڑی ہے اور مختلف محاذوں پر اسلامی جہاد جاری رکھا ہے، اس میں اولیں اور اہم ترین محاذ اپنوں کے بعض طبقات نے کھولا تھا۔ اہل بدعت نے کتاب و سنت اور اعمال و آثار بزرگانِ اسلام کی تعبیر و تشریح اپنی کج فہمی اور کج عقیدتی کے سبب کی اور اسکو صحیح اسلامی نظامِ فکر و عمل بنانے کی کوشش کی۔ الفرقان اور اس کے مدیر جلیل نے ان کی گمراہ اور گمراہ کن تحریروں، تقریروں اور افعال و اعمال اور رسوم و رواج کا بروقت تدارک کیا۔ ان کے کج کلاہانہ اندازِ فکر کو واضح کیا، ان کی تحریفات و تاویلات کی قلعی کھولی، ان کے اصل خیالات و نظریات کو طشت از بام کیا، اور ان کے اعمال و افعال کی شناخت ظاہر کی۔ عوام و خواصِ مسلمین کو اس طرح ان کی تاویلاتِ فاسدہ سے پہونچنے والے خطرناک نتائج سے محفوظ و مامون کیا۔

اپنوں کے فاسد خیالات و باطل افکار کی تردید و تنقید میں ایک سخت مرحلہ بلکہ تمام

مراحل حیات میں سخت ترین اس وقت آیا جب ہر طرح کے ہمنوا و ہم خیال اور ہم فکر و ہم قدم اور محترم و معظم شخصیات و طبقات نے دین و ایمان کے عظیم ترین ابطال کو ہدف تنقید و ملامت بنایا۔ اگرچہ الفرقان کے بانی مدیر گرامی نے اپنی مدیرانہ زندگی میں ایسی بہت سی جنگیں لڑی تھیں مگر یہ معرکۂ حق و باطل ان کی زندگی کے آخری لمحات میں پیش آیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس معرکہ کے اصل شہسوار اُن کے فرزند گرامی کے رشحاتِ قلم تھے مگر ان کے پیچھے دراصل افکار و تربیتِ نعمانی کا پشتہ لگا تھا۔ الزام تراشی اور بہتان طرازی بھی کی گئی کہ یہ معرکۂ حق و باطل نہیں تھا بلکہ ذاتی عداوت و حسد کا شاخسانہ تھا بلکہ یہاں تک بھی سوچا اور پرچار کیا گیا کہ ایک مخصوص ادارہ کے خلاف مجرمانہ سازش تھی۔ دلوں کے بھید عالم الغیب والشہادہ جانتا ہے اور نیت بلکہ نیات اور ان پر مبنی اعمال کا حساب کتاب اسی کے دستِ عدل نواز میں ہے لیکن ہم ظواہ
بندے اتنا جانتے ہیں کہ صحابۂ کرام کو ہدفِ ملامت اور نشانۂ تنقید بنا
اور صحیح نہیں ہو سکتا۔

الفرقان کی طویل جد و جہدِ اسلامی میں یہ مرحلہ بہت اہم ر
میں خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھوانے پر مجبور ہوا تھا۔ بنیادی وجہ
وسیادت سے زیادہ ان کی عزت و حرمت کی حفاظت کی ایمانی کوشش تھی۔ راقم آثم یہ سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا کہ کوئی صحیح العقیدہ مومن و مسلم صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے کسی بھی طبقہ کو مستسلم، غیر مخلص اور غیر عادل کیوں کر کہہ سکتا ہے یا ایسا فاحش کلام کرنے والے کی حمایت و نصرت کر سکتا ہے؟ میرا تو عقیدہ ہے کہ اس فکرِ باطل پر اغماض برتنے والا بھی مرتکبِ فاحش ہے، اور اپنے ہذیان کے لئے ہر طرح کی مہذب اور سخت ترین تنقید کا مستحق ہے، خواہ وہ دینی و علمی جلالتِ دنیا کے کسی بھی مرتبہ پر فائز ہو۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب ساداتِ علم و دین الفرقان کے تلخ لہجہ اور خاکسار راقم کے سخت الفاظ پر شکوہ کرتے ہیں، اور خود فراموش کر دیتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے دین و ایمان کے ارکان کے خلاف سخت ترین بلکہ مذموم و مقہور الفاظ و تعبیرات استعمال کی ہیں۔ ایسے دریدہ دہن، دریدہ قلم اور دریدہ فکر حاملین کے لئے تمام سخت الفاظ اور شدید ترین تعبیرات ہلکی ہیں۔ الفرقان کی یہ جد و جہد مبارک ترین، عظیم ترین اور دور رس نتائج کی حامل رہی جس نے امتِ اسلامی کی عدالتِ صحابہ کرام اور تاریخِ اسلامی کے ایک اہم ترین باب میں صحیح اسلامی رہ نمائی کی۔ یہ وہ قضیہ مرضیہ تھا جس نے حق کو ثابت و اجاگر اور باطل کو پسپا و پژمردہ کر دیا۔ فکرِ نعمانی کا یہ پر تو کتنا دلکش و عزیز ہے!

رد شیعیت و قادیانیت پر

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ کی تسلی بخش ولاجواب تصانیف

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی مقبول و معروف تصنیف۔

کتاب کا انداز منفی اور اسکا مقصد بحث و تردید نہیں، بلکہ ان تینوں موضوعات کے بارے میں جن کی طرف اس وقت پوری دنیا کی توجہ مرکوز ہے بلا کم و کاست بنیادی حقائق کی وضاحت ہے۔ کتاب میں کوئی بات اپنی طرف سے یا ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت کے مخالفوں کی تصانیف سے اخذ کر کے نہیں کہی گئی ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان تینوں کے ماخذ ہی کی روشنی میں کہا گیا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس نے ہزاروں بندگان خدا کی آنکھیں کھول دیں۔ شیعیت کی حقیقت جاننے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ عمدہ گلیز کاغذ۔ آفسیٹ کی عمدہ طباعت اور خوبصورت گرد و پوش سے مزین۔

صفحات ۳۰۰ قیمت اردو ایڈیشن -/60 انگریزی ایڈیشن -/55

خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علمائے کرام کا متفقہ فیصلہ

کیا شیعہ مسلمان ہیں؟ اس بارے میں ائمہ اسلام، فقہاء و مجددین اور خصوصاً دور حاضر کے ماہرین فقہ اور محقق علماء کی رائے۔ دلائل کے ساتھ پڑھیے۔ دو حصے مکمل۔ قیمت -/50

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟

رد قادیانیت پر لاجواب کتاب جو عام و خاص سب کے لئے یکساں تسلی بخش ہے۔ قیمت -/19

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قادیانیت پر یہ مختصر رسالہ دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے اور قادیانیت کے زہر کا مجرب تریاق بھی۔

قیمت -/5

کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت

مولانا محمد منظور نعمانی نے اس میں قادیانی لٹریچر کے بیسیوں حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ قادیانی فرقہ مرزا غلام احمد کو نبی و رسول مانتا ہے اس لئے وہ مسلمان نہیں ہے۔ قیمت -/4

ملنے کا پتہ : الفرقان بکڈپو 114/31 نظیر آباد،

مولانا نور عالم خلیل امینی

ایڈیٹر "الداعی" واستاذ ادب عربی دارالعلوم، دیوبند

داعی، مفکّر اور منفرد اسلامی اہلِ قلم

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۲۳ھ / ۱۴۱۷ھ - ۱۹۰۶ء / ۱۹۹۷ء

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

رفتید ولے نہ از دلِ ما

دوشنبہ ۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۵/ مئی ۱۹۹۷ء کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے، شہر مظفر پور سے، میں نے دیوبند میں اپنے اہل خانہ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ میں آج "ویشالی اکسپریس" سے دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، ان شاء اللہ کل علی الصباح دہلی اور دہلی سے ایک بجے چھوٹنے والی لدھیانہ سوپر فاسٹ سے، ساڑھے تین بجے کے قریب دیوبند پہونچ جاؤں گا۔ ریسیور ہاتھ سے رکھنے سے پہلے، میں نے یوں ہی چلتے چلاتے پوچھ لیا کہ اور کوئی قابل ذکر بات تو نہیں؟ تو اہلیہ نے بتایا کہ ہاں، لکھنو میں کوئی مولانا محمد منظور نعمانی تھے، ان کا آج شب میں وہاں کے کسی نرسنگ ہوم میں ۸ بجکر ۴۴ منٹ پر انتقال ہو گیا ہے۔ دارالعلوم کے مناروں سے آج رات سے ہی بار بار ان کی وفات کی خبر دی جارہی ہے۔ اس وقت دارالعلوم میں ایصال ثواب اور تعزیتی جلسہ ہو رہا ہے۔

مولانا نعمانی فرماتے ہیں:

"دار العلوم دیوبند میں، میری طالب علمی کا دور، دو سال (۱۳۴۳ھ۔ تا ۱۳۴۵ھ) رہا۔ یہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ، کی صدارت تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادے کی توفیق بھی بخشی۔ حضرت استاذ کشمیری قدس سرہ، نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ ۱۷ سال بعد دورۂ حدیث کی جماعت میں اتنے اچھے طلبہ اس سال جمع ہوئے ہیں۔"

"تعلیمی سال کے خاتمے پر، جب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا، تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام بھی رکھ دیا (اتنا کام امتحان کے لئے مقرر چند گھنٹوں میں نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے میں نے خصوصی طور پر درخواست کر کے عصر کی نماز تک کے لئے وقت بڑھوایا تھا،) نتیجے میں بھی امتیاز حاصل رہا۔" (۱)

جامعیت کا راز

دار العلوم دیوبند کی تابناک تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہاں کے طلبہ اپنے اساتذہ سے محض علم و معلومات ہی حاصل نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاص و احتساب، ورع و تقویٰ، زہد و صلاح، جذبہ اصلاح، دین کی تڑپ، دعوت و پیغام محمدی کا درد، مسلمانوں کی حالت زار کا غم، اسلام کے حوض صافی کو گدلانے کی کسی کوشش کی بات سوچنے والے کے خلاف ننگی تلوار بن جانے کا حوصلہ اور ساری توانائیوں، صلاحیتوں اور حاصل شدہ وسائل کو خدمت اسلام کے لیے وقف کر دینے کی عزیمت کا بادۂ تیز و تند پی کر سرمست بھی ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں کا کوئی فارغ محض حامل علم یا خشک عالم یا بے نتیجہ رسمی سند یافتہ اور دراہم معدود کی تلاش میں صرف در در کی ٹھوکر کھانے اور اپنی محدود دنیا کو بنانے اور صرف اپنے متعلق سوچنے اور صرف اپنے تن خاکی کے تقاضے کو پورا کرنے کی تگ و دو پر اپنی علمی و فکری "میناکاری" یا ظاہری لیاقت کو مرکوز کر دینے کی کبھی نہیں سوچتا تھا، کیوں کہ اس نے یہ "سبق" ہی نہیں پڑھا ہوتا تھا۔ وہ تو یہاں سے علم کے ساتھ عشق کی تیغ جگرداروتلوارِ بے نیام لے کر نکلتا اور زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتا تھا، جو شاہ عبد العزیزؒ (متوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف سے انھیں، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صاحب تفسیر

---

(۱) تحدیث نعمت ص ۳۰

مظہری، متوفی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) کے یہ کہہ کر سپرد کیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا کرتے تھے کہ اس کو قرآن سکھا دیجئے۔

روح پدرم شاد، کہ اُستاد مرا گفت
کہ فرزندِ مرا، عشق بیاموز، ودگر ہیچ!

(خدائے پاک میرے والد کی روح کو شاد رکھے کہ انھوں نے میرے استاد سے فرمایا تھا کہ میرے بیٹے کو صرف عشق سکھا دیجئے، باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں)

شخصیت کے تشکیلی عناصر

نیز سیر و سوانح کا طالب علم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جامع صفات و کمالات عالم اور دین کے مختلف میدانوں میں سرگرم کار داعی و مفکر آسانی سے اور [illegible]
ہو جاتا۔ اس کی تشکیل و تعمیر میں مختلف عناصر باہم گھل مل کر اپنا
عنصر، محنت، توفیقِ الٰہی، خاندان، ماحول، تعلیم گاہ، اساتذہ کی دعا
سحر گاہی، سیاسی و اجتماعی صورت حال، سازگار اور معتدل یا سخت
حالات، علما و صلحا کی صحبت، علوم جو اس نے حاصل کیے، وہ پٹری جس پر اس [illegible]
متحرک رہی، وہ اہم اسٹیشن جو اس کی زندگی کو کراس کرتے رہے، وہ غم و الم یا خواب و آرزو جو اس کے فکر و نظر کے آشیانے میں جنم لیتے رہے، وہ رفقا جو راہِ عمل اور سفر حیات میں اس کے ساتھ رہے، وہ بڑے اور ذہین لوگ جن سے اس کو شعوری و لاشعوری استفادے کا موقع ملا، وہ مصائب جنھوں نے اس کی مخفی صلاحیتوں کے سوتے جگا دیئے اور وہ مطلوبہ معیار پر سرگرم عمل ہو گئیں، اس کے ملک میں اٹھنے والے سیاسی طوفان اور اس کے وطن کی مذہبی و گروہی کش مکشیں: یہ سبھی کچھ مل جل کر کسی شخصیت کو تراشتے ہیں۔

قدرتاً مولانا نعمانی کی تعمیر میں بھی ان سارے عناصر نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک نسبتاً خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے گھر کا ماحول مائل بہ بدعت ہونے کے باوجود دینی تھا۔ ان کے والد اپنے خاص عقیدے کے ساتھ بھی صالح اور عبادت گزار تھے، کثرتِ عبادت کی وجہ سے ہی "صوفی" ان کے نام کا سابقہ بنا ہوا تھا اور وہ "صوفی احمد حسین" کے نام سے معروف تھے۔(۱)

ان کے والد "گیارھویں" اور "بارھویں" شریف کے قائل ہونے کے باوجود اپنے

---

(۱) دیکھئے "تحدیث نعمت" ص ۳۷-۳۹

مولانا نعمانی فرماتے ہیں.

"دار العلوم دیوبند میں، میری طالب علمی کا دور، دو سال (۱۳۴۳ھ۔ تا ۱۳۴۵ھ) رہا۔ یہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ، کی صدارت تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادے کی توفیق بھی بخشی۔ حضرت استاذ کشمیری قدس سرہ، نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ ۱۷ سال بعد دورۂ حدیث کی جماعت میں اتنے اچھے طلبہ اس سال جمع ہوئے ہیں۔"

"تعلیمی سال کے خاتمے پر، جب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا، تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام بھی رکھ دیا (اتنا کام امتحان کے لئے مقرر چند گھنٹوں میں نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے میں نے خصوصی طور پر درخواست کر کے عصر کی نماز تک کے لئے وقت بڑھوایا تھا،) نتیجے میں بھی امتیاز حاصل رہا۔" (۱)

جامعیت کا راز

دار العلوم دیوبند کی تابناک تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہاں کے طلبہ اپنے اساتذہ سے محض علم و معلومات ہی حاصل نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاص و احتساب، ورع و تقویٰ، زہد و صلاح، جذبہ اصلاح، دین کی تڑپ، دعوت و پیغام محمدی کا درد، مسلمانوں کی حالت زار کا غم، اسلام کے حوض صافی کو گدلانے کی کسی کوشش کی بات سوچنے والے کے خلاف ننگی تلوار بن جانے کا حوصلہ اور ساری توانائیوں، صلاحیتوں اور حاصل شدہ وسائل کو خدمت اسلام کے لیے وقف کر دینے کی عزیمت کا بادۂ تیز و تند پی کر سرمست بھی ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں کا کوئی فارغ محض حامل علم یا خشک عالم یا بے نتیجہ رسمی سند یافتہ اور دراہم معدود کی تلاش میں صرف در در کی ٹھوکر کھانے اور اپنی محدود دنیا کو بنانے اور صرف اپنے متعلق سوچنے اور صرف اپنے تن خاکی کے تقاضے کو پورا کرنے کی تگ و دو پر اپنی علمی و فکری "میناکاری" یا ظاہری لیاقت کو مرکوز کر دینے کی کبھی نہیں سوچتا تھا، کیوں کہ اس نے یہ "سبق" ہی نہیں پڑھا ہوتا تھا۔ وہ تو یہاں سے علم کے ساتھ عشق کی تیغ جگر دار و تلوارِ بے نیام لے کر نکلتا اور زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتا تھا، جو شاہ عبد العزیزؒ (متوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی طرف سے انھیں، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صاحب تفسیر

---

(۱) تحدیث نعمت ص ۳۰

مظہری، متوفی ۱۲۲۵ھ ر ۱۸۱۰ء) کے یہ کہہ کر سپرد کیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا کرتے تھے کہ اس کو قرآن سکھادیجئے۔

روح پدرم شاد، کہ بُاستاد مرا گفت
کہ فرزندِ مرا، عشق بیاموز، ودگر ہیچ!

(خدائے پاک میرے والد کی روح کو شاد رکھے کہ انھوں نے میرے استاد سے فرمایا تھا کہ میرے بیٹے کو صرف عشق سکھادیجئے، باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں)

شخصیت کے تشکیلی عناصر

نیز سیر وسوانح کا طالب علم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جامع صفات و کمالات عالم اور دین کے مختلف میدانوں میں سرگرم کار داعی و مفکر آسانی سے اور [illegible] ہو جاتا۔ اس کی تشکیل و تعمیر میں مختلف عناصر باہم گھل مل کر اپنا [illegible] عنصر، محنت، توفیقِ الٰہی، خاندان، ماحول، تعلیم گاہ، اساتذہ کی دعا [illegible] سحر گاہی، سیاسی و اجتماعی صورت حال، سازگار اور معتدل یا سخت حالات، علما و صلحا کی صحبت، علوم جو اس نے حاصل کیے، وہ پٹری جس پر اس متحرک رہی، وہ اہم اسٹیشن جو اس کی زندگی کو کراس کرتے رہے، وہ غم والم یا خواب و آرزو جو اس کے فکر و نظر کے آشیانے میں جنم لیتے رہے، وہ رفقا جو راہِ عمل اور سفر حیات میں اس کے ساتھ رہے، وہ بڑے اور ذہین لوگ جن سے اس کو شعوری و لاشعوری استفادے کا موقع ملا، وہ مصائب جنھوں نے اس کی مخفی صلاحیتوں کے سوتے جگادیئے اور وہ مطلوبہ معیار پر سرگرم عمل ہو گئیں، اس کے ملک میں اٹھنے والے سیاسی طوفان اور اس کے وطن کی مذہبی و گروہی کش مکشیں۔ یہ سبھی کچھ مل جل کر کسی شخصیت کو تراشتے ہیں۔

قدرتاً مولانا نعمانی کی تعمیر میں بھی ان سارے عناصر نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک نسبتاً خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے گھر کا ماحول مائل بہ بدعت ہونے کے باوجود دینی تھا۔ ان کے والد اپنے خاص عقیدے کے ساتھ بھی صالح اور عبادت گزار تھے، کثرتِ عبادت کی وجہ سے ہی "صوفی" ان کے نام کا سابقہ بنا ہوا تھا اور وہ "صوفی احمد حسین" کے نام سے معروف تھے۔(۱)

ان کے والد "گیارھویں" اور "بارھویں" شریف کے قائل ہونے کے باوجود اپنے

(۱)، دیکھئے "تحدیث نعمت" ص ۳۷۔۳۹

بیٹے کی دینی تعلیم کے لیے بے حد تڑپ رکھتے تھے اور اس کو اچھے سے اچھا عالم دین بنانے کے لیے ہر طرح کی دوا اور دعا کرتے رہتے تھے۔(۱) اپنے خصوصی اعتقادات کے باوجود خدا کی توفیق سے انھیں یقین تھا کہ دین کی اچھی تعلیم، دیوبندی مکتب فکر کے مدرسوں ہی میں ہوتی ہے، چناں چہ اپنے بیٹے کو شروع سے ہی انھی مدرسوں میں تعلیم دلائی اور پھر دیوبند بھیج دیا۔ فرزند ارجمند کے یہاں داخلہ لینے کی برکت سے ان کے اعتقادات بھی شدہ شدہ درست ہو گئے۔

دین کی ہمہ جہت خدمت کی راہ پر

ذکر کیا جا چکا ہے کہ دیوبند میں مولانا نعمانی کی طالب علمی کا زمانہ، دیوبند کے سنہرے دور کا تسلسل تھا؛ اس لیے اس کی فضاؤں اور ہواؤں میں حجازی جلال و جمال اور دینی باغ و بہار کی کار فرمائی تھی۔ اس ماحول کا پروردہ امت کے ہر درد کی دوا اور ملت کے ہر مسئلے کا حل ہوا کرتا تھا۔

وہ دیوبند سے نکلے تو صرف دو تین سال تک اپنے وطن سنبھل اور اپنے ضلع کے قصبہ اُمروہہ میں تدریس کا کام کر سکے۔ اس کے بعد دین کے درد سے معمور انکے قلب و نظر نے انھیں مدرسے کی محدود دنیا سے خدمتِ دین کے وسیع تر میدانوں میں ڈال دیا۔(۲)

انھوں نے اسلام و جاہلیت کے مابین جاری معرکوں کی نئی سمتوں، نئی حسیّت اور نئے رویّوں کا بغور مشاہدہ کیا۔ مغربی تہذیب کی شیشہ سازی، مکربازی اور سحر کاری دیکھی اور دوسری طرف نسلِ نو کی اسلامی تہذیب کے حوالے سے "بیزاری" کی حد تک پہنچی ہوئی "بے اعتمادی" دیکھی۔ انگریزی سامراج کے ہاتھوں ہندو مسلم دشمنی کے کاشت کردہ بیج کو تناور درخت بن کر برگ و بار لاتے ہوئے دیکھا۔ سیاسی تحریکات کی ہمہ ہمی، ملک کی آزادی اور پھر اس کی تقسیم، اور تقسیم کے دوران، اور اس کے بعد کے دل فگار فسادات دیکھے۔ خونِ مسلم کی ارزانی دیکھی، خواتین مسلم کی بے آبروئی دیکھی، میراث خلیل کی پامالی دیکھی۔ نبوت محمدی پر قادیانیت کی ناکام یلغار دیکھی اور عقیدۂ صحیحہ پر بدعتوں اور خرافات کی شبخوں بازی دیکھی۔ عقل نو کا مطالعہ کیا تو پایا کہ اس کو اسلامی تعلیمات کے سلسلے میں آسودگی اور یکسوئی نہیں۔ دوسری طرف یہ دیکھا کہ اس ملک میں سیکولرزم کے پردے میں اسلام پر، اس کی تعلیمات و عقائد پر، تہذیبِ اسلام پر، اور اسلامی شناخت پر، منظم، بھرپور اور پیہم حملے کی منصوبہ بند تیاری ہے۔ سیکولرزم جس کو اکثریت کا بڑا حصہ یکسر مسترد کر چکا ہے اور ایک چھوٹا سا طبقہ اس کو "ہندوازم" کے معنی میں لینے اور ہندو مذہب کی ساری دیومالائی تہذیب و ثقافت و تعلیمات کو ملک کے تمام باشندوں پر تھوپ

---

(۱) تحدیث نعمت ص ۳۷-۳۹ (۲) ایضاً ۳۷۔

دینے کو ہی اصل سیکولرزم کہتا ہے، جس کو کبھی وہ "قومی دھارا" کا نام بھی دیتا رہتا ہے۔ جوانانِ مسلم کو دیکھا کہ وہ (خلافتِ عثمانیہ کے زوال اور اکثر اسلامی ملکوں پر سامراجی قبضے اور اب وہاں سامراجی فکر و فلسفے و طریقۂ حکومت و تہذیبِ مغرب کے عمل دخل اور وہاں کے تمام امور کی رگِ جاں کے پنجۂ مغرب میں آجانے کے بعد) احساسِ کمتری، ذہنی جھٹکے اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہیں۔ جب کہ انگریزی و عصری تعلیم یافتہ مسلم طبقہ، مغربی طرز زندگی کا دل دادہ، اور حرف بحرف اس کی تقلید کا داعی اور عامل ہے اور اسی میں ساری دینی و دنیوی ترقیوں کا راز پوشیدہ دیکھتا ہے، اپنی اس رائے سے مخالفت رکھنے والوں کو "قدامت پسند"، "تنگ نظر" اور "تاریک خیال" اور نہ جانے کیا کیا سمجھتا ہے ؂

یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

انھوں نے یہ سب کچھ صلاحیت وذہانت کی نگاہ سے دیکھا،
غیرت مومن سے مطالعہ کیا، ایمان ویقین سے تجزیہ کیا اور اپنی خدا،
لیاقتوں سے دین و ملت کی بہتری کے لیے زندگی بھر سرگرم عمل رہنے ـــ ـیـ ر س یہ۔
انھوں نے جو کچھ کیا وہ خدا کی توفیق اور اس کے نتیجے میں حسن انتخاب و عمل کی بہترین مثال ہے۔
وہ صحیح معنی میں وقت کے مطلوبہ "اسلامی سپاہی" تھے۔

اُنھوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے فتنوں کا خوب خوب مقابلہ کیا۔ خارجی فتنوں میں آریہ سماج کی شدھی سنگھٹن تحریک کا فتنہ پیش پیش تھا اور داخلی فتنوں میں قادیانیت تو تھی ہی جس کے مبلغ و مناظر فرنگی شیشہ گروں سے "نفس" مانگ کر لاتے اور وارثانِ میراث خلیل و محمد ﷺ سے ان کا سرمایۂ دین و ایمان چھین لینے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ دوسری طرف بریلوی شرک وبدعت نے اس وقت کے خاص حالات میں سر اٹھار کھا تھا۔ مولانا نے ان سارے فتنوں کا زبان و قلم دونوں سے مقابلہ کیا۔ بریلویوں سے بطور خاص متعدد مناظرے کیے۔ ہر مناظرے میں اُنھیں یا تو منہ کی کھانی پڑی یا مولانا کے مقابلے سے راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں انھیں عافیت نظر آئی۔(١) اور قادیانیوں اور آریہ سماجیوں کی بھی اچھی طرح خبر لی ان باطل

---

(١) ان مناظروں کی کچھ تفصیل "تحدیث نعمت" صفحہ ٤٠۔٦٠ میں پڑھیے۔ نیز مولانا نعمانی کی کتاب "دیوبند و بریلی کے اختلاف ونزاع پر فیصلہ کن مناظرہ" پڑھیے۔

فرقوں اور قبوریوں کا مولانا نے جس طرح مقابلہ کیا، حق یہ ہے کہ اس کی بنا پر علمائے دیوبند میں اس سلسلے میں وہ صف اول کے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ بدعت کے سلسلے میں مولانا کا کام شاید مولانا گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) اور مولانا تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) کے بعد علمائے دیوبند میں سب سے زیادہ روشن ہے۔

"الفرقان:" دینی خدمت کا مضبوط اور بے مثال پلیٹ فارم

محرم ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں خاص بریلی سے "الفرقان" جاری کیا، تاکہ اہلِ بدعت کی خود ان کے مرکز بریلی ہی میں سرکوبی کی جاسکے۔ شروع شروع میں الفرقان پر اپنے اولین مقاصد کے تحت مناظرے اور بحث و مباحثے کا رنگ غالب رہا، لیکن بعد میں خصوصاً ۱۹۴۲ء میں مولانا محمد الیاس صاحبؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) اور مولانا شاہ عبد القادر رائپوری (متوفی ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۲ء) سے جڑنے کے بعد اس کا رنگ دعوتی، فکری، علمی اور پیغامی بن گیا۔

"الفرقان" مولاناؒ کا ایک مستقل کارنامہ ہے۔ اس کے ذریعے انھوں نے جس طرح ٹھوس بنیادوں پر دین و دعوت کی خدمت کی، بندگانِ خدا کی راہنمائی کی، قلب و ذہن کو سلجھے ہوئے اسلوب میں روحانی خوراک پہنچائی، متردد ذہنوں کو تشفی بخشی، "عقل مندوں" کو مطمئن کیا، بھٹکے ہوئے آہو کے پھر سوئے حرم آنے کا راستہ ہموار کیا اور ہندی مسلمانوں کے پیش آمدہ مسائل و مشکلات پر جس طرح صحیح اور بروقت رائے دی، یہ سبھی کچھ ایک مستقل تحریر بلکہ تحلیل و تجزیے کا عنوان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاید و باید ہی کسی دینی رسالے نے اتنی لمبی عمر پائی ہو گی اور اہلِ حق کی نگاہ میں اس کو وہ اعتبار و وقار حاصل ہوا ہو گا جو "الفرقان" کو حاصل رہا ہے۔

"الفرقان" کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے مسلمانوں کو مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی جیسا شاندار صحافی اور مایہ ناز اسلامی اہلِ قلم دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا سنبھلی کی تشکیل و تعمیر میں جہاں انکے والد بزرگوار اور صاحبِ الفرقان مولانا نعمانی کی کیمیاگری کو دخل ہے وہیں "الفرقان" کے بابرکت پلیٹ فارم کو بھی۔ اور مولانا نعمانی کے چھوٹے صاحبزادے مولانا سجاد نعمانی ندوی تو اپنے قلم کے حوالے سے تمام تر الفرقان ہی کی دین ہیں۔

مولاناؒ کی خود متعدد تصنیفات الفرقان ہی کے صفحات پر تیار ہوئیں، نیز اس پلیٹ فارم سے دیگر کئی اہلِ قلم کی گراں قدر تصنیفات تیار ہوئیں جن میں مولانا مفتی نسیم احمد صاحب

فریدی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔(۱) "الفرقان" کے متعدد خصوصی اور تحقیقی شمارے، شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) اور مجدد الف ثانی رحمہما اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) پھر شیخ محمد الیاسؒ، مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ (متوفی ۱۳۸۴ھ، ۱۹۶۵ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) وغیرہم پر شائع ہوئے، جنھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ دینی و علمی شخصیات پر اس طرح کے خصوصی نمبرات نکالنے کی طرح غالباً اردو رسالوں میں سب سے پہلے "الفرقان" ہی نے ڈالی۔ اب تو علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات پر رسالوں کے آئے دن نمبر نکلنے لگے ہیں۔

اُس زمانے کا ایک زبردست فتنہ خاکسار تحریک کا فتنہ بھی تھا جس کے بانی عنایت اللہ خاں (ولادت لاہور، ۲۵/ اگست ۱۸۸۸ء وفات لاہور ۲۷/ اگست ۱۹۶۳ء) نام کے ایک صاحب تھے جو "علامہ مشرقی" کے نام سے مشہور تھے۔ یہ تحریک مسلمانوں کے
ایک بڑی آزمائش بن گئی تھی۔ مولانا نے اس کا بھی بھرپور مقابلہ کیا
ابطال کرتے رہے اور الفرقان کی چھٹی جلد ۱۳۵۸ھ کے تین شمارو
اسی تحریک کے بارے میں نکالا، جو سارا کا سارا مولانا ہی کی تحریر پر مشـ

یہاں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ اس وقت کے ہندوستان کے سو ں حالات، برطانوی سامراجی حکومت کی طرف سے ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کے نفاذ، اور ہندوستانیوں کو کچھ زیادہ حکومتی اختیارات دیے جانے سے جو صورت حال پیدا ہوئی تھی، اور آئندہ ہندستان کا نقشہ اور اس نقشے میں مسلمانوں کی جو جگہ متعین ہونے لگی تھی اس کے پیش نظر اہلِ نظر و اہلِ علم و قلم پڑھا لکھا مسلمانوں کا طبقہ خاصا فکرمند ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کی اس نقشے میں کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس طرح کے سوالات پر لکھنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۲۰/ شوال ۱۳۹۹ھ / ۲۳/ ستمبر ۱۹۷۹ء) سر فہرست تھے۔ مولانا نعمانیؒ حساس دل اور مسلمانوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ مودودی صاحب کی طاقت ور تحریروں میں مسلمانوں کے درد کا درماں دیکھ کر وہ ان سے متاثر ہو گئے۔ قصہ طویل ہے وہ جماعتِ اسلامی کی اولین شکل (جو تحریک دارالاسلام کے نام سے قائم ہوئی تھی) اور پھر دوسری شکل میں (جو شعبان ۱۳۶۰ھ / مطابق اگست ۱۹۴۱ء میں "جماعت اسلامی" ہی کے نام سے بنی) نہ صرف شریک رہے بلکہ اس

---

(۱) اور اس سے پہلے نام مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا آتا ہے (الفرقان)

(۲) پڑھیے "تحدیث نعمت" ص ۷۱۔۷۷

کے داعی، قائد؛ بلکہ مولانا مودودی سے زیادہ پر زور وکیل رہے؛ لیکن خدا کی توفیق، کتاب و سنت کی شناوری، دیوبند کی تعلیم و تربیت، علمائے صالحین کی صحبت وغیرہ کی وجہ سے مزاج کی سلامت روی نے انھیں زیادہ دن وہاں رہنے نہ دیا(۱)

مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری اور مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ سے وابستگی کے بعد ان کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا۔ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کے وہ اور ان کے رفیق دیرینہ و شریک دعوت و فکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ شارح و ترجمان اور وکیل بن گئے۔ ان دونوں کی کوششوں سے پڑھے لکھے طبقے میں بطور خاص دعوت کے کام کا وقار بڑھا ۔ مولانا الیاس کی دعوت میں قلم اور پروپیگنڈے کو کسی قسم کا عمل دخل نہیں تھا، وہ کام پر زور دیتے تھے، بات سے بالکلیہ اجتناب تھا، لیکن یہ دونوں حضرات چوں کہ اہل قلم بھی تھے اس لئے دعوت کے کام کو قلم انداز نہیں کر سکتے تھے، ان کے قلم سے ہزاروں بندگان خدا کو فائدہ پہنچا، مولانا نعمانی ایک طاقت ور اور معتبر رسالے کے مدیر بھی تھے۔ انھوں نے رسالے کو بڑی حد تک اس کے لئے مسخر کر دیا۔

مولانا فرماتے ہیں

”حضرت مولانا محمد الیاس کی تحریک کا کام صرف دل و زبان اور عملی نقل و حرکت سے تعلق رکھتا تھا، قلم اور تحریر کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا، یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر میری ذات کے ساتھ ”الفرقان“ ایسا جڑا ہوا تھا کہ کسی علمی، دینی اور اصلاحی خدمت کی میں توفیق پاؤں اور ”الفرقان“ اس سے الگ الگ رہے۔ اس کا تصور ہی کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اب ”الفرقان“ کی بھی اصل دعوت یہی ہو گئی“(۲)

مولانا الیاسؒ کو اس عاجز نے دیکھا نہیں، صرف کتابوں میں پڑھا اور مولانا نعمانی، مولانا علی میاں ندوی اور ان جیسے بزرگوں سے سنا ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ پڑھا اور سنا اس سے ان کے سلسلے میں یہ اعتقاد جازم ہو گیا کہ وہ دین کے حوالے سے کچھ صحابہ جیسی ہی تڑپ رکھتے

---

(۱) اس سارے قصے کی باقاعدہ تفصیل اور اس کا پس منظر جاننے کے لیے، مولانا نعمانی کی مستقل تصنیف ”مولانا مودودی“ کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف“ پڑھنا چاہیے۔ جو ہندی مسلمانوں کے ۷۰۔۷۵ سالہ عہد کی ایک تاریخ بھی ہے اور شروع سے ہی مولانا نعمانی کی دینی پختگی، اسلامی حمیت اور بلند دعووں و پرزور و پرشور قلم کے باوجود کھوکھلے داعیوں اور طریقۂ سلف سے ہٹے ہوئے قائدین و مفکرین کی مزاج آشنائی کی دوربیں صلاحیت کی ایک ٹھوس دلیل بھی۔

(۲) ”تحدیث نعمت“ ص ۸۰۔۸۱

تھے۔ مسلمانوں کی حالت زار پر دل کباب ہو گیا تھا، دین کے لئے تڑپنا، اسی کو غم اول و آخر بنالینا، اس کی دعوت کو عام مسلمانوں تک پہنچا دینے کے لئے اسی طرح بے چین رہنا جیسے انگاروں پر لوٹنے والا رہا کرتا ہے، اور مسلمانوں کو مسلمان بنا دینے کی فکر میں روز و شب گھلنا، پگھلنا اور اپنے خدا سے اس کام کو آسان بنا دینے کے لئے رو رو کر تنہائی میں آرزو کرنا اور دعاہائے سحر گاہی میں اسی موضوع پر اس سے مناجات کرنا اور خدا کے ہر بندے سے منت و سماجت کرنا کہ وہ اسی غم کو اوڑھ لے،: ایسی خصوصیات ہیں جو دین کے سابقین اولین داعیوں کا وجہ امتیاز تھیں۔

چنانچہ مولانا الیاسؒ سے جو بھی لگا، جڑا، متاثر ہوا اور ان کی صحبت میں بیٹھا، ان کی دعوت و تبلیغ میں شریک ہوا، وہ مولاناؒ کے درد سے حصہ پانے سے محروم نہیں رہا، مولانا نعمانی علماء کی صف کے ایسے خوش نصیب لوگوں میں سرفہرست افراد میں تھے۔

چنانچہ ان کی تحریر و تقریر کا رنگ و آہنگ ہی نہیں ان کا
تبدیل ہو گیا، برکت کا نور، عشق کی لپٹ، پیغام محمدی کی محبت کی تپش
صلابت، اور دل حساس کا با مقصد درد و مقدس غم، تحریر و تقریر کے
پھوٹنے لگا، مولانا نعمانی اور ان جیسے "الیاسی بزرگوں" کی اس زمانے او
ایک کرنٹ ہے، ایک عجیب سی محبوبیت ہے، ایک خاص قسم کا جادو ہے، جلے ہوئے دل کی خوشبو ہے، محبوب اعظم محمد ﷺ کی محبت کی جانفزا مہک ہے۔

ملی سرگرمیوں میں قائدانہ رول

لیکن ایسا نہیں ہوا کہ وہ مولانا الیاسؒ اور ان کی دعوت سے مربوط ہو کر دین و ملت کی تمام سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گئے، بلکہ نئے ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کے حل، ان کی باعزت زندگی اور دینی شناخت کی برقراری کے لئے قائدانہ رول ادا کیا اور قلم و زبان اور تگ و دو کے ذریعے متعدد تحریکوں، سرگرمیوں اور کوششوں میں عملی اور فعال حصہ لیا۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل میں پیش پیش رہے، جس کا تخیل اس سے پہلے قاضی عدیل عباسیؒ (متوفی ۲۲/ مارچ ۱۹۸۰ء۔ ۱۳/ جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ) نے پیش کیا تھا اور وہ اپنے ضلع بستی کے حدود میں اس تخیل کو اچھے ڈھنگ سے برپا بھی کر چکے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں ہفت روزہ اخبار "ندائے ملت" کی تاسیس میں اور ۹/ اگست ۱۹۶۴ء کو مجلس مشاورت کی تعمیر میں حصہ لیا، جس کی دعوت ایک بڑے ملی و سیاسی قائد ڈاکٹر سید محمود (متوفی ۱۹۷۱ء) نے دی تھی۔ اسی طرح دسمبر ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل میں قائدانہ رول ادا کیا، جس کی خشت اولین اُن

کی اور دیگر علمائے دیوبند (جن میں مولانا سید منت اللہ رحمانی سابق امیر شریعت بہار واڑیسہ متوفی ۱۴۱۱ھ / ۱۹۹۱ء سر فہرست تھے) کی دعوت پر دار العلوم دیوبند میں منعقدہ اجلاس بابت مارچ ۱۹۷۲ء، میں رکھی جاچکی تھی۔ اور تمام علمائے ہند کے اتفاقِ رائے سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ (متوفی ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء) کو بورڈ کا صدر اور مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کو اس کا سکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ اس بورڈ نے اس وقت سے اب تک مسلمانوں کی دینی شناخت کی بقا کی لڑائی جس کامیابی سے لڑی ہے، اس کامیابی سے مسلمانوں کی کسی تحریک کو سرفراز ہونے کی توفیق آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۳ء میں اپنی مادر علمی دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بنائے گئے اور اس وقت سے تادمِ حیات اس کے سرگرم ممبر رہے۔ ہمیشہ ان کی عالمانہ فاضلانہ اور حکیمانہ رائے کو وزن کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ اور گزشتہ اور حالیہ انتظامیہ دونوں کے دور میں انھوں نے ذمہ داروں کو اپنی گراں قدر رائے، جہاں بینی، دور رسی اور گہرے تجربات سے نہ صرف فائدہ پہنچایا بلکہ مربیانہ راہ نمائی کی۔

ان کی علمی و دینی و دعوتی شخصیت کی بنا پر ۱۹۶۵ء میں انھیں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا رکن تاسیسی منتخب کیا گیا اور تادم زندگی وہ اس منصب پر فائز رہے۔ اسی طرح وہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامی کے بھی رکن رہے۔ ہر جگہ ان کی رائے کا وزن محسوس کیا گیا۔

قلمی خدمات

دعوتی و دینی و ملی میدانوں میں سرگرمِ کار رہتے ہوئے، مولاناؒ نے مختلف اسلامی موضوعات پر گراں قدر تصنیفات اور تحریروں سے اسلامی کتب خانے کو مالامال کیا۔ اسلامی موضوعات پر ہندوستان بلکہ بر صغیر میں لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں، لیکن دو باتوں کی بنا پر مولاناؒ اپنے معاصرین اہل قلم میں لاثانی نظر آتے ہیں۔

[۱] انگریزی تعلیم یافتہ اور مغرب کی مادی تہذیب کے سحر میں گرفتار، مادی طریق فکر و سیاست و فلسفہ پر ایمان رکھنے والی اسلامی تعلیمات سے بے زار یا بے گانہ اور تشکیک میں مبتلا نسلِ نو کو، مدلل، مکمل اور اس کی عقل و خرد و قلب و نگاہ کو متاثر کرنے والے زود ہضم اُسلوب میں؛ اسلامی تعلیمات اور دینی حقائق کو پیش کرنے کے حوالے سے، مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا کام منفرد اور جداگانہ ہے۔ وہ اس سلسلے میں جتنے کامیاب اور خدائے کریم کی طرف سے جس قدر توفیق یافتہ ہیں، کم ہی اہلِ علم و قلم کو یہ سعادت ملی ہوگی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ فرماتے ہیں

"جہاں تک اس زمانے کا تعلق ہے، یہ کام (یعنی دینی تعلیمات و حقائق کو عصر حاضر کے ذہن و تقاضے کو سامنے رکھ کر پیش کرنے کا کام) پہلے سے زیادہ دشوار اور نازک ہو گیا ہے، کہ ذرا سی غفلت، کسی رجحان کے غلبے، یا ذہنی ردّ عمل کے نتیجے میں، دین کی تفہیم، زمانے کے اثرات سے متاثر، روح اور مقاصدِ دین سے دور اور رائج الوقت اور مقبولِ زمانہ فلسفوں، تحریکوں اور نظریات کی ترجمان بن سکتی ہے۔ اس کام سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ بر آ ہو سکتا ہے، جس نے ایک طرف دین کا علم، اس کے ماہر اساتذہ اور علمائے راسخین سے حاصل کیا ہو، کتاب و سنت سے براہِ راست استفادے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہو، تعلیم کے ساتھ علمائے راسخین کی صحبت بھی پائی ہو، پھر اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کے مختلف حلقوں میں را...
خیالات سے واقف ہو؛ اس نے زندگی کسی خیالی دنیا، علمی حصار یا "د...
ہو؛ اہل حرفہ سے لے کر دانش وروں اور علما و واعظین سے لے کر...
والوں تک سے اس کا اختلاط و نشست و برخاست رہی ہو، پھر وہ (وہی...
مسائل کو سہل اور عام طریقے پر بیان کرنے اور سادہ سے سادہ زبان بولنے اور...
اس سب کے علاوہ اُس کے اندر اخلاص،، سوزِ دروں اور دعوت کا طاقت ور جذبہ بھی پایا جاتا ہو، کہ اس کے بغیر کوئی کوشش مؤثر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔

". مجھے اس حقیقت کے اعلان میں مسرت اور کسی قدر فخر محسوس ہوتا ہے کہ رفیقِ محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" نے اس اہم اور نازک کام کا بیڑہ اٹھایا ....."(۱)

[۲] میرے علم میں نہیں کہ کسی اہلِ علم و قلم نے عصر حاضر میں رکاکت یا عامیانہ پن اور سطحیت سے بچتے ہوئے اتنی عام فہم زبان میں اسلام کی دعوت و تعلیمات کو عصر حاضر کے مطابق پیش کیا ہو، جس کو پڑھ کر علماء و تعلیم یافتہ بھی بے مزہ نہ ہوں، اکتائیں نہیں اور عوام پڑھیں تو ایک ایک لفظ ان کے دل میں اترتا چلا جائے، جس میں ادبی چاشنی تو مکمل طور پر پائی جاتی ہو؛ لیکن الفاظ کی بے جا شوکت و سرکشی اور ترکیب کی "کوہ پیمائی" اور ہمالیائی اونچائی" سے بچا گیا ہو اور پڑھنے والے کو ایسا لگے کہ لکھنے والے نے ہر ہر لفظ کو محسوس کر کے لکھا ہے، ہر ہر جملے کو پیمائش اور تول کے بعد ہی، جملے میں برقرار رہنے دیا ہے اور جیسے عوام و خواص کی میٹنگ بلا کر اس

(۱) مقدمہ "دین و شریعت" ص ۱۶، تیرہواں ایڈیشن ۱۹۹۴ء، الفرقان بکڈپو، لکھنؤ

گیا ہے۔ مولانا کا عام فہم اور شیریں ترجمہ، نیز دلکش و روح پرور تشریح نے کتاب کو ہر مسلمان کی ضرورت بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب اِصلاحی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے تمام میدانوں میں مسلمانوں کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اور عمل سے راہ نمائی حاصل کرنا آسان ہو جائے، لیکن مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ حدیث پاک کی بہت سی تعبیروں کا صحیح اردو ترجمہ نیز بعض دقیق علمی بحثوں کی گرہیں اس کتاب میں جس آسانی سے کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں بہت کم جگہ یہ چیز نظر آئی۔

"الداعی" کی ذمے داری لینے کے بعد، میں نے طے کیا کہ اس کو کسی نہ کسی درجے میں داعی رہنا چاہیے اور ایسے دعوتی و فکری مضامین ہر شمارے میں آنے چاہئیں جن میں اسلامی تعلیمات و حقائق کو نئے ذہن کے مطابق پیش کیا گیا ہو۔ فرزندانِ دیوبند نے جو بھرا پُر اگراں مایہ اِسلامی کتب خانہ تیار کر دیا ہے، میں نے اِس مقصد کی خاطر اُس پر ایک نگاہ ڈالی، تو باوجودے کہ یہ تصنیفات و نگارشات اپنی جگہ گراں بہا، بے مثال اور تمام علم و فن کی جامع ہیں، لیکن مجھے اِس بحر میں وہ درِ مطلوب زیادہ آسانی سے نہیں مل سکا جس کا میں متلاشی تھا یعنی یہ کہ دعوتی و فکری بات آسان زبان میں اور موجودہ ذہن کو سامنے رکھ کر کی گئی ہو۔ بالآخر مولاناؒ کی "دین و شریعت" "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے"، "معارف الحدیث" "الفرقان کی فائلوں میں ان کے مضامین اور ان کے تقریری مجموعوں سے ہی اس سلسلے میں فائدہ اٹھایا جا سکا۔

شیعیت کے موضوع پر مولانا کی زندۂ جاوید تصنیف

امام آیت اللہ روح اللہ خمینی (متوفی ۴؍جون ۱۹۸۹ء؍۱۴۰۹ھ) نام کے ایرانی شیعی اثنا عشری عالم نے ایران میں رضا شاہ پہلوی کی طاقت ور شاہی کا تختہ الٹ کر اپنے عقیدے کے مطابق ۱۳۹۹ھ؍۱۹۷۹ء میں وہاں "اسلامی حکومت" قائم کی، تو نہ صرف شیعی دنیا نے آسمان سر پر اُٹھا لیا، بلکہ وہ سنی العقیدہ مسلمان خصوصاً نوجوان جو ایک خاص قسم کی سطحی اسلامی تحریک سے متاثر، "حکومت الٰہیہ" یا "خلافت علی منہاج النبوہ" کے قیام کے لیے نام نہاد کوشش اور مطلوبہ عمل و اِخلاص کے بغیر محض کھوکھلے نعروں سے مسحور اور اس سلسلے کے لٹریچر کے "منشیات" سے سرشار تھے؛ خمینی کے عقیدے، صحابہ کرام پر اُس کے سب و شتم، ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم پر بطورِ خاص اُس کے لعن و طعن اور ایسی الزام تراشی جو کسی نہایت ہی ضال، فاسق اور بدکردار جماعت کے لیے بھی نہیں کی جاتی(۱) سے بالکلیہ صرفِ نظر کرتے ہوئے؛ اُس کو ایک صحیح، مطلوبہ اور مثالی حکومت اسلامی کا بانی، اسلامی انقلاب کا داعی و مؤسس، قابلِ تقلید قائد

سمجھنے، سمجھانے اور پوری دنیا میں اس کا بول بالا کرنے کے لیے زبان، قلم، اور ذرائع ابلاغ کی ایسی پرزور طاقت صرف کرنی شروع کردی اور خمینی سے عقیدت و محبت کے اظہار میں یہ لوگ اس حد تک پہنچ گئے کہ اُس کے خلاف کوئی حرفِ تنقید زبان سے نکالنے والا اُن کے نزدیک گویا اتحادِ اسلامی کا مخالف، حکومتِ اسلامی کا دشمن، مسلمانوں کے انتشار کا داعی اور غلبۂ فکرِ اسلامی و عروجِ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والا بن گیا۔

اس صورتِ حال سے صحیح العقیدہ علمائے دین بے چین ہوگئے؛ کیونکہ فساد عقیدہ کے ساتھ کسی طرح کی "اسلامی حکومت" کا قیام اور اس سلسلے کی دعوت و تحریک محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں قابل قبول نہیں۔ خدائے ذوالجلال کسی کروفر، کسی مغربی طاقت کو للکار دینے، کسی بڑی طاقت کے لیے مشکلات پیدا کردینے سے متاثر و "مرعوب" نہیں ہوتا ا... کے نزدیک اصل یہ ہے کہ شرک سے اجتناب کیا جائے۔ اس کی الو...
وباطنی شکلوں سے بچا جائے، اسی کو سارے کارخانے کا حاکم و مالک

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر
حرف اُس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہوگیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

ان علمائے حق میں سر فہرست مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ہے جن کا قلم بدعت، قادیانیت اور دیگر باطل فرقوں کے مقابلے میں شرر بار رہ چکا تھا۔ مولانا نے اپنے امراض، پیرانہ سالی، کمزوری ساری چیزوں سے بے نیاز ہو کر شیعیت کا، اس کی تاریخ کا اس کے قدیم مآخذ کا اور جدید مراجع کا نیز خمینی کی تصنیفات و تحریرات کا گیرائی و گہرائی سے مطالعہ کیا۔

اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اِس مطالعے نے اُن کے ضعیف اور بیماریوں سے زار و نزار جسم میں ایک نئی حرکت و قوت اور فکر و مطالعے کی ایک نئی صلاحیت پیدا کردی۔ اُنھوں نے اِس محنت و انہماک کیساتھ کام شروع کیا کہ بارہا اُن کی صحت خطرے میں پڑ گئی اور اہلِ تعلق کو اس بارے میں فکر و تشویش لاحق ہوئی، لیکن مولاناؒ اپنی افتادِ طبع اور زندگی بھر کے معمول کے مطابق اپنے کو اس سے باز نہیں رکھ سکے۔"(۱)

مولانا نے اس مذہب کا معروضی،، حکیمانہ و عالمانہ و مؤرخانہ جائزہ لیا، جس کے نتیجے میں

---

(۱) پڑھیے خمینی کی کتاب "کشف الاسرار" بزبان فارسی، ص ۱۱۰۔۱۱۴

ان کی محققانہ کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" معرضِ وجود میں آئی جو مذہبِ شیعہ کی مکمل تاریخ، اس کے عقائد اور کتاب و سنت کی روشنی میں ان کے عقائد سے اخذ کردہ نتائج کا اتنا جامع مرقع بن گئی ہے جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں۔ شیعیت کا یہ جدید ترین اور بہترین مطالعہ ہے جو کسی بھی پڑھے لکھے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

مولانا نے جس وقت اس کتاب کو بالاقساط لکھنا اور الفرقان کے صفحات پر شائع کرنا شروع کیا، اُسی وقت میرے جی میں آیا کہ یہ کتاب وقت کی ضرورت ہے اور ہمیشہ کے لیے عموماً اور اس وقت خصوصاً اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عرب دنیا بھی تشیع کے فتنے، اس کی تحریف کاری اور جسمِ اسلامی میں اس کے سرطانی عمل سے واقف ہو۔ نیز خمینی کی اپنے سلف کی شدید پیروی، صحابہ کرام سے اس کی اور اس کے سلف کی بیزاری تبرا، سب و شتم، اور دل گداز الزامات کی چارج شیٹ سے واقف ہو۔ پھر "حکومت اسلامیہ" کا بھرم بھی اس کے سامنے کھل جائے اور عالمِ اسلام کے نعرہ باز نوجوانوں پر اس کا جو طلسم چلا ہوا ہے اس کے ٹوٹنے کی راہ ہموار ہو۔

یہ سوچ کر میں نے اسے عربی قالب میں "الداعی" میں شائع کرنا شروع کیا۔ اس موقع سے قدرتی طور پر مولانا کی بے پناہ توجہات سے سرفراز رہا۔ وہ اپنے خطوط کے ذریعے جہاں دعائیں دیتے، حوصلہ بڑھاتے، وہیں کسی جگہ عبارت کو حذف کر دینے یا اس کی تعبیر بدل دینے یا پیراگراف کے اضافے اور مزید حوالوں کی نشان دہی کرتے۔

عشقِ جسور و فقرِ غیور کی جلوہ گری

مولانا نعمانی کی تمام تصنیفات، نگارشات، اور علمی و دعوتی کاموں میں جو برکت نظر آتی ہے، ایک خاص قسم کی روشنی پھوٹی پڑتی ہے، ایسی کشش ہے جس کا سرچشمہ محض الفاظ کا حسن، تعبیرات کا جمال، ترکیب کی خوبی، بیان کی رعنائی، طرزِ ادا کی زیبائی؛ نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جب ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ اُن کے ہاں الفاظ کے بناؤ سنگار، اور تراش خراش پر بالارادہ زور نہیں۔ اس کے باوجود ان کی چھوٹی بڑی تمام تصنیفات بے حد مقبول ہیں، ان کے تراجم بہت متداول ہیں۔ اُن کے ذریعے ہزاروں بندگانِ خدا کو دین کے جاننے، سمجھنے، اور اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی ہے۔ اُن کی تالیفات اور مطبوعہ تقریریں عام مسلمانوں کے لیے دین سمجھنے کے حوالے سے ایک عام اور ناگزیر ضرورت بن گئی ہیں. یہ سبھی چیزیں وہ ہیں جو ایک بندۂ خدا،

---

(۱) "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" ص ۱۶، ساتواں ایڈیشن، الفرقان بک ڈپو نظیر آباد لکھنو، یوپی۔

ایک مقبولِ بارگاہِ الٰہی، ایک ایسے عالم ہی کی تصنیفات واعمال میں ہو سکتی ہیں جس کو توفیقِ الٰہی کی دولت، خدا کے صالح بندوں کی صحبت، خاصانِ خدا کی تربیت، مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کی توجہات سے سرفرازی اور ان کی خصوصی دعاؤں سے بہرہ یابی حاصل رہی ہو۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

کوئی عالم، مصنف، اہلِ قلم، داعی، محدث، قائد دینی، مصلح اجتماعی، بلکہ ادیب، شاعر اور فنان، خواہ کتنا ہی قد نکال لے، وہ محض علم واطلاع کے بل بوتے پر اور صرف ذہانت وذکاوت، عقل وعبقریت، دورنگاہی وروشن خیالی کے سہارے، اپنے کام میں برکت کا نور، مقبولیت کی سحرکاری، قدر افزائی وپسندیدگی کی جاذبیت پیدا نہیں کر سکتا، اگر اس کے کام کا خمیر خونِ جگر، نورِ تقویٰ، تب وتابِ اخلاص، بے تابیٔ عشقِ رسول، سرشاریٔ محبت الٰہی، عبادت اور شوقِ ریاضت سے نہ اٹھا ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی عمل کو فائدہ رسانی اور باعثِ حیات جاودانی بنا دیتی ہے۔

واقف ہو اگر لذتِ بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پر اسرار

مولانا نعمانیؒ نے رائپور (ضلع سہارنپور) کی خانقاہ اور مولانا محمد الیاس کی صحبت ودعوت سے محبت کا جامِ آتشیں نوش کیا تھا، علامہ انور شاہ کشمیری کے نفسِ گرم سے تاثیر حاصل کی تھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کی زیارت سے فیض پایا تھا، عارف باللہ مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی (متوفی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندی سابق مہتمم دار العلوم دیوبند (متوفی ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء) حکیم الامت حضرت تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) شاہ وصی اللہ فتح پوری گورکھپوری ثم الہ آبادی (متوفی ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی (۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) امام اہلِ سنت مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنوی (متوفی ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء) کی صحبت ومعیت وعلمی استفادے اور روحانی استفاضے کے حوالے سے قدح خوار رہے تھے اور ان کی مومنانہ نگاہ سے اپنی "تقدیر بدلوانے" میں مدد لی تھے۔ محمد عربی مکی مدنی ہاشمی قرشی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِن عشاقانِ پاک طینت ونیک سیرت سے سلیقۂ عشق ومحبت اور دین کے لیے جینے مرنے کا ذوق حاصل کیا تھا، اسی لیے ان کی تحریر میں جو لذتِ گفتار اور گرمیٔ کردار ہے وہ ہر عام وخاص کو متاثر کرتی اور گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اللہ نے ان کی مقبولیت کا

نظارہ ہم لوگوں کو اس طرح دکھادیا کہ ایک ڈیڑھ لاکھ کے مجمع نے ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی اور سخت دھوپ میں ۸ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے عیش باغ قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ تک انھیں رخصت کیا۔

مولانا کی چند خصوصیات

مولانا ذہین اور قوی الحافظہ تھے، اُنھیں درسی کتابوں کی عبارتیں، فقہ کے متون اور بہت سی اُحادیث زبانی یاد تھیں۔ بوقتِ ضرورت بالفاظہ زبانی پڑھ جاتے تھے۔ کسی عالم کی گفتگو کو عرصے کے بعد بھی اُنھیں کے الفاظ میں لکھ اور بول لیتے تھے۔(۱) واقعات و حالات کو بغیر کسی کمی اور زیادتی کے بیان کرنے پر بھی انھیں عجیب سی قدرت تھی۔ اپنے ملنے والوں کو عرصے کے بعد دیکھ کر بھی پہچان لیتے تھے۔ سالہاسال سے بیماری اور کمزوری کے باوجود انتقال سے ذرا پہلے تک بھی ان کا حافظہ اور دماغ صحیح طور پر کام کرتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث و فقہ کے ساتھ ان کے مسلسل اور طویل اشتغال کی یہ برکت تھی۔ فقہا اور محدثین عموماً قوی الحافظہ اور ذہین ہوئے ہیں، کیوں کہ قوتِ حافظہ خدائی روشنی ہے، جس سے صالحین کو سرفراز کیا جاتا ہے۔ امام شافعی کا زبان زد خاص و عام قطعہ ہے کہ "میں نے اپنے استاذ حضرت وکیعؒ سے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو آپ نے مجھے معاصی سے اجتناب کی تلقین کی کہ قوتِ حافظہ نورِ الٰہی ہے جو کسی عاصی کو نہیں دیا جاتا۔"

ذہانت کی بنا پر مولاناؒ مسائل کی تہوں اور اُن کے ممکنہ گوشوں تک بہت جلد پہنچ جایا کرتے تھے، پھر جلد ہی ان کے مناسب حل تک بھی ان کی رسائی ہو جاتی تھی۔

وہ صائب الرائے اور دوربیں بھی تھے، طویل تجربات، سمجھ داری، زمانے کے نرم گرم سے مسلسل سابقہ اور زندگی کے دراز سفر نے اُنھیں یہ صفت عطا کی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ حساس مسائل اور ملک و ملت کے نازک معاملات میں بڑے بڑے علماء و قائدین ان سے رجوع کرتے اور ان کی رائے معلوم کر کے اسی پر عمل کرتے تھے۔

حالات حاضرہ اور تقاضاہائے زمانہ پر ان کی گہری نگاہ تھی، وہ اچھی طرح جانتے کہ کس مسئلے کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے اور دعوتِ دین کو عوام و خواص میں مقبول بنانے کے لیے اس

---

(۱) "تحدیث نعمت" میں ص ۱۳۹ سے ۱۸۶ تک میں حضرت تھانویؒ کی خدمت اقدس میں اپنی بار بار کی حاضریوں کے ضمن میں بہت سے مسائل پر حضرت کے ساتھ تبادلۂ خیال اور گزارشات کے اپنے الفاظ اور حضرت تھانوی کے جوابات کے متون مولاناؒ نے اکثر جگہ سالہاسال کے بعد اپنے حافظے کی مدد سے لکھے ہیں اور اکثر جگہ فرمایا ہے کہ جہاں تک یاد پڑتا ہے اصل الفاظ یہی تھے۔

وقت کن پتھروں اور روڑوں کو ہٹانے کی فی الفور ضرورت ہے اور انھیں کس طرح ہٹایا جانا چاہیئے۔ مغربی تہذیب کے نشے سے چور اور عصری تعلیم سے مخمور ذہنِ نو کو کس طرح مخاطب کیا جائے؟ خوب جانتے تھے "عصری حسیّت" کے ماہر تھے اور حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے حکیمانہ مقولہ "کلّمُوا الناسَ علی قَدرِ عقولِهم أتريدونَ أن يُكَذَّبَ اللّهُ و رسولُه" (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق خطاب کیا جائے تاکہ وہ نادانی سے اللہ ورسول کی بات کی تکذیب نہ کریں)۔ پر اچھی طرح عمل کرنا جانتے تھے۔ ان کی تمام تحریریں اور تقریریں اس کی شاہدِ عادل ہیں۔

علمی مباحث ہوں، یا فرق ومذاہب، یا نظریات ورجحانات: ان کے درمیان موازنہ اور تجزیہ ایسا کرتے کہ بڑے بڑے مدعیٔ تحقیق کو بھی تشفی ہو جاتی اور ہر پڑھے لکھے کو ان کی رائے دل لگتی بات محسوس ہوتی۔ باطل فِرَق ومذاہب اور دعوات وتحریکا-
کے منشائے زیغ وضلال وطریقۂ اِضلال پر ان کی نگاہ ہمہ گیر تھی۔

وہ اظہارِ حق میں بھی جری واقع ہوئے تھے، اس سلسلے
والے کی ملامت، دوستوں کی ناراضگی اور اپنوں کے برا ماننے کی پرواہ
یقین ہو جائے کہ فلاں بات حق ہے، ضمیر کا یہی تقاضا ہے اور اللہ رب العزت ے ردیف ہن پسندیدہ ہے۔ وہ پرانے کپڑوں کی طرح تبدیلیٔ رائے سے بھی مکمل گریزاں تھے۔

وہ رقیق القلب، جلد آبدیدہ ہو جانے والے اور بہت گریہ کناں تھے۔ حضور ﷺ آپ کے صحابہ اور صلحائے امت کے تذکرے سے روئے بغیر گزرنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ اپنے تمام اساتذہ ومشائخ کی یکساں قدر کرتے تھے اور ان کے اختصاص کے گوشوں میں ان سبھوں سے استفادے کے لیے کوشاں رہتے۔ ہر چند کہ اُنھیں علامہ کشمیری، شیخ عبدالقادر رائپوری، مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے زیادہ مناسبت تھی اور انھیں سے زیادہ اکتسابِ فیض بھی کیا۔

دارالعلوم دیوبند سے عشق

وہ مادر علمی دارالعلوم دیوبند کے عاشقِ صادق، اس کے مسلک کے سرگرم ترجمان، بدعت وقبوریت کے لیے شمشیر برہنہ اور ہمارے علما کی صف میں اس سلسلے میں زیادہ واضح موقف رکھتے تھے۔ دارالعلوم سے ان کا عشق ایک احسان مند کا اپنے محسن کے احسان اور اپنے منعم کی بخششوں کی قدردانی سے عبارت تھا۔ وہ زندگی بھر اُس کے آتش عشق میں جلتے اور اس کی

محبت کی شراب صبوحی وغبوقی پیتے رہے۔ جب تک کسی طرح بھی دیو بند آنے کی سکت باقی رہی مجلس شوریٰ میں بلاناغہ شرکت فرماتے رہے؛ لیکن جب طرح طرح کے امراض واعذار نے چلنے پھرنے سے مجبور کر دیا تو ہمیشہ ان کی تمنا رہی کہ کاش وہ ایک مرتبہ دار العلوم آجائیں۔ دار العلوم کے درودیوار پر ایک نگاہ کسی طرح ڈال لیں، طلبہ واساتذہ سے آخری دفعہ ملاقات کرلیں، مجلس شوریٰ کے ارکان وذمہ داران میں حیات اپنے دوستوں کو الوداع کہہ لیں۔ دوایک مرتبہ عشق نے جب زیادہ ستایا تو اپنے کئی اعزہ کے سہارے وہیل چیر پر بیٹھ کر نہ جانے کتنی مشقتوں سے ریل یا کار کے ذریعے سفر کر کے دار العلوم پہنچے۔

وہ آخر دم تک دار العلوم کے اہم معاملات میں ذمہ داروں کو مشورے دیتے رہے، خصوصاً دار العلوم کے موجودہ مہتمم، مرد صالح حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کو، جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک مربی بزرگ اور سرپرست کو کھو کر بڑی تنہائی محسوس کر رہے ہیں۔

خدائے پاک انھیں اپنی خاص رحمتوں سے نوازے اور انبیا، صدیقین، شہداء اور صالحین کے جوار میں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ان کے تمام اعزا، متعارفین، رفقا، دعاگو اور محبین و معتقدین کو صبر جمیل واجر جزیل سے نوازے۔ آمین۔

☆☆☆

مولانا عبد القدوس رومی

مفتیٔ شہر۔ آگرہ

حضرت مولانا نعمانیؒ کی یادگار

”الفرقان“ کا دورِ زرّیں۔اُس کا دورِ اوّلین

☆☆☆

[قارئین اس مضمون کے آخری حصے میں کچھ ایسی چیزیں پائیں گے جوا
کے خاص موقع و محل کے ساتھ کچھ مور و ں نہ معلوم ہوں۔ لیکن
کا ایک قیمتی مضمون ہے۔۔البتہ قارئین کو الجھن سے بچانے کیلئے کہیں
مناسب سمجھی گئی ہیں۔۔۔ ادارہ]

عنوان مذکور الصدر کے تحت اپنا اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے یہ ذکر کر دینا مناسب و بر محل ہوگا کہ راقم السطور کو حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کی پہلی زیارت کب اور کہاں ہوئی تھی اور پھر بعد میں وہ اتفاقی و ہنگامی ملاقات و زیارت کس طرح گوناگوں روابط و تعلقات میں تبدیل ہوگئی تھی۔

یہ ان متعدد الجہات اور گوناگوں روابط و تعلقات ہی کا تقاضا ہے کہ احقر کو اپنے مزاج اور عام عادت کے خلاف یہ طے کرنا پڑا کہ ”تذکرہ نگاری“ کا یہ دشوار گذار فریضہ چاہے کسی اور کے لئے ادا نہ کیا گیا ہو مگر حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کیلئے جس طرح بھی بن پڑے کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی لکھنا ہے۔

تذکرہ نگاری میں راقم السطور کو جو دشواری محسوس ہوتی ہے اسے سمجھانے کیلئے اپنی ہی ایک بات یہاں لکھ دینا مناسب ہے جو متعدد بار راقم السطور کو ایسے حضرات سے عرض کرنی پڑی ہے جنھوں نے اپنی کسی کتاب پر تقریظ یا مقدمہ و پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ احقر نے ان حضرات سے یہ کہکر معذرت کرلی کہ بھائی! میری قسمت میں قسّامِ ازل نے اس قسم کے مضامین

کا کوئی حصہ رکھا ہی نہیں ہے اسلئے اس خدمت سے معذوری ہے، احقر کو اپنی اس کمزوری کا تجربہ برابر ہوتا رہتا ہے کہ کسی کتاب پر تقریظ لکھنا شروع کی مگر دھیرے دھیرے مضمون کی پٹری بدلتی گئی اور آخر میں وہ تقریظ تنقید کی پٹری پر آگئی۔ اپنی اسی کمزوری کی وجہ سے ایسی خدمات سے معذرت کر لیا کرتا ہوں۔

احقر کو حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کی پہلی زیارت ۱۳۵۵ھ یا ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء) میں بہت ہی عجیب و غریب طور پر ہوئی تھی جو ساٹھ سال کی طویل مدت گذر جانے کے بعد آج بھی تقریباً اسی طرح ذہن میں یوں محفوظ و موجود ہے جیسے یہ ابھی کل ہی کا واقعہ ہو۔

یہ واقعہ غالباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء کا ہے اسوقت احقر کے والد محترم مولانا محمد سراج الحق مچھلی شہریؒ بسلسلۂ ملازمت فتحپور ہنسوہ میں تھے اور احقر نے وہیں مدرسہ اسلامیہ میں ابتدائی عربی و فارسی کتابیں شروع کی تھیں۔ اپنی عمر اسوقت بارہ، تیرہ سال کی رہی ہوگی، حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ بقید حیات تھے۔ مگر سفر کا عمومی سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ کسی وقتی ضرورت سے حضرت علیہ الرحمۃ کانپور تشریف لائے ہوئے تھے اور اُدھر شہر فتحپور میں رضاخانیت کے نقیب اعظم جناب حشمت علی خانصاحب پیلی بھیتی کئی روز سے اپنی تقریروں کے ذریعہ شہر کی پر سکون فضا میں ہلچل پیدا کئے ہوئے تھے۔ ان تقریروں میں بار بار مطالبہ یہ ہوتا کہ حفظ الایمان کی کفریہ عبارت کے مصنف کانپور آئے ہوئے ہیں۔ مجھ سے مناظرے کیلئے انہیں یہاں بلالو اور مناظرہ کرالو۔ اگر وہ یہاں آنے پر تیار نہ ہوں تو اپنی شکست تسلیم کرلیں (''شیر بیشہ'' کی یہ شیری بھی قابل غور ہے کہ وہ کانپور سے ملے ہوئے شہر فتحپور میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی کو مناظرے کیلئے چیلنج کر رہے تھے مگر یہ ہمت نہیں پڑتی کہ وہ خود کانپور جاکر چیلنج کریں) حشمت علی خانصاحب کی یہ ڈینگیں شہر فتحپور کے اہل حق کئی روز تک متواتر سنتے رہے اور پھر انہوں نے بالکل ہی رازدارانہ طور پر اسکا ایک حل بھی سوچ لیا اور چپکے سے بذریعۂ تار ''مناظر اہل سنت'' حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے تشریف لانے کی درخواست کردی جسے مولانا نے بلانے والوں سے قدیم تعلق کی بناپر قبول بھی فرمالیا اور تار ہی سے جواب دیا کہ میں ''کالکا میل سے فتحپور پہنچ رہا ہوں'' حالات کے اس پس منظر سے راقم السطور بے خبر تھا۔ اسے تو صرف اتنی ہی خبر تھی کہ فتحپور میں ''شیر بیشہ'' کی اشتعال انگیزیوں کیوجہ سے ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے اور بس۔ اسی موقع پر ایک روز والد صاحب نے احقر کو بلایا اور پوچھا کہ الہ آباد میں ''میر مسیتا'' کی مسجد کے نیچے جو دکاندار ہیں انکا حلیہ وصورت تمہارے ذہن میں ہے؟ احقر نے اثبات میں جواب دیا کہ ہاں

اچھی طرح ہے!

تب فرمایا کہ تم اسی وقت اسٹیشن چلے جاؤ ابھی "کالکا میل" سے اسی حلیہ کے ایک مہمان آرہے ہیں تم انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے آؤ۔ ہم لوگ اسوقت فتحپور کے محلہ "کھیلدار" میں رہتے تھے۔ جہاں محرک تحریک ندوۃ العلماء حضرت مولانا شاہ سید ظہور الاسلام صاحب علیہ الرحمۃ کا مزار بھی ہے۔ یہ محلہ شہر کے ایک گوشہ میں پڑتا تھا۔ یہاں سے اسٹیشن آنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ باہر ہی باہر تھا۔ دوسرا راستہ وسط شہر سے گذرتا ہوا تھا۔ حضرت والد صاحب نے از راہِ احتیاط مجھے تاکید فرمادی تھی کہ مہمان محترم کو اپنے گھر تک باہر والے راستے ہی سے لایا جائے۔ یہ احتیاط و رازداری اس درجہ ملحوظ رکھی گئی تھی کہ اسٹیشن جاتے جاتے بھی احقر کو اس بات سے بے خبر رکھا گیا تھا کہ یہ آنے والے مہمان کون صاحب ہیں؟ سلسلہ میں تشریف لارہے ہیں۔ اور یقیناً اسی وجہ سے خود اسٹیشن جانے مامور کیا گیا تھا۔

اسی بے خبری کے عالم میں احقر "کالکا میل" سے آنے وا۔ کیلئے ٹرین کے مقررہ وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا۔

"کالکا میل" دہلی، ہوڑہ لائن پر چلنے والی بہت پرانی ٹرین ہے اور اسکی آمد و رفت کے اوقات بھی شاید روز اول سے ایک ہی چلے آرہے ہیں۔ یہ ٹرین آج کل جسوقت فتحپور پہنچتی ہے، اب سے ساٹھ سال پہلے بھی اسی وقت پہنچتی تھی (سہ پہر کو چار بجے کے قریب دہلی سے آنے والی یہ ٹرین فتحپور پہنچتی تھی) ٹرین کے لیٹ ہوجانے کی جو بیماری آجکل لگی ہوئی ہے یہ اسوقت ماورائے تصور تھی، اسٹیشن پر احقر کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کہ ٹرین آگئی۔ احقر کی متجسس نگاہیں والد صاحب کے بتائے ہوئے حلیے والے مہمان کو تلاش کررہی تھیں کہ پلیٹ فارم کے اسی حصہ میں جہاں باہر جانے کا گیٹ ہوتا ہے اور مسافروں سے ٹکٹ لینے والا ٹی ٹی کھڑا ہوتا ہے اسی جگہ ٹرین کے ایک ڈبے سے اسی حلیہ کے ایک صاحب ٹرین سے اترے، احقر نے ان سے سلام و مصافحہ کیا اور عین اسی وقت حضرت مولانا عبدالوحید صاحب مدظلہٗ (۱) جو فتحپور میں احقر کے استاد تھے وہ نظر آگئے جو اسی "کالکا میل" سے الہ آباد جارہے تھے، انھوں نے جلدی جلدی حضرت مولانا سے سلام و مصافحہ و معانقہ کیا اور ٹرین پر سوار ہوگئے۔ احقر اپنے مہمان محترم کو حسبِ ہدایت باہر والے راستے سے اپنے گھر محلہ کھیلدار لے گیا جہاں والد محترم علیہ الرحمہ بعض

---

(۱) افسوس کہ حضرت مولانا اس مضمون کی اشاعت سے قبل انتقال فرماگئے۔

دوسرے اہل شہر کے ساتھ ان مہمانِ محترم کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ یہ تھی حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے پہلی تقریبِ ملاقات۔

اسوقت حضرت مولانا نعمانی کا قیام ہمارے ہی گھر پر ہوا تھا احقر نے شعور کی آنکھیں جب کھولی ہیں شہر الہ آباد کی فضامیں ''دیوبندیت، بریلویت'' کی نزاعی بحثوں اور اشتہار بازیوں نے ایک ہلچل پیدا کر رکھی تھی جسکا قدرتی نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ ان مباحث کا احقر کو اپنی بے شعوری ہی کے دور میں شعور پیدا ہو گیا تھا اور بچپن ہی سے احقر کو علماء حق سے ایک عقیدت اور اس عقیدت کے تحت انکی خدمت کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اسلئے احقر نے بھی حضرت مولانا کی خدمت گذاری نہایت شوق وذوق کے ساتھ کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ''شیر بیشہ'' (حشمت علی صاحب) کو اطلاع دی گئی کہ مناظر اہل سنت فاتح بریلی حضرت مولانا محمد منظور نعمانی تشریف لے آئے ہیں اب آپ ان سے مناظرہ کرنا چاہیں تو کرلیں یہ مولانا نعمانی جیسا کہ آپ کو بذات خود علم ہے حضرت تھانوی (علیہ الرحمہ) کے نمائندہ و وکیل ہیں جنھیں آپ اور آپ کے سرگروہ شہزادۂ اعلیٰحضرت جناب حامد رضا خانصاحب بھی ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء میں لاہور کے مشہور و معروف مناظرہ میں حضرت تھانوی (علیہ الرحمہ) کا نمائندہ ووکیل تسلیم کر چکے ہیں جس مناظرہ کے حکم و صدر ڈاکٹر اقبال وغیرہ جیسے حضرات تھے۔

''شیر بیشہ'' کو جب پوری طرح یقین ہو گیا کہ مناظرہ کا یہ پیغام وہ خواب میں نہیں سن رہے ہیں بلکہ واقعہ یہی ہے کہ بالکل بے خبری میں ہوا یہی ہے کہ اسوقت فتحپور میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تشریف لا چکے ہیں اور مناظرہ کے پورے امکانات پائے جارہے ہیں تو موصوف کی ساری شیری، روباہی میں تبدیل ہو گئی اور اہل سنت کی طرف سے پہنچائے ہوئے پیغام کا جواب یوں دیا کہ مولانا منظور صاحب کو مناظرہ کا چیلنج نہ دونگا، ہاں اگر وہ مجھے چیلنج کریں گے تو مناظرہ کرلونگا۔ شیر بیشہ کا یہ جواب اسلئے تھا کہ انھیں حضرت مولانا نعمانی کے مزاج و فکر کی تبدیلی کا اندازہ پوری طرح ہو چکا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ یہ مولانا نعمانی اب وہ نعمانی نہیں ہیں جنھوں نے سنبھل کے مناظرہ میں اپنے بالمقابل کسی مناظر کو سنبھلنے نہ دیا تھا اور خود میرے استاد محترم و مکرم رحم الٰہی صاحب کو نوٹس دیکر میدان مناظرہ میں آنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ بالکل بادل ناخواستہ رحم الٰہی! رحم الٰہی کی فریاد کرتے ہوئے میدان مناظرہ میں آگئے تھے لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان سے مناظرہ کر سکیں اسلئے ان کی جگہ پر مجھے کھڑا ہونا پڑا

تھا۔

شیر بیشہ کو مناظرہ لاہور بھی یاد تھا کہ کس طرح اُن مولانا منظور نے اُس موقع پر ہم لوگوں کی ہر تکی بے تکی شرطوں کو مان لینے کے بعد یہ کہکر مناظرہ شروع کردیا تھا کہ اب شرطوں کا قصہ ختم کیجئے۔ میں بلاشرط مناظرہ شروع کرتا ہوں۔

چنانچہ یہی ہوا کہ حضرت مولانا نعمانی اپنی فکری و مزاجی تبدیلی اور ملک کی نازک صورت حال کے احساس کی وجہ سے اب مناظرہ کے لئے اقدام اور پہل کو تقاضائے وقت کے خلاف سمجھ رہے تھے، انھوں نے شیر بیشہ کے فرار و گریز کو سمجھ لینے کے باوجود یہی جواب دینے کا فیصلہ فرمایا کہ

"اب وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ اسلئے مناظرہ کا چیلنج تو میں نہ ..نگا لیکن اگر حشمت علی صاحب مناظرہ پر آمادہ ہیں تو میں ان کی جوابدہی کے لئے تسلی کر سکتا ہوں۔"

شیر بیشہ کی خوش قسمتی کہئے یا کہئے کہ "بلی کے بھاگوں چھ روباہی کام آگئی اور سرزمین فتحپور "فاتح بریلی" کی "فتحِ فتحپور" کا نظارہ ...

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

تاہم حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ نے علماء حق کے مسلک کی وضاحت اور اتمامِ حجت کے لئے فتحپور میں دو روز قیام فرمانا منظور فرمالیا جس کی وجہ سے "شیر بیشہ" کو خوشی میں بغلیں بجانے اور یہ کہنے کا موقع نہ مل سکا کہ مجھ سے مناظرہ نہ کیا اور راہ فرار اختیار کرلی۔ چنانچہ دو روز بعدِ نماز عشاء سید واڑہ کے قریب دلالوں کی مسجد میں حضرت مولانا کا ایمان افروز اور شرک سوز بیان ہوا۔

پہلے دن کا بیان کلمہ طیبہ کے جزو اول " لا اله الا الله " پر اثبات توحید اور ابطال شرک سے متعلق تھا۔ اور دوسرے دن کا بیان کلمہ طیبہ کے جزو دوم "محمد رسول الله" پر تھا جس میں حضور سرور کائنات ﷺ کی نبوت و رسالت اور ختم نبوت و رسالت پر ایمان لانے کی تلقین اور اتباع سنت و رد بدعت کا بیان تھا۔

ان دونوں بیانوں کا خاص فائدہ یہ ہوا کہ اہل شہر کے لئے ہر دو فریق کی تقریروں کے

موازنہ و تقابل کا موقع مل گیا جسکی وجہ سے انھیں پوری بصیرت کیساتھ حق اور حقیقت تک پہنچنے کا راستہ مل گیا۔

چنانچہ یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ اسوقت اگرچہ اہل شہر فریقین کے دو مشہور مناظرہ کے پہلوانوں کے دنگل کا تماشا نہیں دیکھ سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے جذبات پر اوس بھی پڑ گئی ہو لیکن ہر دو فریقین کی تقریروں کے تقابل و موازنہ سے جو دور رس اور دیرپا فائدہ پہنچا وہ ایسے کسی بھی مناظرہ سے نہیں پہنچ سکتا تھا جو عام طور پر ایک منصوبہ بند اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت بڑی ہنگامہ خیزی کے بعد شروع کیا جاتا ہے اور پھر کسی نتیجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی شر انگیزی اور ہلڑ بازی کر کے نقصِ امن کے اندیشے میں ختم بھی کر دیا جاتا ہے۔ فتحپور میں بھی امکان یہی تھا کہ اگر مناظرہ کی بساط بچھ بھی جاتی تو وہ مناظرہ کسی نتیجہ اور فیصلہ تک ہرگز نہ پہنچتا، مولانا نعمانی علیہ الرحمہ شیر بیشہ کی روباہی حیلہ سازیوں سے اچھی طرح واقف تھے اسلئے انھوں نے بے نتیجہ ہنگامہ بازی کی راہ اختیار ہی نہیں کی۔

حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ جو بجا طور پر اس دور میں مناظر اہل سنت اور فاتح بریلی تھے راقم سطور کی ان سے یہ پہلی ملاقات بھی اس طرح ہوئی تھی کہ مناظرہ تو نہیں ہو سکا تھا لیکن ایک حد تک مناظرہ ہی جیسا لطف حاصل ہو گیا تھا۔

اس ملاقات کے بعد احقر کی باقاعدہ عربی تعلیم کا دور شروع ہو گیا اور بغرض تعلیم فتحپور سے چل کر کچھ دنوں کے لئے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں، شرح ماۃ عامل اور فصول اکبری وغیرہ کی جماعت میں شریک رہا، جامع العلوم کے صدر مدرس اسوقت مولانا وصی علی صاحب علیہ الرحمہ ملیح آبادی تھے اور حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے مشہور خلیفہ و مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ اس کے سرپرست تھے۔

جامع العلوم میں ہم دونوں بھائیوں کا قیام تقریباً ایک ہی مہینہ تک رہا ہو گا کہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جانے کا فیصلہ ہو گیا اور احقر اپنے برادر محترم مولانا جامی صاحب علیہ الرحمہ کے ہمراہ مظاہر علوم سہارنپور پہنچ گیا۔

یاد پڑتا ہے کہ مظاہر علوم کے زمانہ قیام میں حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے تین بار ملاقات ہوئی تھی جن میں سے دو بار کی ملاقات تو سہارنپور میں ہوئی تھی اور ایک بار کی ملاقات بریلی میں ہوئی تھی جہاں اسوقت مولانا کا قیام تھا، پہلے ذکر اس بریلی کی ملاقات کا پڑھ لیجئے۔

۱۳۶۳ھ میں احقر ایک سال کیلئے دار العلوم دیوبند میں بھی زیر تعلیم رہا تھا۔ یہ سال

مشکوٰۃ شریف کی تعلیم کا تھا، مشکوٰۃ شریف وہاں احقر نے حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ سے پڑھی تھے۔ اسی وقت دارالعلوم کے بعض ساتھیوں کے ساتھ مدرسہ اشاعت العلوم بریلی سے سرکاری نصاب کے مطابق امتحان عالم کا فارم احقر نے بھی بھر دیا تھا۔ امتحان کا مرکز بریلی تھا اسلئے امتحان کے موقع پر بریلی جانا ہوا تھا، خیال ہوا کہ حضرت مولانا سے بھی ملاقات کرلی جائے، غالبًا بعد نماز عصر دولت خانہ پر حاضر ہوا، کنڈی کھٹکھٹائی تو بذات خود حضرت مولانا ہی باہر تشریف لے آئے اور بے سان و گمان مجھے دیکھ کر تعجب کے انداز میں دریافت فرمایا کیسے آنا ہوا؟ احقر نے بے ساختہ و بے تکلف عرض کر دیا کہ

مدرسہ اشاعت العلوم میں سرکاری امتحانات ہونے والے ہیں، عالم کا امتحان دینے آیا ہوں۔ احقر کی زبانی سرکاری امتحان دینے کی بات سنکر حضرت مولانا کو جیسے ایک دھکا سا لگا اور ایک عجیب کیفیت وانفعال رنج و صدمہ کے ساتھ بیساختہ ان کی زبان سے

انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون

مولانا کا یہ صدمہ آمیز تأثر دیکھ کر احقر کو بھی ندامت ہو

پہلے سے تھا ہی کہاں ورنہ عالم کے امتحان کا ذکر کرنا ہی کیا ضروری تھ

ان سرکاری امتحانات اور اس قسم کی سرکاری ملازمتوں سے متعلق ہمارے [illegible] کا مزاج یہی تھا جو حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے طرز عمل سے بے ساختہ ظاہر ہو گیا۔ ان حضرات کی فکر یہی تھی کہ مدرسوں کے یہ بوریا نشین اپنی اصل عزت و مقام اسی بوریا نشینی ہی میں سمجھیں، عربی مدارس کے ان طلباء کا اصل مقصد صرف خدمت دین ہی ہونا چاہئے۔ دنیا طلبی کی بنیاد پر قائم ملک کی عصری تعلیم گاہیں نہیں۔ خود احقر بھی یہی سمجھتا ہے کہ ہمارے ان اکابر ہی کی فکر حق اور قابل قبول ہے۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ اسی موقع پر اپنے اس امتحان عالم سے متعلق یہ دلچسپ لطیفہ بھی ذکر کر دوں کہ خدا تعالےٰ کی قدرت دیکھئے کہ اسی عالم کا سرٹیفیکٹ کیسے وقت میں احقر کے لئے کار آمد ثابت ہوا۔

۱۳۹۰ھ میں احقر جب "مفتی شہر آگرہ" کی حیثیت سے دارالافتاء جامع مسجد جہاں آرا سے وابستہ ہوا تو ایک روز شہر کے ایک ملی کارکن نے باتوں باتوں میں یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ جس جگہ پر آپ کا تقرر ہوا ہے اس جگہ کے لئے درخواستیں تو چند اور بھی تھیں لیکن چونکہ آپ کی درخواست کے ساتھ بریلی شریف اور دیوبند شریف دونوں ہی جگہوں کی سندیں تھیں تو یہی سمجھا گیا کہ یہ "صاحب" معتدل ہوں گے اور آپ کے تقرر کی سفارش کر دی گئی۔

موازنہ و تقابل کا موقع مل گیا جسکی وجہ سے انھیں پوری بصیرت کیساتھ حق اور حقیقت تک پہنچنے کا راستہ مل گیا۔

چنانچہ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اسوقت اگرچہ اہل شہر فریقین کے دو مشہور مناظرہ کے پہلوانوں کے دنگل کا تماشا نہیں دیکھ سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کے جذبات پر اوس بھی پڑگئی ہو لیکن ہر دو فریقین کی تقریروں کے تقابل و موازنہ سے جو دوررس اور دیرپا فائدہ پہنچا وہ ایسے کسی بھی مناظرہ سے نہیں پہنچ سکتا تھا جو عام طور پر ایک منصوبہ بند اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت بڑی ہنگامہ خیزی کے بعد شروع کیا جاتا ہے اور پھر کسی نتیجہ تک پہنچنے سے پہلے ہی شر انگیزی اور ہلڑ بازی کر کے نقض امن کے اندیشے میں ختم بھی کر دیا جاتا ہے۔ فتحپور میں بھی امکان یہی تھا کہ اگر مناظرہ کی بساط بچھ بھی جاتی تو وہ مناظرہ کسی نتیجہ اور فیصلہ تک ہرگز نہ پہنچتا، مولانا نعمانی علیہ الرحمہ شیر بیشہ کی روباہی حیلہ سازیوں سے اچھی طرح واقف تھے اسلئے انھوں نے بے نتیجہ ہنگامہ بازی کی راہ اختیار ہی نہیں کی۔

حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ جو بجا طور پر اس دور میں مناظر اہل سنت اور فاتح بریلی تھے راقم سطور کی ان سے یہ پہلی ملاقات بھی اس طرح ہوئی تھی کہ مناظرہ تو نہیں ہو سکا تھا لیکن ایک حد تک مناظرہ ہی جیسا لطف حاصل ہو گیا تھا۔

اس ملاقات کے بعد احقر کی باقاعدہ عربی تعلیم کا دور شروع ہو گیا اور بغرض تعلیم فتحپور سے چل کر کچھ دنوں کے لئے مدرسہ جامع العلوم کانپور میں، شرح مأۃ عامل اور فصول اکبری وغیرہ کی جماعت میں شریک رہا، جامع العلوم کے صدر مدرس اسوقت مولانا وصی علی صاحب علیہ الرحمہ ملیح آبادی تھے اور حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے مشہور خلیفہ و مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ اس کے سرپرست تھے۔

جامع العلوم میں ہم دونوں بھائیوں کا قیام تقریباً ایک ہی مہینہ تک رہا ہوگا کہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جانے کا فیصلہ ہو گیا اور احقر اپنے برادر محترم مولانا جامی صاحب علیہ الرحمہ کے ہمراہ مظاہر علوم سہارنپور پہنچ گیا۔

یاد پڑتا ہے کہ مظاہر علوم کے زمانہ قیام میں حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے تین بار ملاقات ہوئی تھی جن میں سے دوبار کی ملاقات تو سہارنپور میں ہوئی تھی اور ایک بار کی ملاقات بریلی میں ہوئی تھی جہاں اسوقت مولانا کا قیام تھا، پہلے ذکر اس بریلی کی ملاقات کا پڑھ لیجئے۔

۱۳۶۳ھ میں احقر ایک سال کیلئے دار العلوم دیوبند میں بھی زیر تعلیم رہا تھا۔ یہ سال

مشکوٰۃ شریف کی تعلیم کا تھا، مشکوٰۃ شریف وہاں احقر نے حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ سے پڑھی تھے۔ اسی وقت دارالعلوم کے بعض ساتھیوں کے ساتھ مدرسہ اشاعت العلوم بریلی سے سرکاری نصاب کے مطابق امتحان عالم کا فارم احقر نے بھی بھر دیا تھا۔ امتحان کا مرکز بریلی تھا اسلئے امتحان کے موقع پر بریلی جانا ہوا تھا، خیال ہوا کہ حضرت مولانا سے بھی ملاقات کرلی جائے، غالباً بعد نماز عصر دولت خانہ پر حاضر ہوا، کنڈی کھٹکھٹائی تو بذات خود حضرت مولانا ہی باہر تشریف لے آئے اور بے سان وگمان مجھے دیکھ کر تعجب کے انداز میں دریافت فرمایا کیسے آنا ہوا؟ احقر نے بے ساختہ وبے تکلف عرض کردیا کہ

مدرسہ اشاعت العلوم میں سرکاری امتحانات ہونے والے ہیں، عالم کا امتحان دینے آیا ہوں۔ احقر کی زبانی سرکاری امتحان دینے کی بات سنکر حضرت مولانا کو جیسے ا... عجیب کیفیت وانفعال رنج وصدمہ کے ساتھ بیساختہ ان کی زبان۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا کا یہ صدمہ آمیز تأثر دیکھ کر احقر کو بھی ندامت ہوئی، ... پہلے سے تھا ہی کہاں ورنہ عالم کے امتحان کا ذکر کرنا ہی کیا ضروری تھا؟

ان سرکاری امتحانات اور اس قسم کی سرکاری ملازمتوں سے متعلق ہمارے مشائخ واکابر کا مزاج یہی تھا جو حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے طرز عمل سے بے ساختہ ظاہر ہو گیا۔ ان حضرات کی فکر یہی تھی کہ مدرسوں کے یہ بوریا نشین اپنی اصل عزت ومقام اسی بوریا نشینی ہی میں سمجھیں، عربی مدارس کے ان طلباء کا اصل مقصد صرف خدمت دین ہی ہونا چاہئے۔ دنیا طلبی کی بنیاد پر قائم ملک کی عصری تعلیم گاہیں نہیں۔ خود احقر بھی یہی سمجھتا ہے کہ ہمارے ان اکابر ہی کی فکر حق اور قابل قبول ہے۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ اسی موقع پر اپنے اس امتحان عالم سے متعلق یہ دلچسپ لطیفہ بھی ذکر کردوں کہ خدا تعالے کی قدرت دیکھئے کہ اسی عالم کا سرٹیفیکٹ کیسے وقت میں احقر کے لئے کار آمد ثابت ہوا۔

۱۳۹۰ھ میں احقر جب "مفتی شہر آگرہ" کی حیثیت سے دارالافتاء جامع مسجد جہاں آرا سے وابستہ ہوا تو ایک روز شہر کے ایک ملی کارکن نے باتوں باتوں میں یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ جس ...ہ پر آپ کا تقرر ہوا ہے اس جگہ کے لئے درخواستیں تو چند اور بھی تھیں لیکن چونکہ آپ کی ...خواست کے ساتھ بریلی شریف اور دیوبند شریف دونوں ہی جگہوں کی سندیں تھیں تو یہی ...ا گیا کہ یہ "صاحب" معتدل ہوں گے اور آپ کے تقرر کی سفارش کردی گئی۔

ان صاحب کی زبانی یہ بات سن کر مجھے خود غور کرنا پڑا کہ میں نے اپنی درخواست کے ساتھ بریلی شریف کی سند کہاں پیش کی ہے۔ بہت غور وفکر کے بعد یہ معمہ حل ہو سکا اور مجھے یاد آیا کہ عالم کا جو امتحان میں نے مدرسہ اشاعت العلوم بریلی سے دیا تھا اس کے سرٹیفکیٹ میں تو مدرسہ کا نام دیا ہوا ہے، وہی میرے لئے بریلی شریف کی سند ہے۔

اس طرح بریلی شریف کا وہ امتحان ایسے وقت میں کام آگیا کہ اس غلط فہمی میں مفتی شہر کی جگہ پر میرا تقرر ہو گیا اور پھر اس جگہ پر میرا قیام اتنی مدت تک ممتد ہوا کہ احقر سے پہلے دور میں اس منصب پر اتنی طویل مدت تک کسی بھی "مفتی شہر" کا قیام نہیں رہا تھا۔

بات کا سلسلہ ادنیٰ مناسبت سے ایک دوسرے موضوع سے جڑ گیا اور بات کچھ دور چلی گئی۔ ذکر یہ چل رہا تھا کہ فتحپور کی پہلی یادگار و دلچسپ تقریب ملاقات کے بعد اپنے زمانۂ طالب علمی میں حضرت مولانا نعمانی سے تین بار ملاقات وزیارت کی نوبت آئی تھی جن میں سے بریلی کی یہ ملاقات طالب علمی کے آخری دور کی تھی کہ اسی سال میں عالم کا یہ امتحان بھی دیا تھا اور اسی سال مظاہر علوم میں دورۂ حدیث بھی پڑھ رہا تھا۔ اس ملاقات کے علاوہ اس سے پہلے دو ملاقاتیں مظاہر علوم میں ہو چکی تھیں۔

ان میں سے پہلی ملاقات غالباً ۱۳۵۹ھ (۱۹۳۹ء) میں ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت مولانا نعمانی اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے "تلاش مرشد"(۱) میں سہارنپور اور اطراف سہارنپور (تھانہ بھون، دیوبند اور رائے پور) کا سفر کیا تھا۔

اس ملاقات کے بھی کچھ نقوش ذہن میں محفوظ ہیں، یاد آتا ہے کہ ایک مجلس میں ان دونوں حضرات کی گفتگو میں درس نظامی نصاب کی بعض کتابوں کے غیر ضروری ہونیکی بات بھی آئی تھی، شرح جامی اور مختصر المعانی کو یہ حضرات قابل حذف فرما رہے تھے۔

حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے مظاہر علوم میں دوسری ملاقات اسوقت ہوئی ہے جب مولانا نعمانی علامہ مودودی کی بیعت فسخ کر کے حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمہ کی خدمت میں تشریف لائے تھے اور حضرت شیخ الحدیث صاحب کے مکان کے قریب اس کمرہ میں ٹھہرائے گئے تھے جس میں مولانا اظہار الحسن صاحب کاندھلوی اپنی طالب علمی کے دور میں رہا کرتے تھے، احقر نے خدمت میں حاضری دی تھی اور شاید دو باتیں دریافت کی تھیں، پہلی بات تو یہ تھی کہ آپ نے "جماعت اسلامی" سے علیحدگی کیوں اختیار کی؟ مگر مولانا نے اس سوال کا کوئی صاف

(۱) [الفرقان] یہ تعبیر درست نہیں ہے۔ یہ سفر ایک دوسرے مقصد سے تھا۔

اور اطمینان بخش جواب نہیں دیا تھا (کیونکہ ابھی اسے صیغۂ راز ہی میں رکھنا چاہتے تھے)۔

احقر کا دوسرا سوال مودودی صاحب کے قدرِ قبضہ سے کم داڑھی سے متعلق تھا (اس وقت تک موصوف کی ڈاڑھی قدرِ قبضہ سے کم ہی تھی[۱]) اس سوال کا مختصر جواب مولانا نے یہ دیا تھا کہ مودودی صاحب کہتے ہیں کہ حضرت امام احمد علیہ الرحمہ کے یہاں قدر قبضہ کی شرط نہیں ہے۔ احقر معمولی درجہ کا طالب علم تھا۔ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا تھا لیکن بعد کو جب استاذ محترم مفتی محمود حسن گنگوہی علیہ الرحمہ سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ شیخ ابن ھمام نے فتح القدیر میں ائمہ اربعہ کا اجماع نقل کیا ہے کہ ان سب کے نزدیک قدرِ قبضہ سے کم داڑھی رکھنا جائز نہیں ہے۔[۲]

۲۰ر شعبان ۱۳۶۵ھ میں مظاہر علوم کی تعلیم ختم ہو گئی تھی اور اسی ماہ کی ۲۳ر تاریخ کو احقر کی ازدواجی زندگی شروع ہو گئی۔ احقر کی شادی عمِ محترم جناب
کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی (جواب سے دو سال پہلے ۳۰ر جم
گئیں رحمہا اللہ وغفرھا)

احقر کی یہ شادی بھی حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ
ذریعہ ہی کیونکہ عم محترم حضرت صوفی صاحب علیہ الرحمہ حضرت مولانا نعمانی اور حضرت مولانا ندوی کے ایسے دوستوں میں سے تھے جن کے ساتھ ان حضرات کی عقیدت بھی وابستہ تھی۔ اسی تعلق کی وجہ سے حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ احقر کے ساتھ بزرگانہ شفقت و محبت کا معاملہ رکھتے تھے جسکا کچھ اندازہ حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کے درجِ ذیل مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے۔

---

[۱] فاضل مضمون نگار کی یہ اطلاع صحیح نہیں ہے۔ مودودی صاحب کی داڑھی اس وقت بقدر قبضہ اگر نہیں تو قریب قریب ضرور ہو چکی تھی۔ یہ راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آں محترم کی نگاہ سے والد ماجد کی "سرگزشت" نہیں گزری ہے۔ ورنہ اس اطلاع کی بھی تصحیح ہو جاتی اور اسکے علاوہ بھی اس سلسلے کے بعض سوالات جو اس مضمون میں آگے آرہے ہیں وہ بھی نہ پیدا ہوتے۔ (مرتب)

[۲] یقیناً کوئی خاص وجہ تھی کہ یہ مختصر جواب ملا۔ ورنہ "سرگذشت" میں اس اجماع کا حوالہ بھی مذکور ہے۔ اور مزید بر آں اُس کی رو سے والد ماجدؒ نے ایک حدیث کا حوالہ دے کر مودودی صاحب سے ان کے استدلال کی کمزوری کا اعتراف بھی کرالیا تھا۔

باسمہ سبحانہ و تعالی

لکھنؤ ۸/۵/۸۰ء

برادر مکرم و محترم مولانا عبدالقدوس رومی صاحب زید مجد کم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے بہت ہی قلق ہے کہ آپ کل تشریف لائے اور میں اپنی معذوری کی وجہ سے آپ کا وہ اکرام اور راحت رسانی کا انتظام نہیں کر سکا جو ایک عام مہمان کا ہوتا ہے۔ آپ کا تو چند در چند نسبتوں کا خاص حق تھا۔ اور عجیب اتفاق جو صاحب مرکز میں میرے مہمانوں کی خاص فکر رکھتے ہیں وہ کل وہاں موجود نہ تھے، میں نے ان کو پیغام بھیجا وہ مغرب کی نماز پڑھ کر میرے پاس آئے، میں نے ان کو آپ کے بارے میں بتلایا اور مرکز آپ کے پاس بھیجا واپس آکر بتلایا کہ معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مولانا کانپور کے ارادہ سے تشریف لے گئے، بہت ہی افسوس اور قلق ہوا، صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں، دعاؤں کا محتاج و طالب اور دل سے دعاگو ہوں،

والسلام

محمد منظور نعمانی

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا اس سے مقصود تو صرف اس حقیقت کا اظہار ہے کہ احقر راقم السطور کا نیاز مندانہ و خادمانہ تعلق حضرت مولانا موصوف کے ساتھ بہت پرانا اور گوناگوں رہا ہے جسکی پوری تفصیل ایک علیحدہ مضمون کا تقاضا کرتی ہے۔ اسلئے بقیہ تفصیل کو فی الحال نظر انداز کرتے ہوئے اپنے اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔

الفرقان کی پوری مدت اشاعت تو اس وقت تک تقریباً ۶۵ سال ہو چکی ہے اس طویل مدت میں الفرقان مختلف ادوار سے گذرا ہے جسکی تفصیل بطور اجمال یوں بیان کی جاسکتی ہے۔

پہلا دور جس میں ماہنامہ الفرقان جاری ہوا ہے، یہ دور ۱۳۵۳ھ سے شروع ہوتا ہے لیکن اس دور سے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے اس دور کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ اس دور کی تاریخ کا جائزہ لیا جاتا ہے تو تاریخ پتہ دیتی ہے کہ حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت ۱۳۴۵ھ (مطابق ۱۹۲۷ء) میں پائی تھی۔

یہ دور ہندوستان میں اسلام اور پیروان اسلام کے لئے سخت قسم کی آزمائش کا دور تھا۔ مسلمانان ہند اسوقت متعدد اور مختلف فتنوں سے دوچار تھے جن میں سے کچھ فتنے داخلی تھے اور کچھ فتنے خارجی، خارجی فتنوں میں آریہ سماجیوں کی شدھی سنگٹھن تحریک ایک طرف سرفہرست

تھی اور دوسری عیسائی مشنری کی تبلیغی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔

اور داخلی فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ تھا جس نے ایک قادیانی مرزا کے روپ میں جنم لیا تھا لیکن اس ابوالفتن فتنہ قادیان کے ساتھ ساتھ "رافضیت" و "رضاخانیت" نام کی دو امّھات الفتن کی خلاف توحید و سنت سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔

یہ وہی زمانہ تھا جب آل سعود کے پہلے سلطان سعود نے حجاز مقدس کے گورنر شریف مکہ کو معزول کر کے وہاں کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور محض جوش و جذبہ سے کام لیتے ہوئے حرمین کے مقابر و قبہ جات کے بے دھڑک انہدام کا اقدام کر ڈالا۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ اقدام عام مسلمانوں کے اشتعال و برہمی کا سبب بن گیا۔

اس مظاہرۂ اشتعال و احتجاج میں یہ رافضیت و رضاخانیت فکری و عملی طور پر بالکل متفق و متحد بلکہ شیر و شکر کی طرح "تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو..."

۱۳۴۵ھ جب حضرت مولانا نعمانی دارالعلوم سے فراغت
تشریف لائے ہیں اسوقت ملک کی فضا ان کی اشتعال انگیزیوں
گرمی و بخار سعودی حکومت کی بجائے علمائے دیوبند کے خلاف نـ

حضرت مولانا نعمانی نے فضا کی اس گرمی کو اپنی دینی و اصلاحی سرگرمیوں کے لئے سازگار سمجھا کہ اہل تجربہ یہی کہتے ہیں کہ لوہا جسوقت گرم ہو ہتھوڑے کے زور سے اسے جس طرح چاہیں کار آمد بنا سکتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا نعمانی نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ فضا کی اس گرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی سرزمین بریلی سے توحید و سنت کی آواز بلند کی جائے اور انھوں نے بریلی میں قیام کر کے اسی بدعت خیز زمین میں توحید و سنت کی تخم پاشی کیلئے ۱۳۵۳ھ میں ماہنامہ الفرقان جاری فرمادیا جو نرم و گرم حالات سے گزرتے ہوئے بفضلہ تعالی ۶۵ سال کی عمر طے کر چکا ہے۔

جن حضرات کو کسی دینی رسالہ کے نکالنے کا کوئی تجربہ ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو جنھیں دین و مذہب سے کوئی خاص تعلق اور لگاؤ نہیں ہے وہ کسی دینی رسالے کی خریداری کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں کسی دینی رسالے کے اجراء کا فیصلہ کر ڈالنا غیر معمولی ہمت کی بات ہے اور پھر اسے نہ صرف جاری کر دینا بلکہ ایک مدت تک مسلسل جاری رکھنا بہت صبر آزما اور بڑے دل گردے کا کام ہے۔

چنانچہ رسالہ الفرقان کو بھی بار بار نہایت درجہ دشوار اور صبر آزما مرحلوں سے گذرنا

پڑا تھا جس کی تفصیل الفرقان کے ابتدائی اداریوں میں دیکھی جا سکتی ہے اور جسکا مختصر اجمالی تذکرہ حضرت مولانا نعمانی کی آخری کتاب تحدیث نعمت میں بھی آگیا ہے۔ ہم اس جگہ اسی تحدیث نعمت کے حوالہ سے اس دور کے مشاہیر اہل علم، اکابر ملت کی اس اپیل کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں جو انھوں نے الفرقان کے اہم مقصد اشاعت کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کی نصرت وحمایت کیلئے الفرقان ہی کے صفحات میں شائع کی تھیں۔

اس اپیل پر دستخط کنندگان اکابر ومشائخ حسب ذیل حضرات تھے۔

(حضرت مولانا سید) حسین احمد مدنی، (حضرت مفتی) محمد کفایت اللہ، (حضرت مولانا) شبیر احمد عثمانی، (حضرت مولانا حافظ) عبد اللطیف، (ناظم اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری، (مولانا) حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی، (حضرت مولانا) سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، (حضرت مولانا) محمد اسعد اللہ صاحب، (حضرت مولانا) حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی۔

اکابر ملت کی یہ اپیل الفرقان کے اسی دور اول میں شائع ہوئی تھی جب الفرقان کا مقصدِ وحید توحید وسنت کی تائید اور شرک وبدعت کی تردید کرنا تھا۔

اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اپنے دور اول میں الفرقان نے یہ دینی فریضہ باحسن وجوہ انجام دیا تھا، اس نے اپنے اس روشن ویادگار دور میں توحید وسنت کے بالمقابل شرک وبدعت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو صرف روکا ہی نہیں بلکہ اسے پیچھے ڈھکیل کر توحید وسنت کی پیش قدمی کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا اس حقیقت کا اظہار خود حضرت مولانا نعمانی نے بھی ان لفظوں میں فرمایا، "تحدیث نعمت" میں فرماتے ہیں۔

الفرقان کا دور اولیں:۔ اب سے ساڑھے تیرہ سال پہلے محرم ۱۳۵۳ھ میں الفرقان جاری ہوا تھا، اسوقت اپنے سامنے مسلمانوں کی اصلاح اور خدمت دین کا ایک مخصوص ومحدود دائرہ تھا یعنی مسلمانوں کے بعض خاص طبقوں کی اعتقادی اور عملی غلطیوں پر سنجیدہ بحث وتمحیص اور مدلل تنقید اور دین کے بارے میں ان کے افراط وتفریط کی تغلیط وتردید کرتے ہوئے صراط مستقیم کی طرف دعوت۔

الغرض اس ابتدائی دور میں یہی الفرقان کا خاص موضوع تھا، چند سال تک الفرقان اسی خصوصیت کے ساتھ جاری رہا اور تحدیثاً بالنعمۃ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں جن خاص

<u>مسائل پر الفرقان میں بحث کی گئی غالباً اب آئندہ ان پر کسی مزید غور و بحث کی ضرورت نہ ہوگی اور الفرقان میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہی انشاء اللہ ان مسائل و مباحث میں حرف آخر رہے گا“۔</u>

(تحدیثِ نعمت ص ۸۳)

تحدیث نعمت کا مندرجہ بالا یہ اقتباس الفرقان بابت رجب ۱۳۶۶ھ سے ماخوذ ہے جب کہ الفرقان کے دور اولیں کے ان مضامین کی یاد تازہ اور ناظرین کے دل و دماغ میں محفوظ تھی۔ لیکن اب جبکہ ۱۴۱۸ھ چل رہا ہے اور تحدیث نعمت کے مندرجہ بالا اقتباس کی تحریر کو ۵۲ سال یعنی نصف صدی سے بھی دو سال کی مدت زائد گذر چکی ہے، پچھلے دور میں لکھے ہوئے مضامین کا اس دور میں دستیاب ہونا نہایت درجہ دشوار ہے بالخصوص ایسی صورت میں کہ خود الفرقان نے اب اس قسم کے نئے مضامین کی یا اپنی ہی فائیل سے پرانے مضامین کی اشاعت کو بالکل ہی غیر ضروری سمجھ لیا ہے جن کی اشاعت کو اکابر ملت کی اپیل کے ذریعہ ؎
کرالیا تھا۔(۱)

تحدیث نعمت کے مذکورہ بالا اقتباس کی خط کشیدہ آخری سطور احقر
محسوس ہوتی ہیں، یہ حقیقت مسلم کہ الفرقان کے اولین دور ؎
شرک سے متعلق جو مضامین شائع ہوئے تھے وہ اسکے بعد آئندہ بھی یقیناً
اسی صورت میں کہ بعد کے زمانے میں جب بھی ان مضامین کی ضرورت ہوتی انھیں دوبارہ شائع بھی کیا جاتا، صرف الفرقان کی پرانی فائلوں میں ان کا محفوظ ہونا ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا ورنہ ظاہر ہے کہ رضاخانیت و بریلویت کی تردید اور حضرات علمائے دیوبند کے مسلک صحیح اور عقائد حقہ کی صفائی و ترجمانی کا کام تو اس سے پہلے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہانپوری اور اولین مناظر اہلِ سنت حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری انجام دے چکے تھے۔

---

(۱) واقعے میں ایسا نہیں ہے ”فیصلہ کن مناظرہ“ جو اولیں تحریر ہے۔ برابر کتابی شکل میں شائع کی جارہی ہے۔ علاوہ ازیں ”شاہ شہید پر معاندین اہل بدعت کے الزامات“ پھر ”بریلوی فتنہ کا نیا روپ“ تو الفرقان کے نئے دور ہی میں لکھی گئی ہے۔ اور برادرم مولانا محمد عارف سنبھلی جواب اس سلسلے کے وارث ہیں انکے اس سلسلے کے مضامین الفرقان میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور تقویۃ الایمان پر مولانا نور الحسن راشد کا طویل قسط وار مضمون بھی اسی دور کی چیز ہے۔ اور سب سے آخر میں مولانا نسیم احمد فریدی نمبر میں شاہ شہیدؒ ہی کے بارے میں خود صاحب الفرقان نے جو کچھ لکھا ہے وہ تو انکے دور اول کی یاد تازہ کر دینے والی چیز ہے۔ مزید یاد آیا کہ الفرقان کا انتخاب نمبر (۱۹۷۷ء) جو پرانے مضامین الفرقان کا انتخاب تھا اس میں بھی دور اول کے مضامین کا ایک پورا باب ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر "تحدیث نعمت" کا ایک اقتباس اور نقل کردیا جائے جو حضرت مولانا نعمانی نے الفرقان کے دور اولین کے خاتمہ پر دوسرے دور کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔ عنوان ہے "الفرقان کا دوسرا دور" اس عنوان کے تحت مرقوم ہے:

"الفرقان کی اشاعت کا سلسلہ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں شروع ہوا تھا اور اس کا ایک مخصوص اور محدود دائرہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ہوا، یہ ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کا نفاذ تھا جسکے ذریعہ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو کچھ زیادہ حکومتی اختیارات منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا .... اس صورت حال کے پیدا ہوتے ہی یہ سوالات اٹھنے شروع ہوئے کہ ملک کی آزادی کی صورت میں مسلمانوں کا دینی مستقبل کیا ہوگا؟ اور مسلمانوں کو اس مستقبل کے تحفظ کیلئے کیا کرنا ہوگا؟ اس سوال کو اسوقت کے ایک نمایاں اہل قلم مولانا (علامہ) ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں بہت غیر معمولی انداز پر اٹھایا اور ایک عرصہ تک موضوع بنائے رکھا موصوف کے اس سلسلۂ مضامین نے اس عاجز کو متاثر کیا اور رفتہ رفتہ یہ ذہن بن گیا کہ چند اعتقادی اور عملی مسائل (مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہیں، غیر اللہ کو غائبانہ ندا دینا، اہل قبور سے امداد چاہنا، غیر اللہ سے تقرب کیلئے جانور ذبح کرنا، ان کے نام پر نذر و سنت ماننا وغیرہا امور شرک۔ رومی) جن میں مسلمانوں کے بعض طبقے افراط و تفریط اور غلطیوں میں مبتلا ہیں انکی بابت اصلاحی جد و جہد تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھنے کے بجائے وہ میدان عمل اختیار کیا جانا چاہئے جسکے ذریعہ مسلمان آنے والے نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہوسکیں۔ یہ عاجز محسوس کرتا ہے کہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بہت بروقت اور صحیح رہنمائی تھی اور اس کے ذریعہ اس بندہ پر ایک خیر کثیر کا دروازہ کھلا"

"اور پھر جب اس نئے ذہن اور تقاضے کے تحت اس بندے کے قدم اولاً اس راہ کی طرف اٹھ گئے جو اب اسکے نزدیک فکر و نظر کی ایک غلطی تھی یعنی مولانا (علامہ) ابوالاعلیٰ مودودی کے زیر قیادت جماعت اسلامی کی تاسیس، تب بھی توفیق الٰہی میری دستگیری کے لئے مہربان ہوئی اور بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ میرے قدم واپس ہوں اور اگرچہ الٹے پاؤں واپسی کا یہ مرحلہ نفسیاتی طور پر بڑا سخت تھا اسلئے کہ اس جماعت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں، میں مودودی صاحب سے بھی کچھ آگے ہی تھا، نیز لوگوں کو بڑی قوت سے اسکی طرف دعوت دی تھی اور اعتراضات کے مقابلے میں اس کی بھرپور مدافعت کی تھی مگر ایک

مختصر سی کشمکش کے بعد اللہ نے میرے لئے یہ واپسی کا فیصلہ بھی آسان کیا" (تحدیث نعمت ص ۷۹)۔

حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ نے مندرجہ بالا مختصر سے چند سطری مضمون میں غایت اجمال وایجاز سے کام لیتے ہوئے علامہ مودودی سے اپنے متأثر ہونے اور پھر ان کے ہمنوا، ہم خیال اور ہمسفر ہونیکی خاصی طویل داستان کو بالکل ہی اشاروں اشاروں میں اس درجہ مختصر فرمادیا ہے کہ اس سے صحیح صورت حال کی عکاسی نہیں ہوپاتی۔ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں آیا تھا اسی دور میں علامہ مودودی نے اس ایکٹ کے مضمرات و اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا مسیحا بن کر ترجمان القرآن میں مضامین لکھنے شروع کئے تھے۔

ان مضامین کا جادو ایسا تھا جس نے مولانا نعمانی علیہ الرحمہ جیسے حق پسند، حق آشنا شخص کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ اب ملکی حالات اس بات کی اجازت
کے اسی مقصد وحید پر اب بھی قائم رہے اور دین الٰہی کی اشاعت،
حفاظت میں اسی انداز سے سرگرم عمل رہے جسکے لئے وہ ابھی کچھ
دستخط سے ایک پرزور و مؤثر اپیل شائع کرچکا ہے، کہ مولانا محمد منظو
جو کام کررہے ہیں وہ ان کا ذاتی نہیں بلکہ خالص دینی کام ہے اور تائید اہل سنت
کے سلسلے میں جو خدمات وہ انجام دے رہے ہیں در حقیقت پوری جماعت کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کررہے ہیں۔ اب تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس فرض کفایہ کے حق میں بالکل سرسری قسم کی یہ تعبیر اختیار کرلینا کہ چند اعتقادی اور عملی مسائل جن میں مسلمانوں کے بعض طبقے افراط و تفریط اور غلطیوں میں مبتلا ہیں" یا یہ تحریر فرمانا کہ "یہ عاجز محسوس کرتا ہے کہ یہ اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے بہت بروقت اور صحیح رہنمائی تھی اور اسکے ذریعے اس بندے پر ایک خیر کثیر کا دروازہ کھلا"

یہ سب ایسی تعبیرات ہیں جو دل میں کھٹکتی ہیں ان سے اتفاق کرلینا کسی بھی ایسے شخص کیلئے مشکل ہوگا جو اپنے دل میں توحید خالص کی دعوت کا شوق اور شرک بواح سے بیزاری کا جذبہ رکھتا ہو (۱)۔

---

(۱) [الفرقان] محترم نے ذرا ہی آگے چل کر خود ہی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان بیانات کی تحریر "برادرم عتیق الرحمٰن سنبھلی" کے قلم سے ہے نہ کہ خود حضرت مولانا نعمانی کے قلم سے اس بنا پر ان تعبیرات کو اتنی اہمیت تو نہیں ملنی چاہئے تھی جتنی محترم مضمون نگار نے اپنے اس اظہار تاثر میں دیدی ہے۔ مزید برآں یہ خیال تو آں محترم کا خود بھی نہ ہوگا۔ (بقیہ آگے)

"تحدیث نعمت" میں الفرقان کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار سے متعلق تفصیلات کے بعض حصے قابل غور ہیں جنکی وجہ سے الفرقان کے مختلف ادوار کا بیان ایک دوسرے سے ممیز نہیں ہو سکا ہے، الفرقان کے دوسرے دور کے بیان میں کچھ دور تک تو علامہ مودودی سے تاثر اور پھر بہت ہی سرسری طور پر جماعت کی تاسیس میں شرکت اور پھر الٹے پاؤں اس سے واپسی کا ذکر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں اور تبلیغی تحریک سے متاثر ہونے کا بیان شروع کر دیا ہے۔ پھر "الفرقان کا دور جدید مقصد اور دعوت" کا عنوان دیکر کچھ لکھا گیا ہے اور یہ تمام تفصیلات کچھ اس طرح لکھی گئی ہیں جس سے الفرقان کے بدلتے ہوئے مختلف ادوار ایک دوسرے سے ممتاز و ممیز نہیں ہو سکے ہیں۔

احقر کی یادداشت کے مطابق علامہ مودودی سے حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کی اثر پذیری کی مدت کافی طویل رہی ہے، یہ اثر پذیری تو غالباً ۱۹۳۵ھ، ۱۹۳۶ھ ہی سے شروع ہو گئی تھی پھر ۱۹۴۱ء میں جماعت کی تاسیس ہوئی جس میں مولانا نعمانی نے علامہ مودودی کے شریک غالب کی حیثیت سے شرکت کی اور منتخب امیر المومنین کے ہاتھ پر بیعت کر کے کچھ وقت باقاعدہ رکن کی حیثیت سے گذارا تھا۔

اور جماعت سے علیحدگی کا مرحلہ بھی بتدریج طے ہو سکا تھا اسلئے اس دور کی روداد کا اس درجہ سرسری طور پر آنا کچھ عجیب سا لگا(۱)۔

مودودی صاحب سے اثر پذیری کے دور میں حضرت مولانا پر جس خیر کثیر کا دروازہ کھلا اسکی حقیقت بھی نہ کھل سکی کہ وہ خیر کثیر کیا تھا؟ اگر وہ خیر کثیر یہی تھا کہ حضرت مولانا نعمانی کو الفرقان کے دور اول میں اسکے مقصدِ وحید کے تحت توحید و سنت کے اثبات و تائید یا شرک وبدعت کی تردید پر کی جانے والی محنت و سعی کے رائیگاں جانے کا احساس ہو گیا تو یہ بات کسی

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ) اور نہ ہونے کی گنجائش ہے۔ کہ حضرت مرحوم نے توحید کی دعوت اور شرک سے بیزاری کی بساط لپیٹ دی تھی۔ بات صرف میدان کار میں وسعت اور طریق کار میں تبدیلی کی تھی۔ مولانا ردمی کا ذوق اسے پسند نہیں کرتا تو یہ ایک الگ بات ہے۔ اور ان کا ذوق نہایت قابل احترام، ویسے خود اس تبدیل شدہ طریق کار کی زیادہ افادیت کا قول وہ فتح پور ہنسوہ والے قصے میں کر چکے ہیں۔

(۱) [الفرقان] مولانائے محترم یہاں اپنے خاص ذوقی تاثر کے غلبے میں یہ فراموش کر گئے ہیں کہ ان کا موضوع "تحدیث نعمت" پر تبصرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس تبصرے کی گنجائش بھی ہوتی تب بھی یہ شکایت بجا نہ تھی۔ اس لئے کہ "تحدیث نعمت" اس تفصیل کا محل نہ تھی، اور تفصیل کے خواہش مندوں کیلئے "سرگزشت . " نامی کتاب بہت پہلے سے موجود تھی جس کا حوالہ تحدیث نعمت میں بھی اسی مقصد سے دیا گیا ہے۔

طرح نہ تو معقول ہے نہ ہی قابل قبول(۱)۔

احقر کا اندازہ ہے کہ الفرقان کی تاریخ اور اسکے مختلف ادوار کی جو تفصیلات "تحدیث نعمت" میں مذکور ہوئی ہیں ان میں جابجا جھول اور غلط بیانی اسوجہ سے راہ پا گئی ہوگی کہ یہ حصہ برادر گرامی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب زید مجدہم کا مرتب کیا ہوا ہے، بہتر صورت یہ ہوگی کہ آئندہ کسی موقع پر برادر موصوف الفرقان کی مجموعی خدمات اور اس کے علیحدہ علیحدہ ادوار کی تاریخ و تبصرہ از سرنو مرتب فرمادیں۔

تاریخ الفرقان کا مختصر واجمالی جائزہ لینے پر احقر اپنے خصوصی ذوق کے تحت اس نتیجہ پر پہونچ سکا کہ الفرقان نے اپنی ۶۵ سالہ عمر میں جو روشن و تابندہ اور دیرپا وپائندہ کارنامے انجام دیئے ہیں اسکا زیادہ تر حصہ اسی دور اول سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی روشن و تابناک دور میں اہل شرک واہل بدعت سے متعدد م[illegible]
شائع ہوئیں، ان فرقوں کی تردید میں متعدد علمی و تحقیقی مضامین شا[illegible]
ضرور یہ، اور شارع حقیقی جیسی تحقیقی کتابیں الفرقان کے اسی روشن د[illegible]

اسی روشن دور میں الفرقان نے پہلے مجدد الف[illegible]
ولی اللہ نمبر جیسے دستاویزی شاہکار نمبر نکالے جو آئندہ بھی ایک ر[illegible]
گے۔ اس لئے الفرقان کو مولانا نعمانی کا کارنامۂ حیات قرار دیتے ہوئے ہمیں اسکے ابتدائی اولین دور ہی کو اس کا دور زریں ماننا پڑے گا۔(۲)

☆☆☆☆☆

---

(۱) [الفرقان] نہیں۔ وہ خیر کثیر یہ نہیں تھا اور نہ ایسا سمجھنے کی کوئی گنجائش تحدیث نعمت کے مجمل بیان میں ہی ہے۔ وہ خیر کثیر تحدیث نعمت ہی کے بیان کی روشنی میں وہ عملی دور تھا جو جماعت اسلامی کے بعد شروع ہوا۔ اور اسے حضرت والد ماجد اپنی زندگی کے تمام ادوار میں بیش قیمت ٹھہراتے تھے۔

(۲) محترم مولانا کی نظر مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر کے سالہائے اشاعت پر نہیں رہی کہ یہ نمبر ۳۵ء کے بعد یعنی بالترتیب ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئے ہیں۔ یعنی وہی زمانہ جس میں مودودی صاحب سے گہرا تاثر رہا۔

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
صدر شعبۂ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

اپنی کتابوں، عادتوں اور باتوں کے آئینہ میں

کسی بھی اہم علمی شخصیت پر قلم اٹھانا راقم کیلئے یوں بھی آ
ایسی ذات گرامی پر جو مختلف الجہات اور متنوع کمالات کی حامل ہو،
نعمانیؒ پر "الفرقان" کی خاص اشاعت کے لئے ان کے فرزندان گرا
جب کچھ لکھنے کی فرمائش کر کے راقم کو ایک بڑی سعادت میں شر کـ
صالحین کاذکر بھی موجب خیر و برکت ہے) تو راقم کچھ عرصہ متردد رہا، ایک طرف تو اپنی کوتاہ قلمی کا احساس مولانا ایسی مشہور و ہمہ گیر شخصیت پر لکھنے میں تأمل کا موجب بن رہا تھا، تو دوسری طرف حضرت مولاناؒ سے دیرینہ متعدد قسم کے روابط، خاص طور پر موصوف کی خدمت میں ربع صدی سے بھی زیادہ برابر حاضر ہونے کی توفیق کی بنا پر، ان کی مجالس و گفتگو سے مستفید ہوتے رہنے، نیز انکی شفقتیں جو راقم کے لکھنو آنے کے بعد سے مسلسل رہیں، کی وجہ سے ایک طرح کا اپنے اوپر حق معلوم ہوا کہ اس سعادت سے محروم نہ رہا جائے، برادران محترم کی فرمائش نے مہمیز کا کام کیا، لہٰذا اپنا ٹوٹا پھوٹا قلم لیکر اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسے پر بیٹھ گیا، کیا عجب ہے کہ یہ سطریں خود راقم کے لئے ذخیرۂ آخرت بن جائیں۔

اس سعادت میں حصہ لینے کا ارادہ کر لینے کے بعد میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ کیا لکھا جائے؟ غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کے مواقع پر جو بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں اور حافظہ کی گرفت میں بھی رہ گئیں، ان میں سے کچھ ناظرین کے سامنے پیش کر دی جائیں۔ بہت سوں کو انشاء اللہ نفع پہونچے گا، نیز مولانا کی تصنیفات میں سے چند کا نہایت مختصر خلاصہ پیش کر کے قارئین میں سے جو لوگ ابتک ان کتابوں کے براہ راست

مطالعہ سے محروم رہے ہیں ان کے شوق مطالعہ کو مہمیز کیا جائے،

واقعہ یہ ہے۔ مولانا کی تحریروں سے واقف حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ مشکل سے مشکل علمی مضامین نہایت آسان پیرایہ میں بیان کر دینا مولانا کا وہ امتیاز ہے جس میں وہ کم از کم اپنے معاصرین کے اندر منفرد و ممتاز نظر آتے ہیں، ان کی تحریریں سہل ممتنع کا جیتا جاگتا نمونہ ہونے کے ساتھ نہایت مؤثر اور دلنشیں بھی ہوتی ہیں، انشاء اللہ آئندہ سطروں میں کچھ اقتباسات قارئین کے ملاحظہ سے گذرینگے تو ہر ایک راقم کی ہمنوائی پر مجبور ہو جائیگا۔

مولانا کی مجلسی گفتگو!

یوں تو راقم الحروف کو مولاناؒ کے ہم وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ لکھنؤ آنے سے پہلے وطن میں، مولانا کو صرف ایک دو بار دیکھنا تو یاد آتا ہے، کسی مجلس میں شرکت بلکہ ملاقات تک یاد نہیں حالانکہ مولانا سے میرے والد ماجد حضرت مولانا قاری حمید الدین صاحبؒ (جو علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد اور دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلاء میں تھے، مولانا سے بھی کوئی دس سال (۱) اقدم) کے خاصے روابط تھے، جن کا اندازہ مجھے مولاناؒ کی خاص شفقتوں اور والد صاحبؒ کے ان تذکروں سے ہوا جو یہاں (لکھنؤ) آنے کے بعد مولاناؒ کی ہی زبانی سنے، اسلئے مجھے جو کچھ بھی معلومات ہیں وہ میرے لکھنؤ آنے کے بعد کی ہیں۔

ایک حدیث کی توجیہ:

ایک مجلس میں مشہور حدیث جسکے الفاظ یہ ہیں ان الله يبعث لهذه الأمة على رأس مائة كل سنة من يجدد لها دينها (ابوداؤد شریف صفحہ ۲۳۳ جلد ۲) پر گفتگو کرتے ہوئے کہ اس سے بظاہر ہر صدی کے سرے پر امت محمدیہ میں مجدد کے آنے کی پیشن گوئی معلوم ہوتی ہے (غالباً مولانا شاہ حلیم عطاء، سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حوالہ سے) فرمایا کہ یہاں "رأس" کا لفظ "معجم" ہے (یہ ایک خاص اصطلاحی تعبیر ہے، جسکا مفہوم قریب قریب "زائد" کا ہوتا ہے) مطلب یہ ہوا کہ حدیث میں ہر صدی کے اندر "مجدد" (فرد یا جماعت) آنے کی پیشین گوئی ہے خواہ صدی کی ابتداء میں آئے یا وسط میں یا آخر میں۔ پھر قرینہ یا دلیل کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ 'صدی' کے ابتداء و انتہا کی تعیین (سنہ ہجری کا تعین) تو آنحضرت ﷺ

---

(۱) دونوں کی عمروں میں بھی کم و بیش اتنا ہی تفاوت ہوگا، والد ماجدؒ کا انتقال شوال ۱۳۷۷ھ (مئی ۱۹۵۸ء) میں ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کی وفات کے خاصی مدت بعد (حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں) ہوئی تو عرف عام کے مطابق ابتداء کیونکر مراد ہو سکتی ہے! راقم کو یہ افادہ بہت ہی اہم اور گرہ کشا معلوم ہوا (شائد اسی لئے نہاں خانۂ قلب میں محفوظ ہو گیا) کیونکہ اس سے وہ اشکال بھی دور ہو گیا کہ بہت سے مجددین مثلاً مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ۔ کسی صدی کی ابتدا میں نہ پیدا ہوئے نہ انکی وفات ہوئی (مجدد صاحب کی ولادت کا ۹۷۱ھ ہے اور وفات کا ۱۰۳۴ھ ہے، شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۱۴ھ میں ہوئی اور وفات ۱۱۷۶ھ میں)

تفسیر تدبر قرآن کے بارے میں ایک اُلجھن کا ازالہ

راقم کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں شروع سے ہی حدیث و فقہ ۔
مجید کی تدریس کی بھی خدمت مفوض رہی، اس ضرورت سے اور کچھ ا
مختلف تفسیری کتابوں کے مطالعہ کی سعادت حاصل رہی، یہاں آکر
مطالعہ کا پہلی بار موقع ملا ان میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی "تدبر
جلدیں قریبی زمانہ میں ہی منظر عام پر آئی تھیں) اسکے بعض مقامات، مثلاً آیات ...
اس ذیل میں آیات جہاد وقتال کی تفسیر۔ بہت پسند آئے بلکہ اچھوتے لگے، خاص طور پر تحویل قبلہ سے جہاد وقتال کا ربط۔ جو بظاہر بے جوڑ سی بات لگتی تھی، اس تفسیر کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ ان کے درمیان بے ربطی کا وہم دور ہوا بلکہ اعلیٰ درجہ کی ہم آہنگی معلوم ہونے لگی، مگر "تدبر قرآن" کی یہ اور اس قبیل کی بہت سی خوبیوں کے باوجود ایک خاص بات بری طرح کھٹکتی تھی، وہ یہ کہ متعدد مقامات پر ایسا نظر آیا کہ آیت کی تفسیر و تشریح میں صحیح حدیث (بخاری شریف کی بھی حدیث) موجود ہوتے ہوئے مولانا اصلاحیؒ نے ایسی تفسیر کی جس سے اندازہ ہوا کہ یا تو اس حدیث پر اصلاحی صاحب کی نظر نہیں پڑی یا اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا، (مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ماکان الله لیضیع ایمانکم کی تفسیر میں، یہ آیت بھی تحویل قبلہ کے سلسلہ کی ہے) دوسری وجہ راقم کو نہایت مستبعد لگی تھی اسلئے پہلی وجہ تسکین خاطر کے لئے راجح سمجھی، مگر یہ الجھن برابر رہی تا آنکہ اسکا تذکرہ ایک روز مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے کیا تو مولانا نعمانیؒ نے۔ کم از کم راقم کے اس وقت تک صاحب تدبر قرآن کے ساتھ حسن ظن اور اپنی معلومات بلکہ توقع کے برخلاف۔ ایک چونکا دینے والی بات فرمائی، "جسکا خلاصہ و مفہوم یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کوئی شخص تفسیر قرآن لکھنے بیٹھے اور اس کے سامنے تفسیر ابن کثیر یا اس جیسی کوئی

کتاب نہ ہو تو پھر وہ آیت کی تفسیر سے متعلق احادیث سے بے خبر کیوں کر رہ سکتا ہے! بات دراصل یہ ہے کہ مولانا اصلاحی اپنے استاد مولانا فراہی کے اتباع میں فکری واصولی طور پر تفسیر آیات کا حدیث پر مدار رکھنا ضروری نہیں سمجھتے" (راقم نے مولانا نعمانیؒ صاحب کا مفہوم ادا کرنے کی اسطرح کوشش کی ہے کہ موصوف کے الفاظ کی بھی بڑی حد تک رعایت رہے) پھر اسی بات کو واضح اور مدلل کرنے کے لئے فرمایا کہ "مولانا فراہیؒ کا نقطۂ نظر جاننے کے لئے "الفرقان" کے "شاہ ولی اللہ نمبر" میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا مضمون پڑھنا چاہئے، مزید بر آں اس مقالہ کی اہمیت سے متعلق اور بھی بہت کچھ فرمایا (۱) چنانچہ راقم کو مقالہ دیکھنے کا شدید اشتیاق ہوا، اسے حاصل کر کے بغور مطالعہ کیا، اس میں یہ عبارت ملی "مولانا حمید الدین (فراہی) مرحوم میرے بہت پرانے دوست تھے۔ قرآن شریف کے تناسق آیات میں ہمارا مذاق متحد تھا اگرچہ طریقے اور پروگرام میں کسی قدر اختلاف رہا۔ وہ بائیبل مجھ سے بدرجہا اعلیٰ جانتے تھے اور میں حدیث ان سے زیادہ جانتا تھا، جب تک میں ہندوستان میں ان سے ملتا رہا حدیث شریف ماننے نہ ماننے کا جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوا، اتفاقاً جس سال میں مکہ معظمہ پہونچا ہوں، اسی سال وہ بھی حج کے لئے آئے ہماری باہمی مفصل ملاقاتیں رہیں، افکار میں بے حد توافق پیدا ہو گیا تھا، مگر وہاں بھی حدیث کے ماننے نہ ماننے پر بحث شروع ہو گئی، ہم نے سختی سے انکار کیا اور کہا کہ حدیث کو ضرور ہی ماننا پڑیگا تنگ آکر فرمانے لگے آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا موطا مالک! فرمایا ہم اسکو مانتے ہیں "۔ اسکے بعد "تدبر قرآن" کا راقم نے مقدمہ دیکھا تو اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، اس میں جا بجا اسطرح کی عبارتیں خود مولانا اصلاحی اور انکے استاذ مولانا فراہی کے قلم کی ملیں جن سے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے بیان کی تصدیق اور مولانا نعمانیؒ کے مذکورہ بالا "افادہ" کی پوری تائید نکلتی ہے، مثلاً "تدبر قرآن" (جلد اول پہلا ایڈیشن صفحہ " ف " اشاعت لاہور) میں مولانا فراہی کی یہ عبارت ملتی ہے "پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آجائے جن کی پوری حد و تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو صحیح راہ یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور اخبار و آحاد پر زیادہ اصرار نہ کرو " (حدیث کے بارے میں قریب قریب یہی موقف بر صغیر میں منکرین

---

(۱) اس مقالہ کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے تنہا یہ بات کافی ہو گی کی اسے پڑھ کر مولانا سید سلیمان ندوی جیسے ناقد و بصیر نے مولانا نعمانی کو لکھا تھا" میں نے بغور پڑھا، بیشک مولانا سندھیؒ کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفے اور نظریات پر نہایت وسیع اور عمیق تھی" (یہ مضمون الگ بھی رسالے کی شکل میں شائع ہوا۔)

حدیث کے باوا آدم اسلم جیراجپوری صاحب کا بھی تھا۔ برہان) یا مثلاً اسی صفحہ پر خود مولانا اصلاحی نے لکھا ہے "جولوگ احادیث و آثار کو اسقدر راہمیت دیتے ہیں کہ خود قرآن پر بھی حاکم بنادیتے ہیں (اسطرح کی بات امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر امام سے منقول ہے۔ برہان) وہ نہ تو قرآن کا درجہ پہچانتے ہیں نہ حدیث کا"۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مولانا اصلاحی ہی کے قلم سے نکلی ایک عبارت سے تو یہ مترشح ہورہا ہے کہ وہ حدیث کو تاریخ اور دیگر آسمانی کتابوں کے درجے میں رکھتے ہیں، (دیکھئے مقدمہ تدبر قرآن پہلا صفحہ) بہر حال مولانا نعمانیؒ کے افادہ اور انکی راہنمائی سے وہ الجھن تو دور ہو گئی جسکا ذکر اوپر آیا، لیکن صاحب "تدبر" کے تدبر سے جو حسن ظن تھا اسے ٹھیس لگی۔

شخصیات

یوں تو مولانا نعمانیؒ معاصر شخصیات کا گویا انسائیکلو پیڈیا
دوسرے حلقہ کے ذی علم اشخاص کے بارے میں انکی معلومات قابل
کاش یہ تمام معلومات وافادات کتابی شکل میں آجاتے (اگرچہ "تحدیہ
آگیا ہے مگر اسکے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا "سب کہاں! کچھ نمایاں ہوسیں")

اپنے اساتذہ میں محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بہت قائل و مداح تھے (آں ممدوح کے تمام شاگردوں کو انکا ایسا ہی شیفتہ اور گرویدہ پایا) انکے بعد غالباً اپنے شیخ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائے پوری اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ (بانی جماعت تبلیغ) کے بہت قائل تھے ان حضرات سے متعلق اور وابستہ جس طرح کے حالات بیان فرماتے تھے ان کے پیش نظر اصحاب حالات کا قائل اور گرویدہ نہ ہونا قابل تعجب تھا، بلکہ سننے والے کا بھی عظمت کے احساس سے سرشار نہ ہوجانا مستبعد ہے۔

ایک موقع پر ان مذکورہ حضرات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا (جسکا یہ مفہوم ذہن میں رہ گیا ہے) کہ ان حضرات کو دیکھکر تحقیقاً (براہ راست واقفیت سے) ان کی بلند مقامی کا اندازہ ہوا۔ حضرت الاستاذ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (نور اللہ مرقدہ) کے بارے میں فرمایا کہ ان کی عظمت تقلیداً حاصل ہوئی اس کی وضاحت کرتے ہوئے غالباً یہ بھی فرمایا کہ اپنے عصر کے تمام ہی لائق عظمت علماء اور بزرگوں کو حضرت مدنیؒ کی بلندئ مرتبہ اور رفعت شان کا غایت درجہ قائل پایا۔ اس طرح کے سبق آموز واقعات تو مولانا کے سنائے ہوئے بہت ہیں جن سے پوری کتاب تیار ہوسکتی ہے مگر یہاں اتنے پر ہی اکتفا کیا جارہا ہے (آخر میں بھی "کچھ متفرق بیش قیمت باتیں

" کے عنوان سے مولانا کے چند زریں اقوال ذکر کئے گئے ہیں وہاں پر ملاحظہ ہوں)

خورد نوازی

ہر بڑے میں یہ صفت بھی پائی جاتی ہے کے وہ چھوٹوں کو نوازتے اور انکی قدر و حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مولانا نعمانیؒ موصوف میں یہ وصف راقم نے بدرجۂ اتم پایا۔ اس بارے میں "جگ بیتی" کے بجائے "آپ بیتی" سنانا ہی شائد زیادہ آسان بھی ہے اور کار آمد بھی۔ جیسا کے شروع میں ذکر آیا۔ راقم کو اپنی آمدِ لکھنو (۱۳۹۰ھ۔ ۱۹۷۰ء۔) سے ہی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اس سے قبل باوجود ہم وطنی کے کوئی ربط نہ تھا۔ مگر ایسا محسوس ہوا کہ بہت قدیم زمانے سے ربط و تعلق رکھنے والے کسی نہایت شفیق مربی کی سر پرستی حاصل ہو گئی ہے۔ ایسے ایسے مفید مشورے دیئے جن سے اس نو عمر اور نا تجربہ کار، نووارد کو بڑی مدد اور رہنمائی حاصل ہوئی احقر کو لکھنے پڑھنے کی تھوڑی بہت عادت بفضلہ تعالیٰ یہاں آنے سے پہلے سے تھی۔ کئی اہم مقالہ (مثلاً "رویت ہلال کا مسئلہ" جو بعد میں کتابی شکل میں آیا) شائع ہو چکے تھے۔ مولانا نے کے پاس علمی استفسارات پر مشتمل کوئی خط آتا تو عنایت فرما دیتے تاکہ اس کا جواب یہ حقیر لکھے۔ اور جب تعمیل حکم کر دیتا تو اسے "الفرقان" میں دیتے اور اپنے خاص انداز میں داد بھی دیتے کبھی کسی علمی فکری فتنہ کے سر ابھارنے کی انھیں خبر ملتی تو تفصیلات اور خطرات سے آگہی بخشتے ہوئے اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کرتے اور راقم اگر تعمیل کر دیتا تو اسے الفرقان میں شائع فرماتے۔ اس وقت حسن اتفاق سے "الفرقان" کی ادارت کی ذمہ داری برادرم محترم مولانا عتیق الرحمان سنبھلی زید مجدہ کے ہاتھ میں تھی۔ موصوف بھی احقر پر نہایت مہربان تھے (اور ہیں) ان کی مہربانی کی ہی یہ علامت تھی کہ اس زمانے میں "الفرقان" کا تقریباً پورا ایک شمارہ "مسلم پرسنل لا [۱]" پر راقم کے ایک مضمون کی نذر کر دیا تھا۔ (فجزاھم اللہ احسن الجزاء)۔

کچھ مولانا کی کتابوں کے بارے میں

جیسا کے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اور مولانا کی تحریروں کا ہر پڑھنے والا جانتا بھی ہے۔ موصوف کے قلم میں اللہ تعالیٰ نے غضب کی تاثیر، چاشنی اور سادگی و سلاست رکھدی تھی کہ

---

(۱) یہ مقالہ بعد میں بہت سے اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں "معاشرتی مسائل" کے نام سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" لکھنؤ نے شائع کیا۔ اسوقت سے اب تک کوئی دس بارہ ایڈیشن مختلف جگہ سے شائع ہو چکے ہیں (والحمد للہ علی ذلک)

مشکل سے مشکل مضمون پانی ہو جاتا اور بمشکل سمجھ میں آسکنے والے عقائد و حقائق کا سمجھنا نہایت آسان اور سہل ہو جاتا ہے کہ پھر کسی عامی کو بھی دشواری نہیں ہوتی بلکہ دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اسی کے ساتھ الفاظ نہایت نپے تلے اور بقدر ضرورت ہوتے نہ کم نہ زیادہ۔ یہ صفت یوں تو مولانا کے قلم سے نکلے تمام نقوش میں، فی الجملہ، پائی جاتی ہے مگر عقائد، معجزات اور تصوف جیسے دقیق مباحث میں انکے نوک قلم سے عقدہ کشائی دل و دماغ روشن کرنے والی اور شبہات کے چبھتے کانٹے نکال دینے والی ہوتی ہے۔ اسکی مثالیں یوں تو مولانا کی ہر تصنیف میں بکثرت پائی جاتی ہیں مگر جن کتابوں میں بکثرت ملتی ہیں ان میں حسب ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دین و شریعت:

راقم کا تاثر یہ ہے۔ جو حال ہی میں اسکے بالاستیعاب مطالعہ سے
مسلمان کیلئے۔ خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو یا بہت کم پڑھا لکھا شریعت کے
سے لیکر معاملات، اخلاق، معاشرت اور سیاست تک کے بارے میں
بلکہ شائد یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ اس موضوع کی دوسری کتابوں سے بڑ
بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کتاب میں "اسلام" کی علمی و عملی تصویر ایسے انداز میں [illegible]
کہ قاری کے دل و دماغ میں اسلام کی عظمت واہمیت سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ اسکے تقاضوں (مطلوبات و منہیات) پر عمل کرنے کیلئے پوری طرح آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مولانا نے اپنی کتاب میں نہ صرف اپنی بات کہی ہے بلکہ قرآن مجید، احادیث نبویہ ﷺ اقوال صحابہ سے لیکر حال تک کے تمام اکابر علماء، خاص طور پر شاہ ولی اللہؒ کے ارشادات پیش کئے ہیں۔ بلکہ شاہ صاحب کی تو بہت سی تعبیرات بھی اختیار کرلی ہیں۔

اقتباسات. اب کچھ نمونے پیش کئے جارہے ہیں۔

خداوند تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسکی وحدانیت کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قرآن مجید انسان کے اسی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ کو سامنے رکھ کر کہتا ہے کہ یہ سب کرشمے اللہ کی قدرت کے ہیں اور یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہے۔ جو شخص زمین کو دیکھتا اور زمین پر جو کچھ ہو تارہتا ہے اسکو بھی دیکھتارہتا ہے اور اوپر جو آسمان وغیرہ نظر آتے ہیں ان کو بھی دیکھتارہتا ہے۔ اسکے لئے زمین و آسمان کے خالق کے بارے میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے"۔

اسکے بعد مولانا نے اپنے خاص ذوق کے تقاضے سے بھی اسلام کی اصل روح "توحید" پر بہت مفصل کلام کیا ہے اسکے جستہ جستہ حصہ بھی نقل کئے جارہے ہیں۔

"خدا کی توحید کا مسئلہ ایسا ہے جسمیں بہت سی قومیں گمراہ ہوئی ہیں اسلئے تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور تعلیم کا یہ خاص موضوع رہا ہے۔ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں تو اس مسئلہ کی ایسی ایسی تکمیل اور تفصیل کی گئی ہے کہ کوئی گوشہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔" بعد ازاں مولانا نے کلیدی حیثیت کی یہ بات فرمائی۔۔ "توحید کا۔ یعنی اللہ کو ایک ماننے کا۔ ایک درجہ تو وہ ہے جسکو بہت سے مشرکین بھی مانتے ہیں لیکن قرآن مجید کے بیان کے مطابق وہ کافی نہیں، مثلاً اتنی بات کہ آسمان وزمین اور اس ساری کائنات کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے"۔ ان مشرکین کا شرک یہ تھا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق و تقرب کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں، یہ چاہیں تو بناؤ بگاڑ کر سکتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان کو خوش کرنے کے لئے ان کی عبادت کرتے ہیں، یعنی سجدہ و طواف جیسے اعمال کرتے نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے، مشرکین کے ان اعمال پر مولانا یہ تبصرہ فرماتے ہیں "بس ان کا یہی خیال اور یہی عمل شرک تھا . اسی وجہ سے قرآن پاک میں اسی شرک کا رد زیادہ کیا گیا ہے"۔

معبودان باطل کی نشاندہی یوں کی ہے "بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مشرک لوگ سارے معاملات پتھر کی مورتیوں کے ساتھ ہی کرتے تھے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ مشرکین کا یہ مشرکانہ عقیدہ اور عمل ان بزرگ روحوں اور روحانی ہستیوں کے ساتھ تھا جن سے پتھر کے بت منسوب تھے .. دراصل عبادت ان روحانی ہستیوں کی کیجاتی تھی اور انہیں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جاتا تھا" (۴۲-۴۶)

اسکے بعد مولانا نے اسباب ظاہرہ کے استعمال اور مشرکانہ استعانت کے درمیان فرق، نیز 'عبادت' کی حقیقت پر تفصیلی کلام کیا ہے جو دیکھنے کے لائق ہے۔

عقیدۂ آخرت

عقائد کے ابواب میں غالباً سب سے زیادہ عسیر الفہم آخرت کا عقیدہ ہے، قرآن مجید واحادیث شریفہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے لئے سب سے زیادہ [illegible] عقیدہ کا ماننا مشکل تھا، لیکن دیکھئے! مولانا نے کس طرح اس مشکل کو آسان بنادیا کہ ہر سلیم [illegible] عقل [illegible] سے تسلیم کرنے پر آمادہ ہوجائے فرماتے ہیں، کہ "آخرت کے بارے میں [illegible]

بات ہر شخص کی سمجھ میں خود بھی آسکتی ہے کہ ہماری اس زندگی کے بعد کوئی ایسی زندگی ضرور ہونی چاہئے جس میں لوگوں کو انکے اعمال کی سزا اور جزا ملے، کیونکہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ عمر بھر برائیاں کرتے، ڈاکے مارتے، غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ . اور زندگی بھر عیش اڑاتے رہتے ہیں اور اسی حال میں مر جاتے ہیں اس طرح بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ بیچارے بڑی نیکی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ . . . اسکے باوجود ان کی ساری زندگی تکلیف سے گزرتی ہے۔ . . اسی حال میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو جب یہ دنیا خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور وہ ہمارے سب اچھے برے کاموں کو دیکھتا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یہاں۔ . . نہ نیکوں کو انکی نیکی کا صلہ مل رہا ہے اور نہ مجرموں کو سزا دی جارہی ہے تو خود بخود یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ پھر اللہ کی طرف سے یہ جزا اور سزا کسی دوسری زندگی میں ملنی چاہئے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اللہ کے یہاں ایسا اندھ[illegible] کی کوئی قدر ہو، اور نہ ظالموں۔ . کے ظلم پر کوئی باز پرس ہو، (ص

رسالت

انبیاء اور رسل کی آمد کی ضرورت اور ان پر ایمان لانے کی حاجت لو مولانا نے ییسے سہل اور آسان اسلوب میں بتایا! ملاحظہ کیجئے۔ "جب اللہ کو اور آخرت کو ماننے کے بعد ہمارے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ اس دنیا میں ہم اللہ کی بندگی اور فرمابرداری والی زندگی گزاریں تو ہم اسکے محتاج ہو گئے کہ کسی طرح سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کے ہمارے لئے کیا احکام ہیں اور اسکی طرف سے کن کاموں کی اجازت ہے اور کن باتوں کی ممانعت ؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالی ہر انسان کو یہ باتیں براہ راست بتلاتا نہیں اور جو تھوڑی سی عقل اور سمجھ بوجھ انسان کو ملی ہوئی ہے وہ اس دنیا کی روز مرہ کی ضرورتوں کے لئے تو کسی حد تک کیلئے کافی ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنا اسکے بس کی بات نہیں کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے ؟ اور کن کاموں سے راضی اور کن سے ناراض ہوتا ہے ؟ پس ہماری اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسالت اور پیغمبری کا سلسلہ قائم فرمایا۔" یعنی اللہ نے جس طرح ہماری ضرورت کے لئے سورج پیدا فرمایا۔ . . . . اور جس طرح ہمارے لئے غذا کی پیداوار کا نظام قائم کیا اسی طرح [illegible]
[illegible] کے لئے نبوت کا نظام قائم فرمایا۔" اسی ذیل میں ایک بہت اہم عنوان [illegible]
[illegible]ام کیا۔ "انبیاء شریعت ساز نہیں ہوتے بلکہ شریعت [illegible]
[illegible]رزجاں کرنے کے لائق ہے) اس میں معجزہ، کرامت، نبوت، [illegible]

ضروریات دین، اہل سنت والجماعت کے اصول، تقلید جیسی بہت سی شرعی حقیقتوں پر بڑا ہی تسلی بخش کلام اور عام فہم گفتگو کی ہے اسی کے ساتھ بعض نہایت دلچسپ اور سبق آموز واقعات ذکر کئے ہیں۔

یہ کتاب کے صرف ابتدائی تین بابوں کے اقتباسات ہیں۔ باقی "دین شریعت" اسلام کے تمام ہی اہم ابواب کی جامع ہے ۔عبادات ،اخلاق، معاملات، معاشرت، دین کی نصرت، حکومت و خلافت اور احسان و تصوف، الغرض دین و شریعت کے ان تمام پہلوؤں پر ایسی سیر حاصل، موثر اور بصیرت افروز گفتگو فرمائی گئی ہے جو حضرت مولانا کا ہی حصہ ہے۔
مولانا کے قلم میں کیسی روانی، جاذبیت اور شگفتگی تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بعض جگہ ایسا موزوں شعر چست فرمادیتے ہیں جس سے وجدان جھوم اٹھتا ہے مثلاً شہید اور شہادت کے مراتب بیان کرتے ہوئے جہاں یہ بتایا کہ شہید مرتے نہیں ہیں۔ وہیں یہ شعر بھی لکھ دیا۔

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

تصوف کیا ہے؟

اگرچہ یہ مختصر سا رسالہ ہے مگر مولانا کی یہ بھی بہت مفید اور اہم تحریروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، اسلامی علوم یا یوں کہئے اسلام کے مختلف شعبوں میں تصوف، ایک ایسا عنوان ہے جس پر بعض معلوم اور نامعلوم اسباب سے غلط فہمیوں کے دبیز پردے پڑ جانے کی بنا پر صدیوں سے متکلم فیہ رہا ہے، اسکے غیر اسلامی بلکہ ملحدانہ، اور جوگیانہ، وہندوانہ، ہونے تک کی بات بہت زور شور سے کہی گئی اور اب تک کہی جارہی ہے۔ حالانکہ علمائے حق نے ہمیشہ اس الزام کی تردید اور غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی ہے، آخری دور میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اسے ایسا منقح کردیا اور کتاب وسنت کے دلائل سے اسکا (یعنی حقیقی تصوف کا نہ کہ مصنوعی کا) عین اسلام ہونا ثابت کردکھایا ہے کہ اب کسی جویائے حق منصف مزاج کے لئے اسے غیر اسلامی کہنے کا منہ نہیں رہا، حکیم الامت کی اس عظیم خدمت کا اعتراف سب ہی اہل حق نے کیا ہے، جن میں مولانا نعمانیؒ بھی شامل ہیں (ایک مجلس میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی علیہ الرحمۃ نے (راقم کی موجودگی میں) حضرت تھانوی کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ "تصوف کے مجدد تھے"۔ زیر نظر کتاب کے دیباچہ کا مطالعہ ہی غلط فہمی کے ازالہ کیلئے بڑی حد تک کافی ہو سکتا ہے۔

نماز اور خطبہ کی زبان:

ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے دورِ انتشار میں بہت سے وہ مسائل پیدا ہوئے (یا پیدا کئے گئے) اور اٹھے (یا اٹھائے گئے) جنہیں "مسئلہ،، کہنا ہی شائد صحیح نہ ہو، لیکن جب قومیں آمادۂ زوال ہوتی ہیں تو ان میں طرح طرح کے اسبابِ انتشار پیدا ہوتے یا کئے جاتے ہیں۔ جن میں شعوری یا غیر شعوری (بڑی حد تک غیر شعوری) طور پر ایسی قومیں پھنس جاتی ہیں اور پھر باہم معرکہ آرائی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ گویا ایک مفکرِ عصر (۱) کی زبان میں "نصال فی عیر عدو" (ہوا میں لاٹھی چلانا) کے بے فائدہ کام میں مبتلا ہو جاتی ہیں، یہ صورت حال پیدا ہو جانے پر بعض صاحب الرائے اور دور اندیش قوم کے ہمدرد حضرات جن میں ہمیشہ علماء سر فہرست رہے ہیں، درمیان میں پڑ کر علمی و فکری راہنمائی کے ذریعہ اس نزاع کو ختم کر ... ہیں۔

راقم کے خیال میں نماز اور جمعہ کے خطبہ۔ بالخصوص جمعہ ... ہونے کا معرکہ اسی قسم کا جہاد ہے، اور مولانا نعمانیؒ کا یہ مختصر چ... "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا مصداق ہے۔ اس نزاع کے ختم کرنے کی سعی مشہور ہندوستان ے ایک مشہور فلسفی عالم اور حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مولانا عبد الباری ندویؒ کے ایک حکیمانہ قول "عقل وکیل ہے جج نہیں" کے مطابق ذہین انسان جب کوئی مسلک یا رائے اختیار کر لیتا ہے تو اسکے لئے عقل دلائل فراہم کر ہی دیتی ہے (جسطرح ہر کمزور سے کمزور بلکہ جھوٹے اور فرضی مقدمہ کے لئے بھی وکیل مل جاتے ہیں) ایسی ہی کچھ صورت حال راقم کے نزدیک۔ نماز اور خطبۂ جمعہ کے غیر عربی میں جواز کے قائلین کی ہے، ان لوگوں نے اپنی تائید میں 'بزعم خویش' جو دلائل دئے ہیں ان میں کسی ایک کو بھی واقعی دلیل قرار دینا مشکل ہے، مولانا نعمانیؒ نے اسی قسم کے "دلائل" کا اپنے اس رسالہ میں بھر پور جائزہ لیا ہے اور ان کا پائے چوبیں، بلکہ، تار عنکبوت، جیسا "مضبوط" ہونا واضح کر دیا ہے، یہ نہایت مختصر رسالہ ہے (اسلئے اسکا قیمۃً حصول بھی ہر ایک کی دسترس میں ہے) جو شخص بھی اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتا، یعنی غیر عربی زبان میں نماز و خطبہ کے جواز کی طرف رجحان رکھتا ہو وہ اسے ضرور پڑھے۔

---

(۱) مفکر اسلام مخدومنا حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں مدظلہ نے اہلحدیث کی طرف سے ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین، بالخصوص احناف کے خلاف ادھر کچھ عرصہ سے جارحانہ مہم تیز تر کر دینے سے متاثر ہو کر ایک نہایت قیمتی رسالہ عربی میں لکھا، اسکی تمہید میں اس جارحانہ مہم اور گولہ باری کیلئے مذکورۂ بالا بلیغ تعبیر اختیار کی۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور فیصلہ کن مناظرہ

مولانا نعمانیؒ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے بھی یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ انکی شہرت اولاً مناظر اعظم کی حیثیت سے ہوئی، اب سے تقریباً ۶۰۔ ۶۵ سال پہلے ان کا اصل کارنامہ بلکہ یہ کہنا اور سمجھنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان کا اصل مشغلہ فرق ضالہ۔ بالخصوص بریلویوں سے مناظرہ ہی تھا اس باب میں انہوں نے ایسے تابندہ نقوش چھوڑے ہیں جو مٹ نہیں سکتے، لیکن پھر خود مولانا کو احساس ہوا کہ یہ میدان زیادہ مفید اور بار آور نہیں زیادہ بہتر اور مفید تر کام ایجابی یعنی اصلاحی و دعوتی کام ہے۔

چنانچہ مولانا نے پھر وہ کوچہ ایسا چھوڑا کہ اسکی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لیکن وہ ضرورت فی الجملہ باقی رہی (بلکہ کچھ اب تک بھی ہے) جسکی بنا پر مولانا نعمانیؒ نے یہ میدان سنبھالا تھا، یعنی علمائے حق مثلاً شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری، حضرت تھانویؒ کے خلاف بریلویوں کی افترا پردازیاں اور ان حضرات کے اقوال و عبارات کو توڑ مروڑ کر اسطرح پیش کرنا جس سے کفر و ضلال کا پہلو پیدا کیا جاسکے تاکہ ان بزرگوں پر کفر کا فتویٰ لگانا آسان ہو۔ اگرچہ اوپر (عنوان میں) دو کتابوں کے نام مذکور ہیں، لیکن حقیقۃً ان کا موضوع ایک ہی ہے گویا وہ ایک ہی کتاب کے دو جز ہیں، یعنی اکابر علماء کا دفاع، اور بریلویوں کے امام اور ان کے متبعین کی طرف سے ان حضرات اکابر پر لگائے گئے الزامات کے مسکت جوابات، اور الزام لگانے کے لئے ان کی عبارتوں میں تحریف و تلبیس اور قطع و برید کی جیتی جاگتی مثالیں پیش کر کے عبرت کا سامان فراہم کرنا جس سے بریلوی۔ اکابر و اصاغر۔ کی ناخدا ترسی اور دجل و فریب کے وہ عبرت انگیز نمونے سامنے آتے ہیں کہ عقل دنگ اور شرم و حیاء سر پیٹتی رہ جاتی ہے، اہل حق سے وابستہ جن لوگوں کو بریلویوں کے اس گروہ سے سابقہ ہو اور ان کی ریشہ دوانیوں اور کلہ درازیوں کا شکار ہوں وہ ضرور ان کتابوں کا مطالعہ کریں انشاءاللہ وہ خود بھی پوری طور پر مطمئن ہوں گے اور بریلوی زبان درازوں کے منہ اچھی طرح بند کرسکیں گے۔

مولانا نعمانی کی چند متفرق بیش قیمت باتیں

مسک الختام، کے طور پر مولانا کی چند مفید باتیں۔ جو حافظہ میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ پیش کی جارہی ہیں امید ہے کہ انشاءاللہ نفع پہونچے گا۔!

(۱) راقم نے ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں دعا کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا کہ آپ دعا کیجئے کہ اللہ دعا کی توفیق دے، یہ بظاہر عجیب سا جواب تھا معاً اسکے بعد مولانا نے (غالباً میرا تعجب رفع کرنے کیلئے) یہ واقعہ سنایا (جس کا حاصل یہ ہے)" ایک مرتبہ ہم نے اپنے شیخ حضرت رائے پوری سے دعا کی درخواست کی تو انہوں نے اولاً ایسا ہی جواب دیا پھر فرمایا کہ "مولانا (یا مولوی صاحب)، دعا قلب کی حرکت اضطراری کا نام ہے جب ایسی دعا کی توفیق مل جاتی ہے، تو پھر اسکی قبولیت میں تخلف نہیں دیکھا۔،،

(۲) مولانا کی جب تک صحت و قوت بلکہ ہمت نے بھی ساتھ دیا برابر عیدین کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں بعد نماز عید اصلاحی تقریر فرماتے۔(پہلے تو عیدین کی نماز بھی پڑھاتے تھے مگر ادھر پندرہ بیس سال سے نماز تو نہیں پڑھارہے تھے مگ
اس میں بڑے کام کی اور دل چھونے والی باتیں فرماتے اور یہ مصداق
اثر بھی ہوتا (بعض تقریریں، الفرقان میں چھپ چکی ہیں) عید کے
تقریر میں مولانا کا یہ جملہ بڑا ہی البیلا معلوم ہوا، اور اسے دماغ نے
گناہ چوری بدکاری نہیں ہیں، بلکہ ان کے گناہ ہیں غیبت، حسد، بدگوئی، اور یہ
الفاظ بھی بڑی حد تک مولانا ہی کے ہیں جہانتک یاد ہے)

(۳) غالباً عید کے دن ہی ایک تقریر میں بڑے دردوسوز کے ساتھ فرمایا عموماً مسلمان شادی بیاہ کے موقع پر ہر چھوٹے بڑے قریب ودور کے عزیزوں کو حتیٰ کے نوکروں چاکروں اور کمینوں(۱) تک کو راضی کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں مگر اللہ اور اسکے رسول کو راضی نہیں کرتے بلکہ انکو شدید طور پر ناراض کرنے والے اعمال و حرکات کرتے ہیں۔ ویسے مولاناؒ کی تقریباً ہر تقریر اور تحریر میں فکر آخرت بیدار کرنے کی بات شامل ہوتی تھی۔ یاد آتا ہے کہ مولانا عبدالباریؒ ندوی نے ایک بار مولانا نعمانی کا یہ امتیاز بتا کر بڑی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔

(۴) ایک روز میری موجودگی میں ایک شخص نے ایک نوعمر عالم کی تعریف کی کہ وہ فلاں، فلاں جگہ گئے انہوں نے وہاں تقریریں کیں جو بہت پسند کی گئیں، اس پر مولانا نے فرمایا کم عمری میں شہرت اور مقبولیت بڑے ابتلاء اور آزمائش کی بات ہے! چنانچہ ان صاحب کے بارے میں واقعۃً، یہ شہرت ابتلاء کا باعث بن گئی۔

---

(۱) ہمارے علاقے (سنبھل اور اسکے اطراف) میں "کمین" کا لفظ مہتر، مہترانی اور اسی طرح کے دیگر چھوٹے کام کرنے والے (شاگرد پیشہ) لوگوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور فیصلہ کن مناظرہ

مولانا نعمانیؒ سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے بھی یہ ضرور جانتے ہوں گے کہ انکی شہرت اولاً مناظر اعظم کی حیثیت سے ہوئی، اب سے تقریباً ۶۰۔ ۶۵ سال پہلے ان کا اصل کارنامہ بلکہ یہ کہنا اور سمجھنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ ان کا اصل مشغلہ فرق ضالہ۔ بالخصوص بریلویوں سے مناظرہ ہی تھا اس باب میں انہوں نے ایسے تابندہ نقوش چھوڑے ہیں جو مٹ نہیں سکتے، لیکن پھر خود مولانا کو احساس ہوا کہ یہ میدان زیادہ مفید اور بار آور نہیں زیادہ بہتر اور مفید تر کام ایجابی یعنی اصلاحی ودعوتی کام ہے۔

چنانچہ مولانا نے پھر وہ کوچہ ایسا چھوڑا کہ اسکی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لیکن وہ ضرورت فی الجملہ باقی رہی (بلکہ کچھ اب تک بھی ہے) جسکی بنا پر مولانا نعمانیؒ نے یہ میدان سنبھالا تھا، یعنی علمائے حق مثلاً شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری، حضرت تھانویؒ کے خلاف بریلویوں کی افترا پردازیاں اور ان حضرات کے اقوال وعبارات کو توڑ مروڑ کر اسطرح پیش کرنا جس سے کفر وضلال کا پہلو پیدا کیا جاسکے تاکہ ان بزرگوں پر کفر کا فتویٰ لگانا آسان ہو۔ اگرچہ اوپر (عنوان میں) دو کتابوں کے نام مذکور ہیں، لیکن حقیقۃً ان کا موضوع ایک ہی ہے گویا وہ ایک ہی کتاب کے دو جز ہیں، یعنی اکابر علماء کا دفاع، اور بریلویوں کے امام اور ان کے متبعین کی طرف سے ان حضرات اکابر پر لگائے گئے الزامات کے مسکت جوابات، اور الزام لگانے کے لئے ان کی عبارتوں میں تحریف وتلبیس اور قطع وبرید کی جیتی جاگتی مثالیں پیش کر کے عبرت کا سامان فراہم کرنا جس سے بریلوی۔ اکابر واصاغر۔ کی ناخدا ترسی اور دجل وفریب کے وہ عبرت انگیز نمونے سامنے آتے ہیں کہ عقل دنگ اور شرم وحیاء سر پیٹتی رہ جاتی ہے، اہل حق سے وابستہ جن لوگوں کو بریلویوں کے اس گروہ سے سابقہ ہو اور ان کی ریشہ دوانیوں اور کلہ درازیوں کا شکار ہوں وہ ضرور ان کتابوں کا مطالعہ کریں انشاءاللہ وہ خود بھی پوری طور پر مطمئن ہوں گے اور بریلوی زبان درازوں کے منہ اچھی طرح بند کر سکیں گے۔

مولانا نعمانی کی چند متفرق بیش قیمت باتیں

مسک الختام، کے طور پر مولانا کی چند مفید باتیں۔ جو حافظہ میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ پیش کی جارہی ہیں امید ہے کہ انشاءاللہ نفع پہونچے گا۔!

(۱) راقم نے ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں دعا کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا کہ آپ دعا کیجئے کہ اللہ دعا کی توفیق دے، یہ بظاہر عجیب سا جواب تھا معاً اسکے بعد مولانا نے (غالباً میرا تعجب رفع کرنے کیلئے) یہ واقعہ سنایا (جس کا حاصل یہ ہے)" ایک مرتبہ ہم نے اپنے شیخ حضرت رائے پوری سے دعا کی درخواست کی تو انہوں نے اولاً ایسا ہی جواب دیا پھر فرمایا کہ "مولانا (یا مولوی صاحب)، دعا قلب کی حرکت اضطراری کا نام ہے جب ایسی دعا کی توفیق مل جاتی ہے، تو پھر اسکی قبولیت میں تخلف نہیں دیکھا۔،،

(۲) مولانا کی جب تک صحت و قوت بلکہ ہمت نے بھی ساتھ دیا برابر عیدین کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں بعد نماز عید اصلاحی تقریر فرماتے۔ (پہلے تو عیدین کی نماز بھی پڑھاتے تھے مگر ادھر پندرہ بیس سال سے نماز تو نہیں پڑھا رہے تھے مگر تقریر فرماتے تھے) اس میں بڑے کام کی اور دل چھونے والی باتیں فرماتے اور یہ مصداق، از دل خیزد بر دل ریزد، ان کا اثر بھی ہوتا (بعض تقریریں، الفرقان میں چھپ چکی ہیں) عید کے
تقریر میں مولانا کا یہ جملہ بڑا ہی البیلا معلوم ہوا، اور اسے دماغ نے محفو
گناہ چوری بدکاری نہیں ہیں، بلکہ ان کے گناہ ہیں غیبت، حسد، بدگوئی
الفاظ بھی بڑی حد تک مولانا ہی کے ہیں جہانتک یاد ہے)

(۳) غالباً عید کے دن ہی ایک تقریر میں بڑے درد و سوز کے ساتھ فرمایا سوما سماں شادی بیاہ کے موقع پر ہر چھوٹے بڑے قریب و دور کے عزیزوں کو حتیٰ کے نوکروں چاکروں اور کمینوں (۱) تک کو راضی کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں مگر اللہ اور اسکے رسول کو راضی نہیں کرتے بلکہ انکو شدید طور پر ناراض کرنے والے اعمال و حرکات کرتے ہیں۔ ویسے مولاناؒ کی تقریباً ہر تقریر اور تحریر میں فکر آخرت بیدار کرنے کی بات شامل ہوتی تھی۔ یاد آتا ہے کہ مولانا عبدالباریؒ ندوی نے ایک بار مولانا نعمانی کا یہ امتیاز بتا کر بڑی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔

(۴) ایک روز میری موجودگی میں ایک شخص نے ایک نوعمر عالم کی تعریف کی کہ وہ فلاں، فلاں جگہ گئے انہوں نے وہاں تقریریں کیں جو بہت پسند کی گئیں، اس پر مولانا نے فرمایا کم عمری میں شہرت اور مقبولیت بڑے ابتلاء اور آزمائش کی بات ہے! چنانچہ ان صاحب کے بارے میں واقعۃً، یہ شہرت ابتلاء کا باعث بن گئی۔

---

(۱) ہمارے علاقے (سنبھل اور اسکے اطراف) میں "کمین" کا لفظ مہتر، مہترانی اور اسی طرح کے دیگر چھوٹے کام کرنے والے (شاگرد پیشہ) لوگوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔

(۵) ایک مجلس میں بڑے کام کی، اور گہرے مطالعہ پر مبنی، یہ بات فرمائی بریلویت بطور فرقہ کے "احمد رضا خاں،، کے زمانہ سے یا ان کی بدولت پیدا ہوئی ورنہ اس سے پہلے یہ فکر تو تھا مگر فرقے کی شکل میں نہ تھا۔

اعتذار:

آخر میں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ مولانا کی نصف صد سے زائد کتابیں ہیں ان سب پر گفتگو اور انکا تعارف نہ آسان ہے نہ اسکے لئے وقت بلکہ مقالہ کے مقصد سے جن کتابوں کا حال ہی میں مطالعہ کیا تھا ان سب کا تعارف کرانا بھی سر دست مشکل نظر آیا۔ (امید ہے کہ یہ کمی انشاء اللہ کوئی اور اہل مخلص پوری کردے گا) اسلئے بس اتنے ہی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ راقم کی قارئین سے درخواست ہے کہ دعا فرمائیں، اللہ تعالی اس سعی کو قبول فرمائیں اور جن باتوں اور کتابوں کا ذکر آیا ہے کم از کم ان سے استفادہ کی زیادہ سے زیادہ لوگوں کو توفیق دے، اور صاحب کتب کے رفع درجات اور مغفرت کا سبب بنائے۔ ☆☆

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
استاذ حدیث العین یونیورسٹی (ابو ظبی)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

چند تأثرات

حضرت مولانا نعمانی صاحب کی وفات اس عہد کا بہت بڑا حا
میں ایسا عظیم خلا پیدا ہو گیا، جس کا پر ہونا بظاہر ممکن نہیں، ان کی ذات
وکمالات کی حامل تھی، وہ کامیاب ترین مدرس اور عظیم ترین محدث تھے، وہ
مشہور مناظر، اسلام کے داعی، اور زمانہ کے نبض شناس مفکر تھے۔ انکی اصابت رائے اور دقت نظر مسلم تھی۔ وہ اخلاص ودینی محبت کا اعلیٰ نمونہ، اپنے اکابر کی خصوصیات وروایات کے حامل اور انکے علوم کے ناشر تھے۔

اس ناچیز کا ان کی ذات گرامی سے تعلق ندوۃ العلماء میں طالب علمی کے زمانہ (۳۵ء) سے شروع ہوا تھا جو تا زندگی قائم رہا، یہ ناچیز مظاہر العلوم سے ندوہ پڑھنے آیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مولانا نعمانی صاحب اور حضرت مولانا علی میاں مد ظلہ دونوں بزرگوں کا تبلیغی کام سے بہت گہرا عملی تعلق تھا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ، بھی اپنے خطوط میں ان حضرات کی خدمت میں حاضری کی تاکید فرماتے رہتے تھے، ۱۹۵۶ء تا ۶۷ء دار العلوم ندوۃ العلماء میں میری مدرسی کا زمانہ ہے۔۔۔ اس عرصہ میں حضرت مولانا سے زیادہ قرب واتصال کے مواقع ملے، اس لئے کہ اس ناچیز کے ذمہ جب مشکوٰۃ شریف پڑھانے کے لئے کی گئی، حضرت مولانا اس زمانہ میں ندوہ کے شیخ الحدیث تھے۔ اور دار العلوم کے تمام اہم کاموں میں شریک مشورہ رہتے تھے انھیں کی سعی سے کچھ عرصہ کے لئے مشکوٰۃ شریف کی دونوں جلدیں ایک ساتھ

کردی گئی تھیں، اس کے بعد جب حضرت مولانا نے اپنے خاص حالات کی بناء پر تدریسی خدمت سے معذرت فرمائی، تو اس زمانے میں آپ جو کتاب یعنی ترمذی شریف پڑھاتے تھے وہ آپ کے مشورے سے اس ناچیز کے ذمے کی گئی اور یہ کتاب تقریباً ۵ سال یعنی ۱۹۷۷ تک ندوہ میں میرے آخری قیام تک میرے ہی ذمہ رہی۔

حضرت مولانا کے ایما اور حکم کی بناء پر الفرقان میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، اس زمانہ میں کئی اسفار بھی حضرت مولانا کے ساتھ ہوئے، جب پہلی مرتبہ دارالعلوم ندوہ کے سلسلہ میں مالیگاؤں بمبئی، ناگپور، وغیرہ سفر کرنا پڑا، تو حضرت مولانا نے وہاں کے ذمہ داروں کو جو ان سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، خطوط لکھے جن سے دارالعلوم کے تعارف میں بڑی مدد ملی، ہندوستان سے باہر آنے کے بعد بھی حضرت مولانا سے تعلق برابر قائم رہا، ہر حاضری و ملاقات پر وہ خصوصی شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، ان کی بڑی خواہش تھی کہ حضرت مولانا کے ہمراہ سنبھل جو ان کا آبائی وطن ہے وہاں کا سفر ہو جائے، افسوس، اپنے حالات کی بنا پر اسکا موقع نہ مل سکا، ان باتوں کا تقاضہ تھا کہ الفرقان کے خصوصی نمبر کے لئے کوئی علمی مقالہ تیار کرتا مگر اس وقت ہندوستان سے باہر ہوں، حضرت مولانا کے خطوط اور ان کی اکثر کتابیں یہاں موجود نہیں ہیں، اس لئے چند تأثرات پر اکتفا کر رہا ہوں تاکہ رسالہ الفرقان کے خصوصی نمبر کی بزم میں شرکت کا موقع مل سکے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے، گاہے، باز خواں ایں دفتر پارینہ را

حضرت مولانا کا علمی رسوخ

حضرت مولانا نعمانی نے جس زمانہ میں اپنا علمی سفر شروع کیا تھا، وہ ہندوستان کا عہدِ زرّیں کہا جاسکتا ہے، بڑے بڑے اکابر علماء، ومحدثین، فقہاء وربانیین موجود تھے۔ جن حضرات کے سامنے حضرت مولانا نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، ان میں کا ایک ایک فرد اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھا۔ خصوصیت کیساتھ حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ جن کے بارے میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شہادت ہے ''اگر وہ پچھلے دور میں پیدا ہوئے ہوتے تو طبقۂ اہلِ علم میں ان کی بڑی شان ہوتی'' حضرت مولانا نعمانیؒ کا علامہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں خصوصی مقام ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ رہا، مطالعہ کا شغف تھا، درسی

وغیر درسی کتابوں میں جو اشکالات پیش آتے ان کے جوابات کو اہتمام سے نوٹ فرمالیا کرتے، اور علامہ کشمیری کی خدمت میں حاضری کے وقت پیش کرتے، شاہ صاحب کے جوابات بھی نوٹ فرمالیا کرتے، اللہ تعالیٰ نے قوت حافظہ اور ذکاوت وذہانت کی دولت سے بھی نوازا تھا، حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ یہ سوالات حضرت الاستاذ کی خدمت میں میرا خصوصی ہدیہ ہوتے ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ ترمذی شریف کی ایک عبارت پر اشکال واقع ہوا، اس کو نوٹ کرلیا۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کے وقت اس کو پیش کردیا، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا، مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، جس سال آپ دورے میں تھے، مجھے خوب یاد ہے میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے نسخوں میں ایک غلطی واقع ہوگئی ہے، لیکن لوگ سرسری گذر جاتے ہیں ان کو پتہ نہیں چلتا، ورنہ جو اشکال آپ کو پیش آیا ہے وہ انھیں بھی آنا چاہئے، یہ واقعہ دلیل ہے حضرت مولانا کے علمی رسوخ کی، جس کی شہادت ان کے استاد علامہ کشمیری دے رہے ہیں،

غرض حضرت مولانا نعمانیؒ نے کتابیں محنت سے پڑھیں اور پڑھائیں، ا
کشمیریؒ کے تلمذ و تعلق نے ان کے اندر علمی رسوخ و کمال پیدا کردیا۔
کی تالیفات سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے، بالخصوص ان کی کتاب "
سے کتاب الایمان میں مشکل مقامات کو جسطرح حل کردیا ہے اور آس
سب کے لئے یکساں قابل مطالعہ واستفادہ ہے۔

ان کی ساری زندگی کے رفیق حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے ان کے علمی رسوخ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا " علمی رسوخ بہت اونچی چیز ہے، اور ایک خاص امتیاز ہے، میں اللہ کے گھر میں بیٹھ کر شہادت دیتا ہوں کہ مولانا کو علم حدیث میں، تفسیر میں، علم کلام اور فرق محرفہ اور منحرفہ کے بارےمیں جو وسیع معلومات تھیں ان سے جو غیر معمولی واقفیت تھی اور ان کی کمزوریوں اور ان سے پیدا ہونیوالے خطرات کا جتنا صحیح اندازہ ان کو تھا، وہ ہندوستان کے مشاہیر علماء کو بھی حاصل نہیں"۔ (تعزیتی جلسہ ندوۃ العلماء کی تقریر)

حضرت مولاناؒ کے کامیاب مناظرے

حضرت مولانا نے اپنے وقت کے تمام فتنوں کا، وہ قادیانیت ہو یا بریلویت، علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک، ہو یا اور کوئی فتنہ، ان سب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، اور پوری طاقت سے ان کا رد کیا، اور مسلمانوں کو ان فتنوں کے نقصانات سے آگاہ کیا، اور ان کو بچانے کی کوشش کی۔

مولانا بیان فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور درس و تدریس کا کام شروع کیا، ہندوستان میں چند شدید قسم کے فتنوں سے سابقہ تھا، جن میں بعض داخلی تھے، اور بعض خارجی۔ خارجی فتنہ آریہ سماج کی شدھی سنگٹھن تحریک کا تھا، داخلی فتنوں میں ایک طرف قادیانیت کی یلغار تھی، اور اس کے مناظر و مبلغ پھیل رہے تھے، اور امت کے عقیدۂ ختم نبوت کی جڑیں کھودنا چاہتے تھے، اور دوسری طرف بریلوی مکتب فکر کے شرک و بدعت نے سر اٹھار کھا تھا، اس لئے حضرت مولانا نے بریلویوں کے تکفیری فتنے کی وجہ سے ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، اور ان سے پے بہ پے کامیاب مناظرے کئے، اس میدان میں ان کو اپنے اکابر علماء دیوبند کا پورا اعتماد حاصل تھا، حضرت اقدس حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولاناؒ کو اپنا وکیل بنایا تھا، جو بہت بڑے اعتماد کی دلیل ہے۔

ندوۃ العلماء میں قیام کے زمانے میں ہمارے استاذ مولانا اسحاق سندیلوی کو ان کے قصبہ سندیلہ میں بریلویوں سے مناظرہ کی نوبت آگئی، اس سلسلہ میں انھوں نے مناسب سمجھا کہ مولانا نعمانی صاحبؒ سے مشورہ کر لیا جائے، جو اس میدان کے شہسوار رہ چکے ہیں، اس ناچیز کو ساتھ لیکر لکھنؤ کے تبلیغی مرکز میں جہاں حضرت مولانا نعمانیؒ کا قیام تھا حاضر ہوئے، مولانا نعمانی صاحبؒ ان دنوں مناظرہ چھوڑ چکے تھے، وہ دعوت و تبلیغ اور وعظوں کے ذریعہ فضا کی تبدیلی کو زیادہ مفید و مؤثر سمجھتے تھے، دوران گفتگو حضرت مولانا نے ایک دلچسپ قصہ ایک مناظرہ کا سنایا جس کو میں یہاں نقل کر رہا ہوں "مبارکپور اعظم گڈھ میں احیاء العلوم مشہور مدرسہ ہے اس کے بانی حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مرحوم ہیں انھوں نے لکھا کہ یہاں بریلویوں سے مناظرہ کی نوبت آگئی ہے، اس لئے فلاں تاریخ کو یہاں تشریف لائیں، ان کے مناظر سید محمد کچھوچھوی ہیں، جو اس طبقہ کے بڑے محدث سمجھے جاتے ہیں، ہم نے چیلنج قبول کر لیا ہے" مولانا نعمانیؒ نے بیان فرمایا کہ میں نے صبح کی ٹرین سے اپنی آمد کی اطلاع کر دی، مگر بعد میں رائے بدل گئی، جس کی ان کو اطلاع نہیں کی، صبح اسٹیشن پر نہ پاکر وہ لوگ واپس چلے گئے، لوگوں میں مایوسی ہوئی، بریلویوں نے اعلان کرادیا کہ "دیوبند کے مناظر کا فرار" بہر حال شام کی ٹرین سے مبارکپور پہونچا اور مولانا شکر اللہ صاحب سے عرض کر دیا کہ میری آمد کی کسی کو خبر نہ ہو، اور عشاء کے بعد جہاں ان لوگوں کا اسٹیج لگا ہوا ہے اس سے پچاس قدم دوری پر ہمارے پچاس آدمی بیٹھ جائیں بریلوی مناظر کو حضرت مولانا کی آمد کا خیال نہیں تھا اس لئے انہوں نے جلسہ کا آغاز کرادیا، اور ایک نوجوان کو جو داڑھی منڈا تھا، نعت رسول ﷺ کے لئے کھڑا کر دیا، مولانا فرماتے ہیں کہ اتنے

میں ہم اپنے ساتھیوں کو لیکر میدان مناظرہ میں گئے، اور ان پچاس آدمیوں کو اپنے ساتھ اٹھا کر اس مناظر کے سامنے بیٹھ گئے، یہ منظر دیکھ کر بریلوی محدث گھبرا گئے، مجھے خیال ہوا کہ مناظرہ تو ہوگا نہیں البتہ نقض امن کا بہانہ بنا کر پولس کو یہ لوگ بلا کر جلسہ ختم کرا دیں گے، اس لئے میں نے ان سے مخاطب ہو کر یہ کہا کہ یہ داڑھی منڈا جو نعت رسول ﷺ پڑھ رہا ہے، یہ صریح بے ادبی ہے، اس کو منع کر دیں، اور یہ بتلائیں کہ کن مسائل پر مناظرہ کرنا ہے؟ محدث صاحب نے گھبراہٹ میں کہا کہ ہم وعظ کے لئے آئے ہیں۔ اتنے میں پولس آگئی، وہ پہلے میرے پاس آئی کہ نقض امن کا خطرہ ہے اس لئے جلسہ برخاست کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا پہلے واعظ صاحب کو اٹھائیں، چنانچہ انھیں جا کر پولس والوں نے اٹھا دیا، جلسہ برخاست ہو گیا، اور ہماری کامیابی کا اعلان ہو گیا، یہ ہے مناظرہ کی حقیقت۔ اور یہ فرمایا کہ اس دور کے نئے و پرانے فتنے کا سدباب دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا اور ردّ قادیانیت

قادیانیت کو حضرت مولانا اسلام کی بیخ کنی اور تخریب کاری کا وسیلہ ... کے ردّ کو وقت کا اہم فریضہ سمجھ کر مرزا غلام احمد قادیانی کی کفریات، اور ... گوئی جو خود مرزا نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، ان سب کا اچھی طرح مطالعہ ... اور دیگر جھوٹے دعاوی کا ایسا بھانڈا پھوڑا کہ مولانا کی کتابوں کو پڑھنے والا قادیانیت اور اسکے بانی کو بھی نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، اس کو اس قابل بھی نہیں سمجھے گا کہ یہ شخص شرافت وانسانیت کا حامل سمجھا جائے چہ جائیکہ نبوت و رسالت کا۔

مولانا کی تینوں کتابیں ۱۔ قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ ۲۔ قادیانیت پر غور کرنیکا سیدھا راستہ ۳۔ کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت، یہ کتابیں اپنے موضوع پر بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں۔

آخری دور میں ردّ شیعیت کا منفرد کارنامہ

مولانا کے ضعف پیرانہ سالی، دیگر عوارض صحت اور مزید برآں بعض لحاظ سے معذوری کا دور شروع ہو چکا تھا کہ ایران کے آیت اللہ خمینی نے شاہ ایران کے خلاف اپنی تحریک میں کامیابی حاصل کی، اور خالص شیعہ عقائد پر مبنی حکومت قائم کر کے اسے اسلامی حکومت اور اسلامی

انقلاب کے نام سے مشہور کرایا، ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسلمانوں کا نوجوان طبقہ اس حکومت کو واقعی اسلامی حکومت سمجھنے لگا، نہ کہ ایک خالص شیعی حکومت اس لئے ضرورت تھی کوئی مرد خدا پروپیگنڈے کے اس طلسم کو توڑے، یہ کام اللہ نے حضرت مولانا سے لیا، حضرت مولانا نے خود خمینی کی کتابوں کو حاصل کیا، اور دیگر مستند شیعہ علماء کی کتابوں کے مطالعہ کا ایک طویل اور پُر مشقت مرحلہ اپنی تمام کمزوری اور معذوری کے باوجود طے کر کے "ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی، جو اردو، انگریزی، اور عربی زبان میں اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے، اس کا اعتراف بڑے مشاہیر علماء عرب نے بھی کیا ہے۔

حضرت مولانا نعمانیؒ نے بہت سے ایسے اعمال چھوڑے ہیں، خصوصا ان کی تالیفات جو ان کی ذات گرامی کو قیامت تک زندہ، جاوید رکھیں گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

☆☆

مولانا محمد حنیف ملیؔ
شیخ الحدیث معہد ملت۔ مالیگاؤں

مولانا محمدؐ منظور صاحب نعمانیؒ

اپنی تصنیفات کے آئینہ میں

مرحوم و مغفور حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمۃ
سالہ زندگی میں جو زرّیں خدمات مختلف محاذ پر انجام دی ہیں وہ کسی تع
نہیں اللہ نے انہیں ایسا حساس اور دردمند دل بخشا تھا جو عیاں اور
نظر رکھتا تھا۔ انکی زندگی کا ایک دور وہ بھی تھا جس میں انکا وجود باطل کے ــــ ںتّ
کے نام سے باطل لرزتا تھا اور جسے مرحوم دین کا ایک ضروری اور خوش گوار فرض سمجھ کر انجام دیتے رہے، درس و تدریس کے ذریعہ انھوں نے ملت کے نونہالوں اور خورد و کلاں کی جو تربیت فرمائی وہ ان کی خدمت کا انمول حصہ ہے، ملکی مسائل اور ملت کے مسائل کیلئے وہ جسقدر حق گوئی اور بیباکی سے سرگرم عمل رہے انکے معاصرین میں اسکی نظیر نہیں ملتی، حکومت وقت کی دست درازیوں اور ملت کے ساتھ ہونے والے مظالم کا عہد ناتوانی تک جو مثالی دفاع کیا مسلم جماعتیں، مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل، مسلم پرسنل لا بورڈ، ان کی شرمندۂ احسان ہے۔ غیر مسلموں میں جس حقیقت شناسی کے ساتھ محاسن اسلام پیش کر کے انہیں اسلام کی دعوت دی اس سے کوئی صاحب نظر، صَرفِ نظر نہیں کر سکتا، تقریروں اور مواعظ کے ذریعہ مرحوم نے جو لشکر آراستہ کیا اور محاذ کو تادم زیست گرمائے رکھا وہ انھیں کا عظیم اور روشن کارنامہ ہے لیکن خدمات کے ان نت نئے محاذوں میں مرحوم نے اپنے حقیقت نگار قلم سے جو نقوش ثبت فرمائے اور تقاضوں کی رعایت کر کے اسلوب جدید میں جو قلمی خدمت انجام دی ہے وہ انہیں قیامت تک

زندہ رکھے گی۔ ذوقؔ نے کہا تھا ؎

رہتا قلم سے نام زمانے تلک ہے ذوقؔ
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

مولانا منظور صاحب نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا نبض دوراں پر انگلی رکھ کر لکھا جو ملت کیلئے تیر بہدف اور انسانیت کیلئے آب زلال ثابت ہوا انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا مضراب دل کی صدائے بازگشت اور حرف آخر ثابت ہوا، ان کی تحریر سے دلوں کی تاریک دنیا نے جلاپائی اور گم گشتہ راہ کو منزل کا پتہ ملا۔ ان کی تحریر و تصنیف کی یہ کوئی معمولی برکت نہیں ہے کہ جو لکھا درد دل اور دوائے دل ثابت ہوا اور نہ جانے کتنوں کو ان کی تحریر و تصنیف سے زندگی اور حوصلہ ملا، وقت کے تقاضوں کی رعایت کر کے لکھنا ان کی کتاب زندگی کا روشن اور تابناک باب ہے۔ ان کی کتاب ''اسلام کیا ہے؟'' عہد ابتلاء کی زندۂ جاوید اور انقلابی نشانی ہے۔ ۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی زندگی وبال دوش بنی ہوئی تھی۔ اسلام دشمن تحریکات ایک ایک کر کے خرمن اسلام پر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ مسلمان سہاروں سے محروم ملک کے گوشے گوشے میں اپنے وجود کی طرف سے فکر مند تھے۔ اسلام دشمن طاقتوں نے طے کر رکھا تھا کہ ہندوستان کو اسپین بنا کر رہیں گے۔ ایسے شہر آشوب ماحول میں مولاناؒ کے قلم حقیقت نگار نے حقائق و محاسن سے پردہ اٹھایا اور پوری عزیمت کے ساتھ عصبیت و تنگ نظری میں گرفتار غیر مسلم صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ یہ کتاب مسلمانوں کے ایمان و یقین اور خود اعتمادی کا ذریعہ تو بنی ہی، غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کی راہ بھی ہموار ہوئی، غیر مسلم اردو داں اسکالروں نے اسے شوق کی نگاہ سے پڑھا، متأثر ہوئے، رنجش، تلخی اور غلط فہمی بھی کم ہوئی اور بڑی حد تک فکر و نظر کی اصلاح ہوئی، ان حالات کو برپا کرنے میں مولانا کے اخلاص کو خاص دخل حاصل ہے۔ یہ کتاب کئی زبانوں میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئی۔

مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انتہائی معرکۃ الآراء تصنیف جسکی تکمیل انھوں نے زندگی کی تقریباً چالیس بہاروں میں فرمائی ہے وہ حدیث کا بے مثال انتخاب اور اسکی دلنواز تشریح ''معارف الحدیث'' ہے جو تقریباً ۸ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اس حقیقت کیلئے شاہد عدل ہے کہ خدا نے ان کی عمر میں کسقدر برکت عطا فرمائی ہے۔ کتاب اردو زبان مین حدیث رسول ﷺ کی گراں بہا موسوعہ (انسائیکلوپیڈیا) ہے جسے ابن حجر کی فتح الباری، علامہ عینی کی عمدۃ

القاری، علامہ عثمانی کی فتح الملہم، مولانا زکریا رحمہم اللہ کی لامع الدراری کی صف میں پیش کیا جاسکتا ہے یہ کتابیں تو حدیث کا شغف رکھنے والوں کیلئے ہیں لیکن "معارف الحدیث" تو عوام اور خواص سب کے لیے یکساں بیش بہا سرمایہ ہے جس سے ایک زمانہ فیض یاب ہورہا ہے۔ کتاب میں جو مضامین درج ہیں وہ ایک انسان کی زندگی کے ہر شعبہ سے ہم آہنگ اور متعلق ہیں۔ مضامین انتہائی سہل، زبان میں بلا کی سادگی، تحریر میں غضب کی اپنائیت اور شیرینی سے مرحوم نے جس حدیث کی تشریح فرمائی ہے محو ہو کر اور اسمیں ڈوب کر لکھا ہے۔ کتاب حدیث کا درس دینے والوں اور برکات رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مجلسوں کو معمور رکھنے کے لئے بیش بہا علمی اور حدیثی اثاثہ ہے مولانا نے اس کتاب کے ذریعہ انسانی دل ودماغ کو متأثر کرنے اور دعوت عمل دینے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ ہم جیسے نیاز مند بھی ایسی مناسبتوں کیلئے کتاب کو بغور دیکھتے اور استفادہ کرتے ہیں بلکہ مختلف موضوعات پر عوام کیلئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ کتاب کے بہت سے مخصوص ابواب، مختلف دینی مدارس میں نصاب میں شامل ہیں۔ کتاب کی ا[illegible]
سے ہوتا ہے کہ خود دارالعلوم ندوۃالعلماء میں عصر کی نماز کے بعد اس [illegible]
میں ندوہ کے تمام اساتذہ، طلبہ اور بہ نفسِ نفیس حضرت مولانا سید ابو[illegible]
تشریف فرما ہوتے ہیں، حدیث کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے یہ کتاب اکسیر [illegible]
مخاطب کی ضیافت طبع اور اثر آفرینی کیلئے یکسو ہو کر اپنی سی مبارک کو [illegible]
کتاب چونکہ خدمت کے طور پر اخلاص وللّٰہیت سے لکھی گئی ہے اس لئے اس کا معنوی اثر سننے اور پڑھنے والے کے دل میں چھپ چھپ کر جگہ بنالیتا ہے اور بلا کسی تاخیر کے دل میں جذبۂ عمل بیدار ہوتا ہے۔ خدا مولانا مرحوم کو جزاء خیر عطا فرمائے اور کتاب ان کی مغفرت کا ذریعہ ہو۔ صحاح حدیثوں کا یہ مجموعہ ہر طرح سے لائق مطالعہ ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب "برکات رمضان" ہے، کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن رمضان روزوں سے متعلق حدیثوں کی حکیمانہ تشریح کی گئی ہے۔ جس کے مطالعہ سے مکمل شرح صدر ہوتا ہے اور دل میں کوئی شک وشبہہ نہیں رہتا، روزوں سے متعلق یہ کتاب رموز، نکات، حقائق، اشارات اور نت نئے معنی کی بہترین اور دلنواز تشریح ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے دل ودماغ پر یہ تاثر ہوتا ہے ؎

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت، کیا ادا کیا

شروع کرنے کے بعد قاری ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ مرحوم نے روایات کے مضامین کو سمجھانے کے لئے حالات کا سہارا لیا ہے جسے پڑھ کر طبیعت مچل جاتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد بلاشبہہ دل سے دعا نکلتی ہے۔ ع

جزاک اللہ چشم باز کردی

اسکے علاوہ ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ، حج کیسے کریں، مسنون دعائیں، نماز کی حقیقت، الفرقان کا حضرت مجدد الف ثانی نمبر، حضرت جی نمبر، شیخ الحدیث مولانا زکریا نمبر، شاہ ولی اللہ نمبر، جیسی کوششیں مولانا کے اشہب خامہ کا شاہکار ہیں جس پر اظہار خیال کرنے کیلئے دفتر بھی ناکافی ہوگا۔ یہ کتابیں مولانا کے کمال علم اور تبحر معرفت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتی ہیں۔ درحقیقت امت پر ہونے والے احسان عظیم کا تو خالق کائنات ہی بدلہ دے گا ہم تو صرف مرحوم کے لئے رفع درجات اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ آمین

مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قلم بزاروں، جہاں دیدہ، تصنع سے پاک، عام فہم اور سادہ ہوتا ہے۔ قدرت نے انہیں مشکل ترین مضامین کو آسان زبان میں پیش کرنے کا بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ زبان ایسی میٹھی اور اپنائیت لئے ہوئے کہ ایک معمولی پڑھا لکھا قصباتی بھی خوب محظوظ ہوتا ہے۔ سجع اور قافیہ آرائی سے پیدا ہونے والی غرابت اور تعقید (گراوٹ) سے ان کی تحریر پاک تھی نازک ترین موقعہ پر بھی مرحوم نے مغلوب الغضب صحافی اور اہل قلم کی طرح کوئی بات تحریر نہیں فرمائی، رکیک جذبات، یاوہ گوئی سے مولانا کی تحریر ڈھلی ہوئی تھی۔ ان کی تصنیفات کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ کہ وہ زمانے کے تقاضوں اور لوگوں کی نفسیات سے واقف تھے، ان کی آخری تصنیف جو ان کے وصال کے بعد شائع ہوئی ۸۰ سالہ انقلابی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ آپ بیتی بھی ہے جگ بیتی بھی۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد تاثر ہوتا ہے کہ ہم بھی معرکۂ حیات میں مولانا کے ساتھ مجاہدات کی منزلیں طے کر رہے ہیں، کتاب پڑھنے والے کیلئے زندگی کی تاریک اور پرپیچ راہوں میں قبلہ نما اور مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی کے تجربات اور نشیب و فراز کی مرحوم نے ایسی دل نشیں اور دلنواز تشریح کی ہے کہ مقصد کیلئے سفر کرنے والوں کا دل و دماغ روشن ہو جائے، تحریکات کا انقلابی اقدام، شخصیات کا جلوہ آفریں تذکرہ اس انداز سے فرمایا ہے کہ دل یقین کرتا ہے کہ وہبی اور لدنی اوصاف ہیں جو اخلاص کی بنیاد پر کریم آقا کی طرف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ مولانا نے جابجا اس کا اعتراف بھی

کیا ہے، کتاب اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتی ہے کہ گدڑی میں چھپے ہوئے لعل کی دریافت کیسے کی جائے اور کمال کی شناخت کیسے کی جائے۔ بزرگوں سے مراسم اور رسم و راہ کو بھی مولانا نے خداوند عالم کی نعمت غیر مترقبہ بتایا ہے۔ اس طرح ان کمالات کی وجہ سے یہ کتاب نئی نسل کیلئے بھی اپنی علمی، عملی، روحانی اور ایمانی تربیت کا پیش بہا سرمایہ ہے۔ کتاب حشو و زوائد سے پاک ہے۔ مولانا نے انہی حقائق کا تذکرہ فرمایا ہے جو سیرت، شخصیت اور تربیت سازی کا بڑا موثر ذریعہ ہیں۔ لوگوں کو یہ کتاب اسی جذبہ سے پڑھنا بھی چاہیے تاکہ یہ اوصاف خفیہ راہوں سے قلب و دماغ میں اپنی جگہ بنا سکیں۔

یہ کتاب مولانا کی زندگی کی سرگذشت اور آپ بیتی ہے جو بڑا نازک فریضہ ہے جس میں قدم قدم پر اپنی انا میں کھو جانے کا اندیشہ ہے لیکن مولانا نے اپنی زندگی کے احوال و کوائف کی اس انداز سے عکاسی فرمائی ہے کہ دور دور تک عجب اور خود پسندی کا شائبہ بھی نہیں بلکہ خدا کی عظمت و کبریائی کا احساس اور اپنی بے بضاعتی اور کم سوادی کا اعتراف ہے۔

خود پسندی کے لئے گرز کا کام کرتی ہے۔ کتاب کا نام "تحدیث نعمت"

اس سے بھی خاکساری، کسر نفسی اور تواضع مترشح ہے۔ ہم نے آپ

اس میں کہیں نہ کہیں خود پسندی اور خود ستائی کا رنگ جھلک پڑتا ہے

بن جاتی ہے۔ مگر یہاں سطر سطر تواضع کا مرقع اور سادگی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

دل کی اس خطرناک بیماری کا علاج بھی ہے۔ انشاء اللہ پڑھنے والے بہت سے لوہر پارے اور جواہر پارے پائیں گے۔ خدا مولانا کو جزاء خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے سب کیلئے فکر و عمل کی شاہ راہ تعمیر کر دی ہے۔

مولانا تو اب خدا کے حضور پہنچ گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا لیکن یہ آرزو دل میں لیکر گئے کہ اگر زندگی وفا کرتی اور صحت ساتھ دیتی تو قرطاس و قلم سے کچھ اور خدمت کرتا مگر خدا کی ان بوجھی مشیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تقریباً سو سال زبان و بیان اور قرطاس و قلم سے خدمت کرنے والا مسافر علامہ وحید الدین بیخود دہلوی کی زبان میں یہ کہتا ہوا رخصت ہوا ؎

اجل خدا کیلئے صرف دو گھڑی رک جا
یہ مانگتے ہیں دعا میری زندگی کیلئے

فیصلۂ قضاو قدر غالب آیا اور عمر بھر کا تھکا ہوا مسافر اپنی آخری آرام گاہ عیش باغ لکھنو میں آسودۂ خواب ہے۔ خدا مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین ☆☆

مولانا محمد زکریا سنبھلی

استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

محدّث کبیر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

اور آپ کی شہرۂ آفاق کتاب "معارف الحدیث"

عمِ محترم حضرت مولانا نعمانیؒ کی پوری زندگی دین اور
گذری۔ اور خدمت دین کا یہ سلسلہ اتنا نوع بہ نوع اور مختلف الجہات
لوگوں کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل بہر حال ہے۔ عملی زندگی کے ابتد
کامیاب مناظر بلکہ رئیس المناظرین تھے۔ اسی طرح کچھ وقت کے لئے وہ جماعت اسلامی کے ایک نہایت سرگرم رکن بلکہ اس کے مؤسسین میں نظر آتے رہے ہیں۔ پھر حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دینی دعوت میں (جسے عرف میں تبلیغی جماعت کہا جاتا ہے) شرکت وانہماک اور اُس کے لئے ہر طرح کی غیر معمولی قربانیوں کا دور چلا۔ اسکے علاوہ دوسرے دینی کاموں سے وابستگی اور اُن کے لئے دورے اور اسفار بھی جزو زندگی ہی رہے۔ اور ان سب کاموں کے ساتھ ماہنامہ "الفرقان" کی ادارت کی ذمہ داری نیز مختلف موضوعات پر پے بہ پے کتابوں کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مزید بر آں زندگی کے اکثر حصہ میں وہ ہمیں ضروری قومی اور ملی کاموں میں بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ایسی ایک شخصیت کے لئے جس کے عملی میدان اتنے مختلف الجہات ہوں یہ امکان کہ وہ ایک عظیم اور بلند پایہ محدث بھی ثابت ہو ذرا کم ہی ہوتا ہے لیکن یہ امکان کبھی کبھی وقوع پذیر بھی بہر حال ہوتا ہے۔ اور حضرت مولانا مرحوم کا معاملہ الحمد للہ ایسا ہی ہے۔ وہ ان تمام مذکورہ مشاغل کے ساتھ ایک عظیم وکبیر محدث بھی تھے۔
اللہ تعالیٰ نے انہیں تحصیل علم ودین کے ایسے مواقع عطا فرمائے تھے جسے اس کا

خاص الخاص فضل ہی کہا جائیگا۔ وہ ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے خصوصاً ان کے والد باوجود تاجر اور زمیندار ہونے کے۔ دینی اور دُنیوی معاملات میں نہایت خدا ترس، عبادت گذار اور صوفی صافی بزرگ تھے۔ پھر انہیں رسمی طالب علمی کے پورے زمانہ میں بہت ہی دین دار اور بلند پایہ اساتذہ میسر آئے۔ جن کا اثر آپکی سیرت و کردار اور علمی و دینی مزاج پر پڑنا ناگزیر تھا۔ حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ جو آپ کے ہم وطن، قریبی عزیز اور حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ رشید، اور اپنے وقت کے اصحاب درس اور اہل اللہ علماء میں شمار ہوتے تھے، حضرت مرحوم کے ابتدائی استاذ اور اتالیق تھے دار العلوم دیوبند کی طالب علمی کا زمانہ شروع ہوا تو اس وقت دار العلوم دیوبند میں ایسے اساتذہ تشریف فرما تھے کہ علم کے ساتھ تعلق مع اللہ میں شاید جس کی مثال سارے عالم اسلام میں بھی ملنی مشکل ہو ان حضرات کے سر خیل حضرت مولانا علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ تھے جو اپنے وقت کے حافظ ابن حجر اور علامہ عینی تھے۔ ان کے دیکھنے والوں اور قریبی واقفیت رکھنے والوں کا خیال ہے کہ نہ انکے دیکھنے والوں نے انکی مثال دیکھی نہ خود علامہ کشمیری نے اپنی نظیر دیکھی تھی۔ ایسے اساتذہ کرام سے پڑھنے کا شرف مولاناؒ کو نصیب ہوا۔ علاوہ ازیں تحصیل علم دین کیلئے جو دیگر اسباب و ذرائع ہیں اللہ تعالیٰ نے انکا بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ والدین کا اخلاص انکی دعائیں رزق حلال پھر طالب علم (حضرت مولانا نعمانی) کا اخلاص نیت اور اپنے مقصد میں انہماک اور اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ غیر معمولی حافظہ اور ذہانت یہ سب چیزیں تھیں جن کو ذالك فضلُ اللہ یُؤتیه من یّشاءُ واللہُ ذُو الفضلِ العظیم کا مصداق ہی کہا جائے گا۔

مولاناؒ نے دیوبند کے اساتذہ سے اکتساب فیض کیا اور ان کے بحر علم سے خوب خوب سیراب ہوئے۔ خاص کر حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے ساتھ خصوصی عقیدت نے آپ کو بہت فائدہ پہونچایا۔ انھیں حضرت شاہ صاحب کے درس کی باتیں اس طرح یاد تھیں جیسے یہ کل کی باتیں ہوں۔

۱۹۷۶ء میں احقر کا تقرر دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت مدرس ہوا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے ترمذی شریف پڑھانے کے لئے دی گئی۔ جتنی محنت و مطالعہ خود کر سکتا تھا کرتا تھا لیکن بہت سی جگہیں ایسی رہ جاتی تھیں جن میں تشنگی باقی رہتی۔ ایسے مقامات کے حل اور اپنی تشفی کے لئے عم محترم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنا اشکال عرض کرتا تھا۔ آپ کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ بات سنتے ہی مسئلہ کی پوری وضاحت فرمادیتے۔ اکثر انداز یہ ہوتا تھا کہ ”بھئی حضرت

شاہ صاحبؒ تو اس بات کو اس طرح کہتے تھے"۔ انداز بیان اتنا سادہ ہوتا کہ مشکل سے مشکل مسئلہ نہایت سہل ہو جاتا۔ حضرت شاہ صاحب کے حوالہ سے بعض ایسی باتیں آپ ذکر کرتے تھے جن کا احقر کو کسی شرح میں ذکر نہیں ملتا تھا۔ ایسی باتیں کافی ہیں لیکن یہاں زیادہ موقع نہیں، صرف ایک بات ذکر کرتا ہوں تاکہ ایک خاص علمی امانت محفوظ ہو جائے، اور ساتھ ہی یہ اندازہ بھی کیا جاسکے کہ حضرت مرحوم نے شاہ صاحب سے کس درجے کا استفادہ کیا تھا اور کس حد تک آپ کے افادات کو محفوظ رکھا تھا۔

ترمذی شریف کے آخر میں امام ترمذیؒ کا ایک مختصر سا رسالہ "کتاب العلل" کے نام سے ہے جو غالباً عام طور پر پڑھایا نہیں جاتا احقر کو تو اسکا پڑھنا یاد نہیں۔ لیکن یہاں دار العلوم ندوۃ العلماء میں جب اس کو پڑھانے کا موقع آیا تو ایک جگہ ایسی آئی کہ کسی طرح بات نہ بنتی تھی۔ وہاں پر بات یہ چل رہی تھی کہ بعض محدثین نے بعض جلیل القدر راویان حدیث کو ان کی جلالت شان کے باوجود ضعیف قرار دیا ہے۔ اور یہ سبب ضعف اتنا خفی ت
ہے اس کی مثال کے طور پر امام ترمذی نے حضرت علی بن المدینی (۱)
نے اپنے استاذ یحیٰ بن سعید القطان سے (۲) محمد بن عمرو بن علقمہ (۳)
کہ وہ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، تو حضرت استاذ (یحیٰ بن سعید)۔
العفو او تشدد؟" یعنی جرح و تعدیل کے بارے میں تمہارے یہاں کچھ عفو و درگذر
یا تمہارا معیار اس کے بارے میں بہت سخت ہے؟۔ علی بن المدینی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ میرے یہاں شدت ہے اس پر حضرت یحیٰ بن سعید نے فرمایا تو پھر محمد بن عمرو تمہارے کام کے نہیں ہیں۔ یعنی تمہارے معیار کی رُو سے وہ مجروح ہونگے۔ ثقہ نہیں مانے جائیں گے۔ اور سبب جرح یہ بتلایا کہ وہ ابو سلمہ (۴) اور یحیٰ بن عبد الرحمٰن بن حاطب (۵) کو اپنا "شیخ" بتلاتے ہیں۔ یہ وہ جگہ تھی جو کسی طرح حل نہیں ہوتی تھی اور وجہ اشکال یہ تھی کہ یہ دونوں حضرات جن کو محمد بن عمرو اپنا شیخ (استاذ) بتاتے ہیں اگر واقعی وہ دونوں ان کے شیخ ہیں تو پھر ایسا کہنے سے محمد بن عمرو کے مجروح ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اور اگر فی الواقع یہ دونوں حضرات ان کے

---

(۱) اپنے زمانے کے بلند پایہ محدثین میں ہیں۔ امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ بصرہ کے باشندے تھے ۲۳۴ھ میں وفات ہوئی۔

(۲) یہ بھی بصری ہیں اور علی بن المدینی کے استاد، محدثین میں نہایت بلند مقام ہے وفات ۱۹۸ھ

(۳) مدینہ طیبہ کے راویان حدیث میں سے ہیں۔ ۱۴۵ھ سال وفات ہے۔

(۴-۵) یہ دونوں حضرات بھی مدنی ہیں۔ سال وفات علی الترتیب ۹۴ھ اور ۱۰۴ھ ہے۔

استاذ نہیں تو محمد بن عمرو کا انکو اپنا شیخ کہنا کھلی غلط بیانی ہے۔ اور اس شکل میں تو وہ کسی پست سے پست معیار والے محدث کے معیار پر بھی ثقہ نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ سخت معیار کی قید کا کیا سوال؟ الغرض مجھے کوشش کے باوجود کہیں اس اشکال کا حل نہیں مل پایا کہ آخر اس میں باریک اور خفی بات کیا ہے؟

میں عم محترم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا اشکال وضاحت کے ساتھ عرض کرنا چاہا، ابھی میں نے اپنے بات شروع ہی کی تھی کہ آپ مسکرائے اور فرمایا کہ جس وقت میں امروہہ میں پڑھاتا تھا یعنی (۳۱۔۱۹۳۰ء) اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ بیمار ہو کر ڈابھیل سے دیوبند واپس آچکے تھے۔ اور وہیں قیام تھا۔ میں ہر ایک دو ماہ کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اپنے اور مدرسہ کے دیگر اساتذہ کے کچھ علمی سوالات بھی لے جاتا اور حضرت سے ان کا جواب لیکر آتا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں کے ترمذی شریف کے استاذ نے میرے ذریعہ یہی اشکال حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں بھیجا۔ میں نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر جب یہ اشکال کیا تو حضرت شاہ صاحبؒ مسکرائے اور فرمایا لوگ اللہ جانے کس طرح پڑھاتے ہیں اور کس طرح اس جگہ سے گذر جاتے ہیں۔ آپ دوسرے شخص ہیں جنھوں نے یہ اشکال کیا ہے۔ پھر اشکال کا جواب دیا اور فرمایا۔ محدثین کی اصطلاح میں "شیخ" کا لفظ اُسی اُستاذ کے لئے بولا جاتا ہے جس کی باقاعدہ شاگردی کی گئی ہو۔ اور بکثرت روایات اُس سے لی ہوں۔ اگر صرف چند روایات لینے کی حد تک استاد شاگردی کا رشتہ قائم ہوا ہو تو ایسے استاد کیلئے شیخ کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی "شیخ" کا لفظ استعمال کریگا تو اگر چہ یہ جھوٹ تو نہ ہوگا لیکن سننے والوں کیلئے غلط فہمی میں پڑنے کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے محمد بن عمرو کا یہ بیان کہ ابو سلمہ اور یحیٰ بن عبد الرحمٰن میرے شیخ ہیں جھوٹ تو نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ان دونوں سے بعض روایات حاصل کی ہیں لیکن دوسروں کے لئے غلط فہمی کا ذریعہ ہے کہ یہ باقاعدہ استاد شاگرد ہیں۔ اور یہ ایک بلند مقام محدث کی شانِ عالی کے خلاف ہے۔ لہذا جن حضرات کے یہاں جرح و تعدیل کے مسئلہ میں کچھ عفو و درگذر کی گنجائش ہے ان کے نزدیک تو محمد بن عمرو ثقہ ہی کہے جائیں گے۔ اس لئے کہ انھوں نے کوئی جھوٹ نہیں کہا لیکن جو حضرات زیادہ محتاط ہیں اور ان کا معیار اس سلسلہ میں زیادہ سخت ہے ان کے یہاں محمد بن عمرو مجروح قرار دیئے جائیں گے۔ مسئلہ بالکل حل ہو گیا اور بات سمجھ میں آگئی۔ الغرض علمی مسائل میں مشکل سے مشکل مقامات پر حضرت مرحوم کے یہاں نہایت تشفی بخش جوابات ہوتے تھے۔

معارف الحدیث

آپ کی جملہ تصانیف انتہائی سہل اور عام فہم زبان میں ہونے کے باوجود آپ کے رسوخ فی العلم اور قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ سے گہری واقفیت کی واضح دلیل ہیں لیکن معارف الحدیث تو چونکہ علم حدیث ہی کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے اس لئے اس میں آپ کے علم حدیث کا مقام جیسا واضح ہوتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ تصنیف کا مقصد جیسا کہ اسکی جلد اول کے دیباچہ میں ذکر فرمایا گیا ہے اِس زمانہ کے خاص حالات و ضروریات کا لحاظ رکھ کر اردو میں حدیث نبوی کی ایک ایسی خدمت کرنا ہے جس کے ذریعے عام تعلیم یافتہ مسلمانوں تک رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و ہدایت پہنچے اور انکے لئے اتباع نبوی کی راہ ہموار ہو نیز بعض گمراہ فرقوں نے احادیث کے معانی و مطالب میں جو غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں یا آج کل کے حالات میں جب کہ مغربی علوم و نظریات کی ترقی اور اشاعت نے پوری انسانی دنیا کے طرز فکر
زیادہ متاثر کر دیا ہے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں جن غلط فہمیو
اُن کا سد باب ہو سکے۔ اس مقصد کے ماتحت جہاں اس کتاب کا عام فہم
میں علمی شان کا ظہور بھی ناگزیر تھا۔ اور یہ بات کہ علمی گفتگو بھی با
کسی بڑی سے بڑی حدیث کی کتاب کی شرح کرنے سے بھی زیادہ مشکل اور محنت
جس کا حق حضرت مولانا نعمانی جیسی شخصیت ہی ادا کر سکتی تھی۔ جس کا علم بھی وسیع و عمیق ہو، علم کے ساتھ دین میں بھی جس کا قدم راسخ ہو، جس کو قلم پر بھی اعلیٰ درجے کی قدرت ہو اور اپنے زمانے کے حالات اور مزاج سے واقفیت کے ساتھ فہم و فراست کی دولت سے بھی مالا مال ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس انتہائی اہم اور بروقت کام کیلئے اپنے فضل و کرم سے ایسی ہی شخصیت کا انتخاب فرمایا۔ اور یہ سلسلۂ معارف الحدیث وجود میں آ گیا۔ فللہ الحمد۔

معارف الحدیث کے مضامین

معارف الحدیث کی اب تک سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں، آٹھویں جلد بھی ان شاء اللہ جلد ہی طبع ہونے والی ہے۔ پہلے جلد میں عقائد کا بیان ہے جس میں حقیقت ایمان و اسلام، اسلامی اعمال، تقدیر اور قیامت اور اُس کے مابعد جنت، دوزخ سے متعلق احادیث کا بیان ہے۔ شروع میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ایک غیر معمولی، نہایت مفید اور علمی مقدمہ حجیت حدیث کے موضوع پر ہے جو خود ایک بیش قیمت کتاب

یار سالہ کا درجہ رکھتا ہے۔

دوسری جلد میں کتاب الرقاق اور کتاب الاخلاق سے متعلق احادیث ہیں۔ رقاق سے مراد رسول اللہ ﷺ کے وہ ارشادات، وہ خطبات و مواعظ اور آپ کی زندگی کے وہ حالات وواقعات ہیں جن کے پڑھنے اور سننے سے دل میں رقت و خشیت اور گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ رقاق کی احادیث ہی میں زہد کی احادیث بھی ذکر کی گئی ہیں جن کے پڑھنے سے دنیا کی طرف سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

کتاب الاخلاق میں پہلے وہ احادیث درج ہوئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق کا دین اسلام میں کتنا بلند مقام ہے۔ اور بد اخلاقی اللہ و رسول کے نزدیک کتنا بڑا جرم ہے۔ بعد ازاں اچھے اخلاق کے مختلف شعبوں مثلاً سخاوت، احسان، ایثار و قربانی، باہمی انس و محبت، دینی اخوت، نرم مزاجی، خوش کلامی، صدق وامانت، تواضع خاکساری، شرم و حیا، صبر و شکر اور اخلاص و للہیت سے متعلق احادیث مذکور ہیں اور ان کے مقابلے میں بداخلاقی کے مختلف شعبوں کی مذمت اور ان کے برے انجام سے ڈرانے والی حدیثیں بھی اسی انداز سے درج ہوئی ہیں۔ کتاب کی تیسری جلد کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوۃ پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں خود مولانا کے قلم سے بعنوان دیباچہ علم حدیث کی تاریخ پر ایک بہترین اور بیش قیمت مگر مختصر مضمون ہے۔ حدیث شریف پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے اسکا مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔

کتاب الطہارۃ میں اولاً وہ احادیث ذکر فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں طہارت کس درجہ محبوب اور ناپاکی کس درجہ مبغوض ہے۔ پھر طہارت کی جملہ اقسام مثلاً استنجاء، وضوء، غسل، تیمم وغیرہ سے متعلق احادیث ہیں جن سے ان اعمال کا طریقہ اور ان کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے۔

کتاب الصلوۃ میں اولاً نماز کی اہمیت پر ایک نہایت جامع اور مفید مضمون ہے اس کے بعد اسی مضمون کی احادیث ہیں پھر اوقات صلوۃ، اذان، نماز باجماعت، مسجد کی اہمیت، نماز کے ارکان واعمال کا صحیح طریقہ، پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ دوسری نمازوں مثلاً جمعہ، عیدین کی نماز، سورج و چاند گرہن اور خشک سالی کی نماز اور نماز جنازہ وغیرہ سے متعلق احادیث ہیں۔ جس میں احکامات کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کی کیفیات کا بھی بیان آتا ہے۔

کتاب کی چوتھی جلد کتاب الزکوۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج پر مشتمل ہے۔ کتاب کی جلد کے شروع میں بھی حضرت مولانا کے قلم سے دیباچہ ہے جس میں اس کتاب کا تعارف

اور اُس کی کچھ خصوصیات کا ذکر ہے۔ کتاب الزکوۃ کے شروع میں مولاناؒ کا ایک تمہیدی مضمون دین میں ”زکوۃ کی اہمیت اور اس کا مقام“ کے عنوان سے ہے جس میں زکوۃ کی اہمیت اور اس کے مقام کے بیان کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ مانعین زکوۃ سے قتال و جہاد کرنے پر صحابہ کا اجماع امت مسلمہ کا پہلا اجماع ہے۔ پھر زکوۃ کی اہمیت سے متعلق دیگر احادیث اور اس کے بعد زکوٰۃ سے متعلق احکامات کی تفصیلی روایات ہیں۔ نیز نفلی صدقات کی اہمیت اور اُن پر اجر و ثواب کے وعدوں والی احادیث بھی آخر میں درج کی گئی ہیں۔

کتاب الصوم کے شروع میں ”اسلام کے ارکان اربعہ میں روزہ کی خاص نوعیت“ کے عنوان سے ایک مضمون ہے جس میں روزہ کی اس خاص تاثیر کا تذکرہ ہے کہ روزہ کے ذریعہ انسان میں صفت تقوی پیدا ہوتی ہے جو ایک ملکوتی صفت ہے اور صفت حیوانیت یا صفت بہیمیت پر قابو حاصل کرنے میں روزہ بڑا معین و مددگار ہوتا ہے۔ پھر رمضان المبارک اور اُس کے روزوں کے فضائل سے متعلق احادیث ہیں۔ احکامات کی بھی روایات ہیں اور ا
تراویح، نفلی روزوں سے متعلق احادیث ذکر فرمائی ہیں۔

کتاب الحج کے شروع میں ایک مختصر سا مضمون ”حج کیا ہے؟
میں حج کی حقیقت۔ کہ وہ اللہ کے دربار کی حاضری اور حضرت ابراہیمؑ
اور طور طریقوں کی نقل کر کے اُن کے سلسلہ اور مسلک سے اپنی وابستگی اور
اور اپنے کو ان کے رنگ میں رنگنے کا نام ہے۔ تفصیل سے اجاگر کی گئی ہے۔ اس کے بعد حج کی فرضیت، اسکی فضیلت اور حج نہ کرنے والوں کے لئے وعید کی احادیث ذکر کی گئی ہیں۔ اس کے بعد از اول تا آخر حج کے احکامات سے متعلق احادیث کچھ اس طرح ذکر فرمائی ہیں کہ اگر پڑھنے والا ذرا توجہ سے پڑھ لے تو حج کا پورا نقشہ ذہن نشین ہو جائے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حج جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے کے تذکرہ کی احادیث ہیں۔ آخر میں حرمین شریفین کے فضائل اور روضہ اطہر کی زیارت کی روایات ہیں۔

معارف الحدیث کی پانچویں جلد کا عنوان ہے ”کتاب الاذکار والدعوات“ اس جلد کا مقدمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔ جس میں دعا خصوصاً رسول اللہ ﷺ سے مروی و منقول دعاؤں کے بارے میں بہترین کلام فرمایا گیا ہے۔ اس مقدمہ کے چند جملے پڑھ لیجئے اور خود اندازہ کر لیجئے کہ پورا مقدمہ کس درجے کی افادیت کا حامل ہوگا۔ مولانا مدظلہ لکھتے ہیں.

"آپ ﷺ نے انسانیت کے خزانے کو اور دنیا کے ادب کو دعاؤں کے ان جواہرات سے مالامال کیا جن کی نظیر اپنی آبداری و درخشانی میں صحف سماوی کے بعد مل نہیں سکتی۔ آپ نے اپنے مالک سے ان الفاظ میں دعا کی جن سے زیادہ موثر اور بلیغ الفاظ، جن سے زیادہ موزوں و مناسب الفاظ انسان لا نہیں سکتا۔ یہ دعائیں مستقل معجزات اور دلائل نبوت ہیں۔ ان کے الفاظ تک شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایک پیغمبر ہی کی زبان سے نکلے ہیں۔ ان میں نبوت کا نور ہے۔ پیغمبر کا یقین ہے۔ عبد کامل کا نیاز ہے۔ محبوب رب العالمین کا اعتماد و ناز ہے۔ فطرت نبوت کی معصومیت اور سادگی ہے۔ دل دردمند و قلب مضطر کی بے تکلفی و بے ساختگی ہے۔ صاحب غرض و حاجت مند کا اصرار و اضطرار بھی ہے اور بارگاہ الوہیت کے ادب شناس کی احتیاط بھی، دل کی جراحت اور درد کی کسک بھی ہے اور چارہ ساز کی چارہ سازی اور دلنوازی کا یقین و سرور بھی، درد کا اظہار بھی اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ "درد ما را دوای و درمانی ہنوز۔"

حضرت مولانا علی میاں کے مقدمہ کے بعد حضرت مولانا نعمانی صاحبؒ کے قلم سے ایک مختصر دیباچہ بھی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں کے ایک خاص پہلو کو بہت اجاگر کیا ہے کہ آپ کی دعائیں آپؐ کی نبوت کی دلیل ہیں جن کو غیر مسلموں میں دعوت اسلام کے لئے بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کے اطمینان قلب کا بھی اُن میں بڑا سامان ہے۔

اس جلد میں اولاً ذکر اللہ کی فضیلت، اسکی عظمت اور برکات سے متعلق احادیث ہیں پھر بعض خاص اذکار کی فضیلت سے متعلق روایات ہیں۔ پھر دعا کی حقیقت، اسکے آداب اور اس سے متعلق ہدایات پر مشتمل روایات ذکر کی گئی ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دعاؤں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جن میں آپ کی ہر طرح کی دعاؤں کا ذکر ہے۔ آخر میں صلوٰۃ و سلام سے متعلق روایات ہیں اور درود شریف کے مختلف الفاظ والی روایات کا بیان ہے۔

جلد ششم میں معاشرت یعنی آپسی تعلقات اور گھریلو زندگی نیز اپنے قرب و جوار کے اور مختلف حیثیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے حقوق سے متعلق احادیث مذکور ہیں۔ اس کے دیباچہ میں حضرت مولاناؒ نے اسلام میں معاشرتی احکام کی اہمیت اور حقوق العباد کے ادا کرنے کی تاکید اور اس کی ادائیگی میں کوتاہی پر اللہ کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب کی وعیدوں پر ایک نہایت مفید کلام فرمایا ہے۔ معاشرتی حقوق کی ان احادیث کے ضمن میں حیوانوں اور جانوروں تک کے حقوق سے متعلق احادیث بھی ہیں۔ اس کے بعد "آداب ملاقات" اور "آداب مجلس" کے زیر عنوان سلام مصافحہ معانقہ، گھر میں داخل ہونے کے آداب اور مجلس

سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کا بیان ہے۔ آپسی گفتگو، ہنسی مذاق وغیرہ کے سلسلہ میں نیز چھینکنے اور جمہائی لینے کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی کیا ہدایات ہیں اس کا بھی ذکر ہے۔ اس کے بعد کھانے پینے اور لباس کے احکام و آداب سے متعلق احادیث ذکر کی ہیں جن کے ضمن میں ستر اور پردے سے متعلق احادیث بھی آجاتی ہیں۔

جلد ہفتم میں اولاً کتاب المعاشرۃ کا باقی حصہ (جو جلد ششم میں نہ آسکا تھا) یعنی نکاح و طلاق سے متعلق احادیث ہیں۔ اس کے بعد کتاب المعاملات یعنی خرید و فروخت سے متعلق احادیث ہیں۔ کتاب المعاملات کا دائرہ کافی وسیع ہے اس میں رزق حلال حاصل کرنے کی فضیلت (خواہ وہ تجارت کے ذریعہ ہو یا صنعت و حرفت اور زراعت کے ذریعہ ہو) سے متعلق احادیث بھی درج ہیں۔ پھر ناجائز طریقہ پر کمائے ہوئے مال کی نحوست کو بیان کرنے والی روایات ہیں۔ اس کے بعد ربا یعنی سود کی روایت کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد بیع و شراء کے احکامات متعلقہ روایات ہیں۔

اسی سلسلہ میں ہدیہ تحفہ دینے لینے کا ذکر اور اُسکی فضیلت کا بیا... اللہ، وصیت، نظام قضاء، نظام حکومت اور خلافت وامارت سے متعلق ا... ہیں۔

جلد ہشتم جو ابھی زیر طبع ہے کتاب العلم اور کتاب المناقب والفضائل وغیرہ سے متعلق احادیث پر مشتمل ہے۔ ابواب العلم کے علاوہ اس میں رسول اللہ ﷺ، آپؐ کے صحابہ کرامؓ، آپ کے اہل بیت (جن میں ازواج مطہرات، بنات طیبات اور آپ کے دونوں نواسوں) کے مناقب کا بیان ہے۔ اس کی طباعت کے بعد یہ کتاب مکمل ہو جائیگی۔ یہ کتاب اردو ہی نہیں غالباً دنیا کی کسی زبان میں بھی اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے۔

معارف الحدیث کا نہج اور طرز

جس زمانہ میں حضرتؒ نے اس کتاب کی تصنیف کا آغاز کیا تھا (یعنی بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کا آغاز) وہ زمانہ پوری دنیا میں مغربی علوم و نظریات کی ترقی اور بالادستی کا زمانہ تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ مذہب بیزاری اور اللہ و رسول کی باتوں پر بے اعتمادی تھا۔ اسی زمانہ میں فتنہ انکار حدیث بھی زوروں پر تھا۔ جس سے مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بہت متاثر نظر آرہا تھا اور اس کی وجہ سے اُن کا ایمان متزلزل اور دینی حقائق پر سے یقین اٹھتا جارہا تھا۔ اس لئے مصنف علیہ الرحمہ نے اس زمانہ کے حالات، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن و مزاج کو سامنے رکھ کر اپنی اس

کتاب کی تصنیف کا آغاز اس طرز پر کیا جس سے اولاً تو ایک مسلمان کو اللہ و رسول سے قلبی تعلق پیدا ہو، پھر قرآن و حدیث کے بیان کردہ حقائق پر یقین و اعتماد نصیب ہو جائے اور وہ قرآن و حدیث کے بیان کردہ حقائق کو حقائق سمجھنے لگے۔ محض تبرک کی چیزیں یا خدانخواستہ افسانوی باتیں نہ سمجھے۔ الحمد للہ حضرت مصنفؒ اپنی اس کوشش میں بہت کامیاب ہیں۔ ویسے ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

کتاب کا انداز یہ رکھا گیا ہے کہ اولاً ایک موضوع کی احادیث کا انتخاب فرما کر ان کو ایک عنوان کے تحت رکھتے ہیں۔ عام طور پر اس عنوان ہی سے احادیث مذکورہ کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ پھر احادیث کو اس ترتیب سے ذکر کرتے ہیں کہ محض یہ ترتیب ہی بعض اوقات مطلب کے سمجھنے اور اشکالات کے رفع ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ حدیث کا متن درج کرنے کے بعد اس کا اردو ترجمہ کرتے ہیں جس میں اصل مقصود، حدیث کے مفہوم و مدعا کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اسی لئے تحت اللفظ ترجمے کی یا لغوی تراکیب کی پابندی نہیں فرماتے۔ اس کے بعد "تشریح" کے عنوان سے حدیث کے مفہوم کی وضاحت فرماتے ہیں۔ جس میں نفس حدیث کی وضاحت کے ساتھ حدیث پر واقع ہونے والے کسی اشکال یا کسی دوسری حدیث سے اس کے بظاہر تعارض و تضاد کا جواب اور حل بھی ہوتا ہے۔ اور ایسی احادیث کے درمیان نہایت سہل تطبیق ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھی احادیث ذکر کرنے سے پہلے ایک تمہیدی اور مرکزی مضمون بیان فرماتے ہیں۔ جس میں آئندہ ذکر کی جانے والی احادیث کے مدعا و مقصد کا بیان نیز احادیث میں مذکور مسئلہ سے متعلق مختلف پہلوؤں پر کلام ہوتا ہے۔ یہ مضمون علم حدیث کے طلبہ بلکہ اساتذہ کے لئے بھی غیر معمولی اہم اور قیمتی شئ ہے۔ اس سے اس سلسلہ کی احادیث کا صحیح مفہوم سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں فن حدیث سے مناسبت اور اس کا صحیح ذوق جو عام طور پر حدیث کی کتابوں کی کئی کئی شرحیں پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہو پاتا نصیب ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کا صحیح اندازہ کتاب پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

خصوصیت اعتدال

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور دار العلوم دیوبند کے دیگر اساتذۂ حدیث کے ذوق و مزاج پھر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علوم و معارف سے ذہنی مناسبت اور زندگی بھر رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے شغف، کتب حدیث کا نہایت وسیع و عمیق مطالعہ اور اس کے ساتھ

ساتھ امت مسلمہ میں دینی دعوت کی فکر اور اس میں عملی انہماک یہ ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے حضرت مولاناؒ کے مزاج میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ جو پوری کتاب میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا کسی بھی مسئلہ میں خواہ وہ اعتقاد سے تعلق رکھنے والا ہو یا عام زندگی کے اعمال سے یا وہ عبادات کے مختلف فیہ مسائل میں ہی سے کیوں نہ ہو، جادۂ اعتدال سے کہیں ذرہ برابر بھی ہٹتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اصل حقیقت تو اس بات کی کتاب کے مطالعہ ہی سے سمجھ میں آئے گی۔ لیکن میں اس سلسلہ میں کچھ مثالیں بھی قارئین کے لیے ذکر کرتا ہوں کہ کچھ تو اندازہ ان مثالوں سے ہو ہی سکتا ہے۔

فقہی اختلافات کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان ائمہ کے تمام فقہی مسالک ایک درخت کی قدرتی شاخیں یا ایک بڑے دریا سے نکلنے والی نہریں ہیں، ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور ان میں کوئی تضاد اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا ہے کہ ہماری درسگاہوں میں اس معاملے کو اس طرح [illegible]
بعض اللہ کے بندے حدیث کے استاد ہونے کے باوجود حنفیت اور شا[illegible]
باطل کے اختلاف کا سا درجہ دیتے ہیں۔ حضرت مصنفؒ کے ذوق [illegible]
آپ کے ایک مکتوب کا کچھ حصہ نقل کرتا ہوں۔ جو [illegible] کے ایک
یاسین صاحب) کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھا گیا تھا جس میں [illegible]
میں معارف الحدیث کے ترجمہ کی اجازت چاہی تھی۔ ان صاحب کو ترجمے کی اجازت دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

> "میں نے اپنے نزدیک اُن احادیث کی تشریح میں مسلکی تعصب کی بات کی گنجائش نہیں لی ہے جن کا تعلق فقہی اختلافی مسائل سے ہے۔ ہاں یہ بات میرے پیش نظر ضرور رہی ہے کہ برصغیر ہند میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی غالب اکثریت حنفی المسلک ہے اس کو اپنے مسلک کے بارے میں بے اطمینانی نہ ہو۔ میں نے اس کو دینی مصلحت سمجھا [illegible] بہر حال اس صورت حال کا لحاظ کرتے ہوئے کہ سواحلی زبان بولنے والوں کی اکثریت شافعی المسلک ہے، کتاب الصلوۃ میں یا جہاں بھی معارف الحدیث میں فٹ نوٹ لکھنے کی ضرورت سمجھی جائے وہ ضرور لکھا جائے۔ میرے نزدیک یہ بھی دینی مصلحت ہے۔"

حضرت مصنف کے اعتدال و بے تعصبی بلکہ درحقیقت آپ کے اس ذوق و مزاج کی دلیل کہ کسی بھی شخص، خواہ وہ اپنے امام، امام ابو حنیفہؒ ہی کیوں نہ ہوں، کے تعلق کے مقابلہ میں

وواجبات ہیں وہ غیر اہم اور غیر ضروری ہیں۔ ایسا سمجھنا اور احادیث میں ایسی موشگافیاں پیدا کرنا فی الحقیقت سلامت فہم اور خوش مذاقی سے بہت دور ہے۔ حدیث کے طالب علم کو یہ اصول ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ رسول اللہ ﷺ امت کے ایک شفیق معلم اور شفیق مربی ہی۔ اور شفیق معلم کا طریقہ یہی ہوتا ہے اور یہی اس کے لئے صحیح بھی ہے کہ وہ جس موقع پر جس بات کی تلقین و تعلیم زیادہ مناسب سمجھتا ہے بس اس وقت اتنی بات بتلاتا ہے۔

گُر کی باتیں

اپنی اس کتاب "معارف الحدیث" میں جو اگرچہ اُردو زبان میں ہے، مولاناؒ نے بعض ایسے اصول بیان کردیئے ہیں جو فن حدیث کے اساتذہ کے لئے بھی بہت مفید ہوں گے۔ اور یہ اصول بالعموم حضرت مولانا انور شاہؒ یا اُن کے اساتذہ یا پھر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ہی بیان کردہ ہوتے ہیں۔ مثلاً حدیث من قال لاالہ الا اللہ دخل الجنۃ کی خاصی طویل تشریح کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ اس قسم کی آیات یا احادیث پر غور کرتے وقت ایک اصولی بات یہ ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ اس قسم کی بشارتوں میں متکلم کا مقصد اور مطمح نظر کسی عمل خیر کی ذاتی خاصیت اور اس کا اصل اثر بتلانا ہوتا ہے۔ قطع نظر اس سے اگر دوسرے اعمال کا تقاضہ اس کے خلاف ہو تو پھر انجام کیا ہوگا۔ اگر یہ چھوٹا سا نکتہ ملحوظ رکھا جائے تو وعدو وعید اور ترغیب و ترھیب کے سلسلہ کی صدہا حدیثوں کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی اور اس کی وجہ سے جو الجھن ہوتی ہے وہ انشاء اللہ نہ ہوگی۔

حضرات اساتذہ ایسی سلجھی ہوئی اور مختصر باتوں کو زیادہ اہمیت اپنے درس میں نہیں دیتے حالانکہ یہ اصول و ضوابط فہم حدیث اور اطمینان قلب کیلئے بہت مفید و معاون ہوتے ہیں۔ خصوصاً نئے ذھن کو مطمئن کرنے کیلئے تو یہ اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔

کتاب کا اصل مقصد چونکہ مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین اور آپ کے بیان کردہ دینی حقائق سے قریب کرنا اور انکے دل و دماغ میں ان حقائق پر یقین اور اطمینان پیدا کرانے کی کوشش کرنے کے علاوہ ان کو آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی ترغیب دینا بھی ہے۔ اس لئے کتاب میں جگہ جگہ دعوتی پہلو بھی ملتا ہے۔ مثلاً ہمسایوں اور پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ایسے ارشادات جن میں انکی حق تلفی کرنے والوں کو آپ ﷺ نے بار بار قسم کھا کر فرمایا کہ وہ مومن نہیں ہیں۔ ذکر کرنے اور انکی خاصی تشریح کرنے کے بعد حضرت مولاناؒ لکھتے ہیں ہم مسلمانوں کا اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اور عام بندگان خدا کے

ساتھ جو معاملہ اور برتاؤ ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات کی روشنی میں ذرا ہم اپنے ایمانوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آپ کی ان احادیث کی رو سے ہمارا مقام کیا ہے اور ہم کہاں ہیں۔ اسی طرح یہ حدیث شریف کہ ”آدمی کے اسلام کی خوبی اور اسکے کمال میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ فضول اور غیر مفید کاموں سے بچے“ ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ لایعنی اور بے حاصل چیزوں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کرتے ہیں وہ نادان نہیں جانتے کہ اللہ نے ان کو کتنا قیمتی بنایا ہے اور وہ اپنے کیسے بیش بہا خزانہ کو مٹی میں ملاتے ہیں۔ اس حقیقت کو جس نے سمجھ لیا بس وہی دانا اور عارف ہے۔

اسی طرح کتاب الزکوۃ کے سلسلہ میں بعض وہ روایات ذکر کر کے جن میں حتی الوسع سوالات سے منع فرمایا گیا ہے مولانا فرماتے ہیں افسوس جس پیغمبر کی یہ ہدایت اور یہ طرز عمل تھا اس کی امت میں پیشہ ور سائلوں اور گداگروں کا ایک طبقہ موجود ہے اور کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو عالم یا پیر بن کر معزز قسم کی گداگری کرتے ہیں، یہ لوگ سوال اور گداگر[illegible] اور دین فروشی کے بھی مجرم ہیں۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت جس کا ذکر مضمون میں پہلے بھ[illegible] بعض اہم علمی باتوں کو مولانا نے بڑے سہل انداز میں ذکر کر دیا ہے ا[illegible] لئے مزید ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے سلسلہ میں مولاناؒ فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے ہی قیام مکہ کے زمانہ میں ہی زکوۃ فرض ہو چکی تھی لیکن یہ حکم اجمالی تھا تفصیلات ۲ھ میں نازل ہوئی ہیں۔ لہذا جن مصنفین نے یہ لکھا ہے کہ زکوۃ ۲ھ میں فرض ہوئی اسکا مطلب یہ ہے کہ اس سے متعلق مسائل کی تفصیلات ۲ھ میں نازل ہوئی ہیں۔

یا اسی طرح ایک بہت ہی عمدہ بات روزہ سے متعلق ایک حدیث کی تشریح میں لکھی ہے۔ حدیث میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا ”عليك بالصوم فانه لا مثل له“ یعنی روزہ رکھا کرو اس جیسا کوئی عمل نہیں۔ مولانا کی تشریح کا حاصل یہ ہے کہ ہر نیک عمل کی ایک خاصیت ہوتی ہے جس میں کوئی دوسرا عمل اس کا سہیم و شریک نہیں ہوتا۔ روزہ کی وہ خاصیت نفس کو قابو میں رکھنا اور اسکی خواہشات کو دبانا ہے۔ پس اس خاصیت میں روزہ کا کوئی مثل نہیں۔ اس تشریح کے بعد حدیث کے جملہ فانه لا مثل له پر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

اس طرح ایک روایت میں سو آدمیوں کے قاتل کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے۔ اس کی

تشریح میں فرماتے ہیں یہ دراصل صرف ایک جزئی واقعہ کا بیان نہیں بلکہ اس پیرائے میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت و وسعت اور اس کے کمال کو بتلایا ہے۔

اسی طرح کی ایک بہت اہم علمی بات سجدہ تحیہ (سجدہ تعظیمی) کے عدم جواز کے بارے میں مولانا نے ایک حدیث کی تشریح میں تحریر فرمائی ہے۔ حدیث میں یہ ذکر ہے کہ آپ کو ایک اونٹ نے سجدہ کیا یہ دیکھ کر بعض صحابہ کرام نے اپنے لئے بھی یہ اجازت چاہی کہ ہم بھی آپ کو سجدہ کر لیا کریں۔ آپ نے منع فرمادیا۔

حضرتؒ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ صحابہ کرام کی اجازت طلبی سجدہ عبادت کے لئے تو ہو ہی نہیں سکتی۔ ظاہر بات کہ یہ اجازت مانگنا سجدہ تحیہ کے لئے ہی ہوگا۔ اور آپ نے اسے بھی منع فرمادیا۔ اسی طرح ایک حدیث سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کی بجائے مٹی یا بالو سے رگڑ کر صاف کر لئے مولانا فرماتے ہیں اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ کھانا کھا کر تولیہ یا کاغذ یا کسی بھی ایسی چیز سے ہاتھ صاف کئے جاسکتے ہیں۔ جن سے ہاتھوں کی صفائی ہو جائے۔ اور ایسا کرنا بھی سنت کے دائرہ میں ہی ہوگا۔

پوری کتاب اس طرح کی عالمانہ مگر نہایت سہل اور عام فہم باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور اپنے اصل مقصد میں بھی کہ مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے قرب بلکہ انس و محبت اور آپ اور آپ کے لائے ہوئے دین کی اتباع نصیب ہو جائے غیر معمولی حد تک کامیاب ہے۔

فن حدیث پر مولانا کی ایک درسی کتاب الفیۃ الحدیث بھی ہے جو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور وہاں کے سابق مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ جس میں ایک ہزار حدیثیں جمع کی گئی ہیں اسی لئے اس کا نام الفیۃ الحدیث ہے اس میں بھی احادیث کے انتخاب اور ان کی ترتیب سے فن حدیث میں مولانا کے غیر معمولی مقام اور مسلکی رواداری کے رویئے کا صاف اظہار ہوتا ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند اور اس کے نہج کے بہت سے مدارس میں شامل درس ہے اور مشکوٰۃ المصابیح سے پہلے پڑھائی جاتی ہے۔

☆☆☆

قطب الدین ملا ، ایم، اے
فاضل دینیات۔ بیلگام

میری محسن کتاب

"دین و شریعت"

بعض مشاہیر اہل قلم نے ان کتابوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جن
کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ یا ان کے ذہن و فکر کو ایک نیا محر
مشاہیر اہل قلم ہی کی پیروی میں "میری محسن کتاب" ایک ایسا عنوا
نے بہت ساری کتابوں پر بہت کچھ لکھا ہے، اس موقع پر اس عاجز کا بھ
کا ارادہ ہے۔

یہ خدا کا فضل و کرم اور لطف و احسان ہی تھا کہ اس عاجز کو شروع ہی سے مطالعہ کا شوق رہا، اسی کے ساتھ تحقیق و جستجو کا کچھ ذوق بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، اسی ذوق مطالعہ کی وجہ سے بہت ساری کتابیں نظر سے گزریں، کوئی رہبر، کوئی مربی، اس امر میں نہیں تھا کہ صحیح کی طرف رہنمائی اور غلط کی نشاندہی کرتا۔

بچپن میں والد محترم جناب محمد حسین صاحب ملا مرحوم و مغفور کے ساتھ نمازوں کو جاتا اور کبھی اہم راتوں میں بیان ہوتا اس کو سنتا، اس لئے مزاج میں دینی رنگ شروع ہی سے تھا، لیکن دینی محنت کسی بھی نوعیت کی نہ ہونے کی وجہ سے پورے ماحول پر بے دینی و بدعات کے اثرات تھے، عاجز کی عمر دس گیارہ سال کی تھی کہ والد بزرگوار کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہائی اسکول کے زمانہ میں عربی زبان سیکھنے کے شوق و جذبہ نے ایک قاسمی عالم مولانا بشیر احمد صاحب فیض آبادی علیہ الرحمۃ (۱) کے پاس پہونچا دیا، اس کے نتیجہ میں خیالات میں تبدیلی آنا شروع ہوئی،

---

(۱) موصوف اچھے خطیب و واعظ تھے، ہزاروں اشعار ازبر تھے۔ حضرت مدنیؒ سے بیعت کا تعلق تھا، عاجز نے انہی سے صرف و
کوئی ابتدائی کتابیں پڑھیں تھیں۔

عقائد شرکیہ اور اعمال باطلہ سے کچھ واقفیت ہو گئی۔ چند ہی سالوں میں کچھ حالات ایسے پیش آئے کہ مولانا موصوف اپنے وطن واپس چلے گئے ، لیکن یہ مدرسہ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے مولانا عبد الباری صاحب مد ظلہ ، (خلف مولانا عبد الجبار صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مراد آباد) مرحوم مولانا قاری ضیاء الدین صاحب بخاری خطیب بمبئی، مرحوم مولانا سراج احمد صاحب قمر بارہ بنکوی وغیرہ حضرات علماء کی خدمات میسر ہوئیں۔

بہر حال ایک وقت وہ آیا کہ میں اس مقام پر کھڑا تھا جہاں مذہبی گروہ بندیاں سامنے آتی گئیں اور مطالعہ کی سمتیں متعدد ہوتی گئیں۔ جماعت اسلامی کی کتابیں اور رسالے زیر مطالعہ رہے ،ماہنامہ تجلی والحسنات وغیرہ کو بھی دیکھنے کا معمول رہا، پس اب تک خیالات کی جو عمارت کھڑی ہو گئی تھی وہ ڈھیر ہوتی نظر آنے لگی ــــــــــ پھر نگارشاتِ "نگار" اور غلام جیلانی برق جیسے مصنفین کی تصنیفات "دو اسلام" اور "دو قرآن" جیسی کتابوں کے مطالعہ نے ایک ذہنی کشمکش اور تذبذب میں مبتلا کر دیا، اور باغی تحریرات نے بغاوت کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا اس میں کسی کی رہبری و رہنمائی بھی میرے نزدیک مشکوک تو تھی، معتبر نہیں تھی اِس اندھا دھند مطالعہ نے ذہن کو اتنا پراگندہ کر دیا کہ راہِ حق کی جستجو میں اصل راہ ہی گم ہوتی نظر آنے لگی۔ تذبذب، شبہات ، پراگندگی ، خلش، برہمی ،بغاوت کی کشمکش ، پتہ نہیں ذہن میں کیا کیا بھر گیا تھا ، صحیح کیا ہے، غلط کیا؟ فیصلہ مشکل اور دل کا فیصلہ یہ کہ حق کی یافت کے بغیر زندگی مشکل۔ حضرات علماء کے بارے میں یہ بات گویا ذہن میں بیٹھ گئی تھی کہ بحث و مباحثے کے گورکھ دھندوں کے علاوہ انھیں کچھ کام ہی نہیں، افوہ ! کتنی جسارت کی تھی یہ بات الیکن ع

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی

خدا کا کرم کہ ذوق تجسسِ حق کا آرزو مند رہا، اب یہ نہیں معلوم کہ کس پس منظر میں اور کیسے یہ دعا معلوم ہو گئی کہ

ربنا ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه

وارنا الباطل باطلا وارزقنا احتنابه

خدا کا یہ بھی اس عاجز پر کرم رہا کہ اس نے اس دعا کے اہتمام کی توفیق نصیب فرمائی اور یاد پڑتا ہے کہ پانچ چھ سال تک اس دعا کا اہتمام رہا۔

ادھر خدا کی حکمت نے حالات کو کچھ اس طرح موڑ دیا کہ بعض مخلص دوستوں نے مولانا ریاض احمد صاحب قاسمی فیض آبادی مدظلہ (۱) سے بندہ کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ فلاں فلاں جماعت کی کتابیں پڑھتا ہے انھوں نے مجھ سے اس بارے میں گفتگو فرمائی عاجز نے ان سے عرض کیا کہ مجھے دین کے علاوہ دینوی مسائل میں بھی دلچسپی ہے۔ سیاسی حالات کوائف سے بھی واقفیت ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے دینی معلومات کیلئے الفرقان اور سیاسی حالات کے لئے (شاید) ندائے ملت دیکھنے کی طرف توجہ دلائی اس کے بعد عاجز نے حضرت مخدومنا محمد منظور نعمانی قدس اللہ سرہ العزیز کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔

حضرتؒ کے قلم کی سادگی اور الفاظ کے نپے تلے استعمال نے متاثر کیا۔ بعد کے چند سالوں میں یہاں مولانا سراج احمد صاحب قمر مرحوم (بارہ بنکوی) (۲) مدرسہ فرقانیہ میں مدرسی کیلئے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ مولانا علی میاں ندوی دامت برکاتہم کے قلم میں بلا کی بلاغت اور حضرت نعمانیؒ کے قلم میں الفاظ کا حسن انتخا

جو لفظ جہاں تحریر فرمادیتے ہیں وہاں اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا

ان کی تحریر کی انتہائی خصوصیت ہے۔

الفاظ کے اس بر محل استعمال کے علاوہ حضرتؒ کی تحریر کی

سادگی و سلاست ہے، میری کوتاہ نظر میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ

مقام کا ہو اور تحریر اتنی سلیس و سادہ ہو، علوئے مرتبت کے ساتھ تحریر کی اتنی سادگی شاید منافی شان گردانی جائے۔ لیکن حضرت مولاناؒ کے یہاں تو شان کی کچھ حقیقت ہی نہیں تھی وہ تو "جان" پر جاں چھڑکتے تھے۔ قلم کی شان و شوکت اپنا لوہا منواتی ہے لیکن سادگی و بے ساختگی دلوں کو متاثر کرتی ہے۔

اس سلاست و سادگی کی بھی ایک نرالی داستان ہے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۱ء کی رات آٹھ بجے یہ عاجز اپنے رفقاء کے ساتھ حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس موقع پر بر سبیل گفتگو فرمایا کہ "اسلام کیا ہے" کا مسودہ تیار ہو گیا تو اس کو اپنی اہلیہ محترمہ کے ہاتھ میں تھمادیا اور ان سے یوں کہا کہ اس کو پڑھو اور جہاں کوئی لفظ یا بات سمجھنے میں دشواری پیش آئے اس جگہ نشان

---

(۱) مولانا موصوف، یہاں ہبلی میں ایک دار العلوم چلاتے ہیں، اور جمعیۃ العلماء سے تعلق ہے، قادیانیوں کا خوب تعاقب کیا۔

(۲) مولانا سراج احمد صاحب قمر بارہ بنکوی اچھے شاعر اور خطیب تھے، بابری ایکشن کمیٹی سے بھی تعلق رہا۔ دینی تعلیمی کونسل سے بھی وابستہ رہے۔

لگادو۔ پھر نشان لگائے ہوئے مقامات کو اور زیادہ سہل الفہم بناکر دوبارہ تحریر کیا۔ تب جاکر یہ کتاب قابل اشاعت سمجھی گئی۔ اس لئے اس کتاب کو ایک عامی سے عامی بھی مزے لیکر پڑھتا ہے اور آسانی کے ساتھ سمجھ لیتا ہے۔

اسی بے ساختگی اور سادگی نے قلم میں ایک زبردست تاثیر عطا کی تھی۔ یہ تاثیری قوت آپکی تحریر کی تیسری نمایاں خصوصیت ہے۔ قلم کی اس اثر انگیزی نے اپنا اثر کہاں کہاں تک اور کتنا دکھایا اس کو اللہ علیم ہی بہتر جانتا ہے۔ خود حضرتؒ نے مذکورہ گفتگو کے دوران یہ بھی فرمایا تھا کہ پنڈت سندر لال اس کتاب سے کافی متاثر ہوئے تھے۔(۱)

مذکورہ چوتھی خصوصیت کے علاوہ پانچویں خصوصیت وہ ہے کہ جس سے صرفِ نظر کرنا آپؒ کی تحریر کے حق میں ناانصافی ہوگی۔ پتہ نہیں کہ حضرتؒ نے علم نفسیات حاصل کیا تھا؟ یا یہ کہ نفس شناس اکابرین کی نگاہ فیض کی کرشمہ سازی تھی؟ اور یا پھر اللہ حکیم ہی نے ان کو اس دولت سے بہرہ ور فرمایا تھا کہ ذہن جدید کی نفسیات سے حد درجہ واقفیت رکھتے تھے۔ اور اسکو متاثر کرنے کے لئے سائنسی طرز تحریر (Scientific way Of writting) اختیار فرماتے تھے۔

بات کو ثابت کرنے کے لئے دلائل کے پر پیچ وطویل راستے کے بجائے طریقہ وجدانی اختیار فرماتے تھے۔ جس کی وجہ سے قاری کا ذہن دلائل کی طرف جانیکی بجائے بات کو وجدانی طور پر قبول کرلیتا ہے۔ یہ آپؒ کی تحریر کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔

خیر! بات دور چلی گئی۔ عاجز کے مطالعہ میں حضرتؒ کی کتابیں آتی چلی گئیں۔ لیکن جس کتاب نے مجھے متاثر ہی نہیں بلکہ مسخر کیا وہ آپؒ کی ایک بہت ہی وقیع کتاب "دین وشریعت" ہے۔ پڑھتا چلا گیا، پڑھتا چلا گیا۔ جوں جوں آگے بڑھتا رہا دماغ کی گرہیں کھلنا شروع ہوگئیں۔

اس کتاب کا انداز تحریر ہی نرالا تھا۔ سادگی کے باوجود زبان وادب کی چاشنی تھی۔ ایک ایسی چاشنی کہ کسی ادبی ذوق رکھنے والے کو متاثر کرنے کی پوری قوت اپنے اندر رکھتی تھی۔ پھر موضاعات مختلفہ وضروریہ پر جس روانی، برجستگی اور تسلسل کے ساتھ بحث کی گئی تھی۔ وہ بے مثال تھی۔ اور موضوع بحث کو کچھ ایسے نفسیاتی پہلوؤں کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ایک جدت پسند ذہن اس کو فوراً قبول کرلے۔ ان ساری باتوں نے از حد متاثر کیا اور

---

(۱) پنڈت جی ہندوستان کے بہت مشہور پڑھے لکھے اور صاحب تصانیف شخصیت تھے، مسلم مجلس مشاورت کے زمانہ میں حضرت کا ان سے ملنا جلنا ہوا تھا۔

کتاب و صاحب کتاب کی عظمت کا معترف ہونا پڑا۔

اس کتاب میں عملی شریعت کے عنوان سے ارکان اربعہ کے سلسلہ میں جو بحث کی گئی ہے وہ ذہن جدید کی تشفی و اطمینان کے لئے کافی تھی۔ بہت مختصر مگر ضروری امور پر بحث کرتے ہوئے اور غیر ضروری حشو و زوائد سے اجتناب کرتے ہوئے بس اتنی بحث کی گئی ہے جتنی کہ ضرورت متقاضی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس بحث کو پڑھنے کے بعد شریعت اسلامی کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دینے والا بھی نماز کی طرف راغب ہو جائیگا۔ پھر نماز کو نماز بنانے کے لئے جو اصولی ہدایات دی گئی ہیں وہ ضخیم کتابوں کے مطالعہ سے مستغنی کر دیتی ہیں۔ اس طرح بقیہ ارکان زکوٰۃ، روزہ اور حج کے بارے میں اصولی بحث کی گئی ہے۔ اور ان ارکان کے سلسلہ میں عام طور پر جو غفلت اور کوتاہی ہوتی ہے اس کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

> ”اللہ کے جو بندے اس فریضہ کو ابھی تک ادا بھی کرتے ہیں ان میں سے اکثر کے بارے میں اور ادائیگی کے طریقہ میں بڑی بے فکری اور بے اعتنائی برتے۔۔۔

اور نفلی روزوں کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ ”نماز کے بارے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو صرف فرض رکعتوں پر قناعت کرتا ہو اور سنن و نوافل نہ پڑھتا ہو۔ بلکہ اگر کوئی ایسا طرز عمل اختیار کرے تو اسے بری نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور اس کے متعلق اچھا خیال قائم نہیں کیا جائے گا لیکن روزہ کے باب میں قریب قریب ہم سب کا طرز عمل یہ ہی ہے کہ بس رمضان کے روزے سال میں ایک دفعہ رکھ لیتے ہیں“

اور حج کی روح کے سلسلہ میں توجہ دلاتے ہوئے فرمایا ہے کہ

> ”افسوس ہے کہ لوگ مادی ضروریات کی تو فکر کرتے ہیں، نمک مرچ، اچار چٹنی تک ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، دس دس جوڑے سواتے ہیں، اور مہینوں پہلے سے ان چیزوں کے انتظام کی فکر کرتے ہیں، لیکن حج کے لئے روحانی تیاری کی فکر کرنے کا بالکل رواج نہیں، اسی لئے اکثر جانے والے جیسے جاتے ہیں ویسے ہی چلے آتے ہیں۔“

یہی نہیں کہ صرف مرض دکھایا گیا ہو بلکہ موقع بہ موقع اس کا علاج بھی اور آسان نسخہ بھی بتایا گیا ہے، زیر بحث عنوان کے آخر میں ارکان اسلام کے رکن ہونے کی وجوہات بھی بڑے دلنشیں انداز میں پیش کی گئی ہے، جو بلاشبہ سیکڑوں صفحات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، مگر طوالت کے

خوف سے تفصیل میں نہیں جاسکتا۔

اخلاق حسنہ کے بارے میں اعمال صالحہ کی چار قسمیں بیان کر کے اخلاق کی امتیازی حیثیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔اور خلاصۂ بحث کے طور پر یہ سطور رقم فرمائی ہیں

"بہر حال اخلاق کی اصلاح کا معاملہ صرف تکمیلی چیز نہیں ہے، کہ صرف بزرگ اور کامل بننے کے لئے اس کی ضرورت ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے اور دوزخ سے بچنے کے لئے جس طرح نماز، روزہ ضروری ہے اسی طرح برے اخلاق سے بچنا اور اچھے اخلاق کا اختیار کرنا ضروری ہے۔"

"معاملات اور معاشرت" کے باب میں ان کی امتیازی حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

"ان میں اپنی دنیوی منفعت اور مصلحت اور اپنی خواہش نفس کی اور اللہ کے احکام کی کشمکش دوسری تمام چیزوں سے زیادہ رہتی ہے اس لئے بندہ کی بندگی اور فرمانبرداری کا سب سے زیادہ سخت امتحاں معاملات اور معاشرت کے احکام میں ہے۔"

اس کے بعد "دین کی خدمت و نصرت" کا عنوان ہے جو ۲۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے دینی خدمت کے سلسلے میں پھیلی ہوئی بیسیوں مغالطہ انگیزیوں سے نکالنے والا ہے جس میں کار نبوت، نیابتِ نبوت ، اور دینی خدمت کے مختلف شعبے مثلاً دعوت و تبلیغ، تعلیم و تزکیہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور قتال فی سبیل اللہ وغیرہ پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔پھر اس دینی خدمت و نصرت ہی کے سلسلے میں خلافت راشدہ کے موقف و حقیقت پر بھی بحث کرتے ہوئے انتخاب خلیفہ کے مسئلے کی نوعیت پر کچھ اس طرح گفتگو کی گئی ہے کہ بہت سی وہ گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں جو مسئلے کے بارے میں شیعہ و سنی اختلاف کی بنیاد ہیں۔اس بحث میں ایک سمجھ دار اور غور و فکر کرنے والے کے لئے اپنے لئے راستہ کا انتخاب کرنے کی بہترین رہنمائی موجود ہے۔

"سیاست و حکومت" کے زیر عنوان اصولی امور کا ذکر کیا گیا ہے جن سے وہ مسلمان بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو مسلم حکومتوں میں رہتے ہیں اور وہ بھی جو غیر مسلم اور سیکولر حکومتوں میں رہتے ہیں۔اور "اسلام کا مقصد اصلی قیام حکومت الہیہ" کے نظریہ کے تحت جن مغالطوں دوچار ہونا پڑتا ہے اور راہ اعتدال چھوٹ جاتی ہے اس کی اصلاح کے لئے یہاں ایک معتدل

قرآنی راہِ عمل سامنے آجاتی ہے۔ کتاب کا یہ حصہ سیاسی فکر و بصیرت رکھنے والوں کے لئے ایک بہت ہی مفید اور کار آمد حصہ ہے۔

سب سے آخر میں "احسان و تصوف" کا عنوان ہے۔ تصوف میری نظر میں وہ زہر تھا جو امت کو تریاق سمجھ کر دیا گیا تھا۔ اور اس لئے طبیعت کا یہ حال تھا کہ ع

مجھے تو پسند نہیں یہ طریقِ خانقاہی

الغرض جتنا کچھ مغالطہ درباب تصوف تھا، اس باب نے اس سے نکال کر، "احسانی کیفیت" کی ضرورت اور اس کے متعلقات کے بارے میں اطمینان و انشراح نصیب فرمایا۔ اور حقیقت حال کا پتہ چلا کہ

سرّ دیں مارا خبر او را نظر
او درونِ خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش
وز دست مصطفٰے پیمانہ نوش

دراصل یہ کتاب اسلام کی سب سے زیادہ بنیادی چیز "توحید" ہوتی ہے۔ اس باب میں توحید کے سلسلہ کی جتنی ضروری اور اصولی با... ہے، ان اصولی مباحث نے اس سلسلہ کی بہت ساری گتھیوں کو سلجھادیا۔ اور یہ بحث کچھ ایسی پر اثر اور پر کشش اور مبنی بر حقیقت تھی کہ اہل بدعت و ضلالت کی تعمیر کردہ بڑی بڑی عمارتیں ریت کا تودہ نظر آنے لگیں۔ اور یہ بیانِ قرآن کو زبانِ قرآن میں پیش کرنے کی ایک نہایت کامیاب کوشش تھی، گویا علوم قرآن اسلوبِ قرآن میں پیش کرنے کا ایک نادر ملکہ اللہ تعالیٰ نے اپ کو عطا فرمایا تھا۔ توحید و شرک کا فرق دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کی طرح الگ کر کے دکھادیا تھا۔

اس کے بعد مسئلہ آخرت کی حقیقت پر صرف دس صفحات کے اندر اس انداز میں بحث کی گئی تھی کی آخرت کی ضرورت اور اس کے لوازمات اور منافع کو دل کے ساتھ دماغ اور دماغ کے ساتھ دل بھی شرح صدر کے ساتھ قبول کرلیتاہے۔(۱)

آخرت کے بعد، "رسالت" کا عنوان شروع ہو جاتا ہے۔ رسالت اور اس کے متعلقات کے سلسلہ کی یہ بحث قریبا (۶۰) ساٹھ صفحات پر پھیل گئی ہے۔ کتاب کا کوئی عنوان اور

---

(۱) طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو یہاں تک کا یہ تبصرہ اس بات کا متقاضی تھا کہ اس پر شرح و بسط سے لکھا جاتا لیکن اپنی بساط بھی تو ہو۔

موضوع اتنا طویل نہیں جتنا کہ یہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کی فکر و نظر یہیں زیادہ ٹھوکر کھاتی ہے۔ مصنف ؒ کی نگاہ حقیقت شناس نے اس کو دیکھ لیا تھا اس لئے اس بحث کو قدرے بسط و تفصیل سے تحریر کیا۔ کتاب کا یہی وہ باب ہے جس نے مجھے زیادہ متاثر کیا اور میرے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا۔

مقام رسالت کے سلسلہ میں مختلف اہلِ قلم کی جو افراط و تفریط مطالعہ میں آئی تھی، جس کی وجہ سے ذہنی خلش کا شکار ہو گیا تھا۔ اس باب نے تسلی اور تشفی کا کافی سامان بہم پہنچایا۔ بشریت انبیاء کے نزاعی مسئلہ کو اس سادگی کے ساتھ واضح کیا گیا تھا کہ مخالف و موافق ہر دو کے لئے حق کو عین الحق کے ساتھ دیکھنا آسان ہو۔ اور شدت جذبات پر ایسی پابندی لگا دی گئی تھی کہ ع شرک کی حد میں نہ آجائے عقیدت بڑھکر

دوسری طرف انبیاء علیھم السلام کی "اجتہادی غلطیوں" کی جو بھول ذہن کو لگ گئی تھی یا بعض تحریروں نے دی تھی اس سے نجات ملی۔ اس امر کو کس سادگی اور اعتدال کے ساتھ "امر حق" کی طرح پیش کیا گیا ہے اسکو ملاحظہ فرمائیے۔

"امیا علیھم السلام کے ایسے اجتہادات عموماً صحیح ہوتے ہیں اور اگر کبھی لغزش (۱) ہوتی ہے تو فوراً وحی کے ذریعہ انکو اطلاع دے دی جاتی ہے اور اسکی تصحیح کر دی جاتی ہے اور جب وحی کے ذریعہ کوئی تصحیح نہ کی جائے تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ حکم الٰہی وہی ہے جو نبی نے اپنے اجتہاد سے سمجھا اور پھر وہ مسئلہ اجتہادی نہیں رہتا بلکہ 'ملحق بالوحی' ہو جاتا ہے یعنی اسکا درجہ وہی ہوتا ہے جو وحی کے ذریعہ آنے والے احکام کا ہوتا ہے"

مقام ولایت کے سلسلہ میں ایک طرف سے جو غلو اور دوسری طرف سے جو صرف نظر مطالعہ میں آتا ہے اسکی وجہ سے کسی ذہن میں اس خلش کا پیدا ہونا یقینی ہے لیکن مقام ولایت کو یہاں جس اعتدال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ایک سلیم الطبع کی شرح صدر کے لئے کافی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں

"اسی جگہ ایک بات یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ کسی ولی کو ولی ماننا شرط ایمان تو نہیں ہے لیکن جو واقعی اولیاء اللہ ہیں خواہ وہ اس دنیا سے جا چکے ہوں یا موجود ہوں ان سے عداوت اور بغض و عناد رکھنا سخت محرومی ہے اور بڑا وبال ہے۔
حدیث قدسی ہے من عادیٰ لی ولیا فقد آذنته بالحرب (صحیح بخاری)
یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میری طرف سے اسکو اعلان جنگ ہے اسلئے اولیاء اللہ کے ساتھ ہمارا رویہ ہمیشہ ادب و عظمت کا ہونا چاہئے۔ ہاں اسکی گنجائش ہے کہ ادب و عظمت کے باوجود کسی خاص معاملہ میں ہمیں انکی رائے سے اختلاف ہو، کیونکہ وہ پیغمبروں کی طرح معصوم اور واجب الاطاعت نہیں ہیں"

اعجازِ قرآن اور فتنۂ انکارِ معجزات پر جو بحث ہے وہ بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جدید ذہن زیادہ مخدوش نہیں ہوتا اس لئے ہمیں اس بارے میں کچھ زیادہ تحریر کرنا نہیں ہے۔ لیکن انکار حدیث کی وجہ سے عقل کی بے لگامی اور اسکے نتیجہ میں دین جو ایک کھلواڑ بن جاتا ہے اس اسلام سوز اور دین کش فتنہ پر جو مختصر اور اصولی بحث کی گئی ہے وہ قابل دید و مطالعہ ہے۔ اور اسی موضوع کے تحت مقام نبوت کو جس انداز میں کھولا گیا ہے وہ قلمِ نعمانی ؒ ہی کا حصہ ہے۔

بیان عقائد کی بحث یہاں پہنچ کر ایک عجیب موڑ لیتی ہے۔ یہی موڑ ہے جس نے میری زندگی میں صحیح موڑ پیدا کر دیا۔ جیسا کہ عاجز نے شروع میں تحریر کیا ہے کہ مختلف مکاتب فکر کی تحریروں کا مطالعہ اس عاجز نے کیا تھا اور نتیجتاً ذہن میں وہ خلجان پیدا ہوا کہ کسی بھی مسئلہ پر انشراح نہیں ہو سکا۔ صحابہؓ معیار حق نہیں تھے۔ حنفیت و شافعیت، تیعیت و سـ
و بریلویت یہ سب جہالت کی پیدا کردہ جماعتیں تھیں۔ مجددین نے '
ضرور کیں لیکن انکی کوششیں یا تو جزوی تھیں یا ان کے تجدیدی کارنامو'
اصل اسلام کے مقابلہ میں علماء نے دوسرا اسلام پیش کیا ہے۔ اور قرآں
کئے گئے جو فی الواقع ہیں، بلکہ اس کے مقابلہ میں اس کی تفسیر اپنے خیالا۔۔
اس طرح اسلام اور قرآن کے متوازی ایک دوسرا اسلام اور دوسرا قرآن پیش کیا گیا ہے

خیالات کی ان بھول بھلیوں میں "راہ حق" گم ہو گئی تھی، ایک عجیب ادھیڑ بن میں مبتلا تھا۔ میں کہاں ہوں ؟ میری منزل کیا ہے ؟؟ یا کیا ہونی چاہئے ؟؟؟ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ گھپ اندھیرے میں ہاتھ پیر مار رہا ہوں۔ فکر مفلوج ہو گئی تھی، ذہن ماؤف تھا۔ اور قلب، مقلب، کروٹ کروٹ سلوٹیں تھیں۔ اپنے اس عالم اضطراب کی تعبیر واقعہ یہ ہے کہ میں الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ لیکن خدا کی مشیت، اس کے فضل و کرم نے سہارا دیا، کتاب کی بحث آگے بڑھتے ہوئے "امت میں اختلاف عقائد کا آغاز" تک پہنچ گئی تھی، ساتھ ہی دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں، سوچ چوکنا ہو گئی، پڑھتا گیا پڑھتا گیا، میرے محسن نے بتانا شروع کیا، یہ راستے مختلف کیوں ہوئے اور متعدد کیوں ہوئے۔

"بیان عقائد ہی کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی یہاں سمجھ لینی چاہئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان عقائد میں کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن انھیں کے زمانہ میں مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے جو بے شمار لوگ اسلام میں داخل ہوئے، وہ اپنے ساتھ پرانے خیالات اور اپنا طرز فکر بھی لے کر آئے۔"

اور ان سب کے خیالات کی پوری اصلاح اور تصحیح نہیں ہو سکی (اور عالم اسباب میں یہ ممکن بھی نہیں تھا،) بس ان ہی سے عقائد کا اور طرز فکر کا وہ اصولی اختلاف شروع ہوا جس نے امت میں بہت سے فرقے پیدا کئے۔"

اس کے بعد فرقہ بندی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

" فروع میں اور غیر اہم مسائل میں رائے اور تحقیق کا اختلاف ایسی چیز نہیں ہے۔ جس سے فرقہ بندی پیدا ہو، بلکہ یہ تو ناگزیر اور قدرتی ہے۔ فرقے جس اختلاف سے بنتے ہیں وہ عقائد اور اصول کا اختلاف ہے۔"

دماغ کی ایک گرہ کھل گئی کہ پھر یہ حنفیت و شافعیت جہالت کی پیدا کردہ جماعتیں کیوں ہونے لگیں؟ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں

" اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صحابہ کرام میں بالکل نہیں تھا، اپنے عقائد اور طرز فکر کے لحاظ سے وہ سب ایک جماعت تھے۔"

ذہن کی ایک اور گرہ کھل گئی اور ضمیر نے پوچھا کہ کیا سب صحابہ اس معاملہ میں ایک جماعت ہو کر "معیار حق" نہیں ہو جاتے؟ اس کے بعد مختلف فرقوں کا تجزیہ کچھ اس طرح فرمایا ہے، کہ کوئی الجھن ہی باقی نہ رہے۔ تحریر فرمایا ہے

"پھر بعد میں جو فرقے پیدا ہوئے اگرچہ وہ بے گنتی ہیں لیکن اصولی طور پر ہم ان کو "اھل السنۃ والجماعۃ" اور "غیر اھل السنۃ والجماعۃ" کہہ سکتے ہیں، "

جزاک اللہ، بحث کو کتنا مختصر کر دیا کہ سمجھنا آسان ہو گیا، اور اب حق کی جستجو کرنیوالوں کے لئے مختلف فرق باطلہ کے نظریات کی بحث میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہ رہی اور ہاں اسکی ضرورت ہو گی کہ اہل السنۃ والجماعۃ اور غیر اہل السنۃ والجماعۃ کی حقیقت کو سمجھ لیں اور اس ضرورت کو مصنفؒ ہم سے زیادہ بہتر سمجھتے تھے اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف واصول کو بھی واضح کر دیا۔

"اھل السنۃ والجماعۃ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو دین کی اصل واساس ماننے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سنت یعنی آپ کے ارشادات اور آپ کے طرز عمل کو اس کی شرح اور اس کے اجمال کی تفصیل سمجھتے ہیں۔ اور جو چیزیں قرآن مجید میں بیان نہیں کی گئی ہیں اور سنت میں ان کا بیان ہے ان کے نزدیک وہ بھی واجب الاتباع اور جزو دین ہیں۔"

مختصر جملوں میں اہلِ قرآن جیسے گمراہانہ عقائد و طرز فکر کا باطل ہونا خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ اھل السنۃ والجماعۃ کے بارے میں آگے مزید تحریر فرماتے ہیں

"کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی یہ حیثیت تسلیم کرنے کے ساتھ وہ جماعت صحابہؓ کی حیثیت بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب و سنت کا جو منشا انھوں نے سمجھا اور جن امور پر ان کا اجماع ہو گیا وہ بھی واجب ... اور کسی مسلمان کو حق نہیں ہے کہ ان کے اجتماعی مسلک اور اجتماعی فیصلوں کے خلاف اس سے اختلاف کرنا ضلالت ہے کیونکہ دین جس ماحول اور جس فضا اور جس زبان میں آیا صحابہ کرام یقیناً اس کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے پھر انھوں نے ... ﷺ سے حاصل کیا اور آپ ﷺ کی صحبت و تربیت سے مستفیض ہوئے۔ اس ... دین کا عارف اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کی روح اور منشاء کو سمجھنے والا نہیں ہو سکتا۔ پس دین وہی ہے جو انھوں نے سمجھا"

پھر مزید تشریح فرماتے ہیں کہ

" بس یہ ہے اصولی مسلک، اہل السنہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ کے بعد سنت اور جماعت صحابہ کی دین میں اتنی اہمیت تسلیم کی ہے اور اپنے کو اتنا پابند بنا دیا ہے۔"

اھل السنۃ والجماعۃ کے موقف کی وضاحت کے بعد "غیر اھل السنۃ والجماعۃ" کے موقف کی وضاحت بھی فرماتے ہیں

"باقی دوسرے فرقوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنت کو اور جماعت صحابہ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے ان فرقوں میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے دو فرقے خوارج اور شیعہ ہیں دین کے معاملہ میں صحابہ کرام ان (شیعوں) کے نزدیک قطعاً قابل اعتماد نہیں بلکہ ان کے اکثر فرقے تو جمہور صحابہ کرام کو معاذ اللہ منافق اور مرتد بے دین سمجھتے ہیں اور جو مقام سنت کا ہونا چاہئے وہ ان کے نزدیک ان کے ائمہ کے اقوال و افعال کا ہے ---

اور خوارج کا حال یہ ہے کہ قرآن مجید کو تو دین کا بالکل محفوظ اور قطعی ماخذ مانتے ہیں اور سنت کی اہمیت بھی ان کے نزدیک قریب قریب ویسی ہی ہے جیسی کہ اہل السنۃ کے نزدیک ہے لیکن صحابہ کرام کے اجتماعی مسلک اور اجماعی فیصلوں کا اتباع جسطرح اہل السنۃ ضروری سمجھتے ہیں وہ نہیں سمجھتے، گویا ان کے نزدیک یہ ہو سکتا ہے کہ دین کی کسی حقیقت کو اور قرآن و سنت کی کسی بات کو سمجھنے میں صحابہ کرام کی پوری جماعت یا انکی بڑی تعداد غلطی کر جائے اور بعد والے اس کو صحیح سمجھیں۔ لیکن اہل سنت اس خیال کو گمراہی بلکہ سیکڑوں گمراہیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔"

اہل سنت و غیر اہل سنت کے موقف کو واضح کرنے کے بعد بات کو مدلل بنانے کے لئے آگے چل کر حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا ایک مکتوب بھی درج فرماتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں کہ

"(اس عربی خط کا) مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام کی جماعت نے اپنے لئے جو خوبیاں اور عقیدہ پسند کیا اور جس کو انھوں نے اپنایا تم بھی اسی کو اپنے لئے پسند کرو اور اسکو اپنا مسلک بناؤ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم لائے تھے، صحابہؓ کرام اس سے پوری طرح واقف تھے اور دین کے بارے میں انھیں گہری بصیرت تھی جس سے ہر مسئلے کی تہہ تک پہونچتے تھے اور دینی حقیقتوں کے سمجھنے پر وہ ہم تم سے زیادہ قادر تھے اور دین کے علم و فہم میں وہ دوسروں سے بہت زیادہ فضیلت رکھتے تھے۔ پھر بھی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ (اپنے اس خیال میں جو تم نے صحابہ کرام کے خلاف قائم کیا ہے۔) تم ہی راہ راست پر ہو تو گویا اس بات کے مدعی ہو کہ تم دین میں صحابہ کرام کی پوری جماعت سے آگے بڑھ گئے ہو ظاہر ہے کہ یہ کس قدر احمقانہ و گمراہانہ بات ہے۔"

صحابہ کرامؓ معیار حق تھے یا نہیں اس بحث سے قطع نظر، ان روشن تحریرات نے صحابہ کرام کی عظمت کو دل میں بٹھا دیا اور جو اعتماد اس مقدس جماعت پر سے اٹھ گیا تھا اس اعتماد کو بحال کیا۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام کے متعلق تو ذہن صاف ہو گیا لیکن "سلف صالحین" ابھی تک ذہن میں "غیر ضروری طور پر دخیل دین" بنے ہوئے تھے۔ سلف صالحین کے بارے میں جو راہ اعتدال ہے دیکھئے اس کو کس حسن و خوبی کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔

"ہمارا اصول اور طریقہ کار تو یہ ہے کہ جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ سلف صالحین نے اس بارہ میں کتاب و سنت کا مقصد و منشاء یہ سمجھا ہے اور ان سب کا یا جمہور سلف کا یہ متفقہ مسلک ہے تو ہم صرف اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کا اتباع ضروری جانتے ہیں اور اس کے خلاف ہر نئی رائے کو تسویل شیطانی سمجھتے ہیں۔ اور جو لوگ سلف صالحین کا اتباع نہیں چاہتے اور جن کو ان کے علم و فہم سے زیادہ اپنے علم و فہم پر اعتماد ہے وہ اپنی رائے اور سمجھ کا اتباع کرتے ہیں اور کتاب و سنت کا نام لیکر دوسروں کو بھی اس کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں بس ہمارے اور ان کے طرز فکر اور طرز عمل میں فرق یہ نہیں ہے کہ وہ دین میں اصل سند کتاب و سنت کو قرار دیتے ہیں اور ہم سلف صالحین کو بلکہ یہ ہے کہ ہم کتاب و سنت کا منشاء متعین کرنے میں سلف صالحین کے فہم و فکر کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور وہ اپنے خیالات اور اپنے فہم پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی بجائے سلف کے ان کی تقلید کریں در اصل ان کی ذہنیت بالکل وہی ہے جو ان خوارج کی تھی اور وہ لوگوں کو سلف کے اتباع سے توڑ کر اپنے متبعین میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اور جو سادہ لوح انکی بات مانتے ہیں وہ در حقیقت سلف صالحین کے اتباع سے آزاد ہو کر خود انکے متبع اور مقتدی بن جاتے ہیں اور اس سے امت میں نئے نئے فرقے اور نئے نئے گروہ پیدا ہوتے ہیں۔

ہر حال دین کے بارے میں سلف صالحین پر اعتماد اور انکی اتباع ہمارے ہے اور اسی میں عام مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت ہے۔"

اس وجدانی وضاحت نے صلف صالحین کی قدر و قیمت اور لیکن دماغ میں ابھی کچھ الجھنیں باقی تھیں۔ 'تقلید'، 'اندھی تقلید'، 'علماء کی کاسہ لیسی'، 'لکیر کے فقیر' اور 'اجتہاد سے کام نہ لینا دین کو جامد بنانا ہے'، جیسے الفاظ محیط ذہن کے اندر ابھی تک گردش کر رہے تھے کہ "فقہی مسائل میں تقلید" کے ضمنی عنوان کے تحت وہ بحث شروع ہو گئی کہ میرے خیالات میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ اس ضمنی عنوان کے تحت رقمطراز ہیں

"یہ ساری گفتگو تو ایمانیات اور عقائد میں تھی، فروع اور فقہی مسائل میں بھی ہمارے نزدیک ائمہ حق کی تقلید اور سلف کے اتباع ہی میں سلامتی ہے خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جبکہ اجتہاد اتنا ارزاں ہو گیا ہے کہ جو لوگ قرآن و حدیث کے اردو ترجمے بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بھی اپنے کو اجتہاد کا حقدار سمجھتے ہیں۔

جو حضرات اہل علم کسی خاص فقہی مسلک کی تقلید پر مطمئن نہیں ہیں انکے لیئے بھی اتنا تو بہت ہی ضروری ہے کہ جن مسائل پر ائمہ اربعہ غور کر کے متفق ہو چکے ہیں ان میں کوئی نئی راہ اختیار نہ کریں اور جن مسائل میں ان حضرات کے درمیان اختلاف ہے ان میں بھی ان سب سے الگ کوئی نئی رائے قائم نہ کی

جائے (۱) اس اصول کی پاسدی نہ کرنے میں سخت بے احتیاطی اور خود رائی بھی ہے اور امت میں اس سے امتشار بھی پیدا ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "فیوض الحرمین" میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (مدینہ طیبہ کے زمانہ قیام میں) مجھے تین ایسی باتوں کی تاکید اور وصیت فرمائی جو میرے ذاتی رجحان اور طبعی میلاں کے خلاف تھیں۔ ان میں سے ایک فقہی مسائل میں ان مذاہب اربعہ کی تقلید کا مسئلہ بھی تھا۔"

اسی سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف بھی انھیں کی کتاب کے حوالہ سے حاشیہ میں درج کیا گیا ہے کہ

"حضرت شاہ ولی اللہ اگرچہ مجتہدانہ طرز فکر رکھتے ہیں، "حجۃ البالغہ" میں اس مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے صاف فرماتے ہیں (عربی عبارت) مطلب یہ ہے کہ مذاہب اربعہ کی تقلید جائز اور صحیح ہونے پر پوری امت کا یا کہنا چاہیئے کہ اس کے قابل اعتبار عناصر کا اجماع ہے، خصوصاً ہمارے اس زمانہ میں جب کہ علم کم ہے اور ہوا پرستی اور خود رائی زیادہ، تو اب تو ان مذاہب کی تقلید میں دین کی بڑی حفاظت اور مصلحت ہے"۔

تقلید والی اس بحث کو سمیٹتے ہوئے آخر میں ایک قیمتی مشورہ بھی دیا ہے کہ

"اس وقت امت جس حال میں ہے اس کو ہمارے نئے نئے اجتہادات کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کے لئے عملی جدوجہد کی اور اس راستے میں اپنی جانوں کو بے قیمت کرنے کی ضرورت ہے۔"

زعم فکر و نظر نے دین کے بارے میں جن بھول بھلیوں میں پہنچا دیا تھا اُن سے اِن مباحث نے مجھے باہر نکالا، فرق مختلفہ وضالہ کا باطل ہونا اور مسلک اهل السنة و الجماعة کا حق ہونا مجھ پر واضح ہو گیا، اور اس پر انشراح نصیب ہوا، احقاق حق اور ابطال باطل کی یہ سعی مشکور کچھ ایسے اچھوتے انداز میں کی گئی ہے کہ طبیعت میں جو ایک طرح کا بھٹکاؤ تھا، وہ ختم ہو گیا زندگی کو ایک صحیح رخ مل گیا، اور تذبذب و کشمکش حق و باطل سے نجات ملی۔ باغی ذہن کو اسوۂ صحابہ کی عظمت و عظیمت کا معترف ہونا پڑا، فی الواقع اضطراب دل کو سکون ملا، مجھے ایسا لگا کہ طلاطم سمندر

باقی صفحہ ۲۵۲ پر

(۱) یہ بات بھی صرف ایسے اہل علم کے لئے ہے جو واقعۃً دین میں اس درجہ کا درک رکھتے ہوں اور اپنی ذات کی حد تک اس پر عمل ان کے لئے روا ہو سکتا ہے لیکن وہ اس امر کے داعی نہیں ہوں گے ورنہ عوام ان کی تقلید میں اپنے مفاد کے لئے ایک امر میں ایک امام اور دوسرے امر میں دوسرے امام کی بات لے لیں گے۔

مولانا عتیق احمد قاسمی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

نقوش و تأثرات

حضرت مولانا نعمانیؒ سے ربط و تعلق

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے غائبانہ ربط و عقید[illegible] کا آغاز [illegible]
بچپن میں ہو چکا تھا، حضرت والد ماجد جناب حاجی محمد رفیق صاحب[illegible]
ذخیرۂ کتب میں معارف الحدیث کی ابتدائی دو جلدیں اور غالباً "[illegible]
کتابوں کی ورق گردانی کی سعادت اسی وقت حاصل ہو چکی تھی جس[illegible]
اور اردو کی معمولی شد بد ہو چکی تھی، مولانا نعمانیؒ کا سادہ و آسان[illegible]
کے لئے بھی قابل فہم تھا اس لئے ان کی کتابوں کی طرف طبیعت کھنچتی تھی۔

مکتب کی تعلیم کے بعد عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم کے لئے مشرقی یوپی کے قدیم و بافیض مدرسہ جامعہ نور العلوم بہرائچ میں داخل ہوا، نور العلوم میں جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری اردو کے منتخب معیاری لٹریچر پر مشتمل تھی، اردو زبان کے اکثر صاحب فکر، قابل ذکر مصنفین کی کتابیں وہاں موجود تھیں اور اردو زبان کے اہم جرائد و مجلات بھی لائبریری میں آتے تھے، ان میں حضرت مولانا نعمانیؒ کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ الفرقان لکھنؤ بھی تھا، اس سے استفادہ کا موقع گاہے بہ گاہے ملتا رہتا تھا، جمعیۃ الطلبہ کے تحت ہر ہفتہ جمعرات کے روز بعد نماز مغرب طلبہ مختلف حلقوں میں تقسیم ہو کر تقریر کی مشق کیا کرتے تھے، ان ہفتہ واری جلسوں میں تقریر کرنے کے لئے دوسرے طلبہ کی طرح میں بھی خطبات مدراس (علامہ سید سلیمانؒ ندوی) اور "اسلام کیا ہے؟" (مولانا محمد منظور نعمانیؒ) سے تقریر کی تیاری کیا کرتا تھا، اس طرح خطبات مدراس کے متعدد خطبے اور "اسلام کیا ہے" کے کئی اسباق زبانی یاد ہو گئے تھے۔

مدرسہ نور العلوم بہرائچ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر رہا

کرتا تھا، کیونکہ مدرسہ نور العلوم بہرائچ کے بانی حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن نامیؒ کا حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق تھا۔

میرے نور العلوم بہرائچ پہنچنے سے پہلے حضرت مولانا نامیؒ کا انتقال ہوچکا تھا لیکن نورالعلوم بہرائچ سے حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا مخلصانہ تعلق پہلے کی طرح قائم تھا، اور مدرسہ کے ماحول میں ایک سرپرست اور بزرگ کی طرح مولانا نعمانی کا ذکر خیر رہا کرتا تھا۔

۱۹۷۰ء میں احقر تعلیم کی تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند پہنچا، اس وقت ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اصحاب علم و فکر کی بہترین کہکشاں تھی۔ ہندوستان کے اکثر ممتاز ترین علماء شوریٰ کے ممبر تھے۔ سال میں دو مرتبہ شوریٰ کا اجلاس ہوا کرتا تھا اور شوریٰ کے اجلاس کے موقع پر دارالعلوم دیوبند کی رونق بہت بڑھ جاتی تھی۔ حضرت مولانا نعمانی مجلس شوریٰ کے بہت موثر اور موقر ممبر تھے۔ ارکان شوریٰ میں غالباً سب سے سینیر بھی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس اُس دور میں محض قانونی خانہ پری کے لئے نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ شوریٰ کے اجلاس میں دارالعلوم دیوبند کے چھوٹے بڑے انتظامی و تعلیمی معاملات پر کھل کر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اس لئے دو تین روز تک شوریٰ کا اجلاس بہت انضباط و تسلسل کے ساتھ چلا کرتا تھا اور نرم گرم معاملات پیش آتے رہتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو متعدد بار دیکھنا یاد ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک بار دارالعلوم دیوبند کی مسجد میں مولانا نعمانی مرحوم کی تقریر بھی ہوئی تھی، جس میں انھوں نے اپنی طالب علمی کے واقعات اور اساتذہ و مشائخ کا ذکر بڑے مؤثر پیرائے میں کیا تھا۔

معارف الحدیث پر ایک تاثر

۱۹۷۴ء، میری طالب علمی کا آخری سال ہے، اس سال کی ڈائری میں حضرت مولانا نعمانیؒ کی اہم ترین کتاب معارف الحدیث کے بارے میں یہ تاثرات قلمبند کئے گئے ہیں۔

"۲۶ رمضان ۱۹۹۴ء، مولانا منظور نعمانی اس زمانے کے ممتاز عالم دین ہیں، موصوف نے اسلامیات کا کافی ذخیرہ اردو میں منتقل کیا ہے، اس کی زبان بھی شستہ اور سلجھی ہوئی ہے، عام طور پر علماء کی طرح ان کی اردو میں ژولید گی نہیں ہے۔

"مولانا نے بہت دنوں پہلے بریلی سے الفرقان نکالنا شروع کیا تھا، جو بحمد اللہ اب تک پابندی سے نکلتا ہے، اس پرچہ نے اسلام کی بہت خدمت انجام دی ہے، خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام سے قریب لانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔

''مولانا نے کافی دنوں پہلے الفرقان میں احادیث نبویہ کی مختصر انداز میں تشریح کرنی شروع کی تھی۔ عام فہم ترجمہ، مختصر سی تشریح، جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اشکالات کا ازالہ، ان خصوصیات نے اس سلسلۂ مضامین کو مقبول عام بنادیا، ان مضامین کو مکتبہ الفرقان نے کتابی شکل میں معارف الحدیث کے نام سے شائع کیا ہے۔ اب تک اس کی پانچ یا چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے اس دوران معارف الحدیث کا مطالعہ کیا، اس عظیم خدمت حدیث پر مولانا کے لئے دعا نہ کرنا بہت ہی ناسپاسی اور کم ظرفی ہوگی۔

''جلد اول کے شروع میں محدث کبیر شیخ حبیب الرحمٰن اعظمی کا مقدمہ ہے، جس میں موصوف نے فتنہ انکار حدیث پر رد کرتے ہوئے قرآن اور عقل و نقل کی روشنی میں احادیث کی حجیت کو ثابت کیا ہے۔ اس مقدمہ نے کتاب کی اہمیت کو اور بڑھادیا ہے۔ جلد دوم کے شروع میں مولانا علی میاں ندوی (دامت برکاتہم) کا مختصر مگر فکر انگیز مقدمہ ہے، موصوف [illegible]

حدیث کے نقصانات کو نئے انداز میں واضح کیا ہے اور مسلمانوں کی [illegible]

جو اثرات مرتب کیے ہیں، ان کی طرف اشارات کیے ہیں۔

معارف الحدیث کا یہ سلسلہ اب بھی الفرقان میں جاری [illegible]

تک پہنچائے اور مسلمانوں کو اس سے صحیح معنی میں استفادے کی توفیق [illegible]

الفرقان کے مستقل مطالعہ کی وجہ سے مولانا نعمانی کی خدمات اور طرز فکر سے واقفیت کسی حد تک زمانۂ طالب علمی ہی سے تھی، حافظہ پر زور ڈالتا ہوں تو یاد پڑتا ہے کہ کبھی کبھی مولانا سے مراسلت بھی کرتا تھا۔ مولانا کے بعض خطوط بھی میرے نام آئے لیکن میری زندگی میں ترتیب وانضباط کا جو فقدان رہا اس کی وجہ سے بزرگوں کے خطوط کی حفاظت بھی نہیں کرسکا۔

الفرقان میں مضامین کی اشاعت اور
حضرت مولانا نعمانیؒ کی ہمت افزائی

دارالعلوم دیوبند سے دورہ حدیث اور افتاء کرنے کے بعد ایک ایک سال مدرسہ محمدیہ میل کھیرالا (ضلع بھرت پور، راجستھان) اور مدرسہ ہدایت المسلمین کرہی (ضلع بستی) سے منسلک رہا، اس کے بعد تین سال مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں تدریسی خدمات انجام دیتا رہا، اس زمانہ میں حضرت مولانا نعمانی سے ربط و تعلق رہا، الفرقان میں مضامین اشاعت کے لئے بھیجتا رہا،

مولانا کی کرم فرمائی اور ذرہ نوازی سے الفرقان میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ الفرقان جیسے مستند و معیاری رسالہ میں مضامین کی اشاعت مجھ جیسے نوعمر کے لئے بڑے اعزاز اور عزت افزائی کی بات تھی۔

مدرسہ امدادیہ مراد آباد کے زمانۂ قیام میں احقر نے جناب قاضی عدیل عباسی مرحوم کی کتاب "تحریک خلافت" پر ایک مبسوط تبصرہ لکھ کر الفرقان میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ اس مضمون کی دوسری قسط موصول ہونے پر حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو گرامی نامہ تحریر فرمایا وہ اتفاق سے آسانی کے ساتھ مل گیا اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف کس طرح خورد نوازی کرتے تھے، ان کی مکتوب نگاری کا ایک نمونہ بھی قارئین کے سامنے آئے گا۔

باسمہ سبحانہ ۷۹/۶/۲۵ء

برادر مکرم! احسن اللہ الیکم و الینا سلام ورحمت

مضمون کا دوسرا حصہ بھی آج پہنچ گیا، اس کو میں نے دیکھ بھی لیا، حالانکہ پہلی قسط کو ابھی نہیں دیکھ سکا تھا، انشاءاللہ آج ہی یا کل دیکھوں گا۔

دوسرا حصہ جو آج دیکھ لیا ہے اللہ نے آپ سے خوب لکھوایا...... واقعہ یہی ہے کہ "" تحریک خلافت" کے دور میں دونوں شخصیتوں خلیفہ عبد الحمید اور کمال پاشا دونوں کے بارے میں بہت ہی غلط اور خلاف واقعہ ذہن بنا تھا ۔ قاضی صاحب ان چیزوں سے بالکل بے خبر ہیں جو بعد میں خاص کر عربی میں لکھی گئی ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو (کمال ہی کے دور میں یا اس کے بعد متصلاً) ترکی میں رہے تھے اس کے متعلق بہت سخت رائے رکھتے تھے اور اس کے بارے میں ہندوستانی علماء کی ناواقفیت کو بڑا جرم قرار دیتے تھے۔

انشاءاللہ تعالی پہلی قسط آپ کے مضمون کی جولائی ہی کے شمارہ میں آجائے گی۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

پانچ سال مختلف مدارس میں گذارنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں احقر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت بو کاتہم کی دعوت پر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے منسلک ہوا، اس وقت سے ہر ماہ ایک دوبار حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری کا

معمول تھا، ملاقات کے لئے عموماً عصر کے بعد حاضری ہوتی تھی۔ حضرت مولانا نعمانی بڑے تپاک، محبت کے ساتھ ملتے تھے، چائے وغیرہ کا ضرور نظم فرماتے، مولانا مرحوم کو چائے کا اعلیٰ ترین ذوق تھا، ان کے یہاں ہمیشہ بہت معیاری اور نفیس چائے پینے کو ملتی، بعض خوش مذاق احباب کے بہ قول اس جیسی چائے کے لئے شد رحال جائز بلکہ مستحسن ہے۔

حضرت مولانا نعمانی کی مجالس

مولانا نعمانی مرحوم کی ہر مجلس بڑی علم آموز، معلومات افزا ہوتی تھی، ان کی مجلس میں لا یعنی باتوں کا گذر نہیں تھا، حافظہ بڑا غضب کا تھا، پیری اور معذوری کے عالم میں بھی ان کا حافظہ جوان اور تازہ تھا۔ ساٹھ، ستر سال پرانے واقعات اس طرح تفصیل اور تیقن کے ساتھ سناتے تھے گویا یہ ابھی کل کے واقعات ہوں، ماضی کے اوراق پلٹتے تو تاریخ کا دفتر کھل جاتا، اپنے اساتذہ و اکابر کے علم و فضل، اخلاص و للٰہیت، تواضع و بے نفسی کے واقعات بہت مـ سناتے، تحریک آزادی، تحریک خلافت، لیگ و کانگریس کی کشمکش، جمعیۃ کے بارے میں بہت سی وہ معلومات دیتے جو مدون تاریخ کے اور نہیں ہو سکیں، مولانا نعمانیؒ کے بیان کردہ واقعات و حقائق قلمبند کر سوانح کا بڑا قیمتی اور نادر ذخیرہ ہوتا لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا اور ـب ـ. مولانا کے سینے میں دفن ہو کر چلے گئے۔

میری ڈائری میں ۲۶/ اپریل ۱۹۸۱ء کو حضرت مولانا نعمانیؒ سے ایک ملاقات کا ذکر ہے، اس ملاقات میں مولاناؒ نے جو باتیں فرمائی تھیں انھیں میں نے ڈائری میں قلمبند کر لیا تھا، اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے کیونکہ یہ گفتگو بعض اہم تاریخی حقائق پر مشتمل ہے۔

"... پھر عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا منظور نعمانی سے ملاقات کی غرض سے ان کے مکان پر حاضر ہوا۔ مزاج پرسی کے بعد حضرت مولانا نے تاریخ آزادی ہند کا ایک ورق الٹا، انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ میں جمعیۃ العلماء کی کانگریس میں غیر مشروط شرکت کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن میرا جھکاؤ حضرت مدنی ہی کے سیاسی موقف کی طرف تھا، حضرت مدنی انگریز کے خلاف ہر محاذ پر اور ہر ایک کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار تھے، کانگریس میں ان کی غیر مشروط شرکت یں ان کی خود اعتمادی کو بھی بڑا دخل تھا کہ پہلے انگریز ہٹیں پھر سب دیکھ لیا جائے گا، جمعیۃ کے صف اول کے بہت سے رہنما اس غیر مشروط شرکت کے خلاف تھے مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا ابو المحاسن سجاد صاحب بہاری، مولانا سجاد صاحب کا ارشاد مجھے اب تک یاد ہے کہ

زادی کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ مکمل انقلاب نہیں ہے، کہ قدیم عمارت کو بالکل مسمار
رکے نئی عمارت حسب منشا تعمیر کی جانے والی ہو۔ بلکہ مرحلہ وار اقتدار کی منتقلی ہو رہی ہے۔
بنی تدریجاً عمارت کی ایک ایک اینٹ نکال کر ان کی جگہ دوسری اینٹیں فٹ کی جا رہی ہیں۔ تو
میں دیکھنا یہ ہے کہ اس میں ہمارا کتنا روڑا فٹ ہو رہا ہے جمعیۃ العلماء پر مولانا مدنیؒ کے
ثرات سب سے زیادہ تھے اس لئے انھیں کے موقف کو جمعیۃ کا موقف مانا گیا اور مفتی کفایت اللہ
صاحب، مولانا سجاد صاحب وغیرہ نے ذہنی اختلاف کے باوجود اسی موقف کو اختیار کیا۔"

حضرت مولانا نعمانیؒ کی اکثر مجالس اسی طرح کی تاریخی، دینی معلومات پر مشتمل ہوا
رتی تھیں، اب انتہائی قلق ہو رہا ہے کہ سیکڑوں بار کی حاضری میں انھوں نے جو مفید اور اہم
تیں خود میرے سامنے بیان فرمائیں اگر انھیں قلمبند کر لیا ہوتا تو بڑا علمی و دینی سرمایہ ہوتا۔

ایک بار میں نے عرض کیا اردو زبان میں علمی، دینی، تاریخی مضامین لکھنے کے لئے کس
مصنف کا اسلوب اخذ کیا جائے تو مولانا نعمانیؒ نے سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کا
مطالعہ کرنے اور ان کا اسلوب اخذ کرنے پر زیادہ زور دیا۔

ایک بار اکابر دیوبند کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان حضرات کے معاصرین میں ایسے
متعدد علماء تھے جو علم و فضل میں ان سے کم رتبہ نہیں تھے لیکن حد درجہ اخلاص وللّٰہیت اور تواضع
کی وجہ سے اکابر دیوبند کا چراغ زیادہ روشن ہوا۔

تربیت کا خاص انداز

مولانا نعمانیؒ کی تربیت کا بھی لطیف اور حکیمانہ انداز تھا، اس سلسلے کا ایک واقعہ یاد آ رہا
ہے، مولانا کی خدمت میں عام طور پر ہم تین لوگ ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے (۱) جناب مولانا
ضیاء الحسن صاحب اعظمی مرحوم استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۲) جناب مولانا شمس
تبریز خان سابق رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ و حال استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی،
اور (۳) احقر۔ مولانا اعظمی مرحوم میرے اساتذہ کی عمر کے تھے، مولانا شمس تبریز خاں صاحب
بھی عمر و علم میں مجھ سے بڑھے ہوئے تھے لیکن ان دونوں حضرات کی کرم فرمائی اور خورد نوازی
نے مجھے ان سے بے تکلف بنا دیا تھا۔ حضرت مولانا نعمانیؒ کے یہاں حاضری کے موقع پر اکثر
شوق ملاقات میں میں ان حضرات سے آگے بڑھ جاتا اور مولانا نعمانی سے پہلے مصافحہ کر لیتا۔
ایک بار ایسے ہی موقع پر جب میں نے پیش قدمی کرکے مولانا سے سلام اور مصافحہ کیا تو مولانا
نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کرکے فرمایا "کبّر الکُبر" (بڑوں کو بڑائی دو) یہ ایک حدیث کے الفاظ

ہیں، جسے میں نے بار بار پڑھا اور پڑھایا تھا۔ لیکن اس موقع پر مولانا نعمانی نے حدیث کے الفاظ زبان سے ادا کیے تو معانی کی ایک دنیا ذہن میں گردش کرنے لگی اور مفہوم حدیث کی وسعت پوری طرح ذہن پر منکشف ہو گئی۔ اس حدیث سے وابستہ واقعہ یہ ہے کہ ایک انصاری صحابی کو خیبر میں کسی یہودی نے قتل کر دیا، مقتول صحابی کے تین اعزہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں اس معاملہ قتل کو پیش کرنے حاضر ہوئے۔ مقتول کے بھائی جوان تینوں میں سب سے کم عمر تھے انھوں نے گفتگو کا آغاز کیا اس موقع پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا "کبر الکبر" (بڑوں کو بڑائی دو یا بڑوں کی تعظیم کرو) آپ کا اشارہ اس جانب تھا کہ تینوں اعزہ میں جو سب سے معمر ہیں انھیں پہلے مقدمہ پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ حضرت مولانا نعمانی نے اس حدیث کو بجا طور پر ملاقات او مصافحہ پر بھی منطبق کیا۔ آج کل احادیث میں مذکور اس قسم کے آداب کا ہماری دینی مجلسوں میں بھی لحاظ نہیں کیا جاتا، کوئی بزرگ اگر ہاتھ لگ جائے تو مصافحہ کرنے والے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، خود اس بزرگ کے آرام و اذیت کا خیال بھی نہیں کرنے والے بوڑھے اور ضعیف لوگوں کو کون خاطر میں لاتا ہے، انھیں ہوئے نوجوان آگے بڑھ جاتے ہیں۔

غیر معمولی صبر و شکر

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے عمر کا خاصا طویل حصہ جسمانی معذوریوں میں گذارا، ۱۹۷۴ء میں جب وہ مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے تھے، دیوبند میں رکشا سے گرنے کی وجہ سے ان کی کولھے کی ہڈی کھسک گئی، اس کے بعد سے موصوف تقریباً صاحب فراش ہی رہے، آخری چند سال تو اس طرح گذرے کہ اٹھنا بیٹھنا کروٹ لینا سب کچھ دوسروں کے ہاتھوں ہوا کرتا تھا، شدید تکلیفوں سے دوچار رہے، سماعت، بصارت گویائی سب بری طرح متاثر ہوئی لیکن یادداشت اور دماغ برابر کام کرتے رہے، ان تکلیفوں اور معذوریوں میں مولانا نعمانیؒ کا صبر و شکر قابل رشک تھا، کبھی حرف شکایت زبان پر لاتے نہیں سنا، زبان ذکر سے تر رہتی تھی اور اللہ کے بے پایاں انعامات یاد کر کے سراپا سپاس رہتے تھے۔ ملاقات کرنے والوں سے حسن خاتمہ کی دعا کے لئے ضرور کہتے۔

ماہنامہ الفرقان سے اولاد کی طرح تعلق

الفرقان سے مولانا نعمانی کو ایسا ہی تعلق تھا جیسا تعلق ماں باپ کو اپنی عزیز ترین اولاد

سے ہوتا ہے ـــ تمام معذوریوں کے باوجود "الفرقان" کے تمام مضامین حرف بہ حرف پڑھتے یا سنتے اور اس کی افادیت ومعیار اور اشاعت کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔

دو تین سال پہلے کی بات ہے مولانا کی بیماری اور معذوری آخری درجہ کو پہنچی ہوئی تھی اور بیماری کا سلسلہ کافی دراز ہو چکا تھا، میرا خیال تھا کہ مولانا نعمانیؒ اب الفرقان کے مضامین سے بے خبر ہوں گے۔ اسی دوران یکساں سول کوڈ کے بارے میں میرا مضمون الفرقان کے چار شماروں میں شائع ہو چکا تھا، کئی مہینہ کے بعد برادرم مولانا شمس تبریز خان صاحب کے ساتھ مزاج پرسی کے لئے مولانا کے دولت کدہ پر حاضرہ ہوئی، بیماری کی شدت کی وجہ سے ارادہ تھا کہ اہل خانہ یا خادم سے حال معلوم کر کے چلے آئیں گے کیوں کہ مولانا کا حال یہ تھا کہ جب ملاقات کے لئے حاضری ہوتی تو پورے اہتمام کے ساتھ بیٹھتے تھے، خادم سے اصرار کے ساتھ آخر تک بٹھانے کے لئے فرماتے، کئی بار اصرار کے ساتھ عرض کیا گیا کہ آپ لیٹے رہیں، بیٹھنے کی زحمت نہ کریں لیکن مولانا گویا اس پر قادر نہیں تھے کہ ملاقات کے وقت لیٹے رہیں خادم نے آکر حال بتایا اور ہم دونوں کا سلام حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کیا، تو انھوں نے فوراً اصرار کے ساتھ اندر بلایا۔ ہم لوگ حاضر ہوئے تو مولانا سہارے سے بیٹھے ہوئے تھے، سلام ومصافحہ کے بعد بولنے کی کوشش کرنے لگے حالانکہ گویائی بھی کافی متاثر تھی بہت مشکل سے چند جملے بول پاتے تھے، فرمایا "آپ کے مضمون کی ساری قسطیں سن لیں، ماشاء اللہ بہت اچھا اور کامیاب مضمون ہے، اسے تو انگریزی میں آنا چاہئے۔ میں اس میں حصہ لینا چاہتا ہوں" پھر فرمایا ترجمہ کے لئے کون مناسب رہے گا؟ حیدآباد کے ایک وکیل صاحب تھے، بہار کے گورنر بھی رہے تھے مولانا نام سوچ رہے تھے، نام زبان پر نہیں آرہا تھا میں نے عرض کیا غالباً آپ جناب یونس سلیم صاحب کا نام لینا چاہتے ہیں، فرمایا ہاں! وہ اچھا ترجمہ کر سکتے ہیں، میں نے عرض کیا وہ خود کافی معمر اور مشغول ہو گئے ہیں، ان کے لئے ترجمہ کرنا مشکل ہوگا، آپ دعا فرمائیں کسی سے ترجمہ کرایا جائے گا میں نے گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مذکورہ بالا بات عرض کی، کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت مولانا نعمانی کافی تھک چکے ہیں اور ضعف بڑھتا جارہا ہے۔

میرے لئے یہ بات حد درجہ استعجاب کی تھی کہ مولانا اس شدید معذوری اور بیماری کے زمانہ میں بھی الفرقان کے مضامین پر مکمل نظر رکھتے ہیں اور ان کے جسم کی علالت اور ذہن

ں صحت میں کوئی مناسبت نہیں ہے، ہم جیسوں کا حال تو یہ ہے کہ ذرا مرض نے شدت اختیار کی
لکھنا پڑھنا سب بھول جاتے ہیں، مطالعہ کی ہمت نہیں ہوتی۔

رم فرمائیاں

مولانا نعمانیؒ کی کرم فرمائیوں اور قدر افزائیوں کو کس قدر یاد کیا جائے، قدم قدم پر
نھوں نے حوصلہ بڑھایا، ہمت دلائی، ہمیشہ ہم جیسے خوردوں کے ساتھ بھی اکرام کا معاملہ فرمایا،
للہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور شایان شان معاملہ فرمائے۔

۲۷/اگست ۱۹۹۰ء کا تحریر کردہ ان کا ایک مکتوب پیش نظر ہے، ان دنوں بھی ان کی
معذوری آخری حدوں کو چھو رہی تھی لیکن الفرقان کے مضامین پابندی سے پڑھتے تھے اور ہمت
فزائی کے کلمات تحریر فرماتے تھے، خط کا متن یہ ہے

باسمہ سبحانہ

برادر مکرم و محترم مولانا عتیق احمد بستوی صاحب زید مجدہ

سلام ورحمت

ماہ رواں اگست کے شمارہ میں آپ کا مضمون پڑھوا کر سنا۔ دل .
نے سلطان عبدالحمید خاں ثانی کی دو ڈائریوں کا ذکر کیا ہے، جی چاہتا ہے کہ
ں بنیاد پر آپ خود لکھیں، کوئی دوسرا آدمی میری نظر میں نہیں ہے جو اس کام کو بہتر طریقہ پر
نجام دے سکے۔

جی چاہتا ہے کہ آپ کو تشریف لانے کی زحمت دوں اور اس موضوع پر تفصیل سے کچھ
بات کروں لیکن اب حال یہ ہے کہ بولنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔
یہ چند سطریں بھی بمشکل املا کرا سکا ہوں۔

آپ کے لئے اللہ تعالیٰ دعا کا اہتمام آپ کے حق کے مطابق عطا فرمائے اور اس گنہ گار
بندہ کی دعائیں قبول فرمائے، خود دعاؤں کا سخت محتاج اور طالب ہوں۔

والسلام
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود قاسمی عفی عنہ

۵/صفر ۱۴۱۱ھ

خط لکھا کر ختم کر چکا تھا، بعد میں خیال آیا کہ دولت عثمانیہ کی تاریخ جس کی ضرورت کا
آپ نے ذکر کیا ہے بنام خدا اس کام کو آپ ہی شروع کر دیں، آپ کے مضمون سے اندازہ ہے کہ

آپ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے اس کو بہتر طریقہ پر پورا کر سکیں گے، والسلام آخراً۔

حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میں دولت عثمانیہ پر کام تقریباً مکمل کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ایک ملاقات میں جب میں نے ان سے ذکر کیا کہ میں نے کئی سالوں کی محنت کے بعد دولت عثمانیہ کی خصوصاً اس کے دور زوال (الغاء خلافت وغیرہ) کی تاریخ مکمل کر لی ہے۔ اسی سلسلے میں انیسویں بیسویں صدی کی چار تحریکات (فری میسن، صہیونیت، عرب قومیت، ترک قومیت) کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اسی کے بعض حصے الفرقان میں اشاعت کے لئے دیئے تھے۔ اب صرف اتنا کام باقی ہے کہ اس موضوع پر آئی ہوئی چند نئی کتابوں سے مدد لے کر کچھ ترمیم واضافہ کیا جائے اور آخری نظر ڈال کر اسے کتابی صورت میں اشاعت کے لائق بنایا جائے تو حضرت مولانا کی خوشی ومسرت کی انتہا نہ رہی بہت دعائیں دیں اور اصرار کے ساتھ فرمایا کہ جس طرح ہو سکے اس کام کو آخری شکل دے لیں اور اشاعت کے قابل بنادیں لیکن اپنی محرومی کو کیا کہوں کہ اب تک دولت عثمانیہ والا کام چند دوسرے کاموں کی طرح اسی حال میں پڑا ہوا ہے، دیگر تدریسی و تصنیفی مصروفیات اور کچھ فطری کاہلی کی بنا پر اب تک اسے آخری شکل نہیں دے سکا، اگر مولانا نعمانیؒ کی حیات میں یہ کام منصۂ شہود پر آتا تو کتنی دعائیں ملتیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو آخری شکل دے کر منظر عام پر لانے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

صفحہ ۲۴۲ کا بقیہ

سے بچ کر ساحل سکون وطمانیت پر آگا ہوں، اس دن سے آج تک یہ حال ہے کہ کہیں کوئی مغالطہ انگیزی کی بات در پیش ہوتی ہے تو مسلک اہل سنت والجماعت کے آغوش حقیقت میں سکون حاصل ہو جاتا ہے ع

جزاک اللہ چشمم باز کردی

کاش یہ کتاب ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں پہنچ جاتی! ...... دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف کی اس کتاب کو ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بنادے ۔ آمین

اللهم اهدنا الى سواء السبيل -- ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا و هب لنا من لدنك رحمه انك انت الوهاب ۔

☆☆

جناب اسیر ادروی ، بنارس

اسلامی ہند کی ایک تاریخ ساز شخصیت

مولانا محمد منظور نعمانی سنبھلی مدیر الفرقان ۴ر مئی ۱۹۹۷ء کو ۹۲ سال کی عمر میں سفر
آخرت پر روانہ ہوگئے، پوری زندگی انھوں نے دین حق کی سربلندی اور اسلام د
بنرد آزمائی میں گذاردی، سنگین سے سنگین تر حالات بھی ان کی دینی جدوجہ
باطل کی راہ میں پیش قدمی کو نہ روک سکے۔ ساحل پر کھڑے ہو کر طوفاں
بہت ہوتے ہیں لیکن دریا میں اتر کر طوفان کی ہولناکیوں اور ہلاکت خیزیوں
کا حوصلہ اور ہمت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے، ان کی تعداد اتنی مختصر ہوتی ہے
انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، ایسے ہی کمیاب افراد میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام
نامی شامل ہے۔

ان کا عزم آہنی، ان کی ہمت فولادی، ان کا جوش عمل طوفان بدوش، ان کا حوصلہ ناقابل شکست، دین کی راہ میں ان کی جدوجہد سیماب صفت، وہ جس مہم پر چلے پورے جوش وخروش اور پورے ولولے کے ساتھ چلے، ان کا دل دین حق کی سربلندی کے جذبات سے معمور، ان کا دماغ علوم ومعارف کا خزانہ، ذہانت وفطانت ان کی کنیز، زور استدلال زور بیان ان کا غلام، علماء حق کے خلاف فتنہ برپا کرنے والوں کے محاذ پر پوری جاں سپاری اور جذبۂ فداکاری کے ساتھ ٹوٹ پڑنے والے، کبھی کبھی تو دل جذبات کے لاؤلشکر لے کر اتنی تیز روی کے ساتھ پیش قدمی سے آگے بڑھا کہ عقل اور مصلحت دونوں اپنی جگہ دم بخود اور حیرت زدہ رہ گئیں، سست گامی انھوں نے کبھی نہیں سیکھی، تیز گامی بلکہ برق رفتاری ان کی فطرت تھی۔

میدان عمل کا انتخاب

مولانا مرحوم دینی جد وجہد اور اپنی عملی سرگرمیوں میں اپنی راہ خود منتخب کرتے، کسی

خارجی دباؤ یا کسی دوسرے کے مشورں کا ان کی عملی سرگرمیوں میں کبھی کوئی دخل نہیں رہا، دل میں جو جذبہ اُبھرتا دل کی گہرائیوں سے اُبھرتا۔ مصلحت اندیشی، خطرات کے احتمالات کا کہیں دور دور گذر نہیں ہوتا، انجام سے بے پرواہو کر طوفان میں چھلانگ لگا دینا ان کا مزاج تھا، عقل دلی جذبات کے تابع تھی، دل اپنی پسندیدہ راہ پر چل پڑتا، عقل مصلحت اندیش کو اسکا دامن پکڑنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

جب مولانا نعمانی دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۲۲ء میں سند فضیلت لیکر اپنے وطن سنبھل میں لوٹ کر آئے تو پورے ہندوستان میں بدعات و خرافات، مشرکانہ عقائد اور رسم ورواج کی حمایت میں بدایوں اور بریلی کے علماء نے ایک شور برپا کر رکھا تھا، ان تمام خرافات کو سند جواز ہی نہیں دے رکھی تھی بلکہ ان بدعات کی مخالفت کرنے والوں کو سب و شتم اور دشنام طرازی سے آگے بڑھکر ان پر کفر کا فتوی دے رکھا تھا۔ علماء دیوبند نے ان بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد و خیالات کے خلاف جہاد چھیڑ رکھا تھا اور جاہلی رسم ورواج کے خلاف اپنی تحریک اصلاح جاری کر رکھی تھی۔ وہ اسلام کو صحیح خدوخال کے ساتھ مسلم معاشرہ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ علماء سوء جوان خرافات کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان کے مفاد پر اس سے ضرب پڑتی تھے اسلئے وہ تحریک اصلاح کو ناکام بنانے کیلئے ہر طرح کی سازشوں میں مصروف تھے اور اصلاح کی مہم میں پوری جاں سپاری کے ساتھ حصہ لینے والوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے اور ان پر اپنی کمینگاہوں سے زہریلے تیر برسا رہے تھے۔ علماء حق کو ذلیل ورسوا کرنے اور جاہل عوام کو ان کے خلاف اشتعال دلا کر ان کی جان کا دشمن بنانے کی ہر امکانی جدوجہد کر رہے تھے اور وہ بڑی حد تک اپنی تگ و دو میں کامیاب بھی ہو رہے تھے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے تھے کہ علماء حق کو بعض مقامات پر جانے میں جان کے خطرات لاحق تھے۔

ٹھیک یہی ماحول تھا اور یہی حالات تھے جب مولانا نعمانی دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر وطن آئے تھے۔ سنبھل اور امروہہ کے مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے چار سال گذار چکے تھے۔ اسی تدریسی دور میں بریلوی فرقے سے تین چار مناظرے مختلف مقامات پر کر چکے تھے، لیکن مولانا نعمانیؒ اپنی اس محدود جدوجہد اور عملی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ اس سے بہت آگے جانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ تکفیری فتنے کی شدت کا تقاضا کچھ اور تھا، وار بچانے کے ساتھ ساتھ وار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے انھوں نے ایک بار حالات کا جائزہ لیا اور ذہن میں لائحہ عمل بنایا اور دشمن کی کلائی مروڑ کر اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے کا جذبہ اُبھرا

اور یہ جذبہ اتنی شدت سے اُبھرا کہ انجام سے بے پرواہو کر اس دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑنے اور فتنوں کے سرچشمہ اور منبع و مخرج بریلی جاکر اس فتنہ کے دہانے کو بند کرنے کا عزم کرلیا، ساری مصلحتوں اور خطروں کو پس پشت ڈالا۔ عقل اور مآل اندیشی دامن پکڑتی رہی لیکن آپ دامن جھٹک کر آگے بڑھ گئے اور بریلی پہونچ کر وہیں خیمہ گاڑدیا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مناظروں کا دور

آپ نے بریلوی مکتب فکر کے سب سے مضبوط قلعہ مدرسہ منظر اسلام بریلی پر حملے کے آغاز سے اپنی مہم شروع کی اور خود ان کے مدرسہ میں گئے جوان کا ایک محفوظ قلعہ تھا، مولانا احمد رضاخان صاحب تو "حسام الحرمین" کی تلوار اپنے جانشینوں کے ہاتھ سفر پر جاچکے تھے البتہ ان کے جانشین تخت اقتدار پر متمکن تھے۔ مولانا کا چیلنج دیا لیکن جب مناظرہ کی نوبت آئی تو اپنی جگہ انھوں نے اپنے مولوی سردار احمد گورداسپوری کو اپنا وکیل بناکر کھڑا کردیا

ادری ضلع اعظم گڈھ کا مناظرہ

بریلی کے مناظرہ کے کچھ ہی دنوں بعد میرے وطن ادری ضلع اعظم گڈھ میں ہندوستان گیر شہرت کا مناظرہ ہوا۔ یہاں بریلوی مکتب فکر کے دو ممتاز اور سربرآوردہ مولوی صاحبان موجود تھے ایک مولوی نعیم الدین مرادابادی اور دوسرے مولوی حشمت علی پیلی بھیتی، یہ دونوں ایک جلسہ عام میں تقریر کیلئے بلائے گئے تھے، دن میں جلسہ ہو رہا تھا۔ ۱۱ بجے کا وقت ہوگا، اسٹیج پر مولوی حشمت علی صاحب تقریر کررہے تھے اور مولوی نعیم الدین بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی صورت حال میں مولانا عبداللطیف نعمانی نے جلسہ عام میں جاکر ان دونوں کو مناظرہ کا چیلنج دیا اور ان کے فرار کا راستہ بند کردیا، اسکے باوجود مولوی نعیم الدین پہلی ٹرین سے فرار کرگئے البتہ عوام نے مولوی حشمت علی صاحب کو زبردستی روک لیا۔ پھر تین دنوں تک بڑا ہی ہنگامہ خیز مناظرہ ہوا۔ ہمارا چھوٹا سا گاؤں ادری آدمیوں کا جنگل بن گیا تھا۔ پورا ضلع سمٹ آیا تھا۔ مناظرہ کا موضوع مسئلہ علم غیب تھا۔ لیکن فریق مخالف کبھی اصل موضوع پر گفتگو نہ کرسکا۔ جب عقائد کی دقیق ترین بحثوں پر گفتگو آتی تو وہ حسام الحرمین کے فتووں کی بات لے آتے، اکابر علماء دیوبند

کی کتابوں کی عبارتوں پر تقریر شروع کر دیتے، جب جب مولانا نعمانی اصل موضوع پر ان کو گھیر کر لے آتے تو اول فول بکنا شروع کر دیتے۔ جھنجلاہٹ، برہمی، سخت سست الفاظ کا استعمال مولوی حشمت علی کی طرف سے مسلسل چلتا رہا، علماء دیوبند کے کفر کا اعلان دانت پیس پیس کر کرتے، مولانا نعمانی مولوی حشمت علی کی اس حرکت مذبوحی پر صرف مسکراتے رہتے تھے، جب مولانا نعمانی کی گرفت سے نکلنے کی کوئی شکل نہیں رہی تو اپنے ہم مشربوں سے کہہ کر بذریعہ پولیس تیسرے دن مناظرہ بند کرادیا۔ حلقہ کے تھانیدار نے نقض امن کا اندیشہ بتا کر اعلان کر دیا کہ کل سے مناظرہ بند کیا جاتا ہے۔ اگرچہ موضوع مناظرہ پر مولانا کے سارے سوالات تشنہ جواب ہی رہے، مولوی حشمت علی نے اصل موضوع پر کبھی گفتگو کرنے کی جرأت ہی نہیں کی لیکن عام مسلمانوں نے علی رؤس الاشہاد یہ جان لیا کہ حق مولانا نعمانی کی طرف ہے۔ فریق مخالف کے پاس سوائے سب و شتم، دشنام طرازی اور کافر گری کے اور کوئی علمی جواب نہیں، وہ آخر تک اپنی کم علمی کی پردہ پوشی کی جد و جہد میں مصروف رہے۔

تین دنوں کے بعد یہ مناظرہ بند تو ہو گیا لیکن اس کا اثر ہمارے ضلع اعظم گڈھ کے مسلمانوں پر اتنا پڑا کہ یہاں کی نوّے فیصد آبادی جو بدعات و خرافات میں مبتلا تھی وہ اس سے تائب ہو گئی اور ضلع اعظم گڈھ کے سواد اعظم نے مولانا نعمانی کے اس جرأتمندانہ اقدام سے حق کی روشنی پالی اور سابقہ روش سے ایک دم کنارہ کش ہو گئے، سوائے چند چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے پورا ضلع ان بدعات و خرافات اور مشرکانہ عقائد و خیالات سے پاک ہو گیا۔ اور ان لاکھوں مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی جو توفیق حاصل ہوئی اسکے اجر میں مولانا مرحوم اجر عظیم کے مستحق ہوئے۔

وہابی اور وہابیت کا طعنہ

مولوی احمد رضا خان صاحب نے جب دجل و فریب سے کام لیکر علماء حق کے خلاف، علماء حجاز سے فتوی حاصل کیا تھا اس وقت حجاز پر ترکوں کی حکومت تھی اور جب وہ ہندوستان لوٹ کر آئے اور اس فتوی کو حسام الحرمین کے نام سے طباعت کا انتظام کر رہے تھے تب تک حجاز میں انقلاب آچکا تھا، ترکی حکومت خلافت عثمانیہ کی طرف سے حجاز کا گورنر شریف حسین تھا، اس زمانہ میں انگریزوں کا فوجی جنرل ولسن جدہ میں مقیم تھا۔ اس نے شریف حسین کو ورغلا کر باغی بنادیا اور اس نے بغاوت کر کے حجاز سے ترکی حکومت کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کرلی۔ اسی جنگ عظیم کے موقعہ پر انگریزوں نے ترکی حکومت کے حصے بخرے کر کے خلافت عثمانیہ کا وجود

مٹا دینے کی کارروائیاں شروع کردیں جسکی وجہ سے پورے عالم اسلام میں تہلکہ مچ گیا۔ ہندوستان میں اسی واقعہ کی وجہ سے تحریک خلافت چلی۔ یہ اتنی طاقتور تحریک تھی کہ انگریزی نظم حکومت بے اثر ہو کر رہ گیا، عوام نے اپنی پولیس اور اپنی عدالتیں قائم کرلیں۔ سارے باہمی مسائل از خود حل کرتے، مقدمات کے فیصلے کرتے۔ مجرموں کو سزائیں دیتے، پورے ملک میں "خلافت زندہ باد" کے نعرے کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری تمام سیاسی پارٹیاں یا تو خلافت تحریک کی حمایت کرتیں یا مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں، اور ان کی سرگرمیوں پر اُوس پڑ گئی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ہندوستان کے ہیرو بن گئے۔ سارے مسلمان تو ہم آواز تھے ہی، غیر مسلم بھی نعرۂ تکبیر اللہ اکبر میں ہم آواز تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کا اتنا شاندار، بے مثال مظاہرہ ہندوستان کی تاریخ نے کبھی نہیں دیکھا تھا جو شخص یا جماعت کوئی ایسا کام کرتا یا ایسی بات کہتا جس سے اس اتحاد پر ضرب پڑتی تو پورے ملک کی اس پر لعنت ... لگتی ...
خلافت کی مخالفت کرنے والوں کے جنازے پڑے رہ جاتے، ان کو ...
تھے۔

لیکن ہندوستان کے مقدر میں ابھی غلامی کے بہت دن
خلافت عثمانیہ کی بحالی کیلئے پوری قوت سے تحریک چلائی جارہی تھی۔
ایک ترکی لیڈر مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنے ہاتھوں قباء خلافت کو تار تار کردیا۔ اور ترکی کی سرزمین سے خلافت کا جنازہ نکال دیا۔ ہندستان کی تحریک خلافت اپنی موت آپ مرگئی۔

تحریک خلافت کے اس پورے دور میں مولوی احمد رضا خان کی حسام الحرمین کی تلوار زنگ کھاتی رہی کیونکہ اسکی اشاعت سے اتحاد و اتفاق میں خلل پڑتا تھا۔ اسطرح کی اٹھنے والی ہر آواز کو عوام گلا گھونٹ کر بند کرنے کیلئے بیتابی کے ساتھ دوڑ پڑتے تھے اس لئے ان کی تکفیری مہم اپنی قبر میں سوتی رہی، لیکن حالات نے پلٹا کھایا حجاز میں شریف حسین کی بغاوت کی سزا والی نجد سلطان عبد العزیز بن سعود نے شریف حسین پر حملہ کر کے دی، شریف حسین کو شکست ہوئی، پورے حجاز پر سلطان عبد العزیز کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے اپنے مسلک کی رُو سے قبروں پر بنے ہوئے قبوں کو منہدم کرادیا، سلطان کے اس اقدام کی خبر جب ہندوستان پہونچی تو اسکی مذمت میں جلسے ہونے لگے، رضاخانی جماعت نے اس معاملہ کو اپنی جماعت کا ایشوء بنالیا اور علماء دیوبند کو سعودی حکومت کے ان اقدامات سے جوڑ دیا اور ان کو وہابی اور نجدی گالیاں دینی شروع کردیں۔ حسام الحرمین کی تلوار از سر نو سان چڑھائی گئی، تحریک خلافت کے پورے دور میں ان کی تکفیری مہم جو

مردہ خانے میں لاش کی طرح پڑی رہی، پھر اس میں جان ڈالی گئی اور پھر وہ میدان میں آ گئے۔

اس دور میں مولانا نعمانی جان ہتھیلیوں پر لیکر ان تمام مقامات تک پہونچنے کی کوشش کرتے جہاں رضاخانی جماعت کے نمائندوں نے زہر افشانی کی ہے۔ ہر طرح کے خطرات کا سامنا کرتے، ان کے تمام جبہ قبہ والے مولویوں کو مولانا نعمانی کا چیلنج عام تھا۔ کیسا ہی خطرناک ماحول ہو، کتنے ہی اندیشناک حالات ہوں، آپ کا بر وقت اس مقام تک پہونچنا ضروری تھا۔ مولانا مرحوم پورے دس سال تک مسلسل ان کے تعاقب میں رہے، ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں بچا، جہاں رضاخانیوں نے بدعات و خرافات کی حمایت میں لن ترانیاں ہانکی ہوں اور مولانا نعمانی کی حق کی آواز وہاں نہ گونجی ہو، بریلوی مکتب فکر کے لوگ مسلمانوں کی شکل و صورت میں رہکر اسلام کی شکل بگاڑنے والے جہاں بھی گئے ان کو للکارا، ان کے خلاف تقریریں کیں، مضامین لکھے، مناظرے کئے اور تمام متنازع فیہ مسائل کو علم واستدلال کی روشنی میں حق کو اتنا واضح کر دیا کہ ہندوسان کا سواد اعظم جسکو قدرت نے ذرا بھی علم دیا تھا، سچائی کو پا گیا اور اس نے بدعات و خرافات سے توبہ کرلی۔ احقاق حق اور ابطال باطل کا کوئی دقیقہ آپ نے نہیں چھوڑا، دس برسوں کی انتھک جد و جہد کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اب جو لوگ اپنے آباء اجداد کی گمراہیوں میں مبتلا ہیں وہ وہ حق کی روشنی کو سر کی آنکھوں سے دیکھکر بھی اسکو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تب آپ نے فیصلہ کیا کہ اب مناظروں کی ضرورت نہیں، اب اسکی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ اب مثبت انداز میں دین کی خدمت ہی وقت کی ضرورت ہے۔

جماعت اسلامی کی تشکیل

اس غور و فکر کے دور میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جو کبھی جمعیۃ علماء ہند کے اخبار میں کام کرتے تھے، اب اپنا ایک رسالہ حیدر آباد سے ترجمان القرآن کے نام سے جاری کر رکھا تھا، مولانا نعمانی اسکی ابتدائی اشاعت سے اسکا مطالعہ کر رہے تھے۔ آپ ترجمان القرآن پابندی سے دیکھتے اور پڑھتے تھے، اس میں اقامت دین، حکومت الٰہیہ کا قیام اور اسلامی انقلاب کی جو دعوت دی جا رہی تھی بتدریج آپ اس سے متاثر ہوتے رہے یہاں تک کہ کچھ دنوں بعد یہ دعوت آپ کے دل کی آواز بن گئی۔ دل جذبات سے سرشار، ایثار و قربانی آپ کی فطرت آپ کا مزاج، دین و ملت کی خدمت کیلئے سوز و گداز سے بھرا ہوا دل رکھتے تھے، اثر پذیری اس کا ایک عنصر تھا، مولانا نعمانی مودودی صاحب کی تحریروں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دل ان کی اقامت دین اور اسلامی انقلاب کی دعوت سے ہم آہنگ ہوتا چلا گیا، دل کی تڑپ بڑھتی چلی گئی اور

آپکو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دین کی خدمت کا اس سے بہتر طریقہ موجودہ دور میں کوئی دوسرا نہیں ہے۔

مودودی صاحب کے ذہن میں ابتک کسی تنظیم کا کوئی خاکہ نہیں تھا، نہ جماعت بنانے کا کوئی ارادہ، کچھ ہی دنوں بعد جب ایک جماعت کی تشکیل کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کا اظہار کیا تو سب سے پہلے جس نے پوری صدق دلی اور پورے جوش و جذبے سے مودودی صاحب کا ساتھ دیا اور دست تعاون بڑھایا وہ مولانا نعمانی مرحوم تھے، جماعت اسلامی کی تشکیل میں ان کی حیثیت شریک غالب کی تھی۔

شک کا کانٹا

مگر کچھ ہی عرصہ بعد آپ کو احساس ہوا کہ جو راہ منتخب کی گئی ہے۔ ترکستان کو جارہی ہے۔ مولانا نعمانی شدت دین پسندی اور اسلام کے سرشار ہونے کیوجہ سے مودودی صاحب کے حلقہ اثر میں آگئے اور سال ضائع ہوگئے۔

خدمت دین کی نئی راہیں

مولانا نعمانی اس دور کے مشہور بزرگ مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری رحمۃ اللہ علیہ سے بہت متأثر تھے، آپ نے ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ حضرت رائے پوری نے بیعت کے بعد آپ کو بانیٔ تبلیغ جماعت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی طرف رجوع کرنے اور ان کی خدمت میں حاضری کے لئے تاکید فرمائی، شاید اس میں راز یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے تعلق سے جو روحانی کرب اور ذہنی و فکری زخم لگے ہیں ان زخموں کا مداوا اس طرح ہو جائیگا، مولانا نعمانی پہلی فرصت میں بستی نظام الدین دہلی اس وقت حاضر ہوئے جب مولانا محمد الیاس صاحب بستر علالت پر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ انھوں نے اس حالت میں بھی مولانا نعمانی کا کھڑے ہوکر استقبال کیا اور فرمایا کہ میں انشاء اللہ اس بیماری سے اچھا ہو جاؤں گا اور مولانا نعمانی سے وعدہ لیا کہ کچھ وقت جماعت میں لگائیں گے، آپ نے وعدہ کرلیا، قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید، مولانا محمد الیاس صاحب اس تشویشناک بیماری سے صحتیاب ہوگئے۔ مولانا نعمانی پہلی بار ان کے ساتھ میوات کے سفر میں گئے پھر کچھ دنوں کے بعد مولانا کاندھلوی نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنو کا سفر کیا۔ اس جماعت میں شریک ہونے کیلئے

مولانا نعمانی بریلی سے لکھنو پہونچے اوران کے ساتھ رہ کر پوری دیدہ ریزی کے ساتھ جماعت کے کاموں اور اصولوں کو دیکھااور اس کے طریقہ کار کا گہرا مطالعہ کیاجب دل اس طریقہ کار کی افادیت پر مطمئن ہو گیا تو پوری بصیرت اور انشراح قلب کے ساتھ بقیہ زندگی دعوت و تبلیغ کے لئے وقف کردی اور اپنے رسالہ الفرقان کو دعوت و تبلیغ کیلئے خاص کرلیا۔ آپ نے اس سلسلہ میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور زندگی کا بیشتر حصہ اس مقدس راہ میں صرف کرتے رہے۔

زندگی کا آخری دور

میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک پورے چار سال لکھنؤ میں رہا ہوں مولانا مرحوم کی دید وشنید حاصل ہوئی اور کبھی کبھی سلام و مصافحہ کی سعادت بھی ہوتی۔ بعض معاملوں میں ایک دوبار مولانا کے گھر پر بھی حاضری رہی۔ مولانا مجھ سے واقف نہیں تھے البتہ غائبانہ میرا نام جانتے تھے جیسا کہ مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی نے بتایا کہ جب تمھاری کتاب مولانا موصوف کو دی اور مصنف کا تعارف کرانا چاہا تو مولانا نے فرمایا کہ میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں، غائبانہ تعارف کا واقعہ یہ ہوا کہ جب الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر شائع ہوا تو ایک مشہور عالم نے اکبر کی گمراہی کا واحد ذمہ دار ابوالفضل اور فیضی دونوں بھائیوں کو ثابت کیا، میں اس سے متفق نہیں تھا، میں نے ایک مضمون لکھا جس میں میں نے فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ ساتھ اتنا ہی ذمہ دار ملا عبدالقادر بدایونی، ملا عبداللہ سلطانپوری اور ملا عبدالنبی کو بھی قرار دیا جو اکبر کے دربار سے وابستہ تھے اور فیضی اور ابوالفضل کے جرم کو کچھ ہلکا دکھانے کی کوشش کی تھی۔ مضمون اشاعت کیلئے الفرقان کو بھیج دیا۔ مولانا میرے مضمون سے متفق نہیں تھے۔ لیکن الفرقان میں شائع کیا البتہ مضمون سے پہلے سات آٹھ صفحوں کا نوٹ لکھا، پھر اسکے بعد میرا مضمون اور پھر مضمون کے خاتمہ پر تین چار صفحوں کا استدراک، میرے مضمون کو دونوں طرف سے گھیر کر پھانسی کے تختے پر کھڑا کردیا۔ میں طالب علم، مولانا عالم بے مثال۔ کچھ کہنے کی میری جرأت کہاں! میرے لئے یہی کیا کم تھا کہ مولانا نے میرے مضمون کو درخور اعتنا سمجھا، اسی مضمون کیوجہ سے مولانا مجھ سے غائبانہ واقف تھے۔ مولانا سے بالمشافہ ایک دوبار ملنے کے باوجود میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا، بس ایک ارادتمند کیطرح کبھی کبھی سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل کرلیا کرتا تھا۔ البتہ قیام لکھنؤ کے زمانہ میں چار سالوں تک آپ کی امامت میں نماز جمعہ ادا کرنے کی سعادت ملی۔ میری قیامگاہ سے چند قدموں کے فاصلہ پر مرکز کی مسجد تھی جس میں آپ جمعہ کی نماز پڑھاتے تھے، دورکعت نماز

باقی صفحہ ۲۶۲ پر

جناب سید ثناء اللہ
فاضل جامعہ رحیمیہ لاہور

ایک تاریخی شہادت

بخدمت جناب مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سجاد نعمانی ندوی

السلام علیکم کے بعد مزاج بخیر۔

آپ کے والد گرامی قدر حضرت علامہ محمد منظور صاحب نعم
کا پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا۔ آپ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ اللہ
میں جگہ عطا فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل کی توفیق دے آمین۔
رہا ہوں جو میں نے زمانہ طالب علمی میں کیا جو انکے علم و فضل سے تعلق رکھتا ہے۔ [illegible]
۳۵۔۱۹۳۶ء میں جامعہ اچھرہ لاہور میں حضرت مولانا علامہ مہر محمد صاحب مرحوم سے قاضی مبارک امور عامہ بیضاوی شریف پڑھا کرتا تھا۔ مسجد وزیر خاں لاہور میں دیوبندی اور بریلوی حضرات کے درمیان درج ذیل مسائلِ متنازعہ پر مناظرہ ہونا طے پایا۔ علم غیب، حاضر و ناظر، مختارِ کُل۔ اجتماع تین دن ہوتا رہا لیکن افسوس کہ علماء کرام کی باہمی شرائط طے نہ ہو سکیں اور کوئی نتیجہ خاطر خواہ بر آمد نہ ہوا۔ اس مناظرہ میں علماء دیوبند کی طرف سے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور مولانا ابوالوفا شاہ جہانپوری تھے۔ ادھر بریلویوں کی طرف سے مولوی حشمت علی وغیرہ درجنوں آئے ہوئے تھے۔ گو میں اس وقت طالب علم تھا۔ لیکن آپ کے والد محترم مرحوم و مغفور کی گفتگو سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ علم و عرفان کے پہاڑ ہیں اور جسم ظاہری علم پر ایک پردہ ڈالا گیا ہے۔ اگر مناظرہ ہو جاتا تو ہمیں یقین کامل تھا کہ بریلوی علماء کو ایسی عبرتناک شکست ہوتی جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھی جاتی۔ اسکے علاوہ میرا دوسرا مشاہدہ۔ سلانوالی ضلع سرگودھا میں جو مناظرہ مولوی حشمت علی بریلوی سے علم غیب پر ہوا اس جلسہ کے صدر مولوی کرم دین صاحب دبیر رئیس اعظم آف بھین ضلع جہلم تھے۔ جنھوں نے آپ کی

گفتگو کی سنجیدگی اور متانت کو دیکھا۔ ادھر مولوی حشمت علی بریلوی کی دشنام طرازی اور پھکڑ بازی کو بھی دیکھا۔ حالانکہ مولوی کرم دین صاحب ہمیشہ بریلوی علماء کی حمایت کرتے رہتے تھے اور خود بھی بڑے سخت بریلوی تھے۔ مگر اس مناظرہ میں نعمانی صاحب کی سنجیدگی اور حشمت علی صاحب کی پھکڑ بازی کو دیکھ کر بریلویت سے بہت متنفر ہوئے۔ آپ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے رابطہ قائم کیا اور اپنے بیٹے قاضی مظہر حسین صاحب کو دیوبند میں داخلہ دلوایا۔ جہاں جا کر قاضی صاحب نے علم حاصل کیا اور بعد میں حضرت مدنی ؒ کے خلیفہ بنے۔ میں نے یہ مناظرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اللہ آپ کے والد صاحبؒ کے درجات بلند کرے، آمین۔

الراقم

سید ثناء اللہ فاضل نیلا گنبد، جامع رحیمیہ لاہور

خلیفۂ مجاز حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ

صدر گوگیرہ، ضلع اوکاڑہ

صفحہ ۲۶۰ کا بقیہ

جو چند منٹوں میں ادا ہو جاتی تھی اس کا تاثر آج تک مرے دل میں موجود ہے۔ مولانا پر خوف و خشیت الٰہی کا غلبہ تھا، آپ کے خشوع و خضوع اور استغراق کا عالم دیدنی ہوتا تھا۔ قرأت کرتے ہوئے آپ کی آواز شدت گریہ سے بھرا جاتی تھی۔ ترغیب و ترہیب کی آیتوں پر ہچکیاں بندھ جاتیں، تھرتھراتے ہونٹوں اور کپکپاتی ہوئی زبان سے الفاظ قرآنی کی ادائیگی اور اس پر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آپ کی غمناک آواز ایسی کیفیت پیدا کرتی تھی کہ خود میری آنکھیں بھر آتی تھیں، طویل علالت کے باوجود دماغ برابر کام کرتا رہا، یادداشت صحیح تھی۔ بہت سی تحریریں جو بعد میں شائع ہوئیں اسی معذوری کے زمانہ میں املا کرائیں، بجاطور پر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نعمانی زندگی کی آخری سانس تک دین کی خدمت پوری قوت ایمانی کے ساتھ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اس مجبوری میں بھی جبکہ اپنی ضرورتوں کے لئے بھی زبان کو جنبش دینی دشوار تھی، دین و شریعت کی سرافروزی اور سربلندی کے لئے کام کرتے رہے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، اللھم اغفر وارحم وانت خیر الراحمین

☆☆☆

عتیق الرحمٰن سنبھلی

والدِ ماجدؒ

کچھ یادوں کی روشنی میں

عمر کی سوئی ستر (۷۰) کے ہندسے سے جا لگی ہے۔ اس کے ابت...
طور سے ان کے زیر سایہ گذرے۔ حافظہ اچھا ہوتا تو کام کی باتوں...
ہو جاتی۔ مگر یہ پہلے ہی کچھ اچھا نہ تھا۔ اب تو حال اور بھی خراب ہے۔ تا...

نمایاں ترین خصوصیت

ان کی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت سراپا مقصدیت اور اسکے مطابق مشغولیت تھی۔ عمر کا کوئی لمحہ انہیں ضائع کرتے اور کسی ایسے کام میں صرف کرتے نہ پایا جس کے بارے میں خیال کیا جاسکے کہ وہ آخرت میں کام آنے والا نہ تھا۔ متعدد اصحاب نبی ﷺ کی روایت سے ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ حشر میں آدمی کو چار سوالوں کا سامنا کئے بغیر چھٹکارا نہیں ملے گا(۱) عمر کاہے میں خرچ کی؟(۲) (خاص کر) جوانی کی قوتوں کا مصرف کیا رہا؟ (۳) جو علم پایا تھا اس پر کیا عمل کیا؟ (۴) مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ مال کے بارے میں تو ان کے والد ماجد علیہ الرحمہ کی دعا تھی کہ "اے اللہ دولت تو اسکے پاس کبھی نہ ہو، البتہ اسکا کام بھی نہ رکے"۔ اور یہ دعا انہوں نے اپنے اس بیٹے کے لئے جو انہیں بہت ہی عزیز تھا۔ عزیز تر ہی ہونے کی بنا پر۔ بیت اللہ الحرام کے روبرو مانگی تھی۔ اور وہ زندگی بھر ان پہ سایہ کئے رہی۔ اس لئے مال کے بارے میں تو بظاہر ایسا کوئی خاص سوال ان سے ہونے کی نوبت نہ آئیگی۔ والعلم عند اللہ۔ البتہ عمر انہیں بھرپور عطا ہوئی، (۱۳۲۳ھ تا ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹۰۶ء تا ۱۹۹۷ء) جسمانی قوت کے لحاظ سے بھی وہ سوائے آخری دس پندرہ سال کے نہایت خوش نصیب لوگوں میں رہے۔ اور علم کے باب میں بھی بے شک اللہ کا ان پر عظیم احسان تھا اور آخر تک رہا۔ مگر ان کی زندگی کی جس نمایاں

خصوصیت سے بات شروع ہوئی ہے وہ جیسے اللہ نے انہی تین باتوں کے سوالوں سے سرخ رو ہو کر نکلنے کے لئے انہیں بخش دی تھی۔

جواں عمری کا حال

راقم الحروف جو ان کی اولاد میں سب سے بڑا ہے، اسکی عمر تین چار سال رہی ہو گی، کہ والد ماجد کو رنگون (برما) کا ایک سفر وہاں کے صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایک دینی ضرورت کیلئے کرنا پڑا (۱۹۳۱ء) اور کوئی چھ ماہ قیام رہا۔ کام ایسا تھا کہ ان کے ہم مشرب و ہم مذاق کئی دوست بھی ساتھ تھے۔ ہر علاقے میں کچھ قابل دید چیزیں ہوتی ہیں۔ سیر و تفریح کے مقامات بھی ہوتے ہیں۔ مہینوں کے طویل قیام میں پارٹی کے سب لوگ کبھی کبھی سیر و تفریح کی غرض سے یا عجائبات دیکھنے کی خاطر نکل جایا کرتے تھے۔ مگر والد ماجد کو وہ لوگ کبھی ساتھ نہ لے جاسکے۔ خود سناتے تھے کہ ایک دن ان دوستوں نے کہا کہ بھئی آج تو بالکل ہی ایک نرالی چیز دیکھنے چل رہے ہیں۔ اس میں تو چلے ہی چلو۔ پوچھا کیا؟ کہا کہ سفید ہاتھی سنا تو بہت تھا، مگر معلوم ہوا ہے کہ یہاں عجائب گھر میں وہ موجود بھی ہے۔ اسی کو دیکھنے چل رہے ہیں۔ فرماتے تھے، میں نے جواب دیا۔ لاحول ولا قوۃ، یہ بھی کوئی ایسی شئی ہوئی؟ ہاتھی میں نے دیکھا ہے۔ بارہا دیکھا ہے۔ اور سفیدی بھی۔ میں دونوں کو بآسانی تصور میں یکجا کر سکتا ہوں۔ پھر کاہے کے لئے، اپنا وقت اس کے لئے کہیں آنے جانے میں لگادوں؟ جبکہ میرے وقت کا نہایت بہتر مصرف موجود ہے اس وقت ان کی عمر ۲۶۔۲۷ سال رہی ہو گی۔

مردِ کار

وہ اپنی جبلت کے اعتبار سے مردِ کار تھے۔ ہر مشغلے کو افادیت کی ترازو میں تولنا انکا طبعی مذاق تھا۔ جہاں ٹھوس اور کھری افادیت نہو ادھر کو انکی طبعیت راغب ہی نہ ہوتی تھی راقم السطور نے جب سے ہوش سنبھالا ہے بندوق کے شکار کو اپنے گھرانے (داداجان رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد) کا ایک عمومی شوق پایا ہے۔ اور اس شوق کیلئے سہولت فراہم کرنے میں ہمارے وطن کے محل وقوع کا بھی دخل ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ والد ماجد نے اس خاندانی شوق میں کبھی دلچسپی نہ لی ورنہ کبھی تو ہم ان کو دیکھتے کہ سنبھل آئے تو ایک آدھ دن اس تفریح کیلئے بھی چلے گئے۔ ہمارے لئے تو سنبھل پہونچکر ممکن نہیں رہتا کہ اس شوق کا شکار نہ ہوں۔
تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے نیند کم آنے کی شکایت ہوگئی تھی۔ کوئی علاج کارگر

نہ ہو رہا تھا ایک ڈاکٹر نے (شاید کچھ زیادہ تفصیل سے حالات معلوم کر کے) رائے دی کہ آپ کو دواؤں کی نہیں ذہنی تفریح کی ضرورت ہے آپ کا دماغ ہر وقت سنجیدہ مصروفیت میں رہتا ہے اسکو کوئی وقت تفریحی مشغلے کا ملنا چاہئے ایسے مشاغل کے سلسلہ میں مثال کے طور پر انہوں نے ایک مشغلہ یہ بھی تجویز کیا تھا کہ کبوتر پال لیں اور تھوڑی دیر ان کا دانہ پانی کراتے ہوئے ان سے مشغول ہو جایا کریں اس طرح ذہن آپ کی سنجیدہ مصروفیت سے تھوڑی سی راحت کا وقت پا لیا کرے گا۔ یہ کوئی بھوپال کے ڈاکٹر تھے۔ اس زمانے میں اہل بھوپال کو والد صاحب سے کچھ بہت خصوصی تعلق ہو گیا تھا۔ پس کسی طور پر وہاں جانا ہوا تھا تو واپس آ کر لطیفے کے طور سے ہم لوگوں کو یہ ڈاکٹری مشورہ بہت ہنستے ہوئے سنایا۔ اور یہ مشورہ بس ایک لطیفہ ہی بن کر رہ گیا۔

یہ یا کوئی بھی دوسرا ہلکا سا تفریحی مشغلہ وہ اس طبی مشورے پر اختیار کر لیتے تو یہ یقیناً کسی غیر ضروری کام میں وقت ضائع کرنے والی بات نہ ہوتی۔ "لیکن رنگون والا قصہ بتا رہا ہے کہ ان کا مزاج تو بالکل نوجوانی ہی میں "کام اور بس کام" کے سانچے میں ڈھل ... شغل کا مشورہ انہیں جس وقت دیا گیا تھا اس وقت عمر پچاس سے بھی ... قدرتی طور سے پختہ تر۔ اور اس مزاج اور اسکی پختگی ہی نے انہیں دراصـ... پہونچایا جس مقام سے وہ دنیا سے اٹھ کر آخرت کے راہی ہوئے۔

الابرار الصالحین۔

اس مزاجِ کار کی فتوحات

اپنی طالب علمی کی زندگی کے حالات میں انہوں نے لکھا ہے کہ ابتدائی سات سال انہوں نے محض ضائع کیے، کچھ پڑھ کر نہ دیا۔ اور پھر اللہ نے شوق کے اسباب پیدا کر دیے تو آئندہ سات سال میں ساری کسر پوری کر کے تعلیم کو تکمیل تک پہونچا دیا۔ انہی سات سال میں دراصل ان کے "ہمہ تن کام" والے مزاج کی داغ بیل پڑی۔ اور نتیجۃً نمایاں حیثیت میں فراغت حاصل ہوئی۔ پھر اسی مزاج نے ان کو مناظرے کے اس میدان میں آناً فاناً نمایاں کیا۔ جو ان کی عملی زندگی کا اولین میدان تھا۔ اس مزاج کی بدولت وہ اپنے موضوع پر اس غیر معمولی حد تک حاوی ہوئے کہ مقابل کے مناظر نے اگر کسی ایسی کتاب کی کوئی عبارت اپنی دلیل میں پڑھی جو کتاب اس وقت ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ اس کتاب کا ذرا فلاں صفحہ پڑھیے وہاں آپ کا جواب موجود ہے۔ اس پر اگر مقابل مناظر نے کہا کہ نہیں آپ خود پڑھ کر سنائیے، تو برجستہ اس سائز کی کوئی کتاب اپنی کتابوں میں سے اٹھائی اور کہا کہ کھولئے فلاں صفحہ اور

سطر فلاں اور حافظے سے عبارت پڑھنا شروع کر دی۔ اور مقابل کو آخر تک شبہ بھی نہیں ہو سکا کہ یہ عبارت کتاب سے نہیں حافظے سے پڑھی جا رہی ہے۔ اپنے موضوع پر اس درجے کا حاوی ہونا اسکے بغیر کہاں ممکن ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کام بنالے؟

وہ سات سال جس میں انہوں نے دل لگا کے پڑھا۔ اُنہی کے سلسلے کی ایک بات یہ کہتے ہوئے سنائی تھی کہ "اللہ معاف کرے" اور وہ یہ تھی کہ منطق کی ایک کتاب قطبی نام سے درسِ نظامیہ میں ہے، اس کتاب کے بارے میں ذکر فرماتے تھے ——— اور شاید یہ تذکرہ اس وقت کی بات ہو جب یہ راقم السطور اس کتاب کو پڑھ رہا تھا ——— کہ "میں نے یہ کتاب حفظ کر ڈالی تھی۔ اور اللہ معاف کرے اپنے ساتھیوں کا امام بن کے ان کو اس کتاب سے گویا تراویح پڑھایا کرتا تھا"۔ قطبی کوئی بڑے درجوں کی کتابوں میں نہیں ہے۔ اس کے بعد کوئی چار سال اور تعلیمی سلسلہ رہا ہو گا۔ تو ظاہر ہے کہ جہاں قطبی کے زمانے سے یہ حال ہو وہاں بخاری اور ترمذی کے سال میں کیا کچھ نہ رہا ہو گا؟ اور اسی وجہ سے وہ بات ممکن ہو سکی ہو گی جو،، تحدیثِ نعمت،، میں آئی ہے کہ تعلیم کے آخری زمانے میں ہی انہوں نے اُس میدان کی علمی ضرورتوں سے بھی اپنے آپ کو کافی حد تک مسلح کر لیا تھا جس میدان سے اٹھنے والی ھل من مبارز کی صدائیں ان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ یعنی دعوتِ شرک و بدعت کے مقابلہ میں احیاءِ توحید و سنت کا میدان۔

وقت کے معاملہ میں حسّاسیت

ہمہ تن کام ہی کے اس ذوق و مزاج نے انہیں اپنے وقت کے معاملہ میں بیحد حساس بنا دیا تھا۔ طبعاً وہ خشک نہ تھے۔ اسکو تمام قریبی تعلق والے جانتے ہیں۔ لیکن بے ضرورت ایک منٹ بھی کسی کو دینا انہیں اپنے وقت کا ضیاع معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں مجلس نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی جس میں نشست اور گفتگو کو انکے معیار ضرورت کا پابند رہنا مشکل ہوتا۔ البتہ عصر بعد کیلئے دروازے کے باہر لکھوا دیا تھا کہ کوئی ملنے کو آنا چاہے تو اس وقت میں آجائے یعنی اس کام کیلئے باقاعدہ وقت فارغ نہیں تھا۔ کوئی آگیا تو اسکو وقت دیا ورنہ اس وقت میں بھی ضرورت ہوتی تو وہ اپنا کام کرتے۔

ایک کیفیتِ استغراق

کام اور ہمہ تن کام نے جو کہ زیادہ تر دماغ ہی سے تعلق رکھتا تھا ذہن و دماغ کو ایک ایسے

استغراق کی کیفیت دیدی تھی کہ راہ چلنے میں بھی انکو پوری طرح اس سے چھٹکارہ نہیں ملتا تھا ساتھ چلتے ہوئے اگر وہ ساتھ والے سے بات نہیں کر رہے ہیں تو انکے چہرے پر نگاہ پڑنے سے صاف نظر آجاتا تھا کہ دماغ کہیں مشغول ہے۔ دیوبند کے سفر میں رکشا کا جو ایکسیڈنٹ ۱۹۷۴ء میں ہوا جس نے کولھے کی ہڈی میں فریکچر کیا۔ اور وہ بالآخر سخت معذوری اور عوارض کا باعث بن گیا وہ اسی استغراق و محویت کا نتیجہ بظاہر اسباب تھا ورنہ اگر انکی راستے پر نظر ہوتی تو کچھ نہ کچھ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر سکتے تھے اور بالکل بے خبری کے عالم میں جھٹکا کھا کر گرنے کی جو صورت پیش آئی وہ شاید نہ آنے پاتی۔ ویسے مقدرات اپنا راستہ ہر حال میں بنا لیتے ہیں۔

اس انہماک و استغراق کی بدولت ان کو روزہ بہت آسان تھا اپنے لکھنے پڑھنے کے کام پر بیٹھنے کے بعد وقت کا ان کو پتہ ہی نہیں رہتا تھا۔ اور ایک دفعہ تو روزے کے عالم میں اس محویت نے عجیب ہی تماشہ کیا، تبلیغی مرکز لکھنو والا مکان تھا نہایت مختصر مکان۔ اسکے اوپر کی منزل میں
فقط ایک چھوٹا سا کمرہ تھا بس ایک تخت اور پلنگ کی گنجائش کا۔ وہی انکے لکھ
پشت کی طرف بھی ایک دروازہ مرکز میں اتر جانے کیلئے تھا۔ مرکز میں
گھر میں آنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تو اس پشت کے دروازہ سے ا
جاتے تھے۔ رمضان کے دنوں میں ایک دن مغرب کی اذان ہو جانے
ہوئی جب تک گھر والوں نے یہ دیکھ کر کہ اذان ہو جانے پر بھی افطار کیلئے نہیں اترے ہیں وہاں جا کر انہیں بتایا کہ اذان ہو چکی، افطار نہیں کریں گے؟ حالانکہ اذان کی جگہ کمرے کی پشت کے دروازے سے متصل ہی تھی مگر انھیں بالکل خبر نہ ہوئی نہ معلوم وہ کب تک لکھتے ہی رہتے اگر بہن نے اوپر جا کر بتایا نہ ہوتا کہ ابھی اذان ہو گئی۔

زندگی کا اصل مشغلہ اور اس کیلئے جذبہ کا عالم

الغرض عمر کا کوئی لمحہ کسی ایسے شغل میں صرف کرتے ہوئے انھیں نہیں پایا جس کے بارے میں خیال ہو کہ وہ آخرت میں کام آنے والا نہ تھا۔ ان کی زندگی کا اصل مشغلہ جس میں وہ ہمہ تن کام کی کیفیت کے ساتھ عملی زندگی کے اولین دن سے لگے رہے وہی دین ملت کی خدمت و نصرت تھا جس کے حوالے سے انہیں پہچانا جاتا تھا اور انشاء اللہ یہی حوالہ ان کی پہچان ہمیشہ رہیگا۔ اس مشغلے کی مختلف عملی شکلوں میں سے دو چیزیں عمر بھر قائم رہیں۔ تحریر و تصنیف اور وعظ و تقریر۔ باقی درس و تدریس کا بھی ایک وقت رہا اور شرک و بدعت کے خلاف مناظرانہ نبرد آزمائی کا بھی! اور یہ نبرد آزمائی والا دور۔ جو اُن کی عین جوانی کا دور ہے۔ اسکے بارے میں تو وہ

فرماتے تھے کہ اللہ نے "اس زمانے میں ایک جہادی اسپرٹ عطا کر رکھی تھی۔ دل مچلتا تھا کہ زندگی اسی راہ میں کام آجائے۔ "اور "کام آجانے" کی بات کا پس منظر یہ تھا کہ اس سلسلہ میں اکثر بڑے خطرناک ماحول سے واسطہ پڑتا تھا۔ اسی دور میں انہوں نے (۱۹۳۴ء۔ ۱۳۵۳ھ۔) سے الفرقان جاری کیا تھا اور اس کام کیلئے انتخاب جس جگہ کا کیا اسکا نام بریلی تھا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کی بریلی نہیں۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب کی بریلی۔ یہ انتخاب بجائے خود شہادت ہے کہ جذبات کی جولانی ضرور شہادت کی طلب تک لے گئی تھی۔

الفرقان کی دعوت کیا تھی؟ اس کے الفاظ بھی، جو ہر ماہ ٹائیٹل کے آخری صفحے پر شائع ہوتے تھے، اس وقت کے جذبے کی بے تابی کا پتہ دیتے ہیں۔

من انصاری الی اللہ

اللہ کے راستے میں کون کون میری مدد کرے گا۔

میرا مقصد دین الٰہی کی اشاعت اور توحید و سنت کی حمایت و حفاظت ہے میں چاہتا ہوں کہ تمام مسلمان حقیقی معنیٰ میں خدائے واحد کے پرستار ہو جائیں۔ میری تمنا ہے کہ مدنی آقا کا علم صداقت ہمیشہ سر بلند رہے اس کے دشمن نگوں سار ہوں، میری آرزو ہے کہ دنیا کے سارے انسان خدا کے اس ہاشمی محبوب کے قدموں سے وابستہ ہو کر دین و دنیا کی عزت حاصل کریں جو بنی نوع انسان کا سب سے بڑا محسن ہے۔ ان پاکیزہ مقاصد کی کامیابی کیلئے میری ہر قسم کی اعانت بالخصوص توسیع اشاعت کی سعی کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔☆ الفرقان

بے تاب جذبے کا ایک نیا سفر

الفرقان کا اجراء ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ اگلے ہی سال یعنی ۳۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کو ایک جزوی قسم کی خود مختاری دینے کے لئے ایک بل پاس کیا۔ جو قانون بن کر انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کہلایا اسکے ماتحت صوبائی اسمبلیاں اور حکومتیں بننے کے لئے ۳۶ء میں صوبائی انتخابات ہوئے اور ۳۷ء میں یہ حکومتیں بن گئیں۔ برطانوی ہندوستان کی اس آئینی تبدیلی کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی کلی خود مختاری اب زیادہ دور نہیں ہے۔ تب اس آزاد اور خود مختار ہندوستان کے جمہوری نظام حکومت میں مسلمانوں کا درجہ اور انکی زندگی کا نقشہ کیا ہوگا؟ یہ

سوال ہر سوچنے اور سمجھنے والے سے جواب کا طالب ہوا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جو ان دنوں حیدر آباد دکن سے ترجمان القرآن نامی رسالہ نکال رہے تھے انہوں نے اس سوال کو پوری اہمیت کے ساتھ موضوع بنا کر اظہار خیال کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس نے والد ماجد کی پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور یہاں سے ان کا ذہن اس محدود میدان عمل سے نکل کر جو اُس وقت الفرقان کا خاص نشانہ تھا، اس نئے میدان کی طرف متوجہ ہو گیا جس میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے ملی تشخص اور دینی تقاضوں کے ساتھ انکی بقا کا مسئلہ فیصل ہونا تھا اور جو زیادہ اہم ہی نہیں زیادہ بڑا میدان عمل بھی تھا۔ اپنے سابق میدان میں وہ سردار و سپہ سالار تھے، مگر اس نئے میدان میں تابع کی حیثیت قبول کرتے ہوئے انھوں نے اولاً مودودی صاحب ہی کی طرف دیکھا جنھوں نے اس مقصد کے لئے ایک تنظیم کی دعوت شروع کر دی تھی۔ لیکن ان سے ملنے کے بعد ان کی زندگی کا جو نقشہ دیکھا تو اسے اس میدان عمل کے لئے کچھ امید ... آئے۔ (۱)

اب وہی "کام اور ہمہ تن کام" کی لگن والی روح بے چین تھی ... دنوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سیرت سید احمد شہید" چھپی ار... آئی۔ یہ گویا ایک نئی سمت سے نظر آنے والی روشنی کی کرن ایک پروانہ صفت و بود ... سے تھی۔ اسکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "خوب یاد ہے کہ اسے پڑھ کر اندر ایک آگ سی بھڑک گئی میں نے اسی وقت مولانا علی میاں کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتے پر خط لکھا اس میں کتاب سے متعلق اپنا تاثر ظاہر کیا تھا اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ مجھے صفائی سے بتلایئے کہ آپ نے بس یہ کتاب لکھنے نے کا ارادہ کیا تھا جو لکھی گئی یا وہ کام بھی کرنے کا ارادہ ہے جس کا یہ کتاب تقاضہ کرتی ہے؟ اگر یہ دوسری بات ہے تو میں آپ سے جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی مجبوری نہ ہو تو قریبی فرصت میں یہاں بریلی ایک دو دن کیلئے تشریف لے آئیں۔ اور اگر آپ کسی وجہ سے اس وقت نہ آسکتے ہوں تو مجھے بواپسی مطلع فرمادیں۔ میں انشاءاللہ خود آجاؤنگا۔" (۲)

اس پر مولانا کا جواب اپنے وطن رائے بریلی سے آیا کہ میں اس وقت یہاں گھر پر مقیم

---

(۱) "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت" ص ۳۰-۲۹ (مطبوعہ الفرقان بکڈپو لکھنؤ)

(۲) سرگزشت ص ۳۳-۳۲۔

ہوں اور فلاں وجہ سے اسوقت سفر سے معذور ہوں آپ خود ہی یہاں تشریف لے آئیں۔ اسکا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ "میں ممکنہ عجلت سے روانہ ہو گیا اور رائے بریلی پہنچ گیا" (١)

رائے بریلی پہنچ کر مولانا علی میاں سے گفتگو کی۔ مولانا بھی مودودی صاحب کے ان مضامین سے متاثر تھے والد ماجد نے ان کو مودودی صاحب کے قریب جانے اور پھر پلٹ آنے کا قصہ بھی بتایا اور آخر میں دونوں اس بات پر متفق ہوئے!

"اس وقت کے خاص حالات کے مطابق دین کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے جو کچھ ہو سکے وہ کرنا چاہئے اور بنامِ خدا اس کا آغاز کر دینا چاہئے،،

لیکن اس آغاز کیلئے دونوں کے سامنے رکاوٹ یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس کام کیلئے امارت اور امیری کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ کچھ دوستوں کی طرف نظر گئی اور اس کیلئے ان سے براہ راست اور بلا تاخیر ملنے کا بھی فیصلہ کر کے دونوں نے کئی مقامات کے سفر کرنے کا فیصلہ کیا جن میں ایک سفر اتنے دور دراز کا بھی ہوا کہ ہندوستان کی سرحد افغانستان سے ملنے جا رہی تھی۔ لیکن ان سفروں اور ملاقاتوں کے باوجود وہ مردِ کار ان کے ہاتھ آنہ سکا جس کی انہیں تلاش تھی۔ اس تلاش کا ایک بندۂ خدا نے مذاق بھی مولانا مودودی سے روگردانی کے جرم میں اڑایا ہے کہ لیجئے ایک امیر ڈھونڈنے گھومتے پھر رہے تھے! ایسا ہی کچھ موقع رہا ہوگا جب علامہ اقبال نے فرمایا

کم نظرے تابِ جانم نہ دید
آشکا رم دید و پنہا نم نہ دید (٢)

جذبہ اپنی جگہ بے تاب و بے قرار ہی رہا حتیٰ کہ ایک بار پھر سے بہا کر وہ مودودی صاحب کے قریب لے ہی گیا۔ اور جماعت اسلامی کی تاسیس عمل میں آگئی۔ یہ اگست (١٩٤١ء) کی بات تھی (٣) پٹھان کوٹ کی بستی دارالاسلام جمالپور جو ایک صاحب خیر (مرحوم چودھری نیاز علی صاحب) نے دینی کاموں کیلئے وقف کے طور پر بنائی تھی۔ وہ بستی جماعت کا مرکز بنانے کے لئے حاصل کی گئی۔ مودودی صاحب اور دوسرے بعض اہم ارکان کے لئے طے ہوا کہ وہ

---

(١) "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت" ص ٣٣۔ (٢) دیکھنے کی چیز میری روح کی بیتابی اور جذبے کی بے قراری تھی۔ مگر برا ہو کم نظری کا کہ اسے اندر کی یہ شے تو نظر نہ آئی بس باہر ہی کے منظر پر نظر ٹک کے رہ گئی۔
(٣) تفصیل کیلئے "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت "

وہیں مستقل قیام کریں۔ چنانچہ جون (یا جولائی) ۴۲ء میں والد ماجد بھی بریلی سے ترک سکونت کر کے پنجاب کی اس بستی میں جا اترے۔ یہ راقم السطور بھی ساتھ تھا۔ والدہ ماجدہ کو (جو ۴۳ء میں مرحومہ ہو گئیں) اور میرے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمٰن، کو کچھ ٹھیر کر بلانے کے خیال سے عارضی طور پر سنبھل میں، دادا اور دادی جان کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔

ایک نہ بھول سکنے والا واقعہ

یہ قیام اگرچہ دیرپا ثابت نہوا اور جذبے کی بے قراری کو کچھ حقائق سے ٹکرا کر بالآخر سپر ڈال ہی دینا پڑی۔(۱) مگر یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ ان کے جذبے اور ان کی لگن کی کیا کیفیت تھی کہ وہ ایک بار پھر اسی جذبے کے ہاتھوں مجبور ہو کر مودودی صاحب کی طرف واپس گئے ایک چھوٹا سا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ایک جمعہ کا دن تھا۔ دیکھا کہ والد ماجد ا
پیچھے سائیکل کے کیریر پر بیٹھ رہے ہیں۔ کس لئے؟ پٹھانکوٹ کی کسی
موقع پر پہونچ کر تقریر کرنا ہے۔ یقیناً والد ماجد نے مجھ سے ذکر فرمایا ہو
کے لئے اس طرح کی ضرورت سے باہر جاتا ہے۔ مگر مجھے اپنے حافظے
نہیں۔ تاہم ان کا سائیکل کے کیریر پر بیٹھنا اس طرح یاد رہ گیا ہے جیسے ون
کھنچ جاتی ہے۔ اور یہ یقیناً اس وجہ سے کہ یہ ان کی عرفی حیثیت اور مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ایک اچھنبے کی سی بات تھی۔ مگر ان کی لگن اور جذبہ ان باتوں کو نہیں دیکھتا تھا۔

"سپاہی نہ کہ قائد"

اوپر مودودی صاحب کی طرف پہلی بار جا کر اول وہلہ ہی میں مایوسانہ پلٹ آنے کا جو ذکر مولانا علی میاں کی ملاقات سے پہلے آیا ہے۔ اسکی وجوہات کا تذکرہ اپنی سرگذشت میں کرنے کے بعد لکھا ہے

> "مولانا کی طرف سے تو میں اس معاملے میں بالکل مایوس ہو گیا۔ لیکن ان کی تحریروں اور اپنے غور و فکر سے اس وقت جس قسم کی دینی جدوجہد کو میں نے ضروری سمجھ لیا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اس کا تقاضہ روز بروز شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن خود اپنی صلاحیتوں اور کمزوریوں کا پورا دیانتدارانہ جائزہ لیکر میں اپنے بارے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس قسم کے کسی کام میں قائد و علمبردار بننے کے لائق نہیں ہوں۔ ہاں اگر کہیں ایسا کام شروع ہوا تو میں ان شاء اللہ اسکا ساتھ دینے والا ایک سپاہی بن سکتا ہوں۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ اللہ کا کوئی بندہ یا کچھ بندے جو اہل ہوں وہ اس طرح کا کوئی کام کریں تو میں ان کے ساتھ لگ جاؤں"(۲)

---

(۱) یہ ۱۹۴۲ء کے آخر کی بات ہے۔ (۲) حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

بس یہی سپاہیانہ جذبہ تھا کہ انہیں ایک فرض کی ادائیگی کے لئے، کسی کے پیچھے سائیکل کے کیریر پر بیٹھ کر بھی جانے میں مطلق عار نہوئی، اور وہاں کے ماحول میں خود موجود ہونے کی بناپر، بلاکسی تقابل کی نیت کے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہاں جو اور چند حضرات کسی عرفی حیثیت کے تھے، ان میں سے کسی کے بارے میں بھی اس "سپاہیانہ" روش کی توقع کرنا آسان نہ تھی۔

حاصل بیان

بات میں بات نکلتی چلی آتی ہے۔ ورنہ مدعا صرف یہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے والد ماجد کو بالکل شروع سے ہی اپنے دین برحق کے سلسلے میں ایسی مقصدی لگن دیدی تھی کہ عمر کے کسی لمحے کیلئے کسی غیر شرعی مصرف کی توگنجائش ہی کیا محض مباحات (جائز امور) کا درجہ رکھنے والی چیزوں کیلئے بھی مشکل ہی سے ان کے یہاں گنجائش ہوتی تھی۔ اور یہ لگن اور اسکے مطابق مشاغل ظاہر ہے کہ علم پر عمل کے خانے کے سوا اور کسی بھی خانے میں نہیں ڈالے جاسکتے۔ یعنی یہ مقصدی مشاغل تمامتر نتیجہ ہی تھے اپنے علم پر عمل کے ذوق وشوق کا۔

دوسرے ناگزیر مشاغل کا حال

رہے زندگی کے دوسرے مشاغل جنہیں بشری فطرت لازم کرتی ہے، جنکا بشری علائق مطالبہ کرتے ہیں یا جن سے تمدنی زندگی میں مفر نہیں، ان سب میں بھی ان کا قدم راقم آثم کی واقفیت کی حد تک، وہیں تک جاتا تھا جہاں تک فطرت کے تقاضوں یا علائق کے حقوق ومطالبات کی ادئیگی ہو جاتی ہو، ہاں البتہ اس زمرے کے جن اعمال میں نفس کی لذت کا کوئی حصہ نہو اور وہ تمامتر ثواب ہی ثواب اور فضیلت ہی فضیلت ہوں ان میں وہ ایسے ہی ذوق وشوق سے مشغول ہوتے تھے جیسے کہ مذکورہ بالا مقصدی مشاغل میں ان کا حال دیکھا جاتا تھا۔ کسی جنازے کی نماز میں کوئی دوسرا اصاحب علم موجود ہوتا تو خود پیچھے رہنے کی کوشش کرتے۔ مگر دوستوں (اور یہ لفظ ان کے یہاں بڑا وسیع تھا) میں کسی کا انتقال ہو جاتا تو نہلانے کیلئے خود آگے بڑھتے اور قبر میں بھی اسے اپنے ہی ہاتھوں سے سُلانا چاہتے تھے۔

حضرت سید عبد الرب صاحب صوفی ایم اے (م ۱۹۷۵ء) جن سے والد ماجد کا بہت

۔ (پچھلے صفحے کا حاشیہ) وجوہات کی تفصیل کے لئے "سرگذشت" دیکھنی چاہئے۔ یہاں اس تذکرے کا بس اتنا اقتباس کافی ہوگا کہ "دو تین دن وہاں مولانا کے ساتھ رہ کر اس کے بارے میں تو دبس یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت اچھا سوچنے اور بہترین لکھنے والا تو بنایا ہے لیکن دینی انقلاب کی مقدس مہم چلانے کے لئے جو صفات اور جو زندگی چاہئے اس سے مولانا بہت دور ہیں۔ اور بظاہر ان صفات اور اس زندگی کے حاصل کرنے کا ان میں کوئی خاص داعیہ اور ارادہ بھی نہیں ہے، اس لئے مولانا کی طرف سے تو میں اس معاملے میں بالکل مایوس ہو گیا۔" (صفحہ ۳۲)

قدیم اور دلی تعلق تھا ان کی وفات پر ان کے بارے میں آپ نے دسمبر ۱۹۷۵ء کے الفرقان میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں اس بات کا افسوس کرتے ہوئے کہ ان کو غسل دینے کا موقع نہ مل سکا، حالانکہ اس کے لئے ان کی خواہش بھی تھی، لکھا ہے "اللہ کی توفیق سے میرا معمول ہے کہ اموات کو غسل دینے کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں، خاص کر اللہ والوں کو غسل دینے کی مجھے حرص ہے۔"

اسی طرح ایک طرف یہ حال کہ بے وقت بے ضرورت یا ضرورت سے زائد کسی کا بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اور دوسری طرف یہ کہ والد ماجد کو آنکھوں کے آپریشن کی ضرورت ہوئی ہے تو ان کو دہلی لے جا رہے ہیں اور پھر آٹھ دن، دس دن جسقدر بھی قیام کی ضرورت ہوئی نہایت خوشی سے وہاں ان کے ساتھ رہ رہے اور خدمت گذار رہے ہیں۔ پھر والدہ ماجدہ مرحومہ (یعنی ہماری دادی صاحبہ) اس ضرورت کے مرحلے میں آتی ہیں تو انکو بھی
خود ہی دہلی لیجاتے ہیں خود ہی ساری خدمت گزاری کرتے ہیں۔ اس کے
خالہ صاحبہ کو لاحق ہوتی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب قیام بریلی سے
صاحبہ مرحومہ کو سیتاپور لیجاتے ہیں (جہاں لکھنو سے قربت کے سا
بھی ہندوستان میں یکتا درجہ کا ہے۔) اور ان کے ساتھ ایک خدمت
اپنے بڑے بھائی صاحب (یعنی ہمارے بڑے تایا ابا مرحوم) کو یہ مرحلہ پیش آتا ہے تو اسکے لئے بھی اسی طرح وقت فارغ کر لیتے ہیں۔

رسمیات سے بُعد کی کیفیت

اسکے بر عکس کسی تقریب میں شرکت کے لئے وقت نکالنا ان کیلئے بڑا مشکل تھا۔ زیادہ وسیع الفاظ میں کہئے تو رسمی قسم کے کسی بھی اجتماع سے انہیں بالکل مناسبت نہ تھی۔ کسی خاص تعلق کی رعایت سے شریک بھی ہوتے تو بالکل نپے تلے انداز میں بس ایک "فرض کی ادائیگی" جیسا معاملہ ہوتا۔ کہنے کو کوئی خشک مزاجی بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن ان کی پوری زندگی پر نظر کرتے ہوئے انصاف کی بات غالباً یہ ہوگی کہ ان چیزوں میں انکی روح کیلئے لذت کا کوئی سامان نہیں ہوتا تھا اور یہ گویا ان کی "کمزوری" تھی کہ جہاں ان کی روح لذت نہ پائے وہاں ان کا دل نہیں کھلتا تھا۔ خاص طور سے اگر نمود و نمائش یا آرائش و زیبائش کی کوئی صورت تقریب میں نمود پذیر ہے تب تو وہاں وہ قدم رکھنے کے بھی روادار نہ ہوتے تھے۔ لکھنؤ کے ایک صاحب نے اپنی بیٹی کا نکاح پڑھوانے کی خواہش ظاہر کی۔ راقم الحروف کے ہم عمر ہوتے تھے (اور ہیں) ان سے کوئی خاص

تعلق کی بات تو نہ تھی۔ لیکن غالباً اس بات کی قدر کرتے ہوئے کہ وہ ایک دوسرے حلقے سے باضابطہ اور نہایت گہرا تعلق رکھتے ہوئے یہ خواہش لے کر آئے تھے، والد ماجد نے منظور فرمالیا۔ اور اس منظوری میں اس حسن ظن کا یقیناً دخل رہا ہوگا کہ نکاح کی تقریب میں وہی سادگی ہوگی جو اہل دین کے یہاں ہونی چاہئے۔ بلکہ ان کے مزاج میں معاملے اور بات کی صفائی کا جو عنصر تھا اسکی بنا پر تو اس کا بھی غالب امکان ہے کہ اس معاملے میں اپنا اصول بتادیا ہو۔ لکھنؤ کی مشہور قیصر باغ بارہ دری میں یہ تقریب نکاح منعقد ہونا تھی، جو ہمارے گھر سے بالکل قریب ہی ہے۔ والد ماجد وقت مقررہ پر وہاں پہونچ رہے تھے کہ مکمل شادی والی آرائش و زیبائش کا منظر پایا۔ بس وہیں سے گاڑی واپس کرالی۔ اور ان سے معذرت کہلا بھیجی۔ اور ایسی ہی خلاف مزاج صورت خود اپنی ایک پوتی کی شادی میں پیش آگئی تو اسکے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ ذرہ برابر کوئی فرق دیکھنے میں نہیں آیا۔

راقم الحروف کے چھوٹے بھائی حفیظ الرحمٰن نعمانی کا نکاح تو راقم کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ رخصتی ایک دو سال کے بعد ہوئی۔ اس وقت لکھنؤ کے جس مکان میں ہم لوگ رہ رہے تھے وہ دو منزلہ تھا اوپر کی منزل میں تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ حفیظ میاں کی دلہن کی آمد کی تاریخ مقرر ہوئی تو جی میں آئی کہ دلہن والے کمرے کے دروازوں پہ روغن کردیا جائے۔ کبھی کا پرانا روغن بے رنگ ہو چکا تھا۔ نیز دروازوں پر پردے لٹکا دئے جائیں۔ حفیظ میاں کے ایک دوست ان دنوں آئے ہوئے تھے وہ ان کاموں میں مددگار ہوئے۔ وہم بھی نہیں گذرا کہ یہ چیز والد کو ناگوار ہوگی۔ وہ ان دنوں میں کسی سفر میں تھے، باقی سب گھر والے بھی مع حفیظ میاں کے سنبھل گئے ہوئے تھے۔ وہیں سے دلہن کو آنا تھا۔ اور اپنے سفر سے واپس ہوتے ہوئے والد بھی ان لوگوں کے ساتھ واپس آنے والے تھے۔ واپسی کے بعد دوسرے تیسرے دن وہ جو اوپر گئے اور نئی دلہن والے کمرے پر کچھ "دلہنیت" کے آثار دیکھ آئے تو نیچے آکر نہایت ناخوشی کا اظہار فرمایا۔ بات ۵۱-۵۰ء کی ہے۔ بہت اچھی طرح تو یاد نہیں ہے۔ غالباً ان کو زیادہ ناگواری پردوں سے ہوئی اور شاید کاشانۂ نبوت کا وہ واقعہ یاد آگیا کہ رسول مقبول ﷺ ایک مرتبہ سفر سے تشریف لائے تو عائشہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر ایک پردہ لٹکا ہوا پایا (جو برائے ضرورت نہیں بلکہ برائے زینت تھا) آپ نے اسے ناپسند فرمایا کہ اللہ کا حکم نہیں ہے کہ ہم در و دیوار کو لباس پہنائیں۔ (۱)

---

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت "مشکوۃ باب التصاویر" بحوالہ بخاری و مسلم۔

سادگی اور بے تکلفی سے اُنس

مزاج کی یہ سادگی اور بے تکلفی، بلکہ تکلفات سے وحشت و دوری عمر بھر ان کا خاصہ رہی۔ ۷۵ء کی بات یاد آرہی ہے راقم الحروف کی صحت کی خرابی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ انگلینڈ میں اقامت پذیر ضلع بھڑوچ (گجرات) کے مولانا یعقوب قاسمی نے الفرقان میں بار بار اسکا تذکرہ دیکھکر تبدیلیٔ آب و ہوا کیلئے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ ان کا مرسلہ ٹکٹ بمبئی سے سفر کا تھا۔ والد ماجد نے ضرورت سمجھی کہ بمبئی تک وہ خود بھی میرے ساتھ سفر کریں۔ بمبئی ان مقامات میں سے ہے جہاں کے لوگ انہیں بہت ابتدائی دنوں سے جانتے اور مانتے آئے ہیں بعض اہل تعلق کو انہوں نے اطلاع دیدی تھی۔ اچھی خاصی تعداد میں لوگ اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے باہمی مشورے سے قیام کیلئے جگہ تجویز کر رکھی ہوگی۔ چنانچہ ہم لوگ اسٹیشن سے وہاں لے جاکر اتارے گئے۔ یہ ایک شاندار قسم کا وسیع و عریض ا
صحیح الفاظ میں کوٹھی تھی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا اشتہار ان دنو
انہیں مہربان کی کوٹھی تھی یعنی کوئی غیر لوگ نہ تھے تعلق رکھنے وا
بھی تھے اس میں اشتہار دیکر اسکی مالی مدد بھی کرتے تھے، مگر یہ اتفاق
کے یہاں اتار اگیا مجھے وثوق سے یاد نہیں کہ اسی دن شام کو یا دوسرے دن
مسجد میں منتقل ہوگئے۔ جو کھوکھا بازار کی مسجد کہلاتی تھی اور تبلیغی جماعت کا مرکز تھی اور پھر جہاز پر سیٹ کی بکنگ اور بعض دوسرے مراحل سفر طے ہونے کے انتظار میں ایک ہفتہ یا عشرہ یہ قیام رہا، بات کیا تھی؟ صرف یہ کہ امیرانہ طرز رہائش کے ساتھ ساز کرنا والد ماجد کے بس کی بات نہ تھی (اِلّا یہ کہ کسی امیر کے بہ باطن درویش و فقیر ہونے کو وہ جانتے ہوں یا پھر مجبوری کی بات ہو) مسجد کے اوپر ایک سادہ سا کمرہ تھا اگر یادداشت غلطی نہیں کر رہی ہے تو اسکے فرش پر سونا اور لیٹنا ہوتا تھا اور یہ تو اچھی طرح یاد ہے کہ نہایت سادہ سا کھانا نیچے کسی عام سے ہوٹل سے آجاتا تھا۔ یہ وہ ماحول اور معیارِ زندگی تھا جس میں انکی روح خوش رہ سکتی تھی۔ تکلفات کا سایہ ہو تو گرانبار ہو جاتی تھی۔

تکلفات سے طبیعت کی دوری ہی کا نتیجہ تھا کہ اپنے گھر کے کام انہیں خود کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔ اپنے گھر کے ہر طرح کے کام کیلئے وہ بازار جاسکتے تھے۔ گوشت لانا ہو سبزی ترکاری لانا ہو۔ کپڑا خریدنا ہو۔ غرض جو بھی گھر کی ضرورت ہو وہ بے تکلف اسے انجام دیتے تھے اِلّا یہ کہ کوئی اور اسے انجام دینے کیلئے موجود ہو۔ اور اللہ کا فضل تھا کہ اس نے دین کی فہم کے

ساتھ امورِ دنیا کی سمجھ بھی بھرپور عطا فرمائی تھی۔ گھر کی ضروریات ہی کی طرح اپنے ذریعۂ معاش، کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات کی تیاری کے سلسلہ میں جس کام کی بھی خود انجام دہی کا تقاضہ پیدا ہو جائے اسے بے تکلف خود انجام دے سکتے تھے۔ کتابت کی تصحیح تو اکثر خود کرتے ہی تھے ضرورت ہو تو پریس جاسکتے تھے۔ کاغذ کی خریداری کر سکتے تھے اور کاغذ دیکھتے تو بہر حال تھے کہ مناسب ہے یا نہیں۔

خادم نہ کہ مخدوم

اس مزاج نے انہیں عمر کے اس آخری دور کے سوا جس میں معذورانہ مجبوری کی صورت پیدا ہو گئی تھی خدام سے ہمیشہ بے نیاز رکھا۔ سفر آئے دن تیار رہتا تھا۔ مگر تن تنہا ہی کرتے تھے۔ محض خدمت یا معاونت کے نام سے کسی کو ساتھ لینے کا سوال نہ تھا بلکہ کوئی تعلق والا کسی اور عنوان سے از خود کسی سفر میں ساتھ ہو گیا اور دل میں یہ بھی سوچ لیا کہ راستہ میں خدمت کا بھی موقع ملے گا تو اسے محض مایوسی کا موقع ملا۔ چودھری عبد المنان نام کے ایک صاحب (اللہ غریق رحمت کرے مرحوم ہو چکے ہیں) بہت محبت رکھتے تھے گھر در کے بکھیڑوں سے بھی آزاد تھے غالباً دیوبند سہارنپور کے ایک سفر میں اسی طرح سے ساتھ ہو گئے۔ واپس آکر بتانے لگے کہ بھئی کان پکڑے، خدمت کو سوچ کر گئے تھے الٹے مخدوم بن کر آئے ہیں جس ضرورت کے موقع پر چاہا کہ اسکو انجام دیں، فرمایا کہ نہیں تم بیٹھو، میں زیادہ واقف ہوں کہ، مثلاً، چائے اس اسٹیشن پر کہاں اچھی ملتی ہے، اس طرح وہ اپنے ساتھ الٹی ہماری بھی خدمت کرتے گئے اور کرتے آئے ہیں۔

شیخ بے مشیخت

انہیں حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ جیسے شیخ وقت سے خلافت حاصل تھی۔ اور پھر ان کا درجہ حضرت شاہ صاحب کی نظر میں وہ تھا جس کے راوی حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ہیں کہ اگر اللہ نے قیامت کے دن پوچھا کہ میرے لئے کیا لائے ہو تو حضرت نے دو آدمیوں کا نام لیکر جن میں ایک نام مولانا منظور صاحب کا تھا فرمایا کہ ان دو کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دونگا۔ اسکے باوجود ہم نہیں دیکھتے کہ انہوں نے دینی خدمت کا وہ ذوق و ولولہ رکھتے ہوئے جو زندگی بھر گویا ان کی پہچان بنا رہا بیعت اور پیری مریدی کے ذریعہ انجام دی جانے والی دینی خدمت کی راہ کو بھی اسی ذوق و ولولے والے انداز سے اپنایا ہو۔ حالانکہ انہیں تو خود اس راہ

سے بہت کچھ نفع پانے کا تجربہ ہو چکا تھا، بیعت وہ کر لیتے تھے مگر اس قدر کم اور اتنی خاموشی سے کہ بیعت ہونے والوں کے علاوہ کم ہی لوگ انکی زندگی کے اس پہلو کو جانتے ہونگے۔ حد یہ ہے کہ راقم نے بھی کبھی کسی کو بیعت ہوتے نہیں دیکھا اس کا راز بھی میری نظر میں اصلاً یہی ہے کہ ایسا کرنے میں خواہی نہ خواہی ایک مشیخت کا ہالہ ان کی شخصیت کے گرد بن جاتا۔ ان کے آگے پیچھے لوگ ہوا کرتے، اور یہ بات انھیں بالکل گوارا نہ تھی۔

مشیخت کو بھلا کیونکر راہ ملے؟

مشیخت کا ہالہ؟ عمر بھر طالب ہی بنے رہنے کا ذوق جسے ملا ہو مشیخت کو اسکے یہاں بھلا راہ ملے بھی کیسے؟ "تحدیثِ نعمت" ان کی آخری کتاب، جس کی اشاعت عین مرض وفات میں ہوئی اس ذوق کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اس میں وقت کے معروف مشائخ ہ
ایک مفصل تذکرہ اسی انداز کا حضرت حاجی عبد الغفور صاحب جو د
بھی پایا جاتا ہے جن کو اس تذکرے کی اشاعت سے پہلے شاید ہی کوئی
ان کی زندگی بھی ایک قابل استفادہ نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔
اتفاقاً انکو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو انکی طالبانہ نظر نے "اللہ کے اس بندے،، میں جو "(تعمیراتی) ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا اپنے ہاتھ سے ایک خط بھی نہیں لکھ سکتا تھا حتی کہ تلفظ بھی پورا صحیح نہ تھا" دین کا وہ فہم پڑھ لیا "جو سیکڑوں پڑھے لکھوں بلکہ فارغ التحصیل عالموں سے بھی اچھا تھا" اور جس کی "عملی زندگی" کو پایا کہ "ہم جیسوں کیلئے بڑی سبق آموز ہے" اور اسلئے عمر بھر ان کے ساتھ وہی عقید تمندانہ معاملہ رکھا جو بزرگوں کے ساتھ اہل طلب کا ہوا کرتا ہے۔
ان کی شانِ طلب کا اندازہ کرنے کیلئے اس تذکرے کے یہ الفاظ پڑھ لینے کے ہیں کہ

> "دیکھنے میں ایسے سادے اور لباس اتنا معمولی کہ اگر کوئی ناواقف ان کو اشرف منزل (ان کا ذاتی مکان) کے بڑے دروازے کے پاس بیٹھا ہوا دیکھے جہاں وہ کبھی کبھی بیٹھتے تھے تو زیادہ سے زیادہ ان کو وہاں کا دربان سمجھے۔ اور اگر کوئی ان کو اشرف منزل کی مسجد میں دیکھے جسکا چھوٹا سا ایک حجرہ اب ان کی قیام گاہ ہے تو مسجد کا خادم اور جاروب کش تصور کرے۔ لباس کے علاوہ بھی ان کے کسی ڈھنگ سے کوئی آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ دنیا یا دین کی لحاظ سے بھی یہ شخص کوئی بڑا آدمی ہے"۔ (ص ۱۴۔ ۳۱۳)

اس کتاب کا ایک اور تذکرہ بھی انکے طالبانہ ذوق اور مشیخت نا آشنائی کی ایک ہی کھلی شہادت دیتا ہے۔ یہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا تذکرہ ...

کے یہاں والد ماجد کی اوّلین حاضری ۱۹۴۵ء۔ یا ۱۹۴۶ء میں ہوئی یعنی جبکہ آپ خود مولانا شاہ عبدالقادرؒ صاحب رائپوری سے بیعت ہو چکے تھے اس بیعت کے بعد آپ کا رابطہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے بھی قائم ہوا اور ان بزرگوں کی وفات تک قائم رہا۔ لیکن یہ خود حضرت رائے پوریؒ کی ہدایت ورہنمائی سے ہوا تھا اور خود حضرت رائے پوری بھی ان دونوں بزرگوں کے ساتھ بہت ہی محبانہ اور بہت قریبی رابطہ رکھتے تھے مگر حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے بارے میں ہمیں کوئی ایسی بات نہیں ملتی (دونوں بزرگوں کا مکانی فاصلہ بھی بہت طول طویل تھا۔ حضرت رائے پوری یوپی کی بالکل مغربی سرحد پر اور حضرت شاہ وصی اللہ صاحب نہایت مشرق کی سمت میں) اسکے باوجود ہم حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کے یہاں بھی انکو اس تذکرہ کی روشنی میں ایسا ہی سراپا نیاز اور سراپا طلب پاتے ہیں جیسی طلب اور جیسی نیاز مندی کے ساتھ وہ اپنے شیخ کے یہاں حاضر ہوتے رہے یا مذکورہ بالا ان دونوں بزرگوں کے یہاں جن کی طرف خود ان کے شیخؒ نے رہنمائی کی تھی اور سلسلہ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی وفات (۱۹۶۷ء) تک نہ صرف جاری رہا بلکہ شانِ طلب میں اضافے کے ساتھ جاری رہا۔ وہ ہفتوں ہفتوں کیلئے وقت نکال کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ان کے قیام ومستقر کی تبدیلیوں کے ساتھ کبھی گورکھپور کبھی الہ آباد اور کبھی بمبئی حاضر ہوتے۔ ان کی خانقاہ میں بہ نیت استفادہ قیام کرتے۔

زیادہ سے زیادہ مدظلہ

کیا کیا باتیں اس مشیخت نا آشنائی کی ذکر میں لائی جائیں۔ ۱۹۹۰ء کی بات ہے آفتابِ عمر لبِ بام آرہا ہے سارے بزرگ جا چکے ہیں اور اپنی عمر کے اب بس وہ آپ ہی باقی ہیں یہ راقم آثم انکے ارشاد پر اپنے ایک پرانے مضمون پر نظر ثانی کر کے اسے "واقعہ کربلا اور اسکا پس منظر" نامی کتاب کی شکل میں لاتا ہے یہ کام محض ان کے ارشاد کی تعمیل میں ہوا تھا اس لئے اسکو انہی کے نام سے منسوب کرتے ہوئے انتساب کی عبارت میں جب نام لکھا تو اسکے ساتھ دامت برکاتہم کے احترامی الفاظ شامل کر دئے۔ مسودے ہی کی حالت میں اسکو دیکھا تو فرمایا کہ یہ تو بہت زیادہ ہے زیادہ سے زیادہ "مدظلہ" لکھدو یعنی زیادہ سے زیادہ وہ لکھدو جس سے کم درجے کا کوئی لفظ ایک باپ کیلئے دستیاب نہیں ہے اور جو بلا تفریق ہر باپ کے حق میں موزوں ہوتا ہے نہ کہ "دامت برکاتہم" جیسا کوئی لفظ جس سے ایک دینی وروحانی بزرگی کا اظہار ہوتا ہے۔

خود کو کمتر سمجھنے کی طلب

اللہ نے ان کو دعا کا بہت خاص ذوق بخشا تھا اور پھر قدرتی طور پر ان دعاؤں سے بہت خاص مناسبت تھی جو آنحضرت ﷺ سے ماثور اور منقول ہیں اس چیز کو انہوں نے اللہ کی ایک بڑی نعمت کے طور پر اپنی کتاب "تحدیث نعمت" میں لکھوایا ہے۔ اور ان سیکڑوں ماثور دعاؤں میں سے ایک دعا کا بطور خاص بھی ذکر کیا ہے جو یہ ہے

اَللّٰھمَ احعلنی فی عینی صغیراً — اے اللہ مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور
وفی اعین الناس کبیراً — دوسروں کی نگاہ میں بڑا بنا دے۔

وفات سے تین چار سال پہلے ایک طویل بیماری پیش آئی معمولی نزلہ زکام اور حرارت سے آغاز ہوا۔ جو انکو ایک عام شکایت تھی ذرا سی بھی سردی لگ جانے سے پیدا ہو
طول کھینچا اور وہ شدت اختیار کی کہ پورے پچاس دن نرسنگ ہوم میں
علاج سے فرق نہ پڑا حتی کہ سحر کا شبہ ہونے پر اس رخ سے علاج ہوا
ٹوٹا۔ قدرتی طور پر اہل تعلق کے علم میں ہر طرف بات آگئی اور عیاد
تعلق آنے لگے انہی میں کانپور کے مفتی منظور صاحب مظاہری ایک دن تشریف
کہ مفتی صاحب نے کوئی بات اظہار تعلق کی کہی تھی اس پر یا بس ان کے تشریف لانے ہی پر ایک شکر گزارانہ گریہ کی کیفیت کے ساتھ فرما رہے تھے کہ مفتی صاحب اللہ نے اپنے کرم سے لوگوں کی نگاہ میں تو بڑا بنا دیا، کاش اپنی نگاہ میں چھوٹا بننا بھی موت سے پہلے نصیب ہو جائے۔ یاد کر لیجئے کہ اوپر جو بات "دامت برکاتہم" کے سلسلے کی گذری ہے وہ ۹۰ء کی تھی، یعنی وفات سے چھ سال پہلے کی اور یہ بات اس کے دو تین سال بعد ہو رہی ہے۔ یعنی اپنی نگاہ میں چھوٹا بننے کی ان کی خواہش ان کے ان تمام احوال کے باوجود تسکین پانے کو تیار نہ تھی جن کی روشنی میں ایک دوسرا آدمی یہ کہنے میں حق بجانب ہو گا کہ وہ خود کو ہیچ سمجھنے کی ایک مثال اس زمانے میں قائم کر گئے جب اس وصف کا چلن زمانے سے اٹھ چکا تھا۔

تنقید و تنقیص کی برداشت

اس دعا و طلب کی عند اللہ قبولیت کہیں یا اس میں ان کی صداقت کا ایک نشاں کہ مزاج میں حدت اور غصہ ہونے کے باوجود اپنے بارے میں تنقید و تنقیص پر برہم ہوتے ہوئے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ بعض موقعوں کی باتیں اس وقت یاد آرہی ہیں۔

(ا) ۵۷۔۵۶ء میں جب جماعت اسلامی پاکستان اپنے ایک سخت بحرانی دور سے گزری اور بہت سے لوگ اس وقت اس سے الگ ہوئے تو الگ ہونے والے ممبران شوری میں سے حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب (لائلپور۔ حال فیصل آباد) نے ان اختلافات کے سلسلے میں مودودی صاحب کے بعض افکار پر اپنے رسالے "المسر" میں اپنی رائے اور اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلۂ مضامین میں سے ایک مضمون پر اس راقم الحروف کی نظر رک گئی اور اس میں مودودی صاحب کے جس نظریہ پر کلام تھا، راقم نے اسے الفرقان میں موضوع گفتگو بنالیا۔ عنوان تھا "دین میں حکمت عملی کا مقام" یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے، اور کوئی چار قسطوں میں یہ مضمون پورا ہوا۔ مودودی صاحب نے اس کا براہ راست تو نہیں لیکن بالواسطہ اسطرح جواب دیا کہ اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن میں اس مضمون کی بابت ایک جواب طلب مراسلہ شائع کر کے اپنے مراسلہ نگار کو مخاطب بنایا۔ اس جواب کا پہلا پیراگراف جو الفرقان کے مضمون نگار کی نیت میں خرابی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے الفاظ بالکل صاف اور بدیہی طور پر بتا رہے تھے کہ یہ جواب راقم الحروف کے بجائے اس کے والد ماجد کو الفرقان کا مضمون نگار قرار دیکر لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں کہا گیا تھا کہ

> "اصل بنائے بحث بجائے خود یہ مسائل نہیں ہیں بلکہ دل کا ایک پرانا بخار ہے جو مدتوں سے موقع کی تلاش میں دبا پڑا تھا۔ اور اب اس کو نکالنے کے لئے کچھ مسائل بطور حیلہ ڈھونڈ لیے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ الفاظ راقم الحروف پر صادق آنے کا تو کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کا تو مولانا سے کبھی کوئی ایسا واسطہ نہیں رہا تھا کہ بخار و غبار پیدا ہوا ہوتا۔ اور وہ دبا پڑا ہوتا۔ ہاں والد ماجد کا ضرور ان سے ایسا واسطہ رہا تھا، جو ان کے بارے میں اس طرح کا گمان مولانا کے دل میں گذر سکے۔ پھر یہ پیراگراف جن الفاظ پر ختم ہوتا تھا وہ تو گویا بول رہے ہیں کہ نشانے پر والد ماجد ہی کی ذات ہے اور وہ الفاظ یہ تھے

> "اگر خدا کا خوف اور ایک ایک لفظ پر اس کے حضور بازپرس کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بطور نمونہ بتاتا کہ آدمی تقوے اور خشیت کا لباس زور(ا) پہن کر کیسی کچھ باتیں خود ان لوگوں کے خلاف بنا سکتا ہے۔"

(ا) لباس زور کا مطلب بناوٹی لباس۔

جن حضرات نے جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کے تعلق سے والد مرحوم کی "سرگذشت" پڑھی ہوگی انھیں تو تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ مودودی صاحب اور جماعت سے علاحدگی کی بنیاد، مودودی صاحب میں اس صفت تقوی ہی کا مسئلہ تھا جو ایک اسلامی امیر میں ہونی چاہیے، پس یہ الفاظ کہ "آدمی تقوی اور خشیت کا لباس زور (بناوٹی لباس و لبادہ) پہن کر" ایک کھلی چوٹ تھے۔ اور اسطرح مودودی صاحب نے خود اپنے الفاظ میں اپنے ہی "دل کا ایک پرانا بخار" اس موقع پر نکال لیا تھا(۱)۔ اور اس راقم کو تو اس سے اگرچہ اسلئے بہت تکلیف ہوئی کہ اس کی خطا میں مرحوم نے اس کے والد کو پکڑ لیا تھا مگر والد مرحوم میں (اللہ ان کو رحمتوں سے نوازے) کوئی علامت ایسی نہیں پائی جس سے ظاہر ہو کہ انھوں نے بھی اس چوٹ کا کوئی اثر لیا ہے۔ بلکہ عمر بھر کبھی بھی ان سے کوئی سخت لفظ مودودی صاحب کے بار...

(۲) اور اس سے چھ سات سال پہلے اسی طرح کا وہ واقہ...
خلاف ایک سخت فضا ملک میں پیدا ہوئی۔ اس میں اکابر دیوبند کے فـ...
نے اس موقع پر ایک مفصل مضمون "جماعت اسلامی اور اس کے...
الفرقان میں لکھا جس کا اصل مقصد تو فتوں سے اختلاف تھا مگر سا...
واقعی قابل اصلاح باتیں خود والد ماجد کی نظر میں تھیں ان کی بھی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس پر نہایت تند و تیز جواب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی (مرحوم) کے قلم سے آیا۔ کیا تندی و تیزی تھی کہ بس "اللہ دے اور بندہ لے" کہیئے۔ "میری غلطیاں" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون والد ماجد نے اس پر لکھا۔ ایک لفظ کسی تلخی و برہمی کا نہیں تھا۔ البتہ رنج و ملال کا اظہار تھا کہ ان کو کس قدر غلط سمجھا گیا۔ اور آخر میں یہ کہ دراصل غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اپنے اور اکابر جماعت کے درمیان وہ باہمی اعتماد اور حسن ظن فرض کر لیا جس کی موجودگی میں ایک دوسرے کی غلطیوں کی نشاندہی میں حرج نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا اصلاحی اسی جگہ واپس آگئے جس جگہ ان کو پہلے فرض کیا گیا تھا، مگر غلط ثابت ہوا تھا ——— یہ قصہ پورا کا پورا اسی نمبر میں ہو سکتا ہے کہیں درج کیا جائے۔

(۳) جس زمانے میں "ندائے ملت" ہفتہ وار کی عملی ذمہ داری زیادہ تر والد ماجد اور ان

---

(۱) واقعہ یہ ہے کہ یہ بخار مودودی صاحب ہی کے دل میں ہو سکتا تھا اسلئے کہ دوسرے طرف سے ان کے تقوے کا سوال اٹھایا گیا تھا۔ سوال اٹھانے والے کے دل میں تو کوئی بخار دبارہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ضمناً یہ بات بھی ایک لطیفے کی حیثیت سے قابل ذکر ہے کہ مودودی صاحب کی اس جوابی تحریر میں "طفل مکتب" کی پھبتی بھی موجود تھی۔ جو ظاہر ہے کہ راقم آثم ہی کو صاحب مضمون مان کر چست کی جاسکتی تھی، نہ کہ مولانا کے ہم عمر میرے والد ماجد پر۔

کے دو بیٹوں (عتیق و حفیظ) پر تھی، اس زمانے میں اخبار کے ادارتی کام میں مدد کے لئے کسی موزوں آدمی کی تلاش چل رہی تھی۔ دیوبند کے ایک جرنلسٹ جمیل مہدی مرحوم کے بارے میں والد ماجد کو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے کام کے ہیں۔ ان کو والد ماجد لے آئے اور پھر وہ گویا فرد خاندان بن گئے۔ ایک عرصے بعد ہم لوگوں نے ندائے ملت سے اپنا تعلق ختم کر لیا تو جمیل صاحب نے اپنا اخبار عزائم کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ اولاً پندرہ روزہ تھا پھر روزنامہ ہو گیا۔ ہم لوگوں سے تعلق ویسا ہی رہا۔ اسی دوران میں وہ وقت آیا کہ دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ کے بعد شوریٰ اور مہتمم کے اختلاف کا قضیہ کھڑا ہو گیا۔ جمیل مہدی حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم اور ان کے صاحب زادگان سے تعلق رکھنے والوں میں سے تھے انھیں قدرتی طور پر والد ماجد کے موقف سے اتفاق نہیں ہو سکا۔ اور اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن حضرت قاری صاحب کے انتقال کے بعد وہ بہت جذباتی ہو گئے اور یہاں کے سارے تعلق کو بھول کر اپنے اخبار میں والد ماجد کے خلاف ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ راقم کا اس زمانے میں ہندستان آنا ہوا تو غالباً اس کی بیس قسطیں نکل چکی تھیں، جو قسطیں راقم نے دیکھیں ان کا جمیل مہدی (جن کو برادرانہ تعلق کی بنا پر جمیل بھائی کہا جاتا تھا) سے تعلق ناقابل یقین تھا۔ ان میں تنقید ہی نہیں تفضیک تھی۔ بہت رنج پہونچا اور ان کی طرف جانے کے لئے قدم نہ اٹھ سکے۔ والد ماجد کو غالباً اندیشہ تھا، کئی دن کے بعد پوچھا جمیل کی طرف بھی گئے؟ میں نے کہا جی نہیں چاہتا، تو فرمایا نہیں بھئی چلے گئے ہوتے، ان کی باتیں تم جانتے ہو کچھ زیادہ خیال کرنے کی تھوڑی ہی ہوتی ہیں۔ چند دن کے بعد پھر پوچھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں ارادہ نہیں کر سکا پھر ترغیب دی لیکن اپنا ظرف ان کا سا نہ تھا۔ رنج نے پاؤں ادھر کو اٹھنے ہی نہ دیئے، حالانکہ انھوں نے اپنے اخبار میں میرے لندن سے آمد کی خبر ایسے انداز سے دی تھی گویا وہ اپنی طرف کو میری راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ مرحوم پھیپھڑوں کے مریض تھے۔ اس قصے کے بعد جلد ہی مرض زیادہ ترقی کر گیا اور حالتِ یاس میں اپنے وطن جانے لگے۔ تو والد مرحوم نے ان کو کچھ مالی ہدیہ بھجوا کر رخصت کیا اور پھر جب انتقال کی خبر ملی تو برادرم مولوی محمد زکریا راوی ہیں کہ بڑی رقت طاری ہوئی اور دیر تک ہاتھ اٹھائے دعا کرتے رہے۔

(۴) ان کی خواہش اور فرمائش پر لکھی ہوئی میری کتاب "واقعۂ کربلا" پر ایک بڑا مخالفانہ اور معاندانہ تبصرہ پاکستان کے ایک ماہنامے میں آیا۔ یہ بہت مفصل تھا اور لکھنے والے صاحب اچھے پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے مگر ان کے جذبات کی معاندانہ کیفیت نے ایسی رکاکت اور تہذیبی

گراوٹ ان کے قلم پر طاری کردی تھی کہ پڑھتے ہوئے گھن آئے، راقم کے بارے میں تو جو کچھ رکاکت تھی وہ تھی۔ خود والد ماجد کے بارے میں اس کی سطح یہ تھی ان کے جو چند صفحات افتتاحیہ کے طور پر کتاب میں شامل ہوئے تھے ان صفحات میں حادثۂ کربلا سے متعلق اپنے گھر اور شہر کا ماحول بتاتے ہوئے جس میں بچپن گذرا تھا ایک جملہ یہ لکھا کہ "مجھے چھ سات سال کی عمر میں پورا شعور آگیا تھا، مجلسوں میں (عشرے کی مجلسوں میں) جو کچھ سنتا تھا اسے سمجھتا تھا" تبصرہ نگار کو اس بیان میں شاید کچھ مبالغہ نظر آیا تو اپنے شک وشبہہ کے اظہار کے لئے جو پیرایۂ بیان انھیں پسند آیا وہ یہ تھا کہ اس عمر میں تو ہمارے یہاں بچے ننگے پھرا کرتے ہیں۔

راقم الحروف ان دنوں لندن میں تھا اور ایک دوست کو یہ تبصرہ کہیں سے پہونچ گیا تھا جو انھوں نے مجھ کو بھیج دیا تھا۔ اس کو پڑھ کر جو تاثر ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر تھا مگر والد ما- [illegible]
ہے جس میں اس تبصرے کو اس کی رکاکت کی طرف اشارے [illegible]
تبصروں کے مقابلے میں اس لئے قابلِ لحاظ قرار دیا گیا تھا کہ اس میں
بعض متعین گرفتیں تھیں۔ اگرچہ وہ تھیں سب جذباتیت کا نتیجہ۔ او[illegible]
تھا کہ آئندہ ایڈیشن میں بعض تعبیرات میں تبدیلی مناسب سمجھو[illegible]
مدعا زیادہ واضح ہو جائے۔

راقم الحروف ایسے معاملات میں اپنے والد ماجد کی بڑائی سے پوری طرح واقف تھا اور اس معاملے میں ان کو اپنے اکابر کے قدم بقدم پایا تھا مگر اتنی بڑائی سے کبھی واقفیت کا موقع پہلے نہ ملا تھا۔ وہ ایک نوعمر آدمی کی تحریر میں اپنی ایسی توہین و تکذیب دیکھتے ہوئے بھی جسے میں شاید ہمیشہ ناقابلِ معافی پاتا رہوں قابلِ لحاظ کا لفظ اس کے لئے استعمال فرمارہے تھے۔ اور جن اعتراضات کو بدنیتی پر اگر نہیں تو بدفہمی پر محمول کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا تھا، ان کے بارے میں وہ توجہ دلانا مناسب خیال فرمارہے تھے کہ آئندہ ایڈیشن میں تعبیر کی مناسب تبدیلی سے اپنا مدعا اور مافی الضمیر زیادہ واضح کردیا جائے۔ یعنی اس درجے کے کم فہموں کی رعایت میں جو کمی رہ گئی ہے اسے دور کردیا جائے۔ (۱)

---

(۱) ایک اعتراض مثلاً یہ کیا گیا تھا کہ فلاں عبارت (حاشیہ ص ۷۲ طبع دوم) میں حضرت معاویہ کو "امام فاجر" قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات سوائے ایک بدنیت یا بدفہم کے کوئی اور اس لئے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کتاب کا تو سب سے بڑا امتیاز ہی یہ ہے ــــ جو بعض کے نزدیک اس کی سب سے بڑی خرابی ہے ــــ کہ صحابۂ کرام کی شان کا بلا تفریق تحفظ ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کی سب سے زیادہ ضرورت حضرت معاویہؓ ہی کے سلسلے میں پیش آتی ہے جس میں کوئی کمی نہیں کی گئی۔ اور یہ بات کچھ لوگوں کو جانبداری لگی

راقم نے بعض موقعوں پر ان کی زبان سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا تھا کہ کسی نے آپ کی صحیح النسبی پر حملہ کرنے والے الفاظ بولے تو حضرت نے بلا کسی اشتعال کے فرمایا کہ بھائی میرے والدین کے نکاح کے گواہ ابھی موجود ہیں۔ مذکورہ بالا خط پڑھ کر میرے دل نے کہا کہ بے شک انھیں حق ہے کہ بزرگوں کے ایسے واقعات نصیحت کے لئے سنائیں۔

حزبیت سے بالاتری

دیوبند میں پڑھا۔ مسلک دیوبند اور اکابر دیوبند سے وہ محبت کہ تعلیم کے دوران ہی میں اس مسلک اور اس کے اکابر کے خلاف غوغا آرائی سنی تو وہیں اس سے نپٹنے کی تیاری شروع کردی اور عملی زندگی کے میدان میں جو اپنا پہلا نقش ثبت کیا وہ اس مسلک حق کے خلاف فتنہ اٹھانے والوں کا وہ تعاقب تھا کہ برصغیر میں پھیلی ہوئی پوری جماعت دیوبند کے لئے وہ باعث فخر ہوا اور اکابر کی نگاہ میں قابل رشک قدر و منزلت پائی اور پھر عمر کے چالیسویں سال میں وہ وقت آیا کہ اکابر نے اپنے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اپنے پہلو بہ پہلو ایک رکن کی حیثیت سے ان کا انتخاب کیا تو اس مجلس میں بھی اپنے خلوص، جذبۂ وفا اور جذبۂ عمل کے زیر اثر وہ وقعت پائی کہ اکابر کے گذر جانے کے بعد ان کی رائے کو جو وزن ملتا تھا وہ ان کے کسی بھی ہمسر کے لیے قابل رشک تھا۔ دنیا سے وہ اس حال میں گئے کہ بلا ادنیٰ اختلاف دارالعلوم اور اس کی شوریٰ کی سب سے موقر و محترم شخصیت تھے۔ اس سب کے باوجود حزبیت اور مسلکی گروہیت سے بالاتری کا کیا حال تھا؟ صرف ایک بات کا تذکرہ بالکل کافی ہے۔

انتقال کے بعد ماہنامہ بینات کراچی کے ایڈیٹر محترم مولانا محمد یوسف لدھیانوی زید مجدھم نے جو تعزیتی مضمون اپنے ماہنامے میں بالاقساط تحریر فرمایا اس کی پہلی ہی قسط میں انھوں نے آپ کا ایک خط شائع کیا ہے، جسکا ایک جزو یہ ہے۔

"اس مہینہ اکتوبر ۲۹، ۳۰، ۳۱ کو دارالعلوم دیوبند میں تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے اجلاس بلایا گیا ہے۔ یقین ہے کہ جناب کی خدمت میں بھی دعوت نامہ پہونچا ہوگا دعوت نامے میں ایک بات بہت غلط لکھ دی گئی ہے اگر آپ کو وہ دعوت نامہ پہونچا ہوگا تو آپ نے بھی محسوس فرمایا ہوگا کہ غلام احمد قادیانی کا تعاقب سب سے پہلے حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے فرمایا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خاص کر پنجاب کے حضرات علماء کی طرف سے اس کا تعاقب حضرت شاہ صاحب کی پیدائش سے بھی پہلے شروع ہو گیا تھا۔ میں نے دعوت نامہ ڈاک سے ملتے ہی لکھا تھا کہ فوراً اس غلطی کا تدارک کیا جائے۔ بڑی فاحش اور رسواکن غلطی ہے ہاں میرے نزدیک یہ بات صحیح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے قادیانیت کے خلاف جنگ کا خاتمہ کامیابی کے ساتھ حضرت شاہ صاحب اور ان کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تلامذہ کے ذریعہ کرلیا۔" (بینات اگست ۱۹۹۷ء ص ۱۲)

اکابر دیوبند میں بھی حضرت انور شاہ صاحبؒ وہ ہستی ہیں جن سے والد ماجد کا تلمذ بھی ہے اور علمی و روحانی ہر دو طرح سے وہ تاثر و عقیدت بھی جو اپنی مثال آپ ہے۔ اور جس کا بیان اکثر قارئین "تحدیث نعمت" میں پڑھ چکے ہوں گے۔ لیکن نہ دار العلوم سے ان کی محبت اس کی روادار ہو سکی اور نہ حضرت شاہ صاحب سے تاثر و عقیدت کہ جو خراج تحسین (CREDIT) کسی اور کا حصہ ہے اُسے اپنے کچھ لوگوں نے غلطی سے بھی اپنے اکابر کے حصے میں ڈالدیا ہے تو اُسے طرح دے جائیں(۱)۔ اس غلطی کیلئے "فاحش" سے آگے بڑھ کر "رسوا کن" کا لفظ حزبیت سے ان کی بالاتری کا جو درجہ ظاہر کرتا ہے اسے کسی شرح و بیان کی حاجت نہیں۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ ورنہ ان کی پوری زندگی الحمد للہ حزبیت اور گروہی ذہنیت سے بالاتر رہنے کی شاہد ہے۔ ابھی دو تین صفحے پہلے "جماعت اسلامی اور اسکے خلاف فتوے" کے عنوان سے ان کے جس مضمون کا تذکرہ گزرا وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ او ر ا
بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہ اُس جماعت کی فی الجملہ حمایت میں لکھا گیا
چکے تھے۔ بلکہ جس کے قائد و سربراہ کے اپنے ساتھ معاملے سے اُنھیں
"مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت" میں موجود ہے

اعتدالِ فکر

حزبیت اور گروہی ذہنیت سے یہ بالاتری جس چیز نے اُن کے لئے آسان کی بظاہر اُن کی سوچ اور فکر کا اعتدال ہے، جس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اُن کے امام ہیں۔ اور ابتداءً ان کے ذہن کا یہ سانچہ بننے میں اُن کے استاذ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے فیض صحبت کی بھی علامات پائی جاتی ہیں۔ الحمد للہ کہ اُن کے اس اعتدالِ فکر کا ایک مرقع اُن کی کتاب "معارف الحدیث" کی شکل میں اُن کے بعد بھی موجود ہے۔ اور جو لوگ بھی اعتدال کو بحیثیت ایک اصول کے پسند کرتے ہیں اُن کیلئے وہ ایک نمونہ ہے کہ اس اصول کو، جس کا برتنا بیحد مشکل اور "کارِ شیشہ و آہن" ہے، کس طرح واقعی معنی میں برتا جاتا ہے۔

اسی کتاب کے سلسلے میں ایک خط کا جواب مجموعۂ مکاتیب میں سامنے آیا ہے جس کی چند سطریں یہاں نقل کر دی جائیں تو اُن کی سوچ و فکر کا انداز بہت ہی کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ خط کینیا کے ایک صاحب کو سواحلی زبان میں معارف الحدیث کے ترجمے کی اجازت دینے کیلئے

---

(۱) اس باب میں وہ اپنے زمانے کے لوگوں میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم کا اہمیت سے ذکر فرمایا کرتے تھے جو اہلحدیث جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔

لکھا گیا ہے؛ ارشاد ہوتا ہے:

> "معارف الحدیث کی تمام جلدوں کی سواحلی زبان میں ترجمے کی میرے طرف سے اجازت ہے
>
> میں نے اپنے نزدیک اُن احادیث کی تشریح میں مسلکی تعصب کی بنا پر بے انصافی نہیں کی ہے جن کا تعلق فقہی اختلافی مسائل سے ہے۔ ہاں یہ بات میرے پیش نظر ضرور رہی ہے کہ برصغیر ہند میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی غالب اکثریت جو حنفی المسلک ہے اس کو اپنے مسلک کے بارے میں بے اطمینانی نہ ہو۔ میں نے اسکو دینی مصلحت سمجھا۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً فیوض الحرمین میں تحریر فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تین وصیتیں میرے ذاتی رجحان کے خلاف فرمائیں۔ اُن میں سے ایک یہ تھی کہ اپنے ملک میں جاکر وہاں کے عامۂ مسلمین کے رویے کے خلاف رویہ و مسلک اختیار نہ کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہی تھا کہ ان کے خلاف عمل کرنے سے امت میں انتشار پیدا نہ ہو۔
>
> بہر حال اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ سواحلی زبان بولنے والوں کی اکثریت شافعی المسلک ہے کتاب الصلوۃ میں یا جہاں بھی فٹ نوٹ لکھنے کی ضرورت سمجھی جائے، وہ ضرور لکھا جائے، میرے نزدیک یہ بھی دینی مصلحت ہے۔"(۱)

حمیّتِ دینی

اعتدال اور حمیّت دو چیزوں کا جمع ہونا آسان نہیں ہوتا۔ اعتدال ٹھیراؤ چاہتا ہے اور حمیت بے چینی اور بے قراری۔ مگر اللہ تعالی نے والد مرحوم کیلئے آسان کیا تھا۔ تقریباً ساری عملی زندگی کے رفیقِ خاص حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے انتقال کے بعد جو پہلی تعزیتی تقریر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فرمائی اس کا ایک جملہ یہ بھی تھا کہ "اُن کے اندر اللہ تعالی نے متضاد صفات و صلاحیتیں ودیعت فرمائی تھیں" اِن صفات میں سے حمیّتِ دینی کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

---

(۱) یہ پورا خط حصہ مکاتیب میں شائع کیا جارہا ہے۔ وہاں اس کو مکمل شکل میں پڑھا جاسکتا ہے اور پڑھا جانا چاہئے کہ بات اس سے بھی زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے مولانا کو دوسرا وصف حمیّتِ دینی عطا فرمایا تھا۔ جس کی
میں شہادت دیتا ہوں، ایک رفیق کی حیثیت سے، اُن کے ایک ہم سفر کی حیثیت
سے اور اُن کے ایک معاون کی حیثیت سے بھی، کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو حمیّت اسلامی
و حمیّتِ دینی کا وہ جوہر عطا فرمایا تھا۔ جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔"(۱)

اس جوہر حمیّت کا اظہار اُن کی عملی زندگی کے روزِ اول ہی سے ہوا۔ جماعتِ دیوبند کے اعتقادی مسلک پر حملہ آوروں کے تعاقب کا جو ولولہ انگیز حال ہم اُن کے اس عہد اول میں دیکھتے ہیں وہ اسی دینی حمیت کا ایک ظہور تھا۔ کہ حق کو حملہ آوروں کے نرغے میں پایا تو سینہ سپر ہو گئے۔ محض ایک جماعتی جذبے اور عصبیت سے اُس کا تعلق ہم اس لئے نہیں جوڑ سکتے کہ حزبیت اور گروہی ذہنیت سے اُن کی بیزاری و بلندی کی کیفیت کا وہ حال ابھی ہم پڑھ آئے ہیں کہ اسکے بعد کسی گروہی جذبے کی نسبت ان کی طرف کرنا بڑی بے انصافی ہو گی۔
یہ حمیّت ہر موقع و محل کے مناسب رنگ میں اُن کی دمساز ر
کے بیان کے مطابق علامہ مشرقی کی تحریک کا فتنہ اٹھا تو وہ حرکت میں
مسلمانوں کے مستقبل کا سوال پیدا ہوا تو وہ بے چین ہو پڑی۔ مسلمانو
راستے سے شدھی کے حملے کی منصوبہ بندی نظر آئی تو اس دینی حمیت اور اسلا
مقابلے کی بساط بچھائے بغیر چین نہ پایا۔ اور جب عمر اسی (۸۰) کو پہنچ گئی تھی، مختلف عوارض نے قویٰ بہت متاثر ہی نہیں کر دئے تھے بلکہ پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ اُس وقت اُن کی اس دینی حمیت کو امام خمینی کے چیلنج نے چھیڑا تو پتہ چلا کہ اس زار و نزار بوڑھے جسم میں وہ حمیّت اُسی طرح جوان ہے۔ دورِ جوانی جیسی محنت کر کے "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" لکھ ڈالی۔ حضرت مولانا علی میاں نے اس محنت اور انہماک کی بابت اس کتاب کے مقدمے میں تحریر فرمایا تھا کہ

"انھوں نے اس محنت اور انہماک کے ساتھ کام شروع کیا کہ
بارہا ان کی صحت خطرے میں پڑ گئی۔ اور اہل تعلق کو اس بارے میں فکر و
تشویش لاحق ہوئی۔ لیکن مولانا اپنی افتادِ طبع اور زندگی بھر کے معمول
کے مطابق اپنے کو اس سے باز نہیں رکھ سکے۔"

اور پھر "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق یہ آواز جو اس چیلنج کے مقابلے میں اٹھنے والی اکیلی اور تنہا اور ایک نامانوس سی آواز تھی دیکھتے ہی دیکھتے عالم اسلام کے دل کی آواز بن گئی۔ ملکوں

(۱) حضرت مولانا کی یہ تقریر الفرقان بابت ماہ جولائی ۷۹ء میں چھپ چکی ہے۔

ملکوں اس کے ترجمے اپنی اپنی زبانوں میں ہوئے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اردو لٹریچر میں اس وسعت کے ساتھ آناً فاناً پھیلنے والی کوئی دوسری کتاب اور نہیں ہے۔ اور ایسے ہی کوئی دوسری کتاب نہیں ہے جو ایران کے نام نہاد "اسلامی" انقلاب جیسی کسی زبردست تحریک کے آڑے آنے میں کامیاب ہوگئی ہو۔ بیجا نہ ہوگا اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ قبولیت و تاثیر عمر بھر کی حمیّت کا اُسکے آخری وقت میں عطا ہونے والا ایک انعام تھا۔ والعلم عند اللہ۔

فکرِ آخرت

دلوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ لیکن تمام ظاہری علامات کے اعتبار سے اُن کی زندگی کا سب سے اہم اور رہنما اصول آخرت کی فکر اور یومِ حساب کا خوف تھا۔ اور شاید یہ برکت اور کرامت ہو اُس فکرِ آخرت کی جس کا ثبوت اُن کے والد ماجد (راقم کے دادا علیہ الرحمہ) نے ایک بڑی دنیاوی ترغیب کے اُس موقع پر دیا تھا جب ضلع کے انگریز کلکٹر نے اُن کے گھر پر ایک ملاقات میں بچوں اور اُن کی تعلیم کو پوچھا اور یہ معلوم ہونے پر کہ پانچ لڑکوں میں سے کسی ایک نے بھی انگریزی اسکول میں نہیں پڑھا اور نہ پڑھ رہا ہے۔ اپنی ذاتی دلچسپی کے ساتھ مشورہ دیا تھا کہ کم از کم ایک کو تو ——— جو عمر کے لحاظ سے والد ماجد ہی ہو سکتے تھے ——— انگریزی پڑھائی جائے۔ جس کے بعد وہ خود اپنے اختیارات سے اسکے لئے ترقی کی راہ بنائے گا۔ تو دادا جان مرحوم اس مشورے کو اس لئے اہمیت دینے کو تیار نہ ہوئے کہ اس تعلیم سے اُن کی اپنی آخرت کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ دادا جان مرحوم کے اس طرز فکر کی برکت صرف والد ماجد ہی میں نہیں، الحمد للہ اُن کی تمام اولاد میں قائم رہی اور بظاہر سب اسی حال میں دنیا سے گئے کہ فکرِ آخرت کی دولت اُنھیں میسر تھی۔ والد کے بڑے چھوٹے تمام بھائی بہن اُن سے پہلے رخصت ہوگئے تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

آخرت کی فکر اور اُسکی باز پُرس کا استحضار اختلافات کے موقع پر بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسے سنگین قسم کے چند مواقع والد ماجد کی زندگی میں میرے اپنے دورِ شعور میں آئے۔ ان میں سب سے سنگین دارالعلوم دیوبند کے اختلافات کا قضیہ تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ جو سب الفرقان میں شائع ہوتا رہا۔ وہ ساری تحریریں کم از کم راقم الحروف کی نظر میں اس بات کی گواہی کیلئے کافی ہیں کہ اس قضیے میں اُن کے موقف اور ان کے رویے کی اصل بنیاد بحیثیت رکن شوریٰ اپنی ذمہ داری کے سلسلے میں آخرت کے سوال وجواب کی فکر تھی۔ اور اسی لئے اُن کے بیانات کی تمام سختی و صراحت کے باوجود آدمی کہیں وہ بات نام کو بھی نہ پائے گا کہ

''جنگ اور محبت میں سب کچھ روا ہے''۔ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی نے مئی جون ۱۹۹۷ء کے شمارے میں ایک مفصل تعزیتی اداریہ لکھا تھا، اس میں دارالعلوم کے اسی قضیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

> ''حضرت مولانا نعمانی نور اللہ مرقدہ کی ایک اور صفت جس سے بندہ بیحد متاثر ہوا وہ ان کی آخرت کی جوابدہی کی فکر ہے۔ دارالعلوم کے اسی ہنگامے کے دوران میں بندے کو مولانا سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ اور ہنگامے سے نپٹنے کے متعلق طویل طویل گفتگو کی بھی نوبت آئی۔ مگر مولانا کو کبھی آخرت کی جوابدہی کی فکر سے خالی نہیں پایا۔ جبکہ ایسے معاملات میں عام طور پر اچھے دیندار اور پرہیزگار لوگ بھی تساہل سے کام لیا کرتے ہیں۔''

اس اقتباس کی اہمیت یہ ہے کہ راقم الحروف کے علم کی حد تک مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کا کوئی خصوصی یا عقید تمندانہ تعلق والد ماجد سے کبھی نہیں تھا۔

آخرت اور خوفِ خدا کی شہادت دینے کی حد تک اُسی وقت جاتا ہے جب اُسے غیر معمولی اثر لینے پر مجبور ہی کر دے۔

کسی بھی اختلاف کے موقع پر کبھی کوئی سخت اور ایسا لفظ جو ایک ہو اُن کی زبان سے سننا یاد نہیں۔ کبھی غیبت یا طنز و تعریض کا کلمہ سننا یاد نہیں۔

یقیناً یہ بھی فکر آخرت ہی تھی جو انھیں اپنی غلطیاں ماننے اور اُن کا اعلان کر دینے پر آمادہ کر دیتی تھی۔ اور اس حد تک کہ وہ اپنے ہم عصروں میں اس وصف کے لئے مشہور ہوئے۔

رضا بالقضا

کوئی شکر کا کلمہ اللہ کے اس احسان کا حق ادا نہیں کر سکتا کہ زندگی کا آخری تقریباً ۷ سال کا زمانہ جو طرح طرح کی معذوریوں اور تکلیفوں سے پُر رہا اور اس حد تک کہ پرسشِ حال کرنے والے متعدد خطوں کے جواب میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ اگر موت کی دعا منع نہ ہوتی تو دعا کرتا کہ اب اُٹھا لیا جاؤں۔ اس حال کے باوجود اس تمام عرصے میں کبھی دبی زبان سے بھی کلمۂ شکایت اور شکوۂ احوال سننے میں نہیں آیا۔ اور ہم لوگوں کو رضا بالقضا اور صبر و ضبط کی جو تعلیم اس حال کو مسلسل دیکھنے میں ملی اسکی کوئی قیمت بتائی نہیں جا سکتی۔ بس کلمۂ استغفار اور فضل و عافیت کی دعا ہی زبان پر رہتی تھی .....

اے اللہ اپنے اس بندے کے بارے میں ہمارے گمانوں کو اپنے کرم سے سچ ٹھہرا۔ اُسکی خوبیوں کا ہمیں وارث بنا۔ اور اس کی جدائی کے اجر سے محروم نہ فرما۔ آمین۔ ☆☆

ماہنامہ الفرقان کے مدیر اعزازی اور اس خاص اشاعت کے مرتب مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی اہم تصانیف

واقعہ کربلا اور اس کے پس منظر کا بیان ایک طویل عرصہ سے دو متضاد نقطہائے نظر کی انتہا پسندانہ کشاکش کا شکار ہے۔

یہ کتاب دونوں انتہا پسندیوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال سامنے لاتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس واقعہ سے متعلق تاریخی حقائق کو اس سے پہلے کبھی اتنا چھانا اور پھٹکا نہیں گیا جتنا اس میں اور نہ کبھی اتنی احتیاط اور غیر جانبداری سے حقیقت کی تلاش کی گئی ہے۔

مصنف نے ایک طرف سبط رسول سیدنا حسینؓ کی احترام کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا، دوسری طرف حضرت معاویہؓ کے شرف صحابیت کا حق بھی ہر لحہ نگاہ میں رکھا اور تیسری طرف حق اور سچائی کے اپنے تقاضوں پر بھی کہیں آنچ نہیں آنے دی ہے۔ قیمت عام ایڈیشن -/50 روپے

مکمل غیر جانبداری اور توازن کے ساتھ اس کتاب میں ایران کے اسلامی انقلاب کی اسلامیت کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان گوشوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کو پیش نظر رکھے بغیر انقلاب ایران کی اسلامیت کے بارے میں صحیح رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ قیمت صرف -/15 روپے

علمی و دینی اور تاثراتی حقائق کا مجموعہ قیمت -/55

مسلم مسائل پر اداریتی مضامین کا بہترین انتخاب قیمت صرف -/45

تین طلاق برابر ایک طلاق کے سب سے اہم وکیل حافظ ابن قیم کی بحث کا عام فہم جائزہ قیمت -/35

ملنے کا پتہ : الفرقان بکڈپو 114/31 نظیر آباد ، لکھنؤ – 18

ڈاکٹر شمس تبریز خاں
استاذ شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

اکابرِ علمائے دیوبند کے سلسلۂ زرّیں کی آخری کڑی

عالم ربانی حضرت مولانا محمدؒ منظور نعمانیؒ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی عالم دین دنیا سے اٹھتا ہے تو اس سے دین وملت میں ایک رخنہ اور خلا پیدا ہو جاتا ہے، عالم باعمل فاضل
حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے انتقال پر ملال کو اب قریب
بھی تازہ ہے۔ اور اہل دل کے دلوں میں عرصہ دراز تک تازہ
آیات سے دین وملت کی صفوں میں ایسا ہی خلا محسوس ہو رہا ہے
علیہ وسلم نے کی تھی۔

وما کان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

ملت اسلامیہ ہند کے لئے جن علماء ومشائخ کی بابرکت ہستیاں سہارا بنی ہوئی ہیں اور جنکی دعائیں فرد وجماعت کے حق میں مستجاب کہیں جاسکتی ہیں اور جن کا وجود دنیا کو اللہ کی رحمت کا سایہ عطا کرتا اور اسکے عقاب وعتاب سے پناہ بنتا ہے، ان میں عالم ربانی حضرت مولانا نعمانیؒ کی ذات بابرکات بھی تھی جن کی وفات پر ملت اسلامیہ ہند بجاطور پر اپنے کو یتیم وبے سہارا محسوس کر رہی ہے، حضرت مولانا کی ذات ایک مثالی وربانی عالم کا دلکش نمونہ تھی جس کا عمل اسکے علم سے بھی زیادہ متاثر کرتا تھا، وہ ایسے عالم باعمل تھے جنہیں دیکھ کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور اسلام کی مردم سازی ومردم گری پر یقین بڑھ جاتا تھا، ان کا سیدھا سادہ لباس 'لباس التقوی' کی مثال تھا، اس پر ان کا سادہ عمامہ (جس کا شملہ بقدر علم طویل ہونے کے بجائے سر سے غائب رہتا تھا) ان کی سادگی اور اتباع سنت کا مظہر ہوتا تھا، اللہ کے ذکر اور توبہ واستغفار اور کلمہ طیبہ کے ورد سے ان کی زبان ہر وقت تر وتازہ رہتی تھی اور سننے، پاس بیٹھنے والوں پر اسکا خاص

اثر ہوتا تھا اور غفلت دور ہو جاتی تھی، ان کی مغتنم ہستی ان اللہ والوں میں سے تھی جنہیں دیکھ کر خدا کی یاد آتی ہے اور دل دنیا سے سرد ہو جاتا ہے، اس دور آخر میں وہ اکابر علمائے دیوبند کے سلسلہ زریں کی آخری کڑی تھے، جس سے اسلاف دیوبند کی علمی و عملی جامعیت کی نمائندگی ہوتی تھی اور علم و عمل کے ہر میدان میں ان کا اختصاص و امتیاز ظاہر ہوتا تھا۔

حضرت مولانا نعمانیؒ کی پاکیزہ شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں میں تقویٰ و طہارت اور کتاب و سنت کی تعلیمات پر مداومت و استقامت۔ دین کا علم راسخ اور اس کا حفظ و اتقان۔ عقائد صحیحہ پر ایمان و ایقان، اور انکی حفاظت و اشاعت کیلئے فکر و دل سوزی، غیرت ایمانی و حمیت دینی، اور بدعت و انحراف کے خلاف حساسیت، ملت کی صلاح و فلاح کی ہمہ وقتی ہمہ جہتی فکر اور نازک ترین مرحلوں میں اسکی دستگیری و رہنمائی، اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ فراواں، ذاتی و جماعتی اصلاح و تزکیہ، تعلق باللہ اور آخرت کی فکر، حق گوئی و بیباکی اور اخلاقی جرأت و استقامت، اشاعت اسلام و تبلیغ دین کی علمی و عملی جد و جہد اور اس کے لئے سادہ و داعیانہ اسلوب کا انتخاب، فراست ایمانی و حکمت دینی کے ذریعے عصری تقاضوں کی تکمیل اور عصر حاضر میں اسلامی اقدار و افکار کی علمی و عملی پیش کش جیسی اوصاف حمیدہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

آپ کا ورع و تقویٰ مثالی تھا اور اس کا انھیں ہمیشہ التزام و اہتمام رہا، برسوں امین آباد کی مرکز والی مسجد کے مکان میں قیام رہا، جہاں نماز باجماعت کے ساتھ درس و افادہ بھی رہتا تھا، جماعت تبلیغ اور اس کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے انھیں اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کو شروع ہی سے خاص قربت و مناسبت حاصل رہی ہے، چنانچہ ان حضرات کے جماعت کے ساتھ تاثیر و تاثر کے دو طرفہ تعلقات قائم رہے، اسکے علاوہ وہ اکابر علماء و مشائخ وقت سے مستفید ہوئے اور ان کے معتمد علیہ بھی رہے، اور اپنے تقویٰ اور روحانی اہلیت کے سبب حضرت مولانا عبدالقادر رائپوریؒ کی خلافت سے سرفراز ہوئے۔

شدید اعذار اور امراض میں مبتلا ہونے کی حالت میں بھی میں مولانا نعمانی کو اشاروں سے مگر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے دیکھتا تھا، انھیں دنوں میں ہم اور مولانا عتیق احمد صاحب بستوی جب بھی حاضر خدمت ہوتے تو ہم سے باتیں کرتے ہوئے بھی وقفہ وقفہ سے کلمہ استغفار کا ورد جاری رہتا تھا، ان کی خوش اخلاقی و تواضع کا یہ حال تھا کہ چائے بسکٹ سے ہماری ضیافت کرتے اور اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر ہمیں ممنون و مجوب کرتے تھے، اخیر عمر میں رقت طبع بہت بڑھ گئی تھی، جب دعا کی درخواست کی جاتی تو دعا دینے کے ساتھ اپنے لئے

بھی دعا کی فرمائش کرتے اور فرماتے کہ میں خود گنہگار اور دعا کا محتاج ہوں اور یہ کہتے ہوئے ان کی آواز گلوگیر اور آنکھیں تر ہو جاتی تھیں، مرض الوفات کے آخری چالیس دنوں میں جب کچھ سکتے و غشی کی کیفیت طاری رہی اسکے متعلق صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا سجاد نعمانی صاحب کا بیان ہے کہ ان کا یہ اختیاری سکوت، تبتل الی اللہ کے احوال و کوائف اور رفیق اعلیٰ کی طرف یکسوئی کی کیفیات سے معمور تھا۔

علم دین میں انھیں رسوخ و وثوق حاصل تھا جسے انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے بڑے اساتذہ اور خاص طور سے محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے حاصل کیا تھا، مناظرہ سے مناسبت ہونے کی وجہ سے کتاب و سنت اور اہلسنت کے عقائد و علم الکلام کی کتابوں کے حوالوں کا انھیں بہت خیال رہتا تھا، اور محدثانہ ذوق کی وجہ سے صحت روایت اور استناد کا بھی اہتمام رہتا تھا حتیٰ کہ گفتگو میں بھی سنی ہوئی روایتوں کو راوی کے الفاظ ہی میں بیان کرتے تھے۔ جسکے بہت سے نمونے ان کی آخری کتاب ''تحدیث نعمت'' میں ہیں، اللہ نے حافظہ بھی بہت اچھا عطا کیا تھا جسکی وجہ سے علامہ علماء کے اقوال انھیں کے الفاظ میں نقل فرماتے تھے۔ کتاب و مطالعے کے سبب دین کے اصول و مبادی، اہلسنت کے عقائد اور شرک و بدعت کے حدود و قیود اور انکے نازک و باریک فرق و اختلاف پر جیسی ان کی مبصرانہ و محققانہ نظر تھی ایسی معاصر علماء میں شاید ہی کسی کی ہو، انکی بیشتر کتابیں کتاب و سنت ہی کے صاف شفاف مآخذ اور ان کے حوالوں سے مزین ہیں اور ان میں ضعیف و مشکوک روایتوں سے پرہیز کیا گیا ہے، اس لئے ان کی کتابیں کتاب و سنت اور عقائد صحیحہ اور علم صحیح کے نور سے روشن ہیں اور عوام و خواص ان سے بے کھٹک مستفید ہو سکتے ہیں۔

عقائد صحیحہ پر ان کے ایمان و ایقان کا تقاضا تھا کہ انھیں بریلویوں اور قادیانیوں سے مناظرے کرنے پڑے اور اس سلسلہ کی کتابیں لکھنی پڑیں، بریلویوں کی بدعات و رسوم اور اکابر علمائے دیوبند پر انکے الزامات کے دفاع میں انھوں نے ''بوارق الغیب'' اور فیصلہ کن مناظرہ'' لکھی، اسی طرح قادیانیت کی تردید میں کئی رسالے لکھے، اسی طرح خاکسار تحریک کے ذریعے علماء سے بے اعتمادی اور دینی روایات کی نئی تاویل اور انحراف و تجدد کے خلاف بھی انھوں نے بر وقت آواز اٹھائی، اہلسنت کے عقائد صحیحہ کے خلاف جب بھی کوئی تحریک وجود میں آئی انکی غیرت ایمانی و حمیت دینی بیدار ہو گئی اور انکے حساس ذہن و شعور اور پختہ دینی مزاج و مذاق نے

اسکے خطرات اور آئندہ اثرات ونتائج کو بہت پہلے محسوس کر لیا اور عامۃ المسلمین کو ان سے بچانے اور آگاہ کرنے کا فرض کفایہ انجام دیا۔

امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے بعد حلقہ دیوبند سے ردشیعیت پر علمی کام بہت کم ہوئے لیکن خمینی صاحب کے ذریعے ایران کے انقلاب نے جب نئی حکمت عملی اور نئے عزائم کے ساتھ شیعیت میں کچھ اصلاح وتجدید کے ذریعے سنی مسلمانوں اور عالم اسلام کو پرچانے اور رجھانے کی بھرپور کوشش کی تاکہ ایرانی انقلاب کو برآمد کیا جاسکے اور اسکے مذہبی وسیاسی دائرہ اثر کو بڑھایا جاسکے، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ شط العرب اور خلیج عرب کے مسئلے پر عراق سے زمینی وعلاقائی طویل تصادم نے ایرانی انقلاب کی طرف سے عالم اسلام اور عربوں کو چوکنا کر دیا اور یہ انقلاب حقیقی اسلامی انقلاب کا بہروپ بھرنے میں کامیاب نہ ہوسکا، اس انقلاب کے جارحانہ عزائم نے عالم اسلام کو تذبذب میں ڈال دیا کہ وہ ایرانی بادشاہت کو بہتر سمجھیں یا "اسلامی جمہوری" ایران کو!

عالم اسلام کو اس انقلاب کے دعوائے اسلامیت اور خمینی صاحب کے افکار وعزائم سے آگاہ کرنے اور اس کا علمی وتنقیدی جائزہ لینے کے لئے مولانا نعمانیؒ نے خمینی صاحب کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کر کے ان کے مذہبی وسیاسی خیالات سے پردہ اٹھایا، ایرانی انقلاب کے پروپیگنڈے اور دعوائے اسلامیت سے سادہ دل سنی مسلمانوں کی خوش فہمی اور اپنے موقف پر بداعتمادی وبدگمانی کے خطرے کا انھیں شدت سے احساس ہوا اور اللہ نے ان سے اس نازک مرحلے پر تاریخی کام لیا۔ ان پر یہ احساس اس قدر غالب تھا کہ دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کیا اور ان سے کام لیا، کچھ مضامین مجھ سے بھی ترجمہ کرائے اور وہ سلسلہ مضامین لکھوایا جو "تاریخ اسلام میں شیعیت وباطنیت کا منفی کردار" کے عنوان سے چار پانچ قسطوں میں الفرقان میں شائع ہوا اس کے ساتھ ہی دو جلدوں میں شیعوں کے کفر کے بارے میں علمائے اسلام کا متفقہ فیصلہ شائع کیا، جو بہت سے سنی مسلمانوں کی مرعوبانہ ذہنیت اور شیعیت سے ناواقفیت کے موجودہ حالات میں بڑی جرأت وعزیمت کا کام تھا۔

علم وعمل میں امتیاز کے ساتھ وہ اقامت دین واعلاء کلمۃ اللہ کے معاشرے میں اسلامی اقدار واعمال اور مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کی جد وجہد میں ہمیشہ سرگرم رہے، اسی جذبے کے تحت جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جماعت اسلامی قائم کی تو وہ ان کے شریک کار اور رفیق رہے، اگرچہ بعض وجوہ سے جلد ہی ان سے الگ ہوگئے، جس کی تفصیل انھوں نے

"مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت" میں بیان کی پھر ان کو حضرت مولانا الیاسؒ کی دعوت واصلاح و تبلیغ میں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آئی اور وہ ان کی دعوت دین میں جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوگئے۔ اور تبلیغی دوروں میں دور دراز مقامات کے اسفار کئے اور ہزاروں بندگان خدا کی اصلاح و ہدایت کا ذریعہ بنے۔ اخیر میں اگرچہ تبلیغی جماعتوں میں عملی شرکت موقوف ہوگئی تھی مگر تبلیغ کے ذمہ داروں اور کارکنوں کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ اور اپنی دعاؤں سے ان کی ہمت افزائی اور سرپرستی فرماتے رہے۔

ملت کی دینی رہنمائی کے ساتھ حتی الامکان انھوں نے اس کی سیاسی خدمت بھی کی، مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلاف کے زمانہ میں انھوں نے مولانا مدنیؒ اور جمعیۃ علماء ہند کے موقف کا ساتھ دیا اور تقسیم ہند کے مطالبے سے اختلاف کیا انھوں نے اپنے اس موقف کی حمایت اس خوبی کے ساتھ کی کہ ایک مرحلے پر حضرت تھانویؒ بھی ان

تھے (۱) جس کی روداد ان کی کتاب "تحدیث نعمت" میں دیکھی

پاکستان اور مسلمانوں کے ہندوستان میں قیام اور ان کے قدم جما

مساعی جمیلہ یادگار ہیں ان میں ایک نام مولانا نعمانیؒ کا بھی ہے۔

آزاد ہندوستان میں جب ۱۹۶۰ء میں جبل پور، جمشید پور

فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تو انھوں نے دیگر مسلم لیڈروں کے ساتھ مل کر آواز اٹھائی اور ونوبا بھاوے جی وغیرہ ہندو لیڈروں سے مل کر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور مسلم مجلس مشاورت کے تحت تمام مسلم جماعتوں کا ایک متحدہ محاذ قائم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تاکہ مسلم جماعتیں اپنے علاحدہ وجود کے ساتھ بھی مشترکہ ملی مسائل پر متفقہ موقف اختیار کریں تاکہ ان کا سیاسی و سماجی وزن محسوس کیا جاسکے، یہ ایک بہترین سیاسی پالیسی تھی جس کو اپنا کر ملت اسلامیہ آج بھی ہندوستانی سیاست میں اپنا موثر رول ادا کرسکتی ہے وہ مسلمانوں کے انگریزی اخبار کے لئے بھی دوسرے علماء کے ساتھ کوشاں رہے، علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قیام، اور پیش آئندہ مسائل میں مسلم موقف کی وضاحت واشاعت میں شریک رہے۔

حق گوئی و بیباکی، صاف گوئی اور اخلاقی جرأت کے لئے بھی وہ بہت ممتاز تھے، جس

---

(۱) یہاں فاضل مضمون نگار کو سہو ہوا ہے یہ تقسیم ہند کے مطالبے سے پہلے کی بات ہے۔ اور اس کا تعلق کانگرس اور مسلم لیگ کے اختلاف سے نہیں تھا۔ تفصیل تحدیث نعمت میں ہے۔ (الفرقان)

طرح دین میں بدعت وانحراف کے خلاف وہ ہمیشہ سینہ سپر رہے اسی طرح اپنی جماعت دیوبند کے معاملات میں بھی جس رائے کو صحیح اور دارالعلوم دیوبند کے حق میں مفید سمجھتے اس پر اصرار کرتے تھے اور کسی کی منہ دیکھی نہیں کہتے تھے، آٹھویں دہائی کے شروع میں دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے بعد جب دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا محمد طیب صاحب اور مجلس شوریٰ کی اکثریت کا اختلاف سامنے آیا تو انھوں نے حضرت مہتمم صاحب کی دیرینہ خدمات اور ان کی برگزیدہ شخصیت اور علمی و دینی وجاہت کے باوجود مجلس شوریٰ کا ساتھ دیا، کسی ملامت کی پرواہ نہ کی اور مجلس شوریٰ کے پلڑے میں اپنی شخصیت کا پورا وزن ڈال دیا۔

اپنے سارے کمالات و خصوصیات کے باوجود حضرت مولانا نعمانیؒ کی سیرت کا قابل تحسین ولائق تقلید پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی اصلاح اور تعلق باللہ کی ترقی سے کبھی غفلت نہیں برتی اور اس کے لئے وقت کے بیشتر علماء و مشائخ سے مخلصانہ تعلق قائم رکھا اور ان کی صحبتوں سے مستفید ہوئے اور ان کے معتمد علیہ ٹھہرے۔ اس سلسلے کی اہم تفصیلات ان کی کتاب ''تحدیث نعمت'' میں آگئی ہیں۔

مولانا نعمانی کی تقریر و تحریر میں بہت کم فرق تھا، دونوں میں بڑی سادگی و صفائی، ابلاغ و ترسیل، افہام و تفہیم اور اپنی بات کو ذہن نشیں بلکہ دل نشیں بنادینے کی خداداد صلاحیت تھی، تقریر آیات و احادیث کی روشنی میں آسان اور عام فہم اسلوب میں کرتے، اور اسی طرح تحریر میں بھی نپے تلے جملے ہوتے اور وہ حشو زائد، لفاظی و عبارت آرائی سے بالکل خالی ہوتی تھی، اس کے پیچھے ان کا اخلاص اور فکر مندی، اور امت کی خیر خواہی اور اس کے لئے دردمندی کے جذبات کار فرما ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ان کی بات پہنچ جائے اور وہ کتاب و سنت کی تعلیمات، عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ سے واقف ہو کر اپنی زندگی میں اسلام کی مطلوب تبدیلی لے آئیں اور صحیح معنوں میں مسلمان بنیں۔

ماضی قریب کے علماء میں حضرت تھانویؒ اور حضرت مولانا زکریاؒ کے بعد مولانا نعمانیؒ کی کتابیں اپنی قوت تاثیر و تسخیر، عام فہم و سادہ داعیانہ اسلوب، اور سہل و آسان طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہیں جسے دین کا کام کرنے والوں کو اپنا رہنما بنانا چاہئے۔

اخیر میں ان کی خاص ادا یعنی ان کے ذوق دعا کا ذکر بہت ضروری ہے، جو تمام ہی انبیاء و اولیاء اور صالحین کی سیرت کا بنیادی جوہر اور ان کی کامیابیوں کا سر اکبر ہے، ان کی ہر تقریر و تحریر مسنون دعاؤں، تضرع و ابتہال، عبدیت و انابت کے سوز و ساز سے مزین و مرصع ہوتی تھیں۔

انھیں دعا مانگنے کا سلیقہ آتا تھا، دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں عیدین کی نمازوں کے بعد جس خلوص و خیر خواہی کے ساتھ وہ خطاب کرتے اس کا خاص اثر محسوس ہوتا تھا، اخیر میں اجتماعی توبہ کی تلقین کرتے اور اس میں خود کو بھی شامل کر لیتے، پھر جس درد و سوز اور الحاح و زاری کے ساتھ دعا مانگتے اس سے وہ مجلس وعظ و دعاء، مجلس آہ و بکا بن جاتی، اور اکابر اولیاء اللہ کی مجلس وعظ و تذکیر کا منظر سامنے آجاتا تھا۔

ربِ کریم و رحیم سے ہماری دعا ہے کہ اپنے دین کے اس مخلص و ممتاز داعی اور مبلغ و منادی کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے ان کا بہترین اجر و جزاء عطا کرے، اور انھیں اعلیٰ علیین، فردوس بریں، اور جوار رحمت میں جگہ دے، اور ان کے پسماندگان کو صبر و سکون عطا کرنے کے ساتھ ملت اسلامیہ کو ان کا بدل و نعم البدل بھی عطا کرے۔ اللھم لاتفتنا بعده و لا تحرمنا اجره ، و آخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين ۔

ہماری مطبوعات

نام کتب	نام مصنف	قیمت
قرآن مجید پاکٹ سائز مع ترجمہ	مولانا عبد القادر جیلانی	50/-
ہندوستان میں ملی مسائل	عمر حیات خاں غوری	55/-
فکری یلغار، اسکے منصوبے اور ہتھیار	ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق	35/-
عہد نبوی کا نظام حکومت	سید سلیمان ندوی / مولانا مودودی	20/-
قرآنی شخصیات	مولانا عبد الماجد دریابادی	35/-
غلامی کا مسئلہ	مائل خیر آبادی	10/-
اسلامی ریاست میں عورت کے حقوق	مائل خیر آبادی	7/-
قرآن میں عورت کی حیثیت	مائل خیر آبادی	40/-
دلہن نعامی	مائل خیر آبادی	25/-
تفسیر فی ظلال القرآن (اردو)	سید قطب ترجمہ سید حامد علی	200/-
جلد اول (سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرہ)		
,, ,,	(سورہ آل عمران) جلد دوم	140/-
,, ,,	(سورہ النساء) جلد سوم	160/-
,, ,,	(سورہ المائدہ) جلد چہارم	135/-
تفسیر فی ظلال القرآن (پارہ عم)		140/-
عہد نبوی کا نظام حکومت	مولانا سید علی مودودی	15/-
احوال المسلمون کا تربیتی نظام	یوسف القرضاوی	25/-
اسلامی زندگی کتاب وسنت کی روشنی میں	محمد علی الہاشمی	50/-
فولاد ہے مومن	عبید اللہ فہد فلاحی	60/-
زنداں کے شب و روز	زینب الغزالی	60/-
ہم دعوت کا کام کیسے کریں	عبد البدیع صقر	20/-
اسلامی نظام ہمیں کیا دیگا	محمد شریف قریشی	5/-
بائبل، قرآن اور سائنس	مریس بوکائے	65/-
جہاد اسلامی	خلیل احمد حامدی	35/-
تحریک اور دعوت	بہی الخولی	زیر طبع
وادی نیل کا قافلہ سخت جاں	محمد حامد ابو النصر	45/-
اسلام میں اخلاق کے اصول و آداب	ڈاکٹر طٰہٰ جابر فیاض	20/-
اسلامی تہذیب کی تفہیم جدید	محمد علی صناوی	15/-
رسول اکرم کی حکومت انقلاب	مولانا سید اسعد گیلانی	100/-
	مجلد	125/-
سیرت النبی	مصطفیٰ سباعی	35/-
نور محمدی	مائل خیر آبادی	12/-
تاریخ دعوت و جہاد	عبید اللہ فہد فلاحی	70/-
اللہ کے سپاہی	نسیم حجازی	120/-
سائنس میں سے نقطہ نظر کی ضرورت	محمد زکی کرمانی	5/-
تحریک اسلامی، فکری اور عملی محرکات	ڈاکٹر منظور عالم	5/-
اسلام کا آسان کورس	ایم ایس اے	25/-
نقش راہ (تاریخ ایس آئی ایم)	عبد العزیز سلفی فلاحی	15/-
تحریک اسلامی مشکلات، مسائل، آزمائش	فتحی یکن	40/-
دعوت اسلامی پندرہویں صدی میں	شیخ محمد غزالی	20/-
سوشلزم یا اسلام	ڈاکٹر خورشید احمد	25/-

مولانا مقبول احمد سیوہاروی کی تین نایاب کتب

سفر نامہ ابن بطوطہ

صفحات 179 سائز 23×36 قیمت 35/-

عجائبات ہند (سیاحوں کی زبانی)

صفحات 88 سائز 23×36 قیمت 17/-

سات سو سال پہلے کا ہندوستان

صفحات 122 سائز 23×36 قیمت 22/-

ہماری درسیات

	قیمت
اقراء قاعدہ (آرٹ پیپر)	20/-
اقراء اردو پرائمر ۔ اول تا ہشتم	127/-
اقراء خوش خطی اول تا پنجم	40/-
اقراء کلرنگ بک اول تا پنجم	56/-

مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

(افسوس ہے کہ مولانائے محترم کا یہ مضمون جو البلاغ میں شائع ہوا ہے ہمیں آپ کی طرف سے
اس وقت ملا جب نمبر کی چھپائی شروع ہو رہی ہے محبوراً کچھ اختصار کرنا پڑ رہا ہے۔ مرتب)

جب سے شعور کی آنکھ کھلی ، اپنے والد ماجد حضرت مولا۔
بدولت گھر میں روز آنہ آنے والی ڈاک کا ایک پلنداڈا کئے سے وصول
شامل دیکھا۔ اس ڈاک میں خطوط کے علاوہ ماہانہ اور ہفتہ وار جرائد ورسا
میں ہوتے تھے۔ جب یہ جرائد ورسائل آتے تو انھیں الٹ پلٹ کر انکی کم از کم ورق گردانی کا شوق مجھے اس وقت سے تھا جب ان جرائد ورسائل کے مندرجات کا تقریباً اسی فیصد حصہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتا تھا۔ انہی رسائل میں ایک ماہنامہ "الفرقان" لکھنو بھی تھا، جس پر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کا اسم گرامی متواتر دیکھ دیکھ کر یہ نام دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اور بچپن میں یہ بات ذہن میں جم گئی تھی کہ بزرگ ایسے اہل قلم میں سے ہیں جن کی نگارشات اپنی فہم کی سطح سے بالاتر ہوتی ہیں۔

جب رفتہ رفتہ حرف شناسی میں اضافہ ہوا تو یہ نگارشات کچھ کچھ سمجھ میں بھی آنے لگیں، بالخصوص "الفرقان" میں "معارف الحدیث" کے مسلسل عنوان کے تحت احادیث نبوی ﷺ کی جو عام فہم تشریح حضرت مولاناؒ کے قلم سے شائع ہو رہی تھی، اسکا بیشتر حصہ فہم سے بالاتر نہ رہا، اور اس طرح مولاناؒ سے غائبانہ ایک انسیت پیدا ہونے لگی۔

پھر طالب علمی کے دوران علمائے دیوبند اور علمائے بریلی کے مسلکی اختلافات پر متعدد کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی۔ اکابر علمائے دیوبندؒ کی جن بعض تحریروں پر علمائے بریلی کی طرف سے سخت اعتراضات کئے گئے تھے۔ ان کے بارے میں حقیقت حال کی وضاحت بہت سے

حضرات نے کی، لیکن اس موضوع پر جس کتاب نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی کتاب "فیصلہ کن مناظرہ" تھی اس کتاب میں حضرت مولاناؒ نے جس مدلل، دلنشین اور مستحکم انداز میں ان تحریروں کی وضاحت فرمائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد کسی بھی انصاف پسند انسان کے دل میں ان اکابر کے عقائد کے بارے میں کوئی ادنی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ کتاب کا نام تو اگرچہ فیصلہ کن مناظرہ ہے۔ جس سے تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام قسم کی مناظرانہ کتاب ہوگی اور ہماری شامت اعمال سے مناظرے کے بارے میں یہ تاثر بن گیا ہے کہ یہ ایک فرقہ وارانہ اکھاڑے کا نام ہے جس میں دو منہ زور پہلوان ہر حق و ناحق حربے سے ایک دوسرے کو زیر کرنے کے داؤں استعمال کرتے ہیں اور اس داؤں پیچ میں حق طلبی کا جذبہ کچل کر رہ جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی کتاب اس قسم کی مناظرانہ فضا سے کوسوں دور ہے۔ بلکہ اسکو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیک نیتی والا مناظرہ کیا ہوتا ہے؟۔ اصل میں "مناظرہ" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "مل جل کر کسی مسئلے پر غور کرنا"۔ مولانا نے اس کتاب میں مناظرے کی اسی حقیقت کی عملی تفسیر پیش کی ہے ان کا انداز واسلوب عامیانہ مناظرہ کا اسلوب نہیں، خالص علمی، مثبت، معروضی اور مدلل انداز بیان ہے۔ جس کا مطمح نظر حق کی تفہیم ہے، نہ کہ مخالف کی تذلیل۔

پھر ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ پاکستان اور ہندوستان کے علماء نے مل کر غلام احمد پرویز صاحب کی کتابوں کا جائزہ لیا اور ایک متفقہ فتویٰ مرتب کیا جس میں کہا گیا تھا کہ پرویز صاحب اپنے بعض گمراہانہ عقائد وافکار کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ فتویٰ پرویز صاحب کی کتابوں کی چھان بین کے بعد مرتب کیا گیا تھا۔ اور اس پر تمام مسلم مکاتب فکر کے علماء کے دستخط تھے۔

اس موقع پر پرویز صاحب کے حلقے نے یہ کہہ کر آسمان سر پر اٹھالیا کہ علماء کرام کا تو مشغلہ ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کافر بناتے رہتے ہیں، اسلامی عقائد واصول سے ناواقف بہت سے دوسرے حضرات بھی اس پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اس فتوے کو اعتراضات کا نشانہ بنانے لگے۔ اس موقع پر فتویٰ کی تائید اور اس پروپیگنڈے کی تردید میں بھی متعدد مضامین ومقالات منظر عام پر آئے لیکن اس موضوع پر سب سے زیادہ مدلل، زوردار اور دل میں اتر جانے والی تحریر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی تھی جو "الفرقان" میں شائع ہوئی۔ اور اسے پاک وہند کے بہت سے علمی مجلات نے نقل کیا۔ مولاناؒ کے مستحکم انداز تحریر کا قائل تو میں پہلے بھی تھا، لیکن اس

تحریر سے اندازہ ہوا کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے قاری کو اپنے ساتھ بہالے جانے کی کس غیر معمولی صلاحیت سے مالامال فرمایا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس مضمون نے "تکفیر" کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کی دھند صاف کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

بعد میں مولاناؒ کی بہت سی تحریریں پڑھنے کا موقع ملتا رہا، اور ان سے غائبانہ عقیدت و محبت پیدا ہوتی گئی، لیکن پاک و ہند کے تباین دارین کی وجہ سے انکی زیارت و ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ بالآخر پہلی بار مکہ مکرمہ میں انکی زیارت ہوئی۔ اور اس کے نتیجے میں مراسلت کا سلسلہ بھی قائم ہوا۔ کوئی نئی کتاب آتی تو مولاناؒ شفقت فرما کر احقر کو ارسال فرماتے، اور مختلف مسائل پر خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ افسوس ہے کہ مولانا کے ابتدائی کچھ خطوط میرے پاس محفوظ نہ رہے لیکن بعد میں میں نے اکثر خطوط محفوظ بھی رکھے۔ اس

مرتبہ پاکستان تشریف لائے۔ اور دارالعلوم میں خطاب بھی فرمایا۔ اس
کی وفات ہو چکی تھی، اور انکے ذکر مبارک کیلئے البلاغ کا مفتی اعظم نمبر
احقر کی فرمائش پر اس کیلئے مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا، اور ہندوستان جا کر
نمبر کی زینت بنا۔

مولاناؒ نے اگرچہ "الفرقان" کی ادارت اپنے فاضل صاحبزادے جناب مولانا عتیق الرحمن صاحب سنبھلی کے سپرد کر دی تھی لیکن وقت کی تقریباً ہر اہم ضرورت پر انکی تحریریں الفرقان میں شائع ہوتی رہتی تھیں اسی دوران سعودی عرب میں علمائے دیوبند کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں نے وہاں یہ تاثر پھیلانا شروع کیا کہ علمائے دیوبند علمائے نجد کے سرخیل شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے بارے میں معاندانہ رائے رکھتے ہیں، اور انکے بارے میں توہین آمیز رویہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ مولانا نے اس تاثر کے ازالے کیلئے "الفرقان" میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور علمائے دیوبند کے درمیان وجوہ مماثلت شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی تھیں، اور شرک و بدعت کی تردید میں دونوں کے درمیان جو قدر مشترک تھی، اس پر زور دیا گیا۔ اگرچہ یہ مضمون بھی مولانا کی عام عادت کے مطابق مدلل اور مفید تھا، لیکن اس کی چند قسطیں پڑھنے کے بعد مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ تصویر کے صرف ایک رخ ہی پر ختم نہ ہو جائے۔ اور علمائے دیوبند کو شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے بعض نظریات سے جو واقعی اختلاف رہا ہے۔ اس کے تذکرے سے خالی نہ رہ جائے۔ چنانچہ میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اپنے اس طالب علمانہ اندیشے کا اظہار کرتے ہوئے یہ

درخواست کی کہ مضمون کا تاثر یہ ہر گز نہ ہونا چاہئے کہ علماء دیوبند اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کے نظریات میں کوئی اختلاف ہی نہ تھا۔ اس کے بجائے جس حد تک اور جتنا اختلاف تھا اس کا اظہار بھی ریکارڈ درست رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ جس کے بغیر یہ سلسلہ مضامین ادھورا بھی رہے گا، اور اس سے مزید غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔

میں نے لکھنے کو تو یہ خط لکھدیا تھا، لیکن بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ مولانا کے مقام بلند کے آگے میری حیثیت انکے ایک ادنیٰ شاگرد کی بھی نہیں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ جسارت کر کے میں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہو، لیکن میرے خط کے جواب میں مولانا کا جو گرامی نامہ آیا۔ اس میں انہوں نے اپنی بڑائی کی انتہا کر دی۔ میری گذارش پر کسی ناگواری کا اظہار تو کجا، میری اتنی ہمت افزائی فرمائی کہ میں پانی پانی ہو گیا۔

دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے موقع پر جب مجھے ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا تو میں دیوبند کے بعد لکھنو بھی گیا' اس سفر کا بڑا مقصد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مد ظلہم اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کی ملاقات تھی۔ مولانا علیہ الرحمہ اس وقت بہت کمزور ہو چکے تھے' لیکن احقر کو نہ صرف شرف ملاقات بخشا' بلکہ میرے استحقاق سے کہیں زیادہ شفقت اور اکرام کا معاملہ فرمایا۔

مولانا کی آخری ایام حیات کا ایک بڑا تالیفی کارنامہ مولانا کی کتاب "ایرانی انقلاب" ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے "الفرقان" میں ایک سلسلہ مضامین سپرد قلم کیا تھا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس موقع پر بھی حضرت مولانا نے احقر کو مندرجہ ذیل خط تحریر فرمایا۔

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۳ ذی الحجہ لکھنؤ ۱۴۰۴ھ

برادرم مکرم محترم جناب مولانا محمد تقی عثمانی صاحب زید مجد کم۔ سلام ورحمت

خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔

"البلاغ" غالباً پابندی سے روانہ ہوتا ہوگا' لیکن کبھی کبھی ہی پہونچتا ہے' خدا کرے "الفرقان" پابندی سے پہونچتا ہو۔ معلوم ہوا ہے کہ دفتر سے پابندی سے روانہ کیا جاتا ہے۔

ایران کے انقلاب اور خمینی سے متعلق "الفرقان" کے تین شماروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے خدا کرے نظر سے گذرا ہو (اس کی پہلی قسط تو ذیقعدہ کے بینات میں بھی شائع ہو گئی ہے)

عمر کے تقاضے سے مجھ پر ضعف کا بہت غلبہ ہو گیا ہے میں اس حال میں نہیں تھا کہ کوئی ایسی چیز لکھوں جس کیلئے محنت کرنی پڑے لیکن میں نے اس کو وقت کا اہم فریضہ اور بعض خاص وجوہات سے اپنے حق میں فرض عین سمجھا اور میں نے ایک مستقل کتاب لکھنا شروع کی۔ جس کا ابتدائی حصہ "الفرقان" کے تین شماروں میں شائع ہوا۔ وہ کتاب بفضلہٖ تعالیٰ تکمیل کے مرحلہ میں ہے، کتابت بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتی رہی، اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق دے اپنے بندوں کیلئے نافع بنائے اور قبول فرمائے۔ تقریباً تین سو صفحات ہونگے۔

اگر بآسانی ممکن ہوتا تو میں آپ کو مکلف کرتا کہ آپ پوری کتاب کو غور سے دیکھ کر اس پر مقدمہ لکھیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ آسان نہیں اور اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا اور میں جلد سے جلد کتاب کی اشاعت چاہتا ہوں کتاب تیار ہو جانے پر انشاء اللہ رجسٹرڈ ارسال خدمت ہو گی۔ آپ اس پر اس طرح تبصرہ کریں کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کو ...
شبہ ہے کہ بے ادبی نہ ہو لیکن عرض کرتا ہوں۔ ایرانی انقلاب
شیعیت کے بارے میں خود ہمارے حلقوں میں بھی جو حسن ظن
اسلامی سے متاثر ہونے والے نوجوانوں کا جو حال ہوا اسے دیکھ کر
سمجھنا آسان ہو گیا کہ قادیانیت کے فروغ کی اطلاعات سے استاذنا حضرت ...
چینی ہوئی ہو گی۔ ہم نے ان کا حال آنکھوں سے دیکھا ہے۔

میں نے اس کتاب کے ذریعہ ایک کام شروع کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ آپ جیسے حضرات (جن کے قویٰ بفضلہٖ تعالیٰ پوری طرح ساتھ دے رہے ہیں) اس مسئلہ کی طرف پوری توجہ فرمائیں اور اس کو اپنے قلم کا خاص موضوع بنائیں۔

برادر مکرم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون اور آپ سے اور ان سے دعا کی درخواست ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ (محمد منظور نعمانی)

شیعہ عقائد کے بارے میں علمائے اہل سنت کی طرف سے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن مولانا نے اس کتاب میں ایک نئے اسلوب سے ان مباحث پر گفتگو کی ہے، اور بہت سی ایسی معلومات فراہم کی ہیں، جو پردہ خفا میں تھیں، میں نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بھی حضرت مولانا کی خدمت میں ارسال کئے، خود میں نے اس سے جس طرح استفادہ کیا تھا، اس کا تذکرہ کیا، لیکن ساتھ ہی کچھ طالب علمانہ گذارشات مسئلہ تکفیر کے سلسلے میں پیش کیں۔ حضرت

مولانا نے یہ کتاب ضعف وعلالت کے دور میں لکھی تھی، اور اس کے بعد یہ کمزوری بڑھتی ہی چلی گئی، جسکی وجہ سے مراسلت کا سلسلہ بھی برقرار نہ رہ سکا۔ آنے جانے والوں سے مولانا کی مسلسل بیماری اور معذوری ہی کی اطلاعات ملتی رہیں، اور ایک طویل عرصہ ایسا گذرا کہ مولانا سے کوئی قابل ذکر رابطہ نہ رہ سکا، اور بالآخر وہ وقت آہی گیا جو ہر انسان پر آنا مقدر ہے۔ مولانا علمی ودینی خدمات کا بڑا سرمایہ ہمارے لئے چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی "سرگزشت حیات" خود انہی کے قلم سے لکھی ہوئی شائع ہو چکی ہے، جو مجھ جیسے ہر طالب علم کیلئے موعظت ونصیحت کے نہ جانے کتنے باب کھولتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مولاناؒ کو مقعد صدق میں اپنے مقامات قرب سے نوازے۔ ان کی زلات کی مکمل مغفرت فرمائے۔ اور انکے فیوض کو امت کیلئے جاری وساری رکھے۔ آمین۔

☆☆☆

سجّاد نعمانی

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں

[حسن ترتیب کا تقاضہ تھا کہ یہ مضمون اس حصۂ مضامین (گلہائے تازہ) کی صف اول میں جگہ پاتا۔ مگر محترم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کے مضمون کی طرح یہ بھی، باوجود اندرون خانہ سے ہونے کے، ایسے آخری وقت میں ملا کہ اس سے بہتر جگہ کے تمام امکانات مسدود تھے، نمبر کی ترتیب مکمل ہو چکی تھی ——— مرتب]

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے کئی پہلو
جاسکتا ہے۔ ان کا علمی رسوخ واحتیاط، ان کا تفقہ فی الدین، ان کی جر
ورقت قلب، ان کا حساس اور دردمند دل، ان کی مثالی استقامت، ان
(اِس زمانے میں) عدیم المثال تواضع وبے نفسی، حبّ مال وجاہ سے ان کے دل کی سلامتی، ان کا اخلاص وللہیت، ان کی عالی ہمتی وبلند حوصلگی، آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنے کی ان کی مستقل عادت، غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ ان کا شفقت بھرا برتاؤ، اپنی غلطیوں کے اعتراف ورجوع اور اپنی کمزوریوں کی تشخیص واستحضار کے سلسلے میں انکا مثالی طرز عمل، ان کا ذوق عبدیت وانابت، ان کا جذبۂ اتباع سنت، ان کا حکیمانہ طرز استدلال اور سلیس طرز بیان، آسان اور سادہ لفظوں میں عمیق اور مشکل مضامین کو بیان کر دینے پر ان کی خداداد قدرت، حرمین شریفین حاضری کے موقع پر ان کے احوال وکیفیات، وسعت قلبی، حقیقت پسندی، ہر قسم کی عصبیت سے دل ودماغ کی سلامتی اور مقاصد شریعت کے فہم کے سلسلہ میں مزاج ولی اللّٰہی سے ان کی گہری مناسبت، دین کی حفاظت واشاعت کے سلسلہ میں ان کی مجددانہ حسّاسیت وحمیّت اور پھر اس سب کے ساتھ اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کے سلسلے میں ان کا وہ عجیب وغریب حال جس کی منظر کشی شاید کوئی بھی نہ کر سکے، یہ اور اس طرح کے نہ جانے کتنے پہلو ہیں جن کا تذکرہ ہم جیسے طالب علموں کے لئے بہت مفید ہوگا۔ اور امید ہے کہ الفرقان کی اس خصوصی اشاعت میں جو اسی

فائدے کی امید میں مرتب کی جارہی ہے، بہت سے اہل علم و فضل کی زبانی آپ اس بندۂ خدا کی شخصیت کے اِن پہلوؤں کا تذکرہ پڑھیں گے اور آئندہ بھی پڑھتے رہیں گے۔

اس ننگ خاندان کو عرصے تک تو اس کی ہمت ہی نہ پڑی کہ وہ بھی اس عظیم شخصیت کا تذکرہ و تعارف کرانے والوں کی صف میں شامل ہو مگر جب اپنے بڑوں کے پیہم اصرار کے ساتھ سامنے سپر ڈالنی ہی پڑ گئی اور اس غریب نے بنام خدا کچھ لکھنے کا ارادہ کر ہی لیا تو اس کی نگاہ انتخاب حضرت بانیٔ الفرقان کی شخصیت کے صرف اُس پہلو پر ٹک گئی جس کی طرف، مضمون کے عنوان میں علامہ اقبال کے ایک مشہور شعر کے ایک مصرع کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے۔ ع "وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان"۔ اب آیئے دیکھیں کہ حضرت مجدد الف ثانی کی شان میں کہا گیا یہ مصرع اُن کے ایک عقیدتمند اور خوشہ چیں کے تذکرہ میں مستعار لینا کیوں روا سمجھا گیا ہے؟؟؟

پس منظر

سنبھل ضلع مراد آباد کے ایک معزز دیندار گھرانے کے اک ۱۶ سالہ نوجوان کو مشیت الٰہی تعلیم کے بہانے وہاں سے نکال کر پہلے مشرقی یوپی کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبے مئو لائی ـــــ مئو میں اسے رسمی تعلیم جو ملی وہ تو ملی ہی، اک اضافی -اور بہت ہی اہم- دولت اسے وہ ملی جسے آپ "ملی احساس" یا "انقلابی عزائم" کا نام دے سکتے ہیں۔ مئو کے بعد مشیت الٰہی اُسے عقابوں کے سب سے بڑے نشیمن دارالعلوم دیوبند لے گئی، جہاں اسے علم میں رسوخ اور دین میں صلابت کے ساتھ ساتھ اِن عزائم میں پختگی کی دولت بھی بخشی گئی۔

آگے بڑھنے سے پہلے صاحب تذکرہ ہی کی زبانی پہلے یہ آپ بیتی سن لیجئے:

"یورپ کی پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء پر ختم ہوئی تھی، یاد ہے کہ اس کے خاتمے تک ملک کی فضا ایسی تھی کہ عام آدمی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہاں انگریزوں کی حکومت نہیں رہے گی یا اس کے خلاف کوئی تحریک ہی اٹھ سکے گی ---- پھر اس جنگ ہی کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا ہوئے جو ہندستان میں "تحریک خلافت" برپا ہونے کا سبب بنے جس نے چند ہی مہینوں میں ہندستان میں اور خاص کر ہندستانی مسلمانوں میں وہ انقلاب برپا کر دیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا

جو دو تین سال تحریک خلافت کے خاص عروج و شباب کے تھے (قریباً ۲۳-۲۲-۱۹۲۱ء) اُس زمانہ میں میرا قیام ایک طالب علم کی حیثیت سے ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو میں تھا یوں تو ملک کے سب ہی حصوں میں تحریک خلافت کا رور شور تھا لیکن مئو کا جو حال تھا وہ شاید ہی ہندستان کے کسی دوسرے بڑے یا چھوٹے شہر کا رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ چونکہ تحریک کے پروگرام میں سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا اس لئے خلافت کمیٹی نے اپنی

عدالتیں بھی قائم کی تھیں۔ یاد آتا ہے کہ مئو کے معمر بزرگ شاہی جامع مسجد کے امام مولانا بشیر اللہ صاحب اور دار العلوم دیوبند کے فاضل مولانا محمد ضمیر صاحب اور مولانا عبد اللہ شائق مرحوم (جو ایک بہت تیز اور ذی استعداد اہل حدیث عالم تھے) اس عدالت کے قاضی (جج) تھے۔ ہر قسم کے مقدمات اور نزاعات مسلمانوں کے بھی اور غیر مسلموں کے بھی اسی عدالت میں آتے تھے اور ان کے فیصلے کیے جاتے تھے اور فریقین بلاچون وچرا ان فیصلوں کو مانتے تھے۔ مسلمانوں میں بعض آوارہ مزاج لوگ تاڑی پیتے تھے، خلافت کے رضاکار جو پولیس والی خدمات بھی انجام دیتے تھے اُن کو پکڑ لاتے اور عدالت کے حکم سے ان کے کوڑے لگائے جاتے اور کوئی سرکشی اور سرتابی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ مئو میں سرکاری تھانہ اور اس طرح کے دوسرے سرکاری ادارے اور محکمے موجود تھے لیکن اس عرصہ میں ان لوگوں کے لئے گویا کوئی کام نہیں تھا۔ جرائم اور لڑائی جھگڑے بڑی حد تک ختم ہوگئے تھے، کم از کم مئو کا تو یہی حال تھا کہ وہ حقیقی معنی میں دار الامن بلکہ ایک طرح کا "دار الاسلام" بن گیا تھا

اس تحریک خلافت نے بعض غیر معمولی اثرات چھوڑے، ان میں سے ایک یہ کہ عوام تک کے قلوب میں انگریزی حکومت کی مخالفت بلکہ دشمنی رچ بس گئی، اس کا خوف دلوں سے بالکل نکل گیا اور ہم جیسے لوگ بھی اپنی حکومت اور کم از کم اس فضا کا خواب دیکھنے لگے جو تحریک خلافت میں قائم ہوگئی تھی، اور راقم سطور نے مئو میں دیکھی تھی۔

اس کے بعد تعلیم کے آخری دور میں دو سال میرا قیام دار العلوم دیوبند

پیدا کئے تھے، یہاں کی فضا نے ان کی آبیاری کی اور ان کو مشتعل اور مستحکم کیا۔"

(ماخوذ از "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت، اور اب میر

---

(۲)

مگر دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جب حضرت والد ماجدؒ اپنے وطن سنبھل پہونچے تو وہاں کا ماحول کچھ اور ہی تھا، بریلی کے تکفیری فتنے نے انتشار وافتراق کی آگ بھڑکا رکھی تھی، بچہ بچہ اکابر اہل علم کو کافر کہہ رہا تھا ——— آج کل عام طور پر لوگ اس تکفیری فتنے سے واقف نہیں ہیں رضا خانیت کو صرف چند بدعات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کچھ تاریخ بھی حضرت والد ماجدؒ ہی کی زبانی یہاں سنا دی جائے

" خان صاحب (یعنی مولوی احمد رضا خاں صاحب) نے پہلے تو عرصہ تک حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کو اپنی بدگوئی اور کفر باری کا نشانہ بنایا اور اپنے رسالوں اور فتووں میں ایسے ایسے گندے اور خبیث عقیدے ان کی طرف منسوب کیے جن کی نقل سے بھی ایمانی روح لرزتی ہے اسکے بعد انہوں نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ اکابر جماعت کو اپنی مشق ستم کے لئے انتخاب کیا سب سے پہلے ۱۳۲۰ھ میں اپنی کتاب "المعتمد المستند" میں ان حضرات کو انکار ختم نبوت اور تکذیب رب العزت اور رسول اللہ ﷺ کی تنقیص واہانت کا مجرم قرار دے کر ان کی قطعی تکفیر کی، لیکن ان کی فتوے بازی اور کافر سازی چونکہ نہایت بدنام اور رسوا ہو چکی تھی اسلئے اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، یہاں تک کہ جن بزرگوں کی تکفیر کی گئی تھی انھوں نے بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔

مولوی احمد رضا خاں صاحب نے اپنے فتوے کا یہ حشر دیکھ کر ایک نیا منصوبہ بنایا۔ ۱۳۲۴ھ میں ان بزرگوں کی تکفیر کا ایک فتوی انہوں نے مرتب کیا جس میں ان کی قطعی تکفیر کی ایسی قطعی تکفیر کہ جو شخص ان کو مسلمان مانے یا ان کے کافر ہونے

میں بھی شک کرے اس کے بارے میں بھی کہا کہ وہ بھی قطعی کافر دائرۂ اسلام سے خارج اور جہنمی ہے تکفیر کی اس سراسر جعلی اور نصریانہ دستاویز کو لے کر مولوی احمد رضا خاں صاحب اسی سال حجاز گئے اور مکۂ معظمہ اور مدینۂ طیبہ کے حضرات علماء ومفتیان کے پاس پہونچ کر نہایت ہی عیارانہ اور پر فریب انداز میں ان حضرات سے فریاد کی کہ ہندوستان میں اسلام پر بڑا سخت وقت آگیا ہے، مسلمانوں ہی میں بعض لوگ ایسے ایسے کافرانہ عقائد رکھنے والے پیدا ہوگئے ہیں اور عام مسلمانوں پر بھی ان کا اثر پڑرہا ہے، ہم غرباء اس فتنہ کی روک تھام کررہے ہیں مگر اس مہم میں ہم کو آپ کی اس مدد کی ضرورت ہے کہ ان بد عقیدہ لوگوں کی تکفیر کے اس فتوے کی آپ حضرات بھی تصدیق فرمادیں، چونکہ آپ اللہ کے مقدس گھر اور رسول اللہ ﷺ کے پاک شہر کے رہنے والے ہیں اس لئے دینی رہنمائی کے بارے میں ہندوستان کے عام مسلمانوں کو آپ ہی حضرات پر پورا اعتماد ہے اور اس کی وجہ سے اس فتوے پر آپ ہی کی تصدیقی مہریں ہندوستان کے عام مسلمانوں کو کفر و بد دینی کے اس سیلاب میں بہنے سے روک سکتی ہیں ورنہ فتنہ ایسا شدید ہے کہ ان کا ایمان پر قائم رہنا مشکل ہے۔ المدد المدد اے خدا کے شیر واالغیاث الغیاث اے لشکر محمدی کے شہسوار و"(۱)

الغرض مولوی احمد رضا خاں صاحب نے ان علماء حرمین کے سامنے جو اصل واقعات سے بالکل بے خبر تھے اور اردو زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ان اکابر جماعت دیوبند کی وہ کتابیں بھی نہیں پڑھ سکتے تھے جن کی طرف خاں صاحب نے کفریہ مضامین منسوب کئے تھے اپنا یہ جعلی فتویٰ پیش کیا (تو) بہت سے نیک دل علماء نے پورے دینی جوش کے ساتھ اس تکفیری فتوے پر تصدیقیں لکھ دیں

قصہ مختصر یہ جعلی فتویٰ ہندوستان لاکر ایک شور وہنگامہ برپا کردیا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے متعلق مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے علماء ومفتیین نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے کہ (معاذاللہ) یہ سب قطعی کافر اور مرتد ہیں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاں صاحب کی اس چال نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک طوفانی فتنہ کھڑا کردیا اور شاید ہزاروں یا لاکھوں سادہ دل بندے جو مولوی احمد رضا خاں صاحب کی فتوے بازی سے بالکل متاثر نہ تھے علماء حرمین کے نام سے اس فتنے میں مبتلا ہوگئے۔"

اسکے بعد علمائے دیوبند کی طرف سے صحیح صورت حال کی وضاحت کے لئے جو سنجیدہ علمی تحریریں لکھی گئیں ان کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد حضرت والد ماجدؒ نے لکھا ہے کہ

"ان رسالوں نے معاملہ کو صاف کردیا اور گویا بحث (ادھر سے) ختم کردی گئی، لیکن مولوی احمد رضا خاں صاحب کی طرف سے تکفیر و تفریق کی مہم اسی طرح جاری رہی، مگر ان جوابات کے بعد اس میں کوئی جان نہیں رہی، اور بازار سرد پڑ گیا۔

پھر ۱۳۴۵ھ (۲۶-۱۹۲۷ء) میں یعنی حسام الحرمین کی پہلی اشاعت سے قریباً دو برس بعد مولوی احمد رضا خاں صاحب کے اخلاف نے اس فتنہ کو پھر ایک دفعہ زور شور سے اٹھایا۔ اور پھر فتوی بازی، چیلنج بازی اور اشتہار بازی کے ذریعہ اپنے بازار میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی اور رنج و افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ بیچارے عام مسلمانوں کو پھر دیکھا گیا کہ

---

(۱) مولوی احمد رضا خاں صاحب نے جو فتویٰ علماء دین کے سامنے پیش کیا تھا جو بعد کو "حسام الحرمین" کے نام سے چھپ کر شائع ہوا، یہ اس کی تمہید کا حاصل اور خلاصہ ہے۔

مذہب سے ناواقفیت اور سادہ لوحی کی وجہ سے پھر ان فتنہ پرداروں کا شکار ہو رہے ہیں اور ایسے ایسے جاہل جن کو کلمہ بھی نہیں آتا ان فتنہ پرداروں کی باتوں سے متاثر ہو کر اور کارِ ثواب سمجھ کر اکابر علماء اور بزرگانِ دین کو کافر کہتے پھر رہے ہیں اور گالیوں سے اپنی زبانیں ناپاک کر رہے ہیں۔ گھر گھر خانہ جنگیاں ہیں اور مسجدیں اور عبادت گاہیں تک میدانِ جنگ سی ہوئی ہیں۔"

یہ تھا ماحول اس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں کا۔ خود سنبھل کا حال دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد واپس جاکر حضرت والد ماجدؒ نے یہ پایا تھا کہ "میرے وطن اور قرب وجوار میں اس وقت اس فتنے کے شعلے خوب بھڑک رہے تھے"۔ (ایضاً)

اب ایک طرف وہ بلند تمنائیں تھیں جو تحریک خلافت کے زمانے میں حضرت والد ماجد کے دل میں پیدا ہوئیں اور جنھیں دارالعلوم کی فضا سے مزید تقویت ملی۔ اور دوسری طرف یہ زمینی حقیقت تھی کہ اپنے وطن میں اور قرب وجوار کے علاقوں میں مسلمانوں کا داخلی انتشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ گھر گھر، مسجد مسجد خانہ جنگی کا ماحول تھا۔

بالکل فطری بات تھی کہ ان کی توجہ پہلے اپنے گھر کو ٹھیا
لگی ہوئی اس آگ کو بجھانے کی طرف جاتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہو

"اس آگ کے بجھانے اور اسکے لگانے والوں کے آخری حد تک مقابلہ او
سال تک اپنے دوسرے کاموں درس وتصنیف وغیرہ کے ساتھ یہ شغل بھی سرگرمی سے

دس سالہ دور پر محیط اس محاذ پر ان کی جدوجہد کی پوری تاریخ اور اسکے اثرات لے جائزہ کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی آج کل تو شاید اُس کام کی واقعی اہمیت وضرورت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے راقم الحروف کا احساس کہ اگر بریلی کی وہ تکفیری مہم کسی مزاحمت کے بغیر اسی طرح چلتی رہتی تو آج شاید کوئی قابل اعتبار گروہ یہاں مسلمانوں کی رہنمائی کرنے والا اور مختلف اصلاحی، تعلیمی، دعوتی اور ملی کام کرنے والا باقی ہی نہ رہتا یہ کام جو اللہ نے حضرت والد ماجدؒ سے ان کی عملی زندگی کے ابتدائی دور میں لیا، کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بعد کے بہت سے تبلیغی، اصلاحی، دعوتی اور ملی کاموں کے لئے راہ ہموار ہوئی فللہ الحمد وله الشکر۔

مگر ایسا بھی نہیں ہوا کہ ان کا دل ودماغ اس طرح اس فتنے کے مقابلے میں مشغول ومنہمک ہو جاتا کہ انہیں ہند میں اسلام پر ہونے والے دوسرے حملوں کی خبر ہی نہ ہوتی۔۔۔ چنانچہ ٹھیک اسی انہماک کے دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بیرونی حملوں کے مقابلے سے بھی غافل نہ ہوئے۔ سب سے سخت حملہ آریہ سماج کی طرف سے ہو رہا تھا۔ آیئے دیکھیں کہ انہوں نے اس محاذ پر کیا خدمت سر انجام دی؟

آریہ سماج کا مقابلہ

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی جب شروع ہوئی تھی تب تو تحریک خلافت کی وجہ سے ہندستان کا ماحول جیسا بن گیا تھا اس کا نقشہ کھیچتے ہوئے حضرت والد ماجدؒ نے لکھا تھا

"ہندو اور مسلمان دونوں پورے اشتراک بلکہ اتحاد کے ساتھ تحریک (تحریک خلافت) چلارہے تھے لیکن مسلمانوں کے جذباتی مزاج، بے پناہ جوش و خروش اور مسئلہ خلافت کی خاص مذہبی نوعیت نے تحریک پر اسلامی رنگ غالب کردیا تھا "اللہ اکبر" ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک نعرہ تھا، حد یہ تھی کہ بہت سے ہندو لیڈر جس طرح آزادی ہند کے موضوع پر تقریر کرتے تھے اسی طرح خلافت کے مسئلہ پر بھی بالکل مسلمانوں کے انداز میں بلکہ ایک حد تک مولویانہ انداز میں تقریریں کرتے تھے۔ ہمارے ضلع مراد آباد میں میرے وطن سنبھل سے مالکل قریب ایک چھوٹا سا قصبہ سرسی ہے، وہاں کے ماسٹر چندولال جنھوں نے تحریک ہی کی وجہ سے اسکول کی ملازمت سے استعفادیدیا تھا، بڑے اچھے مقرر تھے۔ ان کی تقریروں میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد "احرجوا الیهود والنصاری من جزیرة العرب" بالکل صحیح الفاظ میں اور صحیح اعراب کے ساتھ ان کی زبان سے بار بار سنا اچھی طرح یاد ہے۔" [ماخوذ از "مولانا مودودی کے ساتھ ص ۱۳-۱۴]

مگر اس تیسری دہائی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ملک کا ماحول بدل دیا گیا تھا، تحریک خلافت ختم ہو چکی تھی، انگریزی حکومت کے خلاف جدو جہد کا محاذ ٹھنڈا کر دیا گیا تھا، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہا تھا۔ آریہ سماج کی طرف سے اسلام پر حملے شروع کروا دیے گئے تھے، توفیق الٰہی نے حضرت والد ماجدؒ کو اس محاذ پر بھی دفاعی جنگ لڑنے کی ہمت و طاقت بخشی۔ الفرقان کے پہلے ہی شمارے میں "آریہ سماج کو ایک اصولی مباحثہ کی دعوت" کے زیر عنوان پورے آریہ سماج کو چھ بنیادی مسائل پر ایک فیصلہ کن اور نتیجہ خیز گفتگو و مباحثہ کی دعوت حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن چاند پوری کی زبانی دی گئی ہے۔

پھر چوتھے شمارے میں اس سلسلے کے دو مضامین ہیں ایک خود حضرت والد ماجدؒ کے قلم سے جس کا عنوان ہے، "اسلام پر آریہ سماج کی نئی یورش، سماجی دنیا کو ہمارا انعامی چیلنج"، اس مضمون میں مسلمانان ہند کے اک بہت بڑے طبقے کو ملت اسلامیہ سے الگ کر کے انہیں کفر وارتداد کی کھلی دعوت پر مشتمل آریہ سماج کیطرف سے شائع شدہ اک اشتہار کا جواب دیا گیا ہے، اس اشتہار میں حضرت والد ماجدؒ کے بقول۔

"مسلم پیشہ ور اقوام نور باف، نداف، موچی، منہیار، نائی، قصاب وغیرہ کو بڑے زور و شور کے ساتھ ویدک دھرم کی دعوت دی گئی ہے (یہ کہہ کر کہ) اسلام تم کو مساویانہ حقوق دینے کے لئے تیار نہیں مگر ویدک دھرم کامل مساوات کا حامل ہے، لہٰذا تم لوگ اسلام سے قطع تعلق کر کے ویدک دھرم میں آجاؤ

(مزید یہ کہ) اس اشتہار میں اصول مساوات کے متعلق وید کے کچھ منتر بھی لکھے گئے ہیں اور اس کے بالمقابل

مولوی احمد رضاخاں صاحب کے فتاوی رضویہ حصہ سوم، ملفوظات حصہ دوم، اور بہار شریعت (مصنفہ مولوی محمد امجد علی صاحب و مصدقہ مولوی احمد رضاخاں صاحب) سے کچھ عبارتیں (اسلام میں مساوات نہ ہونے کے دعوی کی دلیل کے طور پر) نقل کی ہیں۔"

اشتہار کا خلاصہ نقل کرنے کے بعد اور اس کی اصولی تردید کرنے کے بعد حضرت والد ماجدؒ نے جس لب و لہجے میں اس مسئلہ پر اپنے درد و کرب کا اظہار کیا تھا اس سے ہمارے زیر بحث مرحوم پر چونکہ روشنی پڑتی ہے اور ایک نمونہ بھی ان کے اس دور شباب کے طرز تحریر کا سامنے آجاتا ہے اس لئے اس مضمون کی چند سطریں ذیل میں نقل کی جارہی ہیں۔

"اللہ اللہ! ویدک دھرم اور مساوات کا دعوی اور وہ بھی اسلام کے مقابلے میں، وہ اسلام جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی	(اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے یعنی تم ... ہی ماں باپ کی اولاد ...)
ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم	(بیشک تم میں زیادہ ... جو زیادہ متقی، پرہیز گار ہو (خواہ وہ ...)

وہ اسلام جس کا عام اعلان یہ ہے

انما المومنون اخوۃ	سارے مسلمان آپس ...

خواہ سید ہوں یا شیخ، جولاہے ہوں یا موچی، نائی ہوں یا قصائی، کھال پکانیوالے ہوں یا کھٹیارے۔

وہ اسلام جس کا داعی صاف صاف دنیا کو بتلا گیا

لا فضل لعربی علی عجمی - ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقوی	عرب کے کسی باشندے کو عجم کے کسی باشندے پر اور عجم کے کسی شخص کو عرب کے کسی شخص پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں، فضیلت کا دار و مدار صرف تقوی پر ہے۔

وہ اسلام جس نے دنیا کو مساوات کا سبق پڑھایا، ذلیل کو عزیز بنایا، دنیا کے دھتکارے ہوؤں کو سینے سے لگایا، شاہ و گدا کو ایک صف میں کھڑا کیا، جس نے حبش کے سیاہ فام غلام (حضرت بلالؓ) کو حضرت فاروق اعظم کی زباں سے سیدنا (ہمارے سردار) کہلایا، اس اسلام کے مقابلے میں آج وہ دھرم جس نے اصول مساوات کا خون کیا، انسانوں کو چار ورنوں میں تقسیم کر کے غریب شودروں کو انسانی حقوق سے بھی محروم کیا، وہ دھرم اسلام ہی سے سیکھ کر مساوات کا دعوی کر رہا ہے۔

کس نیا موخت علم تیر از من   که مرا عاقبت نشانه نکرد

یہ بندۂ ناچیز پہلے تو اپنے پیشہ ور بھائیوں سے عرض کرتا ہے کہ تم سرور کونین ﷺ کے نام لیوا ہو، تم قرآن کو صحیفۂ خداوندی جانتے ہو جس کے ایک ہاتھ میں اس محبوب خدا سید الانبیاء کا دامن ہو، اور دوسرے ہاتھ میں قرآن پاک، وہ ہر گز ذلیل نہیں، جو اس کو ذلیل کہتا ہے وہ خود ذلیل ہے، عزت کا معیار صرف ایمان و تقوی ہے، دیکھو قرآن کی صاف تعلیم ہے

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون	عزت صرف اللہ کو ہے اور اس کے رسول کو اور ایمان والوں کو، لیکن منافق لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔

بہر حال میرے پیشہ ور بھائیو اتم ایمان اور مومن کا مرتبہ خود قرآں میں دیکھو، صاحب قرآن علیہ الصلاۃ والسلام کے ملفوظات طیبہ (احادیث پاک) میں دیکھو اور دشمناں دین کی چالوں میں نہ آؤ اور خوب سمجھ لو کہ جو شخص تمہارے ہاتھ سے مدنی آقا کا دامن چھڑانا چاہتا ہے جو تمہارے ہاتھ میں قرآں کے بجائے وید دینا چاہتا ہے وہ تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ الحذر را اے بھولے مومن الحذر را"

مضمون کا اختتام ایک چیلنج اور ایک اعلان پر کرتے ہوئے اس مرد حق نے لکھا تھا

"یہ بندہ آریہ سماج ودوانوں کو عموماً اور آریہ سماج امرتسر کے پردھان و منتری صاحبان کو خصوصاً کھلے لفظوں میں چیلنج کرتا ہے کہ اگر آپ حضرات اصول مساوات کے متعلق اسلام اور ویدک دھرم کی تعلیمات کا موازنہ کرنے کے لئے تیار ہوں اور اسی کو حق و باطل کا معیار قرار دیں تو بندہ اس کے لئے حاضر ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسلام حقیقی اور کامل مساوات کا حامی ہے اور ویدک دھرم اس کا سخت دشمن، میں انشاء اللہ عنقریب الفرقان میں اس موضوع پر ایک مستقل سلسلۂ مضامین شروع کروں گا جس میں پوری طرح ہر دو مذاہب کی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے گا، اگر کوئی سماجی دوست اس کا جواب لکھنے کے لئے تیار ہوں تو مجھ کو مطلع فرمائیں تاکہ دفتر سے الفرقان ان کے نام جاری ہو جائے اور وہ جس پرچہ میں اپنا جواب شائع فرمائیں وہ دفتر الفرقان میں بھجوائیں۔"

اسی شمارے (یعنی پہلی جلد کے چوتھے شمارے بابت ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ) میں حضرت والد ماجد نے اس موضوع پر دوسرا مضمون "ویدوں میں تہذیب سوز تحریف" کے زیر عنوان شائع کیا ہے، مضمون نگار کوئی "جناب آتمانند صاحب بانی ست دھرم" ہیں۔ جن کے تعارف میں حضرت والد ماجد نے لکھا ہے کہ وہ

"پہلے ویدک دھرم کے پابند تھے، لیکن ویدوں کے مطالعہ کے بعد ویدوں سے آپ کی عقیدت جاتی رہی۔ اب آپ اپنا اکثر وقت ویدک دھرم کے کھنڈن (رد) میں صرف کرتے ہیں۔ اپریل ۳۴ء میں لکھنؤ میں آریہ سماج سے میرا مناظرہ تھا وہاں آپ بھی تشریف رکھتے تھے۔ اور کچھ مختصر سی گفتگو ویدوں کے متعلق آپ نے بھی کی تھی جس سے اتنا اندازہ ہوا تھا کہ آپ سنسکرت کے بڑے فاضل ہیں اور آریہ سماجی مناظرین میں بھی آپ جیسے سنسکرت داں کم ہیں"۔

اس مضمون کے مطالعہ سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اسکی اشاعت کی وجہ حضرت والد ماجدؒ کا یہ احساس بھی تھا کہ دفاعی حکمت عملی ہی کا تقاضا بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ خود صرف دفاع کرتے رہنے کے بجائے دشمن کو ہی دفاع پر مجبور کر دیا جائے۔ مضمون کی تمہید کی ان سطروں میں اس جانب اشارہ بھی ملتا ہے۔

"یہ مضمون صرف اس غرض سے شائع کیا جاتا ہے کہ دیوپرکاش جی اور ان جیسی ذہنیت رکھنے والے دوسرے سماجی حضرات جو قرآن عزیز پر اس قسم کے ناپاک حملے کرتے رہتے ہیں اپنی روش پر غور کریں اور آئندہ سے شیشے کے گھروں میں بیٹھ کر دوسروں کے آہنی ایوانوں پر پتھر نہ پھینکیں "

پھر الفرقان کے پانچویں شمارے (جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ) میں حضرت والد ماجدؒ نے "اسلام اور ویدک دھرم کا موازنہ، حقیقی مساوات کس میں ہے" کے زیر عنوان اسی موضوع پر

ایک طویل علمی مضمون لکھا جس میں ویدک دھرم کے بدنام زمانہ ورن آشرم (طبقاتی نظام) کا ویدوں اور منو سمرتی وغیرہ کے حوالوں کے ساتھ تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات بیان کیں۔

اس کے بعد اگلے شمارے میں آریہ سماجیوں کے ایک اخبار (آریہ پتر) کی طرف سے حضرت والد ماجدؒ نے اپنے نام لکھے گئے ایک کھلے خط کے جواب میں جس میں انہیں بحث و مناظرہ کا چیلنج دیا گیا ہے چیلنج قبول کرتے ہوئے "مناظرہ منظور" کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا ہے۔

اس دور میں الفرقان کی فائلوں میں آریہ سماج سے حضرت والد ماجد کے دو مناظروں کی مفصل روئداد بھی محفوظ ہے۔ پہلی روئداد جلد (۱) کے شمارہ (۹، ۱۰، ۱۱) اور جلد (۲) کے شمارہ (۵) میں شائع ہوئی تھی۔ دوسرا مناظرہ بریلی میں آریہ سماج بریلی کے سالانہ جلسہ کے موقع پر انہی کی دعوت پر ہوا تھا، اس کی روئداد دوسری جلد کے شمارہ (۸، ۹) کے پہلے شمارے تک مسلسل شائع ہوئی ہے۔

الغرض اس دور میں آریہ سماجی یلغار کے مقابلے میں روئداد جان کر اندازہ ہوتا ہے کہ مشیت الٰہی نے ہند میں سرمایۂ ملت بھی اپنے اس سپاہی سے لے لیا۔ تمام تعریف اسی اللہ کے لئے ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا اعلان تبدیلی مذہب

ہندوستان کی مذہبی و سیاسی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ اسوقت رونما ہوا تھا جب ڈاکٹر امبیڈکر نے (غالباً) ۳۵ء میں برہمنی جبر و استبداد اور ہندو تہذیب کے ظالمانہ نسلی و طبقاتی امتیاز پر مبنی نظام سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے تبدیلی مذہب کا راستہ اختیار کرنے کا دھماکہ خیز اعلان کر دیا تھا۔ صاحب الفرقان کے حساس دل نے ڈاکٹر امبیڈکر کے اس اعلان کا بھی فوری طور پر نوٹس لیا، اور فوراً ہی ایک مختصر سا مضمون "عالمگیر مذھب" کے زیر عنوان لکھا -- اس کے بعد ربیع الثانی اور جمادی الاولی ۱۳۵۵ھ کے شماروں میں "تمام اقوام عالم پر پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ احسان ہے کہ آپ نے روحانیت کو جمہوری کر دیا" کے زیر عنوان ایک اور مضمون لکھا۔

اسلام میں مساوات کے موضوع پر اس زمانے میں "الفرقان" کے صفحات میں حضرت والد ماجدؒ اور بعض دوسرے حضرات کے جو مضامین شائع ہوئے تھے، ان سب کا تعلق اس فضا سے صاف محسوس ہوتا ہے جو اچھوتوں کی تحریک اور آریہ سماج کے حملوں کے ملے جلے اثرات سے ہندوستان میں بنی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں حضرت والد ماجدؒ کی فکر مندی اور ان کے

بعض قریبی لوگوں کی توقعات کا اندازہ اس دور میں ادارۂ الفرقان کے رفیق مولانا سید محب الحق صاحب حسینی محشر کے ایک شعر سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے الفرقان کو خطاب کر کے کہا تھا۔

میرے الفرقان! تو درسِ اخوت عام کر!
دیکھ اب وہ تیری جانب کفر مائل ہو گیا

ایک خاص ذکر کے لائق بات اس شعر کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اس پہلے مصرعہ میں اخوت کے لفظ کے نیچے بطور وضاحت لکھا ہوا ہے "مساوات"۔ اور "کفر مائل ہو گیا" کے نیچے لکھا ہوا ہے "اچھوت اقوام کے رجحانات"۔ اس سے شعر کا مفہوم اور اس کا پس منظر بالکل متعین ہو جاتا ہے۔

سطور بالا میں آگے بڑھنے سے پہلے ایک پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ جو جائزہ راقم سطور نے پیش کیا ہے وہ الفرقان کے صرف ابتدائی تین سالوں پر مبنی ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہ دور ہے جس میں، عام خیال کے مطابق جو بڑی حد تک صحیح بھی ہے، حضرت والد ماجدؒ کی زیادہ تر توجہ بریلی کی تکفیری فتنے اور دوسرے داخلی فتنوں کے مقابلے کی طرف تھی، امید ہے کہ اس جائزہ سے اتنی بات ضرور سامنے آگئی ہو گی کہ وہ اپنی عملی زندگی کے اس ابتدائی دور میں بھی خارجی حملوں اور فتنوں کے مقابلے سے غافل نہیں رہے۔ ایک ۲۸-۲۹ سالہ نوجوان سرمایۂ ملت کی نگہبانی کے سلسلے میں اتنے مختلف محاذوں پر جان کھپائے، بلاشبہ اس میں کم از کم ہم جیسوں کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

ہندوستان میں ایک نئے دور کا آغاز
اور
حضرت والد ماجدؒ پر اس کا اثر

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں باشندگانِ ہند کے اس مظلوم و محروم طبقے نے کچھ جرأتمندانہ قدم اٹھانے شروع کئے تھے جو صدیوں سے اعلیٰ ذات والوں کے ظلم سہ رہا تھا، کہ انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی وہ جدوجہد، جو تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد گویا ملتوی کر دی گئی تھی ۱۹۳۰ء میں پھر شروع کر دی گئی۔ (اس بار قیادت کانگریس کر رہی تھی اور

ساتھ دے رہی تھی "جمعیۃ العلماء،" جبکہ تحریک خلافت میں صورت حال اس کے برعکس تھی) اور جب ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر امبیڈکر نے صاف صاف تبدیلی مذہب کا اعلان کر دیا تو ۳۶ء میں برطانوی حکومت نے انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر جنرل الیکشن کا اعلان کر دیا۔ جس میں مسلمان نمائندوں کو مسلمان ہی ووٹ دے سکتا تھا اور ہندوؤں کو صرف ہندو(۱)۔

یہ الیکشن اور اسی کے نتیجہ میں ملک کے تمام صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہو گئیں اور دوسرے صوبوں میں کچھ دوسری مقامی پارٹیوں کی مخلوط حکومتیں بن گئیں اور تبھی سے یہ بات بالکل یقینی ہو گئی کہ برطانوی اقتدار سے ملک کے بالکل آزاد ہو جانے کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے اور یہ سوال سب سے زیادہ جواب طلب اور توجہ طلب بن گیا کہ آزاد ہندوستان کا تہذیبی اور سیاسی نقشہ کیا ہوگا؟ کیا وہی ہوگا جس کی امید میں علماء کرام کا ایک طبقہ تحریک آزادی میں شریک تھا؟ یعنی یہ کہ تحریک آزادی میں شرکت کے بعد مسلمان آزاد ہندوستان میں اپنے ملی مفاد اور قومی خصوصیات کے العین کے مطابق اپنے ملی نظام کی تشکیل کر سکیں گے۔

اس دور میں حضرت والد ماجدؒ کی ذہنی وابستگی جمعیۃ العلماء سے وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"خلافت تحریک ختم ہو چکی تھی، ان جذبات کو کسی درجہ میں غذا دینے والی مسلمانوں کی جماعت جمعیۃ العلماء ہند ہی میدان میں رہ گئی تھی، اور دارالعلوم میں تعلیم پائے ہوئے ہم جیسے لوگ اپنے اکابر کے تعلق سے اس کو اپنی جماعت سمجھتے اور اس سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے، راقم سطور کی بھی اسی سے وابستگی رہی میری یہ وابستگی ذہنی اور فکری لحاظ سے بہت عمیق اور راسخ تھی اور میں ملک کی آزادی کے سلسلے میں اس کی جدوجہد اور قربانیوں کو پورے یقین و اطمینان کے ساتھ "فی سبیل اللہ" ہی جانتا اور سمجھتا تھا " (مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت)

---

(۱) اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں عرصہ سے کھٹکنے والے کچھ سوالات کی طرف اہل نظر کی توجہ مبذول کراؤں، شاید کسی کی عنایت سے ان سوالوں کے تشفی بخش جوابات راقم الحروف کو مل جائیں۔ اور ملکی سیاست کا اصل محور عیاں ہو جائے۔

۱- پہلا سوال یہ ہے کہ تحریک خلافت کے خاتمے کے بعد آزادی کی جدوجہد کیوں ملتوی کر دی گئی تھی؟ پھر ۳۰ء میں کانگریس نے اسے جب دوبارہ شروع کیا تو کیا اس کا کوئی تعلق اچھوتوں کی تحریک سے تھا۔

۲- دوسرا سوال یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے ۳۵ء میں جو انڈیا ایکٹ بنایا، اور پھر اس کے تحت ۳۶ء میں جنرل الکشن کرا کے ہندوستانیوں کو حکومتی اختیارات منتقل کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا، کیا اس کا کوئی تعلق تبدیلی مذہب کے بارے میں ڈاکٹر امبیڈکر کے اعلان سے تھا؟ اور اس الیکشن اور اسکے نتیجوں کا کیا اثر اس تحریک تبدیلی مذہب پر پڑا؟

۳- تیسرا سوال یہ ہے کہ ۳۶ء کے جنرل الیکشن نے کیا ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت کی باقاعدہ تخم ریزی کا کام نہیں کیا تھا؟

مگر ۳۶ء کے جنرل الیکشن کے بعد جو صورت حال سامنے آئی اس نے حضرت والد ماجد کے حساس اور مضطرب دل کو بے چین کر دیا۔ کیونکہ یہ حقیقت اُن کے سامنے اب بالکل واضح ہو گئی تھی کہ (خود انہی کے لفظوں میں)

"انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت میں آزادی کی تحریک جس طرح چل رہی ہے اس کے نتیجے میں جو آزادی حاصل ہوگی اور جو جمہوری قومی حکومت قائم ہوگی وہ ہم مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق نہ ہوگی بلکہ خاص کر اقلیتی صوبوں میں ان کی تہذیب اور ان کے ملی تشخص کے لیے نئے نئے خطرات پیدا ہو جائیں گے۔" (ایضاً)

مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کی غیر اسلامی فکر و زندگی کی وجہ سے پہلے ہی سے حضرت والد ماجدؒ کو کوئی توقع نہیں تھی کہ اُن کی تحریک کے نتیجے میں ہندوستان میں یا اسکے کسی حصے میں دینی سربلندی اور احیاءِ ملت کی دیرینہ تمنا پوری ہو گی --- البتہ دارالعلوم اور جمعیۃ العلماء سے وابستہ علماء کرام کے اس حلقے سے انہیں چونکہ عقیدتمندانہ وابستگی تھی اور دین اور اسکے احیاء کے لئے ان کی فکرمندی و دردمندی سے، اور آزادی کی جدوجہد میں انکی شرکت کے اصل محرک "آزاد ہندوستان میں شرعی نظام کے قیام" سے وہ بخوبی واقف تھے، اسلئے انہیں ان حضرات سے اور ان کے طریقۂ کار سے اچھی امیدیں تھیں مگر ۳۶ء کے الیکشن کے بعد ملک کی نئی صورت حال نے انہیں ازسرنو حالات کے تجزیہ اور غور و فکر پر مجبور کر دیا---

وہ اس صورت حال کا کتنی بے چینی اور کتنی گہرائی سے مطالعہ کر رہے تھے اور غور و فکر اور تجزیہ کے ذریعہ ہندوستان میں اسلامی وجود کے مستقبل کے بارے میں کیسے شدید خطرے محسوس کرنے لگے تھے، اور ان کا حساس دل اس سلسلہ میں کس قدر مضطرب تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کی اس دور کی تحریروں کا مطالعہ ضروری ہوگا --- ہم سر دست صرف چند اقتباسات پیش کر کے ان کے دل کی کیفیت کی ایک جھلک اپنے ناظرین کو دکھلانا چاہتے ہیں۔

الفرقان کے ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۵۷ء کے شمارے میں انہوں نے "ہمارا نصب العین اور طریق کار" کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا جس میں پہلے تو الجمعیۃ کے اداریہ کا یہ اقتباس نقل کیا ہے

"آخر ہم موجودہ نظام حکومت میں تبدیلی کیوں چاہتے ہیں، ہم ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے کیوں دشمن ہیں؟ کیا اس لئے کہ "رام راج" قائم کریں؟ کیا اس لئے کہ اپنے حقوق کو نظرانداز کر دیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے--- ہم ہندوستان میں ایک نئی قومی جمہوریت کے لئے اس لئے جدوجہد کر رہے ہیں کہ ہم اپنے قومی و مذہبی حقوق سے پوری طرح متمتع ہوں گے۔ ہم ہر اس ضابطے اور قانون کو ختم کرنے کی جدوجہد کریں گے جو ہمارے حقوق پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ ہم اس مطالبے سے کسی طرح دستبردار نہیں ہو سکتے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی زندگی پر پوری طرح اسلامی شریعت حاوی ہوگی۔"

یہ اقتباس نقل کر کے اور اس شہادت کے بعد کہ واقعی "ان حضرات کے عزائم یہی ہیں

اور ان کے سامنے یہی نصب العین ہے" یہ سوال اٹھایا ہے کہ "اسمیں کامیابی کس طرح ہو سکتی ہے اور کس راہ سے ہم اس منزل مقصود تک پہونچ سکتے ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے کانگریس کے پروگرام کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"کانگریس کے سامنے صرف آزادی اور اجنبی تسلط سے ملک کی خلاصی کا سلبی پہلو ہی نہیں ہے بلکہ اسی کے ساتھ ملکی حکومت کی تشکیل و تعمیر کا ایجابی پہلو بھی ہے اور اسی لئے اس کے پیش نظر جو بنیادی اصول اور جو نقشہ ہے اور جس کے مطابق وہ مستقبل کی تعمیر میں اس وقت مصروف ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اس میں اور ہمارے نصب العین میں تضاد کی نسبت ہے۔" (لفظ تضاد پر غور فرمایا جائے -- سجاد)

متحدہ، قومیت اور وحدانی جمہوریت اور مسلمانوں کے ملی وجود پر ان دونوں کے اثرات کا جائزہ لینے کے بعد اس مضمون میں حضرت والد ماجدؒ نے لکھا تھا

"اس کا انجام یہ بھی ہوگا کہ آپ کی قوم یا نیشنلزم (گاندھی اور نہرو یا سدو والے متحدہ) سوشلزم کے سیلاب میں بہے گی اور دونوں ہی کا نتیجہ مسلمانوں کا ارتداد ہے"

اس مضمون کا یہ جملہ بھی نقل کرنے کے لائق ہے

"مجھے خیال ہے کہ میری یہ صاف گوئی میرے بہت سے دوستوں اور بزرگو[ں کو ناگوار ہوگی لیکن] حالات کی نزاکت کا احساس مجھے یہ سب کچھ صاف صاف عرض کر دینے پر مجبور کر رہا ہے۔ [کانگریس] کی غیر مشروط حمایت کرنے والوں میں میرے بعض ایسے مقدس بزرگ بھی ہیں جن کی جوتیوں کا تسمہ کھولنے کے بھی میں لائق نہیں، لیکن اس معاملہ میں مجھے اتنا یقین حاصل ہے کہ میں ہدہد سلیمان کی طرح ان کی جناب میں باادب عرض کرنے کی جرأت کروں کہ احطت بما لم تحط به جرأت"

ٹھیک اسی زمانے میں بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے مخصوص طاقتور اسلوب میں، نہایت ٹھوس دلیلوں کی روشنی میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار اپنے رسالے 'ترجمان القرآن' کے صفحات میں شروع کیا تھا۔

مولانا مودودی کے اس سلسلۂ مضامین کی وجہ سے حضرت والد ماجدؒ کو ان سے فکری وجذباتی ہم آہنگی کا احساس ہوا، اور پھر آگے چل کر دو مرتبہ انہوں نے اسکی کوشش کی کہ ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل کا جو نقشہ ان کے ذہن کے مطابق زیادہ صحیح تھا اور جسکی جھلک انہیں مولانا مودودی کے افکار اور تمناؤں میں بھی نظر آرہی تھی ان کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعہ وہ اسی نقشہ کے مطابق عملی جدوجہد کا بیڑا اٹھائیں، لیکن اُن اسباب کی بناء پر جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں اور جن کا تفصیلی تذکرہ وہ اپنی کتاب "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف" میں کر چکے ہیں، ایسا عملاً نہیں ہو سکا۔

ہندوستان میں اندلس کی طرح سرمایۂ ملت کے لٹ جانے کے خطروں کو شدید سے شدید تر ہوتا، اواپنی آرزوؤں کو خاک میں ملتا ہوادیکھ کر اس حسّاس بندۂ خدا کے دل پر کیا گذری ہوگی؟ ہم جیسے بے حس تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ایسے سخت صدمے اور اسکے نتیجہ میں اتنی شدید بیماری سے انھیں دوچار ہونا پڑا تھا کہ زندگی کے لالے پڑگئے تھے، بالآخر اللہ نے دستگیری کی اور عارف باللہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کی ہدایت پر ایک جذبۂ طالبانہ اور اپنا بے قرار دِل لے کر وہ حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں پہونچ گئے۔ اور یہاں پہونچ کر انہیں محسوس ہوا کہ "جااینجاست"۔

اور پھر حضرت مولانا الیاسؒ اور انکی دینی دعوت کے ساتھ انہیں جو تعلق خاطر ہوا، اور جس طرح اپنی مخصوص حسّاس، دردمند اور سراپا عمل طبیعت کے ساتھ وہ تبلیغی جدوجہد میں لگے، اس کی تاریخ ایک ضخیم کتاب چاہتی ہے، مجھے تو یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس کے پیچھے ان کا یہ احساس بھی کارفرما تھا کہ نئے ہندوستان میں عام مسلمانوں کو متحدہ قومیت اور اکثریتی کلچر کے رنگ میں رنگ جانے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر جزوی یا کلی ارتداد کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچانے کے لئے عام مسلمانوں سے رابطے، اور انہیں اسلام پر جمانے کے لئے عمومی جدوجہد کی یہ سب سے آسان اور مؤثر عملی شکل ہے۔ اسی زمانے میں دسمبر ۴۷ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی ایک مسلم کانفرنس کے موقع پر جمع ہونے والے رہنمایان قوم اور زعماء ملت کے نام اپنے ایک پیغام میں انہوں نے لکھا تھا

"اس تقسیم اور سوارہ کے بعد یہاں کی سیاست کے نقشے میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اور مستقبل میں ان سے بھی بڑی جن تبدیلیوں کے امکانات نظر آرہے ہیں، اگر آپ نے ان پر غور کیا ہوگا تو آپ کو ضرور اس کا اندازہ ہوگا کہ مستقبل کے جدید ہندوستان میں غالباً صرف وہی لوگ اسلام پر قائم رہ سکیں گے جو در حقیقت مسلمان ہوں گے یعنی جو اسلامی روح اور اسلامی زندگی کے حامل ہوں گے۔ اور اس کے علاوہ جو لوگ صرف نام کے مسلمان ہوں گے اور اسلام ان کی روح میں اور ان کے دل میں اترا ہوا نہ ہوگا وہ اپنی جگہ قائم نہ رہ سکیں گے۔ یا تو خدانخواستہ کھلم کھلا کوئی دوسری قومیت اختیار کرلیں گے جیسا کہ بعض مقامات پر ہوچکا ہے اور بعض علاقوں میں اب بھی تیزی سے ہو رہا ہے یا اگر کوئی لادینی تحریک کسی وقت اس ملک میں قوت پکڑ گئی تو وہ لادینی اور لامذہبی راہ اختیار کرلیں گے

ہماری قوم کے سیاسی اور معاشی مسائل کی جو واقعی اہمیت ہے ہم اس سے بھی ناواقف نہیں ہیں اور خصوصاً ملک کی تقسیم کے بعد یہ مسائل جتنے نازک اور قابل فکر ہوگئے ہیں اس کا بھی ہمیں خوب اندازہ ہے اور اس لئے ایمانداری سے ہماری یہ رائے ہے کہ ان مسائل کو صحیح طور سے حل کرنے کے لئے جن کوششوں اور تدبیروں کی ضرورت ہے ان میں بھی کوئی کمی اور کوتاہی کرنا گناہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہم بہت صفائی کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دین وایمان اور ان کی اخروی زندگی اور بقائے ملی کی نزاکت اور اہمیت کو محسوس نہ کرنا اور اسکے لئے اسوقت جس فکر و تدبیر کی ضرورت ہے اس سے غفلت برتنا

اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کی تدبیر اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قوم میں دینی روح اور اسلامی زندگی کو عام کرنے کی پوری جدوجہد کی جائے اور اصلاح امت اور احیاء دین کی اس دعوت کو ایک "عوامی تحریک" بنادیا جائے "

(آگے چل کر حضرت والد ماجدؒ نے اس مقصد کے لئے تبلیغی کام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا)

"عام مسلمانوں کی اس دینی واخلاقی اصلاح اور مذہبی بیداری کا نتیجہ صرف یہی نہ ہوگا کہ مستقبل کے جدید ہندوستان میں ان کے وجود مذہبی اور بقائے ملی اور ان کی مخصوص تہذیب کے لئے جو خطرہ محسوس کیا جارہا ہے قوم اس سے محفوظ ہو جائے گی۔ بلکہ اس وقت مردہ دلی اور خود فراموشی کی جو کیفیت قوم میں عام طور سے پیدا ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ وہ آپ سے آپ جاتی رہے گی اور اس کے بجائے اولوالعزمی اور خود اعتمادی کی دلی سوئی روح ابھر آئے گی "

(الفرقان صفر و ربیع الاول ۱۳۶۷ھ)

اس زمانے کی ان کی تقریروں اور تحریروں پر مشتمل جو مواد الفرقان [illegible]
محفوظ ہے وہ سب اس کا گواہ ہے کہ تبلیغی محنت کی شکل میں ان کے [illegible]
گیا تھا جس سے افراد کی ایمانی تربیت کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند [illegible]
بچایا جانا ممکن نظر آنے لگا تھا جس کے منصوبے انگریز اور برہمن دماغ [illegible]
پس کہا جاسکتا ہے کہ تبلیغی جدوجہد میں ان کی عملی شرکت بھی ہند [illegible]
مشتمل ان کی کتاب زندگی کا ایک باب تھا، نہایت اہم باب!!

اور غالباً یہی سبب تھا کہ تبلیغی کام کے بارے میں مکمل انشراح واطمینان کے باوجود اور اس میں پوری سرگرمی وانہماک کے ساتھ عملی مشغولیت کے باوجود) وہ ہندوستان کے افق پر بار بار منڈلانے والے متحدہ قومیت اور برہمنی کلچر کے خطروں کو محسوس کرنے اور ان کے مقابلے کی ہر ممکن تدبیر سے عین اس انہماک کے دور میں بھی غافل نہیں ہوئے بلاشبہ یہ سب اللہ کی خاص توفیق وعنایت کا ہی کرشمہ ہے! ورنہ ؎

"اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں"

تقسیم ہند کے بعد

تقسیم ہند کا فیصلہ اصولی طور پر ۴۶ء ہی میں ہو گیا تھا۔ اس کے فوراً بعد حضرت والد ماجدؒ نے لکھنؤ منتقلی کا فیصلہ کر لیا۔ سنبھل سے بریلی وہ منتقل ہوئے تھے بریلی کے تکفیری فتنے کے مقابلے کے لئے۔ اور بریلی سے لکھنؤ منتقلی کا ان کا فیصلہ ان طوفان خیز آندھیوں کے مقابلے کے لئے زیادہ یکسوئی کی نیت سے تھا جو ملک میں مشرکانہ احیائیت اور برہمنی فسطائیت کی چل رہی تھیں۔ اور خطرہ تھا کہ یہ آندھیاں آنے والے دنوں میں اس ملک میں مسلمانوں کی ایک خاصی

بڑی تعداد کو دین حق سے کہیں روگرداں نہ کردیں۔

انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے، وہ اپنے ذوق کو اکثر "حکم" بنا کر فیصلے صادر کرتا ہے۔ کسی کو بریلویت جیسے داخلی فتنوں کے مقابلے کے میدان سے زیادہ مناسبت ہے تو وہ حضرت والد ماجدؒ کی زندگی کے دور اول کو زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کسی کو ان کے دوسرے دور کی خدمات سے زیادہ مناسبت ہے تو وہ انکی عملی زندگی کے دور ثانی کو زیادہ تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے رہا وہ مرد حق تو وہ ہر طرح کی داد و تحسین سے بالکل بے نیاز، اپنے ذوق کو بار بار قربان کرکے اور اپنی عقل و فہم کی حد تک صرف اور صرف امت کی ضرورت کو اور رضاء الٰہی کو پیش نظر رکھ کر کام کرتا رہا۔ ترجیحات بدلتا رہا اور اس امید کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کی ان کاوشوں کو بنظر رضا و محبت دیکھ لے گا اور غلطیوں اور کوتاہیوں کو جو اسکی نگاہ میں بے حساب تھیں، معاف فرمادے گا۔

خیر! یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو زبان قلم پر آگیا، میں عرض تو یہ کر رہا تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانان ہند کو جینے کا سلیقہ سکھانے، ان کے حوصلوں اور ایمان کو قائم رکھنے اور ان مشکل حالات سے ایک مسلمان کی طرح نبرد آزما ہونے، اور شکست خوردہ نفسیات کا شکار ہونے سے بچانے کیلئے جو انتھک محنت، اپنی پوری شخصیت کو جھونک کر اللہ کے اس بندے نے کی ہے وہ ایک اور نمونہ ہے احساس ذمہ داری کا اور محنت و جانفشانی کا۔ ایک طرف الفرقان کے ہر شمارے میں وہ اپنے دل کا درد نکال کر رکھتے تھے اور دوسری طرف ملک کے طول و عرض میں جا جا کر عام مسلمانوں کے قدم جمانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان کے اس دور کے مضامین اور تقریریں سب اسی محور کے اردگرد ہوا کرتی تھیں۔ شاید ہی کوئی واقعہ ایسا ہوتا ہو جس کا اثر مسلمانان ہند پر پڑنے والا ہو اور الفرقان اسکا نوٹس نہ لیتا ہو۔ اور اس بارے میں صحیح رہنمائی فراہم کرنے کی کوشش نہ کرتا ہو۔ مثال کے طور پر جب گاندھی جی اسی ہندو فسطائیت کے ہاتھوں ہلاک کئے گئے تو الفرقان نے اس پر اظہار غم بھی کیا اور گاندھی جی کی بھلائیوں کا اعتراف بھی کیا۔ اور ساتھ ہی ان مسلمانوں کو بڑی صراحت کے ساتھ ٹوکا بھی جو گاندھی جی سے اظہار عقیدت کے سلسلے میں غلو اور بے اعتدالی سے کام لے رہے تھے۔ اسی طرح دسمبر ۱۹۴۹ء میں بابری مسجد میں مورتیاں رکھی گئیں تو اس پر حضرت والد ماجدؒ نے اپریل ۵۰ء کے شمارے میں ایک اداریہ لکھا جس میں بعض باخبر کانگریسی لیڈروں کے حوالے سے یہ بات ریکارڈ میں آگئی کہ یہ ایک اتفاقی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس ملک میں ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دے کر اپنی روٹیاں سینکنے

سے دلچسپی رکھنے والے سیاسی عناصر نے یہ قدم دراصل اسلیئے اٹھایا تھا کہ "وہ قتل وغارت کے اس طوفان کو جو ۱۵/ اگست ۴۷ء کے بعد ملک میں اٹھا تھا اور گاندھی جی نے اپنی جان کی قربانی دیکر جس کو اس وقت روک دیا تھا اب پھر نئے سرے سے اٹھانا چاہتے ہیں بابری مسجد کا قضیہ دراصل اس سلسلے کا پہلا قدم ہے اور اس کے بعد وہ مسلسل اسی طرح کے بہت سے قدم اٹھائیں گے"

ان وقتی مسائل کے علاوہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے کروروں مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا، ان میں اللہ پر یقین واعتماد اور خود اعتمادی پیدا کر کے انھیں نئے سرے سے ایک با مقصد اجتماعی زندگی گذارنے پر آمادہ کرنا یہی عرصہ تک اس بندۂ خدا کی شب وروز کی دھن رہی۔ میرے سامنے اس سلسلے کی ان کی بے شمار تحریریں ہیں۔ حیران ہوں کہ کس کو یہاں نقل کروں کہ
بالآخر ایک مضمون کا انتخاب کر کے اس کی تلخیص پیش
اکتوبر ۱۹۴۹ء کے شماروں میں انھوں نے "ہندوستانی مسلمانوں کا
لکھا تھا

"سلطنت معلیہ کا چراغ گل ہونے کے بعد اس ملک میں جس وقت انگریزی حکومت قائم [illegible] سی خرابیوں کے باوجود یہاں کی مسلمان سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں چند ایسی صفات موجود تھیں جو انگریزی اثرات سے ان کے دین اور ان کی تہذیب کی دیر تک حفاظت کر سکتی تھیں۔ (مثلاً) عقائد کی مبادیں محفوظ تھیں۔ دلوں میں دین کی عظمت تھی۔ اپنے دین اور اپنی تہذیب کی برتری کا یقین تھا۔ دینی غیرت وحمیت تھی، خانقاہوں میں خاصان خدا تھے۔ علماء کا علم زیادہ تر راسخ تھا اور ان میں دینی پختگی اور کردار کی مضبوطی تھی۔ اور اسی کے ساتھ انگریزی حکومت اور انگریزی تہذیب سے ان کو سخت نفرت تھی۔

مگر انگریزی دور حکومت میں مسلمانوں کی ان صفات میں برابر انحطاط آتا رہا یہاں تک کہ ۴۷ء میں ہم نے اپنے کو اس حال میں پایا کہ موجودہ مسلمان قوم کے سربر آوردہ طبقے میں کافی تعداد ایسوں کی ہے جنھیں اسلام کے بنیادی عقیدوں پر پورا یقین نہیں رہا ہے۔ دینی غیرت وحمیت دلوں سے نکل چکی ہے۔ وہ معمولی معمولی فائدوں کے لئے دشمنانِ اسلام کے ساتھ جاسکتے ہیں، اغراض پرستی اور ابن الوقتی ہمارے خوش حال طبقے کا عام مزاج بن چکا ہے۔ اس لئے بڑے، بڑے گناہوں اور منافقانہ حرکتوں پر اب سوسائٹی میں کوئی احتساب نہیں ہوتا اور چونکہ یہ باتیں ان لوگوں میں عام ہیں جو قوم میں بڑے اور تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں اسلیئے اب جاہلوں، غریبوں کی نظروں میں بھی ان باتوں میں کوئی برائی نہ رہی اور ان میں (یعنی عوام میں) ایک خطرناک چیز یہ (مزید) ہے کہ وہ دین کی اصولی اور بنیادی باتوں سے بھی ناآشنا ہیں۔ خود علماء کے طبقے میں بھی بہت فرق پڑگیا ہے۔ علم میں رسوخ وبصیرت اور دین میں تفقہ کی شان رکھنے والے ہزاروں میں دو چار بھی نکلنے مشکل ہیں۔ اس طرح تقویٰ اور سیرت کی بلندی اور عزیمت واستقامت کی صفات رکھنے والے اہل علم عنقا کی طرح نایاب یا بہت ہی کم یاب ہیں۔

ان کمزوریوں کے ساتھ ۴۷ء کے انقلاب اور نئی قومی حکومت کا ہم کو استقبال کرنا پڑا ہے۔ دوسری طرف ملک

کے حالات کا نقشہ یہ ہے کہ

تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً بارہ تیرہ فیصد ہے۔ یعنی گویا غیر مسلم آبادی سات گنی اکثریت میں ہے۔ اسلئے حکومت کا سارا نظم و نسق جمہوریت کے اصول کے مطابق قدرتی طور پر اس اکثریت ہی کے ہاتھ میں ہے اور رہے گا۔

اس اکثریت میں ایک عنصر ہے جس کی صاف رائے یہ ہے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کو اس ملک میں مسلمان رہ کر اور عزت کے ساتھ جینے کا کوئی حق نہیں رہا ہے۔ اسلئے اسکے خیال میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کا جبر و تشدد درست ہے عام پبلک کے علاوہ حکومت کے انتظامی عملہ میں بھی اس طرح کے خیالات رکھنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ پس اگر یہ طبقہ ہی کسی وقت بر سر اقتدار آگیا تو موجودہ مسلمان قوم کے جو طبقے دین میں کچے ہیں اور اس وقت بھی جن کا تعلق دین سے زیادہ پختہ نہیں ہے ان کا جو حشر ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اکثریتی طبقے میں (اگرچہ) طرز حکومت اور نظام حکومت کے متعلق الگ الگ رائیں ہیں۔ اور مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کے معاملے میں بھی سب یکساں نہیں ہیں۔ مگر اس خواہش میں قریب قریب سب شریک ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کو اب اپنی ملی انفرادیت اور تہذیبی و معاشرتی امتیاز کو ختم کر کے اکثریت کا ایک غیر متمیز جزو بن جانا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے ایک طرف تو ایسے قوانین بنائے جا رہے ہیں جن کے بعد مسلمانوں کی ملی خصوصیات و امتیازات کے باقی رہنے کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

دوسری طرف "الناس علی دین ملوکھم" کے طبعی قانون کے مطابق خود مسلمانوں کے بعض طبقوں میں ہندوانہ تہذیب و معاشرت اختیار کرنے کا رحجان تیزی سے پیدا ہو رہا ہے۔

تیسری چیز جو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوگی وہ آئندہ کا تعلیمی نظام ہے۔ انگریزوں نے جو نظام تعلیم قائم کیا اگرچہ اس کا مقصد حکومت کی مشین چلانے کے لئے صرف سستے پرزے تیار کرنا تھا، ہندوستانیوں کو انگریز بنانا، ان کے پیش نظر نہ تھا لیکن اسکے باوجود ہندوستان کی تمام قوموں میں یوروپین تہذیب اور یوروپین طرز فکر پیدا کرنے میں اس نے جتنا کام کیا وہ ہم سب کے سامنے ہے بس سمجھا جا سکتا ہے کہ اب جبکہ تعلیم لازمی ہوگی اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اسکے ذریعہ تمام ہندوستانیوں کے خیالات اور طرز زندگی میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا کی جائے "تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری" تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے دینی و ملی خصائص و امتیازات کا کیا حشر ہوگا؟

دو فتنے اور منہ کھولے سامنے کھڑے ہیں، ایک کمیونزم جس کا دھارا پوری تیزی سے ایشیا کی طرف آرہا ہے خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے حالات اس وقت کچھ ایسے ہیں کہ اکثر صوبائی حکومتوں کے غلط رویہ کے رد عمل کے طور پر وہ آسانی سے ہر اس دعوت و تحریک کے ہمدرد بنائے جا سکتے ہیں جو موجودہ نظام کو الٹ کر نئی بساط بچھانے کی دعویدار ہو اور "کامل مساوات" اس کا نعرہ ہو۔

دوسرا فتنہ "نظریۂ وحدت ادیان" ہے۔ بہت امکان ہے کہ جن طبقوں میں دین سے جہالت، مایوسی، نفاق کی یہ بیماریاں موجود ہیں وہ نظریۂ وحدت ادیان قبول کر لینے ہی کو عزت و عافیت کا ذریعہ سمجھ کر قبول کر لیں۔

یہ فتنہ اس لئے اور زیادہ خطرناک ہے کہ اس وقت اس کی داعی اور علمبردار گاندھی جی، راج گوپال اچاریہ جی، اور پنڈت سندر لال جی جیسی باوقار شخصیتیں ہیں۔

ادھر دین کے محافظوں کا یہ حال ہے کہ ان میں سے بہت سوں کے لئے وقتی مصلحتوں کی رعایت ماصدح بما

نؤمر" کی تعمیل سے اس نازک ترین وقت میں بھی رکاوٹ بن گئی ہے، یا "مدارات" اور "مداہنت" کی حدود ان کی نگاہوں میں ملتبس ہو گئی ہیں

آگے چل کر حالات کے اس تجزیہ کے بعد ان سے نبرد آزما ہونے کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

"انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ کے مختلف دور ہوتے ہیں، پہلا دور سخت آزمائشوں کا دور ہوتا ہے، اس دور میں وہی سچے اور پکے لوگ ان کی جماعت میں آتے ہیں جنھیں دین وایمان ہر دوسری چیز سے زیادہ پیارا ہو جاتا ہے۔ وہ سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں۔ پھر ان صادقین کی قربانی اور ثابت قدمی کامیابیوں کے دروازے کھول دیتی ہے اور وہ دوسرا دور آجاتا ہے جبکہ پیغمبر کی دعوت قبول کرنے والوں کو آزمائشوں سے کوئی سابقہ نہیں پڑتا بلکہ دنیا کی ساری کامرانیاں اور اقبال مندیاں اس دور میں اس دین کے سایہ تلے آجاتی ہیں۔ یہ دور بظاہر اس امت کے عروج واقبال کا دور ہوتا ہے۔ لیکن دراصل زوال وانحطاط کی بنیاد اسی دور میں پڑ جاتی ہے امت میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہو جاتی ہے جن کی وابستگی دین اور دینی دعوت کے ساتھ اصلی ایمان والی وابستگی نہیں ہوتی، اس دور میں امت کی حیثیت
بلکہ وہ دنیا کی قوموں میں سے ایک قوم سی جاتی ہے۔ جس میں علم وعمل، افکار وخیالات
کے آدمی ہوتے ہیں، حتی کہ اس دور میں بہت سے ایسے لوگ بھی اس امت میں پیدا ہو
بھی واقفیت نہیں ہوتی، ان کا تعلق دین سے صرف موروثی اور برائے نام ہوتا ہے
کتنا ہی لمبا ہو اسکے نتیجہ میں وہ تیسرا دور ضرور آتا ہے جبکہ حالات اس امت کے لئے پھر
اور قائم رہنے کے لئے عزم وہمت اور جانی ومالی قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

دعوت اسلام کا ابتدائی دور اس امت کے لئے پہلا دور تھا، پھر خلافت راشدہ ہی کے زمانے میں دوسرا دور شروع ہو گیا جو ایک ہزار سال تک چلا اور اب پچھلی صدی سے اسلامی دنیا کے بہت بڑے حصے میں تیسرے دور کا آغاز ہے۔ جن ممالک میں اس دور کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہو چکی ہیں ان میں ایک ہندوستان بھی ہے۔ جہاں کے حالات تیزی سے ایسے ہوتے جارہے ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں یہاں وہی اہل عزیمت سچے مومن ومسلم رہ سکیں گے جو دل کی پوری سچائی کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیں گے کہ ہم کو ہر حال میں مومن ومسلم رہنا اور ایمان واسلام کے ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ چاہے ہم کو اور ہماری نسلوں کو حکومتی عہدے ملیں یا نہ ملیں، نوکریاں ملیں یا نہ ملیں، ٹھیکے اور تجارات کے اچھے مواقع ملیں یا نہ ملیں اور ظاہر ہے کہ یہ عزم وہی لوگ کرسکتے ہیں جو دین کی حقیقت سمجھکر اس پر ایمان لائے ہوئے ہوں اور ہر منفعت ومصلحت کو اس کے لئے قربان کرسکتے ہوں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت میں یہ چیز اس وقت موجود نہیں ہے۔ پس مستقبل میں یہاں کے مسلمانوں کے اسلام پر قائم رہنے کا دارومدار اور تمام تر انحصار بظاہر اسی پر ہے کہ حقیقی ایمانی روح، ضروری درجہ کی دینی واقفیت اور عزیمت واستقامت کی صفت ان میں عام کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کام کے لئے جو طریقۂ کار ہمارے نزدیک صحیح ہے اور جس پر ہم کو پورا یقین ہے اسکی پوری تفصیل ایک مستقل رسالہ "دعوت اصلاح وتبلیغ" میں اس سے پہلے لکھی جاچکی ہے۔ البتہ چند اصولی باتیں یہاں بھی عرض کی جاتی ہیں

۱- مسلمان قوم کے افراد کی بہت بڑی تعداد اگرچہ دین کی بنیادوں سے بھی بے خبر ہے تاہم یہ خارج از ملت نہیں ہے۔ انہیں اپنا اسلامی بھائی سمجھ کر اور ان کی اس غفلت وجہالت کا بہت کچھ اپنے کو بھی ذمہ دار مان کر کام کرنا ہوگا۔

۲- بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھیں دین کی ضروری باتوں کا علم تو ہے لیکن زندگی دین کے مطابق نہیں ہے۔

لہذا ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ صرف کسی عمومی تعلیمی یا اشاعتی اسکیم کے ذریعہ دینی احکام و مسائل کا ان کو صرف معلوم کرا دینا کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ان کے دلوں میں احکام کی عظمت پیدا ہو، اور اسکے لئے انبیاء کے طرز پر ایسی جدوجہد ضروری ہے جس میں جذبات کا رخ پھیر دینے کی طاقت ہو اور جس میں کچھ بتلانے اور پہونچانے سے زیادہ ایمانی جذبات پیدا کرنے کی کوشش ہو۔

۳- مستقبل کے ناسازگار حالات میں ہم کو اور ہماری نسلوں کو پختگی کے ساتھ دین و ایمان پر قائم رہنے کے لئے دین کے ساتھ جس درجے کی محبت اور جیسی استقامت و عزیمت کی ضرورت ہے وہ تبھی پیدا ہو سکتی ہے جب سب کی زندگی کو دعوتی بنادیا جائے کیونکہ کسی عقیدے یا طرز زندگی کی طرف دعوت خود اس پر راسخ اور پختہ ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔

۴- اس مقصد کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ ضروری درجہ کی دینی تعلیم کا ایسا ہمہ گیر انتظام ہو کہ ہر شخص خواہ اس کی عمر کچھ ہو اور اس کے احوال و مشاغل کچھ ہوں وہ آسانی سے دین کی ضروری واقفیت حاصل کر سکے۔ یہ تعلیم مساجد میں آسانی سے ہو سکتی ہے اور کتابی بھی ہو سکتی ہے اور زبانی بھی۔

۵- اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو خاص فکری یا عملی صلاحیتیں بخشی ہیں ان کو اس کام میں لگانے اور ان کی خداداد صلاحیتوں سے دین کو فائدہ پہونچانے کی خصوصیت سے کوشش کی جائے۔ البتہ اس راہ میں کسی کو بھی حقیر و بے کار نہ سمجھا جائے۔ کوشش ہر ایک پر کی جائے اور ہر آنے والے کی پوری قدر کی جائے۔

۶- اس کام کا یعنی احیاءِ دین و اصلاح امت کی جدوجہد کا سب سے بڑا حق حضرات علماء پر ہے، اس لئے ان پر حق ہے کہ اپنی توجہات عالیہ زیادہ سے زیادہ اس کام کی طرف لگائیں۔

۷- علماء کے علاوہ دوسرا طبقہ جس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اہل وجاہت اور اصحاب دولت و ثروت کا ہے۔ قوم کے عوام اسی طبقے کا اتباع کرتے ہیں، یہ اگر نیکی کی راہ پر آجائے تو پوری قوم کا نیک بننا آسان ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس دنیا میں کوئی بڑا کام مادی وسائل کے بغیر نہیں چلتا

۸- احیاء دین اور اصلاح امت کی اس جدوجہد کے ہر مرحلے پر اسکی نہایت احتیاط کی جائے کہ کسی وقت بھی یہ جدوجہد خالص مادی مسائل سے تعلق رکھنے والی قومی اور سیاسی تحریکات سے مشتبہ نہ ہو، اور نہ اس طرح کی کسی قومی تحریک سے اس کا رشتہ جڑنے پائے۔

۹- گذشتہ دور میں ہماری قومی پالیسی یہ رہی کہ یہاں کے دوسرے باشندوں سے حقوق و منافع کی حصہ رسدی کی تقسیم پر ہم لڑتے جھگڑتے رہے اور اپنے طرز عمل سے اہل ملک کو بتلاتے رہے کہ گویا حقوق و منافع کے ان ہی مسئلوں کو ان کی طرح ہم بھی زندگی کے اصل مسائل سمجھتے ہیں۔ اور حضرت محمد ﷺ کا جو پیام ہدایت لے کر ہمارے اسلاف عرب سے نکلے تھے اس کو ہم نے یکسر چھوڑ دیا اور برائیاں ہم نے اختیار کر لیں۔ ایسی حالت میں دوسرے باشندوں کا برتاؤ اگر ہمارے ساتھ غیر منصفانہ ہو تو اسکے لئے تو اگرچہ یہ درست نہیں لیکن ہم کو اس کے سوا توقع کرنے کا کیا حق ہے؟ اس لئے ملک کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ اسلام کے مقرر کئے ہوئے اصول اخلاق، احسان و انصاف اور خیر اندیشی کی بنیاد پر ہو، اور ان کے متعلق دوسرے تمام مسئلوں سے زیادہ فکر ہم کو اس کی ہو کہ اللہ کے ان بندوں کا رشتہ بھی اللہ کی ہدایت اور اس کے بھیجے ہوئے دین حق سے جڑ جائے اور یہ بیچارے بھی رحمۃ للعالمین سیدنا حضرت محمد ﷺ کو پہچان لیں اور ان کی لائی ہوئی رحمتوں اور برکتوں میں ان کا بھی حصہ ہو جائے۔ ویکون الدین کلہ للہ"

یہ مضمون ایک نمونہ ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے اس مرد حق کی بیداری کا، اسکی وقت نظر اور وسعت نظر کا، نیز اس کی حق گوئی و بیباکی کا بعد میں آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی انفرادیت اور ملّی تشخص کی حفاظت کی جتنی بھی سنجیدہ اور ٹھوس کوششیں ہوئیں مثلاً دینی تعلیمی کونسل، مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ اِن سب میں حضرت والد ماجدؒ کا کلیدی اور بنیادی حصّہ رہا۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ جو آج تک ہندوستان میں اندلس کی تاریخ نہیں دوہرائی جا سکی، اور نہ یہاں کے نہتے اور کمزور مسلمانوں کے ساتھ وہی کیا جا سکا جو اسی خطۂ زمین پر بدھوں اور جینیوں کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ یہ دراصل نتیجہ ہے اس ملک کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے کسی خاص فیصلے کا جسکے نتیجہ میں اس نے یہاں (الف ثانی کے مجدد) سید احمد سرہندی، اور اس دور کے فاتح حضرت شاہ ولی اللہ جیسی ہستیاں پیدا کیں ... فیوض کا سلسلہ جاری رکھا۔

والد ماجد حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی زندگی کے با عمر کے تیس سال بھی نہیں ہوئے تھے عالم ربانی حضرت مولانا معمولی طور پر صاحب کشف و فراست تھے) یہ جو کہا تھا کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ قسام ازل نے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی دام مجدھم کا وجود مسعود اسی غرض کے لئے تجویز فرمایا ہے کہ موجودہ دور کے دشمنوں سے اسلام کی عزت بچائیں (ماخوذ از الفرقان جلد اشارہ ۷)

اور یہ بات جو مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کی زبان سے حضرت والد ماجد کی وفات کے بعد نکلی تھی کہ

"مولانا کا بڑا امتیازی کمال یہ تھا کہ انہوں نے نے اس ملک کے خطرات کو سمجھا اور اس حقیقت کو سمجھا کہ یہ ملک مسلمانوں کے لئے دوسرا اسپین نہ بن جائے نیز یہ کہ مولانا کی جامعیت اور ان کا خاص کمال یہ تھا کہ ان کی توجہ مسلمانوں کے اپنے انحرافات اور اس کے تقاضوں پر بھی رہی اور ان مخالفانہ منصوبوں اور خطرات پر بھی جو باہر سے ان کی طرف رخ کر رہے تھے "

یہ سب دراصل اشارہ کرتی ہیں اُن کی شخصیت کے اسی پہلو کی طرف جسکی طرف سطور بالا میں ناظرین کرام کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

راقم الحروف یہاں یہ بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہے کہ حضرت والد ماجدؒ کی شخصیت کے اس پہلو کے انتخاب کا محرک اس کا یہ احساس بھی ہے کہ حالات اب پہلے سے زیادہ سخت ہیں۔ ہمارا ملک اب پہلے سے کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ اُس تنگ نظر گروہ کی گرفت میں ہے، دوسری طرف ہمارا اپنا حال بھی پہلے سے زیادہ خراب ہے۔ ضرورت ہے کہ ہند میں سرمایۂ

ملت کی نگہبانی کے کام کیطرف توجہ بڑھائی جائے اور اس کے لئے علمی دفاع بھی کیا جائے اور دعوتی و عملی اقدام بھی۔ اللہ کرے کہ اس تذکرے سے یہ فائدہ ہو.. لکھنے والے کو بھی اور پڑھنے والوں کو بھی، ورنہ "پدرم سلطان بود" سے کیا فائدہ؟

. . . .

بس اب صفحات کی گنجائش ختم ہو چکی ہے بلکہ شاید میں مقررہ حد سے آگے ہی بڑھ چکا ہوں۔ کہنے کو ابھی بہت کچھ باقی ہے بلکہ سبھی کچھ باقی ہے، مگر

ع- دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والد ماجدؒ کو اعلی علیین میں جگہ دے اور ہمیں انکے، اور انکے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔

رب اورعی ان اشکر نعمتك التی انعمت علی وعلی والدی
وان اعمل صالحاً ترصاه وادحلنی برحمتك فی عبادك الصالحین

☆☆☆

جناب محمد یونس سلیم۔ نئی دہلی
سابق ڈپٹی منسٹر حکومت ہند و گورنر بہار۔

ایک مدبّر و مفکر عالم دین

اچھی طرح یاد نہیں کہ عالم ربانی مولانا منظور نعمانیؒ سے
شرف حاصل ہوا تھا۔ خیال پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ حیدر آباد میں
تبلیغی اجتماع کی خبر کے سلسلہ میں اخبار میں مولانا مرحوم کی تشریف
تھی اور میں مولانا نعمانیؒ سے سکندر آباد کی جامع مسجد میں جاکر ملا تھ
پیش آئے تھے اور بعض دینی و سیاسی امور پر بڑی دیر تک گفتگو رہی تھی۔ تفصیلی ملاقات اور مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ جب ملا تھا جب میں غالباً اگست ۱۹۶۱ء میں خاص طور پر مولانا مرحوم اور علی میاں سے ملنے کی غرض سے لکھنؤ گیا تھا اور کچہری روڈ پر مولانا ہی کے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا تھا۔ تقریب ملاقات یہ تھی کہ جمعیۃ العلماء ہند نے دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن ڈاکٹر سید محمود مرحوم کی صدارت میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور مجھکو کنونشن کا سکریٹری بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود کی بڑی خواہش تھی کہ کنونشن مسلمانان ہند کا ایک نمائندہ اجتماع ہو جس میں ہر طبقہ اور مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے اہل الرائے کو مدعو کیا جائے۔ خاص طور پر جماعت اسلامی کے زعماء اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی کی شرکت کی اہمیت پر خاصؔ طور پر توجہ مرکوز تھی۔ جماعت اسلامی کے قائدین اور مولانا علی میاں اور مولانا نعمانی کو کنونشن میں شرکت پر آمادہ کرنے کی سعی و جد و جہد ان حضرات سے میرے سپرد کی گئی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے مولانا منظور نعمانی سے ربط پیدا کیا اور تاریخ مقررہ پر لکھنؤ پہونچکر مولانا مرحوم کے یہاں ہی کچہری روڈ پر مولانا کے مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر ہوا تھا۔ دو۔ تین دن کے قیام میں کئی نشستوں میں ملک و ملت کے سیاسی و اجتماعی مسائل پر بڑی تفصیلی گفتگوئیں رہیں۔ ہر نشست میں علی میاں بھی تشریف فرمارہتے تھے۔ یہ

پہلا موقع تھا کہ اس قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ملک کے سیاسی امور اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل پر مولانا سے گفتگو اور تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے حیدر آباد میں پولیس ایکشن کے بعد اکابر جمعیۃ العلماء کے علاوہ متعدد علماء کرام اور قائدین ملت سے سیاسی اور ملی مسائل پر گفتگو اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا تھا لیکن لکھنؤ کے دوران قیام میں مولانا نعمانیؒ کی سیاسی بصیرت اور ملک و ملت کے مسائل پر حقیقت پسندانہ سوچ اور فکر نے اس قدر متأثر کیا کہ مولانا کی دینی اور سیاسی بصیرت اور سیاسی امور پر انکے حقیقت پسندانہ نقاط نظر نے مجھے ان کا گرویدہ بنادیا۔ مولانا نے جس محبت، شفقت اور اخلاص کا برتاؤ اس ملاقات میں کیا تھا اس کو نہ صرف مرحوم آخر وقت تک نباہتے رہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ انکی عنایتوں، شفقتوں اور بزرگانہ سرپرستیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

لکھنؤ کی اس گفتگو کے دوران یہ ذکر بھی آیا تھا کہ ملک کے سیاسی و ملی حالات کا تقاضا ہے کہ جماعت اسلامی کے نمائندوں کو مسلم کنونشن میں شرکت کے لئے بہر طور پر آمادہ کیا جانا مناسب ہوگا۔ مولانا علی میاں اور مولانا نعمانیؒ دونوں نے میری گذارش کو شرف قبولیت بخشا اور کنونشن میں شرکت کی دعوت کو قبول فرمایا۔ میں لکھنؤ کی کامیابی پر مسرور دہلی واپس ہوا اور جب میں نے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اور ڈاکٹر سید محمود مرحوم کو ان دونوں علماء کرام کی شرکت پر آمادگی کی خبر سنائی تو یہ دونوں حضرات بھی بہت مسرور اور مطمئن ہوئے لیکن بدقسمتی سے یہ مسرت عارضی ثابت ہوئی۔

لکھنؤ کی مہم سر کرنے کے بعد میں نے جماعت اسلامی کے ارباب حل وعقد سے ربط قائم کیا۔ مولانا ابواللیث مرحوم اور محمد یوسف مرحوم سے بڑی تفصیلی گفتگو جماعت کے اس وقت کے مرکزی دفتر سوئیاں والان میں رہی اور قرار پایا کہ جمعیۃ العلماء کی پالیسیوں اور طریقہ کار انداز فکر کے متعلق ارباب جماعت اسلامی کو جو شبہات واختلافات ہیں ان کو رفع کرنے کے لئے اور کھلے دل سے تبادلۂ خیال کرنے کی غرض سے جمعیۃ العلماء کے ارباب حل وعقد اور جماعت اسلامی کے نمائندوں کے درمیاں مذاکرات منعقد ہوں، چنانچہ ماہنامہ برہان کے دفتر میں جو ایک طرح سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کی قیام گاہ تھی اس غرض کے لئے ملاقاتیں، گفتگوئیں اور بحث و مباحث شروع ہوئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم جمعیۃ العلماء ہند کے نمائندے کی حیثیت سے اور مولانا محمد یوسف مرحوم اور محمد مسلم مرحوم مدیر "دعوت" جماعت اسلامی کے نمائندے کی حیثیت سے مذاکرات

میں شریک ہوئے۔ دو- تین دن تک کئی کئی نشستوں میں تبادلۂ خیال اور بحث و مباحث کا سلسلہ جاری رہا لیکن بد قسمتی سے گفتگو ناکام ہو گئی۔ اس کے دوسرے دن ہی یہ خبر مقامی اخباروں اور نیشنل پریس میں شائع ہو گی کہ جماعت اسلامی نے مسلم کنونش کے اجلاسوں میں شرکت سے انکار کر دیا۔

اخباروں میں اس خبر کے شائع ہونے کے تیسرے چوتھے دن مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کا گرامی نامہ مجھے موصول ہوا جس میں مولانا نے تحریر فرمایا تھا کہ کنونشن میں جماعت اسلامی کے شرکت سے انکار کر دینے کی خبر اخباروں میں شائع ہونے کے بعد موصوف اور علی میاں باہم مشورہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جماعت اسلامی کے انکار کر دینے کی وجہ سے (۱) صورت حال بالکل بدل گئی ہے اس لئے ایسی حالت میں ان دونوں حضرات کی کنونشن میں شرکت بھی سود مند و مناسب نہ ہو گی۔ اس اطلاع سے ہم سب لوگوں کو بہت

ہندوستان کی آزادی کے بعد اپنی نوعیت کا یہ پہلا کنو
لوگوں کی سر براہی بھی حاصل تھی جنھوں نے جنگ آزادی میں کا
لے کر بے مثال قربانیوں کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ جمعیۃ العلماء کے
الرحمٰن کی مجاہدانہ سرگرمیاں ان کے مخلصانہ کردار کا لوہا سارے ملک سے منوا چکی تھیں۔ جو ملت کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی عزت و توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی کوششوں سے کنونشن ہر طرح نہایت کامیاب رہا اور کنونشن کے صدر ڈاکٹر سید محمود جو جواہر لال نہرو کے ساتھی اور دوست تھے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری رہ چکے تھے اور متعدد بار جنگ آزادی کے دوران قید و بند کی سختیاں اٹھا چکے تھے کنونش کے صدر تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اسی کنونشن میں اپنا وہ تاریخی خطبۂ صدارت پڑھا تھا جس میں انھوں نے واضح الفاظ میں بلاخوف اور بغیر جھجھک کے فرمایا تھا کہ کانگریس کی حکومت کے غیر انصافانہ اور تفریقانہ رویہ اور بعض چوٹی کے کانگریسی لیڈروں کی تنگ نظری نے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے

---

(۱) یہاں محترم مضمون نگار کے بیان میں کچھ تسامح معلوم ہو رہا ہے۔ راقم الحروف (عتیق الرحمٰن) اس موقع کی مشاورتوں میں عموماً شریک رہا تھا، اسکی یادداشت کے مطابق نیشنل اخبارات میں واقعہ یوں بیان کیا گیا تھا کہ جماعت اسلامی کو شریک نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور حضرت مولانا علی میاں یا والد ماجد (مولانا نعمانی) کی طرف سے عدم شرکت کا فیصلہ بھی اسی صورت میں حق بجانب ہو سکتا تھا، اسلئے کہ انکا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کنونشن کو پوری طرح مسلم نمائندہ کنونشن بنانے کی کوشش کی جائے۔ اور جماعت کو شریک نہ کرنے کا فیصلہ شاید اس لئے کرنا پڑا ہو کہ ان لوگوں کے یہاں اس وقت تک سیکولرازم قطعی حرام تھا اور کنونشن والے حضرات اس سے اجتناب کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ (عتیق)

ہی ملک میں دوسرے درجے کا شہری بنادیا ہے۔ خطبۂ صدارت کے اس جملے پر جس کو قومی پریس نے نمایاں تشہیر دی تھی جواہر لال نہرو ڈاکٹر محمود پر بہت برہم ہوئے تھے اور مسلم کنونشن کے وفد کی موجودگی میں دونوں میں کافی تو تو میں میں رہی تھی۔ کنونشن کے انعقاد کا مقصد ہی یہی تھا کہ کانگریسی حکومت کو جھنجھوڑا جائے اور ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ ہر میدان میں نامنصفانہ اور امتیازی سلوک کے نتائج و عواقب سے متنبہ کیا جائے۔ چنانچہ کنونشن کے اختتام کے بعد قومی اخباروں میں اس موضوع پر ہفتوں بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رہا۔

کنونشن کے انعقاد کے چند ہفتہ بعد دہلی میں ڈاکٹر سید محمود سے جو میری ملاقات ہوئی اور کنونشن کی روداد اور اس کی تفصیلات پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے نہایت رازدارانہ طور پر مجھ سے فرمایا کہ اگرچہ بظاہر کنونشن بہت کامیاب رہا اور ایک حد تک اس کے خاطر خواہ نتائج بھی ظاہر ہوئے ہیں لیکن میں بالکل مطمئن نہیں ہوں اور کنونشن میں جماعت اسلامی کے نمائندوں اور مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی کے شریک نہ ہونے کا مجھے بڑا ملال ہے۔ ڈاکٹر محمود نے فرمایا کہ ملک کے حالات کا تقاضا ہے کہ ایسے تمام مسائل پر جو مسلمانوں کے مشترکہ مسائل ہیں سیاسی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر تمام مسلم رہنما ایک پلیٹ پر جمع ہوں اور ایسا لائحۂ عمل بنائیں کہ مشترکہ مسائل میں باہمی اتفاق و تعاون سے اپنی اپنی جماعتی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے باہمی مشوروں سے مشترکہ پروگراموں اور لائحہ عمل کو مل جل کر عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

۱۹۶۳ء میں مولانا حفظ الرحمٰن کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ مولانا کے انتقال کی وجہ سے مسلم قیادت میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا اور جمعیۃ العلماء ہند شدید اختلافات انتشار اور اقتداری رسہ کشی کا شکار ہو گئی۔ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں ملک کے مختلف حصوں میں خاص طور پر مغربی بنگال اور بہار کے مختلف شہروں میں جن میں بطور خاص رانچی اور روڑ کیلا وغیرہ کے بھیانک فسادات میں مسلمانوں کو بہت زیادہ جانی و مالی نقصان سے دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے ملک کی فرقہ وارانہ فضا کافی مکدر ہو گئی اور ان بھیانک فسادات نے مسلم قیادت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسی زمانہ میں میرا دہلی آنا ہوا اور میری ڈاکٹر سید محمود سے ملاقات ہوئی تو دوران گفتگو میرے لکھنؤ جانے کے ارادہ کا بھی ذکر آیا۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے لکھنؤ جانے اور مولانا منظور نعمانیؒ سے ملاقات کرنے کے پروگرام کا ذکر کیا تو ڈاکٹر سید محمود سن کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک مولانا منظور نعمانی کی تعریف و توصیف کرتے رہے اور انکی اصابت رائے اور سیاسی فہم و بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ جب میں مولانا

مرحوم سے ملوں تو ان کو تیار کروں کہ وہ مولانا علی کیاں کو آمادہ کریں کہ لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک ایسے اجتماع کا منصوبہ بنایا جائے جس میں سارے ہندوستان سے ہر طبقہ اور ہر مکتبِ فکر کے نمائندوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور اس وقت کی ملک کی سیاسی اور فرقہ وارانہ فضاء کے پیش نظر اک ایسا لائحہ عمل بنایا جائے کہ مشترک ملی مفاد کے معاملات میں مل جل کر کام کرنے کی راہیں ہموار ہو سکیں۔

مولانا نعمانی ؒ نے علالت اور تیز بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود جس انہماک اور دلچسپی سے تمام مسائل پر غور و فکر اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیا اس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا اور نہایت دیانت داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ یہ مولانا نعمانی ؒ کی شخصیت تھی جس نے علی میاں کو ندوہ میں اجتماع کے انعقاد کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کیا۔

۱۹۶۴ء کے وسط میں ندوۃ العلماء میں مسلمانوں کے ایک :
منصوبہ مسائل کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد تیار کر لیا گیا
کر دیئے گئے کہ جمعیۃ العلماء ہند، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ او
اجتماع میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال
العلماء ہند شدید اختلافات کی آماجگاہ بن گئی تھی، مولانا اسعد مدنی اور مولانا مفتی عتیق الرحمن کے حامیوں کے علیحدہ علیحدہ گروپ بن گئے۔

چنانچہ ندوۃ العلماء میں منعقد ہونے والے اجتماع میں شرکت کا مسئلہ بھی جمعیۃ العلماء کے حلقوں میں نزاعی بن گیا تھا، مولانا اسعد مدنی کسی ایسے اجتماع میں جس میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو شرکت کے لئے مدعو کیا گیا ہو شرکت کرنا جمعیۃ العلماء کی قوم پرستانہ پالیسی کے مغائر سمجھتے تھے۔ مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم کا نقطۂ نظر مختلف تھا، ان کا قول یہ تھا کہ ایسے مسائل جو تمام مسلم جماعتوں میں مشترک ہوں اُن پر غور و فکر کرنے اور ایک مشترکہ لائحہ عمل بنانے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر تمام مسلم جماعتوں کا اکٹھا ہونا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بطور خاص فرقہ وارانہ فسادات کے موقعہ پر ریلیف اور امدادی کاموں میں اشتراک عمل سے وقت، صلاحیت اور مالی وسائل ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائیں گے۔

مندرجہ ذکر باہمی تناؤ نے پیچیدہ شکل اختیار کر لی اور اس کے امکانات پیدا ہو گئے کہ جمعیۃ العلماء، ندوۃ العلماء میں منعقد ہونے والے اجتماع میں شرکت سے انکار کر دے۔ چنانچہ
س نزاعی مسئلہ کے تصفیہ کے لئے جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس ندوۃ العلماء کے کنونشن

کی تاریخ سے عین دو تین دن قبل لکھنؤ میں منعقد ہونا کا منصوبہ بنایا گیا، مجھے اس جلسہ میں شرکت کے لئے بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ اس صورت حال کے رونما ہونے کا سب سے زیادہ دکھ اور صدمہ مولانا منظور نعمانی مرحوم کو تھا چنانچہ مولانا مرحوم نے مجھے حیدر آباد خط لکھا اور اپنے دلی احساسات کا اظہار کرتے ہوئے نہایت پر زور الفاظ میں مجھے جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت کرنے کی تاکید فرمائی خط کے علاوہ تار کے ذریعہ بھی شرکت کے لئے اصرار فرمایا۔ تاریخ مقررہ سے دو ایک دن قبل میں لکھنؤ پہونچ گیا۔

جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کی نشست ممتاز دار الیتامیٰ امین الدولہ پارک میں منعقد ہوئی۔ ماحول میں کافی تناؤ تھا۔ گھنٹوں کے بحث ومباحثوں کے بعد خدا خدا کر کے مجلس عاملہ نے متفقہ طور پر ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا منظور نعمانیؒ نے جمعیۃ العلماء کے ارباب حل وعقد سے اور بطور خاص مولانا اسعد مدنی اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰنؒ سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کر کے تمام نشیب وفراز کو واضح کیا اور ندوہ کے اجتماع میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کے لئے نہایت اہم اور بے مثال رول ادا کیا۔ مولانا کی اصابت رائے اور غیر جانبدارانہ رویہ کا سبھی احترام کرتے تھے اس لئے اس گتھی کو سلجھانے میں مولانا کی مساعی سے بڑی مدد ملی۔

جمعیۃ العلماء کے اس متفقہ فیصلہ کے باوجود دلوں میں شکوک وشبہات اور ذہنی تحفظات کا ماحول بر قرار رہا اور باوجود سعی وکوشش کے اس کا ازالہ نہ ہو سکا جس کا اظہار آخر کار ندوۃ العلماء کے اجتماع کے افتتاحی اجلاس میں دونوں کے نمائندوں نے کھل کر کر ہی دیا۔

جس روز مسلم کنونشن کا افتتاحی اجلاس ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا اس روز کنونشن کے صدر ڈاکٹر سید محمود کے افتتاحی ارشادات کے بعد جب شرکاء اجتماع کی تقریریں شروع ہوئیں تو ایک بار جمعیۃ العلماء کے نمائندوں اور جماعت اسلامی کے نمائندوں میں ایسی گرما گرم بحثیں شروع ہو گئیں کہ ایک طرح سے تو تو میں میں کی نوبت آ گئی یہاں تک کہ کنونشن کے اجلاس کو ملتوی کر دینا پڑا۔ اس بدبختانہ صورت حال نے ساری توقعات پر پانی پھیر دیا اور ہفتہ بھر کی کوششوں کو خاک میں ملا دیا۔

صدر جلسہ کے اجلاس کو ملتوی کر دینے کے بعد صورت حال کو سنبھالنے کے لئے باہم صلاح ومشورے شروع ہوئے۔ مولانا منظور نعمانیؒ اس موقعہ پر بھی نہایت فراست اور معاملہ فہمی سے کام لے کر دونوں جماعتوں کے نمائندوں سے علیحدہ علیحدہ گفتگوئیں کیں اور افہام

و تفہیم کے بعد اجلاس میں دونوں گروہوں کے نمائندوں کو شریک ہونے اور خوش گوار و پر سکون ماحول میں کنونشن کی کارروائیوں کو چلنے دینے پر آمادہ کرلیا۔ مزید بر آں سہ پہر کو کنونشن کا اجلاس شروع ہوا، تو مولانا علی میاں نے نہایت موثر اور فکر انگیز خطاب کے ذریعہ متخاصمین کو غیرت دلائی اور ملت کو جگ ہنسائی سے بچنے کیلئے باہمی جزوی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر برادرانہ اور دوستانہ ماحول میں کنونشن کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے لئے بڑی الہامی تلقین فرمائی اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ندوۃ العلماء کا یہ تاریخی اجتماع نہایت پُر امن اور برادرانہ ماحول میں اختتام پذیر ہوا اور ایک متفقہ تجویز کے ذریعے مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔

یہ مولانا نعمانی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کنونشن میں جمعیۃ العلماء [illegible]
کے درمیاں تناؤ اور کشمکش کے ماحول کے باوجود مجلس مشاورت
گرماگرم مباحث کے بعد منظور کی جاسکی۔

مولانا منظور نعمانی ؒ نہایت بالغ نظر، تبحر اور راسخ ال[illegible]
سیاسی اور ملکی امور میں سیکولر اور غیر فرقہ وارانہ نظریۂ فکر [illegible]
مجلس جماعت اسلامای ہند کے برخلاف وسیع الخیال سیاسی مسلک ہی کو آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے مناسب اور سود مند سمجھتے تھے اور اپنے اس مسلک کا اظہار بر ملا کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔

میری مرحوم بیٹی حمیرا مولانا مرحوم سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی، بڑی شفقت، محبت اور پیار سے اس کو دینی مسائل سمجھاتے اور اس کے سوالات کے جوابت دیتے، اس کے انتقال پر مولانا مرحوم نے جو تعزیت کا خط تحریر فرمایا تھا اس نے ہم غم زدہ ماں باپ کے زخموں پر مرہم کا کام کیا تھا، میری اہلیہ بھی مولانا کی بڑی معتقد تھیں، نہایت ذوق و شوق سے ان کی تصنیفات پڑھتی تھیں جس کا سلسلہ اب بھی باقی ہے، جب کبھی مولانا تشریف لاتے تو بڑی عنایت اور شفقت سے اُن سے گفتگو کرتے اور پند و نصیحت سے سر فراز فرماتے۔

ایک خط جو مولانا نعمانی ؒ نے میری اہلیہ کے عریضہ کے جواب میں تحریر فرمایا تھا اس مضمون کے جزو کے طور پر پیش کر رہا ہوں، اس گرامی نامہ میں مولانا نے میری اہلیہ کو جو دینی و فقہی مشورہ دیئے ہیں اس سے پڑھنے والوں کو استفادہ کا موقعہ ملے گا اور یہ اندازہ لگانے میں

---

(۱) یہ گرامی نامہ مضمون کے خاتمہ پر ملاحظہ فرمائے۔ (سلیم)

آسانی ہوگی کہ کس طرح ایک سچے، باعمل اور مصلح عالم دین کی طرح مولانا نعمانی نجی خط و کتابت میں بھی پند و نصیحت اور تبلیغ و تنذیر کو ملحوظ رکھتے تھے اور اللہ کے رسول کے ذریعے آئے ہوئے دین کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کے فریضہ کی انجام دہی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

بصمیم قلب دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان مخلصانہ خدمات کو قبول فرمائے اور اپنے خاص اور مقبول بندوں کے زمرے میں شامل کر کے اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

حضرت مولانا کا گرامی نامہ راقم کی اہلیہ کے نام

محمد منظور نعمانی

(پونا اور بلگام کے درمیان چلتی ٹرین سے)

۲۲ر فروری ۱۹۶۸ء

محترمہ بہن سلام و رحمت!

۱۵ر فروری کا مرقومہ اخلاص نامہ مجھے ۱۷ر کو مل گیا تھا، ہر بڑے سفر سے پہلے میرا حال یہ ہوتا ہے جن کاموں سے فارغ ہونا اور جن حسابات کو صاف کرنا ضروری ہوتا ہے، روانگی کے وقت تک انہی میں مصروف رہتا ہوں، ڈاک کئی دن پہلے سے جمع ہوتی رہتی ہے جسکے جواب کا موقع سفر شروع ہونے پر ہی ملتا ہے۔ آپ کا خط میں نے پڑھ تو اسی دن لیا تھا اور ۱۸ر کو جب یونس سلیم صاحب تشریف لائے تو اُن سے ذکر بھی آگیا تھا۔ لیکن جواب کا وقت آج سے پہلے نہیں مل سکا۔ ۱۹ر کی صبح کو میں بمبئی کے لئے روانہ ہوا اور اب ایسا ہوا کہ جو ضروری کام پہلے ختم کرنے تھے وہ میں نہیں کر سکا۔ بمبئی پہونچ کر کل شام تک ان میں مصروف رہا، الحمد للہ اُن سے فارغ ہو کر بمبئی سے یہ سفر شروع کیا میں اسوقت بھٹکل جارہا ہوں، انشاء اللہ ۲۶ر کو پھر بمبئی واپس پہونچ جاؤں گا، پی فارم کا مرحلہ میرے سامنے تک طے نہیں ہو سکا تھا لیکن معلوم ہو گیا تھا کہ انشاءاللہ ہو جائے گا۔ اگر اللہ نے ایسا ہی کیا تو ۲۹ فروری کو روانہ ہو سکوں گا۔

بہت اچھا آپ کے لئے اہتمام سے مغفرت و رحمت کی دعا بھی کروں گا اور روضۂ اقدس پہ صلوۃ و سلام بھی عرض کروں گا۔ دعاؤں کا کام آنا بالکل برحق ہے اور آخرت میں ہم

دیکھیں گے کہ بہت سے بندوں اور بندیوں کو دعائیں کہیں سے کہیں پہنچادینگی لیکن اپنے عمل سے دعا کو تقویت پہنچانا ایک درجہ میں شرط ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو ایک رات ایک خادم صحابی کی خدمت سے بہت آرام پہنچا۔ آپ نے خوش ہو کر فرمایا "سل" (کچھ مانگنا چاہو تو مانگو) انھوں نے عرض کیا "مرافقتک فی الجنۃ" (جنت میں آپ کی رفاقت اور معیت چاہتا ہوں) آپ نے ارشاد فرمایا "فاعنی علی کثرۃ السجود" (پھر میری مدد کرو سجدوں کی کثرت سے، یعنی نماز زیادہ پڑھا کر) اس سے معلوم ہوا کہ حضور کی اس قسم کی دعاؤں کے لئے بھی عمل سے تقویت کی ضرورت کس درجہ میں تھی۔

خواتین کے لئے رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کی زیادہ ترغیب دی ہے۔ یہ دو چیزیں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، نماز اور اللہ کی رضا اور رحمت کی امید میں اسکے احتیا
پر خرچ کرنا۔ یونس سلیم صاحب کے سرمایہ میں سے بھی آپ
میں خرچ کریں گی اس کا ان کو اور آپ کو دونوں کو پورا پورا ثواب
ادا کرائیں اور آپ سے منی آرڈر کرائیں تو اُن کے اجر میں ذرہ
تعالیٰ آپ کو ان کے برابر اجر اپنی طرف سے الگ عطا فرمائے گا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا صریح وعدہ ہے کہ زکوۃ و صدقات کا اجر اس دنیا میں بھی عطا فرمایا جائے گا اور اس عاجز کا مسلسل تجربہ ہے صحیح نیت کے ساتھ جتنا خرچ کرنے کی توفیق مل جاتی ہے اللہ تعالیٰ ہاتھ کا ہاتھ کسی بھی راستہ سے اس سے زیادہ عنایت فرمادیتا ہے۔ اللہ سے تجارت کرنے والا کبھی خسارہ میں نہیں رہے گا۔ دور قریب کے رشتہ داروں میں اگر کچھ ایسے لوگ ہوں جنکی آمدنی کم اور مصارف زیادہ ہوں وہ مناسب سے مقدم ہیں، یہ ظاہر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ یہ زکوۃ یا صدقہ ہے، آپ تحفہ اور خدمت کے عنوان سے دینگی تو اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کا صدقہ ادا ہوگا۔

یہ سوچنا کون ضرورت مند ہیں اور اس کو کس طرح خوبصورتی سے پہنچایا جائے کہ اس کو اپنی کمتری کا احساس بھی نہ ہو ذہن و دماغ کی بہت بڑی عبادت ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
محمد منظور نعمانی

☆☆☆

جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر

تعاون کی اپیل

جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر ایک خالص علمی، تحقیقی، دعوتی اور فلاحی ادارہ ہے جو کہ حکومت جموں و کشمیر سے باضابطہ رجسٹرڈ ہے۔

الحمد للہ! اس مرکز کو سرکردہ اہل علم و فضل کی سرپرستی حاصل ہے، دُنیا کے اہم علمی و دینی مراکز کے ساتھ اس کے گہرے روابط قائم ہیں۔

اس مرکز نے بہت سے اہم اور مفید علمی پروجیکٹ ہاتھ میں لئے ہیں، جن کی تکمیل واشاعت پر زرِکثیر خرچ ہونے کا تخمینہ ہے، نیز مرکز نے علمی نوادرات، مسودات، مخطوطات اور مطبوعات وغیرہ کو محفوظ کرنے کا ایک بہت بڑا منصوبہ بھی ہاتھ میں لیا ہے۔

اس ادارہ کے ساتھ تعاون کی دو صورتیں ہیں

(۱) فراہمی سرمایہ

(۲) ریسرچ لائبریری کے لئے کتابوں کا ہدیہ۔ خاص کر قلمی کتابیں، تاریخی سندیں، دستاویزات اور پرانے رسائل و جرائد کی فائلیں آپ اس ادارہ میں محفوظ کرائیں، تاکہ ارباب ذوق اور ریسرچ اسکالر اس سے استفادہ کر سکیں۔

اہل علم اور اصحاب خیر دونوں طبقوں سے بھرپور تعاون واشتراک کی درخواست ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنے عطیہ جات سے خود بھی تعاون کریں گے اور اپنے دوست واحباب کو بھی ادارہ کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ فرمائیں گے۔

و الاجر علی اللہ

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

عبدالرحمٰن کوندو
ڈائریکٹر
جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سنٹر
کوکر باغ۔ پی او۔ نوشہرہ،
سری نگر ۱۹۰۰۱۱ (کشمیر)

Abdur Rahman Kondoo
Director
Jammu & Kashmir Islamic Research Centre
Kokerbagh, P O Nowshahra,
Srinagar 190011 (Kashmir)

مولانا فرید الوحیدی
جدہ، سعودی عربیہ

مَن اَنصاری اِلی اللہِ

دن تاریخ تو اب یاد نہیں مگر اس بات سے کہ میری عمر اس وقت سات یا آٹھ سال کی رہی ہو گی، یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ ۳۵ء یا ۳۶ء کا زمانہ رہا ہو گا اپنے گھر میں ایک کتاب بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا اسے دیکھنے سے یہ مطلب کسی طرح نہیں نکلتا
سچی بات تو یہ ہے کہ پڑھنا لکھنا تو قاعدے قرینے سے بہتر تہتر
ایک نعمت پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ کتاب اور
تھا تو دیوانگی کی حد تک شوق سے پڑھنے کی کوشش کئے بغیر ہاتھ
غرض نہیں تھی کہ کس موضوع کی کتاب ہے کیا مضمون ہے کیا لکھا ہے بس ایک شوق تھا جو پورا ہوتا رہتا تھا۔ وخیر جلیس فی الزمان کتاب۔ بیسیوں برس بعد یہ شعر پڑھا تو طبیعت باغ باغ ہو گئی، طبیعت کے اس انداز اور زندگی کے اس باب میں بڑے بڑے لطیفے گزرے۔ اس مضمون میں ان تفاصیل کا موقعہ کسی طرح نہیں ہے۔ بات صرف یہ بتانی ہے کہ باپ دادا کے پاس ایک کتاب "الفرقان" بریلی مرتبہ محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ نظر پڑی۔ اپنی افتاد طبع کے مطابق بڑے شوق سے پوری ہی کتاب الٹ پلٹ کر ڈالی۔ کتاب کی پشت پر جو مضمون نظر آیا وہ وہی تھا جو اس مضمون کا عنوان "من انصاری الی اللہ" ہے۔ یہ جاذب نظر تو تھا ہی مگر آج بھی خوب یاد ہے کہ اسکا ایک ایک حرف دل میں اتر تا چلا گیا۔ والدہ مرحومہ روز سونے سے پہلے کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ان میں جو عناصر بار بار گوش گذار ہوتے تھے وہ "مہاجر" اور "انصار" کے الفاظ تھے یہ اسمائے مبارکہ نہ صرف یہ کہ سمجھ میں آگئے تھے بلکہ یاد بھی ہو گئے تھے۔ اللہ کا نام تو دن رات حرز جاں اور ورد زبان تھا ہی اس طرح یہ آیت کا عنوان کسی قدر سمجھ میں آگیا کچھ دنوں کے بعد اپنے والد صاحب مرحوم (۱) سے اسکا مطلب پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ کتاب نہیں بلکہ مہینہ کے

(۱) مضمون نگار کا تعلق حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے گھرانے سے ہے۔ حضرت کے حقیقی بھتیجے مولانا وحید احمد جو حضرت کیلئے بمنزلہ اولاد بھی تھے اور مالٹا کی اسارت کے زمانے میں آپ کے ساتھ اسیر بھی رہے، فرید الوحیدی انہی مولانا وحید احمد صاحب کے فرزند ہیں۔

مہینہ شائع ہونے والا ایک ماہوار رسالہ اور اسکے آخری صفحہ پر یہ مضمون نہیں بلکہ اشتہار ہے جسکا عنوان قرآن پاک کی یہ آیت ہے۔

یہی وہ پہلی تقریب تھی جس نے الفرقان اور اسکے فاضل مدیر سے ایک خاص قلبی تعلق پیدا کر دیا جو وقت اور عمر کے ساتھ بڑھتا رہا اس دوران میں جب میری دیوبند میں تعلیم کا کل ابتدائی دور تھا۔ لوگوں سے سنا کہ مولانا منظور صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں تو "انصار اللہ" میں شریک تھا ہی دارالعلوم دیوبند کے بہت سے طلبہ میں بھی مولانا سے ملاقات کا شوق دیکھا۔ مولاناؒ تشریف لائے تو حیرت ہوئی کہ الفرقان کی اتنی طویل صحبت کے نتیجہ میں جو شکل شمائل اور شباہت اور شخصیت ذہن میں مولانا کی مرتسم ہو گئی تھی وہ اس سے تو بالکل ہی مختلف نکلے۔ نہ جبہ و دستار، نہ عصا، نہ تسبیح بس ایک سادہ سی مولویانہ اور مومنانہ شخصیت، ڈھیلا ڈھالا دو رسوں والا کرتا، سیدھا پاجامہ، دستار کی جگہ ایک معمولی سا رومال، سیاہ داڑھی اور جوانی کی عمر، طبیعت خوش بھی ہوئی اور یہ ہمت بھی ہوئی کہ ان سے بات بھی کی جا سکتی ہے اور انکے قریب جگہ بھی مل سکتی ہے۔ اپنی عمر کا وہ دور شروع ہو چکا تھا جب رسائل اور جرائد کے مضامین روانی اور دلچسپی سے سمجھ میں آنے لگے تھے مولانا سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ صوفیانہ اور واعظانہ طرز کے خشک مزاج اور شدت پسند نہیں ہیں بلکہ دینی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اور نوجوان طلبہ کے ساتھ تفہیم و تفہم کرتے ہوئے زجر و توبیخ کے بجائے کشادہ روئی اور فراخ دلی کے ساتھ اپنی بات مخاطب کے دل میں اتار دینے کا سلیقہ رکھتے ہیں اگر کوئی بری بات ہو تو اللہ معاف کرے مگر اس وقت میرے دل میں یہی خیال آیا کہ "زاہد خشک" ہونے کے بجائے مولانا منظور صاحب "روشن خیال" عالم ہیں۔ نوجوانوں سے شگفتہ زبان میں بات کرتے ہیں۔ صوفیوں کے ساتھ انکی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور علماء کے ساتھ ان کے مقفّیٰ و مسجّع طرز میں تخاطب کرتے ہیں طلباء اور علماء کے ایک مجمع سے خطاب کیا تو واعظانہ اور خطیبانہ عبارات آرائی کے بجائے سلیس اور دل نشیں اسلوب میں گفتگو کی۔ حاضرین میں اکثر لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ مولانا ذاتی طور پر اسی سے مخاطب ہیں۔

اسی زمانے کے آس پاس یہ شہرت سنی کہ بڑے صف شکن اور زلزلہ افگن مناظر مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب چاندپوری مشہور مناظر تھے ایسے کامیاب کہ لوگ انکو ابن شیر خدا علی مرتضیٰ مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب کہتے اور لکھتے تھے۔ افسوس کہ صغر سنی اور کم فہمی کی بنا پر مولانا موصوف کے علمی منصب سے واقف اور مستفید نہیں ہو سکا۔ مگر مولانا منظور

صاحبؒ کی مناظرانہ قابلیتوں اور کامیابیوں کا غلغلہ جب بلند ہوا تو مجھے کسی قدر شعور آچکا تھا۔ ان مناظروں کے جو حالات میں پڑھتا تھا اور اہل علم حضرات کی جو رائے سنتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ مولانا کے مباحث اور مناظروں میں الزامی اور الجھے ہوئے جوابوں کے بجائے علمی اور تحقیقی رنگ غالب ہوتا تھا اور یہی ایک وجہ تھی کہ پیشہ ور مناظرین اور مخالفین کا کوئی حربہ اور حملہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ میں کامیاب نہیں سنا گیا۔ علمی اور تحقیقی زندگی کی بالکل ابتداء سے اعدائے اسلام اور فرق باطلہ کے مقابلہ اور مباحثہ کے جذبات مولانا کے دل میں موجزن ہوگئے تھے۔

"اس عاجز نے بریلوی فتنے کے خلاف دیوبند کے زمانۂ طالب علمی ہی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ باقی دونوں فتنوں، قادیانیت اور آریہ سماجیت کے مقابلہ کا داعیہ اور اسکی صلاحیت بھی بفضلہ
داریوں کے ساتھ ان سب کے ساتھ بھی محاذ آرائی میں حصہ لینا شروع کر
مقابلہ میں کامیاب و سرفراز ہی نہیں کیا بلکہ اس میدان میں جو توفیق اس سے عطا
مقبول بندوں کی نگاہ میں میرے لئے وسیلۂ امتیاز و اعزاز بھی بنا دیا"(۱)

بات بڑی ہے اور چھوٹے منہ سے اچھی بھی نہیں لگتی مگر فرق باطلہ اور اعداء دین کے مقابلہ میں جو مجاہدانہ، مخلصانہ اور مومنانہ خدمتیں مولانا نے اپنی ساری زندگی میں انجام دی ہیں وہ مجاہدین اسلام اور جاں نثاران حق کے گروہ میں آپ کو بڑے امتیازی اور خصوصی درجہ پر فائز کرتی ہیں۔ افصل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر۔ یہ بات غور کرنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ اسوقت کے معاندین حق میں زیادہ تر جماعتیں اور فرقے وہ تھے جن کو اسوقت کے سلطان جائر کی تائید اور مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ بریلویت، قادیانیت، فرقہ واریت، کیسی کیسی عداوتیں، مخالفتیں اور طاغوتی طاقتیں تاک لگا لگا کر حملہ آور ہوتی تھیں۔ سنبھل سنبھل کر نشانہ لگاتی تھیں مگر ایک مرد درویش انکے مقابلے میں تن تنہا ساٹھ ستر برس تک نبرد آزما رہا۔ ع ؎

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا — وہ مرد درویش جسکو حق نے دیئے تھے انداز خسروانہ

افسوس کہ ان مناظروں اور مقابلوں کا کوئی مرتب اور مفصل مجموعہ موجود نہیں ہے۔ بہت پہلے کی کوئی کتاب 'صاعقۂ آسمانی بر فرقۂ رضاخانی' دیکھنی یاد آتی ہے ممکن ہے اب بھی کہیں دستیاب ہو جائے۔

---

(۱) 'تحدیث نعمت' مرتبہ مولانا عتیق الرحمٰن نعمانی، ص ۳۸، مطبوعہ الفرقان بکڈپو لکھنؤ

ایک بڑی اہم بات قابل توجہ یہ ہے کہ ''الفرقان'' محض ایک ماہوار رسالہ نہیں بلکہ ایک مستقل اور مکمل تحریک تھی جسے وقت کے اکابر امت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان بزرگوں نے اعلان کیا تھا کہ الفرقان ایک دینی اور علمی تحریک ہے۔ تبلیغ دینِ حق اور تائید اہل سنت نیز ردِ فرق باطلہ اسکا مقصد ہے۔ امت کے افراد و اعیان سے امید کی جاتی ہے کہ اسکی آواز شہر شہر اور قریہ قریہ پہونچا کر حق کی نصرت اور مدد کریں۔ جن اسلاف و اکابر کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا انکے نام بھی سن لیجئے۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء ہند، شیخ الحدیث والتفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حافظ عبد اللطیف صاحبؒ ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ صدر مجلس احرار، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ امیر انجمن خدام الدین لاہور، حضرت مولانا مفتی محمد مقیم صاحب لدھیانویؒ، مناظر اسلام مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند مناظر اسلام مولانا اسعد اللہ صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، حضرت شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ۔ (۱)

قصہ مختصر یہ کہ انھوں نے دین و مذہب کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں انکی تفاصیل تو ''الفرقان'' ہی کے صفحات بیان کر سکتے ہیں۔ ان چند صفحات اور محدود وقت میں اسکی گنجائش کہاں سے نکالی جائے کہ ساٹھ ستر برس کی طویل اور جاں کاہ خدمات کے تذکرہ کا حق ادا کیا جائے۔ پھر بھی دو چار کارہائے نمایاں پر ایک طائرانہ نظر تو ڈالتے ہی چلیے۔

سبھی جانتے ہیں کہ بریلوی اور بدعتی مذہب ایمان و توحید کے خلاف ایک مہلک اور خاموشی سے سرایت کر جانے والا زہر ہے۔ ابتدائی حالات میں اس کا اندازہ بہت کم ہوتا ہے مگر جب اسکی جڑیں شرک اور کفر تک پہونچ جاتی ہیں تب یہ سرطان ناقابل علاج ہی ہو جاتا ہے۔ ابھی ایک آدھ صفحہ پہلے گذر چکا ہے کہ مولانا محمد منظور صاحب نے اس فرقہ کے خلاف بالکل ابتداء سے پوری تندہی اور بے جگری کے ساتھ علم جہاد بلند کیا اور اسکے مقابلہ میں شمشیر برہنہ ہو کر میدان میں اترے۔ اسکے خطرناک نتائج سے عام مسلمانوں کو گھر گھر جا کر خبردار کیا۔ اسکے اعیان و مبلغین کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کیا۔ اسکے رد میں مضامین، کتابیں اور رسالے شائع کرتے رہے اور اس راستے میں ایسی قربانیاں دیں کہ آخر کار اسکی جڑیں ہلا کر ہی دم لیا۔ اسکے علاوہ

(۱) 'تحدیث نعمت' مرتبہ مولانا عتیق الرحمٰن نعمانی ص ۷۰

ایک معرکہ اور بھی سنئے۔ پچاس ساٹھ برس پہلے کی بات ہے کہ ملک میں عنایت اللہ مشرقی نامی ایک صاحب نے گمراہی اور باطل افکار پھیلانے کا کام بہت تیزی سے شروع کیا۔ اپنی اس تحریک کا نام انھوں نے جماعت خاکسار رکھا مگر عوام اسے بیلچہ پارٹی کے نام سے پکارتے رہے۔ شروع شروع میں یہ ایک سیاسی اور عسکری جماعت نظر آتی رہی۔ مگر بہت جلد ایک خاص طبقے میں شہرت اور مقبولیت کے زور پر اس جماعت نے اسلام کے بنیادی عقائد پر بھی ہرزہ سرائی شروع کر دی۔ پہلے تو علمائے حق اور مصلحین امت نے اسکی طرف کوئی توجہ نہیں دی مگر جب دیکھا کہ آہستہ آہستہ یہ سائے امت کی دیواروں تک پہونچنے لگے تب انکی آنکھیں کھلیں اور اس پاک اور مقدس جماعت نے اسکے سدباب کیلئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ 'الفرقان' بھی اس فریضہ کی ادائیگی میں مکمل طور پر شریک رہا۔

"خاکسار تحریک کا مسئلہ اسوقت مسلمانان ہند کے اہم ہے۔ وہ اس مقام تک پہونچ چکا ہے کہ اگر چندے یہی رفتار رہی تو یہ مصر توں اور ملت پر مرتب ہونے والے اسکے مہلک اثرات اور نتائج نہیں تو قریب بہ محال ضرور ہو جائے گا"(۱)

یہ چند الفاظ مولانا نے اس خطرہ کے مہلک اثرات کے بارے میں لکھے اور اسکے ساتھ ہی اسکے خلاف الفرقان کی جدوجہد کا تذکرہ ہمیں ان الفاظ میں ملتا ہے

"میری تعلیم دارالعلوم دیوبند کی تھی اور اس سے پہلے جن دوسرے مدارس میں پڑھا تھا ان کے اساتذہ بھی دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ تھے، اسی وجہ سے میرا سیاسی ذہن وہی تھا جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اثر سے اور پھر خلافت تحریک سے جماعت دیوبند کا بن گیا تھا۔ اسی بنا پر شروع سے جمعیۃ علماء سے تعلق رہا"(۲)

ے
ں
رفی
بمعہ
ا عط
یات

ہندوستان کی سیاست میں مولانا کا ایک خاص مسلک تھا۔ فکر اور ذہن کے اعتبار سے وہ آزادی اور اسکے لئے مشترکہ ہندو مسلم جدوجہد کے حامی تھے
خوب سمجھ لیجئے کہ جمعیۃ علماء ہند نہ صرف آل انڈیا کانگریس سے ہم آہنگ تھی بلکہ متحدہ قومیت کی زبردست حامی تھی۔ لیکن مولانا کا تعلق محض ذہنی اور فکری موافقت تک محدود تھا۔ عملی

(۱) تحدیث نعمت ص ۷۳ (۲) ایضاً ص ۱۴۹

سرگرمیوں، سیاسی کانفرنسوں اور دھواں دھار تقریروں اور دوروں سے بالکل ہی الگ تھا۔ اسلئے کہ مولانا کی زندگی اور اسکی تگ ودو ساری کی ساری ہمیشہ دینی خدمات اور اسلامی تحریکات کیلئے وقف رہی۔ لیکن آزادی اور تقسیم کے نتیجہ میں جب مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا اور انکی دینی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی تباہ کرنے کے پروگرام بننے لگے تو مولانا عملی اقدام سے الگ نہ رہ سکے اور سب سے پہلے آپ نے اپنے رفقاء کے ساتھ دینی تعلیم کی اشاعت اور جدوجہد کا پروگرام بنایا۔ یہ اسکیم بڑے زور و شور سے چلی اور گاؤں گاؤں، گھر گھر اسکی آواز پہونچی اور پورے مشرقی یوپی میں قصبات و دیہات میں دینی تعلیم کے مدارس و مکاتب قائم ہوگئے۔ بعد میں وہ ابتداء والی سرگرمی اگرچہ باقی نہیں رہی تاہم ابھی تک پوری طرح جان باقی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی مرد خدا غیب سے بر آمد ہو اور ایک کام کر جائے۔ اسی سلسلے کی کڑیاں مجلس مشاورت کا قیام اور ہفتہ وار 'ندائے ملت' کا اجراء تھا۔ مجلس کا انعقاد دوسرے بعض اکابر کے ساتھ مولانا منظور صاحب کا بڑا کارنامہ تھا۔ اور 'ندائے ملت' مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی زیر ادارت جاری ہوا تھا۔ قانونی طور پر تو معلوم نہیں مگر ذاتی طور پر میں نے دیکھا تھا کہ یہ اخبار بھی مولانا نعمانی ہی کی زیر نگرانی شروع ہوا تھا۔ ابھی حال میں مولانا عتیق الرحمٰن کے الفرقان میں شائع شدہ اداریوں کا ایک مجموعہ 'راستے کی تلاش' شائع ہوا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ مجموعہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں چھپے اور ہندوستان کے ہر مسلمان کے ہاتھ میں پہونچے۔ یہی نہیں بلکہ راستے کی اس تلاش کیلئے ان مضامین میں اشارہ کئے ہوئے لائحۂ عمل کی بنیاد پر ایک ہندستان گیر تحریک چلائی جائے۔ کچھ بعید نہیں کہ مسلمان انگڑائی لیکر اٹھ کھڑا ہو اور یہ خستہ و درماندہ قافلہ منزل کی طرف ایک بار پھر گامزن ہو جائے ؎

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

الفرقان کے ان اداریوں کا تذکرہ اسلئے سامنے آگیا کہ اگر ندائے ملت کے مقالات اور اداریوں کو اسی طرح جمع کر کے شائع کیا جائے تو شاید بڑی بیداری کا سبب ثابت ہو۔

مولانا منظور صاحب کی تالیفات اور مقبول عوام و خواص تصنیفات 'اسلام کیا ہے؟' 'معارف الحدیث' 'تذکرہ مجدد الف ثانی' 'آپ حج کیسے کریں؟' وغیرہ وغیرہ کم وبیش چالیس

کتابیں اس قابل ہیں کہ اس مضمون میں انکے تعارف کا پورا پورا حق ادا کیا جائے۔ مگر بات نکلے گی تو پھر بہت دور تک جائیگی۔ قلم کو روکا نہ جائے تو لذید حکایت طویل تر ہوتی جائیگی۔ کسی طرح صفحات اور وقت کی گنجائش میں کھینچ تان کر بھی لی جائے تو قارئین کے صبر کے پیانہ پر کیسے قابو پایا جائے۔ ؎

سو دا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر　　　اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہونچ گئی۔ ذکر یہ تھا کہ بچپن میں الفرقان کے آخری صفحہ پر اس آیت من انصاری الی اللہ کے ساتھ جو اپیل کی گئی تھی اسکی حلاوت و بلاغت ذہن پر آج تک اسی طرح تر و تازہ ہے۔ ہزاروں اعلانات نظر سے گذرے اور سیکڑوں اشتہارات پڑھے مگر ایسا موثر اور بلیغ اعلان دیکھنا یاد نہیں آتا۔

ایک آخری حکایت رہی جا رہی ہے۔ حضرت مولانا ر
عاجز پر کیسی کیسی شفقت فرماتے تھے، کتنی محبت کرتے تھے، یہ تذ
یہی چاہتا ہے کہ پورا قصہ صفحات قرطاس پر الٹ دیا جائے مگر
درمدح خود کی قباحت بھی ہے۔ بزرگوں کے احوال میں بعض مضامین اور [illegible]
مولفین نے گھما پھرا کر سارا قصہ اپنی ہی تعریف اور بڑائی پر ختم کر ڈالا ہے اسلئے اس باب کو یہیں تہہ کر دینا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

دسمبر ۹۷ء کی کوئی تاریخ تھی جب مجھے حضرت مولانا منظور صاحب نعمانیؒ کی زیارت سے آخری بار مشرف ہونے کا موقعہ ملا۔ حالت دیکھ کر دل پر شدید صدمہ گذرا، ہلنا جلنا مشکل تھا، مجھے دیکھ کر بیتاب ہو گئے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اٹھ کر بیٹھنا چاہا مگر اتنی سکت کہاں تھی۔ اشارہ سے بیٹھنے کی خواہش کی۔ خدام نے مشکل سے بٹھایا۔ میرے ہاتھ چومے، میرے سر پر ہاتھ رکھنا چاہا مگر ہاتھوں میں یہ طاقت بھی نہ تھی۔ میں نے سر جھکا کر ہاتھوں کے قریب کر دیا اور آخر کار یہ نعمت نصیب ہو گئی۔ بات کرنی چاہی مگر آواز نہ نکلی۔ دماغ نے سوچا کہ آج اچھی طرح زیارت کر لو، آئندہ یہ مقدس اور مبارک چہرہ دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو، ہاتھوں اور پیشانی کو جی بھر کر بوسہ دے ڈالا کہ پدرانہ شفقت کا یہ لمحہ پھر ملے یا نہ ملے۔ ؎

گلوں کو دیکھ لے جی بھر کے بلبل
خبر کیا پھر بہار آئے نہ آئے

مگر دل نے کہا کہ ایسا نہ ہوگا، اللہ نے چاہا تو سال بھر بعد پھر زیارت ہوگی، بہر حال کسی نہ کسی طرح دکھے ہوئے دل سے رخصت ہونا ہی پڑا، یہ آنکھیں کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب کو روتی ہیں۔ اس دل نے کتنی عظیم الشان ہستیوں کا ماتم کیا ہے۔ مگر مولانا کے وصال سے تو ایسا معلوم ہوا کہ سر پر سے آسمان ہی ہٹ گیا ہو ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

لکھنؤ سے واپسی کے دس ہی بارہ دن کے بعد اطلاع ملی کہ مولانا اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ برد الله مضجعه و اسکنه الله فی اعلیٰ جناته — سدا رہے نام اللہ کا۔

صوفی رحمت اللہ صاحب(۱)
مظہر العلوم، نوگڈیاں۔ بہرائچ

ماں باپ سے زیادہ شفیق

حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کا حادثہ ہم لوگ
ہے، حضرت کی رحلت سے ہم لوگ یتیم ہوگئے۔ کوئی باپ اپنے بیٹے
طرح کی خیر خواہی، دینی ہو یا دنیاوی نہیں کر سکتا، جتنی خیر خواہی
ملاقات پر خوش ہوتے، محبت سے پیش آتے، گھریلو حالات یہاں تک کہ کھیتی باڑی کے حالات
دریافت فرماتے، بچوں کی تعلیم کے بارے میں اور مدرسہ کے بارے میں پوچھتے، اس کے بعد
دعائیں دیتے، نجی، یا مدرسہ کا کوئی اہم کام یا ضرورت بتلاتا تو فوراً ہاتھ اٹھادیتے، اور خوب الحاح
وزاری کے ساتھ دعا مانگتے جو کام مشورہ طلب ہوتا اس کے لئے مشورہ دیتے اور فرماتے، حافظ جی
سے مشورہ کر لینا (مراد حافظ محمد اقبال صاحب مدظلہ مہتمم مدرسہ فرقانیہ گونڈہ)۔

حضرت مولانا کے تعلق سے پہلے ہم لوگ شرک وبدعات وخرافات میں مبتلا تھے۔
یہاں تک گمراہی تھی کہ ہمارے والدین، دادا، پردادا، تعزیہ رکھتے، گاؤں اور قرب وجوار میں
محرم کے دنوں میں تعزیہ کا بہت اہتمام کرتے، محرم میں جو باجے بجاتے ہیں اس کا بھی انتظام
رکھتے تھے، والد صاحب دو ڈھول، دو جوڑ جھانجھ، اور دو تاشے رکھتے، گاؤں کے لوگوں کو یہ سب
بجانے کے لئے دیتے، ہمارے دادا اور والد صاحب اور پورا خاندان سلون کے پیر صاحب سے
مرید تھے، یہ سال میں ایک بار ضرور آتے، اور ہفتہ عشرہ ہمارے ہی چوپال میں ٹھہرتے اور شرک
وبدعت کی تعلیم دیتے، ایک مرتبہ یہ پیر صاحب آئے تو والد صاحب نے اسی چوپال میں ان کی

یا۔

(۱) صوفی صاحب حضرت مرحوم کے وابستگان دامن میں سے ہیں، ان کا مضمون اس رشتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھنا چاہئے۔

چارپائی بچھادی، جہاں آدھے چوپال میں تعزیہ رکھا تھا پیر صاحب نے دیکھا کہ تعزیہ زمین پر رکھا ہے۔ والد صاحب پر بہت خفا ہوئے اور ڈانٹ کر کہا تم نے تو غضب کردیا، امام حسینؓ کو زمین پر رکھا ہے اور ہم کو چارپائی پر بیٹھنے کے لئے کہہ رہے ہو، بہر حال چارپائی کھڑی کردی گئی، جاڑے کا مہینہ تھا، پیال زمین پر ڈالا گیا اور پیر صاحب کا بستر زمین پر لگایا گیا۔

بہرائچ میں مدرسہ نور العلوم اور نور العلوم کے بانی حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن نامی رحمۃ اللہ علیہ کو ہمارے والد صاحب جانتے تھے، مگر ان پیر صاحبان نے بد ظن کر رکھا تھا، اور بتلاتے رہتے تھے کہ مدرسہ نور العلوم مت جانا، یہ لوگ گمراہ ہیں، یہ بزرگوں کو نہیں مانتے، اللہ تبارک تعالیٰ مولانا محفوظ الرحمٰن نامی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کو نور سے بھر دے، جنھوں نے مدرسہ نور العلوم قائم کر کے علم کی شمع روشن فرمائی، اور بہت سے علماء تیار ہوئے، مدرسہ نور العلوم ہی کے فارغین میں ایک مولانا عبد الرحیم تھے جن سے ہم لوگوں کا تعلق ہوا، اور وہ ہمارے یہاں تشریف لانے لگے، ان سے کچھ دین کی روشنی معلوم ہونے لگی، ان مولوی صاحب سے بہت تعلق ہو گیا، یہ مولوی صاحب بہت با اخلاص اور ملنسار تھے اور بہت ہی محبت سے بات کرتے تھے، ہمارے والد صاحب بھی ان سے بہت متاثر اور مانوس ہو گئے، بدعتی پیروں کی قلعی کھلنے لگی، پیر صاحب سے بد ظنی پیدا ہوئی، مولوی عبد الرحیم صاحب سے مشورہ کیا گیا کہ ہم لوگوں کو کوئی صحیح پیر بتلائیں۔ یہ مولوی عبد الرحیم اس وقت ضلع بستی میں کسی مدرسہ میں پڑھاتے تھے، اور اس علاقہ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کئی بار تشریف لے گئے تھے، حضرت مولانا نعمانیؒ صاحب سے مولوی عبد الرحیم بہت متاثر تھے، انھوں نے مشورہ دیا کہا آپ لوگ مولانا نعمانی صاحب سے بیعت ہو جائیں، بتلایا کہ علماء تو اور بھی بہت ہیں مگر آپ لوگوں کو نعمانی صاحب سے بہت فائدہ ہو گا، کہ آپ لکھنؤ رہتے ہیں اور وہاں تبلیغی مرکز ہے، جماعتوں سے بھی جوڑ ہو جائے گا، علاقہ میں دین کا سلسلہ چل پڑے گا۔

ہم نے مولانا عبد الرحیم صاحب سے گذارش کی کہ آپ مولانا نعمانی صاحب سے ملاقات کرادیں، انھوں نے کہا کہ مولانا مدرسہ فرقانیہ گونڈہ تشریف لاتے رہتے ہیں، مدرسہ فرقانیہ مولانا کی آمد کا پروگرام معلوم کر کے بتلائیں گے، چند دنوں کے بعد مولانا عبد الرحیم صاحب گھر تشریف لائے، اور یہ خوشخبری سنائی کہ گونڈہ مدرسہ فرقانیہ میں کانفرنس ہونے والی ہے، اسمیں ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کرام تشریف لائیں گے تو اسمیں حضرت مولانا نعمانی صاحب ضرور تشریف لائیں گے، اور مزید یہ بھی فرمایا کہ حافظ محمد اقبال صاحب جو مدرسہ

فرقانیہ میں درجہ حفظ کے استاذ ہیں حضرت مولانا نعمانی صاحب کا حافظ جی سے بہت تعلق ہے۔ آپ لوگ پہلے حافظ جی سے ملاقات کر لیجئے گا، وہ مولانا سے ملادیں گے۔ کانفرنس کی تاریخ آئی ہم کئی آدمی گونڈہ حاضر ہوئے، اس کانفرنس میں قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالوفاء صاحب، مولانا محمد قاسم شاہجہاں پوری، مولانا محفوظ الرحمن نامی، ناظم مدرسہ نورالعلوم بہرائچ، اور بہت سے علماء تشریف لائے تھے، اس زمانہ میں مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے مہتمم مولانا افضال الحق صاحب تھے، اسوقت مدرسہ فرقانیہ میں مسجد نہیں تھی، مدرسہ سے پورب تھوڑی دور پر مسجد تھی، عصر کی نماز کے وقت جب سب لوگ نماز کے لئے مسجد جانے لگے، تو ایک صاحب سے معلوم کرا[illegible]
محمد اقبال صاحب کون ہیں، انھوں نے بتلایا کہ وہ حافظ صاحب ہیں
کیساتھ نماز کے لئے جارہے ہیں، آگے بڑھ کر حافظ جی سے بات کی [illegible]
سے بات کی، اور فرمایا کہ مغرب سے پہلے یا بعد میں ہم سے مل لینا، [illegible]
بات کیا، حافظ جی نے فرمایا کہ ہم نے مولانا صاحب سے بات کر لیا ہے [illegible]
فجر کی اذان سے قبل آجائیں ہم اور حاجی رحمت اللہ صاحب ثانی اور عظیم اللہ ماموں اسی وقت پہونچ گئے حضرت نے بیعت فرمایا، بہت دیر تک دعائیں دیں، کچھ ہدایتیں کیں، کچھ تسبیحات پڑھنے کی بتلائیں، اور فرمایا کم سے کم مہینہ میں ایک خط اپنی حالت لکھ کر بھیج دیا کرنا، اور ہمارے یہاں مرکز میں آنے کی کوشش کرنا، اور پتہ بھی نوٹ کرادیا۔

ہم نے اور بھائی رحمت اللہ صاحب ثانی نے مرکز جانا شروع کر دیا، دین کی باتیں معلوم ہونے لگیں، تعزیہ اور محرم میں جو بدعتیں و خرافات ہوتی تھیں، ان سے نفرت ہونے لگی، والد صاحب اور گاؤں گھر کے لوگ دین سمجھنے لگے، ایک دن وہی پیر صاحب سلون والے آئے، میں کہیں گیا ہوا تھا، والد صاحب نے پیر صاحب کو ادب واحترام سے بٹھایا، اور پیر صاحب سے ہماری ساری داستاں کہہ سنایا، والد صاحب نے کہا کہ رحمت اللہ لکھنؤ جاتے ہیں، ایک وہاں مولانا ہیں ان سے ملتے ہیں، وہ ان کو بہت چاہتے ہیں، وہاں جماعت کا کام ہوتا ہے، رحمت اللہ بہت باتیں دین کی سیکھ کے آئے ہیں، اور بتلاتے ہیں، والد صاحب نے اپنے سیدھے پن سے سب پیر صاحب سے کہہ سنایا، والد صاحب نے سمجھا تھا کہ پیر صاحب رحمت اللہ سے خوش ہو جائیں گے، لیکن اسکا الٹا ہوا، یہ سب سننے کے بعد پیر صاحب بہت خفا ہو گئے، اور والد صاحب کو بہت ڈانٹا اور بہت

غیظ و غضب میں ہو کر والد صاحب پر برستے رہے، اور کہتے رہے کہ تیرا لڑکا گمراہ ہو گیا، وہابی ہو گیا، اب تو تباہ ہو جائیگا، مٹ جائیگا، تیرے لڑکے نے بڑا غضب کر دیا، یہ سب کہہ کر اور بہت ناراض ہو کر دوسروں کے گھر چلے گئے، میں گھر آیا والد صاحب نے داستان سنائی اور بتلایا کہ پیر صاحب بہت ناراض ہو کر چلے گئے ہیں، کیا کیا جائے، ہم نے کہا چلے جانے دو، اللہ ہر چیز کا مالک ہے، پیر کے اختیار میں کچھ نہیں، والد صاحب خاموش ہو گئے، صبح معلوم ہوا کہ پیر صاحب فجر کی اذان سے قبل ہی گاؤں سے چلے گئے، پھر کبھی اس گاؤں میں آنے کا نام نہیں لیا۔

کئی بار لکھنؤ مرکز سے جماعتیں آئیں، حضرت مولانا نعمانی صاحب بھی تشریف لائے، حضرت مولاناؒ کے ہمراہ محترم حافظ محمد اقبال صاحب بھی تشریف لاتے رہے، گاؤں کے کافی لوگ بیعت ہوئے، ہمارے والدین اور پورے گھر والے بیعت ہوئے اور ساری بدعتوں، برائیوں سے توبہ کی، تعزیہ کو دفن کر دیا، دوسرے گاؤں کے لوگوں نے مشورہ دیا کہ تعزیہ نہیں رکھنا ہے تو دوسروں کو دیدو، چونکہ تعزیہ کاٹھ کی تھی بہت مضبوط بنی تھی، ہم نے کہا، دوسرے کو دیدیں گے تب بھی یہ گناہ ہوتا رہیگا اور ہم بھی اس گناہ میں ملوث رہیں گے، اسلئے دفن ہی کرنا بہتر ہے۔ محترم مولاناؒ اور حافظ جی نے مکتب پر توجہ فرمائی، محترم حافظ جی نے مجھے بھی مدرسہ میں پڑھانے کیلئے ارشاد فرمایا، ہم نے بھی مدرسہ میں پڑھانا شروع کیا، میں نے اپنے نانا صاحب کے پاس قرآن پاک کا ناظرہ پڑھا تھا حافظ جی جب ندوۃ العلماء لکھنؤ میں درجہ حفظ میں پڑھانے کے لئے تشریف لائے تب حافظ جی نے مولانا صاحب سے ہمارے بارے میں مشورہ کیا کہ رحمت اللہ کچھ دن کے لئے ہمارے پاس دارالعلوم آجائیں اور قرآن پاک کی اصلاح کر لیں، پڑھنے پڑھانیکا کچھ سلیقہ آجائے، حافظ جی کے حکم سے دارالعلوم گیا، حافظ جی کو قرآن پاک سنانا شروع کیا، ہمارے کھانیکا بار حضرت مولانا نے برداشت کیا، کھانے کے پیسے دارالعلوم کے مطبخ میں جمع کر دیا، اور ہم کو مطبخ سے کھانا ملتا رہا، ندوہ سے واپسی پر مدرسہ میں پڑھاتا رہا، مدرسہ میں جو ضرورت ہوئی تعلیمی ہو یا تعمیری، حافظ جی سے اور مولانا صاحب سے عرض کرتا رہا، مدرسہ کی کسی ضرورت پر حضرت مولاناؒ سے دعاء کیلئے کہتا تو حضرت فرماتے، دعا بھی کرونگا، اور دوا بھی، اور حضرت بقدر ضرورت دریافت فرما کر مالی تعاون فرما دیتے۔

ہم ایسے حقیر ذلیل، دیہاتی، جاہل سے جو کسی مصرف کے نہیں تھے حضرت بڑی محبت فرماتے، مرکز پہونچنے پر پہلے کھانا پوچھتے اور کھلاتے، فجر کی نماز کے بعد کبھی ہم کو گھر آنے کیلئے جلدی ہوتی اور چلنے لگتا تو حضرت حکماً روکتے اور اندر تشریف لیجا کر شام کا جو بچا ہو تا وہی بلا تکلف

عنایت فرماتے اور فرماتے کھا کے جاؤ، تم تو صبح کھاتے ہو، کھلاتے رہتے اور مسکراتے رہتے، اماں ابا نے اتنی محبت نہیں کی جتنی شفقت و محبت مولانا صاحب فرماتے تھے چلتے وقت کچھ روپے بھی عنایت فرماتے، نہیں لیتا تو اصرار کر کے دیتے، لیکن حضرت کبھی اپنی تعریف سننا گوارہ نہیں فرماتے تھے، شروع میں تعلق ہونے کے بعد ہم نے خط لکھا، القاب میں، آقائی مولائی، لکھدیا، حضرت نے تحریر فرمایا، آقائی مولائی ایسے بڑے بڑے الفاظ مت لکھنا۔

مدرسہ کے ہال کمرے میں پختہ فرش نہیں تھا، فرش بننے کے لئے حضرت سے دعا کی گذارش کی، حضرت نے بدست محترم حافظ محمد اقبال صاحب مد ظلہ رقم عنایت فرمائی، اور فرش بن گیا، بچے فرش پر بیٹھ کر پڑھنے لگے، ہم نے حضرت کے پاس کچھ تعریفی الفاظ لکھدیئے، حضرت نے جواب میں لکھا کہ، مجھے اپنی تعریف کی رشوت کی ضرورت نہیں

دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں، بس اللہ کا شکر ادا کرو، اللہ قبول فرمائے

دبولیا بانس گاؤں کے احباب مولانا منفعت علی مرحوم مولا

عبد القدیر خاں صاحب، حاجی عبد الوحید خاں صاحب نے خواہش کی

یہاں بانس گاؤں تشریف لائیں، حضرت سے گذارش کی گئی حضرت

حالانکہ اسوقت قیصر گنج سے بانس گاؤں جانے کیلئے راستہ اچھا نہیں تھا، راستے میں ندی بھی پڑتی تھی، بانس گاؤں کے احباب بیل گاڑی لائے تھے، حضرت بیل گاڑی پر بیٹھے، کچھ دور چل کر بالو پڑتا تھا، بالو میں بیلوں کو گاڑی کھینچنے میں حضرت نے تکلیف محسوس کی فوراً گاڑی سے اتر پڑے اور کافی دور تک جہاں تک بالو تھا پیدل چلتے رہے، بانس گاؤں پہونچ کر وہاں بہت پر درد تقریر فرمائی، لوگ بہت متاثر ہوئے، بہت بڑا مجمع ہوا تھا، بہت سے لوگ بیعت بھی ہوئے، ان کے دینی تعلق و محبت دیکھ کر حضرت بہت خوش ہوئے، بہت دعائیں دیں، چلتے وقت ان لوگوں نے کچھ رقم پیش خدمت کی، حضرت نے قبول نہیں فرمایا، ان لوگوں نے بہت اصرار کیا تو حضرت نے صرف کرایہ جوڑ کرلے لیا۔

قیصر گنج سے تقریباً ایک میل اتر موضع برخوردارہ پور کے حاجی دین محمد صاحب تھے جب مولانا صاحب ہمارے یہاں تشریف لاتے تو حاجی صاحب اپنے یہاں سے کافی آدمی اپنے ہمراہ لاتے، اور بہت غور و فکر کیساتھ تقریر سنتے، ایک بار بہت عاجزی کر کے حضرت کو اپنے یہاں لے گئے وہاں کافی آدمی جمع ہوئے، دین کی باتیں ہوئیں وہاں بھی لوگ بیعت ہوئے، شرک ابدعت سے لوگوں نے توبہ کی، نماز پڑھنے کا عہد کیا، پھر حضرت سے گذارش کی، حضرت

، یا

جماعت کے ہمراہ تشریف لائے، اکی کندیلہ اور میر گنج وغیرہ تشریف لے گئے، میر گنج جسکو ہم لوگ بدعت کا گڑھ کہتے تھے، جرول سے میر گنج جانے کے لئے یکہ کیا گیا تھا، لیکن راستہ ناہموار تھا، گھوڑے کو یکہ کھینچنے میں تکلیف ہو رہی تھی حضرت پیدل تشریف لے گئے انھیں بزرگوں کی برکت کا نتیجہ ہے کہ میر گنج میں اپنا مدرسہ قائم ہو گیا علمائے کرام کی آمد ہونے لگی، کندیلا میں بھی حضرت تشریف لے گئے، وہاں بھی اجتماع ہوا، لوگ جمع ہوئے، دین کی باتیں سنیں، انھیں اللہ والوں کی برکت ہے کہ کندیلا میں تبلیغی جماعت کا کام ہو رہا ہے۔ مسجد، مدرسہ ترقی پر ہیں۔

ہمارے ہی گاؤں سر دو نپورہ کے مولوی احمد حسین صاحب جو اس وقت بہرائچ سرکاری ماڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے، حضرت مولانا سے بیعت کے ارادہ سے لکھنؤ مرکز ہمارے ساتھ تشریف لے گئے، اس وقت مولوی صاحب داڑھی نہیں رکھتے تھے، ہم نے مولانا صاحب سے تنہائی میں عرض کیا کہ یہ مولوی صاحب جو ساتھ آئے ہیں، بہت نیک، پڑھے لکھے آدمی ہیں، حضرت سے بیعت ہونا چاہتے ہیں، مگر ابھی داڑھی نہیں ہے، حضرت ہنسنے لگے اور فرمایا انشاء اللہ داڑھی بھی ہو جائے گی، مولوی صاحب بیعت ہوئے، اسی وقت سے داڑھی رکھ لی، لکھنؤ مرکز سے ایک بڑی جماعت گورکھپور، بستی، وغیرہ کی طرف جانے کے لئے نکلی، جس میں حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ، حاجی بادشاہ علی، سید لیاقت حسین، ڈاکٹر فیض اللہ، حاجی عبد القوی وغیرہ تھے، اسی سفر میں اللہ نے ہمیں بھی توفیق عطا فرمائی، جماعت کے ساتھ ۲۲ دن رہ سکا، میں حضرت مولانا صاحب ہی کے قریب سوتا تھا، سوتے وقت مولانا روزانہ فرمادیتے کہ رحمت اللہ تہجد کے وقت آنکھ کھلے تو ہمیں بھی جگا لینا لیکن ۲۲ دن حضرت کے ساتھ رہا، ایک دن بھی ہم کو جگانے کی نوبت نہیں آئی، ہماری آنکھ کھلتی تو دیکھتا کہ حضرت وضو کر رہے ہیں، یا نماز پڑھ رہے ہیں، یا دعا میں مشغول ہیں حالانکہ دیر میں سونا ہوتا تھا، دیر تک تقریر ہوتی تھی۔

ہم نے حضرت سے اور حاجی بادشاہ علی صاحب سے مرکز میں گزارش کیا کہ ہمارے یہاں کے لئے اب پھر جماعت بھیجی جائے، ہماری گذارش پر اتوار ۲۰ راکتوبر ۱۹۵۱ء کو مرکز سے چار دن کے لئے جماعت آئی، اتوار ۲۰ راکتوبر جرول، دو شنبہ فخر پور، سہ شنبہ کو بہرائچ، چہار شنبہ کو نوگنئیاں اس جماعت میں مولانا محمد ثانی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے تھے، حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ سے کوئی بہت ضروری کام کی خبر آجانے سے واپس تشریف لے گئے تھے، صرف ایک دن جرول میں قیام فرمایا تھا۔ اور رات میں تقریر فرمائی، بہت زیادہ مجمع ہوا تھا،

تبلیغی کام کے مقصد کو بہت ہی اچھے انداز میں سمجھایا تھا، مولانا عبدالجلیل رحمۃ اللہ علیہ بہت متاثر ہوئے تھے، تنہائی میں مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالجلیلؒ دیر تک گفتگو کرتے رہے تھے۔ بعد میں مجھ سے حضرت نے فرمایا کہ تم نے کبھی بتلایا نہیں کہ جرول میں ایسے بزرگ عالم رہتے ہیں

والد صاحب کے انتقال پر ہم نے حضرت کو دعائے مغفرت کے لئے لکھا تھا ، والد صاحب کی پہلے کی زندگی بدعت کے کاموں میں گزری، بعد میں حضرت سے بیعت ہونے پر توبہ اور اچھے اعمال کی توفیق اللہ نے دی، حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے والد صاحب مرحوم کے انتقال کا حال معلوم ہوا، ان کا حق تھا اور حق ہے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت ورحمت کی دعا کا اہتمام کیا جائے، الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے بڑی عمر نصـ
زندگی سے توبہ واصلاح کی توفیق بھی عطا فرمائی، اگر آخری وقت ـ
نصیب ہو جائے تو کافی ہے، الحمد اللہ ان کو تو اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے
اللہ تعالیٰ مغفرت کا معاملہ فرمائیں گے، اور تمہاری دعاؤں سے انشاء
گا۔ تمہارے لئے اور تمہارے والد مرحوم کے لئے دعاء کرتا ہوں اور ...
ہوں۔ والسلام محمد منظور نعمانی

۱۹ نومبر ۱۹۷۹ء

حضرت مجھ ایسے حقیر ذلیل دیہاتی سے کسقدر محبت فرماتے تھے ایک بار حضرت نے تیس روپے منی آرڈر بھیجا، اور منی آرڈر فارم کے نیچے تحریر فرمایا کہ "صوفی رحمت اللہ آج میرے دل میں آیا کہ تمہارے گھر بھر کی دعوت کروں، اسلئے تیس روپے منی آرڈر ہے"

حضرت مولانا کی محبت والفت وکرم کے بیشمار واقعات ہیں، ایک واقعہ بتا کے بس کرتا ہوں حضرت کی دعاؤں سے اللہ نے مجھ ایسے کمزور وبے بس کو حج کی سعادت توفیق فرمائی، حج سے واپسی پر حضرت سے ملنے کے لئے حاضر ہوا ، اس وقت حضرت کی طبیعت خراب تھی، چلے آنے کے بعد جو خط حضرت نے تحریر فرمایا، ملاحظہ فرمائیں

باسمہ سبحانہ

برادرم وعزیزم صوفی رحمۃ اللہ زیدت حسناتکم . سلام ورحمت
خدا کرے تم مع متعلقین بخیر وعافیت ہو،

جس دن اور جس وقت تم مجھ سے ملنے آئے تھے میری طبیعت کچھ زیادہ خراب تھی،

اسلئے میں تم سے تمہارے مبارک سفر کے بارے میں باتیں بھی نہیں کر سکا اور جب تم نے جانا چاہا تو میں نے نہیں روکا، میری نیت تم کو ہدیہ پیش کرنے کی تھی، وہ بھی اس وقت میں یاد نہ آیا، جب تم جانے لگے تو یاد آیا، تم کو واپسی کے لئے اور اندر آنے کے لئے آواز دی، لیکن تم نکل چکے تھے، سن نہیں سکے بعد میں افسوس ہوا اور قلق ہوا، اب وہ منی آرڈر کے ذریعہ روانہ کر رہا ہوں ، مجھ سے تم کو جو کچھ ملتا ہے، خواہ کسی ذریعہ سے ملتا ہے، اسکو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھنا چاہئے، اور شکر ادا کرنا چاہئے، تمہارے لئے اور تمہارے مدرسہ کے لئے دعاء کرتا ہوں، اور خود دعاؤں کا بہت محتاج ہوں، جب تک زندگی مقدر ہے اللہ تعالیٰ ایمان، اعمال مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت، نعمتوں کا شکر، گناہوں سے استغفار کے اہتمام اور عافیت کے ساتھ پورے فرمائے، مقررہ وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جاؤں، اور ارحم الراحمین اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادے، بس یہی سب سے بڑی حاجت ہے۔

والسلام

محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ

بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(اس خط پر تاریخ نہیں ہے لیکن یہ واقعہ ستمبر ۱۹۸۸ء کا ہے)

☆☆

محمد حسان نعمانی

حضرت ابیؒ علیہ الرحمہ کی ذاتی اور گھریلو زندگی

ابیؒ کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں ایک قریبی مشاہد کی حیثیت سے ان کے ذاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

میرے سن شعور کا آغاز مرکز والے مکان میں ہوا، ان دنوا [illegible] دوسری تھی، حضرت مولانا علی میاں دامت برکاتہم کا قیام ان [illegible] کمرے ہی میں رہتا تھا۔ اگرچہ ان کا گھر (جس میں ان کے برادر [illegible] اور خاندان کے دوسرے افراد رہتے تھے) مرکز سے چند قدم [illegible] لکھنؤ میں ہوتے ان کا قیام مرکز ہی میں ہوتا تھا۔ ابیؒ کا جو وقت [illegible] کاموں میں صرف ہوتا وہ تو گھر میں ان کے کام کے کمرہ میں صرف ہوتا تھا اسکے علاوہ انکا زیادہ تر وقت حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کی معیت ہی میں گذرتا تھا۔ وہ مولانا کے ساتھ ہی ناشتہ کرتے اور کھانا کھاتے، تمام نمازیں بھی ساتھ ہی پڑھتے تھے، جہاں تک یاد ہے اُن دنوں مرکز سے متعلق اور وہاں آنے والے زیادہ تر لوگ دونوں بزرگوں کو چھوٹے مولانا اور بڑے مولانا کے نام ہی سے پکارتے تھے، لیکن میں نے دونوں کو ایک دوسرے کی ایسی تکریم کرتے دیکھا ہے کہ جس سے ظاہر ہی نہیں ہوتا تھا کہ بڑا کون ہے اور چھوٹا کون؟ مولانا مدظلہٗ کے آرام کے وقت ہم میں سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ ذرا سی آواز نکال سکے، ابی رحمۃ اللہ علیہ کبھی سفر میں ہوں تو ممکن ہے کہ ہم نے اپنے بچپنے کی وجہ سے مولانا کے آرام کا خیال نہ کیا ہو ورنہ ہماری ذرا سی آواز نکلی اور سزا ملی ـــ میں کھیل کا زیادہ شوقین تھا اس لئے سزا میرے حصے میں زیادہ آتی۔

اس وقت مرکز والی مسجد موجودہ مسجد کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹی تھی لیکن ان دو بزرگوں کی برکت سے وہ عوام و خواص کی مرجع تھی۔ عصر حاضر کے اکابرین اور اہل اللہ میں سے

---

(۱) مرکز اصلاح و تبلیغ، کچہری روڈ، لکھنؤ

شاید ہی کوئی ایسا ہو جو وہاں نہ آیا ہو، خاص طور پر ماہ صیام اور اسکے آخری عشرہ میں تو اسکی روحانی فضا اپنے شباب پر ہوتی تھی، یقیناً خوش قسمت ہیں وہ جن کو وہ ماحول دیکھنا نصیب ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے مرکز کو بے لوث اور پر خلوص خدمت گذاروں کی ایک ٹیم بھی مہیا کی تھی، جن میں زیادہ تر تہجد گذار تھے اور ساتھ ہی ان بزرگوں پر پروانوں کی طرح نثار بھی —— بھائی عبد السلام (۱) صاحبؒ اور مولوی محمد سلیم (۲) صاحبؒ کے نام ان میں سر فہرست ہیں۔

مرکز والے مکان میں ابیؒ کا پندرہ سال سے زیادہ قیام رہا وہاں عام طور پر ان کی صحت اچھی رہی اس کے بعد نظیر آباد والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ پھر ۱۹۷۴ء میں دیوبند میں رکشا الٹ جانے کے نتیجے میں اکسیڈنٹ کا شکار ہو کر عمر کے آخری پچیس سال زیادہ تر معذوری کی حالت ہی میں گذارے۔

صحت کے دنوں میں ابی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سخت جدوجہد، جفاکشی اور مشقتوں سے پُر تھی، میرے شعور کے آغاز کے وقت ان کی عمر ۵۴-۵۵ سال سے کم نہ ہو گی لیکن اس کے بعد بھی ۱۶-۱۷، سال تک وہ جوانوں سے زیادہ جوان تھے، تکان کے تو لفظ ہی سے وہ نا آشنا تھے، بڑے بڑے اسپورٹس مین بھی جسمانی طور پر اتنے فٹ نہ ہوتے ہوں گے جتنے کہ وہ تھے —— آواز اس قدر زوردار تھی کہ خود بتاتے تھے کہ جب لاؤڈ اسپیکر عام نہیں ہوئے تھے، دس دس ہزار کے مجمع تک اُن کی آواز آسانی سے پہونچ جاتی تھی —— پھر معذوریاں آئیں تو وہ جسمانی حد تک محدود رہیں، دل و دماغ آخر آخر تک جوان رہے، یادداشت بلا کی تھی، برسوں پہلے کہی باتیں انھیں الفاظ میں سنا دیا کرتے تھے جن الفاظ میں خود کہی یا سنی تھیں۔

ابیؒ کی عملی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے تمام اعمال وافعال کو عبادت بنا دیا تھا، ان کے یہاں نہ تو اوراد و وظائف کی کثرت ملتی ہے نہ نوافل کی —— ان کے معمولات میں کوئی ایسا عمل نظر نہیں آتا جو عام آدمی کے لئے مشکل یا دشوار ہو، انھوں نے اپنے عمل سے دین کے "یُسر" ہونے کو ثابت کر دکھایا —— جب تک صحت رہی گھر کا سودا سلف لانے میں کبھی نہ ہچکچائے، اپنی ڈاک خود نمٹاتے اور زکوٰۃ وذاتی رقوم کے ایک ایک پیسے کا حساب خود رکھتے، وقت کی قدر انکے یہاں جیسی تھی وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے، ایک منٹ بھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلا وجہ لوگوں سے ملاقات انھیں پسند نہ تھی کسی دینی فائدے کیلئے لوگ بیٹھیں تو بہت مبارک ورنہ کسی کا بیٹھنا انھیں اچھا نہ لگتا۔ اسی وجہ سے انکے پاس حواریوں کا

---

(۱) متوفی ۱۹۹۲ء ۔ (۲) متوفی ۱۹۸۲ء

جھلک بھی نہ لگ سکا۔

طبیعت میں احتیاط اور احساس ذمہ داری ہر معاملہ میں تھا۔ خطوط لکھاتے تو الفاظ انتہائی نپے تلے ہوتے، اگر کاتب سننے میں غلطی کے باعث یا اپنی فہم کے مطابق جانے انجانے میں الفاظ کی ترتیب میں ردو بدل کر دیتا تو جب دستخط کرنے کیلئے خط پر نظر ڈالتے تو وہاں آکر فوراً رک جاتے اور اسکی اصلاح کراتے، اگرچہ ہمارے خیال میں اس لفظ کی تقدیم یا تاخیر سے جملہ کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہوتا لیکن ایسا لگتا کہ ان کے نزدیک عظیم فرق ہو گیا ہو۔

ان کے کسی نہ کسی فعل سے ان کے کمالِ احتیاط کا ہمیں روز مشاہدہ ہوتا بلا مبالغہ سینکڑوں واقعات اس بابت ذہن میں ہیں لیکن ایک واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ان کے طرز عمل کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

ایک مرتبہ کوئی او ستھی صاحب (اس وقت پورا نام یاد نہیں) ...
لڑ رہے تھے انھوں نے چاہا کہ مسلم گریجوٹ ووٹرس کی حمایت حا...
شائع کی جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہمارے گھر کے ایک بچہ ...
بیٹے کے دوست تھے اس بچے کی ہمّت ابیؒ سے اس اپیل پر دستخط ...
خاموشی سے اس پر ابیؒ کے دستخط کر دیئے۔ جب یہ اپیل مقامی روزنامہ ...
ہوئی اور اس پر ابی رحمہ اللہ کی نظر پڑی تو انھوں نے فوراً اس سلسلے میں ایک تردیدی بیان اشاعت کے لئے قومی آواز کو بھیج دیا اس کا علم کسی طرح او ستھی صاحب کو ہو گیا، تو انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ ابیؒ رحمہ اللہ اپنے تردیدی بیان کی اشاعت پر زور نہ دیں کیونکہ اس سے انکا الیکشن کالعدم ہو سکتا تھا، ان کے لڑکے نے تو رو رو کر محلّہ سر پر اٹھالیا، نیز ہمارے اس عزیز نے اپنی سی کوشش کرلی لیکن ان کے یہاں یہ بات، جو عام طور پر لوگوں کے یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اتنی زیادہ اہمیت رکھتی تھی کہ وہ کسی طرح اپنے تردیدی بیان کی اشاعت روکنے پر راضی نہ ہوئے اور اپنے گھر کے بچے کی غلطی کی پردہ پوشی کا خیال بھی انھیں اس پر راضی نہ کر سکا، انھوں نے نہ صرف قومی آواز کے ایڈیٹر کو فون کر کے اس تردیدی بیان کی اشاعت کی تاکید کی بلکہ بعض دوسرے اخبارات کو بھی اپنا بیان اسی وقت میرے ذریعہ بھیجا۔ انکا فرمانا تھا کہ "یہ معاملہ شہادت کا ہے اور قیامت میں اس کے بارے میں جواب دہی کرنی ہو گی میں ایک ایسے شخص کے بارے گواہی کیسے دے سکتا ہوں جسے میں جانتا تک نہیں"۔

جرأت کے وصف سے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو پوری طرح آراستہ کیا تھا کیسے بھی

حالات ہوں ان کو کبھی خوف زدہ یا پریشان نہیں دیکھا۔ ۴۷ء کے سخت مسلم مخالف حالات اور فرقہ وارانہ فضا میں انھوں نے جرأت کے نمونے پیش کئے، اپنی کتاب "انسانیت زندہ ہے" میں انھوں نے جو چار اہم واقعات نقل کئے ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔

فتنوں کے رد کے سلسلے میں مخالفین نے بارہا انہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دیں لیکن وہ ان سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔ مناظروں کے دور میں اس طرح کی دھمکیوں کے جواب میں انھوں نے لکھا

> "او صداقت کے دشمن ! محمد منظور نعمانی فانی ہے اسکو فنا کیا جاسکتا ہے مگر خدا کا مقدس دین غیر فانی ہے اسکی خدمت بھی غیر فانی ہے اُسکو کوئی نہیں مٹا سکتا، تاریخ عالم شاہد ہے کہ جس نے اس کو مٹانے کا ارادہ کیا تو خود صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اگر بالفرض مجھے اس سلسلے میں موت آئی تو موت ہی میرے کام کے بقاو دوام کی ضامن ہو گی"۔

ابیؒ علیہ الرحمہ فرض نمازیں ہمیشہ با جماعت ہی پڑھتے تھے اور جماعت کو نماز کی پابندی کا بہترین نسخہ بتاتے تھے فرماتے تھے کہ جو جماعت کی پابندی کرنا چاہتا ہے وہ تکبیر تحریمہ میں پہونچنے کی عادت ڈالے ممکن ہے کبھی تکبیر تحریمہ چھوٹ جائے لیکن انشاء اللہ جماعت اسے ضرور ملے گی اور جو نماز کی پابندی کرنا چاہتا ہے وہ جماعت کی پابندی کا خیال کرے اسطرح ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اسکی جماعت چھوٹ جائے لیکن انشاء اللہ اس کی نماز نہیں چھوٹے گی ـــــ اس سلسلے میں انکا ذاتی عمل یہ دیکھا کہ جب معذوری کی وجہ سے مسجد جانے کے قابل نہ رہے تو بھی اپنی امکانی کوشش سے ہر نماز جماعت سے ہی ادا کی۔ جماعت کی خاطر نماز کو مؤخر یا مقدم بھی فرمادیتے اور کبھی جمع بین الصلوتین بھی کرتے، گھر میں کوئی بڑا نہ ہوتا تو گھر کے کسی بچے ہی کو شریک کر لیتے لیکن نماز با جماعت ہی ادا کرتے۔ جب امامت فرماتے تھے تو مقتدیوں کا بے حد خیال کرتے تھے اور اکثر مختصر ہی نماز پڑھاتے تھے۔

نماز میں استحضار کا بے حد خیال رہتا تھا، جہری نماز میں اکثر و بیشتر دیکھا گیا کہ جب بھی آیات موعظت و موہبت آجاتیں آواز بھر اجاتی اور گریہ طاری ہو جاتا۔ خاص طور پر نیت کے وقت استحضار کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ تکبیر کہہ کر نیت باندھ لی اور پھر نیت توڑ کر مقتدیوں سے دوبارہ نیت باندھنے کو کہا، بعد میں کسی کے معلوم کرنے پر بتایا کہ نیت کے وقت استحضار نہیں تھا، فرماتے تھے کہ نیت کے لئے عقد اللسان شرط نہیں استحضار شرط ہے

کہ اس کے بغیر نیت کا اعتبار نہیں۔

ان کی نفل نمازیں اکثر بہت طویل ہوتی تھیں کسی بھی آیت یا دعائیہ کلمہ کو بار بار پڑھتے، ایسا لگتا تھا کہ جب تک دل کی کوئی خاص کیفیت نہ ہو جائے وہ اس سے آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتے ہوں ——— بعض دفعہ قعدہ میں اللھم انی ظلمت نفسی (صرف ان الفاظ کو) درجنوں بار دہراتے سنا ——— خاص طور پر تہجد کی نماز میں جو کیفیت ہوتی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، اس میں گریہ کا زبردست غلبہ ہوتا تھا۔ سجدوں میں ماثورہ دعاؤں کی کثرت اور ان کی ادائیگی کا خاص انداز، ایک بندہ کا اپنے رب سے بلک بلک کر سوال کرنا، یہ ایک عجیب وغریب روح پرور منظر ہوتا تھا ——— چونکہ یہ نماز بالکل تنہائی میں ہوتی تھی اسلئے اس وقت "اخفاء" کے سارے پردے اٹھ جاتے تھے اور صحیح معنوں میں ان کی اصل شخصیت سامنے آتی تھی، اے اللہ ! ہمیں بھی ایسی نمازیں یا انکا کوئی حصہ نصیب فرما

تہجد کی نماز کے بعد جہری ذکر کا معمول تھا، اندازاً ایک ڈیڑھ ... لگتا ہوگا ہم لوگوں کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس ذکر سے وہ کسی خا... ہو رہے ہیں، اُس وقت کے اُن کے سرور کی کیفیت بیان نہیں کی جا...

اپنے بچپن میں ان کو کثرت سے روزے رکھتے دیکھا، خاص طور پر "معارف الحدیث" کی تالیف کے دنوں میں یا الفرقان کے لئے کسی اہم مضمون کی تصنیف کے دوران تو روزے کا معمول ہی تھا، ماہ مبارک میں وہ سحری بالکل آخر وقت میں کھاتے بلکہ اکثر فجر کی اذان شروع ہوتی تو ان کی سحری شروع ہوتی ، فرماتے تھے کہ لوگ احتیاط میں فجر کی اذان وقت سے قبل دے دیتے ہیں۔ سحری کے اوقات میں مساجد سے لاؤڈ اسپیکروں سے روزہ داروں کو جگانے کے سلسلے میں جو شور کا سلسلہ ہوتا اس سے بہت تکلیف محسوس کرتے، ان کی نماز تہجد میں اس سے بہت خلل پڑتا اس شور شرابہ کو وہ بہت غلط سمجھتے تھے، اس سلسلے میں الفرقان میں بھی انھوں نے کئی بار لکھا اور ایک دو دفعہ تو اس بابت اپیل چھپوا کر تقسیم بھی کرائی، افطار میں عجلت فرماتے بسا اوقات مطلع دیکھکر روزہ افطار فرمالیتے۔

زکوۃ کا وہ پورا حساب رکھتے تھے، اپنی زکوۃ پیشگی ادا کرتے رہتے اور ماہ مبارک آنے پر ایک ایک پیسے کا حساب لگا کر حساب بیباق کر دیتے۔ بہت سے عقیدت مند حضرات ان کے ذریعے اپنی زکوۃ کی ادائیگی کراتے تھے وہ اس کا مکمل حساب الگ رکھتے جبتک خود اس حال میں رہے خود لکھتے رہے بعد میں یہ خدمت میرے حصے میں آئی۔

انھوں نے باقاعدہ قرآن کریم حفظ نہیں کیا تھا لیکن پچاس پچپن سال کی عمر کے بعد جب بھائی صاحب، مدظلہٗ نے الفرقان کی ادارتی ذمہ داری پوری طرح سنبھال لی تو انھوں نے قرآن کریم حفظ کرنیکا ارادہ کیا اور اپنی تمام مصروفیات کے باوجود بائیس پارے حفظ کرلئے پھر انھیں احساس ہوا کہ جو کچھ یاد کیا ہے اس کو یاد رکھنا مشکل ہورہا ہے تو اسی کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے رہے، تلاوت کے اوقات کے علاوہ اکثر نفل نمازوں اور خاص طور پر اوابین میں اسکو برابر دہراتے رہتے۔

دعا سے انھیں خاص لگاؤ تھا، اسی وجہ سے "معارف الحدیث" کی جلدوں میں جلد پنجم (جو کتاب الاذکار والدعوات پر مشتمل ہے) سے انھیں زیادہ تعلق نظر آتا تھا۔ عام طور سے معارف کی اس جلد اور اپنی کتاب "نماز کی فضیلت" پڑھنے کیلئے بار بار توجہ دلاتے۔ ہر مشکل مسئلے اور پریشانی کا حل ان کے یہاں دعا اور نماز تھی۔ بیماریوں یا کسی بھی قسم کی تکالیف کے لئے ہمیشہ کوئی دعا ہی پڑھنے کے لئے بتاتے۔ آپریشن کے لئے اوٹی (Operation Theater) جاتے وقت یااللہ یارحمٰن یارحیم پڑھنے کی ہدایت فرماتے۔ شدید درد گردہ اور بعض دوسرے سخت امراض میں انھوں نے اکثر لا الہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ کسی مریض کی حالت مایوس کن ہوتی تو متعلقین کو تلقین فرماتے کہ یا اللہ یا سلام کثرت سے پڑھیں۔ خود ان کی طبیعت کئی مرتبہ زیادہ خراب ہوئی تو ہم لوگوں نے اس بابت ان کی تعلیم کو اپنایا، اور وہ مایوس کن حالت سے باہر آگئے۔

معاشرت و معاملات میں ہدایات ربانی اور خواہشات نفسانی نیز احکام شریعت اور دنیوی مصلحت و منفعت کے مابین کشمکش عبادات وغیرہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ کی بندگی و فرمانبرداری اور شریعت رسول کی تابعداری کا جیسا امتحان اس میں ہوتا ہے۔ کسی دوسرے میدان میں نہیں ہوتا ـــــ مجھے ابیؔ رحمۃ اللہ علیہ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، میں یہ گواہی دے سکتا ہوں کہ وہ معاشرت و معاملات کے باب میں اللہ کے احکام اور شریعت رسول کی کامل تابعداری کرتے تھے، بلکہ اس کے تحت آنے والے زندگی کے ہر پہلو کو انھوں نے احکام شریعت کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

اہل قرابت، ہمسایہ کمزور و حاجت مندوں کا انھیں بے حد خیال تھا۔ نہ جانے ان کی کس کس طرح مدد فرماتے تھے۔ مدد کا بھی ان کا عجیب طریقہ تھا۔ وہ انتہائی خاموشی سے تو ہوتی ہی لیکن اس کی بھی کوشش کی جاتی کہ جس کی مدد کی جارہی ہے وہ اس کا عادی نہ ہو جائے۔ اس لئے

کبھی کبھی یہ قرض کے نام سے بھی کی جاتی ——— اہل خاندان اور تعلق والوں کی چھوٹی ضرورتوں کا وہ خیال رکھتے۔ کسی کی بچی کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ اس کی شادی نہیں ہو رہی ہے تو اس کی فکر کرتے۔ اس کے لئے دعا بھی کرتے اور کوشش بھی۔ کسی عزیز کی عمر زیادہ ہو رہی ہوتی تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی طرف توجہ دلاتے۔

ابیؒ مہمانوں کی تواضع حتی الامکان بہتر سے بہتر کرتے۔ لیکن اس کے لئے اپنے کو کبھی مشکل میں نہ ڈالتے۔ گھر میں جو اچھی سے اچھی چیز میسر ہوتی وہ پیش فرمادیتے۔ ایک طریقہ اور تھا تواضع ضیف کا۔ اور اس کو وہ تھانوی طریقہ بتاتے تھے۔ وہ یہ کہ کبھی کبھی آنے والے مہمان کی خدمت میں کھانے کی رقم ہدیہ فرمادیتے اور فرماتے کہ آج کا کھانا وہ اُن کی طرف سے اپنی سہولت سے کہیں کھالیں۔

کسی مہمان کی آمد کی اطلاع مل جاتی تو اس کا انتظار وقت سے پہلے ش
کے استقبال کی تیاری شروع کر دیتے۔ خاص طور پر حضرت مو
جاتی تو بہت پہلے سے تیار ہو کر ان کا انتظار کرتے۔ اور ہم لوگوں
کے لئے سڑک پر کھڑے ہو جائیں۔ کبھی اس کے خلاف ہو جاتا
آتی سخت ناراض ہوتے۔ آنے والے کسی مہمان کے سلسلہ میں ا
توجہی یا بے اعتنائی کی شکایت ملتی تو بہت خفا ہوتے۔ ایک مرتبہ مولانا حبیب ریحان خان بھوپال تشریف لائے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میں ان کی طرف پوری توجہ نہ دے سکا۔ انھوں نے واپس جا کر ابی علیہ الرحمۃ کو اس کی شکایت لکھدی تو سخت سرزنش کی اور بعد میں احساس ہوا کہ سرزنش غالباً کچھ زیادہ ہو گئی تو یہ سطریں لکھ کر مجھے دیں۔

"معلوم ہے کہ تم اپنے کام میں ایسے منہمک ہوتے ہو کہ کسی طرف توجہ نہیں کرپاتے لیکن تم خود سمجھ سکتے ہو یہ رویہ اخلاقی نقطۂ نظر کے علاوہ کاروبار کے لئے بھی مضر ہے، اگر مناسب سمجھو تو دفتر میں کسی ایسے آدمی کا ہونا ضروری ہے جو آنے والوں سے مناسب بات کرسکے اور دفتر کا کام بھی کرے۔ یہ مسئلہ خود تمھارے لئے قابل غور وفکر ہے، اگر ضرور سمجھی جائے تو مجھ سے مشورہ بھی کرلیا جائے۔

مجھے احساس ہے کہ بعض مرتبہ غصہ میں بہت نامناسب لفظ نکل جاتے ہیں اس پر بہت افسوس ہے۔ استغفار بھی کرتا ہوں۔"

شاید اس پر یقین کرنا آسان نہ ہو کہ اپنے چھوٹوں بلکہ بہت چھوٹوں سے بھی معا

مانگنے میں انھیں ذرا تکلف نہ ہوتا۔ اپنی اولاد یا اپنے خادم کو کبھی کچھ کہدیا تو ان سے فوراً معافی مانگتے، مولوی ارشاد سے تو بعض مرتبہ ایک ایک دن میں کئی کئی مرتبہ معافی مانگتے تھے۔

اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے لئے بھی ابیؒ علیہ الرحمہ کے دل میں نفرت کی کوئی جگہ نہیں تھی ـــــ اگر کسی ذاتی معاملہ میں کسی کا رویہ ان کے لئے تکلیف دہ ہوتا تو اس کا تو جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اس کو معاف کردیتے اور اس کے لئے دعا کرتے، البتہ اگر مخالفت کسی دینی امر کی ہوتی تو اس بات کی وضاحت کرنا اور حق کو آشکارا کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس کے نازیبا رویہ کی کوئی شکایت نہ کرتے ـــــ خاص طور پر قضیۂ دارالعلوم دیوبند کے دوران ان کے خلاف کیا کچھ نہیں لکھا گیا، اور لکھنے والے بھی ان کے اپنے حلقہ ہی کے تھے۔ ان میں سے ایک ہمارے جمیل بھائی مرحوم (ایڈیٹر روزنامہ عزائم لکھنؤ) تھے۔ ابیؒ علیہ الرحمہ ان کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے، وہ بھی ابیؒ کی اسی طرح عزت کرتے تھے اور ابا جی ہی کہا کرتے تھے۔ لیکن قضیہ دارالعلوم کے مسئلے میں انھوں نے پچاس سے زیادہ قسطیں اس بابت ابیؒ کے خلاف "عزائم" کے ادارتی کالم میں لکھ ڈالیں اور ان میں نفس مسئلہ پر بحث کم اور ذاتیات پر زیادہ تھی اور سارا زور قلم شخصیت کو مجروح کرنے پر صرف کیا گیا ـــــ ابی علیہ الرحمہ ان دنوں خاص طور پر "عزائم" کا پابندی سے مطالعہ کرتے اگر کسی دن اخبار نہ آتا تو ہم لوگوں کو بھیج کر منگاتے اور ان کے اداریے پڑھتے۔ کبھی پڑھتے پڑھتے رونے لگتے، کبھی کلمۂ استغفار پڑھنے لگتے لیکن جمیل بھائی مرحوم کے خلاف انھوں نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا، اگر ہم میں سے کسی نے اس سلسلے میں ان کے تاثرات جاننا چاہے تو ابیؒ نے ان کے لئے صرف دعائیہ کلمات ہی کہے، اداریئے پر کسی قسم کے تبصرے سے ہمیشہ گریز کیا۔

ابیؒ کے ساتھ جمیل بھائی کے مذکورہ رویہ کے باوجود جب وہ بہت زیادہ بیمار ہوکر شہر کے بلرامپور اسپتال میں داخل ہوئے تو ابیؒ کی پریشانی دیکھنے کے قابل تھی، ابیؒ کی طبیعت بھی ان دنوں کافی خراب تھی لیکن جیسے ہی جمیل بھائی مرحوم کے بارے میں معلوم ہوا ان کی مزاج پرسی کے لئے پہلے تو مجھے بھیجا اور پھر اگلے روز مجھے ساتھ لیکر خود بھی اسپتال تشریف لے گئے۔ جمیل بھائی کا عجیب حال ہوا، وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لئے ابیؒ کو صرف دیکھتے رہے، بہت زیادہ بولنے والا وہ شخص اس وقت ایک لفظ بھی نہ بول سکا صرف نم آنکھوں سے اپنے طرز عمل کی معذرت ہی کرتے رہے، اللہ تعالیٰ جمیل بھائی کی مغفرت فرمائے، یہی مرض انکا مرض الوفات ثابت ہوا۔

ابیؒ علیہ الرحمہ یوں تو بہت خوش مزاج تھے، سب سے چمکار کر بولتے ـــــ چمکارنے کی

عادت ایسی پڑگئی تھی کی بعض وقت اپنے برابر والوں یا عمر میں کچھ بڑوں کو بھی چمکار بیٹھتے اور پھر خود مسکرا کر معذرت کر لیتے ——— لیکن اولاد کے بارے میں وہ کافی سخت تھے، غالباً ان کی تربیت کے لئے سختی کو ضروری سمجھتے تھے۔ چاہتے تھے کہ اولاد زندگی کے ہر شعبے میں آداب اور شریعت کی پوری پابندی کرے اور وہ ظاہری طور پر بھی شریعت کے پورے پابند نظر آئیں۔ اس لئے ان کے شرعی لباس کا بھی خیال رکھتے تھے اور اس میں کافی سختی بھی کرتے تھے، ہم لوگوں کو ہمیشہ کرتا، پاجامہ پہناتے، پاجامہ ٹخنے سے نیچے کبھی نہیں ہوتا تھا، جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو ہمیں بھی اپنے ساتھیوں کی طرح قمیص پہننے کو شوق ہوا، عید کا موقعہ تھا، ہمارے کپڑے ہمیشہ ابیؒ سلواتے تھے اس بار ہم نے خود سلوالئے، عید سے ایک دن قبل کپڑے سل کر آئے تو ابیؒ کی نظر ان پر پڑگئی بس جلال ہی تو آگیا، کالردار قمیص دیکھ کر فوراً قینچی منگائی اور اسکے کالر کاٹ دیئے۔ پھر ہماری سزا یہ ٹھہری کہ ہم کو وہی قمیص عید کے دن پہننی پڑی۔

ابیؒ کو بچوں کا دوستوں میں بیٹھنا، کھیل کود میں وقت صہ
طور پر ترک نماز تو بالکل ہی برداشت نہیں کرتے تھے، بچوں کی غاب
میں ان کی اچھی مرمت بھی کر دیتے تھے لیکن غصے کے بعد ان کا عم
ہے، جب بھی زیادہ غصہ آتا تو اس کے فوراً بعد ہمارے رہائشی مکان ــــ
اور وضو فرماتے، اکثر وضو کے بعد نفل پڑھتے اور دعا واستغفار کرتے۔

ابی علیہ الرحمہ کو رسومات اور اسراف سے بہت نفرت تھی، انھوں نے اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادیاں بہت سادہ انداز میں کیں، بڑے بھائی صاحبان کی شادیاں تو ہمارے سامنے نہیں ہوئیں لیکن بچپن میں ہم ان شادیوں کی سادگی کے بارے میں والدہ مرحومہ سے بہت کچھ سنا کرتے تھے، البتہ بہنوں کی شادیاں ہمارے سامنے ہوئیں، ہماری بڑی ہمشیرہ کا عقد ابیؒ نے اپنے بھتیجے برادرم مولانا محمد زکریا سے اور چھوٹی ہمشیرہ کا اپنے بھانجے برادرم نظیف الرحمٰن سنبھلی سے کیا۔ یہ شادیاں اسی طرح سادہ اور بے رسوم تھیں۔

ہم دو بھائیوں یعنی میرا اور مولوی سجاد میاں کا ولیمہ مشترک ہوا تھا، ابی علیہ الرحمہ بہت ہی کم لوگوں کو شرکت کی دعوت کی اجازت دے رہے تھے جبکہ ہم دونوں اور خاص طور پر برادر عزیز مولوی سجاد میاں کا حلقہ خاصا وسیع تھا، شاید ہم لوگوں کے خیال سے انھوں نے سختی نہیں کی جس کو ہم نے ان کی رضامندی سمجھا لیکن حقیقت اس وقت کھلی جب انھوں نے ولیمہ میں شرکت نہ کی اور کمرے میں مقفل ہو کر بیٹھ گئے۔

ان کی ذاتی اور خانگی زندگی کی ایک جھلک دکھانے کے بعد اس مضمون کو ان کے اپنے نام ایک مفصل اور پُر درد مکتوب پر ختم کرتا ہوں جو میرے لئے ہمیشہ مشعل راہ بنا رہا ہے، اور اپنے اندر افادیت کے ہزاروں پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

عزیز من حسان میاں ! سلمکم اللہ تعالی وعافاکم سلام ورحمت

جیسا کہ میں نے خط کے آخر میں لکھا ہے اسکو محفوظ رکھو اور بار بار تنہائیوں میں پڑھو

میں مہینوں غور و فکر کے بعد اپنا فرض سمجھ کر اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اور تم سے اچھی امید رکھتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں ـــــ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ تم ابھی صاحب اولاد نہیں ہو ـــــ رب کریم اپنے فضل و کرم سے تم کو صالح اولاد عطا فرمائے، جو دنیا و آخرت کے لحاظ سے تمھارے لئے خیر اور رحمت کا وسیلہ بنے۔

میرا اندازہ ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہیں ہوتا وہ اسکا اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ ماں باپ کو اولاد سے کیسا تعلق ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنے حقیقی بھائی اور اپنے باپ کے بارے میں بھی نہیں چاہتا کہ وہ وہ اس سے بڑھ جائیں لیکن اولاد کے بارے میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کو اللہ وہ بھی عطا فرمادے جو مجھ کو عطا نہیں ہوا۔ اُن کی راحت سے دلی راحت و سکون اور ان کی تکلیف سے دلی تکلیف اور بے چینی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ تم کو محفوظ رکھے جب کبھی تم درد گردہ کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہو تمھیں یا کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ میرا حال کیا ہوتا ہے۔ صلوۃ الحاجۃ پڑھ کر دعائیں کرتا ہوں اور جو کچھ بھی کر سکتا ہوں کرتا ہوں، صرف تمھارے ہی ساتھ نہیں تم سب بہن بھائیوں کے ساتھ یہی معاملہ ہے اور یہ بالکل فطری بات ہے اور غیر اختیاری ہے۔

مرنے کے بعد جو کچھ ہونے والا ہے وہ میرے لئے بھی غیب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اسکا ایسا یقین نصیب فرمایا ہے کہ اچھے برے اعمال کے جو نتائج اور ثواب و عذاب کی جو شکلیں قرآن پاک یا رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں ان کو گویا آنکھ سے دیکھتا ہوں۔

ذرا سوچو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیسے انعامات فرمائے ہیں، تم ایسے گھر میں پیدا ہوئے جہاں بقدر ضرورت بلکہ فراغت کے ساتھ دنیا بھی تھی۔ اور اسکے فضل و کرم سے دین بھی۔ تمھاری والدہ مرحومہ ہمارے گھر آنے سے پہلے سے تہجد گذار تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے تمھارے اندر کچھ خاص صلاحیتیں رکھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں ہیں، سخت کوشش اور محنت اور مالی معاملات

میں امانت وغیرہ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے بیوی ایسی عطا فرمائی جس میں میرے خیال میں وہ سب خوبیاں ہیں جو ہونی چاہئیں۔ وہ بفضلہٖ تعالیٰ نماز کے علاوہ تلاوت کی بھی پابند ہے، مجھے اس سے وہ سب راحتیں ہیں جو کوثریا حمیرا سے ہوتی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وہ سب تمھیں نصیب فرمایا جو اس وقت تم کو نصیب ہے۔ اطمینان اور خوشحال زندگی کا سامان۔ تم اللہ تعالیٰ کے ان سب انعامات کو یاد کر کے سوچو کہ تمھارا معاملہ اور رویہ اس کریم کے ساتھ کیا ہے۔

میں دیکھتا بھی ہوں اور رخسانہ کے ذریعہ بھی مجھے معلوم ہے کہ نماز تم قریباً پابندی سے پڑھتے ہو۔ یہ حال نماز نہ پڑھنے سے بلا شبہ بہتر ہے۔ لیکن جماعت کا ترک اور خدا کے گھر سے بے تعلقی یہ بہت خطرناک اور اللہ تعالیٰ کو بہت ناراض کرنے والا عمل ہے۔

یوں تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کا کتنا وقت باقی ہے لیکن مجھے شد[illegible]

میرا وقت اب زیادہ باقی نہیں ہے (اس لئے ضعف کے باوجود آ[illegible]

شیعیت سے متعلق کام مکمل ہو جائے) بہر حال وقت موعود ک[illegible]

میں شدید خواہش ہے کہ میرے سامنے ہی تمہلے اندر وہ تبدیلی آجا[illegible]

کم سے کم صرف تین باتوں کا عزم کر لو [۱] ایک مسجد کی پابندی [۲] دوسرے جو دینی شخصیتیں میری معذوری کی وجہ سے گھر پر آتی ہیں مثلاً حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب اور حافظ محمد اقبال صاحب جیسے حضرات جو اِس زمانے کے اہل اللہ میں سے ہیں اور وہ سب ہی حضرات جو دین کی نسبت سے میرے پاس آتے ہیں ان کے ساتھ حسن تعلق [۳] تیسرے دینی مجالس اور دینی خدمت کے سلسلوں سے کسی نہ کسی درجہ کا ربط و تعلق ـــــــ ان میں سے کوئی بھی نہ محنت طلب کام ہے نہ کہیں آنے جانے کا ـــــــ قرآن مجید میں بھی فرمایا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا جو شخص دنیا میں جن لوگوں سے خاص ربط و تعلق رکھے گا وہ آخرت میں انھیں کے ساتھ ہوگا۔

تم اس خط کو بار بار پڑھو اور اللہ تعالیٰ تم کو جو عزم و ہمت کا جوہر کا دیا ہے اس سے کام لیکر فی الحال صرف ان تین باتوں کا فیصلہ کر لو۔ والسلام (محمد منظور نعمانی)

یکم شعبان ۱۴۰۴ھ، یوم جمعہ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ابیؒ علیہ الرحمۃ کی منشاء اور خواہش کے مطابق زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے، اور میں ان تین باتوں پر پوری طرح عمل کر سکوں جنکا تذکرہ نقل کردہ مکتوب میں کیا گیا ہے، قارئین کرام سے بھی دعاؤں کے اہتمام کی استدعا ہے۔

محمد یحیٰ نعمانی
متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

ناناجان رحمۃ اللہ علیہ

کیا دیکھا ☆ کیا پایا

راقم سطور نے جس وقت ہوش سنبھالا، وہ وقت حضر...
سرگرمی ونشاط اور خارجی اعمال وکوششوں کے بعد کا زمانہ تھا۔ ٹانگ کے فریکچر ... میں زیادہ چلنے پھرنے اور اسفار سے (تقریباً) معذوری ہوچکی تھی، عمومی ضعف کے علاوہ بلڈ پریشر کا عارضہ بھی مستقل ہی تھا اس لئے یہ کہنا بالکل مبنی بر حقیقت ہوگا کہ ان کی شخصیت کے متعلق میرا مشاہدہ بڑا محدود ہے۔ اور پھر اس مشاہدہ کا بھی ایک حصہ بچپن کی ابتدائی کچی اور ناپختہ عقل و فہم کا ہے۔ ایک چھوٹے بچے کو گھر کے بڑوں اور پھر اتنے بڑوں کی ذات سے جو سروکار ہوا کرتا ہے سب جانتے ہیں۔ اس کے علم میں کتنی باتیں آتی ہیں۔

الغرض میرے پاس بیان کرنے کو آخری ۱۵۔۱۶ سال کے کچھ اپنے مشاہدات وتاثرات ہی ہیں اسی لئے کسی طرح میری تحریر کی حیثیت کسی سوانحی مضمون یا مقالہ کی نہیں ہوسکتی بلکہ میں نے اپنی فہم کی حد تک انکی ان چند خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہا ہے جن میں وہ ممتاز تھے۔ در حقیقت میں نے انکے اندر بعض غیر معمولی صفات دیکھیں۔ جن کے قلب ودماغ میں انمٹ نقوش ثبت ہوگئے ہیں ان میں یقیناً وہ ہم سب کیلئے قابل تقلید تھے۔

اخلاص وللّٰہیت

اخلاص پورے دین کی روح ہے۔ دینی اعمال کی ساری اہمیت اسی پر منحصر ہے۔ حضرت

ناناجان کی ساری خصوصیات میں، میں اپنے علم شعور کی حد تک اس صفت کو انکا بنیادی امتیاز کہہ سکتا ہوں ۔ میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ انہوں نے کوئی کام اللہ کی رضا کے علاوہ کسی اور غرض سے کیا ہو۔ جو کرتے اللہ کیلئے کرتے۔ وہ اپنے اخلاص کا خود امتحان لیتے رہے اور اپنا بذات خود محاسبہ کرتے رہتے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کی علالت اور معذوری کے بعد دارالعلوم کے منتظمین نے ان سے دارالعلوم میں چند گھنٹے پڑھانے کی فرمائش کی۔ ابتدا میں وہ صرف ایک گھنٹہ پڑھانے کیلئے راضی ہوئے مگر جب مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کی علالت کا سلسلہ دراز ہو گیا تو ان سے باقاعدہ دو گھنٹے بالمعاوضہ پڑھانے کی فرمائش کی گئی شروع میں وہ اپنی مصروفیت کی بنا پر راضی نہیں ہوئے۔ فرماتے تھے کہ بعد میں میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اپنے آپ کو اس منصب سے بڑا سمجھنے لگا ہوں ، میں نے جائزہ لیا، بعد ازاں حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا صاحبؒ کے مشورے پر اس ذمہ داری کو قبول کر لیا اگر چہ دو سالوں میں ہی اندازہ ہوا کہ تدریس کی ذمہ داری اور مطالعہ کی مشغولیت کی وجہ سے دیگر بہت سارے کاموں کا حرج ہو رہا ہے اس لئے پھر اس ذمہ داری سے معذرت کر لی۔

اخفاء حال

مجلس میں گفتگو کرتے مگر اپنے بارے میں تقریباً نہیں، اپنا کوئی واقعہ نہ کوئی قصہ، ہم لوگوں کو بڑی تشنگی رہتی کہ انہوں نے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا کوئی اگر انکی کچھ ستائش کرتا یا کسی کام کی افادیت کا تذکرہ کرتا تو پہلے وہ اس کو اللہ کی توفیق واعانت کا نتیجہ بتاتے اور اسکے بعد بھی اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہونے لگتے۔ مجلس میں انکی ناگواری کا اندازہ اس طرح ہوتا کہ چہرا جھک جاتا اور کلمہ طیبہ یا استغفار کا زیر لب یا ہلکی سی آواز سے ورد شروع ہو جاتا۔ کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہوگی کہ ہمارے علاقہ میں بارش کی شدید کمی محسوس کی گئی لوگوں کو زبردست قحط سالی کا اندیشہ تھا۔ حضرت ناناجانؒ اور حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کی طرف سے نماز استسقاء کا اعلان کیا گیا، بعض اخباروں نے نماز کی خبر کے ساتھ دونوں حضرات کیلئے غیر معمولی تعریفی کلمات لکھے ۔ اور اس سے بھی چند سال پہلے کا واقعہ لکھا کہ ایسی ہی قحط سالی کے نتیجے میں ہی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نے نماز استسقاء پڑھائی اور طویل دعا کرائی تھی اور واقعتا لوگ اپنے گھروں کو بھیگتے ہوئے پہونچے۔ بہر حال عین نماز استسقا سے پہلے [illegible] ناناجان نے اپنے بارے میں ان تعریفی کلمات کو مبالغہ آمیزی قرار دیا اور آ

کیلئے اس طرح کی باتوں سے اخبارات سے دور رہنے کی خواہش ظاہر کی۔

انکسار و تواضع

تواضع کا وہ پیکر تھے۔ ہمارے آبائی وطن سنبھل کے قریب کے کسی دیہات سے ایک صاحب کسی سرکاری کام کے سلسلے میں لکھنو آئے، عمر تقریباً ٦٠ سال سے اوپر ہوگی۔ انکی وضع قطع، ہیئت اور بات چیت سے تو اندازہ نہیں لگتا تھا کہ وہ حضرت نانا جانؒ کو یا کسی عالم کو جانتے بھی ہونگے بس ہو سکتا ہے کسی نے آتے وقت ذکر کر دیا ہو۔ نانا جانؒ اس وقت کچھ لکھنے میں مشغول تھے لہٰذا کہلا دیا کہ اس وقت مہمانوں کے کمرے میں آرام فرمائیں شام کو ملاقات ہوگی، وہ صاحب ناراض ہو گئے اور واپسی کیلئے سامان اٹھالیا میں نے آکر پوری بات عرض کی فوراً خود اٹھے (اگر چہ اس وقت بھی چلنا خوب مشکل تھا اور چھڑی کے سہارے ہی ممکن ...
ساتھ اپنے کمرے میں لیکر آئے ان کی پوری بات سنی اپنے سا...
بڑی سادگی سے معذرت خواہی کی اور انکے اس کام کے سلسلے میں ...
آئے تھے۔

بعض ریسرچ اسکالرس نے اپنے تحقیقی مقالوں کیلئے درخواست ...
اور اپنی شخصیت اور کاموں کے متعلق ضروری معلومات لکھوادیں، ایسا متعدد بار ہوا، مگر آپ نے ہمیشہ از راہ تواضع وانکسار اور اپنی اخفاء کی افتاد کی بنا پر اس طرح کے تعاون سے معذرت کرلی، بلکہ ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ اس سے مجھے اپنی نیت کیلئے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ برادر محترم جناب عبید الرحمان سنبھلی بیان کرتے ہیں کہ جس زمانے میں وہ لکھنو میں مقیم تھے (١) اور خطوط کے جواب کی ذمہ داری ان پر ہی تھی جب بھی ایسے خطوط آئے آپ نے یہی جواب دلوایا کہ آپ کے حسن ظن پر اللہ آپ کو جزائے خیر دے میری ذات اس قابل نہیں ہے کہ اس کو باقاعدہ تحقیق و ریسرچ کا موضوع بنایا جائے راقم سطور سے بھی اس طرح کے چند جوابات لکھوائے گئے۔

ایک مرتبہ ایک تبلیغی اجتماع میں بیان کیلئے بہرائچ جانا ہوا، سفر میں رات کو دیر ہوگئی، اجتماع گاہ پہونچے جہاں سارے ہی لوگ سو چکے تھے، چپلوں کی جگہ پر ہی خالی جگہ ملی کسی کو جگانا مناسب نہ سمجھا وہیں بستر بچھایا اور چپلوں کے اوپر ہی سو گئے۔ آخر شب میں جب کچھ لوگ اجتماع گاہ سے باہر نکلے، تو وہاں کسی کو نامناسب جگہ سوتے ہوئے دیکھکر بڑا سخت سست کہا مگر انکی پشیمانی کی کوئی انتہا نہیں رہی جب انہوں نے دیکھا کہ سونے والا کون ہے؟

---

(١) ایک مدت سے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے سے دہلی میں قیام ہے۔

ناناجانؒ کے نزدیک کپڑوں وغیرہ مظاہر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میری والدہ محترمہ کبھی عرض کرتیں کہ نئے کپڑے بنالیں تو فرمادیتے کہ بیٹی اب کپڑے کیا بنائیں اب کفن ہی بن جائے گا۔اسی کی تیاری کررہاہوں۔ایک کرتا میں کافی عرصہ سے دیکھتا تھا۔ گھر میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ کرتا ۳۰ سال سے زیادہ پرانا ہے۔اور اللہ کی طرف سے برکت بھی اس میں عجب ہے کہ اب تک پھٹا نہیں۔ گذشتہ ۱۵۔۱۶ سال میں ان کے لئے اندر پہننے کی بنیان نما کرتیاں تو کافی سلوائی گئیں مگر کرتے شاید ہی چار پانچ سے زائد سلے ہوں۔

ایک مرتبہ مغرب کے بعد لیٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اچانک آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، پھر آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا میں وہیں بیٹھا ہوا تھا۔اور فرمایا کہ اللہ کی خاطر ذلیل ہونا بھی بڑا اعزاز ہے اور یہ اللہ اپنے خاص محبوب بندوں کو ہی عطا کرتا ہے۔اس کے بعد بعض بزرگوں کے اس سلسلہ کے واقعات سنائے۔

رِقت قلب

آپ کی رقت قلب کا حال دیکھنے والے ہی جانتے ہیں۔شائد ہی اس زمانہ میں رقت قلب کا یہ حال کہیں دیکھا گیا ہو۔ تقریروں میں بھی خود رورو پڑتے اور خوب خوب رلاتے، دل دھل سا جاتا۔وعدو بشارت یا انذار و وعید کی کوئی آیت ہو یا کوئی حدیث کسی بزرگ کا تذکرہ ہو کوئی اہم واقعہ ہو،اگر بیان فرماتے تو بیان کرنا مشکل ہو جاتا۔دعا کے لئے ہاتھ اٹھ جائیں آنکھیں بغیر بھیگے نہیں رہتیں۔

اکابر دیو بند اور سلسلہ ولی اللہی کے مشائخ سے حضرت ناناجانؒ کو غیر معمولی قلبی عقیدت اور ذوقی مناسبت تھی۔ حافظہ میں ان حضرات کے بے شمار واقعات ہمیشہ تازہ رہتے۔ا جب کبھی تذکرہ نکل آتا اور کوئی واقعہ بیان فرماتے تو گریہ طاری ہو جاتا۔ایک مرتبہ دارالعلوم کے طلبہ کی ایک جماعت ملنے آئی،ان سے بات کرتے ہوئے اسی طرح کے سیاق میں یہ فرمایاَ ہمارے اکابر کو بنسبت بعض دیگر ممالک کے علما کے جو ممتاز کامیابی ملی اس کا سبب یہ نہیں تھا وہ علمی اعتبار سے ان سے بہتر تھے۔بلکہ اس کا اصل سبب ان کی للہیت، زہد و تقویٰ، ذوق عبادت سادگی و اخلاص اور مجاہدہ کا مزاج جیسی صفات تھیں۔ ہمارے مدارس صرف ایک دانش گاہ تھے۔بلکہ وہ دعوت و احیائے دین کی جد و جہد کے مراکز تھے۔اور یہاں کی زندگی کا عموم رہا تھا جو ایک ... مقصد کی زندگی کا ہونا چاہئے۔(پھر اس کے بعد دو یا تین واقعات بھی سنائے)

خاص

ذوق عبادت

اللہ تعالیٰ نے نانا جان پر جو احسانات فرمائے میں سمجھتا ہوں کہ ان میں ایمان کے بعد سب سے عظیم انعام عبادات کے باب کی وہ خاص توفیق ہے جو ان کو عطا ہوئی تھی، عبادات اور خاص طور پر ذکر و دعا جو تمام ہی عبادات کی روح ہیں ان کے لئے ذوقی اور طبعی چیزیں بن گئیں تھیں۔ خاص طور پر نماز میں تو ایسا معلوم ہوتا کہ صفت عبدیت کا اس سے بڑھ کر اور کوئی نمونہ نہیں مل سکتا۔ انکی نماز روح نماز یعنی رجوع وانابت، خشیت و تضرع، اور حضوری کی کیفیات سے معمور ہوتی۔ عام طور پر نماز سوائے جماعت کی امامت کے طویل ہی پڑھتے لیکن خاص طور پر تہجد بہت طویل ہوتی جس میں کافی لمبی قرات ہوتی تقریباً ایک ڈیڑھ پارہ یومیہ پڑھتے۔ بسا اوقات سورہ فاتحہ میں ہی کافی وقت لگ جاتا۔ "اھدنا الصراط ال "
آیات کو دھراتے جاتے، آواز کچھ بلند ہو جاتی اور آنسوؤں
بھی ایسا ہی حال ہوتا تھا کسی آیت پر ایسا خوف طاری ہوتا
بندھ جاتیں اور کہیں ایسا کیف ہوتا کہ محسوس ہوتا کہ ا
کیفیات کے سبب ہے۔

رکوع و سجدہ دونوں طویل ہوتے۔ مگر سجدہ کچھ زیادہ لمبا ہوتا تھا۔ سجدہ میں مسنون وماثور دعائیں بکثرت مانگتے۔ اور شاید ہی کوئی سجدہ آہ وبکا سے خالی ہوتا۔ ماثور دعاؤں سے ان کو خاص ذوقی مناسبت تھی، ٹانگ میں فریکچر کی وجہ سے مستقل تکلیف رہتی جس کی وجہ سے کھڑا ہونا بہت دشوار ہو گیا تھا اور اسی لئے نمازیں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ مگر سجدے اتنے طویل ہوتے کہ اچھا بھلا صحت مند آدمی بھی تھک کر چور ہو جائے۔ سجدہ میں تسبیحات کے بعد دعاؤں کا سلسلہ جو شروع ہوتا تو یکے بعد دیگرے دعائیں آتی جاتیں۔ ایک ایک سجدہ میں کئی کئی کیفیات آتیں اور گزر جاتیں۔ گریہ کی وجہ سے سانس ٹوٹ جاتی، الفاظ منہ سے نہ نکلتے۔ نماز کے اختتام پر "اللھم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً، سے شروع ہونے والی وہ مسنون دعا ضرور پڑھتے جو آں حضرت ﷺ نے حضرت ابو بکر کو تلقین فرمائی تھی اور اسکے ابتدائی چند کلمات بلا مبالغہ بیسیوں مرتبہ بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ دہراتے ... نماز کی یہ صورت و کیفیت کبھی کبھار کا واقعہ نہیں روزانہ کا معمول تھا، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسی نماز اپنی زندگی میں نہیں دیکھی، بس!!"

لاتسال عن حسنھن و طولھن"

رمضان المبارک میں ذکر و تلاوت وغیرہ کی مشغولیات بڑھ جایا کرتیں، ضعف و

کمزوری کے باوجود پورے رمضان میں پندرہ (۱۵) قرآن ختم کر لینے کا معمول رہا تھا۔ اور اس سے پہلے کا معمول اس سے زیادہ کا رہ چکا تھا بالکل آخری سالوں میں جب ضعف اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور خود زیادہ تلاوت کی سکت نہ رہ گئی تھی تب بھی دوسروں سے قرآن مجید اور حضرت تھانویؒ کی مرتب کردہ دعائیں بھی پڑھوا کر سنتے۔

سحری بس (شاید) سنت ہی کی ادائیگی کیلئے کرتے۔ عام ایام کے مقابلہ میں لمبی تہجد اور وتر ہوتیں اور جب بالکل چند منٹ باقی رہ جاتے تو دو چار لقمہ کھا لیتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ وقت سب سے قیمتی وقت ہوتا ہے اور عام طور پر لوگ اسے سحری کے غیر ضروری اہتمام اور فضول باتوں کی نظر کر دیتے ہیں۔ افطار سے قبل خود بھی دعا کا اہتمام فرماتے اور سارے ہی متعلقین کو اسکی ہدایت بھی کرتے۔

علم و عمل کی جامعیت

نانا جان کا ایک خاص امتیازی وصف علم و عمل کی جامعیت اور توازن و اعتدال تھا۔ ایک طرف علمی رسوخ و گیرائی اور دوسری طرف وسیع تر عملی میدان اور متنوع و گوناگوں مشاغل و مصروفیات۔ جہاں تک علم کا تعلق تھا تو دینی علوم خصوصاً علم حدیث سے انکا خاص اشتغال تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز صاحب فن اساتذہ خصوصاً امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے انہوں نے استفادہ کیا تھا۔ اور حضرت شاہ صاحب کے علمی مزاج و مذاق سے وہ خاص طور پر متاثر تھے۔ اسکے علاوہ معارف الحدیث کی تالیف کی وجہ سے (جس کا سلسلہ کئی دہائیوں تک جاری رہا) ان کو حدیث میں غور و تدبر اور وسیع تر مطالعہ کا موقعہ ملا۔

فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے علم حدیث میں فتنوں اور فکری انحراف سے محفوظ رکھنے کی خاص تاثیر رکھی ہے۔ ہر زمانے کے مخصوص سیاسی و اجتماعی حالات نے امت مسلمہ کیلئے متعدد فتنے کھڑے کئے۔ بسا اوقات ان فتنوں کے سیلاب میں بہہ جانے سے جو لوگ بچ رہے وہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لیکن بحیثیت مجموعی امت کو انحراف سے بچانے والی چیز علم حدیث ہی ثابت ہوا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ علم حدیث کا مطالعہ صرف فقہی و کلامی مسائل کے تناظر میں کرنا خود علم حدیث کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے جس سے ایک طرف سنت رسول کی اصل روشن و دیدہ زیب تصویر سامنے نہیں آپاتی۔ اور دوسری طرف خود امت کیلئے علم حدیث بہت محدود ہو جاتا ہے ان کے نزدیک یہ مسائل سنت نبویہ کے مشتملات کا ایک حصہ ہیں اور یقیناً وہ ان میں بھی رہنما ہے مگر اسکا اصل حصہ وہ محکمات ہیں جن میں امت میں کوئی

اختلاف نہیں ہے۔ اور وہ ہی سنت نبوی کا اصل پیغام ہیں۔ اور اس میں ساری امت کیلئے رہنمائی اور معرفت خداوندی کے بے شمار خزانے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ شائد سلسلہ معارف الحدیث کی تالیف کا ایک مقصد سنت نبویہ پر غور و فکر کے انداز کو عام کرنا بھی رہا ہو اور اس میں متعدد جگہ اس طرح کے اشارات بھی آئے ہیں۔

وہ حکمت ولی اللٰہی کو دین کی تفہیم و تشریح کا ایک کامیاب ترین انداز سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جتنا مطالعہ اور علم بڑھتا جاتا ہے عمومی طور پر حضرت شاہ صاحبؒ کی حکمت کی گہرائی عیاں ہو جاتی ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ کم از کم حجۃ اللہ البالغہ مدارس کے نصاب کا لازمی جزو ہو۔ مگر یہ فرمایا کہ اس کو پڑھانے کیلئے جیسے علماء مطلوب ہیں اب ان کی تعداد بہت کم ہے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ حجت اللہ اگر مشکوۃ شریف کی شرح نہیں ہے تو کم از کم اس کو سامنے رکھکر ضرور لکھی گئی ہے مجھے خاص طور پر حجۃ اللہ کے باب حقیقۃ التوحید، کے غور سے پڑھنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ یہ بحث تو [illegible] ہے۔

والد ماجد (مولانا محمد زکریا صاحب) سناتے ہیں کہ جب [illegible] تو بارہا ایسا ہوا کہ کسی مسئلہ میں مطالعہ کرتے کرتے صبح ہو گئی اور [illegible] میں فوراً آباجی(۱) کے پاس حاضر ہوا اور رات کے مطالعہ کا خلاصہ پیش کر کے اپنا اشکال رکھا انہوں نے دو جملوں میں کوئی ایسی بات فرمادی کہ سارا مسئلہ حل ہو گیا۔

حدیث کے علاوہ تفسیر و فقہ پر بھی نظر کم نہ تھی اگرچہ تفسیر و فقہ کو مستقل موضوع بنا کر انہوں نے کوئی محنت نہ کی تھی سوائے عمومی مطالعہ کے جو ان کی زندگی کا جز تھا۔ ایک مرتبہ اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ اصول تفسیر میں اسلامی مکتبہ میں بڑا خلا ہے۔ چند نقوش اولیں قسم کی چیزوں کے علاوہ اس موضوع پر کوئی چیز نہیں ملتی اسباب نزول کے سلسلہ میں وہ شاہ ولی اللہؒ کے نقطۂ نظر کے مداح تھے۔ نیز نسخ کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ شاہ صاحبؒ کی بیان کردہ آیات کی تعین و تعداد میں کوئی اختلاف ہو سکتا ہے۔ البتہ شاہ صاحب نے جو نقطۂ نظر حقیقتِ نسخ اور مفسرین کے یہاں اسکے استعمال کے متعلق پیش کیا وہ بہت تحقیقی ہے۔

شرعی علوم میں اس گہری بصیرت کا نتیجہ انکا علمی اعتدال و توازن تھا بڑے سے بڑے معرکۃ الآراء مسئلہ میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ہر رائے کو اسکے اپنے

---

(۱) والد ماجد حضرت نانا جان رحمۃ اللہ علیہ کو "آباجی" ہی کہا کرتے تھے۔

زاویۂ نظر سے دیکھتے ان کی متعدد کتب، معارف الحدیث ، دین و شریعت، اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور ہندوستان کے علماء حق پر اسکے اثرات نامی کتاب میں اسکے بہت سارے شواہد ملتے ہیں۔ اسکے علاوہ الفرقان کے فائلوں میں ایسے کافی مقالات و مضامین موجود ہیں جو دو مختلف انتہا پسند رایوں کے درمیان راہ اعتدال کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

عام علمی اشتغال اور لکھنے پڑھنے کی مصروفیتوں نے آپ کو دوسرے دینی و ملی تقاضوں سے غافل نہیں کیا دعوتی و ملی کاموں کیلئے دوروں واسفار کی ایسی کثرت رہتی تھی کہ ہر وقت گھر پر سفر کا سامان تیار رہتا تھا۔ ایک نہیں دو دو بستر بندھے رہتے کہ مبادا ایک سفر سے آئے اور اس قابل نہ ہو کہ اگلے سفر میں جاسکے تو دوسرا باندھنے اور تیار کرنے کی وجہ سے کچھ تاخیر نہ ہو۔

راقم کو انکی اس خاص کیفیت دیکھنے کا تھوڑا بہت موقعہ اس وقت ملا جب وہ ایرانی انقلاب اور شیعیت کی تالیف میں مشغول تھے۔ حالات کی نوعیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ اس انقلاب کی فتنہ سامانیوں اور کسی تدارک نہ کرنے کی صورت میں اسکے خطرناک نتائج کا اندازہ (کم از کم اس وقت) بہت ہی کم لوگوں کو تھا حضرت نانا جان اس انقلاب کو محض ایک سیاسی انقلاب نہیں سمجھتے تھے بلکہ انکے نزدیک یہ انقلاب ایک عالمی شیعی دعوت کا قیام تھا جو زبردست مشنری طاقتوں، حکومتی ذرائع، افرادی جوش و حوصلہ اور بلا کے ذہین دماغ جیسے وسائل سے لیس تھی جسکا کام ایران کے انقلاب کے بعد ختم نہیں بلکہ شروع ہوا تھا۔ دوسری طرف ایرانی حکومت کے خیرہ کن پروپیگنڈے اور جذباتی نعروں نے انقلاب کے ظلم و بربریت اور سفاکیوں ہی نہیں بلکہ انقلاب کے حقیقی مقاصد پر ایسا خوشنما پردہ تانا ہوا تھا کہ مسلم عوام ہی نہیں اہل فکر و دانش حضرات کی زبانیں بھی تحسین و آفریں کی صداؤں سے نہ تھکتی تھیں۔ گویا عالم اسلام میں ایک ہمہ گیر شیعی دعوت کیلئے زمین تیار ہو چکی تھی۔ بلکہ کئی ممالک خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکہ اور افریقہ کے متعدد ممالک سے ایرانی داعیوں کی عملی سرگرمیوں کی اطلاع بھی ملنی شروع ہو چکی تھی۔

اس صورت حال نے ان کو بے چین کر دیا، اور وہ اپنے ضعف پیری و سارے عوارض بھلا کر ایک نئی مہم پر اتر گئے پہلے انتہائی توسع کیساتھ انقلاب کی تاریخ، پس منظر و محرکات اور خمینی کی شخصیت کا مطالعہ کر کے کتاب لکھی پھر بر صغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش کے علماء و اصحاب فضل کو اس کے ذریعہ فرداً فرداً مخاطب کیا۔ کتاب کے نسخے بھیجے، مراسلات کی، اس مطالعہ کے نتیجے میں ان پر یہ بھی منکشف ہوا کہ اثناعشری عقائد و آراء مکمل طور پر کفریہ ہیں اور اسی صورت

حال کا تقاضہ ہے کہ ان کو ایک استفتاء کی شکل میں مرتب کر کے ارباب افتاء سے رائے طلب کی جائے اور اگر انکی رائے بھی یہی ہو تو عوامی آگاہی کیلئے اسکو نشر بھی کیا جائے۔ انہوں نے ایک مفصل استفتاء مرتب کر کے ہند و بنگلہ دیش کے تمام قابل ذکر علماء واصحاب افتاء اور اداروں کو بھیجا اور اس سلسلہ میں وہ اتفاق رائے پایا گیا کہ جسکی خود حضرتؒ نانا جان کو بھی توقع نہ تھی اس کی پوری تفصیل الفرقان (اور دیگر کئی رسالوں) نے اپنی خصوصی اشاعتوں میں محفوظ کر دی ہے۔

اسی مقصد کیلئے والد ماجد (جناب مولانا محمد زکریا صاحب) اور خال محترم جناب مولانا خلیل الرحمان سجاد نعمانی کو لیکر سعودی عرب کا سفر کیا، اور وہاں کے ذمہ داروں اور علماء سے ملاقات کر کے ان کی توجہ اس فتنہ اور اسکے وسیع تر عزائم و خطرناک منصوبوں اور عالم اسلام کی تشویشناک صورت حال کی طرف مبذول کرائی، ان کا خیال تھا کہ ایک عظیم حکو[illegible]
پروپیگنڈہ کا مقابلہ کوئی حکومت یا حکومتی وسائل رکھنے والی تحریک[illegible]
ہوا کہ وہاں کے علماء اس فتنہ کی خطرناکی کا کسی حد تک احساس تو ر[illegible]
بنا پر کچھ کرنے کیلئے اپنے پاس گنجائش نہیں پاتے۔

مجھے اس وقت کی انکی کیفیتیں یاد ہیں۔ ان کو نہ اپنے امراض[illegible]
بلڈ پریشر تشویش انگیز حد تک بڑھا ہوا تھا اور وہ دن رات مطالعہ اور تالیف میں [illegible]سعول رہے اہل خانہ کی منتیں سماجتیں ڈاکٹروں کے اصرار، سب ایک طرف اور انکی اپنی دھن ایک طرف، یہ تک ہو تا کہ رات کو جب سب سو جاتے وہ اٹھتے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور ایک ہاتھ میں کتاب لیکر مطالعہ میں مشغول ہو جاتے اور اوپر اس انداز سے لحاف ڈھک لیتے کہ روشنی کی کوئی کرن باہر نہ نکلنے پائے خال محترم جناب حسان نعمانی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ اس طرح آپ اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے۔ فرمایا میں اس کام سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتا ہوں اس لئے کہ میرے علاوہ بظاہر کوئی یہ سب کرتا نظر نہیں آتا چاہتا ہوں کے اپنے وقت کے آنے سے پہلے یہ کام کر تا جاؤں۔

دینی غیرت وحمیت

آپ کی ایک خاص صفت، دینی غیرت وحمیت تھی وہ اللہ کے دین کو نقصان پہنچتا دیکھ کر تڑپ جاتے اور کچھ کرنے کیلئے بے چین ہو جاتے اور اس پر خاموش رہنا ان کیلئے ممکن نہ ہوتا ایک واقعہ میرے سامنے کا ہے جس سے انکی شدت غیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دہلی کے ایک صاحب نے مساجد سے متعلق ایک تنظیم بنائی اور اسکی بالکل ابتدا میں انہوں نے حضرت سے اپنی تنظیم اور اسکے مقاصد کا ذکر کیا۔ اس تنظیم کے مقاصد جو بھی رہے ہوں لیکن فی الوقع اسکا نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ مسلمانوں کی مساجد براہ راست حکومت کی دست درازیوں اور مکمل دخل اندازی کا شکار ہو جائیں۔ حضرت نے پہلے تو اسکے مضر پہلوؤں (جو ایک عام آدمی کیلئے بھی واضح تھے) کی طرف توجہ دلائی مگر جب انہوں نے اپنی بات پھر دہرائی تو بات برداشت سے باہر ہو گئی، چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور بلند آواز سے کہا، بھائی میں یہ سننے کی سکت نہیں رکھتا، خدا مجھے وہ دن نہ دکھائے، انہوں نے پھر کچھ عرض کرنا چاہا، پھر فرمایا میں کچھ نہیں سن سکتا بس اب آپ چلے جائیں۔ انکے جانے کے بعد بھی طبیعت متاثر رہی لیٹ گئے لیکن طبیعت کی بے چینی کم نہیں ہوئی بلڈ پریشر چیک کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کافی بڑھا ہوا تھا۔

صبر و تحمل

کیسی ہی شدید تکلیف ہو اور کیسا ہی مشکل مرحلہ ہو ان کی زبان شکر ہی ادا کرتی رہی۔ زبان پر حرف شکایت تو درکنار اشارۃً بھی کبھی قلت رضا کا گزر نہیں ہوا۔ آخری چند سالوں میں معذوری کے ساتھ تکلیفیں بھی بڑھ گئیں تھیں مگر کبھی چہرے کے تاثرات سے بھی شکوے کا اندازہ نہ ہوا۔ آنکھ کا پہلا آپریشن ہوا اور ناکام ہو گیا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ آنکھ کا باقی رہنا بھی مشکل تھا خدشہ تھا کہ شائد آنکھ نکال دینی پڑے۔ اس وقت ڈاکٹروں کی رائے یہ ہوئی براہ راست آنکھ کی پتلی میں صبح و شام دو وقت اعلی طاقت کے اینٹی بائیٹک انجکشن لگائے جائیں تو شاید آنکھ بچ جائے۔ مگر مشکل یہ پیش آئی کہ کسی وجہ سے آنکھ پرُسن کرنے والی دوا نے اثر کرنا بند کر دیا یعنی اب آنکھ کی پتلی میں بغیر ُسن کئے انجکشن لگنا تھا۔ ڈاکٹروں کو کسی طرح ہمت نہیں ہوتی تھی الغرض آپ سے عرض کیا گیا فرمایا کہ اگر آپ حضرات کی رائے ہے تو کرلیں۔ مجھے یاد ہے کہ صبح شام دونوں وقت آنکھ کی پتلی میں انجکشن لگے۔ اللہ سب کو عافیت دے اس تکلیف کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مگر آہ کہ صبر کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب انجکشن کی سوئی اندر جاتی تو شدت تکلیف میں اللہ ہی کا نام نکلتا اور جب دوا انجکٹ کی جاتی تو اس سے بھی زیادہ دردناک انداز میں اللہ ہی کا نام نکلتا اور جیسے ہی سوئی باہر آتی تو پھر زبان سے بجائے تکلیف کے اظہار کے بس الحمدللہ ہی چند بار نکلتا۔

حقوق العباد میں احتیاط

حقوق العباد کا معاملہ بڑا سنگین ہے حضرت نانا جان کے یہاں اس کی بڑی فکر تھی اپنے خوردوں بلکہ خوردوں کے خوردوں تک کو اگر کبھی کچھ کہہ دیتے تو تھوڑی ہی دیر کے بعد معافی مانگ لیتے۔ اور بغیر کسی واقعہ کے بھی کبھی کبھی سب سے معافی مانگتے۔ میں نے انکی زبان سے اس پورے ۱۴۔۱۵ سال کے عرصہ میں کسی چھوٹے بڑے کی غیبت نہیں سنی۔ شاید عام حالات میں اس کو مبالغہ سمجھا جائے کہ اس پورے عرصہ میں صرف ایک مرتبہ انہوں نے ایک دینی ضرورت سے ایک صاحب کی ایک کمزوری میرے سامنے ذکر کی۔

انہوں نے اپنے پرس (بٹوے) میں اپنے خرچ اور زکوۃ و صدقات اور دیگر امانتوں کے لئے الگ الگ حصے مقرر کر رکھے تھے اور گھر کے سب لوگوں اور خدام کو اسکی اطلاع بھی کر رکھی تھی، کہیں آپس میں مل نہ جائیں۔

یہ چند تاثرات اور کچھ منتشر سی یادیں تھیں جو قلمبند ‹
کہ ان سطروں میں حضرت نانا جان کی ذات والا صفات کی بس کچھ
سے دعا ہے کہ ہم سب کو آپ کی ان صفات کی اتباع کی توفیق عط

☆☆☆

ڈاکٹر محمد مسلم شبنم نوری
سربراہ شعبۂ فارسی ممتاز ڈگری کالج، لکھنؤ

عجب اک مطلع انوار تھے منظور نعمانی

شریعت کے علمبردار تھے منظور نعمانی طریقت کے حسیں کردار تھے منظور نعمانیؒ

فقیہ عصر حاضر اور محدث عالم و فاضل مبلغ تھے بڑے دیندار تھے منظور نعمانیؒ

کیا نور قلم سے چاک سینہ کفر و ظلمت کا عجب اک مطلع انوار تھے منظور نعمانیؒ

مفکر مصدر علم و عمل خلق و محبت تھے سراپا پیکر ایثار تھے منظور نعمانیؒ

گذاری عمر ساری دین حق کی پاسبانی میں مجاہد عالم بیدار تھے منظور نعمانیؒ

رواں ہیں قافلے تبلیغ کے جو سارے عالم میں انھیں کے قافلہ سالار تھے منظور نعمانیؒ

کہاں سے لائے گی دنیا بھلا اب ایسی شخصیت گل صد رنگ تھے، گلزار تھے منظور نعمانیؒ

نکلتا ہے انھیں کے نام سے سال وفات انکا یہیں تک زیست کے حقدار تھے منظور نعما

شبِ دوشنبہ تھی ستائیسویں تاریخ ذی الحجہ وصال یار سے سرشار تھے منظور ن

بقدر
والدہ مر
خاص

بفیض پیروی حضرت نعمان اے شبنم
اسی نسبت کے وہ حقدار تھے منظورؒ نعمانی

جناب حافظ سمیع اللہ صدّیقی

باتیں جو یاد رہ گئیں

"حافظ سمیع اللہ صاحب تقریباً بارہ سال ادارۂ الفرقان سے وابستہ رہے ہیں۔ اور دل کا ... وابستہ ہیں، تبلیغی کام سے بھی نو عمری ہی سے تعلق ہے۔ جماعتوں میں بھی ... رفیق ہوئے انھیں اوقات کی کچھ باتیں انھوں نے ہم کو قلمبند کر کے د...

لکھنؤ میں جب تبلیغی کام شروع ہوا اور جماعتیں نکلنے لگیں تو ... جماعت جانیوالوں کے گھر پر تحقیق کے لئے آیا کرتے تھے کہ آپ جماعت میں کیوں گئے تھے اور کیا بیان کیا اور اس کام کا مقصد کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مولانا کے پاس بھی اس محکمہ کے لوگ اسی طرح تحقیقات کے لئے آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا علی میاں مدظلہ دعوت و تبلیغ کے سلسلہ سے عرب ممالک کے سفر پر تشریف لے گئے تھے۔ اس زمانے میں مولانا بلوچپورہ میں رہتے تھے۔ رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا۔ مولانا اعتکاف میں تھے، سی، آئی، ڈی، کے ایک صاحب آئے اور مسجد میں ہی مولانا سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تبلیغی کام سارے ہندستان میں ہو رہا ہے بلکہ اب تو جماعتیں عرب و دوسرے ممالک میں بھی جا رہی ہیں، اتنا بڑا کام ہو رہا ہے مگر اس کا نہ کوئی دفتر ہے، نہ صدر، نہ سکریٹری پھر یہ کام کیسے چل رہا ہے۔ مولانا نے ان صاحب سے پوچھا کہ آپ کے مذہب کا بانی کون ہے۔ انھوں نے یہ مذہب کیسے پھیلایا، ان کا دفتر کہاں تھا۔ اس کا صدر، سکریٹری کون تھا۔ سی، آئی، ڈی، والے نے جواب دیا کہ ہمارا مذہب تو رشیوں، منیوں نے پھیلایا نہ ان کا کوئی دفتر تھا، نہ صدر تھا نہ سکریٹری مولانا نے فرمایا کہ یہ کام بھی رشیوں، منیوں والا ہے۔ اس کا نہ کوئی صدر ہے نہ سکریٹری اور نہ کوئی دفتر

ہے جب تک رشیوں، منیوں کے طریقہ پر ہوگا چلتا رہے گا۔ جس دن اسکا صدر اور سکریٹری بنا دیا جائیگا یہ کام ختم ہو جائیگا۔ یہ سن کر اس نے جواب دیا کہ مولانا صاحب! ہماری سمجھ میں تو بات آگئی مگر ہم اپنے افسر کو نہیں سمجھا سکتے۔ ہم تو آپ کے پاس (اپنی ڈیوٹی نبھانے) آتے ہی رہیں گے۔

ایک مرتبہ ٹرین کے سفر میں ایک پنڈت جی کا ساتھ ہو گیا جو کافی پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے۔ اردو اور فارسی سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے مولانا سے پوچھا کہ یہ سوال ہم کئی لوگوں سے کر چکے ہیں مگر کسی نے اطمنان بخش جواب نہیں دیا وہ یہ کہ خدا کو آپ بھی مانتے ہیں ہم بھی مانتے ہیں پھر آپ اپنے آپ کو مسلمان اور ہمیں کافر کیوں کہتے ہیں؟ مولانا نے جواب دیا کہ صرف "کو" اور "کی" کا فرق ہے۔ ہم خدا کو بھی مانتے ہیں اور خدا کی بھی مانتے ہیں اس لئے مسلمان ہیں۔ آپ خدا کو تو مانتے ہیں مگر خدا کی نہیں مانتے اس لئے کافر ہیں۔ پنڈت جی نے کہا" مولانا صاحب! آپ نے بہت مختصر جواب سے مسئلہ حل کر دیا ورنہ ہم بہت لوگوں سے یہ سوال کر چکے تھے۔ سب نے بڑے تفصیلی جوابات دیئے مگر کوئی ہمیں مطمئن نہ کر سکا۔

ایک مرتبہ میں اپنے تینوں بیٹوں کو مولانا کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ چھوٹے دونوں کا رجحان دینداری کی طرف تھا بڑے بیٹے میں اس لحاظ سے کمی تھی۔ میں نے مولانا سے پہلے ہی بات کر رکھی تھی کہ ذرا آپ بڑے والے کو نصیحت فرما دیجئے گا۔ مولانا نے بڑے کے بجائے دونوں چھوٹوں کو نصیحت کی۔ مقصود یہ تھا کہ شیطان انہیں دینداری کے زعم میں مبتلا نہ کر دے کہ دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھنے لگیں اور "کبر" میں مبتلا ہو جائیں۔

جماعت کے ایک سفر میں ضلع بستی کے ایک گاؤں میں جانا ہوا۔ گاؤں کا راستہ خراب تھا۔ مقامی ذمہ دار سواری کے لئے ہاتھی لائے اس پر بیٹھ کر مولانا گاؤں تشریف لے گئے۔ مگر واپسی میں کئی کلومیٹر پیدل چل کر آئے ہاتھی پر نہیں بیٹھے فرمایا اس پر بیٹھنے سے "کبر" پیدا ہوتا ہے۔

مد

لدہ

حس صلہ

ایک مرتبہ فرمایا کہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک حیوانی اور شیطانی۔ لوگ حیوانی

کو بڑا سمجھتے ہیں حالانکہ شیطانی گناہ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ چوری، ظلم، اور زنا، وغیرہ حیوانی گناہ ہیں اور بہتان، غیبت، کبر وغیرہ شیطانی گناہ ہیں۔

ایک تبلیغی سفر مین بڑی جماعت ساتھ تھی ۔ تقریباً دس کلومیٹر جانا تھا۔ جاتے وقت سب کے لئے سواریوں کا انتظام ہو گیا لیکن واپسی میں صرف چار یکوں (تانگوں) کا انتظام ہو سکا۔ مولانا نے کمزور اور نازک مزاج لوگوں کو سواری پر بٹھادیا باقی سارے ساتھیوں کو پرانے واقعات سناتے ہوئے پیدل لے آئے۔ اتنا لمبا سفر تھا لیکن ساتھیوں کو پتہ بھی نہیں چلا۔

ایک دفعہ مولانا کے ہمراہ ہم چار ساتھی گورکھپور جارہے تھے ۔ راستے میں ایک جگہ ریلوے کراسنگ پر ٹرین رک گئی۔ ہم اتر کر نماز پڑھنے لگے۔ مولانا امامت کر [illegible]
شروع ہوتے ہی سیٹی کی آواز آئی۔ مولانا نے بہت مختصر نماز پڑھا [illegible]
کی ایک رکعت چھوٹ گئی تھی ان کی نیت تڑوا کر سب کو جلدی جلـ [illegible]
آخر میں چلتی ٹرین میں بیٹھے۔

ایک بار عید الاضحیٰ کے موقع پر لکھنؤ کے ایک علاقہ میں فساد ہو گیا تھا۔ دوسرے دن ہفتہ واری اجتماع میں بیان فرمایا کہ اسلام جذبات سے نہیں روکتا مگر ہوش کے ساتھ اور فرمایا کہ جذبات کے گھوڑے پر سوار رہو مگر عقل کی مشعل ہاتھ میں رہے۔

جس زمانے میں ندوۃ العلماء میں جمعرات کا اجتماع ہوتا تھا۔ بیان کے بعد حسب معمول دعا بھی ہوتی تھی لیکن کبھی کبھی دعا نہیں کراتے تھے اور فرماتے تھے کہ کہیں یہ بھی رسم نہ بن جائے اور لوگ دعا کو بھی ضروری سمجھنے لگیں۔ ایک مرتبہ نویں ذی الحجہ کو مختصر بیان کر کے فرمایا کہ آج صرف دعا ہو گی کیونکہ حجاج کرام میدانِ عرفات میں دعا میں مصروف ہوں گے۔ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے یہ کہہ کر طویل دعا کرائی، خود بھی روئے اور سارا مجمع روتا رہا۔

ایک مرتبہ تبلیغ کے کام کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اس کام کو حق اور ضرورت سمجھ کر [illegible] رہا ہوں۔ جس روز دیکھوں گا کہ اس میں رسمیت آگئی ہے تو منظور پہلا شخص ہو گا جو اس کام کی

مخالفت کرے گا۔

ایک دفعہ اٹاوہ کے اجتماع سے واپسی میں کانپور میں گاڑی بدلنا تھی۔ کینٹین میں چائے پینے گئے اس وقت چائے کی قیمت چار آنے تھی مولانا نے کینٹین کے ملازم کو الگ سے ایک روپیہ دیا۔ پھر فرمایا کہ یہ سمجھتا ہے کہ مولوی لوگ کچھ دیتے نہیں، ان کی طرف کم توجہ دیتا ہے اب ان کی طرف بھی توجہ کرے گا۔

ایک حجام کو خط بنوانے کے لئے گھر پر بلوایا۔ اس زمانے میں خط بنوائی دو آنے پڑتے تھے مگر مولانا نے اس کو ایک روپیہ دیا۔ مولوی حسّان یا مولوی سجّاد میاں نے بہت غور سے دیکھا۔ بعد میں مولانا نے فرمایا کہ میں نے خط بنوائی نہیں دی بلکہ وہ اپنا وقت خرچ کر کے آیا ہے اس کے وقت کے پیسے دئے ہیں آئندہ جب بھی بلوائیں گے فوراً آجائیگا۔

اسی طرح رکشہ سے کہیں جانا ہوتا تو پیشگی کرایا طے کر کے رکشہ پر بیٹھتے مگر بعد میں اکثر وبیشتر رکشہ والے کو زیادہ پیسے دیتے۔

ایک مرتبہ نکاح پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ مہر کی رقم لڑکے کی حیثیت سے زیادہ تھی۔ مولانا نے سمجھایا مگر لڑکی کے والد مہر میں کمی کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ مولانا نے نکاح نہیں پڑھایا اور واپس آگئے۔

ہمارے ایک ساتھی کے نکاح میں شرکت کی اور نکاح پڑھایا۔ مولانا کے احترام میں لوگ نکاح کے بعد خاموش بیٹھے رہے اور چھوہارے یونہی رکھے رہے۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ خوشی کا موقع ہے یا رنج کا۔ یہ کہہ کہ چھوہارے خود ہی لٹادیئے اور خود بھی لے لیا۔

مرکز کے قیام کے زمانہ میں نمازِ جماعت کی امامت مولانا ہی فرماتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نیت باندھنے کے بعد توڑ دیتے اور پھر دوبارہ نیت باندھتے۔ بعض لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ بغیر استحضار کے نیت باندھ لی تھی۔ نیت باندھنے سے پہلے استحضار (یعنی دل دماغ

مد
ع ص

پوری طرح حاضر ہونا) ضروری ہے۔

ایک مرتبہ ہم الفرقان کا چندہ وصول کر کے لائے اور تھیلے میں رکھ کر کسی کام سے پوسٹ آفس چلے گئے۔ واپس آکر دیکھا تو تھیلے میں روپئے نہیں تھے۔ دفتر الفرقان میں ہم اور ہمارے ایک ساتھ صرف دو آدمی تھے۔ ہم نے مولانا سے ذکر کیا تو پوچھا کہ کسی پر شک ہے۔ ہم نے اپنے دوسرے ساتھی پر شک ظاہر کیا کیونکہ تیسرا کوئی آدمی وہاں آیا نہیں تھا۔ مولانا نے فرمایا اتنے نیک آدمی پر شک کرتے ہو۔ فوراً ان سے معافی مانگو کہ ہم نے آپ پر ناحق شک کیا۔ دوسرے دن مولانا نے پھر دریافت فرمایا کہ تم نے معافی مانگ لی؟ ہم نے کہا ابھی نہیں۔ مولانا نے فرمایا کسی پر شک کرنا بہت بڑا گناہ ہے، معافی مانگ لو۔

۱۵ء میں لکھنؤ کے مرکز کی پہلی مرتبہ تعمیر ہوئی۔ تعمیہ
نگرانی میں ہوا تھا۔ تعمیر کے بعد مولانا دیکھنے کے لئے تشریف ا،
چاروں طرف پھول پتی کی بیل کا بارڈر بنا ہوا تھا۔ مولانا وکیل صا،
اس کی کیا ضرورت تھی۔ قوم کا پیسہ برباد کیا۔ وکیل صاحب نے کہا میٹیریل بچ گیا تھا اسی سے بنوادیا۔ مولانا نے فرمایا کہ اسے بنانے میں کئی دن لگ گئے ہوں گے۔ اس کی مزدوری تو دینا پڑی ہوگی۔ یہ اسراف ہے اور جائز نہیں ہے۔

ایک دفعہ ایک تعلق والے صاحب کے یہاں ایک تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے، وہاں بہت سادگی تھی۔ صرف روشنی ضرورت سے زیادہ تھی۔ روشنی دیکھ کر فوراً اسی رکشہ سے واپس آگئے۔ تقریب میں شرکت نہیں فرمائی۔ اللہ ان کی قبر میں زیادہ سے زیادہ روشنی عطا فرمائے۔

عبدالرؤف صدیقی
ایڈیٹر "ٹریڈ کرانیکل"۔ کراچی

علم و عمل کی ایک جیتی جاگتی شخصیت

چار اور پانچ مئی ۱۹۹۷ء شمسی کی درمیانی رات مسلمانوں کے لئے غم واندوہ کی دردناک تکلیف لے کر آئی تھی۔

ہر کام کے لئے ہر چند کہ ایک وقت معین ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی بعض امور، وقت کے ہاتھوں اس طرح انجام پاتے ہیں کہ دل و دماغ سارے کلیے بھول کر، ایک جان لیوا غم کے غار میں گرتے چلے جاتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ایک سانحہ ۲۷ ذی الحجہ ۱۴۱۷ قمری کو ظہور پذیر ہوا جس نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ صدہا افراد ملت اس وقت دھاڑیں مار مار کر رونے لگے جب انھیں معلوم ہوا کہ عہد حاضر میں اسوۂ محمدی کے عالم اور پابند عالم دین اور محدث وقت مولانا محمد منظور نعمانی اللہ کو پیارے ہو گئے۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے پیارے تو وہ زندگی بھر رہے ہوں گے، بالآخر انھوں نے اپنی جان جاں آفریں کو سونپ دی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی " کا قیام (از ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۶ء) بریلی کے "گھیر عبدالقیوم" کے ایک مکان میں تھا۔ میری اوائل عمری تھی۔ گھیر عبدالقیوم صاحب مرحوم میں قریب قریب ہم ایک ہی خاندان کے افراد رہتے تھے۔

وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے میں بھی بڑا ہوتا گیا مولاناؒ سے قلبی تعلق دوسری جنگ

عظیم کے آخری دنوں (۱۹۴۱ سنشی) میں ہوا تھا میری نشست گاہ حضرت مولاناؒ کے دفتر (ماہنامہ "الفرقان") سے متصل تھی میں ایسے اخبارات کا مطالعہ باقاعدہ کیا کرتا تھا جو اس زمانہ میں سیاسی دنیا کے ممتاز اخبارات تھے۔ ان میں "مدینہ" (بجنور یو۔پی) مولانا عثمان فارقلیط کی ادارت میں شائع ہونے والا روزنامہ "الجمعیۃ" (دہلی) اور روزنامہ "زمزم" (لاہور) میرے مطالعہ میں رہتے تھے، صحافت کا چسکہ مجھے اسی دور سے لگا۔ مولانا مرحوم کے ساتھ دو ایک مرتبہ تبلیغی جماعت کے اجتماع میں حاضری کا موقع بھی مجھے ملا۔

میرے محلہ میں جو مسجد تھی، مولانا نعمانیؒ اس میں اعزازی خطیب تھے۔ مولاناؒ کا انداز بیان نہایت سلیس، سلجھا ہوا، عام فہم اور دل پر براہ راست اثر کرتا تھا میرے خاندان کے تمام جوان اور بزرگ حضرات اگرچہ مولاناؒ کے عالم باعمل ہونے کی صفات عالیہ اور حسن کردار سے بہت متاثر تھے اور اتنا ہی ان کا احترام بھی کرتے تھے لیکن ان کی پیر د ' کہہ جس کا مجھے آج بھی تکلیف دہ احساس ہوتا ہے۔

حضرت مولاناؒ صاحب فجر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے ـ

تھے یہ ان کا معمول تھا۔ ماہنامہ "الفرقان" جس کا اجراء انھو

پاکستان سے چند سال پہلے جب مولاناؒ بریلی سے لکھنؤ منتقل ہو گئے تو "الفرقان ہ دسر ں سو ہو گیا۔

پاکستان آجانے کے بعد دو یا تین مرتبہ حضرت نعمانی صاحبؒ کی قدم بوسی کے لئے لکھنؤ گیا وہ کتنے شفیق اور مجھ سے کس قدر محبت فرماتے تھے اسے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں جب لکھنو جاتا تو قیام مولاناؒ کے دولت کدہ پر کرتا تھا مولاناؒ چونکہ کہیں گر گئے تھے جس سے ان کی کولھے کی ہڈی اتنی متاثر ہو گئی تھی کہ وہ چل پھر نہیں سکتے تھے۔ لیکن دوران قیام میں مجھے ناشتہ اور رات کا کھانا اپنے سامنے کھلاتے تھے اور مجھ سے نام بنام میرے خاندان کے ایک ایک فرد کی خیر و عافیت دریافت فرماتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا علیہ الرحمہ ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانہ میں مؤتمر کے اجلاس میں شرکت کے لئے مولانا علی میاں صاحب کے ہمراہ پاکستان آئے تھے اور ان سے میری ملاقات ہوئی تھی اس سے آٹھ دس سال پہلے حج کے موقع پر منیٰ میں ان سے اس وقت ملاقات ہوئی جب مولانا علیہ الرحمہ شیطان کو کنکریاں مار کر آرہے تھے اور میں کنکریاں مارنے جا رہا تھا۔ اس موقع پر ان سے تفصیلاً ملاقات ہوئی۔

مولانا نعمانی صاحب مرحوم و مغفور کا دامن طعن و تشنیع، طنز و مزاح اور عیب جوئی سے پاک رہا۔ ملی فروعی مسائل پر انہوں نے اپنے دامن کو کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔

تقسیم ہند کا مسئلہ

ہندوستان کی تقسیم کے مسئلے پر ہندوستان کے علماء دین دو بلاکوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ہمارا گھرانہ مسلم لیگی تھا لیکن مولانا نے کبھی مسلم لیگ کو اپنی مخالفت کا نشانہ نہیں بنایا۔ اگر چہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندستان کے بٹوارے سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہوں گے انہیں اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ چند گمراہ جوشیلے نوجوان اپنے علماء دین کے ساتھ جو ناشائستہ برتاؤ کر رہے ہیں وہ شعائر اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ ہندستان کی تقسیم سے یہاں کے مسلم باشندے جو کروڑوں کی تعداد میں ہیں ان کے مصائب و آلام ختم نہیں ہو سکیں گے ۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ شعائر اسلامی کی خلاف ورزی، جن گمراہ نوجوانوں سے سرزد ہوئی اس کا کفارہ آج ہم سب لوگ ادا کر رہے ہیں، ہم میں رواداری قطعی مفقود ہو گئی ہے کبھی جاگیرداروں کے نام پر کبھی صوبائیت کے نام پر، کبھی فرقہ واریت کے نام پر کبھی چھوٹی چھوٹی برادریوں اور قبیلوں کے نام پر یہاں خواہ مخواہ بے بات کے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان لے رہا ہے، مسلمانوں کو کھلے عام لوٹ رہا ہے۔ مسلمان، مسلمانوں کے ہاں ڈاکے ڈال رہے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کی املاک تباہ کر رہے ہیں، خواتین کی آبروریزیاں کر رہے ہیں، مساجد کے تقدس کو پامال کر رہے ہیں اور اس حقیقت سے قطعی بے خبر ہیں کہ

اللہ تعالیٰ کے نزدیک، صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ غیر مسلم کو ناجائز قتل کرنا اسے بے حرمت کرنا یا اس کی املاک کو نقصان پہنچانا ایک نا قابل معافی گناہ ہے۔

میں ایک عاجز دنیادار آدمی ہوں لیکن دین حنیف کی تھوڑی بہت رمق جو یہ خاکسار اپنے وجود خاکی میں پاتا ہے، یہ مولانا علیہ الرحمۃ کے فیض صحبت اور ان کی خصوصی توجہ کا اثر ہے اور ان کا وہ احسان ہے جس کی جزاء رب کریم و رحیم ہی انھیں عطا فرما سکتا ہے۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ و اکرم نزلہ ووسع مدخلہ و اغسلہ بالماء و الثلج والبرد ونقہ من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس و ادخلہ یا رب جنتک مع النبیین و الصدیقین والشھداء و الصالحین وحسن اولئک رفیقا آمین یا رب العالمین ۔

محمد فرقان محمد نعمان القاسمی
مکہ مکرمہ

اپنی باتیں کچھ نا قابل فراموش یادیں

حضرت اقدس مولانا محمد منظور صاحب نعمانی رحمہ اللہ علیہ کا نا
پھر اس کے بعد جب ابتدائی کلاس میں مولانا مرحوم کی کتاب اسلا
نام ذہن میں نشیں ہو گیا ویسے تو ہمارے والد صاحب مرحوم کا بہت
مرحوم جب بھی کسی کام سے لکھنو جاتے تو حضرت مولانا سے ضرو
تھے۔ گہرا تعلق اس بنا پر بھی تھا کہ جب رسالہ الفرقان بریلی سے شائ
والد صاحب مرحوم اور چچا محمد عرفان بیگ صاحب مرحوم نے بھی کچھ عرصہ اس رسالہ کے سلسلہ میں خدمت کی جو شاید پرانی فائلوں میں ابھی موجود ہو۔ اس طرح سلسلہ بڑھتا گیا پھر ایک دور ایسا آیا کہ حضرت مولانا نے مولوی حسان نعمانی اور مولانا زکریا صاحب و مولانا خالد صاحب کو مدرسہ نور العلوم بہرائچ والد صاحب مرحوم کی زیر نگرانی تعلیم کیلئے بھیجا۔ جو مستقل کئی سالوں تک حضرت مولانا کی یاد کا سبب بنے رہے اور ہمارا ایک پرانا تعلق حضرت مولانا سے قائم رہا۔ لیکن اس کے باوجود مولانا سے ملاقات اور انکی زیارت سے لطف اندوز نہ ہو سکا اور اس امید اور محبت کو لئے ہوئے ہم حجاز مقدس بھی آگئے بفضلہٖ واحسانہ کئی سال کے بعد حجاز مقدس سے جب ہم اپنے رشتہ داروں سے ملنے کی غرض سے آئے تو پھر حضرت مولانا کی یاد امنڈ پڑی اس پہلی زیارت کے بعد پھر سلسلہ ملاقات کا شروع ہو گیا پھر بارہا ملاقات وزیارت اور گفتگو نیز ساتھ میں تناول کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ قربان جاؤں اس پاک روح پر !

ایک بار کا واقعہ ہے کہ لکھنؤ جانا ہوا تو مولانا کی یاد تازہ ہو گئی دل چاہا کہ ملاقات بھی کرلوں۔ لیکن جب بھی پہنچتا تو دیکھتا کہ مکان پر ایک تختی لگی ہوئی ہے "مولانا کی طبعیت ناساز ہے ملاقات کیلئے بعد العصر تشریف لائیں" اس تختی کو دیکھ کر مایوسی کے ساتھ واپس ہونا پڑتا اور

کچھ دل میں ملال بھی ہوتا۔ کہ جب بھی آؤ تو یہ تختی لٹکی ملتی ہے! ایک بار دہلی کے سفر سے لکھنو کا گذر ہوا۔ وقت تقریباً صبح کا تھا خیال آیا کہ اب تو حجاز مقدس کی روانگی ہے کاش مولانا سے ایک منٹ کی ملاقات ہوجاتی (توز ہے قسمت) مایوسی کے ساتھ ساتھ گھر کی طرف قدم بڑھائے قریب پہونچا تو دیکھا تختی وہی حسب معمول لٹکی ہوئی ہے۔ لیکن اس مرتبہ مایوسی کے ساتھ کچھ امید اور خوشی بھی شامل تھی ـــــ تختی پر نظر پڑتے ہی میں نے بے دھڑک دستک دیدی تھوڑی دیر انتظار کے بعد ایک آواز بھی لگادی۔ کسی نے دروازے کے سوراخ سے دیکھا اسکے بعد تھوڑی دیر میں دروازہ کھل گیا اور اندر جانے کی اجازت مل گئی، سامنے ہی کمرے میں حضرت مولانا جلوہ افروز تھے۔ نظر پڑتے ہی دل میں ایک محبت اور فرحت محسوس ہوئی جسکا اظہار مشکل ہے سلام اور مصافحہ کے بعد میں نے کہا حضرت الوداع کا سلام کرنے حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا بیٹے! تم تو کافی عرصہ سے آئے ہوئے ہو ملاقات اب کی! تو میں نے اپنی پوری تختی کی کہانی سنادی ہنستے ہوئے فرمایا "بیٹے یہ تختی تو یہاں کے مقامی لوگوں کیلئے ہے کہ وقت بے وقت چلے آتے ہیں باہر سے آنے والوں کیلئے کوئی وقت نہیں، تم تو اپنے ہو۔ تمہارے لئے ہر وقت دروازہ کھلا ہے" یہ سننا تھا کہ دل باغ باغ ہوگیا۔

غالباً ۱۹۸۵ء میں رابطہ عالم الاسلامی کے اجلاس میں حضرت نے اپنی معذوری کے باوجود مع بھائی سجاد صاحب اور استاذی مولانا زکریا صاحب کے ساتھ شرکت فرمائی اور عمرہ اور زیارت کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ کچھ بہت معمولی سی خدمت کا موقع ملا جسکا حقیقت میں کوئی شمار نہیں۔ اس خدمت سے اتنا متاثر ہوئے کہ وطن پہونچنے پر زیارت حرمین کے عنوان سے جو سفر نامہ تحریر کیا تو اس میں ہم سبھی کا نام بنام تذکرہ کیا اور اپنی محبت اور بہت سی دعاؤں سے نوازا۔ اللہ رب العزت اپنی شان کے مطابق اسکا انھیں نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

یہ ہیں اہل ظرف کہ اس تھوڑی سی خدمت کو فراموش نہیں کیا بلکہ اسوقت سے ابھی تک پابندی کے ساتھ رسالہ الفرقان 'فرقان' کے نام جاری کردیا۔ جو کہ ابھی تک جاری ہے، اللہ جل جلالہ اسکے بدلے میں صدیقین شہداء اور صالحین کا مرتبہ نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین

بڑے لوگوں کی یہ ہیں بڑی باتیں۔

انھیں احسان اور محبت کی بنا پر حضرت مولانا رحمہ اللہ علیہ کی یاد طواف اور ملتزم پر ضرور آتی ہے اللہ پاک اپنی بے شمار رحمتوں سے نوازے اور مغفرت فرما کر اعلیٰ درجات سے سرفراز کرے۔ آمین۔

خدا رحمت کند ایں عاشقِ پاک طینت را

حافظ محمد ابراہیم فانی
دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک۔ پاکستان

مرثیۂ فارسی

بر سانحۂ ارتحال حضرت العلامہ مولانا محمد منظور نعمانی نور اللہ مرقدہ مدیر الفرقان لکھنؤ

نعرہ زد ہاتف کہ دردا شیخ ربانی برفت
یعنی آں علا.

از در و دیوار می آید صدائے درد و غم
آں متاعِ علم و دانش سیف رحمانی برفت

شورِ بلبل بر نیاید خندۂ گل بے مزہ
یک گل تازہ ازیں بستانِ عرفانی برفت

آں خطیب بے مثیل و آں ادیب بے عدیل
بہر حفظ دین و ملت تیغ برّانی برفت

حامیٔ سنت کہ بود و ماحیٔ بدعات و شرک
ترجمانِ دیوبند آں شیر یزدانی برفت

واقفِ اسرارِ قرآں شارحِ علم حدیث
آں مبلغ بے بدل داعیٔ لاثانی برفت

منظور نعمانی مادۂ تاریخ وصال آں مرحوم بحساب ہجری ۱۴۱۷ حاصل میشود۔ فانی

رونقِ بزمِ صحافت زینتِ اقلیم علم رازدانِ مکرِ رفض و "قلب ایرانی" برفت

او مناظر بود قابل بہر نشر دین حق پیکر نطق فصیح وزور برہانی برفت

مستمند بر حال مسلم نالہ سنج بر ضعف او رشکِ تقویٰ افتخار بزم روحانی برفت

نابغہ روز گارے در سواد ہند بود آں مثال وصفِ بوذر فقر سلمانی برفت

سرگروہِ بزم اصحاب عزیمت در زماں
کوکب آں چرخِ دانش حسرتا فانی برفت

☆☆☆

فکر نعمانی کی جھلکیاں
آئینہ الفرقان میں

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو
اقبال

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے میں ہوتے!

[قرآن پاک امت کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ بالعموم اس کے پیغام سے بے پرواہے، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوں اور اہل ایمان ان کی طرف سے غافل۔ یہ اس مضمون کا حاصل ہے اور دعوت ہے۔ رجوع الی القرآن ا صفر در بیعین ۱۳۶۲ھ میں چھپا۔ مرتب]

فرض کیجئے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے میں ہوتے

اور کسی قابل اعتماد اور باوثوق ذریعہ سے ہم کو معلوم ہو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نہایت اہم پیغام سنا۔

وضلالت اور نجات وہلاکت کے راستوں کو صاف صاف بیان کر دیں۔

بندوں پر اللہ کی حجت تمام کر دی جائیگی، اور مقدس رسول کی زبانی اللہ پاک کا یہ آخری پیغام ہوگا جس کے بعد ہم کوئی الٰہی پیغام اور رسول خدا کا کوئی جدید بیان نہیں سن سکیں گے ——— اور اس مقررہ ومشتہرہ مقام پر پہنچنا بھی ہمارے لئے بہ آسانی ممکن ہوتا، اور اس تاریخ کے آنے کے بعد میں ابھی اتنے دن بھی باقی ہوتے کہ اس سرکاری پیغام کی اصلی زبان اگر ہم نہ جانتے ہوتے تو اس کا سیکھ لینا بھی اس عرصہ میں ہمارے لئے ممکن ہوتا جس کے بعد ہم اس پیغام کو اس کی اصلی اسپرٹ میں پوری طرح سمجھ سکتے اور پھر اس کے سیکھنے کے وسائل بھی ہم کو میسر ہوتے ——— لیکن اس کے باوجود ہم اس زبان کے سیکھنے کی کوئی کوشش نہ کرتے، اور جب وہ مبارک دن آجاتا تو اللہ کے اس نہایت اہم پیغام اور رسول کے اس آخری بیان کو سننے یا بعد کو بالواسطہ ہی اس سے واقفیت حاصل کرنے کا خیال بھی ہمارے دل میں نہ آتا اور اسکی طرف ہم کوئی توجہ ہی نہ کرتے ، تو کیا دنیا کی کوئی عقل بھی ہمارے اس طرز عمل کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتی تھی کہ ہمارے دلوں میں اللہ ورسول کی کوئی عظمت ووقعت اور ہماری نظروں میں ان کے پیغاموں کی کچھ بھی قدر وقیمت ہے؟

کوئی دوسرا کچھ کیوں کہے! آپ ہی خوب سوچ سمجھ کر اپنے دلوں سے اس کا جواب لیجئے! ——

اچھا اگر آج کسی شخص کے متعلق آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس نے اللہ ورسول اور انکے مقدس پیغاموں کی طرف سے اتنی ہی بے اعتنائی اور ایسی ہی لاپرواہی اختیار کر رکھی ہے تو کیا اس کے بعد بھی دولت ایمان وایقان سے اس کی محرومی میں آپ کو کچھ شک شبہ ہو گا۔؟

سوال کی جو صورت سطور بالا میں آپ کے سامنے رکھی گئی ہے کیا یہ محض فرضی ہے۔؟

بیشک رسول اللہ ﷺ اپنے جسد عنصری کے ساتھ اس دنیا میں رونق افروز نہیں ہیں لیکن اللہ پاک کا جو آخری فیصلہ کن پیغام اس کے آخری رسول، حضرت محمد عربی (فداہ امی وابی) لیکر آئے تھے وہ بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے آج ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گزر جانے پر بھی اپنی اسی شان جلالی و جمالی اور اسی شادابی و تازگی کے ساتھ موجود ہے، ہمارے گھروں میں اس کی کئی کئی کاپیاں اور کئی کئی نسخے رکھے ہوئے ہیں —— اب ہم جس وقت چاہیں خداوند قدوس کے اتارے ہوئے اور مقدس رسول کے لائے ہوئے اس "پیغام ہدایت" کو بالکل اسی کے اصلی لفظوں میں دیکھ سکتے ہیں پڑھ سکتے ہیں اور اگر ان کو تھوڑی سی بھی عربی آتی ہو تو خود اس کا مطلب و منشاء سمجھ سکتے ہیں، اور کسی درمیانی واسطہ کے بغیر اس سے براہ راست ہدایت حاصل کر سکتے ہیں، اللہ کی رضامندی اور فلاح دینوی واخروی کے طریقے اس سے دریافت کر سکتے ہیں،

گویا یوں سمجھئے کہ نہایت پیاری اور بیحد شیریں عربی زبان بولنے والا اور عربی مبین ہی میں خدا کا "پیغام ہدایت" سنانے والا ایک زندہ جاوید پیغمبر (بشکل قرآن ہمارے گھروں میں آج بھی موجود ہے۔

لیکن ہمارا برتاؤ اس کے ساتھ کیا ہے؟ —— کتنے ہم میں ہیں جو اس سے ہدایتی تعلق رکھتے ہیں —؟ کتنے ہیں جو اس سے اچھی طرح فیض حاصل کرنے کے لئے اور س کو براہ راست سمجھنے کے لئے عربی زبان سیکھ چکے ہیں یا سیکھ رہے ہیں؟ اور کتنے ہیں جو عربی زبان نہ جاننے اور اس کے لئے کوئی ذریعہ بھی نہ پاسکنے کی مجبوری سے کسی اردو ترجمہ یا تفسیر کی روشنی میں یا درس قرآن کے کسی حلقہ میں شریک ہو کر ہی اس کی بات سمجھنے کی اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے لئے اپنے وقت کا کچھ حصہ صرف کرتے ہیں؟

ذرا ہندوستان ہی کے "نو کروڑ مسلمانوں" پر اس جہت سے ایک نظر توڈا لئے اور سوچئے کہ کتنی گہرائی ہے ان کے ایمانی دعووں میں اور کتنا تعلق ہے ان کو اللہ ورسول اور ان کے پیغاموں سے؟

اللہ کے بندو! رسول کی محبت کا دم بھرنے والو اور قرآن کی عظمت و تقدیس کی قسمیں کھانے والو! اللہ ورسول کے اس مقدس پیغام (قرآن) کے ساتھ یہ بے اعتنائی اور یہ لاپروائی!

کیا خدا کے سامنے اپنے اس تغافل مجرمانہ کی تم جواب دہی کر سکو گے؟ اور کیا عذر ہوگا تمہارا اس وقت جب رب العزت کے تختِ جلال کے سامنے اس کا رسول فریادی بن کر درد وحسرت کے ساتھ کہتا ہوگا۔

یا رب ان قومی اتخذوا هذا القرآن مهجورا (اے میرے خداوند! میری اس قوم نے اس قرآن کو بالکل چھوڑ رکھا تھا)۔

قرآن پاک کے ساتھ مسلمانوں کے معاملہ پر اگر آپ طبقہ وار نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ "مسلمان" کہلانے والی امت میں ایک بہت بڑی بلکہ خارج از حد و شمار تعداد تو ان قطعاناتعلیم یافتہ سب سے نیچے کے طبقہ کے عوام کی ہے جن بے چا[illegible] بھی نہیں لگی۔

پھر ان سے کچھ کم تعداد میں دوسرے درجہ کے وہ عوا[illegible] کسی پرانے طرز کے مکتب میں بیٹھ کر یا کسی "حافظ جی" سے قرآن[illegible] بعد کبھی اس کو کھول کر دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی، بجز اس کے کہ محلہ، برا[illegible] کوئی مر جاتا ہو اور پڑوس یا قرابت کے خیال سے اس کے "تیجے" میں ایک آدھ پارہ پڑھنا پڑ جاتا ہو۔ پھر وہ بھی اپنے لئے نہیں بلکہ اس مر جانے والے کو "بخشنے" کے لئے بلکہ فی الحقیقت تو اکثر و بیشتر صرف محلہ یا برادری کا "حق" اتارنے ہی کے لئے ——— تو اس طبقے کا تعلق "قرآن مجید" سے بس کسی کی موت اور تیجے ہی کا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اس قسم کے لوگوں سے کچھ کم تعداد میں کچھ ایسے نیک لوگ بھی ہیں "جو حصول ثواب و برکت" کی خاطر کبھی کبھی یا روز مرہ قرآن مجید کے پارہ دو پارہ کی تلاوت تو کرتے ہیں اور بڑی خوش اعتقادی سے کرتے ہیں مگر بیچارے اسکے مطلب و مقصد سے قطعاً ناآشنا ہیں، کیونکہ عربی جو اسکی زبان ہے اس سے واقف نہیں اور جس زبان میں پڑھنا لکھنا وہ جانتے ہیں مثلاً اردو تو اگرچہ اس میں اب بہت سے ترجمے اور تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور ایک اردو داں انکی مدد سے بھی قرآن مجید کے مطلب و مقصد سے اچھی خاصی حد تک آشنا ہو سکتا ہے لیکن ان بیچاروں کے ذہن میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور اپنی عملی زندگی کے لئے اس سے

ہدایت لینا بھی کوئی بہت ضروری بات ہے، اس لئے مدت العمر وہ بس تلاوت ہی کا ثواب حاصل کرنے پر قانع رہتے ہیں، گویا کہ قرآن مجید بس ان کی تلاوت ہی کے لئے نازل ہوا ہے اور اس سے زیادہ اس کا کوئی مطالبہ ان سے نہیں ہے اسی واسطے قرآن پاک کے مطالب و مقاصد سے واقفیت حاصل کرنے کا کوئی داعیہ کبھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتا،

رہا جدید تعلیم یافتہ طبقہ تو باستثنائے شواذ اس کی غالب ترین اکثریت نے دین کے تمام ہی علمی و عملی شعبوں سے جیسی کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے، اور حیاۃ دنیا ہی کی کامرانیوں کو مطمح نظر بنا کر جو ارشاد ربانی -

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ أُولٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔

لا ریب، جو لوگ (موت کے بعد عالم آخرت میں) ہماری لقا (یعنی دربار خداوندی میں حاضری اور پیشی) کے امیدوار نہیں ہیں اور حیات دنیا ہی سے خوش اور اس میں مگن ہیں اور جو ہماری آیتوں سے غفلت و بے پروائی برتتے ہیں ان سب کا ٹھکانا جہنم ہوگا اپنی بدکرداریوں کے بدلے۔

کا ہو بہو مصداق ہو گیا۔ اسکو قرآن پاک بلکہ خود قرآن نازل کرنے والے اور اس کے لانے والے (اللہ ورسول) کے ساتھ جیسی کچھ دلچسپی ہے وہ ہر واقف حال کو معلوم ہے۔

ان تمام طبقات کی بہ نسبت محدود اور قلیل التعداد ایک گروہ "باضابطہ علمائے کرام" کا بھی جو اپنی اس قلت کے باوجود بھی ہزاروں سے متجاوز اور لاکھوں کے شمار میں ہوگا، ان حضرات نے برسہا برس دینی مدرسوں میں گزار کے عربی زبان سیکھی ہے، اسکی صرف و نحو تک پر آٹھ آٹھ دس دس کتابیں پڑھی ہیں، معانی اور بیان و بدیع میں بھی کم از کم "تلخیص المفتاح" اور "مختصر المعانی" تو ضرور ہی ان کے زیر درس رہی ہوگی، فقہ اور حدیث کی بہت سی کتابوں پر بھی اُنھوں نے عبور حاصل کیا ہے، قرآن کی تفسیر کے نام سے بھی کم از کم ایک کتاب "جلالین" تو سبقاً سبقاً پڑھی ہی ہوگی، اور اگر خوش نصیبی سے تعلیم کسی بڑے "دارالعلوم" میں ہوئی ہے تو شاید "بیضاوی" و "مدارک" کا کچھ حصہ بھی زیر درس رہا ہو، اس لئے قرآن پاک میں تدبر و تفکر اور اس کی ہدایات سے براہ راست استفادہ کم از کم اُن کا تو شغل حیات ہی ہونا چاہئے، اور اُن کے متعلق تو یہ اُمید بجا اور درست ہی ہونی چاہئے کہ اللہ کی اس کتاب عظیم سے ان کا تعلق بڑا گہرا

ہوگا اور یہ خوش نصیب حضرات تو "قرآن حکیم" کی تلاوت بالکل اس طرح اور اس تصور کے ساتھ کرتے ہوں گے کہ اُن کے سامنے گویا ایک پیغمبر ہے جو خدا کی غیر مشکوک وحی ان کو سنا رہا ہے اور وہ اپنے سینے کے کواڑ کھول کے اس کے سامنے اس کا درس ہدایت سننے اور اُس پر عمل پیرا ہونے ہی کیلئے بیٹھے ہیں۔

مگر آہ کہ یہاں بھی یہ امید بڑی حد تک پامال ہی ہے۔ مستثنیات کو چھوٹ کر (جن کا شمار غالباً پانچ فیصد ع بھی نہ ہوگا) اس طبقۂ علماء کا عام حال بھی اس باب میں دوسروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہاں بھی قرآن مجید کی عموماً "تلاوت" ہی کی جاتی ہے اور "کتاب ہدیٰ" و "موعظۃ وذکریٰ" ہونے کی اس کی جو اصل حیثیت تھی وہ یہاں بھی عموماً کم از کم عملاً تو فراموش ہی کر دی گئی ہے۔ حالانکہ خود اس کا نازل کرنے والا اسی میں یہ اعلان کر رہا ہے کہ "یہ کتاب اسی واسطے بھیجی جا رہی ہے کہ تم غور و تامل سے اس کی باتیں سنو، اس کے احکام سمجھ ہدایت ونصیحت حاصل کرو"۔

کتاب انزلناہ الیک لیدبروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب ۔ (یہ قرآن) ایک کتاب ۔ نازل کیا ہے کہ لوگ اس عقل ودانش اُس سے نصیحت

اور جو لوگ آیات قرآن کو سمجھ بوجھ کر اُس سے ہدایت ونصیحت حاصل نہیں کرتے ہیں اُن کے متعلق ارشاد ہے -

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں!

وا اسفاہ! اللہ پاک تو ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن پاک کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ذرا گوش دل سے سنو! کیسی پیاری اس کی یہ صدا ہے۔

لقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر ہم نے نصیحت کے واسطے قرآن کو آسان کیا، ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت لینے والا؟

لیکن ہم نے شاید یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جہاں تک دینی ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ہے اُس کے لئے تو دوسرے وسائل (مثلاً بزرگان کرام اور پیران عظام) ہی کافی ہیں، اور قرآن تو بس "ثواب تلاوت" حاصل کرنے کیلئے گویا "وظیفہ" کی ایک کتاب ہے۔

حتیٰ کہ نماز میں قرآن پاک جو پڑھا جاتا ہے تو عام خیال اُس کے متعلق بھی یہی ہو گیا

ہے کہ بس صحت حروف کے ساتھ "قرأت" ہو جانی چاہیئے، اسی لئے پوری توجہ الفاظ کے سنوار اور اُتار چڑھاؤ، نیز آواز میں جاذبیت ودلکشی پیدا کرنے پر تو صرف کی جاتی ہے، مگر اُن الفاظ کے ذریعہ جو کچھ ہدایت قرآن مجید دینا چاہتا ہے اور یہ الفاظ جس کے لئے بس ایک حسین اور مقدس پیراہن اور بہترین واسطۂ تبلیغ کی حیثیت رکھتے ہیں اُس کی طرف دھیان دینے کی مطلق ضرورت نہیں سمجھی جاتی، گویا جسم و پیراہن کی آرائش وتزئین کی تو پوری کوشش کی جاتی ہے مگر جان اور روح سے مکمل بے پروائی برتی جاتی ہے (۱)، اور یہ بدیہی حقیقت گویا بالکل ہی فراموش کردی گئی ہے کہ "کتاب الٰہی" کی قرأت کا اصلی اور اولیں مقصد تو تذکیر و تذکر ہی ہو سکتا ہے، حضرت علی مرتضیٰؓ کا مشہور اثر ہے۔

لا خير في قرأة ليس فيها تدبر ولا	جس قرأت و تلاوت کے ساتھ تدبر و تذکر نہ ہو اور
خير في عبادة ليس فيما تفقه	جس عبادت میں تفقہ نہ ہو اُس میں کچھ خیر نہیں۔

(رواہ رزین، جمع الفوائد ج ۲، ص ۲۷۹)

خیر بات کچھ طویل ہو گئی ورنہ عرض تو صرف یہ کرنا تھا کہ قرآن پاک کے ساتھ اس وقت ہمارا برتاؤ کیا ہے؟ اور ہونا کیا چاہیئے؟

پھر یہ سب کچھ سامنے آجانے کے بعد اس سلسلہ کا تیسرا اور آخری سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ جب حالات یہ ہو چکے ہیں تو اب چارۂ کار کیا ہے

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟

چارۂ کار

پس اگر آپ نے معاملہ کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر لیا ہے، اور اس سلسلہ میں آپ پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس سے آپ عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو پہلا کام آپ کا یہ ہے کہ اولاً اس نقطۂ نظر سے اپنے ہی طرز عمل پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اگر خدانخواستہ آپ نے بھی اب تک قرآن پاک کے سمجھنے اور اس سے ہدایت ونصیحت حاصل کرنے کی کوشش میں کوتاہی کی ہے تو آئندہ کیلئے آج ہی سے رویہ کو بدل دیجئے! اس طرح، کہ اگر آپ خدا کے فضل وکرم سے

---

(۱) "مشکوٰۃ شریف" کی شرح "التعلیق الصبیح" میں بحوالہ شیخ ابی طالب مکی رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث بایں الفاظ نقل کی ہے "ليس للعبد من صلوته الا ما عقل منها" (ج ۱، ص ۳۶۵) یعنی بندہ کو اسی نماز بلکہ اتنی ہی نماز کا اجر وثواب ملے گا جو اس نے

الد
ماص

قرآن پاک سمجھنے کے بقدر عربی جانتے ہیں تو اب ہدایت و نصیحت حاصل کرنے کے ارادہ سے اس کو سمجھ سمجھ کر پڑھنے کی عادت ڈالیئے! اور اگر آپ اتنی عربی نہیں جانتے ہیں تو پھر کسی عربی داں کی مدد سے اتنی عربی سیکھ لیجئے اور یقین کیجئے کہ اگر اس راہ میں آپ کو کوئی اچھار ہنما مل گیا تو بس دو تین مہینے کی معمولی محنت سے آپ قرآن فہمی کی ضرورت کے بقدر عربی سیکھ سکیں گے، اور جو کمی رہ بھی جائے گی وہ انشاء اللہ قرآن پاک کے اشتغال سے یوں ہی پوری ہوتی رہے گی، بلکہ اس عاجز کا تجربہ تو صرف ایک مہینہ کا بھی ہے۔

کاش میرے سر دوسرے کاموں کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو جی چاہتا تھا کہ میں شہر بہ شہر گشت کر کے اسی کی تبلیغ کرتا پھرتا اور جو لوگ عربی زبان کو مشکل سمجھ کر اس کی تحصیل سے ہچکچاتے ہیں اور اس لئے قرآن و حدیث کی برکات سے محرومی ہی پر قانع ہو جاتے ہیں ان کو صرف ایک مہینہ میں بعون اللہ تعالیٰ اتنی عربی سکھا کر دکھاتا جس کے ا
ایک عربی داں طالب علم کی طرح پڑھ سکتے اور اپنی ذاتی بصیر
موعظت حاصل کر سکتے۔ ہاں اگر توفیق الٰہی نے مساعدت کی تو
جن سے اپنے اس تجربہ کے افادہ کو کچھ عام اور وسیع کر سکے
المستعان۔

بہر حال، تو اگر آپ اللہ پاک کے اتارے ہوئے اور اس کے رسول کے لائے ہوئے اس مقدس و مبارک "ہدایت نامہ" سے براہ راست واقفیت و آشنائی پیدا کرنے کیلئے، گویا (مجازی زبان میں) خدا اور اس کے رسول کی باتیں دو بدو سننے اور بلا واسطہ ان سے مستفیض اور لذت اندوز ہونے کیلئے صرف دو تین مہینے تک بھی بس گھنٹہ دو گھنٹہ یومیہ خرچ کر سکتے ہوں تو آپ کو چاہئے کہ اس میں کوتاہی نہ کریں، اور آپ کے محلّہ میں، یا آپ کی بستی سے قریب جہاں بھی کوئی مولوی صاحب ایسے موجود ہوں جو اس سلسلہ میں آپ کو کچھ مدد دے سکیں تو ضرور آپ ان کی مدد سے عربی زبان سیکھنے کی کوشش میں ابھی سے لگ جائیں (۱)، اور جب مہینے دو مہینے میں عربی سے آپ کو کچھ بھی شد بد ہو جائے تو پھر آپ کسی عالم دین ہی سے قرآن پاک کا درس لینا شروع کر دیں۔

اور اگر کسی وجہ سے آپ کیلئے اس طرح عربی زبان سیکھ کر درس قرآن لینے کا امکان نہ

---

(۱) اگر وہ صاحب بھی "تھوڑے وقت میں اور مختصر راستہ سے عربی زبان سکھا دینے" کی کوئی خاص بصیرت نہ رکھتے ہوں تو وہ اس عاجز سے خط کتابت کر کے اس بارہ میں مشورہ لے سکتے ہیں۔

ہو تو پھر کم از کم اس کی کوشش کیجئے کہ آپ کی بستی کی مسجد میں ترجمۂ قرآن کا درس ہوا کرے اور آپ اس میں شریک ہو کر حسب مقدور مطالب قرآنی کے سمجھنے کی کوشش کریں نیز دوسروں کو بھی اس کی اہمیت جتلا کر شرکتِ درس اور اُس سے استفادہ کی ترغیب دیں۔

اور اگر بالفرض آپ کسی ایسی جگہ رہتے ہیں کہ وہاں کوئی شخص ترجمۂ قرآن پڑھانے والا ہے ہی نہیں اور اس لئے درس قرآن کے اجراء کا انتظام آپ کے بس میں نہیں ہے تو پھر کم سے کم اس کا التزام کیجئے کہ ہر روز قرآن مجید کا جتنا حصہ آپ پڑھ سکتے ہوں ترجمہ ہی کے ساتھ پڑھیں، اور تا مقدور ترجمہ کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں، پھر جتنی بات سمجھ میں آتی جائے اُس سے اپنے لئے ہدایت و نصیحت لیتے رہیں۔(۱)

امید ہے کہ اگر اس طور پر ترجمہ کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے کی آپ نے مستقل عادت ڈال لی اور تسلسل کے ساتھ اللہ پاک کی اس کتاب سے لپٹے رہے اور اس کے سمجھنے کی کوشش میں اس طرح ہی آپ لگے رہے تو قرآن مجید کا کافی حصہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ سمجھ سکیں گے۔

البتہ یہ بات بہر حال اور سب کیلئے ملحوظ رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید "ھدی للمتقیں" ہے لہذا اُس سے ہدایت و نصیحت کا نور اُنہی خوش بختوں کو حاصل ہو سکتا ہے جن میں "تقوی" ہو یعنی اللہ کا خوف اور عاقبت کی فکر ہو اور اسی کی بے چینی ان کو طلب ہدایت کیلئے قرآن پاک کے پاس لانے والی ہو، نہ کوئی اور شوق، اور نہ کوئی دوسری غرض ——— ورنہ ہم اور آپ سب ہی جانتے ہیں کہ ابو جہل اور ابو لہب تو آج کل کے ہر بڑے سے بڑے عالم دین سے بہتر قرآن کی زبان جانتے تھے لیکن چونکہ دل ایمان اور تقوی سے خالی تھے اس لئے اس بحر ہدایت سے ان کو ایک قطرہ بھی نہیں مل سکا، وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یومنون۔

☆☆☆

---
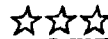
(۱) قرآن پاک کے اردو تراجم میں قدیم اور مستند ترین ترجمے حضرت شاہ عبد القادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کے ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں کچھ تو زبان کی نامانوسیت کی وجہ سے اور کچھ اُن حضرات کے التزامی اختصار کی وجہ سے غیر عربی داں عوام کو قرآن فہمی میں وہ کچھ زیادہ مدد نہیں دے سکتے۔ اس مقصد کے لئے موجودہ تراجم میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ کا ترجمہ راقم کے نزدیک زیادہ کارآمد ہے، نیز اردو تفاسیر میں آپ کی تفسیر "بیان القرآن" بھی اردو داں طبقہ کے لئے [illegible] تفسیر ہے۔

نیز "مدینہ پریس بجنور" کا شائع کردہ وہ قرآن مجید بھی اس سلسلہ کی ایک بہتر چیز ہے جس میں ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ [illegible] مشہور ہے۔ مرتب)

درس قرآن پاک

سورہ توبہ کی اہمیت، اُس کے ناقابلِ فراموش اسباق اور اس کا خاص پیغام

تبلیغی مرکز لکھنؤ کی مسجد میں ہر اتوار کو بعد نماز مغرب آپ کا درس
کرتا تھا۔ یہ اسی سلسلے کا ایک درس ہے۔ ۱۳رجون ۱۹۷۱ء کو

حمد و صلواۃ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

لقد جاء کُم رسول مِن انفسِکُم عزیزٌ علیهِ ما عنتم حریصٌ علیکُم بالمُو منینَ رؤفٌ رحیم ٭ فاِن تولوا فقل حسبِی اللهُ لا اله الا هو علیه تو کلتُ وَهُو ربُ العرشِ العَظیم ٭

(خاتمة سورة البراءة)

یہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیتیں ہیں جو آج میں نے پھر تلاوت کی ہیں، پچھلے ہفتہ اس سورت کے آخری دور کوع کا درس ہوا تھا اور ان دونوں آخری آیتوں کا بھی ترجمہ کر دیا گیا تھا اور مختصر تشریح بھی کر دی گئی تھی —— اس کے بعد آج سورۂ یونس کا درس شروع ہونا چاہئے تھا، لیکن سورۂ توبہ کی غیر معمولی اہمیت اور اس کے مضامین کی خاص نوعیت کی وجہ سے میں نے ارادہ کیا کہ آج بھی اسی سورت کے اہم مضامین کا اعادہ کیا جائے اور اس میں امت کو جو خاص سبق دئے گئے ہیں ان کو دہرایا جائے اور سمجھنے اور یاد کرنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت عمرؓ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ سورۂ توبہ کا علم حاصل کرنے کی خاص طور سے تاکید فرماتے تھے —— دراصل اس سورت کے ذریعہ اس ہدایت کی تکمیل ہوئی

ہے جو آغاز نبوت سے نازل ہونا شروع ہوئی تھی اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کیسا ایمان اللہ کے ہاں قابل قبول ہے اور اللہ و رسول کے ساتھ اور دین کے ساتھ مومن کا تعلق کیسا ہونا چاہئے۔

یہ سورت حضور ﷺ کے آخری دور حیات میں نازل ہوئی ہے ـــــ رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ نبوت کو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تین دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) آغاز نبوت سے مدینۂ طیبہ ہجرت فرمانے تک کے قریباً ۱۳ سال یہ پورا مکی دور ہے۔

(۲) ہجرت سے فتح مکہ تک کے قریباً ۸ سال، یہ گویا درمیانی دور ہے۔

(۳) فتح مکہ سے وفات تک کے قریباً ڈھائی سال، یہی آپ کا آخری دور حیات ہے، اسی میں ہر حیثیت سے دین کی تکمیل ہوئی ہے۔

یہ سورۂ براءۃ جیسا کہ آپ حضرات کو بھی اس کے مضامین سے اندازہ ہو چکا ہو گا اسی آخری دور میں نازل ہوئی ہے ـــــ ۹ ھ کے وسط میں 'مشہور روایات کے مطابق رجب کے مہینہ میں رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک والا سفر فرمایا، یہ آپ کا اور آپ کے اصحاب کرام کا سب سے طویل اور نہایت پر مشقت جہادی سفر تھا اور اس لحاظ سے بھی نہایت پر خطر تھا کہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور سلطنت یعنی رومی حکومت کی باقاعدہ اور نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ فوج سے جنگ کا امکان تھا جو لاکھوں کی تعداد میں تھی اور اس دور کے لحاظ سے بہترین اسلحہ اور ہر قسم کے سامان جنگ سے لیس تھی، اور آپ کے ساتھ صرف تیس ہزار کی جمعیت تھی جو رومی فوج کے مقابلہ میں بالکل ہی بے سروسامان تھی، حد یہ ہے کہ ان مجاہدین کے لئے غذا کی اتنی کمی تھی کہ بعض دنوں میں اللہ کے بندوں نے ایک ایک کھجور کھا کر گذارا کیا۔ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ موسم سخت گرم تھا اور بعض منزلوں پر پینے کیلئے پانی بھی نصیب نہیں ہوتا تھا، اسی لئے اس غزوہ کا ایک نام "عروۃُ العُسرہ" بھی ہے۔ یعنی تنگی اور فقر و فاقہ والا غزوہ۔

سورۂ توبہ کا کچھ حصہ تبوک سے کچھ پہلے اسی کے سلسلہ میں نازل ہوا تھا، اور کچھ حصہ تبوک کے سفر کے دوران میں نازل ہوا، اور زیادہ تر اس سفر سے واپسی کے بعد نازل ہوا ہے۔

بہرحال اس کے مضامین کا بہت کچھ تعلق غزوۂ تبوک اور اس کے سلسلہ کے واقعات سے ہے۔ میں اس غزوہ کے واقعات پوری تفصیل سے پچھلے ہفتوں کے درس میں موقع بہ موقع بیان کرتا رہا ہوں۔

ـــــ مختصر طور سے اس وقت پھر ذکر کرتا ہوں۔

واقعات کا سلسلہ یوں ہے کہ عرب کی مغربی سرحد پر جو شام کے علاقہ سے ملتی ہے عرب عیسائیوں کی کئی ریاستیں تھیں جو رومی شہنشاہی کی باج گزار تھیں اور گویا اس کی سرپرستی میں تھیں۔ جب ۸ھ میں مکہ معظمہ اور طائف کے فتح ہو جانے کے بعد قریباً پورے عرب پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا تو سرحد کی ان عیسائی ریاستوں نے محسوس کیا کہ یہ ابھرتی ہوئی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی نئی طاقت کسی وقت ہمارے لئے بھی خطرہ کا باعث بن سکتی ہے، وہ ایک ہی سال پہلے غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کی حوصلہ مندی اور جرأت و جانبازی کا تجربہ کر چکے تھے۔ انھوں نے اس بات کو رومی حکومت تک بھی پہونچایا جس کا اس وقت شام پر اقتدار تھا اور پھر رومی حکومت کی پوری امداد اور پشت پناہی کا اطمینان حاصل کر کے یہ منصوبہ بنایا کہ پوری طاقت سے مدینہ پر ایک بھرپور حملہ کر کے اس نئی ابھرتی طاقت کو اسی مرحلہ میں کچل دیا جائے اور پوری تیز رفتاری کے ساتھ اس کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے حکمت عملی کے طور پر یہ طے کیا کہ ان کو حملہ کرنے کا موقع کر کے ان پر ضرب لگائیں اور مسلمانوں کی ایمانی طاقت اور ان کرادیں تاکہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں۔

—— اس کے لئے عالم اسباب میں یہ ضروری تھا کہ مجاہدین کی زیادہ سے زیادہ تعداد آپ کے ساتھ ہو اس لئے آپ نے مدینۂ طیبہ اور قرب و جوار کے تمام مسلمانوں کو اس جہادی مہم کے لئے تیاری کا اور اس میں حصہ لینے کا اعلان عام جاری فرمادیا، اس سے پہلے کسی مہم اور جنگ کے لئے کبھی بھی اس طرح کی نفیر عام نہیں دی گئی تھی —— غزوۂ تبوک ہی میں آپ نے یہ حکم جاری کیا کہ ہر مسلمان جو معذور و مجبور نہیں ہے اس میں شرکت کرے۔ اور اتفاق کی بات کہ موسم انتہائی گرم تھا، اور مدینہ کے باغوں میں کھجوروں کے تیار ہونے اور پکنے کا زمانہ تھا اور اسی پر اہل مدینہ کی معیشت کا دار و مدار تھا، اس حالت میں اپنے باغوں کو چھوڑ کر جانا بڑا سخت امتحان تھا۔ اسکے علاوہ سفر دور دراز کا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسی فوج کے مقابلہ کے لئے جانا تھا جو اس وقت کی دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور فوج تھی اور جس نے چند ہی برس پہلے دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت فارس کی فوجوں کو شکست دے کر دنیا بھر پر اپنی برتری کا سکہ جمادیا تھا اور اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ اسی بنا پر منافقین یہ سمجھتے تھے کہ اس سفر میں جانا موت کے منہ میں جانا ہے اور جو جائے گا وہ واپس نہیں آئیگا، وہیں کے چیل کوے اور جانور ان کی لاشوں کو کھائیں گے۔ اس

لئے ان منافقین نے طرح طرح کے حیلے بہانے کئے اور نہیں گئے ـــــ ان منافقین کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے ایمانوں میں کچھ ضعف تھا اور اس لئے کم ہمتی تھی وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح بچ جائیں تو اچھا ہے۔

انہی حالات میں یہ پر جلال آیتیں نازل ہوئیں۔

"یاایها الذین اٰمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیوٰۃ الدنیا من الاٰخرۃ فما متاع الحیوٰۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا قلیل ٭ الا تنفروا یعذبکم عذاباً الیماً و یستبدل قوماً غیرکم و لا تضروہ شیئاً۔"

"یعنی اے مسلمانوں تمہارا یہ کیا حال ہے کہ جب تم کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کے راستے میں قربانی اور جانبازی کے لئے قدم اٹھاؤ اور چلو تو تم بجائے اٹھ کھڑے ہونے کے زمین پر پڑجاتے ہو، کیا تم نے آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کی خوش عیشی کو اپنے لئے پسند کر لیا ہے، حالانکہ دنیا کا سازوسامان آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ ہے اگر تم نے اس دعوت پر لبیک نہیں کہا اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نہیں چلے تو اللہ کی طرف سے تم پر بڑی سخت مار پڑے گی اور پھر وہ اپنے دین کی خدمت کے لئے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کردے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے خود ہی محروم ہو جاؤ گے۔"

ان پر جلال آیتوں کا روئے سخن دراصل ان مسلمانوں کی طرف تھا جن میں کچھ ضعف اور تذبذب تھا۔ ان آیتوں نے اس تذبذب کو ختم کر دیا اور ہر مخلص مسلمان نے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اللہ کی شان کہ کعب بن مالکؓ جیسے کئی ایسے مخلص مسلمانوں سے جو صفِ اول کے مخلصوں میں تھے لغزش ہو گئی اور وہ صرف سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے پیچھے رہ گئے، ان کے واقعات تفصیل سے پہلے بیان کئے جا چکے ہیں اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان واقعات میں امت کے لئے کتنے اہم سبق ہیں۔

الغرض ان کے علاوہ مدینہ طیبہ اور قرب وجوار کے قریباً سب ہی مسلمان حضور ﷺ کی نفیر عام پر لبیک کہہ کے آپ کے ساتھ تبوک کے لئے روانہ ہو گئے، ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی ـــــ مدینہ طیبہ سے تبوک تک کا ۱۴-۱۵ دن کا راستہ تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ بڑا ہی پر مشقت اور بڑے سخت مجاہدہ کا سفر تھا۔ لیکن مسلمانوں کی اس پیش قدمی نے ان عرب ریاستوں کے حوصلے پست کر دئے جو مدینہ طیبہ پر حملہ کا منصوبہ بنارہے تھے اس لئے انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ مدینہ کی اسلامی حکومت سے مصالحت کر لی جائے، یہ رسول اللہ ﷺ کی

اور مسلمانوں کی بڑی کامیابی تھی، چنانچہ قریباً بیس دن تبوک میں قیام کر کے اور اس سر زمین پر اللہ کا نام بلند کر کے، اذانیں دے کے اور نمازیں پڑھ کے آپ واپس تشریف لے آئے، اور آپ کے اس سفر نے اس علاقہ میں اسلام کے نفوذ کی اور آگے کی بڑی کامیابیوں کی راہ ہموار کر دی، اور دور دور تک مسلمانوں کی دھاک بٹھادی ——— اسکے علاوہ بہت سے داخلی فائدے ہوئے وہ مار آستین منافقین جن کا نفاق اب تک دبا ہوا اور چھپا ہوا تھا، اس غزوہ تبوک نے ان کا پردہ فاش کر دیا، اور سورۂ توبہ کی آیات نے انکو بالکل عریاں کر دیا پھر ان میں سے بہت سوں کا نفاق ختم ہو کر انکے اندر ایمان آگیا اور اس غزوہ کے سخت مجاہدہ نے مومنین صادقین کو اور نکھار دیا اور انکے ایمانوں میں بڑی ترقی ہوئی ——— اور کعب بن مالک وغیرہ چند مخلصین جو محض سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے اس غزوہ میں جانے سے رہ گئے تھے ان پر سخت عتاب ہوا اور انکو مقاطعہ کی ایسی سخت سزا دی گئی کہ قرآن پاک میں اسکا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ... "... الارض بما رحبت و ضاقت علیھم انفسھم" (یعنی ان کیلئے زندگی سے تنگ آگئے) مگر انھوں نے اللہ و رسول اور دین اخلاص کا پورا پورا ثبوت دے دیا تو انکی سچی توبہ کی بنا پر انکی معا... امت کو قیامت تک کیلئے ایک بڑا سبق دے دیا گیا۔

اسی سفر تبوک کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ جس طرح منافقین یہ سمجھتے تھے کہ یہ تبوک جانے والے مسلمان اب واپس نہ آسکیں گے اور رومی فوج ان سب کا وہیں خاتمہ کر دے گی اسی طرح عرب کے مختلف علاقوں کے وہ مشرکین جن سے رسول اللہ ﷺ نے معاہدے کر لئے تھے انھوں نے بھی یہی سمجھا اور ایسی شرارتیں شروع کر دیں جو معاہدوں کے بالکل خلاف تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک سے واپس آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان معاہدوں کو فسخ کئے جانے کا اعلان فرمادیا اور ان سب کیلئے چار مہینے کی مہلت کا بھی اعلان فرمادیا گیا، اور جن قبیلوں اور علاقوں کے مشرکوں نے عہد شکنی نہیں کی تھی انکے متعلق اعلان فرمادیا گیا کہ ان سے معاہدہ مقررہ میعاد تک قائم رہے گا لیکن آئندہ اس میں توسیع نہ ہوگی ——— اس سورۂ توبہ کے ۳-۴ رکوع قریباً ۳۰ آیتوں میں تمام مشرکین عرب کے سلسلہ میں اسی نئے فیصلے اور نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس حکم اور فیصلہ کا مقصد یہ تھا کہ عرب کا وہ خاص علاقہ جسکو دعوتِ توحید اور دین حق اسلام کا مرکز بننا تھا وہ شرک سے بالکل پاک صاف ہو جائے، بتوں سے اور بت پرستی سے کعبۃ اللہ کی تطہیر کی طرح یہ چیز رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے خاص مقاصد میں سے تھی، اور

اب اس کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا —— اسی سلسلہ میں یہ بھی حکم آیا کہ آئندہ مشرکوں کو اپنے مشرکانہ عقائد اور رسوم کے ساتھ حج میں شریک ہونے کی اور کعبہ کے طواف وغیرہ کی بلکہ مسجد حرام میں داخلہ کی بھی اجازت نہ ہوگی —— یہ سب نہایت اہم احکام اور فیصلے تھے —— غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ ہجری کے حج سے کچھ ہی پہلے سورۂ توبہ کا یہ ابتدائی حصہ نازل ہوا تھا — رسول اللہ ﷺ نے طے فرمایا کہ ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) آپ کے خاص نمائندہ اور امیر حج کی حیثیت سے اس سال حج کریں اور آپ کی طرف سے اللہ اور رسولؐ کے اہم فیصلوں کا حج میں شریک ہونے والے تمام عربوں کے سامنے اعلان کریں —— صدیق اکبر کے روانہ ہو جانے کے بعد بعض تجربہ کار لوگوں نے حضور کو توجہ دلائی کہ عربوں کا پرانا دستور یہ ہے کہ کسی معاہدے کے فسخ کرنے کا اعلان یا تو صاحب معاہدہ خود کرے یا پھر اسکا کوئی قریبی عزیز اور رشتہ دار کرے۔ اس بات کے سامنے آنے کے بعد آپ نے حضرت علی مرتضٰی کو روانہ کیا جو آپ کے حقیقی چچازاد بھائی اور داماد تھے، چنانچہ صدیق اکبر نے یہ اعلان انھیں سے کرایا۔ تو جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ سورۂ برأت کی شروع کی قریباً تیں آیتوں کا تعلق انھیں اہم فیصلوں سے ہے۔

سورہ برأت کی ان آیتوں میں ایک طرح سے گویا تمام مشرکین عرب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا تھا۔ قدرتی طور پر اس کے اثرات بہت سے مسلمانوں پر بھی پڑ سکتے تھے، کسی کے باپ یا بھائی ابھی شرک ہی کی حالت میں تھے، کسی کے دوسرے قریبی عزیز مشرک تھے، اب ان سب ہی کے خلاف اعلان جنگ ہو گیا تھا۔ اسکے علاوہ یہ بھی امکان تھا کہ اس نئی پالیسی کے اعلان کے بعد جنگوں کا ایسا سلسلہ چھڑ جائے جن سے کبھی فرصت نہ ملے اور سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے —— غالباً ان خیالات نے کچھ کچے مسلمانوں کے دلوں میں کچھ وسوسے پیدا کئے ہونگے۔ اور اگر اس وقت ایسے وسوسے پیدا نہ بھی ہوئے ہوں تو اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ ایسے سخت حالات میں ایسے وسوسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور قرآن مجید کو قیامت تک کے حالات اور امکانات کے پیش نظر رہنمائی دینا تھی اسلئے اس سلسلے کی آیتوں کے آخر میں مسلمانوں کو مخاطب فرما کر یہ سخت تنبیہ کر دی گئی۔

"قل ان كان آباؤكم وابناؤكم واخوانكم وازواجكم وعشيرتكم واموال اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومساكن ترضونها احب اليكم من الله ورسوله وجهاد في سبيله فتربصوا حتى ياتي الله بامره، والله لا يهدي القوم الفاسقين ٥"

اس آیت کا پیغام یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل کو ٹٹول لے اور جانچ لے اگر اس کا حال یہ ہے کہ اپنے ماں باپ، اپنی اولاد، اپنی چہیتی بیویوں اور دوسرے قریبی عزیزوں، رشتہ داروں سے یا اپنی کمائی ہوئی دولت اور اپنے چلتے ہوئے کاروبار سے یا اپنے مکانات اور جائداد سے اسکو ایسا تعلق ہے جو اللہ ورسول کے حکم کی تعمیل میں اور دین کے راستے میں قربانی دینے سے رکاوٹ بن سکتا ہے تو وہ اللہ کے ان بندوں میں سے نہیں ہیں جو اسکی رحمت اور عنایت کے مستحق ہوں بلکہ وہ "فاسقین" میں سے ہے۔ جس کو خدا کے عذاب کا انتظار کرنا چاہئے اور ایسے لوگ ہدایت کی نعمت سے محروم رہیں گے۔ اور پھر خداوندی رحمت اور جنت سے بھی محروم رہیں گے۔

میرے محترم بھائیو! اگر ہمارے دلوں میں کچھ بھی ایمانی رمق ہو تو یہ بڑی لرزا دینے والی آیت ہے، آج جہاد وجاں فروشی کا وہ میدان تو ہمارے سامنے نہیں
نازل ہونے کے وقت صحابہ کرام کے سامنے تھا، لیکن امتحان کے
ہیں، روز مرہ ایسے حالات اور معاملات سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے کہ
کے حکم پر چلیں اور دین کے مطالبہ اور تقاضے کو پورا کرنے کا فیہ
پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے یا ہماری بیویوں اور دوسرے گھر والوں کی نارا ن ت
ذرا سوچیں کہ ایسے موقعوں پر ہمارا طرز عمل کیا ہوتا ہے؟ ہم چھوٹے چھوٹے مقدموں میں جیت حاصل کرنے کے لئے اور بس اپنی ناک اونچی رکھنے کیلئے بے تکلف جھوٹی گواہیاں دے دیتے ہیں جو اشد حرام ہے۔ دین کے تقاضے ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے اس کے لئے اپنا آرام بھی قربان نہیں کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا کھلا فیصلہ یہ ہے کہ جن کا یہ حال ہو وہ اللہ کی نگاہ میں سخت مجرم ہیں اور اس کے مستحق ہیں کہ ان پر خداوندی عذاب کے کوڑے برسیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو جو آگاہی دی تھی وہ ہم آپ کو سب کو اور قیامت تک کے مسلمانوں کو دی گئی ہے ——— سورۂ توبہ کی یہ آیت ایک کسوٹی ہے جس سے ہر ایک اپنا ایمان جانچ سکتا ہے اور ایک آئینہ ہے جس میں ہم میں سے ہر ایک اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ سورۂ براءت کی ابتدائی قریباً تیس آیتوں کا تعلق مشرکین عرب سے اور ان کے بارے میں نئے فیصلے اور نئی پالیسی سے ہے۔

اسکے بعد ان اہل کتاب کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے اور ان سے جہاد کی دعوت دی گئی ہے جو اس وقت اسلام کو مٹادینے اور نور حق کو گل کر دینے کے منصوبے بنا رہے تھے اور انھوں نے اپنے پیغمبروں کا لایا ہوا دین اور ان کی شریعت کو چھوڑ کے اپنے نفس کی اور شیطان کی پیروی اختیار کرلی تھی ـــــ اس موقع پر قرآن پاک میں ان کے ٹھیٹھ مشرکانہ عقائد کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے -

''اتحذوا احبارهم و رهبانهم ارباباً من دون الله والمسيح ابن مريم وما امروا الا ليعبدوا الله الها واحداً لا اله الا هو سبحانه عما يشركون ہ''

یعنی انھوں نے اپنے احبار و رھبان کو یعنی عالموں اور درویشوں کو خدا کے علاوہ اپنا رب بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی خدا بنالیا ہے حالانکہ توریت وانجیل کے ذریعے انکو توحید کی تعلیم دی گئی تھی لیکن انھوں نے اس خداوندی تعلیم کو پس پشت ڈال کر یہ مشرکانہ طریقہ اختیار کرلیا ہے۔

پھر اس کے آگے کی آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ ان کے مذہبی پیشواؤں، پیروں اور پادریوں کی سیاہ باطنی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے .-

''يا ايها الذين آمنوا ان كثيراً من الاحبار والرهبان ليأكلون اموال الناس بالباطل ويصدون عن سبيل الله ہ''

یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے یہ پیر پادری جو بظاہر بڑے مقدس اور مہاتما بنے ہوئے ہیں ان میں سے بہت سوں کا حال یہ ہے کہ وہ ریاکار اور مکار ہیں اور حرام اور ناجائز طریقوں سے بس دنیا بٹورتے ہیں اور اپنے ماننے والے سیدھے سادے عوام کو لوٹتے ہیں اور اپنی جیبیں اور اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ یہ بالکل دولت کے پجاری ہوگئی اور انھوں نے خدا کے بجائے مال و دولت کو اپنا مقصود و معبود بنالیا ہے۔

ان آیتوں کا اگرچہ براہ راست تعلق بگڑے ہوئے یہود و نصاری اور ان کے حرام خور اور ریاکار پیروں، پادریوں سے ہے، لیکن ہم مسلمانوں کے لئے اور خاص کر ہم جیسوں کے لئے جن کو لوگ مذہبی عالم اور دینی پیشوا سمجھتے ہیں ان آیتوں میں بڑا سبق اور بڑی آگاہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے ''لتتبعن سنن من كان قبلكم شبراً بشبر وذراعاً بذراع'' جس کا مطلب یہ ہے کہ میری امت کے لوگ وہ سب کچھ کریں گے جو پہلی امتوں، یہودیوں اور نصرانیوں نے کیا اور بالکل ان کے قدم بقدم چلیں گے۔ یہاں تک کہ اگر پہلی امتوں کے

بد بخت نے اپنی ماں کے ساتھ حرام کیا تھا تو میری امت میں بھی یہ ہو کر رہے گا۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد کا مقصد دراصل امت کو خبردار کرنا تھا کہ وہ اس خطرے سے اپنی حفاظت کرے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ حضور ﷺ نے فرمایا تھا وہ سب سامنے آرہا ہے۔ امت میں اعمال و اخلاق کی وہ ساری خرابیاں اور وہ سب اعتقادی گمراہیاں پیدا ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں جو یہود اور نصاریٰ میں تھیں ـــــــ وہ کون سا جرم اور گناہ ہے جو مسلمانوں میں نہیں ہے اور وہ کون سا فسق و فجور ہے جو دین و مذہب ہی کے نام پر بزرگان دین کے عرسوں میں نہیں ہو رہا ہے اور وہ کون سا شرک ہے جو ان کے مزاروں پر نہیں ہو رہا ہے۔ قبروں کو سجدے ہو رہے ہیں، مرادیں مانگی جارہی ہیں، نذریں چڑھائی جارہی ہیں، الغرض وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو یہود و نصاریٰ کرتے تھے۔

اور جس طرح انکے پیر پادری دین کے نام پر دنیا کماتے اور بیچا[illegible] کے نمونے بھی اس امت کے پیروں اور مولویوں میں موجود ہیں [illegible] بے لاگ ہے اسکی کسی سے رشتہ داری نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ [illegible] والا شرک یا کوئی جرم کرے تو جہنم میں جائے اور مسلمان کہلا [illegible] جائے۔ وہاں کا قانون تو یہ ہے - ”فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن [illegible] شراً یرہ“۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ سورۂ توبہ کی ان آیات ”اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللہ“ سے لیکر ”یا ایھا الذین آمنوا ان کثیراً من الاحبار والرھبان“ الآیۃ کا تعلق اگرچہ براہ راست یہود و نصاریٰ سے ہے، لیکن ان میں ہم مسلمانوں کیلئے بھی بڑا سبق ہے۔

یہ آیتیں جن میں اہل کتاب کی گمراہیوں اور ان کے صریح مشرکانہ عقائد اور ان کی اسلام دشمنی اور نور اسلام کو مٹا دینے کے منصوبوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے خلاف جہاد اور قتال کی تیاری کی مسلمانوں کو دعوت دی گئی ہے، یہ دراصل غزوۂ تبوک کی تمہید ہے جسکا میں ابھی تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ مختلف پہلوؤں سے اس غزوہ میں بڑے خطرات تھے اور بڑی سخت آزمائش تھی اسلئے منافقوں کے علاوہ بعض کچے دل کے اور کم ہمت مسلمان بھی اس سے کترانا چاہتے تھے تو آگے کی آیتیں نازل ہوئیں۔

”یا ایھا الذین آمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض۔الآیۃ“..........

میں ابھی آپ کے سامنے ان آیتوں کا ترجمہ کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد ہر مخلص مسلمان تیار ہو گیا ـــــ ہاں جن کے دلوں میں کسی درجے کا نفاق تھا انھوں نے حیلے بہانے کئے اور طرح طرح کے عذر پیش کئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان سب کے عذر قبول کر لئے، ان کی تعداد روایات میں اسی (۸۰) کے قریب بتائی گئی ہے ـــ بعض منافق ساتھ بھی گئے لیکن اپنے منافقانہ ذہن اور منافقانہ کردار کو ساتھ لیکر گئے اور وہاں بھی شرارتیں اور ناپاک سازشیں کرتے رہے ـــــ اور انکے جو ساتھی مدینہ میں رہ گئے تھے ان کا چونکہ یہ خیال اور گمان تھا کہ رومی فوج اس پورے اسلامی لشکر کو موت کے گھاٹ اتار دے گی اور اب یہ زندہ واپس نہ آئیں گے اس لئے اس زمانہ میں ان کی زبانوں پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسی باتیں بھی آئیں جو ان کے ناپاک دلوں میں چھپی ہوئی تھیں لیکن کبھی زبان پر نہیں آتی تھیں اور ان میں سے بہت سوں کا نفاق بالکل عریاں ہو گیا۔

سورۂ توبہ کی شروع کی قریباً چالیس آیتوں کے بعد مسلسل قریباً پچاس ساٹھ آیتیں (پانچ چھ رکوع کے قریب) ایسی ہیں جن میں ان منافقین کے نفاق ہی کا بیان ہے۔ اور جس طرح اس سورت کی شروع کی آیتوں میں مشرکین عرب کے بارے میں ایک نئے فیصلے اور نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے اسی طرح بعد کی ان آیتوں میں منافقین کے متعلق وہ سخت رویہ اختیار کیا گیا جو اس سے پہلے کبھی اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ اور ان پر اور ان کے نفاق پر وہ ضربیں لگائیں اور ایسے کوڑے برسائے جنھوں نے نفاق کا گویا خاتمہ کر دیا اور اسلامی معاشرے میں منافقین کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

منافقین کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے یہاں تک فرمادیا گیا "استغفر لهم او لا تستغفر لهم ان تستغفر لهم سبعين مرة لن يغفر الله لهم" یعنی یہ منافقین ایسے مردود ہیں کہ اے نبی اگر تم بھی ان کی بخشش کیلئے ہم سے دعا کرو اور ایک دو دفعہ نہیں ستر دفعہ دعا کرو تو ہم تمھاری دعا بھی ان کے بارہ میں نہیں سنیں گے اور ان کو نہیں بخشیں گے۔ اسکے بعد آپ کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ "ولا تصل على احد منهم مات ابداً ولا تقم على قبره" یعنی ان میں سے جب کوئی مر جائے تو اے نبی تم اس کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھو اور اس کی قبر کے پاس بھی نہ کھڑے ہو ـــــ جیسا کہ میں نے عرض کیا منافقین کے بارے میں یہ نیا حکم تھا اور نئی پالیسی کا اعلان تھا۔ اسکا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بہت سے منافقین کے دل بدل گئے اور انکو حقیقی ایمان نصیب ہو گیا قریباً پچاس ساٹھ آیتیں ساتویں رکوع سے بارہویں رکوع تک منافقین ہی سے متعلق ہیں، درمیان

میں کہیں کہیں بطور مقابلہ مومنین صالحین کے کردار کا بھی ذکر آگیا ہے ـــــ اس کے بعد ان چند مخلص مسلمانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو صرف سستی اور لیت و لعل کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں جانے سے رہ گئے تھے اور خود ان کو اس کا بے انتہا رنج و غم تھا اور انھوں نے پوری سچائی کے ساتھ حضورؐ کے سامنے اپنے قصور کا اقرار کر لیا تھا اور بعضوں نے تو مسجد نبوی کے ستون سے اپنے کو باندھ دیا تھا اور طے کر لیا تھا کہ حضور ﷺ ہی معافی دے کر اپنے ہاتھ سے کھولیں گے تو کھلیں گے ورنہ اسی طرح بندھے بندھے مر جائیں گے، میں ان حضرات کے واقعات متعلقہ آیتوں کے درس میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں ـــــ سورہ کے تیرہویں رکوع میں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے

"وآخرون اعترفوا بذنوبهم خلطوا عملاً صالحاً وآخر سيئاً عسى الله ان يتوب عليهم ، ان الله غفور رحيم"

یعنی کچھ بندے وہ ہیں جنھوں نے دلی ندامت کے سات کر کے خود اپنے کو پیش کر دیا ہے، ان کا حال یہ کہ انھوں نے اچھے عمل بھی ان سے سرزد ہوئے ہیں وہ امید کر سکتے ہیں کہ اللہ مہربا اور ان کی توبہ قبول کر لے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

پھر دو تین آیتوں کے بعد فرمایا گیا ہے - "وآخرون مرجون لامر الله اما يعذبهم واما يتوب عليهم والله عليم حكيم" یعنی غزوۂ تبوک میں نہ جانے والے اہل ایمان میں سے کچھ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم کے انتظار میں ملتوی ہے وہ انھیں عذاب دے یا ان کی توجہ قبول فرما کر معاف فرمادے۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر! ـــــ قرآن مجید کا یہ انداز بیان کعب بن مالک اور ابو لبابہ انصاری جیسے صف اول کے مخلصین کے حق میں ہے جو ہمیشہ اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت اور دین کی خدمت اور اس کی راہ میں ہر قربانی کرتے رہے، ان میں سے کئی ایک بدری بھی تھے ـــــ ان سے بس یہ غلطی ہوئی تھی کہ سستی کی وجہ سے غزوۂ تبوک سے پچھڑ گئے تھے، اسی پر اتنا سخت عتاب ہوا کہ کعب بن مالک اور ان کے دو اور ساتھیوں کا پچاس دن تک مکمل مقاطعہ رہا، کوئی مسلمان ان سے بات چیت نہیں کرتا تھا، ان کے سلام کا جواب تک نہیں دیتا تھا ـــــ اس آیت میں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کا معاملہ خدا کے حکم پر موقوف ہے، وہ احکم الحاکمین چاہے عذاب دے چاہے معاف فرمائے۔

ذرا غور کیجئے ان آیات میں کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کا ایسے انداز میں ذکر کیا گیا ہے جیسے کہ وہ بڑے ہی مجرم تھے ــــــ ذرا ہم اپنے بارے میں سوچیں کہ اللہ و رسول کے احکام کی فرمانبرداری اور دین کے لئے جان و مال کی قربانی کے معاملے میں ہمارا حال کیا ہے اور ہمارا انجام کیا ہونے والا ہے۔

پھر اس سے اگلے رکوع میں بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ سچے مسلمان کا اللہ کے ساتھ کیا معاملہ اور دین کی راہ میں قربانی کے بارہ میں کیا رویہ ہونا چاہئے اور اس کی زندگی کا کیا رنگ ہونا چاہئے۔ سنئے فرمایا گیا -

"ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ ، یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون وعداً علیہ حقاً فی التوراۃ والانجیل والقرآن ومن اوفی بعھدہ من اللہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ وذالک ھو الفوز العظیم"

مطلب یہ کہ جو سچے ایمان والے ہیں ان کی جانیں اور ان کے مال اللہ نے جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ اب کسی سچے مسلمان کی جان و مال اسکی اپنی ملک نہیں ہے۔ بلکہ وہ اللہ کے ہاتھ بیچ چکا ہے۔ اب ان کا کام یہ ہے کہ جب ان کو راہ خدا میں جہاد اور جاں بازی کے لئے پکارا جائے وہ لبیک کہہ کے میدان میں آجائے، خدا کے اور اسکے دین حق کے دشمنوں کے مقابلہ میں جنگ کریں، ماریں اور مریں ــــــ اور اس طرح خدا کے ہاتھ بیچی ہوئی جان و مال اسکی راہ میں قربان کر دیں اور اسکے عوض جنت اور اس کی لازوال نعمتیں اور ابدی عیش و آرام حاصل کریں ــــ آگے فرمایا گیا ہے "وعداً علیہ حقاً فی التورۃ والانجیل والقرآن" ــــ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملہ بالکل پکا ہے، کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ پہلے مقدس صحیفوں توراۃ و انجیل میں بھی اس کا اعلان ہو چکا ہے اور اب قرآن میں بھی اسکی ضمانت دی جارہی ہے ــــ اور خدا سے زیادہ وعدہ کا سچا کون ہو سکتا ہے ــــ آگے فرمایا گیا ہے کہ مومنین کا اپنے اللہ کے ساتھ یہ ایسا نفع بخش سودا ہوا ہے جس پر انھیں جتنی بھی خوشی اور مسرت ہو برحق ہے، یہ ان کی بہت ہی بڑی فیروزمندی ہے۔ ذالک ھو الفوز العظیم۔

ذرا غور کیجئے اللہ ہی کی دی ہوئی ایک فانی جان جو دیر سویر ختم ہونے ہی والی ہے اور مال و دولت جس کو یا خرچ ہونا ہے یا مر کر ترکہ میں چھوڑ دینا ہے اس کو اللہ کے حکم پر اسکی راہ میں قربان کر کے آخرت کی حیات ابدی اور جنت حاصل کر لینا کتنا نفع بخش سودا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدر دانی دیکھئے کہ وہ خود ہمارا خریدار اور طالب بنا ہے، یہ

نہیں فرمایا کہ مومنین نے اپنی جان اور مال کے عوض ہم سے جنت خرید لی ہے بلکہ یوں فرمایا کہ ہم نے جنت ان کے لئے لکھ دی ہے۔ اور اس کے بدلے ان کی جانیں اور انکے مال ہم نے خرید لئے ہیں، ہم انکے خریدار بنے ہیں —— خرید و فروخت کے معاملے میں ہمیشہ خریدنے والا طالب ہوتا ہے۔ جو قیمت ادا کرکے مطلوب چیز کو خرید لیتا ہے۔ قیمت کی حیثیت تو خرید و فروخت کے ایک وسیلے کی ہوتی ہے۔

اسکے بعد والی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان مومنین کی زندگی کا کیا ڈھنگ ہوتا ہے اور کیا ان کے اوصاف و احوال ہوتے ہیں —— فرمایا گیا ہے -

"التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناهون عن المنکر والحافظون لحدود الله وبشر المومنین"

یعنی یہ اپنی خطاؤں، قصوروں سے توبہ کرنے والے اور اللہ کے عبادت گذار بندے ہوتے ہیں ان کی زبانوں پر خدا کی حمد و تسبیح رہتی ہے، یہ خدا کی راہ میں
قریب کے علاقوں میں پھرتے ہیں —— (جس دن ان آیتوں کا
کہ "اَلسائِحُونَ" کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، میرے نزدیک اس ک
راہ میں پھرنا مراد ہے۔ عبادت اور ذکر و تسبیح کی طرح خدا کی راہ میں پ
کا خاص جز تھا، ہمارے اس دور میں تبلیغی جماعت کے مخلصوں کا پھرنا دیکھ کر یہ بات خوب سمجھ میں آتی ہے) —— آگے فرمایا گیا ہے "الراکعون الساجدون" یعنی یہ لوگ ذوق و شوق سے نمازیں پڑھتے ہیں اور اس سے روحانی غذا حاصل کرتے ہیں۔ "الآمرون بالمعروف والناهون عن المنکر" یعنی ان ذاتی اعمال و اشغال کے علاوہ اللہ و رسول کے حکم کے مطابق یہ دوسرے بندگان خدا کی بھی فکر کرتے ہیں۔ اچھے کام کرنے اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لئے کہتے ہیں اور برے کاموں سے ان کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں —— آخر میں فرمایا گیا ہے "والحافظون لحدود الله" یعنی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کی محافظت اور پابندی کرتے ہیں، یعنی جن کاموں اور جن باتوں سے منع فرمادیا گیا ہے ان کی طرف قدم نہیں اٹھاتے

یہ ہے سچے ایمان والوں کی پوری تصویر! آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "وبشر المومنین ه" یعنی اے پیغمبر ہمارے ان صاحب ایمان بندوں کو جو اپنا جان و مال اور سب کچھ ہمارے ہاتھ بیچ چکے اور جن کے یہ اوصاف و احوال ہیں ان کو ہماری رضا اور جنت کی خوشخبری دے دیجئے، ہماری طرف سے وہ ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔

ان دو آیتوں نے ہمارے سامنے سچے مسلمانوں کی ایسی مکمل تصویر رکھ دی ہے کہ اسکو سامنے رکھ کے ہم میں سے ہر ایک اپنی ایمانی حالت اور اسلامیت کو جانچ پرکھ سکتا ہے۔ اس میں جتنی کمی ہو سمجھنا چاہئے کہ اتنی ہی ایمان میں اور اسلامیت میں کمی ہے۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
که دانم مشکلات لا اله را

پھر چند آیتوں کے بعد اسی سچی اسلامیت اور ایمان صادق کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

"یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله و کونوا مع الصادقین ہ"

یعنی اے مسلمانو! جنھوں نے اسلام کو بطور دین کے قبول کر لیا ہے اللہ سے ڈرو، اپنے اندر تقوی الله کی کیفیت پیدا کرو اور مومنین صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔

سورۂ توبہ کے ان تمام مضامین کے بعد جن میں ہر قسم کے اور ہر درجہ کے نفاق اور دین کی راہ میں قربانی سے گریز، بلکہ معمولی کوتاہی اور سستی پر بھی سخت عتاب کیا گیا ہے اور انتہائی جلال کے کوڑے برسائے گئے ہیں تو ان مضامین کے بعد یہ آیت "یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله و کونوا مع الصادقین" بڑی معنویت رکھتی ہے۔ اس آیت کی جو دعوت و پکار صحابہؓ کرام کے لئے تھی وہ میرے اور آپ کے لئے بھی ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی مخاطب کر کے فرما رہا ہے "یاایها الذین آمنوا اتقوا الله و کونوا مع الصادقین" ـــــ مجھے اور آپ کو دل سے اور عمل سے جواب دینا چاہئے کہ اے ہمارے اللہ ہم نے فیصلہ کر لیا، تو توفیق دے کہ تیرا تقویٰ اور صادقین کی معیت نصیب ہو جائے۔

اس کے بعد اب اس سورۃ کی ان آخری دو آیتوں پر آجایئے جو میں نے شروع میں تلاوت کی تھیں اور جن پر یہ سورۃ ختم ہوئی ہے۔

آپ حضرات نے اس پوری سورت کے درس سے خود بھی محسوس کیا ہو گا اور میں بھی برابر عرض کرتا رہا ہوں کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے جلال کا بڑا ظہور ہوا ہے ـــــ مشرکین، یہود و نصاریٰ، منافقین اور وہ مسلمان جن کے ایمانوں مین کچھ ضعف تھا اور وہ صحابہ کرام جن سے دین کے بارہ میں کچھ بھی سستی اور کمزوری ظاہر ہوئی تھی ان سب کے خلاف اس سورت میں بڑا سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے اور سب ہی کو جھنجھوڑا گیا ہے، اسی لئے حضرت حذیفہ اس سورت کو "سورت العذاب" کہا کرتے تھے ـــــ لیکن اس کا خاتمہ ایسی آیت پر کیا گیا ہے جو رحمت سے بھرپور ہے ـــــ ارشاد ہوا ہے۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم
بالمؤمنین رؤف رحیم ہ

مطلب یہ ہے کہ خدا نے تم سب طبقوں پر یہ رحمت فرمائی ہے کہ ایسا رسول تمھاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے جو خود تمھیں میں سے ہے، تم اس کو جانچ پرکھ سکتے ہو اور وہ تمھارا ایسا غمخوار و غمگسار ہے کہ تمھاری تکلیف و مشقت اس پر بھاری اور شاق ہے، اس کو تمھاری فوز و فلاح کی بڑی حرص اور فکر و لگن ہے اور خاص کر ایمان والوں کے لئے وہ بڑا ہی شفیق و ہمدرد ہے اور اس کا قلب رافت و رحمت سے معمور ہے۔ تو اے سب لوگو! تمھیں اللہ کی اس نعمت اور رحمت کی قدر کرنی چاہئے اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرنا چاہئے۔ اور اس کے رؤف و رحیم پیغمبر کی رافت و رحمت سے فائدہ اٹھانا چاہئے! خاص کر ایمان والوں کو چاہئے کہ اس کی ہدایات پر چل کر اور اس کا اتباع کر کے اللہ کی رضا اور رحمت اور جنت حاصل کریں۔

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے -

"فان تولوا فقل حسبی الله لا اله الا هو، علیه توکلت وهو

یعنی اگر یہ لوگ رحمت کی اس پکار کو بھی نہ سنیں اور اے پیغمبر تم ان سے کہدو کہ مجھے تم سے کچھ لینا نہیں، میرا اللہ مجھے کافی ہے، وہی اور صرف وہی ہے، میرا اسی پر اعتماد و بھروسہ ہے، اور وہ "رب العرش العظیم" ہے ــــ اس آیت پر یہ سورت ختم ہے۔

یہ سورۂ توبہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں رسول اللہ ﷺ کے آخری دور حیات میں نازل ہوئی ہے اور اس کے مضامین کی نوعیت ایسی ہے کہ گویا یہ الوداعی پیغام اور وصیت نامہ ہے، غالباً اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی تاکید فرماتے تھے کہ ہر مسلمان اس کا علم حاصل کرے تاکہ اس سے اس کو برابر ہدایت اور روشنی ملتی رہے ــــ میں نے بھی آج اسی لئے اس کے اہم مضامین کو دہرا دینا مناسب سمجھا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب حضرات کو اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں اس کی بالکل آخری آیت کے متعلق ایک حدیث اور سن لیجئے۔ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت سے سنن ابی داؤد میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صبح و شام سات سات دفعہ یہ کلمہ پڑھ لیا کرے "حسبی الله لا اله الا هو علیه توکلت وهو رب العرش العظیم" تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مشکلات و مہمات حل ہوتی رہیں گی اور اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔

سبحانك اللهم وبحمدك نشهد ان لا اله الا انت نستغفرك
ونتوب الیك، وصلی الله علی نبیه الکریم وعلیٰ آله واصحابه اجمعین ہ

چند بہت ہی مفید کتب

حفظ الایمان
از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
سجدۂ قبور، طواف قبور اور علم غیب نبوی کے متعلق حکیم الامت کا معروف رسالہ۔
اہم ترمیمات اور مولانا نعمانیؒ کی نظر ثانی کے بعد اب بسط البنان شامل کر کے شائع کیا گیا ہے۔
قیمت -/6

قرآنی علاج
از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
ہر قسم کی بیماریوں کا علاج قرآنی آیات کے ذریعہ
قیمت -/5

بریلوی فتنہ کا نیا روپ
از مولانا محمد عارف سنبھلی
استاذ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
یہ کتاب ارشد القادری کی کتاب "زلزلہ" کا جواب ہی نہیں بلکہ بریلوی فتنہ پر ایک ضرب کاری ہے۔ مسلک علم غیب اور کائنات میں تصرف کے عقیدہ کی جو تنقیح کی گئی ہے وہ اس کتاب کا خاص تحفہ ہے۔
قیمت -/27

تاریخ میلاد
از مولانا عبد الشکور مرزاپوری
قیمت -/25

دربار نبوت کی حاضری
از مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم
حج کے سفر کی عاشقانہ و مستانہ داستان مولانا مرحوم کے البیلے طرز بیان میں۔
قیمت -/8

زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک
مرتبہ مولانا عتیق احمد قاسمی
زکوٰۃ کے لئے مالک بنانا لازم ہے یا نہیں۔ اس پر علماء کرام کی آراء پڑھئے۔
قیمت -/70

مکتوبات نعمانی
مرتبہ مولانا محب الحق صاحب
حضرت مولانا نعمانیؒ کے کچھ مکتوبات بنام جناب الحاج عزیز الٰہی خاں صاحب
قیمت -/25

معمولات یومیہ
از ڈاکٹر عبد الحی مدظلہ
اصلاح نفس کے سلسلہ میں روز آنہ معمولات کا جامع نصاب۔ قیمت -/3

صبح و شام کی ماثورہ دعائیں
دعاؤں کا عجیب و غریب مجموعہ قیمت -/5

احکام نماز
قرآن مجید اور احادیث میں وارد نماز کے بارے میں ۲۰-۲۰ منتخب احکام کا مجموعہ۔ قیمت -/2

انیس نسواں
عورتوں کے لئے بہترین اصلاحی کتاب۔ قیمت -/8

ملنے کا پتہ: الفرقان بکڈپو 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ-18

حنفیّت اور اہلحدیثیت !

اے کاش لوٹ آئے گزرا ہوا زمانہ

[ایک مرد دانا کی تائید میں مارچ ۱۹۷۹ء کا نگاہ اوّلیں]

پاکستان میں ہمارے ایک بہت مخلص اور قدیم دوست حکیم
ہیں، راقم السطور نے گزشتہ شعبان (جولائی) میں پاکستان کا جو سفر
"الفرقان" میں آپ نے بھی پڑھا ہوگا) اس میں حکیم صاحب کا ا
ہونے والے ہفت روزہ "المنبر فیصل آباد" کا نیز ان کے قائم کئے ہوئے جامعہ تعلیمات اسلام" کا تذکرہ بھی کیا گیا تھا کئی مہینے ہوئے ان کے ہفت روزہ "المنبر" کا ایک ضخیم خصوصی شمارہ "جامعہ نمبر" موصول ہوا تھا، اس کے تمام مضامین و مقالات "جامعہ تعلیمات اسلامیہ" ہی سے متعلق ہیں ——— اس میں حکیم صاحب کی ایک تقریر بھی ہے جو کسی خاص موقع پر "جامعہ" ہی میں کی گئی تھی اس میں حکیم صاحب نے ان دواعی اور محرکات کو بیان کیا تھا جنھوں نے ان کو خاص عزائم اور تصورات کے ساتھ یہ جامعہ قائم کرنے پر آمادہ کیا — اس سلسلہ میں پانچواں محرک بیان کرتے ہوئے حکیم صاحب نے فرمایا:

"ہم خلوص نیت سے وہ ماحول ازسر نو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اس صدی کے شروع میں اہل اللہ کے یہاں موجود تھا۔ مولانا مفتی محمد حسنؒ (۱) دیوبندی مسلک کے جید عالم اور پائے کے بزرگ تھے لیکن ان کا

---

(۱) حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے جلیل القدر خلیفہ ارشاد تھے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے امرتسر میں قیام رہا، جب پاکستان بنا تو لاہور تشریف لائے اور "جامعہ اشرفیہ" کی بنیاد ڈالی۔ اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی تھی۔ (نعمانی)

تعلق شاگرد ہونے کا بھی اور محبت رکھنے کا بھی امام عبدالجبار غزنویؒ (۱) سے تھا، اور اس تعلق کو انھوں نے اس قدر عظیم جانا اور اتنا عزیز سمجھا کہ وفات کے مہینے تک آپ مولانا داود غزنوی علیہ الرحمہ کے ہاں ملاقات کے لئے تشریف لے جاتے اور اسی طرح مولانا داؤد غزنویؒ بھی اسی طرح محبت سے ان کے ہاں آتے جاتے ان کے مابین ربط کی کیفیت یہ رہی کہ تقریباً ہر مہینے مولانا مفتی محمد حسنؒ مولانا داؤد علیہ الرحمہ کے ہاں ملنے جاتے اور مولانا داؤد بھی اسی طرح کوشش کرتے کہ ملاقات کا سلسلہ جاری رہے۔ مفتی محمد حسن نوراللہ مرقدہ کی زندگی کے آخری مہینے کی یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مفتی صاحبؒ اپنی گاڑی پر تشریف لے گئے پہلے وہ شیرانوالے دروازے سے مولانا احمد علیؒ کے پاس گئے۔

اسکے بعد جب مفتی صاحب، عبدالرحیم شیش محل روڈ مولانا سید داؤد غزنویؒ کے یہاں تشریف لے گئے تھے مولانا غزنوی نے فرمایا کہ حضرت آپ نے رحمت گوارہ فرمائی مجھے پیغام بھیج دیا ہوتا، میں حاضر ہو جاتا، مفتی صاحبؒ نے فرمایا، طبعیت کا تقاضہ یہی تھا کہ خود آؤں۔

یہ تھا وہ ماحول جو ابھی کل تک ہمارے یہاں موجود تھا، اور اسی ماحول کا یہ ایک ثمر بھی ہم نے دیکھا کہ مولانا احمد علی علیہ الرحمہ جو پاک و ہند میں عظیم شہرت رکھتے تھے اور لاہور میں تو آپ نے نصف صدی سے زائد قرآن مجید کا درس دیا، ہزاروں شاگرد آپ کے حلقہ درس کے تھے اور لاکھوں معتقد، مگر آپ نے اس وجاہت و مقبولیت کے باوجود عید کی نماز کا کوئی الگ اہتمام نہیں فرمایا اور آپ ہمیشہ اقبال پارک میں مولانا سید داؤد غزنویؒ کے پیچھے ہی ادا فرماتے رہے تا آنکہ آپ اپنے آقا کے حضور حاضر ہو گئے۔" (المنبر فیصل آباد جامعہ نمبر صفحہ ۵۳-۵٤)

ان واقعات کے ذکر کے بعد حکیم صاحب نے اس تقریر میں اپنا یہ حال بیان کیا ہے کہ ان حنفی و سلفی مخلص علماء ربانیین (حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحبؒ، حضرت مولانا احمد علیؒ، حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ) کی یکے بعد دیگر وفات ہو گئی تو میرے قلب میں اس کا شدید داعیہ اور تقاضا پیدا ہو کہ اپنے امکان بھر ایسے علماء تیار کرنے کی فکر اور کوشش کی جائے جو "حنفیت، یا اہلحدیثیت" جیسی کسی فرقہ وارانہ نسبت کے بجائے رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور تقوے و تعلق باللہ کو اخوت و مودت کی بنیاد بنائیں اور مسلمانوں کو "امت واحدہ" بنانا جن کا

---

(۱) حضرت مولانا عبدالجبار غزنویؒ برصغیر میں سلفی مسلک کے ربانی عالم تھے۔ ورع و تقوی اور تعلق باللہ میں علمائے سلف کا نمونہ تھے۔ مولانا سید داؤد غزنوی انہی کے گھرانے کے چشم و چراغ تھے مسلک کے ساتھ ان ایمانی صفات و خصوصیات میں ان کے وارث تھے۔

نصب العین ہو۔

اللہ تعالیٰ حکیم صاحب کے مخلصانہ جذبے اور عزم وارادہ کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے اور اپنی خاص نصرت سے اس عظیم مقصد میں کامیاب فرمائے۔

واقعہ یہ ہے کہ حنفیت اور اہل حدیثیت کے مسلکی اختلاف کا درجہ وہی ہے جو ہمارے ان قریبی اکابر کے طرز عمل سے سامنے آیا جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں حکیم صاحب نے کیا ہے۔

اس برّ صغیر میں فقہ حنفی کو کتاب وسنت پر مبنی یقین کرتے ہوئے اس پر عمل کرنے والے علماء احناف خاص کر وہ جو دیوبند کے تعلیمی سلسلہ اور مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں (اور یہ عاجز بھی اسی سلسلہ کے ادنیٰ تلامذہ میں سے ہے) اور اسی طرح حضرات علماء اہل
طبقوں میں جو واقعی اصحاب علم ہیں جہاں تک راقم السطور کا علم
معترف اور اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان دیار میں حضرت
وسنت کے علم میں امامت کا درجہ عطا فرمایا تھا اور جن اہل علم نے ان
مطالعہ کیا ہے ان میں سے کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کے بار
ہے ــــ وہ کسی متعین امام ومجتہد کی تقلید کے بغیر کتاب وسنت اور صحابہ وتابعین کے فتاویٰ کی پیروی کو بھی برحق اور سلف امت کا طریقہ بتلاتے ہیں ــــ اور اسکو بھی حق وصحیح اور دین واہل دین کی مصلحت قرار دیتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی کی فقہ کا (اور خاص کر ہمارے اس برّ صغیر میں فقہ حنفی) کا اتباع کیا جائے، کہ ان ائمہ کے فقہ کی بنیاد بھی کتاب وسنت اور صحابہ وتابعین کے فتاویٰ پر ہے ــــــــ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے علم سے بلا واسطہ اور بالواسطہ روشنی حاصل کرنے والوں میں وہ اہل بھی تھے جن پر اپنے ذوق ورجحان کی بناء پر پہلا رنگ غالب تھا اور انھوں نے اسی کو اپنایا اور وہ بھی جنھوں نے دوسرے طریقہ میں زیادہ سلامتی سمجھی اور اسی کو اختیار کیا (اور خود حضرت شاہ صاحب کا عمل بھی اسی پر تھا) پھر درمیان میں ان تاریخی اسباب کی بناپر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں بد قسمتی سے ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اس ذوقی ومسلکی خلافات میں بہت ہی نامناسب شقاق وافتراق کی شکل اختیار کرلی، ایک طرف کی شدت جارحیت دوسری طرف کی جارحیت اور بے اعتدالی کا سبب بنی اور بارہا نوبت سر پھٹول اور مقدمہ بازیوں تک پہونچی اور کفر کی عدالتوں نے فیصلے کیئے ــــ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیے

الحمد اللہ وہ زمانہ ہم سے پہلے گزر گیا، اللہ تعالیٰ موجودہ دور کے دونوں طبقوں کے اہل علم رہنماؤں کو توفیق دے کہ وہ مسلک وطرز عمل کے اس اختلاف کو اسی حد تک رکھیں جو اس کا درجہ اور مقام ہے اور دینی اخوت ومودت پر اسکو اثر انداز نہ ہونے دیں۔

حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب نے حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ کا جو طرز عمل بیان کیا ہے وہ ہم سب کے لئے "اسوہ حسنہ" ہے ——— واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

☆☆☆

اَلْحَذَر ،فَالْحَذَر!

[۱۹۴۵ء کی بحرانی سیاسی فضا میں لکھا گیا الفرقان کا ایک اداریہ جو جلد (۱۲) شمارہ (۳) میں "بدگوئی اور تہمت تراشی کی وبائے عام" کے عنوان سے شائع ہوا ـــــ مرتب]

جب کسی شہر یا کسی علاقہ کی آب و ہوا خراب ہو جاتی ہے اور کوئی بیماری پھیل جاتی ہے تو بہت سے ایسے لوگ بھی جو حفظانِ صحت کے اصولوں سے واقف اور عملاً ا...
اوقات وہ بھی اس وبائے عام کا شکار ہو جاتے ہیں بالکل یہی حال اخلا...
بھی ہے جب کسی قوم میں کوئی برائی وبائے عام کی طرح پھیل جاتی...
زندگی والے بھی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی پا...
میں ناخداترسانہ بدگوئی ،افشاءِ عیوب ،اور محاسبۂ آخرت سے ...
پر تہمت تراشی کی جو وباء اس وقت ہماری قوم پر مسلط ہے دیکھا جا رہا ہے کہ بعض اچھے اچھے اہل علم اور بظاہر خداترس حضرات بھی اسمیں مبتلا ہو رہے ہیں۔

مسلم لیگی مسلک رکھنے والے ایک صاحبِ علم جو معمولی درجہ کے کوئی غیر معروف مولوی نہیں ہیں۔ بلکہ اچھی علمی شہرت کے مالک ہمارے لئے بھی قابلِ احترام "بزرگ" ہیں چند روز ہوئے ان کا ایک خط اس عاجز کے نام آیا تھا جس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی دیانت پر ایک نہایت رکیک عامیانہ اور سوقیانہ اتہام اسی بے باکی اور سہل انگاری کے ساتھ لکھا ہوا تھا جس طرح کہ محاسبہ آخرت سے بے خوف اور ناخداترس عوام عام طور سے آجکل کہنے اور لکھنے کے عادی ہیں۔ یہ ایک طرف کا حال ہے ـــــ ساتھ ہی دوسری طرف کی بھی سن لیجئے ـــــ جمعیۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے ایسے ہی ایک اچھے خاصے عالم نے حال کی ایک گفتگو میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے متعلق اظہار خیال فرماتے ہوئے ریاست حیدر آباد سے انکی وظیفہ یابی کا ذکر کیا، اور اپنی کسی تحقیق اور اپنی معلومات کی بناء پر نہیں، بلکہ کسی ہندو کی صرف قیاس آرائی کا حوالہ دیتے ہوئے اس عاجز کے سامنے فرمایا، کہ موصوف کو یہ وظیفہ در حقیقت انگریزی سرکار کے خزانے سے بوساطت ریاست حیدر آباد ملتا ہے۔ اور مولانا موصوف

کی طرف سے مسلم لیگ کی موجودہ سرگرم حمایت در حقیقت اس وظیفہ ہی کا نتیجہ ہے "إنّا لِله وَإنّا اليه راجعون ۔"

یہ بھی واضح رہے کہ جن مولوی صاحب نے یہ فرمایا وہ حدیث میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے شاگرد بھی ہیں۔

آخرت کی باز پرس اور مواخذۂ خداوندی سے قطع نظر سیاسی بحران نے ان حضرات کی عقل عام کو بھی اتنا ماؤف کر دیا ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں اسکے بدیہی نتائج کو بھی یہ محسوس نہیں کرتے کتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جب آپ خود حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کے متعلق ایسی لغویات زبان سے نکالتے ہیں جو مسلّمہ طور پر آپکی جماعت کے صفِ اول کے عالم ہیں حضرت شیخ الهندؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں، حدیث میں آپکے استاذ ہیں، محدث ہیں، مفسر ہیں، اور کل تک جمعیۃ علماءِ ہند کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی رہے ہیں تو آپ دنیا کو یہ بتلا دیتے ہیں کہ آپ کا چوٹی کا عالم۔ آپ کا استاذِ حدیث، آپ کا مفسّر قرآن، اور برسہا برس تک جمیعۃ العلماء کی مجلس عاملہ کا رکن رہنے والا بھی اپنے ایمان اور ضمیر کو فروخت کر سکتا ہے۔ماَ لَکُمْ لاَ تَشْعُرون۔ بیشک آپ کسی بڑے سے بڑے عالم اور شیخ وقت کے ماہر سیاست ہونے سے انکار کر سکتے ہیں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سیاست حاضرہ کے مبصر یا عملی تجربہ کار نہیں ہیں۔اسلئے انکی رائے ہمارے نزدیک وزن دار نہیں، لیکن انکی دیانت اور انکے ایمان و ضمیر پر حملہ یقیناً گناہِ عظیم ہے اور اس بارے میں حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب بلکہ عام اہل ایمان کے بارے میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اللہ کے نزدیک ہر صاحب ایمان کے ایمان کی عزت کعبۃ اللہ کی حرمت سے بھی زیادہ ہے پھر ان میں جو ایمان اور عمل صالح میں جتنا بڑا ہے اس کی حرمت کا حق بھی ویسا ہی بڑا ہے، اور اس کو بے ایمانی اور بد دیانتی سے متہم کرنا عظیم ترین گناہ ہے جسکی سنگینی کم از کم اہل علم کو تو معلوم ہے۔ جاہل عوام یا ناخدا ترس لیڈروں سے ایسی باتیں سن کر تو صرف دل ہی دکھتا ہے، لیکن جب دین کے جاننے والوں، مدرسوں میں پڑھنے پڑھانے والوں اور خانقاہوں سے تعلق رکھنے والوں سے بھی ایسی ناخدا ترسانہ باتیں سنی جاتی ہیں تو خطرہ ہوتا ہے کہ شائد دینی برکتیں ان سے بھی سلب ہونی مقدر ہو چکی ہیں، اور اللہ ان کو بھی اپنی نظروں سے گرا دینا چاہتا

ہے، حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے۔ اذا تسأبت أ متی سقطت من عین الله میری امت جب آپس میں بدگوئی کرینگی تو اللہ کی آنکھ سے گر جائیگی۔

اللہ کے کسی بندہ کے ایمان و ضمیر پر حملہ کرنا در حقیقت اپنے ایمان اور اپنی دیانت

خطرہ میں ڈالنا ہے ایک حدیث کا مضمون ہے کہ جو شخص اللہ کے کسی بندہ پر ایسی تہمت لگائے جس سے وہ عند اللہ بری ہے تو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر لیا ہے کہ اس تہمت لگانے والے کو وہ اسی برائی میں ضرور مبتلا کریگا اور اس سے پہلے اس کو موت نہ دیگا۔ (العیاذ باللہ۔

قرآن مجید نے تو ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم برابر اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کریں کہ ہمارے دلوں میں کسی ایمان والے کی طرف سے کینہ اور بدخواہی نہ ہو (ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم) مگر کیا قلب موضوع ہے کہ آج امت کے خواص تک کے قلوب اپنے بھائیوں اور دینی بزرگوں تک کی بدگمانیوں اور کینوں سے بھرے ہوئے ہیں اور زبانیں بدگوئیوں اور تہمت تراشیوں کیلئے وقف ہیں۔ اور کس بناء پر؟ صرف اس بنیاد پر کہ مسلمانان ہند کی نمائندگی کا حق صرف مسٹر جناح اور انکی مسلم لیگ ہی کو ہے، یا کانگریسی مسلمانوں کو بھی؟ اور مسلمانوں کیلئے تقسیم ہند کا نظریہ بہتر ہے یا اتحادِ ہند کا؟ ظاہر ہے کہ ...
مسئلوں کا کچھ بھی تعلق نہیں، بلکہ خالص "قوم پرستانہ" اور "مصـ...
کئے ہوئے یہ دونوں مسئلے ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کو بھی ...
جہالت یا بڑی ظالمانہ جسارت ہے ـــــ اور پھر اس اختلاف کی ...
بدگمانیاں اور بدزبانیاں خود اپنے اوپر ظلم عظیم ہے جو شخص بھی قیمت ...
بدگوئیوں اور ان پر ناروا، بدگمانیوں اور تہمت تراشیوں کا بوجھ لیکر میدان حشر میں آئیگا، اسکا معاملہ بڑا بھاری اور حساب بڑا سخت ہو گا۔ فالحذر الحذر!

☆☆☆

کیا ابھی وقت نہیں آیا؟

تقسیم ہند کے بعد کی ایک پکار

(الفرقان جمادین ۱۳۶۶ھ، ۱۹۴۷ء)

ہندوستان کی سیاست جس رخ پر نہایت تیز رفتاری سے جا رہی ہے اور اس سے جو نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور اس ملک کے بالخصوص مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کا مسئلہ جس قدر نازک اور ان کا مستقبل جس قدر بھیانک ہوتا جارہا ہے اس سے ہر باخبر اور صاحب فہم و فکر مسلمان کسی نہ کسی درجہ میں پریشان ہے اور مسلمانوں کے قومی مسائل سے تعلق و دلچسپی رکھنے والی مختلف جماعتیں اپنی اپنی صوابدید کے مطابق ان مشکلات کو حل کرنے اور ان پر قابو پانے کے لئے مصروف جدوجہد بھی ہیں ——— لیکن خیالات و نظریات کے بڑے بڑے اختلافات کے باوجود ان سب کے طرز فکر اور طریق کار میں ایک عجیب وحدت اور یکسانیت بھی ہے اور وہ یہ کہ سب کے سب معاملہ پر صرف مادی پہلو ہی سے غور کرتے ہیں اور اس لئے جو کوششیں بھی اس سلسلہ میں ہماری مشہور اور قابل ذکر قومی جماعتوں کی طرف سے ہو رہی ہیں وہ سب مادی تدبیروں ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر بالفرض اس ملک کی کسی دوسری قوم کو (جو خدا سے بالکل ناآشنا اور ایمان کی دولت سے محروم ہو بلکہ جو دشمن دین و ایمان ہو) ایسے حالات پیش آجائیں جو اس وقت ہم مسلمانوں کو درپیش ہیں تو یقیناً وہ قوم بھی وہی سب کچھ کرے گی جو ہماری قومی اور سیاسی جماعتیں عام طور سے اس وقت کر رہی ہیں اور اس کی پالیسی بالکل وہی ہوگی جو آج ہماری ہے ——— الغرض یہ بات خواہ کتنی ہی رنج و افسوس کے قابل ہو اور ہمارے قومی کارکنوں کو خواہ کتنی ہی کڑوی لگے مگر یہ ایک غیر مشتبہ حقیقت اور ناقابل انکار واقعہ ہے کہ ہماری قومی اور سیاسی پالیسی کا رشتہ انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی سے گویا کہ کٹ چکا ہے اور کم از کم زندگی کے اس نہایت اہم شعبہ میں ہم دنیا کی خدا فراموش اور مادہ پرست قوموں کے پورے پورے پیرو ہو گئے ہیں انہی کی طرح سوچتے ہیں اور انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں ——— اگر اس صاف گوئی سے آپ کے دل پر چوٹ لگے یا اس

حقیقت میں آپ کو کوئی شک و شبہ ہو تو للہ تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ کو ماحول کے اثرات اور جذبات سے صاف کر کے ہماری مندرجہ ذیل گذارشات پر غور کیجئے۔

ساری دنیا کی خدا نا آشنا قوموں اور نبوت کی روشنی سے محروم تمام طبقوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان پر جو حالات آتے ہیں اور دنیا میں جو انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں وہ ان کا کوئی خاص تعلق اللہ کے ارادہ اور مشیت سے نہیں سمجھتے اور اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جو خاص قوانین کارفرما ہیں (مثلاً قانون تکوین، قانون ابتلاء، قانون مکافات وغیرہ وغیرہ) وہ چونکہ ان کو بالکل نہیں جانتے، اور اس عالم کے تمام چھوٹے بڑے واقعات کو وہ سلسلۂ اسباب ظاہر ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں اس لئے صرف ظاہری تدبیروں اور مادی کوششوں ہی سے انکا مقابلہ کرتے ہیں ——— مثلاً ان میں سے کسی قوم پر کوئی دوسری طاقت اگر حملہ کر دے اور اس کو شکست دے کے اس [illegible] ملک پر قبضہ کر لے تو اس کے زعماء اور مفکرین اس سانحہ پر صرف اس [illegible] کہ ہمارے دشمن کی فوجیں تعداد میں ہم سے زیادہ اور زیادہ منظم اور [illegible] کے پاس سامان جنگ ہم سے زیادہ اور ہم سے بہتر تھا، بحری بری اور [illegible] میں ان کو برتری اور فوقیت حاصل تھی، میدان جنگ جغرافیائی حیثیت اور ہمارے لئے ناسازگار تھا وغیرہ وغیرہ۔

الغرض دنیا کی تمام خدا ناشناس قومیں اپنی مغلوبیت اور شکست کے اسباب ووجوہ پر صرف اس طرح سے غور کرتی ہیں اور اس لئے ان کی جدوجہد صرف ظاہری تدبیروں، اسباب ووسائل کی تیاریوں اور مادی کوششوں ہی میں منحصر رہتی ہے اور کون باخبر اور حقیقت شناس اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت ہم مسلمانوں کی قومی پالیسی بھی اصولاً بالکل یہی ہے۔ یہی ہمارے قائدین کا طرز فکر ہے اور یہی طریق عمل ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا بتلایا ہوا طریقہ اس سے بالکل اور بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ان کے فکر و نظر کا اوّلی اور اساسی نقطہ یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اور کسی فرد یا کسی قوم پر جو اچھے برے حالات آتے ہیں اگر چہ بظاہر وہ سلسلۂ اسباب ہی کے راستہ سے آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب ایک علیم و خبیر اور حکیم و بصیر قادر مطلق ہستی کے حکم سے ہوتے ہیں، لہذا دنیا کے ہر واقعہ کے متعلق ہمیں اسی یقین و اذعان کی بنیاد پر سوچنا اور اسی کے مطابق طریق کار اختیار کرنا چاہئے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس کو باقی رکھنا یا ختم کر دینا یا بدل دینا صرف اسی کے دست قدرت میں ہے اور وہ اگر چاہے تو ظاہری اسباب و وسائل کی نا مساعدت کے باوجود سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ اسباب و

وسائل کی کمی اور کمزوری کی تلافی اپنی غیبی مدد سے کر کے بہتوں کے مقابلہ میں تھوڑوں کو، زور آوروں کے مقابلہ میں بے وسیلوں اور ساز و سامان سے تہید ستوں کو اپنی خاص مدد سے کامیاب کر سکتا ہے اور اس بارہ میں اس کی خاص سنت اور خاص قانون ہے۔

اور انبیاء علیہم السلام کی سچائی اور رہنمائی پر ایمان ویقین رکھنے والوں اور انکے طریقہ پر کام کرنے والوں نے بارہا اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے اس خاص "قانون نصرت" کا تجربہ بھی کیا ہے۔ قرآن مجید میں حضرات انبیاء علیہم السلام اور انکے زور آور اور سرکش مخالفوں اور فرعون و نمرود جیسے طاقتور حکمرانوں کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ در حقیقت اسی سنت اللہ کی مثالیں ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی اس سنت اور نصرت کی کار فرمائی کیلئے کچھ اصول اور شرائط ہیں، جن کا تعلق عقائد و خیالات، اعمال و اخلاق، سیرت و کردار غرض انسان کی پوری زندگی سے ہے اور جسکا ایک مختصر اور جامع عنوان "ایمان والی زندگی" ہے تو اگر کوئی قوم اور امت اجتماعی طور پر ان اصول پر کاربند ہو جائے اور انھیں اصولوں کے ماتحت جد و جہد کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ اختصاصی معاملہ کرتا ہے کہ تعداد میں کمی اور اسباب و وسائل میں کمزوری کے باوجود اپنی غیبی مدد سے اسکو کامیاب اور فتحمند کر کے اس دنیا میں بھی عزت و سربلندی کا مقام عطا فرما دیتا ہے۔

لیکن اسکا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر یہ قوم کسی وقت اس راہ سے منحرف ہو جائے اور اسکا طرز زندگی بدل جائے تو پھر اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی بدل جاتا ہے اول اول تو اسکو متنبہ کرنے اور چونکانے کیلئے اس پر مصیبتیں بھیجی جاتی ہیں، دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ ان انتباہی کارروائیوں سے بھی کوئی سبق نہ لے اور اپنے حال کو درست نہ کرے تو پھر اس کیلئے دنیا میں مستقل ذلت و پستی اور تباہ حالی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے (یہودیوں کے متعلق قرآن مجید نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اسی سنت اللہ کی مثال ہے)

بہر حال دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور قوموں کے اچھے برے حالات بالخصوص کتاب و پیغمبر سے وابستگی رکھنے والی امتوں کے عروج و زوال کے متعلق یہ ہے انبیاء علیہم السلام کے طرز فکر اور طریق کار کا اوّلی اور اساسی نقطہ ـــــ بیشک وہ ترک اسباب اور ترک تدابیر کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ حدود اللہ کے اندر تمام ممکن اسباب و تدابیر کے استعمال کا اور استطاعت کی آخری حد تک جد و جہد کا سبق دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ان اسباب سے بالاتر اور اس کے ارادہ اور مشیت کو اصل کار فرما یقین کرتے ہیں اور اس لئے اسکی رضا جوئی اور اور اسکی خاص مدد کے استحقاق کو سب سے بڑی اور بنیادی تدبیر اور اصل فیصلہ کن کوشش سمجھتے ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم پر پہلا تاثر

[۳؍جون ۱۹۴۷ء کو ملک کی تقسیم کے فیصلے کا اعلان ہوا تو اس پر پہلا تاثر الفرقان بابت جمادی الاولی والاخری ۱۳۶۶ھ کے نگاہ اولیں میں حسب ذیل تھا۔ مرتب]

ہندوستان کا وہ سیاسی نزاع جس نے ادھر چند سال سے .. کرر کھا تھا خدا خدا کر کے کسی طرح اس کا فیصلہ ہو گیا اور ملک کی تق ہندوستان دو حصوں میں بٹ جائے گا، ایک چھوٹا سا حصہ پاکستان بن ب.... مسلمانوں کا اقتدار ہو گا اور باقی حصوں میں ہندو اکثریت کا اقتدار رہے گا، اس وقت پاکستانی علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد پانچ کرور سے کچھ اوپر ہے اور اس سے کچھ ہی کم وہ ہندوستان کے غیر پاکستانی علاقوں میں ہیں ـــــــــ

اس تقسیم کے مفاد و مضار کی تفصیلات سے قطع نظر، اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت ملک کی تقسیم اور قیام پاکستان ہی کے حق میں تھی اور اگرچہ پنجاب و بنگال کی تقسیم کی وجہ سے ان کی مانگ اور امید و آرزو کے لحاظ سے ناقص اور کٹا پٹا ہی پاکستان بنا، مگر بہرحال وہ بن گیا اور پاکستان کا مطالبہ کرنے والی مسلم اکثریت نے اس فیصلہ کو اپنی فتح ہی سمجھا اور ہم بھی اس میں اس کو فتح یاب ہی سمجھتے ہیں ـــــــــ لیکن اگر قیام پاکستان کا مقصد و منتہا صرف یہی ہو کہ مسلم اکثریت والے علاقوں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے سیاسی و اقتصادی غلبہ سے نجات حاصل ہو جائے اور ان کی ایک ایسی قومی حکومت قائم ہو جائے جس کے زیر سایہ وہ ویسی ہی آزادانہ مادی ترقیاں کر سکیں جیسی کہ دنیا کی دوسری خود مختار قومیں کر رہی ہیں تو ہمیں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ ایک سچے مسلمان کے لئے دین و ایمان کے نقطۂ نظر سے اس میں کوئی بڑی خوشی کی بات نہیں ہے۔

خدا پرستوں اور دین اسلام پر حقیقی ایمان و یقین رکھنے والوں کے نزدیک اصل اور سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس حکومت (پاکستان) کا اور اس کے چلانے والوں کا رویہ اللہ و رسول اور ان کی ہدایات و تعلیمات کے بارہ میں کیا ہو گا؟ آیا وہ مقصد حکومت اور طرز حکومت میں ترکی وایران وغیرہ کی طرح یورپ وامریکہ کی تقلید کریں گیا اور ان ہی خداناشناس قوموں سے روشنی حاصل کریں گے یا اسلام کو صحیح ترین اور صالح ترین نظام زندگی یقین کرتے ہوئے اور اللہ کے احکام کی ازلی ابدی صداقت پر ایمان پر رکھتے ہوئے رسول خدا ﷺ اور خلفاء راشدین کے اسوۂ حسنہ سے روشنی حاصل کریں گے؟

——— افسوس از مانہ کے پھرے ہوئے حالات اور قوم کے بگڑے ہوئے مزاج اور اسلام کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے عام قوم کی ناواقفیت بالخصوص اس کے زعماء و قائدین کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس امید کے لئے کوئی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔

——— ہاں مایوسی کی اسی شب تاریک میں روشنی کی ایک جھلک بھی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں امّت کی عام دینی اصلاح اور دعوت اسلام کے احیاء کی جو کوششیں مختلف شکلوں میں ہو رہی ہیں اگر ان کے مخلص کارکن اور دوسرے عام دیندار اور دین کا درد رکھنے والے مسلمان صورت حال کو صحیح طور سے سمجھ لیں اور عوام مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت اور ان میں صحیح اسلامی روح پیدا کرنے کے لئے محض لوجہ اللہ تعالیٰ اس طرح کی جاں فروشانہ کوششیں کریں، جیسا کہ اس کا مقصد کا حق ہے تو ہوا کا رُخ ان شاء اللہ تعالیٰ پھر سکتا ہے، یہ زمانہ بادشاہی کا نہیں بلکہ عوامی طاقت کا دور ہے۔

بلکہ ہندو اکثریت کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کی مشکلات کا حل بھی صرف یہی ہے کہ ان کو سچا مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے۔ مسلمان اگر سچے اور سیرت و کردار کے مسلمان بن جائیں تو یقیناً دشمنوں کی دشمنی محبت و عقیدت سے بدل جائے، اور دوسرے ان کو اپنے واسطے ذریعہ برکت سمجھنے لگیں، اور اگر کسی ملک کی شریر فطرتیں صالح اور راست باز ایمان والوں کے ساتھ بھی بدی سے پیش آئیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت اپنا کام کرے گی ———

افسوس! ہم نے اسلام کو اور اسلام کے ساتھ اللہ کے معاملہ کو ابھی سمجھا ہی نہیں اگر ہم سچے مسلمان ہو جائیں تو بیسویں صدی کی خدا ناشناس دنیا بھی "معجزات" دیکھ سکتی ہے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

☆☆☆

انتخابی جنگ میں دین واخلاق کی پامالی پر

الفرقان کا احتساب

[یہ ۱۹۴۶ء کے اس الیکشن کی بات ہے جو پاکستان یا متحدہ ہندوستان کے سوال پر لڑا گیا تھا۔]

[الفرقان کے پچھلے چند نمبروں کے ان مضامین کی بنا پر جن میں مسلمانوں کی الیکش
کے سلسلہ کی غلط کاریوں پر دینی واخلاقی نقطۂ نظر سے احتساب کیا گیا
ایک صاحب علم اور صاحب صلاح بزرگ نے (جو مسلم لیگ کے
میں (یقیناً اخلاص اور خیر خواہی کی بناء پر) اپنے اس احساس کا اظہا
لیگ والوں کی جو شکایت کی گئی ہے وہ "تبلیغی حکمت" کے خلاف
ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مسلم لیگ کے ساتھ ہے لہٰذا ان کی غلط کاریوں کی
شکایت اور احتساب کے بجائے ان میں ایک فیصدی درجہ کی بھی اگر کوئی خوبی ہے تو اسی کو اجاگر کر کے ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ موصوف کا خیال ہے کہ "ان کی غلط کاریوں پر احتساب کرنا، ان پر ہدایت کا دروازہ بند کر دینا ہے۔"

نیز موصوف نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی فرمایا ہے کہ ان مضامین میں جو کچھ لیگ والوں کے متعلق لکھا گیا ہے وہی درحقیقت دوسری جانب (یعنی موصوف کے خیال میں مخالفین لیگ کی جانب) میرے میلان اور جھکاؤ کا نتیجہ ہے، چونکہ اسی عرصہ میں اور بھی بعض حلقوں سے ان مضامین کے متعلق اسی طرح کے احساسات سننے میں آئے اس لئے مولانا موصوف کو جو جواب دیا گیا ہے "الفرقان" ہی کے ذریعہ اس کی اشاعت مناسب معلوم ہوتی ہے۔]

"الفرقان" کے پچھلے چند نمبروں میں الیکشن میں حصہ لینے والی مختلف مسلمان پارٹیوں کے طرزِ عمل پر جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے، میں نے اپنے نزدیک بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے اور فیما بینی وبین اللہ اپنے اندازہ کی حد تک عدل کی میزان میں تول تول کے اور بہت ضروری سمجھ کے لکھا ہے اور اس یقین کے باوجود لکھا ہے کہ دونوں گروہوں سے تعلق رکھنے والے مجھ سے سخت

ناراض ہوں گے (اور یہی ہوا) مگر اللہ تعالیٰ راضی ہوگا اور اس لئے میں تو اپنے اس عمل پر اللہ تعالیٰ سے اجر کا امیدوار ہوں۔

اس کا اصلی اور حقیقی علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں یا آپ جیسے حضرات کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ لیکن مجھے اپنی اس رائے پر بڑا وثوق ہے کہ الیکشن کے اس طوفان بدتمیزی میں دینی واخلاقی حدود کی عدم رعایت بلکہ پامالی جس طرح ایک عام مسلّمہ اصول بن گئی تھی اور تب سے حاملانِ دین بھی جس طرح اپنی محتاطانہ اور محتسبانہ خصوصیات کھو کر اس گندے سیلاب میں بہے اور اپنی پارٹی کی انتہائی درجہ کی ناخدا ترسانہ اور بادشانہ (۱) حرکات پر بھی واجبی احتساب تک سے انھوں نے سکوت اختیار کیا تو ایسی وباء عام کی صورت میں (اشخاص وافراد کو نامزد کئے بغیر اور نامنصفانہ طور پر کسی ایک ہی پارٹی کو ہدف بنائے بغیر) اس بارہ میں دینی تعلیم کا اظہار، اور عند اللہ ان حرکات کی معوصیت کا جو درجہ ہے اُس کا اعلان اور اُس کی اشاعت اور عادلانہ احتساب میرے نزدیک تو فرائض میں سے تھا۔

مجھے معلوم نہیں دوسروں کا عذر اللہ کے یہاں کیا ہوگا (ولست علیہم بوکیل) لیکن میں نے تو اپنے لئے کوئی عذر اور خاموشی کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں پائی۔

حضرت مولانا! میں نے کتاب وسنت سے اس بارہ میں جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس وقت امت اجتماعی طور سے کسی گندگی کو اپنانے لگے، اور اس کی گندگی کا احساس عام ذہنوں سے زائل ہو رہا ہو، اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کو سخت معوص ہیں اُمت کا اجتماعی ضمیر ہنسی خوشی اُن کو ہضم کرنے لگے، تو ایسے وقت میں احتساب اور تواصی بالحق اور تناھی عن المنکر کے فریضہ کی نوعیت خاص ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر علماء بنی اسرائیل سے جو تغافل ہوا قرآن مجید ہی میں کتنی سختی کے ساتھ اُن کے اس جرم پر داروگیر کی گئی ہے۔؟

محترم مولانا! الیکشن کے زمانہ میں جو کچھ ہوا میرے علم واندازہ میں وہ چند آدمیوں کی یا آپ کے الفاظ میں ”لڑکوں“ کی سیرت کی خرابی اور بداطواری نہیں تھی، بلکہ اُمت کا اجتماعی ذہن مسخ ہو رہا تھا، اس لئے میں نے بالالتزام اور مسلسل اس کے بارے میں حق کا اظہار وانتباہ ضروری سمجھا۔

نیز میں اس کو حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی عام تبلیغی حکمت عملی کے خلاف اور اس سے متصادم بھی نہیں سمجھتا، لیکن اگر بالفرض ایسا ہوتا تو بھی میں پورے شرح صدر کے ساتھ (استدلالی شرح صدر نہ کہ انکشافی جس کی مجھے ہوا بھی نہیں لگی ہے) اپنے ہی علم ویقین کے مطابق عمل کرنا اپنا دینی فرض سمجھتا۔ (الفرقان جمادی الاولیٰ واخریٰ ۱۳۶۵ھ)

---

(۱) اوباشانہ۔

ہمارا نصب العین اور طریقِ کار

۱۹۳۹ء کی ایک سیاسی تحریر(۱) جس میں جمعیۃ علماء ہند کی سیاسی پالیسی پر ایک رکن جمعیۃ کی حیثیت سے گفتگو کی گئی ہے۔ تحریر طویل تھی۔ یہاں صرف اس کا اتنا حصہ درج کیا جا رہا ہے جس سے اس وقت کے طرز فکر کا اندازہ ہو۔

۲۸ر جنوری ۳۹ء کے "الجمعیۃ" میں بذیل "شذرات" لکھا گیا ہے۔۔

"آخر ہم موجودہ نظام حکومت میں تبدیلی کیوں چاہتے ہیں، ہم ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے کیوں دشمن ہیں، کیا اسلئے کہ رام راج قائم کریں؟ کیا اسلئے کہ اپنے حقوق کو نظرانداز کردیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے ـــــــ ہم ہندوستان میں ایک نئی قومی جمہوریت کے لئے اسلئے جدوجہد کررہے ہیں کہ ہم اپنے قومی و مذہبی حقوق سے پوری طرح متمتع ہونگے، ہم ہر اس ضابطہ اور قانون کو ختم کرینگے اور ختم کرنیکی جدوجہد کرینگے جو ہمارے حقوق پر اثرانداز ہوتے ہیں ہم اس مطالبہ سے کسی طرح دست بردار نہیں ہوسکتے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انکی زندگی پر پوری طرح اسلامی شریعت حاوی ہوگی"۔

جو لوگ "بزرگان جمعیۃ" سے براہ راست واقفیت رکھتے ہیں انکو بالیقین معلوم ہے کہ ان حضرات کے عزائم یہی ہیں اور انکے سامنے یہی نصب العین اور یہی مطمح نظر ہے، اور اولاً بالذات ان حضرات کی ساری جدوجہد اسی مقصد کیلئے ہے ـــــــ لیکن اسوقت اصل سوال یہ ہے کہ اسمیں کامیابی کسطرح ہوسکتی ہے اور کس راہ سے ہم اس منزل مقصود تک پہونچ سکتے

(۱) شائع شدہ الفرقان ماہ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ۔

ہیں۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس بارہ میں ارکان جمعیۃ کی رائے ایک نہیں ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اسکی واحد صورت یہی ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ کانگریس سے وابستہ ہو کر اسکو مضبوط بنائیں اور اسکے زیر قیادت ملک کی آزادی کیلئے جنگ کریں، ان مساعی کے نتیجہ میں جب ہندستان سے انگریزی اقتدار اٹھ جائیگا، اور ملک قطعی طور پر آزاد ہو جائیگا تو ہمکو اختیار ہو گا کہ اپنے لئے جو قانون مناسب سمجھیں بنائیں اور اپنی زندگی کے لئے جو نقشہ چاہیں تیار کریں ــــ یا یوں سمجھئے کہ جب ملک کی آزادی میں ہماری قربانیاں بھی شریک ہونگی تو آئندہ قائم ہونیوالی ملکی جمہوری حکومت ہمارے اس مطالبہ کو رد نہ کر سکے گی کہ "مسلمانوں کیلئے انکی "شریعت" کے مطابق علیحدہ قانون ہونا چاہئے ــــ یا یہ کہ اُس وقت ہم اس سے بزور اپنے اس مطالبہ کو منوالیں گے اور اس کو ماننا پڑے گا ــــ یہ ہیں اُن حضرات کی آرزوئیں جو مسلمانوں کے ملی مفاد کیلئے بھی کانگریس کی شرکت اسکے نظام عمومی سے وابستگی ضروری قرار دیتے ہیں۔

جمعیۃ ہی کے بعض دوسرے ارکان کی رائے اسکے خلاف ہے، انکا خیال ہے کہ کانگریس کے اصول اور اس کا موجودہ طریقہ کار ہمارے اس نصب العین سے نہ صرف یہ کہ بیگانہ ہیں، بلکہ غائر نظر سے دیکھا جائے تو تضاد کی نسبت رکھتے ہیں اسلئے اس کے اصولوں کی پیروی کر کے اور قوم کو اسکے ساتھ چلا کے ہم کسی وقت بھی اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے ــــ میں خود اسی آخری رائے کو صحیح رائے سمجھتا ہوں اور مختصراً اسکے وجوہ بھی پیش کرتا ہوں۔

اس کاوش سے میرا مقصد کسی گروہ، کسی جماعت یا کسی بزرگ کو ملزم کرنا نہیں ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ رہنمایان ملت پھر اس پر غور فرمالیں ــــ ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اور اپنے ہی ہاتھوں سے وہ سب کچھ ہو جائے جسکے تصور کیلئے بھی ہم میں سے کوئی تیار نہیں ہے، مجھے اس پر اصرار کا حق نہیں ہے، یہی رائے صحیح ہے کیونکہ یہ وحی والہام سے تو معلوم ہی نہیں ہوئی ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی میں کوئی غلطی ہو، جہاں جہانتک غور و فکر اور اپنی بصیرت رہنمائی کر سکی ہے میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں ــــ لیکن اگر ثابت ہو جائے کہ صحیح طریقہ کار یہ نہیں بلکہ دوسرا ہے تو پھر الحمد اللہ بلا ادنیٰ تردد کے اسی کو اختیار کیا جائے گا اور کوئی استنکاف واستکبار ان شاء اللہ رجوع الی الحق سے مانع نہ ہو گا ــــ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے مسائل میں اپنی غلطی محسوس کرنا اور ایک راستہ پر پڑ کر پھر اس سے ہٹنا بڑا مشکل کام ہے حتی کہ خود مجھ سے ایک اچھے خاصے صاحب نے اب سے چند مہینے پہلے فرمایا تھا کہ "بھلا بیس برس سے ہم قوم کو جو مشورہ دے رہے ہیں اس کے خلاف کس طرح زبان کھول سکتے ہیں اور کس

منہ سے قوم کے سامنے جاسکتے ہیں" ——— لیکن خدا پرستوں کا شعار تو یہی ہونا چاہئے کہ خواہ وہ کسی راستہ پر کتنے ہی دور نکل گئے ہوں لیکن جس لمحہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ راہ غلط ہے اور اس پر چلنا مفاد ملت کے خلاف ہے تو اسی لمحہ وہ الٹے پاؤں لوٹ جائیں ——— یہ ظاہر ہے کہ ہمارے درمیان کسی جائداد کے بٹوارہ کا سوال نہیں ہے سب کے سامنے ملت ہی کا مفاد ہے جو سب کو یکساں ہی عزیز ہے اسلئے اسمیں کسی کے ہر سٹیج اور جیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه والباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه

اصل مسئلہ پر غور کرنے کے لئے پہلے اسکی ضرورت ہے کہ کانگریس کے اصول اور اس کے اس وقت کے طریق پر ایک گہری نظر ڈالی جائے ——— جو لوگ اس موقعہ پر بلند آہنگی کے ساتھ کہدیتے ہیں کہ "کانگریس بس ملک کو آزاد کرانا چاہتی ہے اور اسمیں شامل ہو کر ہمیں آزادیٔ ملک کے لئے جنگ کرنی چاہئے۔

غالباً انھوں نے صورت حال پر پوری طرح غور نہیں کیا

آزادی اور اجنبی تسلط سے ملک کی خلاصی کا سلبی پہلو ہی نہیں ہے بلکہ

کی تشکیل و تعمیر کا ایجابی پہلو بھی ہے اور اس کے لئے اس کے پاس

نقشہ ہے اور جس کے مطابق وہ مستقبل کی تعمیر میں اس وقت مصروف

کہ ہمارے ان عزائم کی تکمیل کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اس میں اور ہمارے اس نصب العین میں جس کے لئے بقول مدیر الجمعیۃ ہم موجودہ نظامِ حکومت میں تبدیلی چاہتے ہیں اور جس کے واسطے ہماری ساری جدوجہد ہے تضاد کی نسبت ہے۔

(۱) کانگریس کا پہلا بنیادی اصول جس پر وہ ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اور کر رہی ہے "نیشنلزم" ہے یعنی "واحد قومیت" کا نظریہ ہے، اس اصول کے ہوتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ "جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی زندگی پر اسلامی شریعت پوری طرح حاوی ہوگی اور گویا ان کو حق ہوگا کہ وہ دیگر باشندگانِ ملک سے الگ اپنا قانون و دستور اسلامی شریعت کو بنائیں، ایسے ہی حضرات سے ممکن ہے جو یا تو نیشنلزم کی حقیقت سے واقف نہیں، یا پھر بلا سوچے سمجھے بات کہنے کے عادی ہیں۔

اس نظریہ "قومیت" کا تو منشاء ہی یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہر ہندوستانی صرف باشندہ ہندیا "ہندوستانی قوم" کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے شریک ہوگا اور اسٹیٹ کے معاملات میں فرقہ وارانہ اصولوں پر کوئی تقسیم و تفریق نہ ہوگی ——— جو حضرات اس غلط فہمی

میں مبتلا ہیں ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ حضرات کے یہ عزائم آجکل کی اصطلاح میں اعلیٰ درجہ کی "کمیونل" اور فرسودہ خیالات جو نیشنلزم" اور نظریہ واحد قومیت کے صریح منافی بلکہ اس کی ضد ہیں، اور اسکے مان لینے کے بعد ان کا مطالبہ بھی یقیناً ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔

(۲) کانگریس کا دوسرا بنیادی اصول انگلستانی طرز کی وہ "وحدانی جمہوریت" ہے جسکی بنیاد اسی واحد قومیت کے نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ اس میں کسی قوم کو بحیثیت مستقل قوم کے تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ علی الاطلاق کثرتِ رائے ہی حاکم اور فیصلہ کن ہوتی ہے ــــ اس قسم کی جمہوریت کا مستقل فائدہ اسی قوم کو پہنچ سکتا ہے جو بلحاظ تعداد اکثریت میں ہو، اور اس راستہ سے مآلاً اکثریت والی قوم ہی بلا شرکت غیرِ سارے اختیارات کی مالک بن جاتی ہے۔ اس اصول پر مستقبل میں کانگریس جو حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اس کا نمونہ اس وقت خود ادارہ کانگریس ہے، چونکہ اس کا نظام اسی قسم کی جمہوریت پر قائم ہے اس لئے اس پر اول سے آخر تک اکثریت ہی والی قوم کا قبضہ ہے اور اگر کسی مسلمان کو کوئی عہدہ ملا ہوا ہے تو وہ صرف دوسروں کا رحم و کرم یا دانشمندانہ انتخاب ہے حتی کہ اگر ہندوستان کے سارے مسلمان متفقہ طور پر کسی مسلمان کے متعلق مثلاً حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند کے لئے یہ چاہیں کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن ہو جائیں تو وہ اپنی اجتماعی طاقت سے بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے جبتک کہ دوسری قوم نہ چاہے، لیکن اس کے برعکس اگر دوسری قوم کسی مسلمان ہی کو منتخب کرنا چاہے تو وہ صرف اپنے ووٹوں کی طاقت سے کر سکتی ہے، اگرچہ ایک مسلمان بھی اس کے حق میں نہ ہو۔

بہرحال کانگریس کے موجودہ نظام میں مسلمانوں کی نمایندگی خود مسلمانوں کے اختیار میں نہیں ہے۔

چند خام خیالیاں

اس مسلک کے جن دوستوں اور بزرگوں سے اب تک تبادلہ خیالات کا موقع ملا ہے ان کے خیالات اور ان کے توقعات اس بارے میں کچھ عجیب عجیب ہیں۔

پچھلے دنوں ایک صاحب سے اسی موضوع پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے میری اس قسم کی باتوں کے جواب میں فرمایا کہ بے شک کانگریس کے یہ اصول تو ہمارے ملی مقاصد کے ضرور خلاف ہیں لیکن اسکا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں کانگریس میں شامل ہوں اور اپنی طاقت سے ان اصولوں کو بدلوائیں، میں نے عرض کیا کہ اس کی عملی صورت کیا

ہے۔ جہاں تک چار آنہ والی ممبری کا تعلق ہے وہ تو اختیاری ہے کے ہر شخص سال میں چار آنہ ادا کر کے کانگریس کا عمومی ممبر بن سکتا ہے لیکن اس کو اس سے زیادہ کچھ حق نہیں ملتا کہ وہ مقامی کانگریس کمیٹی یا براڈ نسل (صوبہ کمیٹی) کی رکنیت کے امیدواروں کو ووٹ دے سکے ——— اور کانگریس کے تمام انتخابات اسی واحد قومیت اور وحدانی جمہوریت کے اصول پر ہوتے ہیں جن کی رو سے ممکن ہے (بلکہ اگر اکثریت رحم وکرم سے کام نہ لے یا کسی وقت اپنی مصلحت اسی میں سمجھے کہ مسلمانوں کو منتخب نہ کیا جائے تو اغلب بلکہ یقینی ہے) کہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں دو دو چار چار مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکیں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں (جس کے ہاتھ میں کانگریس کی پالیسی ہے) ان کا تناسب پانچ فیصدی بھی نہ ہو سکے اور اگر بالفرض اکثریت رحم وکرم ہی کی پالیسی پر کاربند رہے اور مسلمانوں کو بھی ان کے حق کے مطابق کانگریس میں نمایندگی کا موقع دے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکے گا کہ مسلمان پچیس تیس فیصدی ہی پہونچ جائیں ...
تو کوئی امکان ہی نہیں ——— پس یہ امید رکھنا اگر مسلمان کی زیادہ
ہو جائیں تو وہ اپنی رائے کی قوت سے کسی وقت اس کے فیصلوں میں
کرا سکیں گے محض خام خیالی ہے۔

اور یہ جو فرض کر لیا گیا ہے کہ "اکثریت" مسلمانوں کو ان ...
میں نمایندگی کا موقع دے محض فرضی ہی بات ہے ورنہ اس وقت تک کے تجربات صاف بتلا رہے ہیں کہ ان کی خود غرضانہ ذہنیت سے اسکی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بعض حضرات اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں ہیں لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اس وقت تو کانگریس کی ان تمام چیزوں سے چشم پوشی کر کے اس میں شامل ہو کر ملک کو آزاد کرا لو، اس کے بعد سب کچھ منوا لینا آسان ہو گا۔

در حقیقت یہ بھی نہایت غلط بلکہ مہلک تخیل ہے اس سوال کو بعد کے لئے اس وقت ملتوی کیا جا سکتا تھا، جبکہ کانگریس کی جنگ آزادی خالص انقلابی ہوتی لیکن درصورت کہ اس کی جنگ کی نوعیت دستوری یا نیم دستوری اور نیم انقلابی ہے اور قدیم نظام حکومت کی تخریب کے ادعاء کے ساتھ ہی ساتھ وہ انگریزی حکومت سے تعاون بھی کرتی ہے اور اسی اثنا میں جدید قومی حکومت کی تدریجی تعمیر بھی کرتی جا رہی ہے ——— یہ خیال قائم کرنا (کہ اس وقت تو کانگریس جو کچھ کر رہی ہے کرنے دو بلکہ ہر معاملہ میں اس کی تائید وحمایت ہی کرو، اور جن غلط یا صحیح بنیادوں پر ہندوستانی اسٹیٹ کا ارتقاء اس کے ہاتھوں ہو رہا ہے ہونے دو، بعد میں ہم اس کو اپنی منشاء کے

مطابق بنالیں گے) ایک ایسی سطحی بات ہے جس کو صرف بے غوری یا سادہ لوحی کا نتیجہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

بعض مقررین اس موقع پر بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ بھائی! یہ وقت ان باتوں کے چھیڑنے کا نہیں ہے پہلے ملک کو آزاد ہونے دو پھر بس ہندو مسلمانوں کا معاملہ رہ جائے گا اور نبٹ لیا جائے گا بھلا موحد مسلمان ان دھوتی بند مشرکوں، بت پرستوں سے دب جائے گا — ؟ اسلام اگر صداقت ہے اور مسلمان اگر خدا کے پرستار ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو کسی وقت ہم کو دبا سکے یا ہماری بات نہ مانی جائے — نعرہ تکبیر ——— اللہ اکبر زندہ باد)۔

ہم جیسے کم تجربہ کار یا "ناتجربہ کار" جب اس قسم کی مجذوبانہ تقریریں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں سے (جو خیریت سے اپنے کو سیاسی واقف کار بلکہ میدان سیاست کا شہسوار بھی سمجھتے ہیں) سنتے ہیں تو بخدا غرق حیرت رہ جاتے ہیں ——— پھر لطف یہ ہے کہ یہی حضرات جس وقت ملک کی آزادی کی ضرورت ثابت کرنے پر آتے ہیں تو ان کا سارا زور اسی پر ہوتا ہے کہ انگریز نے اسلام کو سخت نقصان پہونچایا ہے اس نے مسلمانوں کی حکومت کو برباد کیا، بہت سے اسلامی علاقوں کی آزادی سلب کر کے وہاں کے مسلمانوں کو اپنا غلام بنالیا، اس نے نہ صرف ہماری حکومت اور دولت ہی چھینی ہے بلکہ ہمارے مذہب کو بھی برباد کر ڈالا ہے" (اور بے شک یہ سولہ آنے صحیح ہے بلکہ اسلام اور مسلمان پر انگریز کے مظالم اس سے بدرجہا زیادہ ہیں) لیکن یہی حضرات جب مسلمانانِ ہند کے مستقبل پر آتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں واحد خدا کے پرستار ہیں بھلا کوئی ہم کو دبا سکتا ہے؟ — گویا ان کی اسلامیت صرف ہندوؤں کے مقابلہ میں ہے ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح ہماری ہی بعض غلط کاریوں کی وجہ سے انگریز کو یہ موقع ملا کہ وہ یہ ظلم و ستم ہم پر کر سکا اسی طرح ہماری غلط روی ہندی مشرکوں کو بھی اس کا موقع دے سکتی ہے۔

☆☆☆

معرکۃ القلم (۸) فیصلہ کن مناظرہ

(پیوستہ بگزشتہ)

[الفرقان کے اولین فائل میں سے اس مناظرانہ تحریر کا ایک ٹکڑا جس کی اشاعت کا تقاضہ الفرقان کے اجراء کا فوری باعث ہوا تھا، تاریخی حیثیت کے علاوہ کئی پہلوؤں سے قابل دید ہے ــــــ مرتب]

(خانصاحب بریلوی حکیم الامت مد ظلہ کے متعلق کفر کی فرد جرم

وهذا لفظه الملعون ان صح الحكم على ذات النبى المقدسة بعلم المغيبات كما يقول به زيد فالمسئول عنه انه ماذا اراد بهذا أ بعض الغيوب ام كلها فان اراد البعض فاى خصوصية فيه لحضرة الرسالة فان مثل هذا العلم بالغيب حاصل لزيد وعمرو بل لكل صبىّ ومجنون بل لجميع الحيوانات والبهائم وان اراد الكل بحيث لايشذ منه فرد فبطلانه ثابت نقلاً وعقلاً ـ اقول فانظر الى آثار ختم الله تعالىٰ كيف يسوى بين رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم وبين كذا وكذا۔

اور اسکی ... مقدسہ ... صحیح ہو تو دریافت طلب یہ امر ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب۔ اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی کیا تخصیص ہے۔ ایسا علم غیب تو زید و عمرو بلکہ ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کیلئے بھی حاصل ہے۔ الی قولہ۔ اور اگر تمام علوم غیب مراد ہیں اس طرح کہ اس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل نقلی و عقلی سے ثابت ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی مہر کا اثر دیکھو یہ شخص کیسی برابری کر رہا ہے رسول ﷺ اور چنیں و چناں میں۔

اس جگہ خان صاحب نے حضرت حکیم الامت کے متعلق جو سخت اور متعفن کلمات استعمال کئے

ہیں ان کا جواب تو ہم اس وقت کچھ نہیں دے سکتے اور اس وقت کیا! کسی وقت بھی نہیں دے سکتے، اس کا ترکی بہ ترکی اور کلہ بکلہ جواب وہی بازاری دے سکتا ہے جو گالیوں کے فن میں بھی مجددانہ شان رکھتا ہو، ہم تو اس فن سے بالکل عاری اور عاجز ہیں۔
ادھر قرآن حکیم کا ارشاد ہے

قل لعبادی یقول التی ھی احسن ان الشیطان ینزغ بینھم، ان الشیطان کان للانسان عدواً مبیناً ہ	اے رسولؐ آپ میرے (ایمان والے) بندوں سے کہئے کہ وہ بات کہیں جو اچھی ہو، بتحقیق شیطان پھوٹ ڈلواتا ہے انکے درمیان، بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

دوسری جگہ خود حضور کو ارشاد ہے

ادفع بالتی ھی احسن السیئۃ — آپ بدی کا جواب نیکی سے دیجئے

پس حسب فرمودہ قرآن ہم خان صاحب کی ان گالیوں کے جواب میں صرف حق تعالیٰ سے یہ عرض کریں گے کہ خداوندا ! خانصاحب تو اس دنیا سے جا چکے اب تو ان کی اولاد کو ایسی بری عادتوں سے بچا جو دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں حرمان و خسران کا باعث ہوں ؎

تم شوق سے مجھے کو سو میں تم کو دعا دوں
جو میرا برا چاہے خدا ! اس کا بھلا ہو

اسکے بعد ہم اصل بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں "واللہ الھادی الی سبیل الرشاد" معلوم ہوتا ہے کہ حسام الحرمین لکھتے وقت خانصاحب نے قسم کھائی تھی کہ کسی معاملہ میں بھی محض سچائی اور دیانت داری سے کام نہ لوں گا، غور تو کیجئے، کہاں حفظ الایمان کی اصل عبارت اور اس کا حقیقی اور واقعی مطلب اور کجا خانصاحب کا تصنیف کردہ یہ لعنتی مضمون۔ کہ "غیب کی باتوں کا جیسا علم رسول اللہ ﷺ کو ہے ایسا تو ہر بچے اور ہر پاگل بلکہ ہر جانور اور ہر چارپائے کو حاصل ہے" (معاذ اللہ منہ) کاش خانصاحب اپنا فیصلہ ٔ کفر سنانے سے پہلے "حفظ الایمان" کی پوری عبارت بغیر قطع و برید کے نقل کردیتے تو ناظرین کو خود ہی حقیقت معلوم ہو جاتی اور آج ہم کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ "حفظ الایمان" حضرت حکیم الامت (دامت برکاتہم) کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں تین بحثیں ہیں اور تیسری بحث یہ ہے کہ "حضور سرور عالم ﷺ کو عالم الغیب کہنا درست ہے یا نہیں" واضح رہے کہ مولانا کی بحث اس میں نہیں ہے کہ "حضور اقدسؐ کو علم غیب تھا یا نہیں؟ اور تھا تو کتنا؟ بلکہ وہاں مولانا مدظلہ

صرف اتنا ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور کو "عالم الغیب" کہہ نہیں سکتے۔ اور ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے، کسی صفت کا واقع میں کسی ذات کے لئے ثابت ہونا اس کو مستلزم نہیں کہ اس کا اطلاق بھی اس پر جائز ہو، قرآن کریم میں حق تعالیٰ کو ہر چیز کا خالق بتلایا گیا ہے (۱)۔ اور تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ عالم کی ہر چیز صغیر ہو یا کبیر عظیم ہو یا حقیر سب اسی کی مخلوق ہے، لیکن بایں ہمہ فقہاء کرام تصریح فرماتے ہیں کہ اسکو "خالق القردہ والخنازیر (۲)" کہنا ناجائز ہے۔ علیٰ ھذا قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے زرع (کاشت) کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے لیکن اس کی ذات پاک پر زارع (کاشتکار) کا اطلاق درست نہیں اسی طرح باشاہ کی طرف سے لشکر کو جو عطایا دیئے جاتے ہیں اہل عرب ان پر رزق کا اطلاق کرتے ہیں چنانچہ لغت کی عام کتابوں میں یہ محاورہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "رزق الامیر الجند (۳)" لیکن بایں ہمہ بادشاہ کو رازق یا رزاق کہنا ہرگز درست نہیں۔ اور حضور کے فضائل مبارکہ پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ
آپ خود ہی اپنے نعل مبارک کو ٹانک لیا کرتے تھے اور خود
اس کے باوجود حضور اقدس کو "حاصف النعل" "جفت
دوزنے والا) نہیں کہا جاسکتا۔ بہرحال یہ حقیقت ناقابل انکار
ذات کسی ذات میں پائی جاتی ہے اور اس کا اطلاق درست نہیں
تمہید سے ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ حضور کو علم غیب ہونا، نہ ہونا ایک الگ بحث ہے اور آپ کی ذات مقدسہ پر عالم الغیب کے اطلاق کا جواز، عدم جواز ایک الگ مسئلہ ہے اور ان دونوں میں باہم تلازم بھی نہیں، جب یہ بات ذہن نشین ہو گئی تو اب سمجھئے کہ حفظ الایمان میں اس موقعہ پر حضرت مولانا مدظلہٗ کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ حضور کی ذات مقدسہ پر عالم الغیب کا اطلاق ناجائز ہے۔ اور حضور کو جس طرح خاتم النبیین، سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، وغیرہ وغیرہ القابات سے یاد کر سکتے ہیں، اس طرح لفظ "عالم الغیب" سے حضور کو یاد نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس مدعا کی دو دلیلیں مولانا نے پیش کی ہیں، پہلی دلیل کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ چونکہ عام طور پر شریعت کے محاورات میں "عالم الغیب" اسی کو کہا جاتا ہے جس کو غیب کی باتیں بلاواسطہ اور بغیر کسی کے بتلائے ہوئے معلوم ہوں (اور یہ شان صرف حق تعالیٰ کی ہے) لہٰذا اگر کسی دوسرے کو عالم الغیب کہا جائے گا تو اس عرف عام کی وجہ سے لوگوں کا ذہن اسی طرف جائے گا کہ ان کو بھی "بلاواسطہ غیب کا علم ہے" (اور یہ عقیدہ صریح شرک ہے) پس حق جل مجدہ کے سوا کسی اور

---

(۱) اللہ خالق کل شیٔ و خلق کل شیٔ فقدرہ تقدیرا (الی غیر ذلک من الآیات) (۲) بندروں اور سوٴروں کا خالق۔ (۳) امیر نے لشکر کو رزق دیا۔

کو "عالم الغیب" کہنا بغیر کسی ایسے قرینے کے جس سے معلوم ہو سکے کہ قائل کی مراد "علم غیب بلاواسطہ نہیں ہے" اسلئے نادرست ہوگا کہ اس سے ایک مشرکانہ خیال کا وہم ہوتا ہے، قرآن و حدیث میں ایسے کلمات سے منع فرمایا گیا ہے جس سے اس قسم کی غلط فہمیوں کا اندیشہ ہو، چنانچہ قرآن کریم میں حضور کو لفظ "راعنا" سے خطاب کرنے کی ممانعت، اور حدیث شریف میں اپنے غلاموں اور باندیوں کو "عبدی" و "امتی" کہنے سے نہی اسی لئے وارد ہوئی ہے کہ یہ کلمات ایک باطل معنی کی طرف موہم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ خود متکلم کا قصد ایسا نہ ہو۔ یہ ہے حضرت مولانا تھانوی مدظلہٗ کہ پہلی دلیل کا خلاصہ، مگر چونکہ خانصاحب کو مولانا کی اس دلیل پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ تقریباً یہی مضمون خود خانصاحب نے بھی "الدولة المکیة" میں ایک جگہ پوری تفصیل سے لکھا ہے اس لئے اس کی تصویب و تائید میں ہم کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور اب مولانا مدظلہٗ کی دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسی میں وہ عبارت واقع ہے جس کے متعلق خانصاحب کا دعویٰ ہے کہ

"اس میں تصریح کی کہ غیب کی باتوں کا جیسا علم رسول خدا ﷺ کو ہے ایسا تو ہر بچے اور ہر پاگل اور ہر جانور اور ہر چارپائے کو حاصل ہے"

لیکن ہم حفظ الایمان کی اصل عبارت نقل کرنے سے پہلے تسہیل فہم کے لئے یہ بتلادینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری دلیل میں مولانا نے مسئلہ کی دو شقیں کر کے ان میں سے ہر ایک کا ابطال کیا ہے اور حاصل مولانا کی اس دوسری دلیل کا یہ ہے کہ جو شخص حضور کی ذات مقدسہ پر عالم الغیب کا اطلاق کرتا ہے اور آپ کو "عالم الغیب" کہتا ہے (مثلاً زید) وہ یا تو اس وجہ سے کہتا ہے کہ اس کے نزدیک حضور کو بعض غیب کا علم ہے۔ اور یا اس وجہ سے کہ آپ کو کل غیب کا علم ہے یہ دوسری شق تو اس لئے باطل ہے کہ آں حضرت کو کل غیب کا علم نہ ہونا دلائل عقلیہ و نقلیہ سے ثابت ہے (اور خود مولوی احمد رضا خانصاحب بھی اس سے متفق ہیں) اور پہلی شق (یعنی بعض غیب کی وجہ سے حضور کو عالم الغیب کہنا) اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ ہر انسان بلکہ حیوانات تک کو "عالم الغیب" کہا جائے کیوں کہ غیب کی بعض باتوں کا علم تو سب کو ہے۔ کیوں کہ ہر جاندار کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ضرور ہے جو دوسرے سے مخفی ہے۔ پس اس شق کی بنا پر چونکہ سب کو عالم الغیب کہنا لازم آتا ہے اور یہ عقلاً، نقلاً، عرفاً غرض ہر حیثیت سے باطل ہے لہذا ملزوم (یعنی زید کا حضور کو بعض علوم غیبیہ کی وجہ سے عالم الغیب کہنا) بھی باطل ہوگا۔ یہ ہے مولانا کی ساری تقریر کا خلاصہ ... .

نیک ارادے کے ساتھ سینما بینی؟

[الفرقان ۱۳۵۳ھ۔ ۱۹۳۴ء میں بریلی سے جاری ہوا۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ
کا صدق (لکھنؤ) پہلے سے نکل رہا تھا۔ بانیٔ الفرقانؒ کی نظر میں وہ اس قدر قابل تعریف اور قابل قدر تھا کہ
۱۳۵۵ھ کے الفرقان نمبر (۷) میں "مرض الحاد کے دو حکیم" کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا تو ان دو میں
ایک نام مولانا دریابادی کا تھا۔ لوگوں کو توجہ دلائی گئی تھی کہ "صدق" کا مطا
کی تفسیر چھپنی تو اس کا بھی نہایت اہتمام سے الفرقان میں کئی بار د
میں پڑھا گیا کہ مولانا نے ایک شرعی مقصد سے سینما دیکھا۔ بانیٔ الفر
نام ونشان کے "ایک مشہور دینی جریدے کے محترم مدیر" کو توجہ
بہت خلاف امید ملا تو دوبارہ مذکورہ بالا عنوان سے جو کچھ لکھا گیا وہ حضرت مان
پہلو اجاگر کرتا ہے۔ اسکی اشاعت جمادین ۱۳۶۲ھ کے شمارے میں ہوئی ----- مرتب]

"سینما بینی" کے متعلق ایک مشہور صحیفہ کے محترم اڈیٹر کی ایک نہایت خطرناک علمی غلطی کا تذکرہ دلی رنج و قلق کے ساتھ "الفرقان" کے گزشتہ پرچہ کے انہی صفحات میں کیا گیا تھا، خود اُن محترم سے بھی اپنی رائے پر "نظر ثانی" کی درخواست پوری دلسوزی سے کی گئی تھی، اور دوسروں کو اس غلطی سے بچانے کا جو فرض اپنے اوپر عائد ہوتا تھا اپنے امکان بھر اس کی ادا کی بھی پوری کوشش کی تھی ——— شکر گزار ہوں کہ 'اُن محترم' نے میری اس کوشش کو تو مخلصانہ اور خیر خواہانہ ہی سمجھا، لیکن رائے میں کوئی تبدیلی اس کے بعد بھی نہیں ہوئی بلکہ پوری قوت وشدت کے ساتھ موصوف کو اب تک اپنے اس نظریہ پر اصرار ہے کہ ——— سینما بینی اگرچہ فی حد ذاتہ معصیت اور حرام و فسق ہی ہے لیکن اس قسم کے معاصی و فواحش کے ارتکاب سے بھی بہت سے "دینی فوائد" حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور اگر ان "دینی فوائد" ہی کی نیت سے اس حرام و فسق (سینما بینی) کا ارتکاب کرلیا جائے اور اسکے ذریعہ حاصل کئے ہوئے

معلومات و تجربات سے "دین کی خدمت و تبلیغ" میں کام لیا جائے تو اُمید یہ ہے کہ یہ فعل قابل مواخذہ نہ ہوگا"۔

محترم موصوف نہ صرف یہ کہ اپنے اس غلط تر اور خطرناک نظریہ پر مصر ہی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس غلطی میں اپنا ہم نوا کرنے پر وہ اپنے دماغ و قلم کی پوری قوت صرف فرما رہے ہیں اور اس مہینہ میں ان کے اخبار کا کوئی پرچہ بھی غالباً اس کوشش سے خالی نہیں رہا ہے۔

جن محترم بزرگ کا اس قضیہ سے تعلق ہے چونکہ دین ہی کے واسطے سے یہ ناچیز بھی ان سے کچھ نیاز مندانہ ربط و تعلق رکھتا ہے، نیز اس وجہ سے کہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے وہ نرے اڈیٹر نہیں ہیں بلکہ دین کے مخصوص اور دردمند خادموں میں ان کا شمار ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ "تفسیر قرآن" اُن کا ایک ایسا تازہ دینی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ایک بہت بڑے طبقہ کیلئے اُن کی بات "دینی سند" ہو سکتی ہے نیز یہ کہ وقت کے بعض اکابر علماء و مشائخ سے ان کی ایک طرح کی عقید تمندانہ یا ارادتمندانہ وابستگی بھی لوگوں کو معلوم ہے ___ غرض ان وجوہ سے چونکہ ان کی اس غلط روی کے اثرات بہت متعدی ہو سکتے ہیں (اور خود راقم کے علم میں ہے کہ ہو رہے ہیں) اس لئے دل کو سخت رنج و قلق ہے۔ اسی قلبی اذیت نے اشاعت گزشتہ میں وہ سطریں لکھادی تھیں، اور یہی تاثر آج بھی اس اظہار درد و کرب پر مجبور کر رہا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں تک کسی کے ذاتی فعل کا تعلق ہو سکتا ہے اس پر کسی کو "واویلا" کی کیا ضرورت، اس دنیا میں آج کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے اور ہم میں سے کتنوں کا دامن آثام و معاصی سے بالکل پاک صاف ہے، سو جہاں تک ان کے ذاتی فعل کا تعلق ہے اس کے متعلق تو بجز اس کے کچھ عرض کرنا نہیں کہ اللہ پاک اس کو اور اس کے علاوہ بھی ہماری ان کی ساری خطاؤں کو معاف فرمائے اور اپنی ناراضی کے سارے ہی موجبات سے بچنے کی ہم سب کو توفیق دے!

البتہ اس سلسلہ میں اپنے ایک بالکل غلط نظریہ کو وہ جو ایک مستقل اصول کے طور پر اب پیش کر رہے ہیں اور اپنے اخبار کی قریباً ہر اشاعت میں کسی نہ کسی پیرایہ سے وہ دوسروں کو بھی یہ باور کرانے کی مسلسل کوشش فرما رہے ہیں کہ "شیطان شناسی" کیلئے ___ یا "شیطان شناسوں" کیلئے اس قسم کے معاصی کا ارتکاب، اُن کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات و تجربات سے خدمت دین میں کام لینے کے واسطے، اگر کیا جائے تو یہ کوئی مواخذہ کی چیز نہیں ہے بلکہ گویا دینی خدمت کی یہ بھی ایک راہ ہے۔

تو اپنی "بے خبری" اور "شیطان ناشناسی" کے حقیقی اعتراف و احساس کے باوجود میں صاف صاف یہ عرض کرنے کی پھر جرأت کروں گا (اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو رعایت بیجا اور حق پوشی کا مجرم ہونگا) کہ شریعت محمدی میں اس نظریہ کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ یہ محض "تسویل" ہے۔

پاک مقاصد کے لئے ناپاک ذرائع سے کام لینے کی شریعت اسلامی نے ہم کو ہرگز تعلیم نہیں دی ہے اور نہ ہم کسی ایسی "خدمت دینی" کے مکلف ہیں جو کسی "حرام اور فسق" کے ارتکاب پر موقوف ہو، بکہ اس کو خدمت دین شمار کرنا ہی انتہا درجہ کی غلط فہمی ہے۔ صدقہ و خیرات کس قدر محبوب عبادت ہے، لیکن اگر کوئی شخص ناجائز و ناپاک ذرائع سے روپیہ حاصل کر کے اس کو راہ خدا میں خرچ کرے تو نصوص ناطق ہیں کہ وہ اس کے منہ پر مار دیا جائے گا۔ ان اللہ طیب لا یقبل الا الطیب (حدیث) اللہ پاک ہے اور صرف ...
اور اسی پر کیا موقوف! اگر کوئی شخص اس ارادہ اور ...
اور ڈاکہ زنی کرے کہ ان طریقوں سے جو مال اس کو حاصل ہو ...
دین و خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ" میں صرف کرے گا، اور ...
سے وہ ایسا کرے بھی، تو کیا عند اللہ وہ کسی اجر کا مستحق ہوگا؟ یا شریعت ...
کہ وہ اپنی اس "نیک نیتی" کی وجہ سے مواخذۂ خداوندی ہی سے چھوٹ جائے گا؟ کم از کم میرے علم میں تو کوئی ایسا استثنا نہیں ہے۔

مشرکین عرب کے متعلق قرآن مجید ہی کی گواہی ہے کہ وہ "بت پرستی" کے بارہ میں اپنی "نیت" اور اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے کہتے تھے:-

ما نعبدُ ھم الا لِیُقرّبُو نا اِلی اللہِ زُلفیٰ۔	ہم تو اپنے ان دیوتاؤں کی پوجا بس اسلئے کر لیتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیں۔

گویا وہ بت پرستی بھی تقرب الی اللہ ہی کی نیت سے کرتے تھے، جس سے زیادہ پاک مقصد اور جس سے اچھی نیت یقیناً کوئی اور نہیں ہو سکتی لیکن، کیا ان کی یہ "نیک نیتی" اور صرف مقصد کی پاکی شرک کی سزا (خلود فی النار) سے ان کو بچا لے گی؟ —— میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ شرک اور سینمابنی ایک درجہ کی چیزیں ہیں بلکہ مقصد صرف اس اصول کا واضح کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص "خدا طلبی اور "تقرب الٰہی" کی نیت سے بھی معصیت کا ارتکاب کرے (بالخصوص اس

کو معصیت اور حرام و فسق جانتے ہوئے) تو "حسن نیت" کی وجہ سے وہ مواخذہ سے چھوٹ نہ جائے گا ــــ خصوصاً معاصی میں جو چیزیں (اصول فقہ کی اصطلاح میں) "قبیح لعینہ" ہیں، اُن میں تو "حسن نیت" کا عذر نہ ہونا عقلاً بھی ظاہر بلکہ بدیہی ہے، اور معلوم ہے کہ فواحش تمامتر قبیح بالذات ایسی ہیں اور سینما کے تماشوں میں جیسا کہ "خود ان محترم" ہی کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے بجز فواحش کے اور کیا ہوتا ہے؟ ـــ بہر حال "سینماء جیسے مجموعۂ فواحش و منکرات کے متعلق یہ خیال کرنا کہ "شیطان شناسی" یا "شیطانی ترقیوں سے واقفیت" حاصل کرنے کے لئے، یا "خدمت دین" کے کسی شعبہ میں اس کے معلومات و تجربات سے کام لینے کے واسطے اس "حرام و فسق" کا ارتکاب اگر کبھی کبھی کر لیا جایا کرے تو امید یہی ہے کہ اللہ مواخذہ نہ فرمائے گا"۔ میرے لئے اب بھی سخت موجب حیرت ہے، اور اس قسم کے محرمات و موجباتِ فسق کو "خدمت دین" کے کسی شعبہ میں کار آمد سمجھنا بھی بجائے خود عجیب تر، اور محض سطحیت نظر! ان الله لم يجعل شفائكم فيما حرم عليكم ' (اللہ نے تمہاری شفاء حرام چیزوں میں نہیں رکھی ہے)(۱)۔

واضح رہے کہ یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں وہ صرف "کنز" و "ہدایہ" جیسی کسی فقہی کتاب کے کسی "جزئیہ" ہی کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ یہ اصول شریعت کا کھلا مقتضی ہے۔ اس کو "فقیہانہ" یا "مدرسانہ" طرز فکر کا نتیجہ کہنا اور اس اختلاف رائے کو "بے خبر فقیہ" اور "باخبر حکیم" کے نقطۂ نظر کا اختلاف قرار دینا، "متجدد دیں" یا "شریعت سے آزاد متصوفین" کو توزیبا ہو سکتا ہے لیکن اگر "متشرعین" بھی کسی وقت اسی قسم کی باتیں کرنے لگیں تو "اپنی بد قسمتی" کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات اور آپ کا اسوۂ حسنہ (جس کا مجموعی نام شریعت اسلامی ہے) اگر ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے قانونِ رضا و غضب کی مکمل اور غیر مشتبہ تشریح ہے اور جن چیزوں کو اُس نے "معروف" و موجبِ رضا قرار دیا ہے انہی پر اچھے اجر کی توقع کی جا سکتی ہے، اور جن چیزوں کو اُس میں منکر اور موجب سخط و غضب الٰہی بتلایا گیا ہے تو اُن کا نتیجہ برا ہی نکلنے والا ہے، غرض اگر ہم شریعت محمدی کو اللہ تعالیٰ کی رضا و عدم رضا کی صحیح اور مکمل ترجمانی یقین کرتے ہیں، تو پھر کسی چیز کے متعلق یہ جانتے ہوئے کہ شرعاً یہ "حرام و فسق" ہے محض اپنے خیالات اور اپنی آرزوؤں کی بنیاد پر یہ اُمید قائم کر لینا کہ اگر اس "نیک مقصد" سے

---

(۱) علماء محققین نے اس حدیث میں لفظ "شفا" کو وسیع معنی میں سمجھا ہے ۱۲ منہ۔

اس کا ارتکاب کر لیا جائے تو ہم سے مواخذہ نہ ہوگا، میرے خیال میں تو ایک قسم کا "اتباع ہویٰ" ہے۔ اور اسی کا دوسرا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں "امانی" ہے۔

مثلاً آپ بلا وضو "نماز" پڑھتے ہیں، پھر اللہ کیلئے بھی نہیں بلکہ اللہ کی مخلوق کو دکھلانے کیلئے، اور دوسروں کو بھی تبلیغ کرتے ہیں کہ بھئی! نماز پڑھو، بے وضو ہی پڑھ لو، تاکہ ذرا "یہ کافر لوگ" دیکھیں تو اور "شوکت اسلام" سے متاثر تو ہوں(۱)۔

اب بیچاری 'کنز و ہدایہ' ہی نہیں بلکہ (جہاں تک مجھے علم ہے) قرآن بھی اس "نماز" کو نماز نہیں تسلیم کرتا، اس پر کسی اجر کا وعدہ نہیں کرتا، بلکہ "الذین ھم یراؤن" کے صریح لفظوں میں ایسی "نماز" کی مذمت کرتا ہے، اور جابجا صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ جو عبادت بھی خالص اللہ کی رضا کیلئے نہیں کی گئی وہ قبول نہیں کی جائے گی، بلکہ منہ پر مار دی جائے گی لیکن آپ کا "دل" چاہتا ہے ہماری "یہ نماز" ضرور قبول ہو بلکہ بہت سے اعمال مقبولہ سے بڑھ کر مقبول رہے اور پھر آپ اپنی اس دلی خواہش کی بنیاد پر ایسا ہی عقیدہ بھی بنا لیں تو یہ "ھدیٰ" کا اتباع ہوگا یا "ھویٰ" کا؟ اور آپ کی اس خوش فہمی اور امید کی بنیاد کسی محکم وعدہ پر ہوگی یا محض "امانی" پر؟۔

قرآن مجید نے تو اس طریق کار اور اس طرح من مانے عقائد و اعمال کی قوت اور شدت سے تردید کی ہے، جن آیات میں "بغیر علم" "بغیر ھدیٰ" "بغیر سلطان" "بغیر اذن رب" دینی معاملات میں خیالات قائم کرنے کی مذمت فرمائی گئی ہے کیا اُن میں غور و تدبر کے بعد اس باب میں کچھ شبہ رہتا ہے؟

اس سلسلہ میں عام محکمات شریعت کے مقابلہ میں عارف رومی کی چرواہے والی حکایت سے استناد اور بھی حیرت انگیز ہے، اگر مثنوی کی حکایات کی روایتی حیثیت کچھ قابل اعتنا(۲) ہوتی تو قواعد شرعیہ کے مطابق اس حکایت ہی کی "توجیہ" کی جاتی، نہ کہ اُن کے مقابلہ میں اُسی کو مسائل کے استنباط کیلئے اساس بنایا جاتا۔

ہمارے "اُن محترم" پر یہ حقیقت تو مخفی نہ ہوگی کہ اگر بالفرض (کفرض المحال) اس قسم

---

(۱) یہ کوئی واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک فرضی مثال ہے، ہاں اس سے کچھ ملتے جلتے ایک واقعہ کا ذکر غالباً اسی سینمابینی کے قضیہ پر روشنی ڈالنے کیلئے بعض حضرات نے فرمایا ہے، تو اس مثال سے اگرچہ اُس واقعہ پر بھی کچھ روشنی پڑ سکتی ہو (اور یہ مقصود بھی ہے) لیکن بہر حال اس کو عینہ وہی واقعہ نہ سمجھا جائے۔ اُسمیں اور فرضی مثال میں کچھ فرق ہے ۱۲منہ۔

(۲) اہل علم کو معلوم ہوگا کہ "مثنوی رومی" میں بہت سی حکایات "کلیلہ و دمنہ" کے قبیل کی ہیں۔ ۱۲منہ

کا کوئی واقعہ قرآن مجید میں بھی بیان ہوتا تو اس کا شمار "متشابہات" میں ہوتا اور اُس کا اتباع اور اس سے استناد کرنے والے اللہ کے فیصلہ کے بموجب "الذین فی قلوبھم زیغ" کے مصداق ہوتے، چہ جائیکہ وہ نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں نہ "روایات و آثار" کی کسی کتاب میں!

اس سلسلہ میں میرے ایک مخدوم اور نہایت محترم بزرگ کے "حکیمانہ طریق اصلاح و ارشاد کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، اگرچہ اس قسم کے مسائل میں میں اس طرز عمل کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا، اور میرا عقیدہ ہے کہ جس فعل کا غلط اور "حرام و فسق ہونا ہمکو شریعت سے معلوم ہو، اگر اپنی کسی "خوش فہمی" کی وجہ سے ہم اس کے مرتکب ہو جائیں تو آخرت میں اپنے کسی بزرگ کے طرز عمل کا حوالہ دے کر اللہ کی گرفت سے ہم چھوٹ نہیں سکیں گے، (بلکہ ان بزرگوں ہی کی تعلیم و صحبت کی برکت سے بفضلہٖ تعالیٰ یہ ناچیز اتنی جرأت بھی اپنے اندر پاتا ہے کہ اگر خود اُن بزرگوں سے بھی کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جس سے دوسروں کے بھی گمراہ ہونیکا اندیشہ ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ انکے واجبی ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے انکو اسی طرح ٹوک دونگا)۔ بہر حال اگرچہ یہ طریقہ خود میرے نزدیک صحیح نہیں ہے لیکن اگر ہمارے وہ "محترم" اس پر مطمئن ہیں تو میں عرض کرتا ہوں کہ پھر دور از کار اور موضوع سے غیر متعلق اشارات سے کام لینے کی کیا ضرورت، بحمد اللہ وہ بزرگ (حضرت تھانوی مدظلہ) اس دنیا میں موجود ہیں، پوری چیز اور اصل معاملہ بجنسہٖ اُن کی خدمت میں پیش کر کے استصواب کیا جاسکتا ہے، اور اگر اس میں کچھ زحمت ہو تو پھر حضرت مولانا مدظلہ ہی کی ایک تحریر جو مسئلہ زیر بحث پر ہو بہو منطبق ہے یہ عاجز پیش کرتا ہے۔

آج سے پانچ سال پہلے ۱۳۵۰ھ میں خود راقم سطور نے حضرت مولانا مدظلہ سے چند سوالات کئے تھے، حضرت مولانا نے ان کا جواب کسی قدر تفصیل سے ارقام فرمایا تھا، جو اسی زمانہ میں رسالہ "النور" تھانہ بھون میں غالباً "شق العین" کے عنوان سے شائع بھی ہو گیا تھا۔ اسکی چند سطریں یہ ہیں جو میں اصل مکتوب گرامی سے نقل کر رہا ہوں۔ ۔

"معصیت ہر حال میں معصیت ہے، تحسین نیت سے مباح یا طاعت نہیں ہو جاتی، آیات و روایات مرقومہ بالا کا اطلاق اس کی کافی دلیل ہے۔ مگر اس کی تنویر کیلئے حضرت مولانا گنگوہی کی ایک ارشاد فرمودہ مثال یاد آگئی کہ اگر کوئی شخص ناچ رنگ کی محفل اس نیت سے منعقد کرے کہ نمازی اذان سن کر تو آتے نہیں ناچ دیکھنے کیلئے جمع ہو جائینگے، پھر سب کو مجبور

کر کے نماز پڑھوادونگا، تو کیا کوئی شخص اس نیت سے ناچ کرانے کو جائز کہہ سکتا ہے، بلکہ معصیت میں طاعت کی نیت قواعد شرعیہ کی رو سے زیادہ خطرناک ہے جیسے حرام چیز پر بسم اللہ کہنے کو فقہا نے قریب بکفر کہا ہے۔" انتہی بلفظہ '

پس اگر حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کی تصریح ہی "ان محترم کو مطمئن کر سکتی ہے تو لیجئے وہ بھی حاضر ہے ورنہ خود میرا اس باب میں جو مسلک ہے وہ میں عرض کر چکا ہوں و به ادین الله یوم یقوم الناس لرب العٰلمین۔

آخر میں پھر گذارش ہے کہ چونکہ "وہ محترم اپنی ایک افسوسناک اور خطرناک غلط فہمی کو اب ایک مستقل اصول کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور اپنے اخبار کے ذریعہ دوسروں کو بھی اسکی صحت باور کرانے کی مسلسل اور طرح طرح سے کوشش فرما رہے ہیں اور انکی بزرگی کی وجہ سے لوگ اس سے متاثر بھی ہو رہے ہیں اور میں دیانت داری کے ... ہوں اس لئے خاموشی کو جرم سمجھ کر بادل ناخواستہ آج بھی یہ چند ... ہے کہ کس احساس کے ساتھ لکھی ہیں۔ میں نے ان سطور میں ص... ہے جو میرے نزدیک کسی کیلئے غلط فہمی کا موجب ہو سکتی تھیں، باقی اور لطیفوں سے تعرض کرنیکی میں نے ضرورت نہیں سمجھی کہ شرعی مباحث ... چیزیں لا یعبأ بہ ہیں۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دعوت

[۱۳۶۴ھ میں الفرقان کا ایک خاص نمبر "حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت"
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے شائع ہوا تھا۔ اس کے پیش لفظ مرقومہ
حضرت بانیٔ الفرقان کا ایک حصہ ـــــــــــــ مرتب]

مولانا کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ارشادات تفصیل سے سننے کا موقع ملا، تو قلب ودماغ پر دو اثر ہوئے۔

ایک تو یہ کہ مولانا کی دعوت بڑی عمیق اور اصولی دعوت ہے جو محض غلبۂ حال کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص اعانت و توفیق کے ساتھ، اصول دین میں بہت گہرے غور وتدبّر، قرآن وحدیث کے عمیق مطالعہ و تفکر، دین کے مزاج وطبیعت سے واقفیت اور صحابۂ کرام اور قرنِ اول کے طرز زندگی کے وسیع اور گہرے علم پر مبنی ہے، اور وہ چند منتشر اور غیر مربوط اجزا کا نام نہیں ہے، بلکہ مولانا کے ذہن میں اس کا ایک مرتب خاکہ ہے۔ البتہ اس کے لئے ان کے نزدیک ترتیب و تدریج بہت ضروری ہے، اس حقیقت کے انکشاف کے بعد قلب میں شدت کے ساتھ اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ یہ چیزیں کاغذ پر بھی مرتب شکل میں آجائیں، اور اس دعوت کے اصول ومبادی اور طریق کار اور اس دعوت کی ذہنی اساس اور اس کی دینی بنیاد اہل علم کے لئے اس زمانہ کی زبان اور علمی پیرایۂ بیان میں سامنے آجائے۔

رجب ۶۲ھ میں مولانا لکھنؤ تشریف لے گئے اور خاکسار راقم کو بھی آپ کی معیت میں کئی روز رہنے کی سعادت اور کبھی کبھی ترجمانی کی عزت بھی حاصل ہوئی، ہمارے دوست مؤلف کتاب نے ایک مجلس میں مولانا کی ترجمانی کا فرض ادا کیا، اس تقریر کے بعد خاکسار نے بہ اصرار ان سے کہا کہ آپ تمام کام چھوڑ کر اس تقریر کو قلمبند کرلیں، یا اس کو تحریری شکل میں از سرِ نو مرتب کریں، یہ آپ پر سب سے بڑا حق اور بڑی ذمہ داری ہے، اور آپ سے اس

متعلق باز پرس ہو گی، مولاناؒ نے بھی میری فرمائش کی تائید کی، اور غالباً اسی سے متاثر ہو کر مولف کتاب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب نے وہ رسالہ مرتب کیا جو "ایک اہم دینی دعوت یا مسلمانوں کی عمومی تعلیم و تربیت کا نظام" کے نام سے ادارہ الفرقان سے شائع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد راقم الحروف نے مولانا کی علالت کے زمانہ میں "نصرت دین و اصلاح مسلمین کی ایک کوشش" کے عنوان سے ایک مقالہ مرتب کیا اور اس میں اس دعوت کی ترجمانی و نمائندگی کی کوشش کی، اس طرح جہاں تک دعوت کے اصول و اساس کا تعلق ہے، اگرچہ کوئی تحریر کسی انسان کی قائم مقام نہیں ہو سکتی، مگر اس سلسلہ میں دل پر اب اتنا بوجھ نہیں رہا، اور کسی حد تک اس کا اطمینان ہو گیا ہے، کہ دل و دماغ کی امانت کاغذ کے سپرد کر دی گئی ہے اور اگرچہ کاغذ بہت ضعیف ہے مگر اس کے امین ہونے میں شک نہیں۔

قلب پر دوسرا اثر مولانا کی شخصیت کا تھا۔ ہماری آمد و رفت،
ذاتی واقفیت جتنی بڑھتی گئی، مولانا کی شخصیت کا اثر بھی ہمارے
دوسرے صاحبِ بصیرت احباب اس بارے میں ہم خیال و یک
شخصیت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی اور رسول اللہ ﷺ
مؤثر اور زندۂ جاوید ہونے کے ثبوت کے طور پر اور صحابۂ کرام
جنون و بے قراری اور اس دور کی خصوصیات کا ایک اندازہ کرنے کے لئے اس زمانہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ غیر معمولی اور نادر چیزیں دیکھتا ہے، تو چاہتا ہے کہ اس کے دوست احباب بھی دیکھیں، اس سے سُن کر تصدیق کریں، دوسرے ملکوں کے سفرنامے اسی جذبے کے ماتحت لکھے گئے، طبعی طور پر ہمارا بھی جی چاہتا تھا کہ ہمارے احباب اور معاصر اس ہستی کو دیکھیں، جو قرون اولیٰ کے خزانۂ عامرہ کا ایک بچا کھچا موتی ہے، لیکن کسی کو کسی پر اختیار نہیں، بہت سے احباب جو بہ آسانی پہونچ سکتے تھے اور جن کی نظر دوررس اور حقیقت شناس تھی اور جو اپنی مناسبت اور صلاحیتوں کی بنا پر مولانا کے موردِ لطف ہو سکتے تھے، وہ اپنے مشاغل کی بنا پر یا کسی دوسری وجہ سے انکی زندگی میں نہ آسکے، یا اُن کو انکی شخصیت کے مطالعہ اور انکی زبان سے انکی دعوت کے سننے کا کافی موقع نہ مل سکا۔

ہم آپس میں اکثر تذکرہ کرتے تھے کہ اگر ہم مولانا کے حالات کسی کے سامنے بیان کریں تو وہ مبالغہ پر محمول کرے گا، اور دیکھنے والا ہمارے بیان کی تقصیر اور کوتاہی سمجھے گا، الفاظ کی

کوئی بڑی سے بڑی مقدار ذاتی مطالعہ اور عینی مشاہدہ کے قائم مقام نہیں ہو سکتی، الفاظ یا تو آگے بڑھ جاتے ہیں یا پیچھے رہ جاتے ہیں، کاغذی لباس جو بھی تیار کیا جائے گا وہ جسم پر پورے طور پر راست نہیں آئے گا، یا ڈھیلا رہے گا یا تنگ۔ اگر کوئی چیز کسی کا کچھ صحیح تصور قائم کرا سکتی ہے اور اس کو کسی حد تک اس کی صحیح شکل میں پیش کر سکتی ہے تو وہ صرف واقعات یا اس کی اپنی تحریریں (خصوصاً خطوط) اور اس کی روز مرہ کی بے تکلف گفتگو ہے۔

مولانا کے ساتھ رہنے اور ان کو قریب سے دیکھنے سے ہم پر ایک اہم علمی نکتہ منکشف ہوا کہ بزرگانِ دین اور اکابرِ سلف کے جو حالات کتابوں میں جمع کئے گئے ہیں ان میں خواہ کتنے ہی استقصا سے کام لیا گیا ہو وہ ان کی شخصیت اور ان کے اصلی کمالات سے کوئی نسبت نہیں رکھے، اور واقعات کا بھی وہ بہت تھوڑا سا حصہ ہوتے ہیں جن میں مؤلف و سوانح نگار کی نظر انتخاب اور اس کے ذوق کو بڑا دخل ہوتا ہے اور بعض مرتبہ تو جس شخص کی وہ سیرت ہوتی ہے اس سے زائد خود سوانح نگار کی اپنی سوانح اور اس کا ذہنی مرقع ہوتی ہے، پھر کیفیات و جذبات اور بیسیوں ادائیں ہیں قلم سے جنکی تصویر کشی محال ہے۔ شاعر نے سچ کہا ہے.

اگر مصور صورتے آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش راچناں خواہد کشید

اور غریب سوانح نگار کرے بھی کیا، بہت سی کیفیات و حقائق کے لئے شاعری کی لطیف اور وسیع زبان میں بھی لفظ نہیں

بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

☆☆☆

احیاءِ دین کی دعوت اور سیاست

[ذی قعدہ ۷۵؁ ۱۳ھ کے الفرقان میں پاکستان کے ایک نوعمر عالم دین کے ایک ایسے خط کا جواب شائع کیا گیا تھا جس میں تبلیغی جماعت کے کام کے بارے میں اپنے کچھ خیالات پیش کر کے بعض باتوں کی وضاحت چاہی گئی تھی۔ اس جواب کا ایک نکتہ (۷) یہاں پیش ہے مرتب]

(۷)

حکومت میں اصلاحی انقلاب یعنی دینی تقاضوں کے مطا
تبلیغی جماعت کے جد و جہد نہ کرنے کا بھی آپ نے ذکر فرمایا ہے
کام میں یہ بڑا خلا ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ایک حکومت کی اصلاح ہی کا معاملہ کیا اس سے علاوہ ن بہت سے بہت اچھے اور بعض پہلوؤں سے بہت اہم اور بہت ضروری کام ایسے ہیں جن کے لئے تبلیغی جماعت بظاہر کچھ نہیں کر رہی ہے —— مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کی اہمیت میں کون شک کر سکتا ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ تبلیغی جماعت اس کے لئے بھی بظاہر کچھ نہیں کر رہی ہے۔ نہ تعلیم کے نظام و نصاب کی اصلاح کے لئے کوئی کوشش ہے نہ مکاتب و مدارس قائم کرنے کی کوئی جد و جہد ہے۔ نہ مساجد میں درسِ قرآن جاری کرنے کی دعوت ہے۔ نہ وقت کے تقاضے کے مطابق دینی لٹریچر تیار کرنے کا کام کیا جا رہا ہے۔ وقس علی ھذا —— اگر آپ سوچیں تو ان کے علاوہ بھی بہت سے کام آپ کو نظر آئیں گے جو بڑے اچھے ہیں اور بعض پہلوؤں سے بہت ضروری ہیں لیکن تبلیغی جماعت ان کے لئے کچھ نہیں کر رہی ہے۔ اب آپ خود ہی ذرا غور فرمائیں کہ آپ نے سیاست و حکومت والی خلا ہی کو کیوں زیادہ محسوس کیا۔؟

اصل بات یہ کہ مادّیت کے غلبہ اور بعض خاص عصری حالات نے بھی سیاست و حکومت کے مسئلہ کو اتنا اہم بنا دیا ہے اور اس کی اہمیت و اقدمیت کا اتنا مبالغہ آمیز پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ عام طور سے یہی سمجھا جانے لگا کہ دین و دنیا کا اصلی اور بنیادی مسئلہ بس حکومت ہی

کا ہے، اور اگر کوئی آدمی حکومت کے ادل بدل کے لئے کچھ نہیں کر رہا ہے، اور اس مقصد کے لئے شور بھی نہیں مچا رہا ہے تو گویا وہ کچھ کر ہی نہیں رہا ہے ـــــــ میرا خیال ہے کہ غیر شعوری طور پر آپ بھی اس وقتی مشاغبہ سے متاثر ہیں۔

لیکن جن بندگانِ خدا کو اس حقیقت کا یقین نصیب ہو کہ جب تک قلوب میں وسیع پیمانہ پر ایمان و یقین اور فکرِ آخرت پیدا نہ ہو، اور جب تک مسلمانوں کی زندگی میں اسلام غالب نہ ہو، خاص کر عوامیت اور جمہوریت کے اس دور میں حکومت میں کسی صالح انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کا طرزِ عمل اس معاملہ میں قدرتی طور پر وہی ہونا چاہئے جو آپ تبلیغی جماعت والوں کا دیکھ رہے ہیں۔

ایک زمانے میں اس مسئلہ میں میرا حال بھی قریب قریب وہی تھا جو اس وقت غالباً آپ کا ہے۔ لیکن اب تو گویا کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی زندگی میں اور ان کے ظاہر و باطن میں بڑی تبدیلی کے بغیر صالح حکومت اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے لئے براہ راست کوشش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی سوکھے بے جان درخت سے پھل نکالنے کی براہ راست لاحاصل سعی کرنا، مجھے تو قرآن و احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، اور غور و فکر کا فیصلہ بھی یہی ہے، اور یہی تاریخ کی شہادت ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی سمجھنی ضروری ہے کہ متذکرہ بالا احوال و اسباب کی وجہ سے سیاست کے اکھاڑوں اور حکومت سے متعلق آویزیشوں سے کسی فرد یا جماعت کے یکسو رہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کو صالح حکومت کے قیام سے دلچسپی نہیں ہے، اور اس کے نزدیک حکومتِ کافرہ حکومتِ فاسقہ اور حکومتِ صالحہ عادلہ سب یکساں ہیں ـــــــ یہ خیال اور حال کسی کافر کا ہی ہو سکتا ہے، بلکہ جیسا کہ عرض کیا ایک صاحب بصیرت مؤمن کسی وقت یہ فیصلہ اس لئے بھی کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اس وقت کے حالات کا دینی اقتضا یہی ہوتا ہے اور انجام کے لحاظ سے وہ اسی کو اولیٰ و اصلح سمجھتا ہے۔ سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے چھوٹے بھائی سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کو جو چند اصولی وصیتیں کی تھیں شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو کہ ان میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ ہم کو اب دین کی خدمت سیاست و حکومت کے راستے کے بجائے دعوت کے راستے سے کرنا چاہئے۔ (۱)

---

(۱) مجھے وصیت کا یہ حاصل اور خلاصہ یاد رہ گیا ہے۔ اصل الفاظ وصیت کے یاد نہیں ہیں، اور نہ اس وقت کتاب کا نام ہی یاد ہے۔

میرے نزدیک تو یہ بات ازروئے دین بالکل بدیہی سی ہے کہ اصل چیز ایمان اور عبدیت والی زندگی اور اس کے لئے جدوجہد ہے ـــــــ اور دین میں کسی حکومت کے خلاف ''جہاد'' کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ایمان اور عبدیت کے لئے کام کا راستہ آسان ہو جائے، اور دشمنِ دین یا بے دین حکمرانوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات اور رکاوٹیں دور ہو جائیں۔

پس اگر کسی فرد یا جماعت کی ایمانی بصیرت کا فیصلہ کسی وقت یہ ہو کہ سیاست کے راستہ سے اس وقت ہمارے مقصد کے لئے کامیابی کے امکانات نہیں ہیں، اور اگر ہم سیاست و حکومت کے اکھاڑے میں اُتر کر زور آزمائی کریں گے تو بس اسی میں کھو کے رہ جائیں گے، اور ایمان اور عبدیت والی زندگی کے لئے جو کچھ اس وقت دعوتی جدوجہد کی راہ سے کر سک رہے ہیں وہ بھی نہ کر سکیں گے۔ تو اس عاجز کے نزدیک گویا یہ دین کے بدیہات میں سے ہے کہ اس صورت میں اس کا فیصلہ سیاست سے الگ رہ کر ہی اپنا کام کرتے رہنے کا ہونا چاہئے

اس سلسلے میں ایک بات یہ بھی سمجھنے اور ملحوظ ر
متعلق یہ فیصلہ کریں کہ ہمیں تو انشاء اللہ مرتے دم تک ا
دعوتی جدوجہد ہی کے کام میں لگا رہنا ہے، اور اگر اللہ تعا
ایمان اور عبدیت والی زندگی امت میں وسیع پیمانے پر پید
سنت اور اپنے وعدے کے مطابق اس امت کے صالح طبقہ کی طرف حکو ی اقتدار س بھی لہ
تب بھی ہم حکومت میں حصہ نہ لیں گے بلکہ ایمان اور عبدیت کے لئے دعوتی جدوجہد جو اس وقت کر رہے ہیں بس یہی انشاء اللہ کرتے رہیں گے اور خدا نے توفیق دی تو اسی کو کرتے کرتے مریں گے ـــــــ تو میں نہیں سمجھتا کہ دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی بندہ ان کے اس فیصلہ کو غلط اور ناپسندیدہ کہہ سکے۔

آپ نے اپنے خط میں تبلیغی کام کرنے والے بعض حضرات کا ایک فقرہ جو نقل کیا ہے اس کا مطلب یہی ہے لیکن چونکہ اس زمانہ میں یہ تخیل اور یہ نقطۂ نظر نایاب ہے اسلئے بہت سے لوگوں کو اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے، اور کبھی کہنے والے کی تعبیر کا قصور بھی غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔

☆☆☆

مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی بعض اہم تصانیف

تذکرہ مجدد الف ثانی

امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی مکمل سوانح حیات، آپ کے عرفانی اور ارشادی خصوصیات اور اس عظیم کارنامہ کی تفصیل جس کے نتیجہ میں اکبر اور اسکے حواریوں کا چلایا ہوا "دین الٰہی" تاریخی قصہ ہو کر رہ گیا۔

قیمت -/70

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

جن لوگوں نے حضرتؒ کو نہیں دیکھا وہ ان ملفوظات کے مطالعہ سے آپ کو پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ملفوظات دین کے حقائق و معارف کا عجیب و غریب گنجینہ ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ تفقہ فی الدین اور معرفت و یقین میں مولانا کا مقام کتنا بلند تھا۔

قیمت اردو ایڈیشن -/25 ہندی -/25

منتخب تقریریں

مولانا نعمانیؒ کی ایمان افروز اصلاحی و تبلیغی تقریروں کا مجموعہ جو اپنے اندر افادیت کے ہزاروں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

قیمت -/36

آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور آپ کی منزل کیا ہے؟

مولانا موصوف کی ایک تقریر جس میں دینی مدارس کے طلبہ کے لئے ایک جامع پیغام ہے۔

قیمت -/6

قرآن و حدیث کی سو دعائیں

مولانا نعمانیؒ کی مرتب کردہ ۵۰ قرآنی اور ۵۰ احادیث کی دعاؤں کا مجموعہ۔ آسان اور عام فہم ترجمہ کے ساتھ۔

قیمت -/5

میری طالب علمی

مولانا موصوف نے اس کتاب میں اپنی تعلیمی زندگی کے مختصر حالات بیان کئے ہیں۔

قیمت -/3

شیخ محمد بن عبد الوہاب

کے خلاف پروپگنڈہ اور ہندوستان کے علمائے حق پر اس کے اثرات نیز انکشاف حقیقت کے بعد شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بارے میں انکی رائے کی تبدیلی کی پوری تفصیل۔

قیمت -/20

تصوف کیا ہے؟

تصوف کے موضوع پر اپنے اختصار کے باوجود انصاف و تحقیق و مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے بہت ممتاز بھی ہے۔

قیمت -/20

الفرقان بکڈپو 114/31 نظیر آباد، لکھنؤ-18

یہ شوق جنت اور خوف دوزخ سے محرومی!

[تبلیغی دعوت کے سلسلہ کی ایک تقریر سے اقتباس]

اس موقع پر بے اختیار اپنے دل کا ایک احساس ظاہر کر دینے کو جی چا
یقینی اور اصلی ایمان سے ہمارے دلوں کی محرومی اب اس حد
اور جنت کے وعدہ میں اب ہمارے لئے کوئی کشش نہیں رہی
چھوٹے سے چھوٹا کام ہونا بھی مشکل ہے حالانکہ اگر دلوں
مست و بے خود ہو جانا چاہئے، جنت وہ چیز ہے جس کے شوق
لاکھوں ایمان والے بندوں نے جانیں قربان کی ہیں اور اپنا سب کچھ مٹادیا ہے اور بے شک جنت ایسی ہی چیز ہے، قرآن و حدیث میں جنت کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس پر سچا ایمان اور یقین ہو تو پھر اسکے مقابلہ میں ہمارے سارے شوق سرد پڑ جائیں، صحابہ کرامؓ کو دوزخ اور جنت کا ایسا یقین ہو گیا تھا کہ دوزخ کی تکلیفوں اور ذلتوں کے مقابلہ میں دنیا کی کسی تکلیف اور ذلت کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رہی تھی، اور جنت کے شوق اور عشق میں زندگی کے سارے شوق کو فنا کر دیا تھا اور ہمارا حال یہ ہے کہ دوزخ اور جنت کے ذکر سے اب ہمارے قلوب میں نہ کوئی خوف پیدا ہوتا ہے نہ شوق۔

بزرگوں اور دوستوں! ہمارے دلوں کا یہ تغیر کوئی معمولی تغیر نہیں ہے، دوزخ کا خوف اور جنت کا شوق ہی دین کی وہ قوت محرکہ تھی جس نے مٹھی بھر مسلمانوں کے ذریعے دنیا کو زیر و زبر کر ڈالا تھا، آج اسی چیز سے خالی ہو کر ہم خس و خاشاک سے زیادہ بے وزن اور بے وقعت ہیں۔

جنت اور دوزخ سے بے فکری کی یہ سزا تو ہم و دنیا میں ملی ہے اور آخرت میں جو کچھ سامنے آنیوالا ہے بس اللہ ہی اسکو جانتا ہے۔ اللهم احفظنا ونعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات أعمالنا

جنت اور دوزخ سے ہماری بے فکری اور بے تعلقی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ ہمارے خالص مذہبی جلسوں میں اور دینی وعظوں میں بھی اب جنت اور دوزخ کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگ شاید اسکو کسر شان سمجھتے ہیں اور اسکے ذکر کو دقیانوسیت اور ملائیت سمجھتے ہیں، حالانکہ قرآن پاک میں جنت اور دوزخ کا جتنا ذکر ہے اتنا کسی چیز کا بھی نہیں ہے حتیٰ کہ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ توحید و رسالت کا بھی نہیں ہے۔

آجکل کچھ فیشن سا ہو گیا ہے کہ دین کی دعوت بھی صرف دنیوی نتائج اور مصالح کی بنیاد پر دی جاتی ہے، اور اس طرز پر دی جاتی ہے جس طرح دنیا کے دوسرے فلسفوں اور نظاموں کی دعوتیں دی جاتی ہیں یہ طریقہ مفکروں اور فلسفیوں اور خدا اور آخرت سے غافل دنیا پرستوں کا ہوتا ہے، انبیاء علیہ السلام کا طریقہ یہ ہے کہ آخرت کی فکر اور اسکا یقین پیدا کر کے اسی کی بنیاد پر دین کی دعوت دیتے ہیں۔

(الفرقان ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ)

☆☆☆☆

ختم نبوت کی حقیقت

اور

حفاظت دین کے سلسلہ میں ہمارے بزرگوں کا موقف

[۲۹ر۳۰ر۳۱ر اکتوبر کو دار العلوم دیوبند میں منعقد ہونے والے اجلاس تحفظ ختم نبوت کی پہلی نشست کی صدارت فرماتے ہوئے گفتگو فرمائی، جس کا کچھ حصہ تحریر کی شکل میں تھا اور کچھ زبانی خطاب کی شکل میں الفرقان بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۸۶ء میں یہ شائع ہوئی تھی۔ مرتب]

حضرات کرام آپ میرا حال دیکھ رہے ہیں، بیماری ..
آپ کے سامنے ہے۔ اس حال میں اپنی حاضری اور آپ حضـ
تعالیٰ کی توفیق خاص کا کرشمہ اور اپنے لئے باعث سعادت سمجھتـ
"ختم نبوت" کی نسبت کی قوت کشش کا ایک ثمرہ۔

زندگی بھر کتاب و قلم سے واسطہ رہنے کے باوجود نہ علم آیا اور نہ سمجھ، اور اب تو آئے ہوئے علم کے بھی جانے کا زمانہ ہے۔ رات ہی مجھے معلوم ہوا کہ اسی حال میں اتنے اہل علم حضرات کے سامنے اس اجلاس کی اس پہلی نشست میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے تو کوشش کی کہ چند مختصر اشارات قلمبند کرا دوں۔

محترم حضرات! نبوت و رسالت، انسان کی سب سے اہم بنیادی اور فطری ضرورت اور راہ سعادت کی طرف اس کی رہنمائی کی تکمیل کا خدائی انتظام ہے۔ جو ابتدائے آفرنش سے چھٹی صدی عیسوی تک تو اس طرح جاری رہا کہ قوموں، علاقوں اور مختلف بنیادوں پر قائم ہونے والے انسانی مجموعوں معاشروں کیلئے الگ الگ انبیاء و رسل کی بعثت مختلف زمانوں میں ہوتی رہی، پھر چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ انسانیت بلوغ کو پہونچ گئی، اور حکمت الٰہی کے نظر نہ آنے والے مسلسل عمل کے نتیجہ میں دنیا کے جغرافیائی، تمدنی، مواصلاتی اور ذہنی احوال اس طرح کے ہو گئے کہ پوری دنیا کو ایک رہنمائی کا مخاطب بنانا، اسے ایک ہی مرکز ہدایت سے وابستہ کرنا ممکن ہو گیا اور قیامت تک کیلئے دین اور دین کے سرچشموں کتاب و سنت کی حفاظت کے اسباب پیدا ہو گئے

تب سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو اس مبارک سلسلہ کا خاتم اور عالمین کیلئے رحمت بنا کر مبعوث فرمادیا گیا، اور گویا یہ طے کردیا گیا کہ قیامت تک کے آنے والے زمانہ اور پورے کرۂ ارض میں بسنے والے انسانوں میں سے کسی ایک فرد پر اب ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آئیگا جو نبوت اور اسکے فیضان ہدایت سے خالی ہو اس پہلو پر غور فرمایا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ختم نبوت اس نعمت عظمٰی کے انقطاع اور اسکے فیض سے محرومی نہیں بلکہ اسکے دوام و تسلسل کا نام ہے۔

ختم نبوت کا ایک اور پہلو اس لائق ہیکہ اسے اچھی طرح سمجھ کر عام کیا جائے، وہ یہ ہے کہ گزشتہ امتوں کیلئے نئے نبی کی آمد ایک شدید آزمائش ہوا کرتی تھی۔ آنے والے نبی سے پہلے نبیوں کے ماننے والوں میں سے بہت کم لوگ اس کو قبول کرتے اور اس پر ایمان لاتے تھے بڑی تعداد انکار و تکذیب کا اور کفر کا راستہ اختیار کر کے لعنتی اور جہنمی ہو جاتی تھی۔ سب سے آخری دو عظیم الشان رسولوں ہی کی مثال سامنے رکھ لیجئے۔ اسرائیلی سلسلہ کے آخری رسول حضرت عیسیٰؑ جب تشریف لائے اور احیاء موتیٰ جیسے معجزے لے کر تشریف لائے تو یہودیوں میں سے کتنے ان پر ایمان لائے اور کتنوں نے انکو جھوٹا مدعی نبوت قرار دے کر لعنتی اور واجب القتل قرار دیا اور انکی شرعی عدالت نے انکو سولی کے ذریعہ سزائے موت دینے کا فیصلہ کیا۔ اور اسطرح حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کو نہ مان کر اس وقت کی قریب قریب پوری یہودی امت لعنتی اور جہنمی ہوگی۔

اسی طرح جب انکے بعد سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو اگرچہ آپ کے بارے میں واضح پیشین گوئیاں تورات وانجیل وغیرہ اگلی آسمانی کتابوں میں موجود تھیں اسکے باوجود اگلے پیغمبروں اور ان اگلی کتابوں کے ماننے والے یہود نصاریٰ میں سے بس چند ہی نے آپ کو قبول کیا اور آپ پر ایمان لائے باقی سب انکار و تکذیب اور کفر کا راستہ اختیار کر کے دنیا میں اللہ کی لعنت اور آخرت میں جہنم کے ابدی عذاب کے مستحق ہوئے ــــــ پس اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم فرما کر اس امت محمدیہ پر عظیم رحمت فرمائی کہ اسکو اس سخت ترین امتحان اور آزمائش سے محفوظ فرمادیا ــــــ اگر بالفرض نبوت کا سلسلہ جاری رہتا تو یقیناً وہی صورت ہوتی جو پہلے ہمیشہ ہوتی رہی تھی، یعنی حضور ﷺ کی امت کے بہت تھوڑے لوگ آنے والے نبی کو قبول کرتے اور زیادہ تر آپ کے اُمتی اس کا انکار کر کے (معاذ اللہ) کافر اور لعنتی ہو جاتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ حضور ﷺ پر ختم فرما کر اس اُمت کو ہمیشہ کیلئے کفر اور لعنت کے اس خطرہ سے محفوظ فرمادیا اس لئے یہ ختم نبوت امت محمدیہ کیلئے اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین رحمت ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذمہ پیغام الٰہی کی تبلیغ، اور اسکو قبول کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کے کام کے علاوہ ایک کام یہ بھی تھا کہ ایک ایسی امت تیار کر دیں جو ان تینوں کاموں کو سنبھال لے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس حقیقت کی تعبیر یہ کہکر فرمائی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت "بعثت مزدوجہ" تھی یعنی آپ کی بعثت کے ساتھ آپکی امت کی بھی بعثت ہوئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں اس طرف اشارے بھی آئے ہیں کہ آپ کے بعد اللہ تعالیٰ آپکی امت میں وقتاً فوقتاً ایسے بندے پیدا فرماتا رہیگا جو آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت و اشاعت اور اسکی صفائی و آبیاری کی خدمت انجام دیتے رہیں گے، آپ کے ایک ارشاد کے الفاظ ہیں

اِنّ الله يَبْعَث لِهٰذه الامة علىٰ رأس كل ما ئة سنة م[illegible]

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں "يَحمل هذا العلم عن كل العالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين"

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں "لكل قَرْنٍ سابِقٌ"

ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں :بَدَاَالا سلام غَرِيباً وسيعود غريباً [illegible] يارسول اللہ ﷺ،قال الذين يصلحون ماأفسدالناس مِنْ امتى"

رسول اللہ ﷺ کے ان سب ارشادات کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں آپ کی امت میں ایسے افراد پیدا فرماتا رہیگا جو آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت و اشاعت اور تجدید و صفائی کا کام کرتے رہیں گے۔

گزشتہ چودہ سو سال میں دین کی جو خدمات ہوئی ہیں وہ دراصل انہی ارشادات نبوی کی عملی تطبیق ہیں محققین کا خیال ہے کہ ہزارۂ دوم کے آغاز سے اس عظیم کام کا خصوصی مرکز حکمت الٰہی نے سرزمین ہند کو بنادیا۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سے یہاں اس زریں سلسلہ کا آغاز ہوا، ان سے اللہ تعالیٰ نے جو بہت بڑے بڑے کام لئے ان میں اکبر کے دین الٰہی کا خاتمہ سر فہرست ہے، جو ایسا فنا ہوا کہ اب تلاش کرنے سے اس کا ذکر صرف تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اسکے علاوہ توحید و سنّت کی اشاعت، مشرکانہ رسوم و بدعات کے خلاف جہاد تزکیہ و احسان کے صاف ستھرے نظام کی ترویج ——— بگڑے ہوئے تصوف کی بیخ کنی اور شیعیت کے فتنہ سے اس دور کے مسلمانوں کو بچانے کی جد و جہد، انکے چند اہم تجدید کارنامے ہیں۔

ان کے بعد یہ امانت بارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سپرد ہوئی ان کے زمانہ میں ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں پر سخت حالات تھے۔ باہمی تفرقہ و انتشار بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اصرار کی وجہ سے مسلمانوں کے مختلف حلقوں اور مکاتب فکر کی صلاحیتیں باہم ایک دوسرے کی تردید و تصلیل ہی پر صرف ہو رہی تھیں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے وہ تمام کام کئے جن سے ملت اسلامیہ ہندیہ کی تعمیر نو ہو سکے، اور اسکی صفوں میں اتحاد اور قدموں میں ثبات پیدا ہو، اور ذوق و مزاج عملی اور مثبت ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے وقت کے فتنوں اور اسلام کو درپیش داخلی و خارجی خطروں پر کڑی نظر رکھی، اس سلسلہ میں خاص طور پر رد شیعیت کے سلسلہ مین انکے کام کا حوالہ دیا جاسکتا ہے، انھوں نے نہ صرف یہ کہ خود دو کتابیں تصنیف کیں (۱) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (۲) قرۃ العین فی تفضیل الشیخین، بلکہ حضرت مجدد الف ثانی کے اس رسالہ کا عربی میں ترجمہ بھی کیا جو انھوں نے شیعوں کی تکفیر کے سلسلہ میں علماء خراسان کے فتوے کی تائید میں لکھا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے متصلاً بعد انکے صاحبزادۂ گرامی حضرت شاہ عبد العزیز کا زمانہ آیا اس زمانے کے حالات کا اندازہ آپ جیسے اہل علم و نظر حضرات صرف اس سے لگا سکتے ہیں کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنے زمانے میں ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا تھا، لیکن اپنے تمام دوسرے کاموں کے ساتھ جن میں رجال کار کی تیاری کا کام سب سے زیادہ اہم تھا، انھوں نے بھی شیعیت کے فتنہ سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کیلئے "تحفہ اثنا عشریہ" جیسی کتاب تصنیف فرمائی جو انشاء اللہ اس راہ میں قیامت تک مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

پھر حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے تمام کاموں کے ساتھ جن میں اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے میدان کارزار کا سجانا سرفہرست ہے شرک و بدعات کی بیخ کنی کا کام پورے اہتمام کے ساتھ جاری رکھا،

پھر وہ وقت آیا کہ مغلیہ حکومت کا اگرچہ کچھ نام باقی تھا لیکن فی الحقیقت وہ ختم ہو چکی تھی، اسکی جگہ "سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی" کا اقتدار قائم ہو چکا تھا، اس وقت مسلمانوں کی سیاسی مغلوبیت اور کمزوری کے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر عیسائی مبلغین کی ایک فوج میدان میں آگئی، انھوں نے سمجھا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو عیسائی بنالینا آسان ہوگا، انھوں نے تحریر و تقریر سے تبلیغی مہم وسیع پیمانے پر شروع کر دی، تو ہمارے سلسلہ کے اکابر میں سے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دیگر علمائے کرام نے ایسا مقابلہ

جس نے عیسائی مبلغین کو ہمیشہ کیلئے پسپا اور خاص کر مسلمانوں کی طرف سے مایوس کر دیا۔ اسکے
کچھ ہی بعد سوامی دیانند کی آریہ سماجی تحریک وجود میں آئی انھوں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کو
اپنا نشانہ بنایا۔ حضرت نانوتویؒ نے تحریر و تقریر سے اسکا بھی مقابلہ کیا ——— اسی دور میں
یورپ کے سیاسی غلبہ اور اقتدار کے نتیجہ میں عقلیت اور روشن خیالی کے خوبصورت ناموں سے
دہریت اور نیچریت کا فتنا اٹھا، اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے حضرت نانوتویؒ نے اس طرف بھی
خاص توجہ فرمائی اور اپنی تصانیف اور تقریروں سے ثابت کیا کہ اسلام کے تمام بنیادی عقائد
و مسائل عقل و فطرت کے عین مطابق ہیں اور جو اس کے خلاف ہے وہی خلاف عقل و فطرت
ہے ـــ پھر ان خارجی حملوں اور فتنوں کے دفاع اور مقابلہ کے ساتھ شیعیت کی ضلالت کے
خلاف بھی آپ نے لسانی و قلمی جہاد کیا۔ اس سلسلے میں آپ کی مستقل ''تصنیف'' "ھدا یہ
الشیعہ" اور اس موضوع سے متعلق آپ کے مکتو بات حضرات اہل علم
ہیں اس کے علاوہ تعلیمات نبوی اور دین کی حفاظت و اشاعت کا
مدارس کے قیام کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی۔ علیٰ ہذا۔ آپ
نے بھی عمر بھر شیعیت اور دوسرے داخلی فتنوں اور گمراہیوں، مشـ
اور مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جدوجہد فرمائی اور اس کو تقرب ان
زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کا فتنہ شروع ہوا۔ ابتدا میں جب تک حضرت کے علم میں اس کی با
تیں اور دعوے نہیں آئے جن کی وجہ سے اس کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا فرض و واجب ہو
گیا۔ آپ نے احتیاط فرمائی لیکن جب اس کے ایسے دعوے سامنے آگئے جن کے بعد کف لسان کی
بھی گنجائش نہ رہی تو حضرت نے اس کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔

حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے بعد ان کے تلامذہ و مسترشدین، حضرت شیخ
الہند، حضرت سہارنپوری، حکیم الامت حضرت تھانویؒ، پھر ان کے تلامذہ و مرشدین، حضرت
علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ، حضرت مولانا سید
حسین احمد مدنی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی، (رحمہم اللہ
تعالیٰ) یہ سب حضرات بھی اپنے اکابر و اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، خارجی حملوں اور
داخلی فتنوں سے دین کی حفاظت، علوم نبوی کی اشاعت امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور امت کی
اصلاح وارشاد کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس وقت بھی ہم میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے
جنھوں نے ان اکابر دینی غیرت و حمیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہم شہادت دیتے ہیں کہ کو

ئی بڑی سے بڑی مصلحت ان حضرات کو کسی فتنے سے سمجھوتہ اور کسی زیغ و ضلال کو نظر انداز کر نے اوراس سے چشم پوشی پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ بارہا ہم نے دیکھااور تجربہ کیا کہ ہمارے یہ اکابر کسی مسئلہ کی طرف بڑی شدت سے متوجہ ہوئے جو ہم جیسے کوتاہ نظروں کی نگاہ میں اس شد ت کا مستحق نہیں تھا، لیکن تھوڑے ہی دن بعد سامنے آگیاکہ ہم جس فتنہ کو بہت معمولی سمجھ رہے تھے یااس کو دین میں رخنہ اور فتنہ ہی نہیں سمجھ رہے تھے وہ دین کے لئے ایسے زہریلے برگ وبار لایاکہ الاماں ، الحفیظ !

یہ اجلاس تحفظ ختم نبوت کے عنوان سے بلایا گیاہے اور یہی اس کا اصل موضوع اور مقصد ہے اس سلسلہ میں ہمارے استاد امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ قدس سرہ سے (خاص طور سے اس دارالعلوم کی صدارت تدریس کے دور میں) اللہ تعالیٰ نے جو کام لیااوراس بارے میں ان کا جو حال تھا (جس کی طرف کچھ اشارہ اجلاس کے دعوت نامہ میں بھی کیا گیاہے) میں مناسب بلکہ ضروری سمجھتاہوں کہ اس موقع پر آپ حضرات کے سامنے اس کا کچھ ذکر کروں، میں اس کا عینی شاہد ہوں۔

اس وقت میں اس سلسلہ کی حضرت کی تصانیف اور انکی علمی عظمت واہمیت کاذکر نہیں کروں گا، اسی طرح حضرت کی توجہ اور فکر مندی سے آپ کے تلامذہ کی جوایک بڑی تعداد قادیانی فتنہ کے خلاف تحریر و تقریر کے ذریعہ علمی جہاد کے لئے تیار ہو کر میدان میں آگئی تھی، اس کا بھی ذکر نہیں کروں گا، بس چند واقعات ذکر کروں گا جن سے اس فتنہ کے بارے میں حضرت کی شدت احساس اور قلبی اضطراب کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے گا۔

میں ۱۳۴۵ھ میں یہاں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا، یہ اس دارالعلوم میں حضرتؒ کی صدارت تدریس اور درس حدیث کا آخری سال تھا، جس دن دورۂ حدیث کے طلبہ کا سالانہ امتحان ختم ہوااس دن حضرت نے بعد نماز عصر مسجد میں دورہ سے فارغ ہونے والے ہم طلبہ کو خصوصی خطاب فرمایا، وہ گویا ہم لوگوں کو حضرت کی آخری وصیت تھی، اس میں دوسری اہم باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایاکہ ہم نے اپنی عمر کے پورے تیس سال اس میں صرف کئے کہ ب اطمینان ہو جائے کہ فقہ حنفی حدیث کے خلاف نہیں ہے ——— الحمد للہ فیما بیننا و بین اللہ اس پر پورااطمینان ہو گیا کہ فقہ حنفی حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ اگر کسی مسئلہ کے خلاف کوئ حدیث ہے تو کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس کی تائید اور موافقت میں موجود ہے

لیکن اب ہمارا احساس ہے کہ ہم نے اپنا یہ وقت ایسے کام پر صرف کیا جو زیادہ ضرو

نہیں تھا، جو کام زیادہ ضروری تھے ہم اس کی طرف توجہ نہیں کر سکے اس وقت سب سے زیادہ ضروری کام دین کی اور امت کی فتنوں سے حفاظت ہے۔ اس ووقت سب سے بڑا فتنہ مغرب (یعنی یورپ) سے آنے والا الحاد اور دہریت کا فتنہ ہے اور ہمارے اس ملک میں اٹھنے والا قادیانیت کا فتنہ ہے۔ جو بلا شبہ فتنۂ ارتداد ہے میں آپ لوگوں کو وصیت کرتا ہوں کہ ان فتنوں سے امت کی اور دین کی حفاظت کے لئے اپنے کو تیار کریں، یہ اس وقت کا جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ آپ اس کے لئے اردو تقریر و تحریر میں مہارت پیدا کریں اور جن کے لئے انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کا امکان ہو وہ انگریزی میں مہارت پیدا کریں، ملک کے اندر ان فتنوں کا مقابلہ اردو کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے، اور ملک سے باہر انگریزی کے ذریعہ ——— حضرت الاستاذ قدس سرہ سے یہ ارشاد سنے ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں، الفاظ میں تو یقیناً فرق ہو گا لیکن اطمینان ہے کہ حضرت کا پیغام اور ہم لوگوں کو آپ کی وصیت یہی تھی

حضرت اپنے خطابات اور تقریروں میں قادیانی فتنہ پر گف

اکبر رضی اللہ عنہ کے اس غیر معمولی حال اور اضطراب کا ذکر فرما۔

وفات کے بعد ارتداد کے فتنوں خاص کر نبوت کے مدعی مسیلمہ کذ

آپ پر طاری تھا، ہم لوگ محسوس کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے قادیانی فتنہ سے

طرح کا حال ہمارے حضرت استاذ پر طاری فرما دیا ہے۔

یہاں میں فتنۂ قادیانیت کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب سے متعلق ریاست بھاولپور کے تاریخی مقدمہ کا واقعہ ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں یہ مقدمہ بھاولپور کی ججی کی عدالت میں تھا، ایک مسلمان خاتون نے دعویٰ کیا تھ کہ میرا نکاح فلاں شخص سے ہوا تھا، اس نے اپنے کو مسلمان ظاہر کیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قادیانی ہے، اس لئے وہ کافر ہے۔ عدالت میرے اس نکاح کو فسخ اور کالعدم قرار دے۔ بھاولپور کے علمائے کرام نے اہتمام سے اس مقدمہ کی پیروی کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ تشریف لائیں اور عدالت میں بیان دیں اس وقت حضرتؒ مریض اور مرض کی وجہ سے بہت ضعیف و نحیف تھے بالکل اس لائق نہ تھے کہ بھاولپور تک کا طویل سفر فرمائیں، لیکن آپ نے اسی حال میں تشریف لے جانیکا فیصلہ فرمایا، (میں نے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ میرے پاس کوئی عمل نہیں ہے جس سے نجات کی امید ہو، شاید اس حال میں یہ سفر ہی میری نجات و مغفرت کا وسیلہ بن جائے) بہر حال تشریف لے گئے اور جا کر عدالت میں بڑا معرکۃ الآراء بیان دیا، دوسرے چند حضرات علمائے کرام

کے بھی بیانات ہوئے، خاص کر حضرت شاہ صاحب کے بیان نے فاضل جج کو مطمئن کر دیا کہ قادیانی ختم نبوت کے انکار اور مرزا غلام احمد کو نبی ماننے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج کافر مرتد ہیں انھوں نے بہت مفصل فیصلہ لکھا، دعویٰ کرنے والی مسلم خاتون کے حق میں ڈگری دی اور نکاح فسخ اور کالعدم قرار دیا فاضل جج کا یہ فیصلہ قریباً ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب کی شکل میں اسی زمانہ میں "فیصلہ مقدمہ بھاولپور کے نام سے شائع ہو گیا تھا، اسکے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بڑی بنیاد حضرت شاہ صاحب کا بیان تھا —— برطانوی حکومت کے دور میں یہ پہلا عدالتی فیصلہ تھا جس میں قادنیوں کو کافر اور غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔

فتنۂ قادنیت کے ہی سلسلہ میں ایک واقعہ حضرت شاہ صاحب کے جلال کا بھی سن لیجئے۔ دورۂ حدیث کے ہمارے ہم سبق طلبہ میں ضلع اعظم گڑھ کے بھی چند حضرات تھے، اسی زمانے میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک صاحب جو قادیانی تھے سہارنپور میں حکومت کے کسی بڑے عہدے پر آگئے، وہ ایک دن اپنے ہم ضلع اعظم گڑھی طلبہ سے ملنے کیلئے (لیکن فی الحقیقت انکو جال میں پھانسنے کیلئے) دار العلوم آئے، ان طلبہ نے انکی اچھی خاطر مدارات کی، وہ شکار کے بہانے ان میں سے بعض کو اپنے ساتھ بھی لے گئے جو رات کو دار العلوم واپس آئے، حضرت شاہ صاحب کو کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی حضرت کو ان طلبہ کی اس دینی بے حمیتی سے سخت قلبی اذیت ہوئی، ان طلبہ کو اس کا علم ہوا تو ان میں سے ایک سعادت مند طالبعلم غالباً معافی مانگنے کیلئے حضرت کی خدمت میں پہونچ گئے، حضرت پر جلال کی کیفیت طاری تھی قریب میں چھڑی رکھی تھی اس سے انکی خوب پٹائی کی (یہ فاروقی شدت فی امر اللہ کا ظہور تھا) ہمارے وہ ہم سبق طالب علم بڑے خوش اور مسرور تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ ایک غلطی پر حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ سے پٹنے کی سعادت انکو نصیب ہوئی۔ جو حضرت کے ہزاروں شاگردوں میں سے غالباً کسی کو نصیب نہ ہوئی ہوگی کیونکہ حضرت فطری طور پر بہت ہی نرم مزاج تھے، ہم نے کبھی انکو غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا۔

آخر میں اپنا ایک ذاتی واقعہ ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ میرے اصل آبائی وطن سنبھل سے قریباً ۱۵/ میل کے فاصلہ پر ایک موضع ہے اس موضع میں چند دولتمند گھرانے تھے، والد ماجدؒ سے ان لوگوں کے تجارتی اور کاروباری تعلقات تھے جس کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ میں جب شعبان ۱۳۴۵ھ کے اواخر میں دار العلوم کی تعلیم سے فارغ ہو کر مکان پہونچا تو میرے بڑے بھائی صاحب نے بتلایا کہ اس موضع والوں کے کوئی رشتہ دار امروہہ میں

ہیں جو قادیانی ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ برابر وہاں آتے ہیں اور قادنیت کی تبلیغ کرتے ہیں اور دعوت دیتے ہیں اور لوگ متائثر ہو رہے ہیں اور سنا ہے کہ اسکا خطرہ ہے کہ بعض لوگ قادیانی ہو جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ وہاں چلنا چاہئے آپ پروگرام بنایئے!۔ (میرے یہ بھائی صاحب مرحوم عالم تو نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے دین کی بڑی فکر عطا فرمائی تھی) —— چند روز کے بعد انھوں نے بتلایا کہ معلوم ہوا ہے کہ امروہہ کا وہ قادیانی (جس کا نام عبد السمیع تھا) فلاں دن وہاں آنے والا ہے بھائی صاحب نے اس سے ایک دن پہلے پہونچنے کا پروگرام بنایا رمضان مبارک کا مہینہ تھا ہم اپنے پروگرام کے مطابق پہونچ گئے لوگوں سے ہم نے باتیں کیں تو اندازہ ہوا کہ بعض لوگ بہت متائثر ہو چکے ہیں، بس اتنی ہی کسر ہے کہ باقائدہ ابھی قادیانی نہیں ہوئے ہیں جب ہم نے قایانیت کے بارے میں ان لوگوں سے گفتگو کی تو انھوں نے کہا کہ امروہہ سے عبد السمیع صاحب آنے والے ہیں آپ انکے سامنے یہ باتیں کریں۔ ہم نے کہا کہ یہ تو بہ
بھی بات کریں گے اور انکو بھی بتلائیں گے کہ مرزا غلام احمد
گمراہی کے علاوہ کتنی بڑی حماقت ہے ——— اس گفتگو
صاحب نے (جو کچھ پڑھے لکھے اور عبد السمیع کی باتوں سے زیا
عبد الشکور صاحب لکھنوی سے مناظرہ کر چکا ہے اور امروہہ —
بحث کر چکا ہے اور سب کو لاجواب کر چکا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات سن کر میں بڑی فکر میں پڑ گیا اور دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی تجربہ کاری اور چرب زبانی سے لوگوں کو متاثر کر لے۔ میں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ میری مدد اور انجام بخیر فرمائے۔ میں اسی حال میں سو گیا خواب میں حضرت استاذ قدس سرہ کو دیکھا، آپ نے کچھ فرمایا جس سے دل میں یہ اعتماد اور یقین پیدا ہو گیا کہ بڑے سے بڑا کوئی قادیانی مناظر آجائے تب بھی میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ حق کو غالب اور اس کو مغلوب فرمائے گا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھلی تو الحمد اللہ میرے دل میں وہی یقین و اعتماد تھا —— لیکن امروہہ سے وہ قادیانی عبد السمیع نہیں آیا ——— ہم نے کہا کہ اب جب کبھی وہ آئے تو ہم کو اطلاع دیجیو ہم انشاء اللہ آئیں گے —— اسکے بعد ہم نے لوگوں کو بتلایا اور سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا یا کسی دعویٰ کرنے والے کو نبی ماننا صریح کفر وارتداد ہے اور مرزا قادیانی کے بارے میں بتلایا کہ وہ کیسا آدمی تھا ہم بفضلہٖ تعالیٰ وہاں سے اس اطمینان کے ساتھ واپس ہوئے کہ انشاء اللہ اب یہاں کے لوگ اس قادیانی کے جال میں نہیں آئیں گے۔ خواب

میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مجھے دکھایا اسکو میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت اور حضرت شاہ صاحبؒ کی کرامت سمجھا۔

محترم حضرات! حضرت شاہ صاحب کے چند واقعات تو میں نے صرف اس لئے بیان کئے کہ اس دار العلوم کے اکابر میں اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کے تحفظ کا اور قادیانی فتنہ کے خلاف جہاد کا (جو اس اجلاس کا خاص موضوع ہے) سب سے زیادہ کام انہی سے لیا ـــــ ورنہ ـــــ میں تاریخی تسلسل کی روشنی میں عرض کر رہا تھا کہ ہمارے اس سلسلہ مجددی وولی اللّٰہی اور سلسلہ قاسمی و گنگوہی کی ایک خصوصیت بتوفیق خداوندی قسم کے فتنوں اور ہر قسم کی تحریف سے دین اور امت کی حفاظت، اور اس سلسلہ میں پوری بیداری، ہوشیاری اور صلابت و صراحت رہی ہے ـــــ ہمیں اسکی فکر ہونی چاہئے کہ یہ مزاج اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ زندہ اور قائم رہے اور ہماری ان نسلوں کو منتقل ہو جو ہمارے مدارس میں تیار ہو رہی ہیں۔

میں اس موقع پر آپ حضرات سے اپنا یہ احساس عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وقت کا بہت اہم مسئلہ یہ ہے کہ امت کے عوام ہی میں نہیں بلکہ ان میں بھی جن کو خواص سمجھا جاتا ہے ایک بڑی تعداد ہے جو دین کے بنیادی عقائد و حقائق کے بارے میں بھی، تسامح، تساہل اور چشم پوشی کے رویہ کو اچھے اچھے نام دے کر اختیار کرتی جا رہی ہے خطرہ یہ ہے کہ وہ ایمانی غیرت و حمیت اور وہ دینی حِس جو اکثر بڑے بڑے فتنوں کے مقابلہ میں محافظین دین کی مددگار رہی ہے کہیں وہ اتنی مضمحل نہ ہو جائے کہ پھر اس کے بعد آپ کو دو طرفہ کام کرنا پڑے ایک طرف تو آپ کو ان فتنوں کا مقابلہ کرنا پڑے اور دوسری طرف امت کو بلکہ ان کے خواص کو اس بات پر مطمئن کرنے پر اپنی توانائی صرف کرنی پڑے کہ عقیدہ اور دین پر کسی اور شئے کو مقدم کرنا ہمارے دین کے خلاف ہے۔

اگر یہ اجلاس ختم نبوت کے خلاف ہونے والی صریح اور پوشیدہ بغاوتوں اور اسی طرح دوسرے فتنوں کے مقابلہ کیلئے اپنے اکابر و اسلاف کی روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کا نقطۂ آغاز بن جائے اور مدارس کے فضلاء کی ایسی جامع تربیت کا ایک پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کر دے جس کے ذریعہ انھیں دین کی حفاظت اور فتنوں کے مقابلہ کیلئے تیار کیا جائے تو میرے خیال میں یہ اجلاس کی افادیت کا ایک عملی ثبوت ہوگا۔

آخری کلمہ اللہ کی حمد و ثناء اور خاتم النبین حضرت محمد ﷺ پر درود و سلام ہے۔

اللھم أنصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم واجعلنا منھم واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم ۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے

"۱۹۹ اسمائے پاک"

(نگاہ اوّلیں الفرقان رجب ۱۳۹۳ھ)

بزرگانِ دین اور خاصکر ان میں سے جو اکابر واعاظم ہیں مثلاً
چشتی اجمیریؒ اور حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیریؒ ان کے مز
میلے لگتے ہیں ان میں غلیظ سے غلیظ اور خبیث سے خبیث قسم کا جو
چھپی چیز نہیں ہے شہروں شہروں سے پیشہ ور طوائفیں پہونچتی
ہے جو فسق وفجور کے مخصوص بدنام بازاروں میں ہوتا ہے۔

ع "آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں"

لیکن جو کھلا شرک ان درگاہوں میں ہوتا ہے اور دین کی حقیقت سے جاہل لوگ ان بزرگانِ دین سے جس طرح حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور جس طرح نذریں مانتے اور چڑھاتے ہیں، جس شخص کو قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وہدایت کا کچھ بھی علم ہو وہ اس سے یقیناً واقف ہوگا کہ اللہ جل جلالہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کے نزدیک یہ شرک ہر قسم کے خبیث سے خبیث فسق وفجور سے بڑی مجرمانہ معصیت ہے۔ قرآن مجید میں اعلان فرمادیا گیا ہے۔

ان الله لا يغفر ان يشرك به و يغفر ما دون ذالك لمن يشاء	اللہ تعالیٰ مشرک کو ہرگز نہ بخشے گا اور اس کے سوا دوسرے گناہ جس بندہ کے چاہے گا بخش دے گا۔

گزشتہ مہینے رجب میں اس عاجز کا گجرات میں سورت، راندیر وغیرہ جانا ہوا تھا، وہاں ایک صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے عرس کا ایک اشتہار دکھایا جو ان کے پاس ڈاک سے پہونچا تھا۔ اس پر شائع کرنے والے کا نام پتہ چھپا ہوا ہے

"پیرزادہ مولوی سید عبدالرحمٰن گدی نشین خادم خواجہ صاحب درگاہ شریف اجمیر"

اس اشتہار میں ایک صفحہ پر عرس کا دعوت نامہ اور نذر و نیاز کے لئے رقم جمع کر کے بھیجنے کی اپیل ہے۔ (اور اس کے لئے منی آرڈر کا ایک فارم بھی منسلک ہے جس پر مندرجہ بالا پتہ انگریزی میں چھپا ہوا ہے۔) اور دوسرے صفحہ پر حضرت خواجہ کے ۱۹۹ "اسمائے پاک" کا وظیفہ لکھا گیا ہے۔ اس وظیفہ کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اشتہار ہی کے الفاظ میں پڑھ لیجئے

> "حضرت خواجہ خواجگاں خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند قدس سرہ کے ۱۹۹ اسمائے پاک کا وظیفہ جو تمام مشکلات کے حل کے لئے نہایت کامیاب اور آزمودہ ہے، جو عقیدت منداس وظیفہ کو خلوص دل سے پڑھیں گے وہ حضرت خواجہ کی زیارت بابرکت سے شرف اندوز ہوں گے اور دینی و دنیاوی مقاصد میں کامیاب ہوں گے، مگر اس وظیفہ کو شروع کرنے سے پہلے حضرت خواجہ کی روح پر فتوح کی خوشنودی اور دعا کی مقبولیت کے لئے حسب توفیق ہدیہ توشہ پیش کیا جائے، وہ ہدیہ توشہ بذریعہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر یا بذریعہ رجسٹری دعاگو کے پتہ پر ارسال فرما کر سعادت مندی سے بہرہ اندوز ہوں۔ دعاگو کی اجازت کے بغیر یہ وظیفہ ہرگز نہ پڑھیں "

اس کے آگے خواجہ صاحب کے وہ "۱۹۹ اسمائے پاک" بھی لکھے ہیں، افسوس ہے کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہ سب یہاں درج نہیں کئے جا سکتے۔ ان میں سے بعض معنوی لحاظ سے نہایت مہمل اور بے تکے ہیں۔ مثلاً عنقاء اللہ معین الدین، علماء اللہ معین الدین، خلفاء اللہ معین الدین، شرفاء اللہ معین الدین، مقتداء اللہ معین الدین۔ ان میں یہ اسماء بھی ہیں۔ اوّل معین الدین، آخر معین الدین، ظاہر معین الدین، باطن معین الدین، غفار معین الدین، ستار معین الدین۔ اس طرح کے ناموں سے ۱۹۹ کی گنتی پوری کی گئی ہے اور ایک لمبا وظیفہ بنایا گیا ہے۔

حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی تعداد ۹۹ بتلائی گئی ہے اور وہ بطور وظیفہ کے بھی پڑھے جاتے ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کے ناموں کا وظیفہ پڑھنے والوں نے ان کے لئے

۹۹ نام بھی کافی نہیں سمجھے بلکہ پورے ۱۹۹ نام بتائے اس مشرکانہ ذہنیت کی مثال اگلی امتوں میں شاید ہی مل سکے۔

اور یہ سب کچھ توحید کے اس داعی اور منادی کے ساتھ اور اس کے نام پر ہو رہا ہے جس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے بتکدۂ ہند میں توحید کی اذان دی او ہزاروں لاکھوں ایسے بندوں کو جو شرک میں گرفتار تھے اور اپنی حاجتیں اور مرادیں غیر اللہ سے مانگتے اور ان کے ناموں کا وظیفہ جپتے تھے سب طرف سے ہٹا کر اس خدائے واحد سے وابستہ کر دیا اور اس کے نام کا وظیفہ خواں بنا دیا جس کے وہ خود پرستار اور نام لیوا تھے۔

اللہ نے جن کو عقل و دانش اور نور ہدایت کا کوئی ذرہ دیا ہو وہ سوچیں کہ حضرت خواجہ قدس سرہ کی روح پاک کے ساتھ اس سے زیادہ تکلیف دہ کوئی مذاق ہو سکتا ہے؟۔ اور یہ سب کا ہے کے لئے، بس منی آرڈر اور پوسٹل آرڈر وصول کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے۔

" ان کثیراً من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس ۔

☆☆☆

حافظے کے نقوش

[یہ ایک ایسی یادداشت ،ایک خاص تقریب سے جنوری ۱۹۷۹ء کے الفرقان (نگاہ اولیں) میں قلمبند ہوگئی ہے جو آں مرحوم کی اس قوت حافظہ پر روشنی ڈالتی ہے، جس کا ذکر ان کے قلم پر بطور تحدیث نعمت آتا رہا ہے۔]

اپنی طالب علمی کے زمانہ میں بلکہ اس کے بعد بھی
خرید و فروخت سے خود راقم سطور کا کوئی واسطہ نہیں تھا، تا
نرخ یاد ہیں۔

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے دور میں تھا۔

جنگ سے پہلے ہمارے وطن میں ایک روپے میں ۱۷۔۱۸ سیر مل جاتا تھا، [illegible] نرخ ۴۔ سیر تک پہونچ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس گرانی کا ذکر غریب لوگ اس طرح کرتے تھے جیسے قیامت آگئی۔

پھر جنگ ختم ہو جانے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بہت تیزی سے چیزوں کے نرخ گرنا شروع ہوئے اور بعض چیزیں قبل از جنگ سے بھی زیادہ ارزاں ہوگئیں۔ گیہوں بیس سیر تک فروخت ہونے لگا، اسی طرح دوسرے اناج بہت ارزاں ہوگئے تھے، میرے والد ماجدؒ نے اسی زمانہ میں اپنے گھرانے کی بعض شادیوں کیلئے سونا خریدا جو غالباً ۲۳۔ روپے تولہ کے حساب سے خریدا گیا تھا۔

۲۱ء ۲۲ء ۲۳ء میں اس عاجز کا قیام اپنے خاص استاذ اور مربی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلیؒ کے ساتھ (جن سے قرابت بھی تھی) ایک طالب علم کی حیثیت سے مئو ضلع اعظم گڑھ رہا (حضرت مولانا مرحوم وہاں کے دینی عربی مدرسہ دارالعلوم میں صدر مدرس تھے) مئو میں اس زمانہ میں بھی ——— جبکہ ملک میں عام طور سے گائے کا ذبیحہ ہوتا تھا، نہ معلوم کیوں بھینس ہی کا گوشت کھایا جاتا تھا، جو اس وقت گھٹیا قسم کا وہاں دو پیسے سیر، اس سے اچھا

تین پیسے سیر اور بہت اچھا چار پیسے سیر ملتا تھا (جو آجکل لکھنؤ میں ۴۔۵ روپے سیر ہے) وطن میں ہمارے یہاں گائے کا گوشت کھایا جاتا تھا اور وہ اچھے قسم کا دو ڈھائی آنے سیر ملتا تھا۔

استاذی حضرت مولانا کریم بخشؒ مئو کا بڑا گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے، انکے لئے خاص اہتمام سے بکری کا گوشت پکتا تھا، میرا کھانا پینا بھی حضرت مولانا کے ساتھ ہی تھا، جو کچھ صرف ہوتا اس کا نصف میں ادا کرتا تھا جہانتک یاد ہے قریباً چھ روپے مہینے کا حساب ہوتا تھا۔

مئو کی طالب علمی کے اس زمانہ ہی میں ایک دفعہ مئو سے اپنے وطن سنبھل جاتے ہوئے ایک ساتھی طالب علم کے ساتھ (بلکہ انہی کی ترغیب پر) جو پہلے لکھنؤ میں طالب علمی ہی کے سلسلہ میں رہ چکے تھے، صرف سیر و تفریح کیلئے دو تین دن لکھنؤ میں قیام کیا، خوب یاد ہے کہ اچھا خاصا کھانا چوک بازار میں صرف چار پانچ پیسے میں کھاتے تھے جس میں گرم گرم دو تنوری روٹیاں ہوتی تھیں اور ایک پیالہ میں اچھی لذیذ نہاری، اگر کھانے میں کباب وغیرہ کسی چیز کا اضافہ کرنا چاہا تو بس ایک پیسہ مزید۔

۴۵/۱۳۴۴ھ (۲۷/۱۹۲۶ء) میں یہ عاجز بسلسلہ طالب علمی دار العلوم دیوبند میں رہا۔ میں ان چند طلبہ میں سے تھا جو قیمت ادا کر کے دار العلوم کے مطبخ سے کھانا کھاتے تھے، ایسے طلبہ سے مہینے میں حساب کر کے کھانے کی اصل لاگت لے لی جاتی تھی، مولانا گل محمد خاں صاحب مرحوم مطبخ کے ذمہ دار اور منتظم تھے، بڑے حسابی آدمی تھے، میرا قیام وہاں دو سال رہا، کھانے کی قیمت قریباً ساڑھے تین روپے، کسی مہینے کچھ کم کسی مہینے کچھ پیسے زیادہ مجھ سے وصول کئے جاتے تھے، جہانتک یاد ہے ایک دفعہ بھی پورے چار روپے دینے کی نوبت نہیں آئی حالانکہ معلوم ہوا تھا کہ سوختہ لکڑی اور باورچیوں کی تنخواہ کا بھی حساب لگایا جاتا تھا۔

۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) سے الفرقان بریلی سے جاری ہوا۔ اور اسکی وجہ سے اہل و عیال کے ساتھ وہیں قیام ہوا، بس یہیں سے خانگی ضروریات خود خریدنے یا خریدوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت مولانا کریم بخش صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا عبد الحق صاحب مرحوم بریلی کے مدرسہ مصباح العلوم کے مہتمم اور صدر مدرس تھے وہ بازار کا سودا خریدنے میں بڑے ماہر تھے، ان سے قرابت داری بھی تھی میری خانگی ضروریات زیادہ تر وہی خریدتے تھے وہ ہر مہینے آٹے کی ایک پوری بوری خرید لیتے تھے جس میں دو من کے قریب آٹا ہوتا تھا۔ اس میں سے دو تہائی اپنے ہاں رکھ لیتے تھے اور ایک تہائی میرے ہاں بھیج دیتے تھے جو ایک مہینے کیلئے کافی ہوتا تھا اس بوری کی قیمت لگ بھگ چھ روپئے ہوتی تھی، کبھی کچھ پیسے کم کبھی کچھ پیسے زیادہ گویا صرف دو

روپے کا آٹا پورے مہینے کیلئے کافی ہوتا تھا ــــــ گائے کا گوشت بہت عمدہ قسم کا تین چار آنے کا بکری کا چھ آنے اور بہت اعلیٰ قسم کا خصّی کا آٹھ آنے (اور بریلی میں سیر اس زمانہ میں سو تولہ والا مروج تھا) ــــــ مچھلی اچھی قسم کی چارپانچ آنے سیر ملتی قربانی کے لیے گائے ۲۵۔ ۳۰۔ روپئے کی اچھی مل جاتی تھی اور بکری ۵۔ ۲۔ روپئے کی۔ ایک دفعہ دودھ دینے والی ایک اچھی بکری غالبًا سات روپے میں خریدی تھی جو کئی سال رہی پھر مع ایک بچہ کے آٹھ روپئے میں فروخت ہوئی ــــ مرغی ایک روپئے میں اچھی مل جاتی تھی انڈا پہلے ایک پیسے میں ایک ملتا تھا بعد میں دو پیسے میں ملنے لگا عمدہ قسم کا گڑ ایک روپئے میں دس بارہ سیر تک مل جاتا تھا ــــ چاول بہت اعلیٰ قسم کا ہسراج (جو باسمتی سے بڑھیا مانا جاتا ہے) ایک روپئے کا ساڑھے پانچ سیر ہلدوانی سے خریدنا یاد ہے۔

الفرقان اگرچہ بریلی سے نکلتا تھا، لیکن اس زمانہ میں بر[illegible]
شروع میں تین سال تک وہ دہلی میں چھپتا رہا، کتابت بریلی ہی [illegible]
لیکر ہر مہینے خود دہلی جاتا اور چھپوا کے لاتا تھا، اس سلسلہ سے ۲۔ [illegible]
تھا کھانا اکثر کسی ہوٹل میں ہوتا، بہت اچھے کھانے (روٹی قورمہ
زیادہ دینا یاد نہیں، شام کو اکثر ایسا ہوتا کہ مغرب کی نماز کیلئے جامع مسجد جانا، وہاں [illegible] دروازہ پہ کھانے پینے کی طرح طرح کی چیزیں بیچنے والے پچاسوں آدمی چھوٹی چھوٹی دکانیں لگائے بیٹھے ہوتے، مختلف قسم کی پھلکیاں، دہی بڑے، حلیم پشاوری کباب، مچھلی کے کباب، یہ سب چیزیں بڑی لذیذ ہوتی تھیں، ان میں سے ہر چیز دو پیسے کی لی جاتی تھی۔ ایک صاحب روہو مچھلی کے سر مسالے میں تلے ہوئے بیچتے تھے۔ چھوٹا سر دو پیسے میں اور اس سے بڑا چار پیسے میں دیتے تھے، ایک عدد وہ بھی لیکر کھانے کا معمول تھا۔ بس یہی شام کا کھانا ہو جاتا تھا ــــ کبھی ناشتہ میں حلوہ پراٹھا بھی لے لیا جاتا جو ایک ڈیڑھ آنے میں آدھ پاؤ ملتا تھا۔

۱۹۳۴ء میں جب بریلی میں مع اہل وعیال کے قیام ہوا تو غالبًا پہلے ہی دن ایک معمولی قسم کا نیا پلنگ (بغیر بنا) بازار سے ایک روپیہ دو آنے میں خریدا تھا، جو ۲۵-۳۰ سال تک رہا۔ اسی کے ساتھ نماز پڑھنے کی ایک نئی چوکی صرف چودہ آنے میں خریدی تھی جو کسی نہ کسی شکل میں اب تک موجود ہے۔ پلنگ کیلئے بہت اعلیٰ قسم کے پائے دو روپئے میں خریدے تھے جو آج بھی بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ (اور اس وقت انکی قیمت پچاس سے کم نہ ہو گی) چولہے میں جلانے

والی بہت اچھی بالکل سوکھی لکڑی بریلی میں پہلی دفعہ ایک روپیہ میں تین من خریدنا اچھی طرح یاد ہے (اور ملحوظ رہے کہ اس وقت بریلی کا سیر سوا سیر کا اور من سوا من کا ہوتا تھا)

یورپ کی دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی اس وقت تک ان میں سے اکثر چیزوں کے نرخ قریب قریب یہی رہے ——— چونکہ پہلی جنگ عظیم کا یہ تجربہ تھا کہ بعض چیزیں بہت زیادہ گراں ہوگئی تھیں ان میں سے کپڑا بھی تھا اس لئے راقم سطور نے چاہا کہ اپنی ضرورت کا کپڑا اپنی استطاعت کے مطابق کچھ زیادہ خرید کر رکھ لیا جائے تو لٹھا ململ جیسے خاص کپڑوں کے ایک ایک دو دو تھان بازار جاکر خرید لئے، اچھے قسم کے لٹھے کا تھان غالباً چار آنے گز کے حساب سے خریدا تھا، دوسرے کپڑے بھی قریب قریب ایسے ہی نرخوں سے۔

بریلی میں ہمارے پڑوس میں ایک نیک صالح شخصیت عبدالماجد صاحب کی تھی، یہ بریلی کی عدالت سشن میں منصرم تھے، مثالی دیندار تھے، راقم سطور سے بہت محبت فرماتے تھے، ڈالڈا ایجاد ہو چکا تھا، لیکن کھانے پکانے میں ہمارے گھرانوں میں اس کے استعمال کا رواج بالکل نہیں تھا، ہمارے منصرم صاحب کو کسی دکاندار نے خوشامد اور اصرار کر کے ایک پورا کنستر دیدیا، وہ لے آئے، انھوں نے چاہا کہ آس پڑوس کے گھروں کو بھی شریک کرلیں، مجھ سے بھی فرمایا کہ ایک روپئے کا اس میں سے آپ بھی لے لیجئے! میں نے صرف انکی فرمائش کی تعمیل اور انکا بوجھ ہلکا کرنے کی نیت سے کہہ دیا کہ اچھا بھیج دیئے، انھوں نے ایک سیر گیارہ چھٹانک (بریلی کے سیر سے) بھیج دیا (جو آج کے دو کلو سے کچھ ہی کم تھا) یہ صرف ایک روپئے کا تھا آخر میں بس ایک بات اور پڑھ لی جائے دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا جس محلّہ (گھیر مولوی عبدالقیوم صاحب مرحوم) میں میری رہائش تھی اس کی پرانی مسجد کی از سر نو تعمیر کا فیصلہ ہوا، جس دن معماروں اور مزدوروں نے اسکی چھت کا سلیپ ڈالا، جس میں انکے ساتھ اور لوگ بھی فی اللہ لگے ہوئے تھے، میں نے ان سب کیلئے ایک روپیہ کی جلیبیاں منگوائیں، خوب یاد ہے کہ سوا تین سیر یا پونے تین سیر آئی تھیں (یعنی سوا تین کلو یا قریباً چار کلو)۔

☆☆☆

ایک ایشیائی اسلامی کانفرنس کا تجربہ

[۱۹۷۸ء میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے ایک ایشیائی اسلامی کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں شرکت سے واپسی پر جو مشاہدات و تاثرات الفرقان اگست ۷۸ء کے شمارے میں لکھے گئے ان کا ایک اقتباس۔]

جہاں تک شان و شوکت اور ایشیا کے مختلف ممالک کی نمایندگی کا تعلق ہے بلاشبہ یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ لیکن یہ بات مستقبل بتائے گا کہ اسلام
الشان کانفرنس نے کیادیا، ——— اس طرح کی کانفر
کے لحاظ سے راقم سطور کا پچاس سال سے زیادہ کا تجربہ بہت
پہلے سے مختلف خوش کن اور مسرّت بخش ہو۔

کانفرنس میں دو چیزیں شدت سے محسوس ہوئیں، ان
خیانت ہو گی۔

ایک انتہائی اسراف، جس کی کم از کم راقم سطور کوئی وجہ جواز نہیں سمجھ سکا، جس ہوٹل میں تمام مدعوین کا قیام تھا ——— جن کی تعداد دو سو کے قریب تھی ——— انہی میں سے بعض واقف حضرات نے بتلایا کہ اس ہوٹل میں ہم میں سے ہر ایک کے قیام وطعام کے مصارف کا اوسط ایک ہزار روپیہ یومیہ کے قریب ہے۔ انہی صاحب نے بتلایا کہ ایک پیالی چائے جو ہم پیتے ہیں یا کسی مہمان کیلئے منگواتے ہیں اس کی قیمت سات روپے ہوتی ہے ——— بعد میں پاکستان ہی کے ایک صاحب نے یہ بھی بتلایا کہ اس ہوٹل کے مالک پاکستانی مسلمان نہیں ہیں بلکہ یہ امریکہ کی کسی کمپنی کا ہے ——— اگر یہ بات صحیح ہے تو اور بھی زیادہ رنج و افسوس کی بات ہے۔ آجکل پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ ——— معاشرہ کی اصلاح اور مسلمانوں میں اسلامی زندگی عام کرنے کا مسئلہ سب مخلص اور دین پسند اہل فکر کے سامنے ہے اور اسکو دوسرے سب مسئلوں سے زیادہ اہمیت دی جارہی ہے اور بیشک یہ اسکا مستحق ہے، لیکن سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہمارا یہ طرز عمل اور امریکہ وغیرہ کی تقلید میں ہماری یہ مسرفانہ زندگی ہماری ان نیک اور

مبارک آرزوؤں سے کچھ مطابقت رکھتی ہے، کیا اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایات، آپ کے اسوۂ حسنہ اور امت کی تاریخ میں ہمارے لئے کوئی رہنمائی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بصارت اور بصیرت عطا فرمائے۔

دوسری چیز جو شدت سے محسوس ہوئی وہ بعض مقررین کا وہ جوش خطابت تھا جس سے محسوس ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حقیقت پسندی کا کوئی حصہ عطا نہیں فرمایا ہے اور وہ صرف خیالی دنیا میں رہتے ہیں اور شاید اپنے کو اور اپنے دور کے مسلمانوں کو وہ قرون اولیٰ کے فاتح مجاہدین سمجھتے ہیں اور دنیا کی بساط پر اس وقت مسلمانوں کی جو واقعی حالت ہے اس کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے (حالانکہ صرف اسرائیل کا وجود اور اس کی تاریخ ہی ہم کو سب کچھ بتلانے اور سبق دینے کے لئے کافی ہے) ـــــ الغرض ان پر جوش مقررین کی ہنگامہ خیز تقریریں سن کر شدت سے یہ احساس ہوا کہ یہ تقریریں عام مسلمانوں کو حقیقت پسندی اور فکر مندی کے ساتھ عملی آدمی بننے کے راستہ میں ہمیشہ رکاوٹ بنتی رہیں گی ـــــ کانفرنس کے آخری دن کے اجلاس میں ایک مرحلہ پر رفیق محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بڑی دلسوزی کے ساتھ تقریر فرمائی جس میں ان مقررین کو اس طرف توجہ بھی دلائی اور بتلایا کہ اس رویہ سے ہم نے کھویا بہت اور پایا کچھ نہیں ہے ـــــ لیکن بعد کی تقریروں سے اندازہ ہوا کہ مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ ''صدا بصحرا'' کے سوا کچھ نہ تھا۔ فالی اللہ المشتکیٰ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب وہ خلیفہ منتخب کئے گئے اور انھوں نے پہلا خطبہ دیا جو بہت مختصر تھا تو اس کے آخر میں یہ بھی فرمایا کہ

انتم الیوم الیٰ امام	آج تمہیں زیادہ بولنے والے امام ور ہنما سے
فعّال احوج منکم	زیادہ ضرورت فعال (بہت کرنے والے)
الی امام قوّال ۔	امام ورہنما کی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ بات ہمارے اس زمانہ سے جیسی مطابقت رکھتی ہے شاید ایسی مطابقت کسی دور میں نہ رہی ہوگی ـــــ واقعہ یہ ہے کہ '' قوّالیت ''اور قوّالیت پسندی ''اس وقت ہم مسلمانوں کی بیماریوں میں بڑی قابل فکر بیماری ہے۔

خطابِ عید

[تقریباً چالیس سال سے معمول تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں عیدین کی نماز کے بعد تقریر فرماتے۔ اور پھر دعا ہوتی۔ اس تقریر اور دعا کی نوعیت نے لکھنؤ کے تقریباً تمام فہمیدہ طبقے کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ یہ اس مبارک سلسلہ کی آخری تقریر اور دعا ہے جو عید الفطر ۱۴۱۰ھ ۱۹۹۰ء کے موقع پر کی گئی]

حمد و صلوٰۃ کے بعد!

میرے عزیزو، میرے دوستو! اور میرے بھائیو! آ... موجودہ حال معلوم ہوگا، اور جن کو نہیں معلوم ہوگا وہ دیکھ کر سمجھ جائیں گے، میرے لئے ... و حرکت بھی مشکل ہو گئی ہے۔ آنکھ اور کان کی اور جسم و دماغ کی قوتیں رخصت ہو رہی ہیں، مجھے خود بھی امید نہ تھی کہ میں آپ کے ساتھ نماز عید میں شریک ہو سکوں گا۔ حسرت کے ساتھ دعائیں کر رہا تھا کہ اس مبارک موقع پر حاضری اور شرکت کا ایک موقع اور مل جائے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کے پروانے تقسیم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مجمع اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور ان میں شریک ہونا بہت برکتوں اور سعادتوں کا سبب ہوتا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے حاضری کی توفیق عطا فرمادی میرا برسوں کا معمول اس موقع پر آپ حضرات سے کچھ باتیں کرنے کا ہے مجھے اسکی تو بالکل ہی امید نہ تھی کہ اس بار میں کچھ کہہ بھی سکوں گا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ، صحیح لفظ بھی میری زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے ہیں، لیکن حضور ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی سیدنا ابوذر غفاریؓ کی ایک بات یاد آگئی، بس اس بات کی برکت سے ارادہ کر لیا کہ جو کچھ بھی بن پڑے گا کہوں گا۔ کوئی سمجھے گا یا نہیں، میرا اللہ تو دیکھے گا، اور کیا عجب کہ یہی عمل میری مغفرت کا سبب بن جائے۔

دوستو! جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں، اور کوئی لمبی چوڑی بھی نہیں، لیکن

اس سے پہلے سیدنا ابوذر غفاریؓ وہ ارشاد آپ کو بھی سنادوں جسکا میں نے ابھی حوالہ دیا۔ آپ میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہونگے جن کے دل میں اس ارشاد کو سننے کا شوق پیدا ہو گیا ہو گا۔ تو سنئے انھوں نے ایک دفعہ فرمایا تھا۔

لو وضعتم الصمصامه على هذه ـ وأشار إلىٰ قفاه ـ وابى ظننت أنى مُسمعكم كلمةً سمعتها من رسول الله ﷺ لأ سمعتكموها قبل أن تجيزوا عليّ۔

انھوں نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اگر تم میری گردن پر تلوار رکھ دو مگر مجھے امید ہو کہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی ایک بات ابھی سنا سکتا ہوں تو اس پہلے کہ تم میرا کام تمام کر دو وہ بات میں تمہیں ضرور سناؤں گا۔

اور یہ سیدنا ابوذرؓ تھے کون؟ کس مرتبہ کے تھے؟ اسکا اندازہ ان کے بارے میں خود رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے کیا جاسکتا ہے

ما أقلت الغبراء ولا أظلت الخضراء على أصدق ذى لهجةٍ من أبى ذرا أو كما قال صلى الله عليه وسلم۔

(یعنی یہ کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر بسنے والوں میں ابوذرؓ سے زیادہ سچی اور کھری بات کہنے والا کوئی نہیں) تو ان ابوذ نے روہ بات فرمائی تھی، بس اس بات کو یاد کر کے میں نے نیت کر لی کہ کچھ بھی ہو میں کچھ نہ کچھ ضرور کہوں گا۔

میرے بھائیو! مسلمان کہلانے والی قوم پر نگاہ ڈالو تو موٹے حساب سے تین قسم کے لوگ ملیں گے۔

۱۔ بہت بڑی تعداد میں تو وہ لوگ ہیں جو صرف نام کے مسلمان ہیں۔ ان کے مسلمان ہونے میں ان کا اپنا کچھ حصہ نہیں، مسلمان گھر میں پیدا ہو گئے، اس لئے مسلمان ہیں۔ عملی طور پر ایک دن کیلئے بھی انھوں نے اسلام کو نہیں اپنایا۔ ایسے لوگوں کے مسلمان ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ انھیں مسلمان ہونے سے صراحۃً انکار نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ وہ اسلام کو ایک برادری یا ایک قومی نسبت سمجھتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت آپ جیسوں کو نہیں ہو گی کہ یہ طبقہ بڑے خطرے میں ہے اور ہم سب کو اس کے بارے میں فکر مند ہونا چاہئے۔

۲۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اتنا بے تعلق تو نہیں ہے، لیکن اس نے بھی تو اسلام کو سیکھنے کی،

اپنی زندگی کو، اپنی کمائیوں کو، اپنے اخلاق اور معاملات کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ بس وہ جس حال پر ہے قانع ہے، اگر وہ جمعہ جمعہ کی نماز پڑھتا ہے تو اسی پر قانع ہے، اگر وہ صرف رمضان میں نمازوں کا اہتمام کرتا ہے تو بس اسی پر قانع ہے اگر اسکے اخلاق میں یا معاملات میں کوئی خرابی ہے، یا اسکے دل میں حسد کی، کینہ کی، یا بغض یا عداوت کی، یا لالچ کی، یا کبر وریا کی بیماریاں ہیں، تو برسوں سے وہ اسی حال میں چل رہا ہے لیکن کبھی اس نے سنجیدہ فکر نہ کی کہ مجھے ان خرابیوں کو دور کرنا چاہئے ان بیماریوں سے نجات ملنی چاہئے اور مجھے دین کے اعتبار سے ترقی کرنا چاہئے مسلمان کہلانے والی قوم کے مردوں اور عورتوں کی خاصی تعداد اسی قسم کی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی اچھا اثر دنیا کی دوسری قوموں پر ہمارا نہیں پڑ رہا۔ اور دن رات کا ساتھ ہونے کے باوجود دنیا میں بسنے والے عام انسانوں کے دل میں ہمیں دیکھ کر کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے، وہ کچھ سوچنے پر مجبور نہیں ہوتے۔

مسلمان کہلانے والی قوم کی جو غالب اکثریت ہے وہ درا

مل کر بنتی ہے۔ اور اجتماعی طور پر جو حالات ہم پر آ رہے ہیں وہ اسی د

۳۔ ایک تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنھوں نے سچے دل

اطاعت کا عہد کیا ہے۔ انھوں نے اپنے بارے میں طے کیا ہے کہ اللہ

ہے۔ اور ظاہر و باطن پر ہر طرف سے ہونیوالے نفس و شیطان اور ماحول کے حملوں سے چوکنا رہنا ہے۔

یہ قسم جو بہت تھوڑی تعداد میں ہے۔ اکا دکا اور خال خال افراد کی شکل میں ہے یہ بھی معصوم اور بے گناہ نہیں ہے۔ غلطیاں چھوٹی بڑی اس سے بھی ہوتی ہیں، لیکن ان لوگوں کو اس کا احساس ہو جاتا ہے، توجہ ہو جاتی ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگتے ہیں استغفار کرتے ہیں، توبہ کرتے ہیں، اور اپنا معاملہ ٹھیک کر لیتے ہیں اور پھر سے طاعت اور بندگی میں لگ جاتے ہیں یہ اللہ کے ولی ہیں، ان کو اپنے اپنے تعلق کی بقدر دین کا مزا آتا ہے، اطاعت کا ذائقہ آتا ہے، ان کے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے تکلیفیں ان کو بھی ہوتی ہیں، بیماریاں انھیں بھی گھیرتی ہیں لیکن وہ نہ تو مایوس رہتے ہیں، اور نہ غمگین، "لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون" کا لطف انھیں اس دنیا میں بھی جو خوف اور حزن ہی کا گہوارہ ہے آنے لگتا ہے، یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ نہیں ہیں جو ہواؤں میں اڑتے ہیں، اور پھونک ماردیں تو یہ ہو جائے وہ ہو جائے، انکی پہچان اللہ نے یہ نہیں بتائی ہے۔ اللہ نے اپنے ان دوستوں کی اور ان اپنوں کی پہچان بتائی ہے۔ الذین آمنوا

و کانوا یتقون ۔ ایک تو ان لوگوں نے ایمان کی دولت حاصل کر لی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور اسکی بندگی کا احساس مسلسل انھیں رہتا ہے۔ غفلت اور بھول انکا مستقل حال نہیں ہے۔ بلکہ انکا مستقل حال تو یاد اور احتیاط ہی ہے کبھی کبھی بھول جانا الگ بات ہے، مسئلہ اصل مستقل حال کا ہے سو وہ ان لوگوں کا درست ہو جاتا ہے۔

دوستو ابس دو باتیں ہیں اللہ کا ولی بننے کیلئے، ایک ایمان دوسری تقویٰ، ایمان کا مطلب یہ کہ دل میں یہ یقین اتر جائے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ بالکل برحق ہے، اور اسی میں کامیابی ہے، اور تقویٰ یہ کہ اس یقین کے مطابق زندگی میں احتیاط اور پابندی کی عادت پڑ جائے، بے لگام زندگی سے پیچھا چھوٹ جائے عام طور پر لوگوں نے اللہ کا ولی ہونے کے جو مطلب سمجھ رکھے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں بزرگان دین اولیاء اللہ تھے اور بس اکیا حضور اکرم ﷺ صرف اس لئے آئے تھے کہ آپ کی پوری امت میں ۴-۶ -اولیاء اللہ پیدا ہو جائیں، نہیں یہ خیال تو آپ کے فیض کی بڑی توہین ہوگی، آپ تو اس دولت کو عمومی طور پر تقسیم کرنے آئے تھے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شروع کے دور میں عام مسلمانوں کو یہ دولت ملی تھی، اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیا کے انسانوں کے دل اس پوری قوم کی طرف، اور اس کے طریقۂ زندگی کی طرف اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ کھنچنے لگے تھے جتنے آج ان اکاڈکا اللہ والوں کی طرف کھنچتے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔

لہٰذا میرے بھائیوں! آج ایک بات کا فیصلہ کرو، پہلی اور دوسری قسم سے نکل کر تیسری قسم میں آنا ہے، واقعی اب تک کی جو غفلت ہوئی اس کی تو معافی مانگو، اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والے ہیں، لیکن آگے کیلئے نئے سرے سے اللہ کی طرف سفر شروع کرو سورۂ زمر کی یہ آیت ہم سے یہی کہتی ہے

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللہِ، اِنَّ اللہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا، اِنَّہٗ ھُوَالْغَفُوْرُالرَّحِیْمُ ہ
وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَہٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۔

اے محمد! آپ (میری طرف سے میرے بندوں سے) کہئے اے میرے وہ بندوں جنھوں نے (اب تک) اپنے ساتھ بہت (غفلت برتی اور) زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخش دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا اور بہت مہربان ہے، اور رجوع ہو جاؤ اپنے رب کی طرف اور اسکی فرمانبرداری اختیار کر لو قبل اسکے کہ تم پر عذاب آجائے اور پھر کسی طرف سے تم کو کوئی مدد نہ مل سکے۔

ایک بات اور سن لو! ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں جانے کیلئے بھی انسان کو حرکت کرنی پڑتی ہے نیچے سے اوپر کی طرف جانے میں انسان کو زیادہ مشقت کرنی پڑتی ہے پہلے اور دوسرے طبقہ سے نکل کر تیسرے طبقہ میں داخل ہونے کیلئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑیگا، راستہ میں مزاحم ہونے والے نفس و شیطان کو شکست دینے کیلئے مضبوط ارادہ اور مسلسل کوشش کی ضرورت یہاں بھی ہوگی۔ یہ جو لفظ اس آیت میں آیا ہے "وانیبوا الی ربکم"۔ بس یہی ہے پہلی سیڑھی، ترقی کا پہلا زینہ، اور وہ دروازہ جس میں سے نکل کر ایمان اور تقویٰ والوں میں شامل ہوا جاتا ہے یہ انابت علماء سے پوچھو ہاتھ پیر کا عمل نہیں دل کا فعل ہے یعنی دل سے ارادہ کرو کہ اپنے اللہ کو راضی کرنا ہے صحیح مسلمان بننا ہے ایمان اور تقویٰ حاصل کرنا ہے جتنا سچا پکا فیصلہ دل کا ہوگا اتنی ہی طلب دل میں ہوگی اور جسے طلب ہوتی ہے وہ ڈھونڈھ ہی لیا کرتا ہے جسکے دل میں طلب ہوتی ہے وہ اپنے لئے مناسب راستہ ڈھونڈھ لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسکی رہبری فر
اسی چیز کی تلاش کیلئے جاتا ہے وہ اسی طلب میں اہل دل کی صحبتیں
علمائے ربانیین کی کتابیں پڑھتا ہے غرض کہ جہاں سے اسے اس
وہاں طالب اور سائل بن کر جاتا ہے پھر جہاں سے اسے اپنی مایا ملتی
بس اللہ کے بندو! اس بوڑھے معذور اور قریب المرگ کی یہ
اپنے موجودہ حال پر قانع نہ رہو، آگے بڑھنے کا ارادہ کرو، فیصلہ کرو، اللہ سے لو لگاؤ اس سے قرب بڑھاؤ، اور نئے سرے سے، نئے حوصلہ سے اسکی طرف سفر شروع کردو، جہاں معلوم ہو کہ یہاں کچھ لوگ اسی مقصد سے جمع ہوتے ہیں پہنچ جاؤ، بات کو سنو! جو راستہ بتایا جائے اس پر چل کر دیکھو، جن لوگوں کو اپنے گردو پیش میں دین کے اعتبار سے اپنے سے بہتر پاؤ ان سے پوچھو مشورے کرو، غرض کہ دل میں ایسی فکر و طلب پیدا کرو کہ اللہ تعالیٰ کو ترس آجائے، اور طلب پر اعتبار آجائے کیونکہ وہ اپنے قرب کی دولت قدر دانوں ہی کو دیتے ہیں۔ آؤ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کھائے اور ہمیں اپنے قرب کی طلب اور قرب کی دولت دونوں عطا فرمادے۔

"الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون ، الذین آمنوا وکانوا یتقون ، سبحانك اللهم وبحمدك نشهد ان لا اله الا انت نستغفرك ونتوب الیك ،اللهم صل علی سیدنا محمد وعلی آل سیدنا محمد کما صلیت علی سیدنا ابراهیم وعلی آل سیدنا ابراهیم انك حمید مجید ،ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخاسرین ،اللهم اجعلنا من عبادك المسلمین ، اللهم اجعلنا من عبادك المؤمنین ، اللهم

اجعلنا من عبادك المحسنين اللهم اجعلنا من عبادك الصالحين ، اللهم اجعلنا من عبادك المصلحين ، اللهم اجعلنا من عبادك المخلصين ۔

اے اللہ! ہم آپ کے بندے آپ کے حضور میں حاضر ہیں، ہم ایمان لائے کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور ایمان لائے کہ سیدنا محمد ﷺ آپ کے رسول برحق ہیں، اے اللہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اس ایمان کے بعد زندگی جیسی گزرنی چاہئے تھی ویسی نہیں گزری، بہت سے کام جن کا آپ نے حکم دیا تھا، ہم سے ان کے کرنے میں بہت غفلت ہوئی، بہت سے کام جن سے آپ نے سختی سے منع فرمایا تھا ہم سے برابر سرزرد ہوئے، اے اللہ ہمیں معاف فرمادے، اور آئندہ کیلئے ارادہ کرتے ہیں کہ ایمان اور تقویٰ والی زندگی گزاریں گے، اے اللہ ہمیں اس ارادہ پر جمنے والا بنادے، اے اللہ ہمیں ہمت و استقامت اور سچی طلب عطا فرمادے، اے اللہ ہم سب کو معاف فرمادے، اے اللہ ہم سب کو قبول فرمالے! آمین ! برحمتك ياأرحم الراحمين ۔

☆☆☆

اپنے خطوط کے آئینہ میں

مختلف حضرات کو، مختلف اوقات میں
لکھے گئے، مختلف خطوط کا انتخاب

علمی اَفکار واِفادات

بنام

۱- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مئو
۲- نام نہیں معلوم ہو سکا
۳- حضرت مولانا فاضل عثمانی، مکہ مکرمہ
۴- بھائی مراد علی صاحب، سعودی عرب
۵- مولانا سعید احمد پالنپوری
۶- 〃 〃 〃 〃
۷- نام معلوم نہیں ہو سکا
۸- حکیم ظل الرحمٰن صاحب، دہلی
۹- مولانا ابوالحسن زید فاروقی، دہلی
۱۰- مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی
۱۱- 〃 〃 〃 〃 〃 〃
۱۲- جناب عبدالرحمٰن کوندو، سری نگر، کشمیر
۱۳- مولانا سید فرید الوحیدی، جدہ
۱۴- جناب قطب الدین مُلاّ، بیلگام۔

محمد منظور نعمانی
۲۳؍دسمبر ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

حضرت مخدومنا(۱) ! دامت فیوضکم و برکاتکم
السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

خدا کرے حضرت والا کا مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

گذشتہ دو ہفتوں میں میری طبیعت بہت زیادہ خراب رہی، خیال تھا کہ شاید یہ آخری مرض ہے اور یہ دن زندگی کے آخری دن ہیں، ان دنوں میں جو خطوط آئے، ان کا مجھے علم بھی نہیں ہوا، اب تین چار دن سے بفضلہٖ تعالیٰ مرض میں تخفیف اور افاقہ
تعالیٰ نے کچھ اور مہلت عطا فرمائی ہے۔ وہی توفیق دے کہ توبہ
اس مہلت سے فائدہ اٹھاسکوں۔

آج سے دو تین دن پہلے گرامی نامہ کے بارے میں معلـ
وقت صرف اتنا ہی عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے "مصنف
العالیہ" کے سلسلہ میں جو کام لیا ہے، معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ حضرت کے ذریعہ ان کاموں کو تکمیل تک پہنچائے اور قبول فرمائے۔

"شارح حقیقی" کا نسخہ ہمارے یہاں محفوظ نہیں تھا، میں چاہتا تھا کہ وہ پھر طبع ہو۔ اب والا نامہ سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ اسکا نسخہ حضرت کے یہاں نکل آیا ہے، اسکو رجسٹرڈ روانہ کرانے کا انتظام فرمادیا جائے، انشاء اللہ اشاعت کا انتظام ہو جائے گا(۲)۔

حضرت کے ضعف اور معذوری کا حال تو معلوم تھا، تازہ والا نامہ سے مزید تفصیل معلوم ہوئی، اللہ تعالیٰ عافیت عطا فرمائے۔ مولانا اسعد میاں کا حال آنے جانے والوں کے ذریعہ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ یہ مریض اور دور افتادہ ان کے لئے برابر دعا کرتا ہے اور خود حضرت والا کی دعاؤں کا محتاج و طالب اور امیدوار ہے۔

والسلام
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود

---

(۱) حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، مئو۔ (۲) غالباً یہ کتاب نہیں آئی۔ ورنہ ناظم کتب خانہ کو اشاعت کیلئے سپرد کی گئی ہوتی۔ اُن کا بیان ہے کہ انھیں نہیں ملی۔ (مرتب)

(۲)

محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

حضرت معظمی و محترمی(۱) ! دامت فیوضکم و برکاتکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں ــــــ گرامی نامہ مورخہ ۶/اکتوبر ۱۹۸۹ء، اب سے کئی دن پہلے موصول ہو گیا تھا، اس سے پہلے مولانا احمد علی صاحب کے ذریعے بھی والا نامہ مجھے مل گیا تھا ــــــ میری بری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں نے اپنے بزرگوں کے عنایت ناموں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا، مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے اُس والا نامہ میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے اکتوبر میں پاکستان تشریف لے جانے کا ذکر فرمایا گیا تھا اور اس سلسلے میں دعا کے لئے بھی ارشاد فرمایا گیا تھا ــــــ اپنی ذاتی رائے کے اظہار کی فرمائش مجھے بالکل یاد نہیں، اگر بالفرض فرمائش کی گئی ہوتی تب بھی یہ عاجز اس بارے میں رائے عرض کرنا مناسب نہ سمجھتا ــــــ اب صفائی کے ساتھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، میں اس بارے میں سخت مایوس ہوں، جس قوم کی نوے (۹۰) فیصدی یا اس سے بھی زیادہ کی حالت وہ ہو جو پاکستان کے موجودہ عام مسلمانوں کی ہے اس میں قانونِ شریعت کا نفاذ اور اس پر عمل بلاشبہ ایک اچھی اور مبارک آرزو تو ہے لیکن سنت اللہ یہ نہیں ہے اس عاجز کے نزدیک اس مقصد کے لئے صحیح طریقۂ کار یہی ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے عوام میں حقیقی ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، جب بھی قابل لحاظ اکثریت میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ چیز پیدا ہو جائیگی تو یہ مبارک آرزو بھی انشاءاللہ پوری ہو جائیگی۔

حضرت! میں ایسے حال میں ہوں کہ ٹھہر ٹھہر کر بمشکل یہ سطریں لکھا رہا ہوں، اگر میرے لئے آسان ~~ہوتا~~ تو زیادہ تفصیل اور وضاحت سے اپنی بات عرض کرتا، دعاؤں کا سخت محتاج و طالب ہوں اللہ تعالیٰ اس عاجز کو آپ کے حق کے مطابق ہر طرح کے دنیوی و اُخروی خیر وفلاح کے لئے دعا کا اہتمام نصیب فرمائے۔

والسلام
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن

---

(۱) نام نہیں معلوم ہو سکا، تاریخ درج نہیں ہے، بظاہر ۱۹۸۹ء ہے۔

(۳)

۱۹/ اکتوبر ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

محترمی و معظمی حضرت مولانا محمد فاضل عثمانی صاحب (۱)

دامت فیوضکم و برکاتکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ بہت ہی نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ پہلا عنایت نامہ بھی مل گیا تھا، میں ان دنوں آشوب چشم میں مبتلا تھا جو یہاں وبا کے طور پر پھیلا ہوا تھا، ایک مہینہ سے کچھ زیادہ اسکا اثر رہا، اس عرصہ کے وہ تمام خطوط جمع ہوتے رہے جن کا جواب بہت مختصر نہیں لکھایا جاسکتا تھا، ان میں گرامی نامہ بھی تھا، اب تک بھی یہ
خطوط محفوظ ہیں۔ کل ہی کی ڈاک سے دوسرا گرامی نامہ موصول ہو
اس وقت صرف اتنا ہی عرض کر سکوں گا کہ سب —
ذہن سے بالکل نکل گیا تھا کہ تعلقات و معاملات کیسے رکھے جائیں
گئی تھی کہ شیعہ اثنا عشریہ میں جو لوگ ان عقائد سے انکار کرتے ہیں
مذہب کے ان عقائد سے ناواقف ہیں، یا جن کا طرز عمل یہ بتلاتا ہے کہ یہ ایسے عقیدے نہیں رکھتے ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہوگا؟ —— الغرض میرے ذہن میں یہی سوال محفوظ تھا، میں نے اسی کے جواب دینے کی کوشش کی تھی جو خصوصی اشاعت الفرقان، حصہ دوم کے صفحہ ۳۰ پر "ایک ضروری وضاحت" کے زیر عنوان لکھا گیا ہے۔

دوسرا مسئلہ جو میرے ذہن سے اتر گیا تھا، میں نے اسکے بارے میں کچھ نہیں لکھا، نہ میں نے پوری طرح اس پر غور کیا ہے۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ جس طرح ہم قادیانیوں کو ان کے موجب کفر عقائد کیوجہ سے دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں یہی حال شیعہ اثنا عشریہ کا ہے، ان کے ساتھ ہمارا رویہ وہی ہونا چاہئے جو مثلاً قادیانیوں کے ساتھ ہے۔

اس وقت اس سلسلہ میں صرف اتنا اور عرض کر سکتا ہوں کہ قادیانیوں یا شیعہ اثنا عشریہ کے ساتھ ہمارے روابط و معاملات ایسے نہ ہونے چاہئیں جن سے عام مسلمانوں کو یہ شبہ ہو کہ ہم ان کو مومنین میں سے سمجھتے ہیں —— عام کافروں یہود و نصاریٰ اور مثلاً ہنود کے ساتھ تعلقات و معاملات میں کسی مسلمان کو بھی اسکا شبہ نہیں ہو سکتا، لیکن قادیانیوں اور اثنا عشریہ اور

(۱) مکہ مکرمہ

اسی طرح اُن فرقوں کے لوگوں کے ساتھ جو مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کے عقائد قطعی طور پر موجب کفر ہیں جن کو خاص شرعی اصطلاح میں زندیق کہا جاتا ہے ان کے ساتھ ایسے تعلقات رکھنے سے منع کیا جائیگا جن سے عام مسلمانوں کو یہ شبہ ہو کہ ہم ان کو اہل ایمان و اسلام میں سمجھتے ہیں۔

کھلے غیر مسلم، کفار اور زنادقہ کے بارے میں شرعی احکام مختلف ہیں، اسلامی حکومت میں کسی کافر کو اسکے کفر کی بنیاد پر قتل نہیں کیا جائیگا لیکن جیسا حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "مسوّی" میں تحریر فرمایا ہے کہ زنادقہ کے واجب القتل ہونے پر متاخرین حنفیہ اور شافعیہ کا اتفاق ہے۔

یہ مختصر عریضہ بھی طبیعت کی ناسازی کی حالت میں بمشکل لکھا سکا ہوں، علاوہ اُن دعاؤں کے جو جناب از راہ عنایت اس عاجز کے لئے فرماتے ہیں، صحت و عافیت اور حُسن خاتمہ کی دعا کی بھی درخواست ہے۔

والسلام
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود

(۴)

۳ر اکتوبر ۱۹۸۹ء
یکم ربیع الاول ۱۴۱۰ھ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

میرے مخلص بھائی مراد علی صاحب! سلام مسنون

آپ کا خط ملا ـــــــ آپ سعودیہ عربیہ کی جس بستی میں ہیں کیا وہاں کوئی عالم دین نہیں ہیں کہ آپ کو مجھے خط لکھنا پڑا۔

معارف الحدیث کی ساتویں جلد کے صفحہ ۳۹ پر اصل حدیث شریف عربی نقل کی گئی ہے۔ نیچے اسکا اردو میں ترجمہ ہے، اُس میں باندی کا ذکر ہے، آپ نے اُس کا مطلب نوکرانی سمجھ لیا، نوکرانی کا تو ہاتھ پکڑنا بھی حرام ہے، باندی کا مطلب اگر آپ نہیں سمجھتے تو کسی عالم یا زیادہ پڑھے لکھے آدمی سے دریافت کر لیتے، شریعت میں اُسکو باندی کہتے ہیں جس سے بیوی ہی کی طرح صحبت جائز ہے، یہ حدیث شریف جس میں کسی صحابی کے اپنی باندی سے صحبت کرنے کا ذکر ہے، مسلم شریف ہی کے حوالہ سے مشکوۃ شریف (ص ۲۷۵) کتاب المعاشرہ میں بھی نقل

کی گئی ہے، مشکوۃ شریف کا اردو ترجمہ مظاہر حق کہیں مل جائے تو اس میں دیکھ لیا جائے یا کسی عالم سے سمجھ لیا جائے ـــــــ دوسری حدیث جس میں کسی سانپ یا بچھو کے کاٹے ہوئے آدمی پر ایک صحابی کے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کرنے اور اسکی اجرت پر بکریاں لینے کا ذکر ہے جو بخاری شریف کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے وہ بھی مشکوۃ شریف میں بخاری شریف کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے۔ (باب الاجارۃ ص ۲۸۵) اس کا ترجمہ اور تشریح بھی مظاہر حق میں دیکھ لی جائے یا کسی عالم دین سے دریافت کر لیا جائے۔

الغرض جو کچھ معارف الحدیث میں لکھا گیا ہے وہ حدیث شریف کا اردو میں ترجمہ اور اسکی تشریح ہے اور خدا کے فضل سے بالکل صحیح ہے، جو لوگ اس پر اعتراض کرتے اور اس کو غلط سمجھتے ہیں وہ بیچارے جاہل ہیں، ان کو کسی عالم دین سے پوچھنا چاہئے۔

آئندہ کوئی خط لکھنا ہو تو آپ خود نہ لکھیں، کسی عالم سے ـ زیادہ پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی سے لکھوائیں۔

میں خود ضعیف اور مریض ہوں، آنے والا خط بھی د۔ جواب بھی خود نہیں لکھ سکتا، دوسروں سے لکھواتا ہوں۔

آپ کا خط بھی پڑھوا کر سنا ہے، اوار یہ جواب بھی دوسرے ں ـ کے لئے دعا کرتا ہوں اور دعاؤں کا محتاج ہوں۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۵)

۸؍فروری ۱۹۷۷ء

برادر مکرم مخلص محترم (۱) رید مجدکم

سلام مسنون!

گرامی نامہ مورخہ یکم فروری موصول ہوا۔ مرسلہ کتاب بھی پہونچ گئی۔ بے تکلف عرض کروں اب مطالعہ کے ذریعہ علمی اضافہ کا سلسلہ بالکل منقطع سا ہو گیا ہے۔ جو علم حاصل ہو چکا ہے اس کا بھی کچھ حق ادا نہیں ہو سکا۔ اس لئے آپ مجھے کتابی ہدیہ کے لائق نہ سمجھیں۔

---

(۱) مولانا سعید احمد پالنپوری، استاذ دار العلوم دیوبند۔

ہاں فتاویٰ کے سلسلہ کا محتاج ہوں، جبتک زندگی ہے اسکی ضرورت ہے۔

آپ نے اپنی اس تازہ تصنیف میں حضرت نانوتویؒ کی سوانح میں اور تصانیف کی خصوصیات پر جو لکھا ہے وہ حرفاً حرفاً پڑھا اور آپ کے علم کے بارے میں جو حُسنِ ظن تھا اس میں بہت اضافہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ یہ علم مبارک فرمائے۔

آپ نے آبِ حیات کی شرح لکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے، بہت بڑا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں آپ کی مدد فرمائے۔

اب سے قریباً بیس سال پہلے جب پاکستان میں علماء دیوبند کے دو گروہوں میں مسئلہ حیات النبی پر شدید اختلاف تھا اور اس نے نزاع اور جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی تو میں نے اس موضوع پر کچھ تفصیل سے الفرقان میں لکھا تھا۔ اس میں "آب حیات" کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ شاید کبھی نظر سے گزرا ہو۔ میری ملاقات یا عیادت کیلئے ہرگز سفر نہ فرمایا جائے۔ انشاء اللہ کچھ عرصہ کے بعد میں سفر کے لائق ہو جاؤں گا۔

ابھی تو خطوط کا جواب لکھانا بھی میرے لئے مشکل ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ خطوط کم سے کم آئیں۔ الحمد للہ اب چند روز سے بیٹھ کر نماز ادا کرنے لگا ہوں۔ دعاؤں کا محتاج اور دعا گو ہوں۔

والسلام

(بقلم عبید الرحمٰن سنبھلی)

(۲)

۲۰؍دسمبر ۱۹۷۰ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادرم مکرم محترم(۱) !احسن اللّٰہ تعالیٰ الیکم والیبا۔

سلام مسنون

اخلاص نامہ موجب مسرّت ہوا۔ مرحوم مودودی صاحب کے ساتھ تعلق کی یہ سرگزشت میں (۲۲) سال پہلے الفرقان میں لکھ چکا ہوں صرف فرق اتنا ہے کہ دو چار باتیں

(۱) مولانا سعید احمد پالنپوری

صراحت کے ساتھ اس وقت ذکر نا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن اسطرح لکھا تھا کہ واقعات سے واقف حضرات کے لئے کافی تھا تو اب یہ ضروری سمجھا کہ ان چیزوں کو صراحت سے لکھ دیا جائے تاکہ یہ تاریخ محفوظ ہو جائے۔ ابھی ان سب چیزوں کے مشاہد زندہ ہیں کل کو وہ نہ رہیں گے الفرقان میں اس سلسلہ کے باقی خطوط کی اشاعت کا بھی فیصلہ کرلیا گیا ہے۔

موسم کی شدّت کی وجہ سے مجلس شوریٰ میں شرکت کا ارادہ نہیں کر سکا معذرت لکھ دی ہے۔

آپ کے ساتھ حسن ظن اور قلبی تعلق ہے۔ دعاؤں کا محتاج اور دعا گو ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

(۷)

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء

محمد منظور نعمانی

مکرمی(۱)!

سلام مسنون

میں اس حال میں ہوں کہ آنے والے خطوط دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں اور جواب بھی دوسروں ہی سے لکھواتا ہوں، خود لکھنے اور پڑھنے سے معذور ہوں۔

آپکا خط مورخہ ۲۸ر صفر المظفر ابھی پڑھوا کر سنا۔ اسکے مضمون سے اندازہ ہوا کہ آپ غالبًا عالم اور عربی داں ہیں۔

"نشر الطیب" میں اکیسویں فصل صفحہ ۱۱۵ سے شروع ہوئی ہے اس میں مصنف حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کا پورا رسالہ "شیم الحبیب" ترجمہ کے ساتھ نقل فرمادیا ہے جو صفحہ ۱۶۵ پر ختم ہوا ہے۔

آپ "نشر الطیب" میں اس پورے رسالہ "شیم الحبیب" کو پڑھیں اسکے آخر میں لمؤلفه کے زیر عنوان جو اشعار ہیں وہ حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب ہی کے ہیں اور رسالہ کا آخری جزء

(۱) نام کا علم نہیں ہو سکا۔ (مرتب)

اور گویا اس کا خاتمہ ہیں۔

حضرت مفتی صاحب شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے تلامذہ اور سید احمد شہیدؒ کے مسترشدین میں ہیں اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے پیر بھائی اور انکے ہم مسلک و ہم مشرب ہیں۔

حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ یا حکیم الامت حضرت تھانویؒ جیسے سلیم العقیدہ ربانی علماء و مشائخ جب رسول اللہ ﷺ سے خطاب کر کے اس طرح کی بات کہیں جیسی ان اشعار میں کہی گئی ہے تو اسکا مطلب وہی ہوگا جو انکے عقیدۂ توحید سے پوری مطابقت رکھتا ہو۔ یہ ایسی کھلی اور بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی سلیم العقل کو شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ عربی داں اور عالم ہیں اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے میری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں تو آپکے لئے انشاء اللہ وہ کافی ہوگا جو لکھایا ہے۔

آپ نے زمانۂ طالب علمی میں پڑھا ہوگا کہ اگر ایک ملحد اور دہریہ کہے است الربیع البقل تو اس کا مطلب اسکے عقیدہ کے مطابق ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا مومن و موحد بندہ یہی جملہ بولے است الربیع البقل تو اس کا مطلب اسکے عقیدہ کے مطابق سمجھا جائے گا۔

آپ کیلئے دین و دنیا کے خیر و فلاح کی دعا کرتا ہوں اور خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

والسلام
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۸)

۱۸ جولائی ۱۹۹۱ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

عزیز مکرم (۱) ! سلمکم اللہ تعالیٰ وعافاکم

سلام و رحمت ——— آپ کا ملفوف خط کل ملا، بفضلہٖ تعالیٰ خود ہی پڑھا۔ مولوی سجاد سلمہ نے یاجوج و ماجوج کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں پہلے سن چکا تھا، چوں کہ جو کچھ انھوں نے لکھا وہ نئے لوگوں کیلئے نئی سی بات تھی اسلئے اس سے اتفاق نہ کرنا قدرتی بات ہے۔

---

(۱) حکیم ظل الرحمٰن صاحب، دہلی

میں نے اس مسئلہ پر نہ کبھی خود غور کیا اور نہ اسکی ضرورت محسوس کی لیکن اپنے استاذ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے چونکہ خود اس بارے میں سن چکا ہوں اور انکی چار جلدوں میں مطبوعہ صحیح بخاری کے درس کی تقریر "فیض الباری" طبع مصر، میں بھی اس موضوع پر اسی خیال کا اظہار فرمایا گیا ہے جسکا حوالہ بھی مولوی سجاد نے دیا ہے۔ اسلئے مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں۔ میں حضرت استاذؒ کا مقلد نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس دور میں نہ صرف برصغیر میں بلکہ پورے عالم اسلام میں میری نظر میں قرآن و حدیث کا کوئی عالم اس درجہ کا نہیں ہے اور نہیں تھا اگر کبھی آپ سے ملاقات ہوئی اور آپ نے یاد دلایا تو حضرت الاستاذ کی وسعت علم کے بارے میں زبانی کچھ بتلا سکوں گا۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

دعاؤں کا طالب اور دعا گو ہوں۔

والسلام

(۹)

۴ ستمبر ۱۹۸۹ء
محمد منظور نعمانی

محترمی گرامی مرتبت جناب مولانا ابوالحسن زید صاحب(۱) دام مجدکم السامی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

جناب کے علم میں ہے کہ مولانا نسیم احمد فریدی علیہ الرحمۃ نے اب سے بہت پہلے آپکی کتاب "مولانا اسماعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان" پر تبصرہ لکھا تھا اور الفرقان میں اشاعت کیلئے میرے پاس بھیج دیا تھا لیکن وہ مولانا مرحوم کی حیات میں شائع نہ ہو سکا تھا، گزشتہ مہینے اگست میں الفرقان کے "فریدی نمبر" میں شائع ہوا —— اس تاخیر کے باعث کی کچھ تفصیل "فریدی نمبر" کے ملاحظہ سے جناب کو معلوم ہو جائیگی —— مولانا مرحوم کے تبصرہ کے تکملہ کے طور پر

(۱) دہلی۔

کو اپنا یہ خیال پہونچا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جہاں تک میرے علم میں ہے حضرت شہیدؒ کی کوئی سوانح حیات سوائے مرزا حیرت مرحوم کی "حیات طیبہ" کے نہیں لکھی گئی اور وہ جیسی کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اس کمی کو پورا کردینے پر غور کریں، اس میں حضرت شہیدؒ اور ان کی تصانیف "تقویۃ الایمان" وغیرہ اور ان کے مخالفین خاص کر مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم سے مولانا زید تک کی "مخالفانہ تحریریں" اور ان کے جواب میں حضرت شہیدؒ کی طرف سے مدافعانہ طور پر جو چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئیں ان کا ذکر بھی آجائے گا۔

کام یقیناً بہت طویل ہے لیکن امید ہے کہ آپ کے لئے زیادہ مشکل نہ ہوگا اور ایک بہت بڑا قرض جماعت سے اتر جائیگا اور یقین کے ساتھ امید ہے کہ ایک فی سبیل اللہ شہید مظلوم اور حق کی حمایت کا اجرِ عظیم اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق آپ کو عطا فرمائیں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی غالبًا لکھا چکا ہوں، میری نظر میں آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس سے اِس ضروری کام کے انجام دے سکنے کی امید ہو۔

یقین ہے کہ اگر یہ کام ہو گیا تو انشاء اللہ کتاب آپ کی بیحد مقبول ہوگی، اگر زندہ رہا تو انشاء اللہ اسکی طباعت کے انتظام میں حسبِ توفیق حصہ لے سکوں گا۔

یہ جو کچھ لکھایا یہ بس "الاحاحة فی نفس یعقوب قضٰها" ہے، اسکے سوا کچھ نہیں۔ ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی، وہی رب کریم اس ضعیف اور عاجز بندہ کو دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔

جیسا کہ لکھایا جاچکا ہے، شاہد صاحب کیطرف سے کوئی چیز ابتک دفتر الفرقان میں نہیں پہونچی، خدا کرے انھوں نے آپکو بھیجدی ہو اور آپ اس پر نظر ڈال کر روانہ فرمادیں والد ماجد کی خدمت میں سلام مسنون، ان سے اور آپ سے بھی دعا کی درخواست۔

والسلام

بقلم ضیاء الرحمٰن محمود

(۱۴)

۱۳؍ جنوری ۱۹۷۸ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مکرمی(۱) زید لطفکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تازہ "الفرقان" بابت جنوری میں خط و کتابت سے متعلق میری گزارش نظر سے گذری ہوگی۔ تاہم چند باتیں مختصراً عرض کرتا ہوں۔

(۱) حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام ۱۶ھ سے ۳۳ھ تک مدینہ منورہ رہا۔ ان پر وہاں کے علمی حلقہ کے خیالات کے بعض خاص اثرات تھے۔ اس زمانے کے علماء حرمین کی غالب اکثریت شیخ محمد بن عبدالوہابؒ بلکہ شیخین ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ
سخت رائے رکھتی تھی۔ اس کا آئینہ شیخ احمد زینی دحلان مکی کی "
بہت پہلے ابن حجر مکی ہیثمیؒ شیخین کے بارے میں سخت رائے
ہے۔ ہم اس رائے کو دلائل اور واقعات کی روشنی میں غلط
ہمارے سب اکابر ان دونوں کو اکابر علمائے امت میں سمجھتے ہیں۔

(۲) شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی اس رائے کا مجھے علم ہے کہ وہ ان کے علم کے قائل نہیں تھے۔ "فیض الباری" میں شاہ صاحب کے سخت الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے اس رائے کا اظہار فرمایا ہو۔ آپ کے علم میں ہے کہ انہوں نے قاضی شوکانی کے بارے میں بھی اسیطرح کی کوئی بات فرمائی تھی ——— مجھے اس سلسلۂ مضمون میں جو الفرقان میں لکھا جا رہا ہے انشاء اللہ وہ لکھنا ہے جسکو میں صحیح سمجھتا ہوں۔

(۳) سماع موتیٰ کا مسئلہ صحابہؓ کے زمانے سے مختلف فیہ رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا اس بارے میں جو نقطۂ نظر "فیض الباری" میں نقل کیا گیا ہے وہ اس عاجز کے نزدیک صحیح اور قابل قبول ہے۔

(۴) ما أهلّ به لغير الله کی کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے جو کچھ لکھا ہے میرے علم میں ہماری جماعت کے اکابر کا یہی مسلک ہے۔ یعنی یہ کہ وہ جانور حرام ہو جاتا ہے۔ علماء بریلی کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی اس تحقیق سے اختلاف ہے۔ "تفسیر عزیزی" کا

---

(۱) جناب عبدالرحمٰن کوندو، سری نگر، کشمیر۔

مطالعہ فرمالیا جائے۔

(۵) مولانا بنوریؒ پر میں نے جو لکھا اس میں دو چیزیں قابل اصلاح ہیں۔ ایک یہ کہ میں نے "بنور" کو پشاور کا ایک قریہ لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ بنور ریاست پٹیالہ (مشرقی پنجاب) میں ایک قصبہ تھا۔ شیخ آدم بنوری وہاں آکر مقیم ہوئے تھے۔ اسی کی طرف نسبت ہے۔

دوسرے یہ کہ میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ مولانا مرحوم ڈابھیل سے فارغ ہونے کے بعد کئی برس اپنے وطن صوبہ سرحد میں رہے۔ وہاں مدرسہ بھی قائم کیا۔ بعد میں (غالباً ۵۲ھ میں) ڈابھیل جامعہ اسلامیہ میں بلائے گئے۔

(۶) شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے شاہ صاحب سے پڑھنے کی بات یقیناً غلط ہے۔ اس بارے میں تفصیل سے لکھنے کی وقت میں گنجائش نہیں ہے۔

(۷) دیوبند کے جلسہ دستار بندی میں فارغین کی تعداد کے بارے میں اگر "نقش حیات" میں ایک ہزار والی بات لکھی ہے تو پھر میری اطلاع قابل اعتماد نہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند سید محبوب رضوی (مؤرخ) کو خط لکھ کر دریافت کرلیں۔ وہ بالکل صحیح بتا سکیں گے۔

معذرت: میں خط لکھانے کے بعد پڑھ نہیں سکا ہوں۔ خط و کتابت سے بالکل معذور تصور فرمایا جائے۔ "الانور" سے متعلق مفتی صاحب اور مولانا اکبر آبادی اچھے مشورے دے سکیں گے، آپ کو دہلی جانا ہی ہے۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم (عبیدالرحمٰن سنبھلی)

(۱۴)

لکھنؤ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

۲۶ر نومبر ۱۹۹۱ء

برادرِ عزیز و مکرم مولانا فرید الوحیدی صاحب! زید لطفکم

سلام و رحمت —— امید ہے کہ آپ بخیرت دہلی پہونچ گئے ہونگے۔ اور بعافیت ہوں گے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ (۱) پر جو کتاب آپ نے لکھی ہے آپ نے خود ہی بتلایا تھا کہ اسکی کتابت بھی ہو چکی ہے اور یہ کہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے حضرت کے سیاسی مخالفین (مسلم لیگ کے زعماء اور ڈاکٹر اقبال وغیرہ) کے بارے میں الفاظ کو نرم کرنے کا مشورہ دیا ہے جس کو ایک حد تک آپ نے قبول بھی کر لیا ہے۔

درمیان کے ان چند دنوں میں میں نے کئی دفعہ ا

پہونچا کہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک عقید تمند اور نیا

بھائی ہونے کی حیثیت سے اس بارے میں اصرار کے ساتھ آ

کتاب کی تصنیف سے آپ کا خاص مقصد یہ ہو گا اور یہی ہو نا چ

کے مقام و مزاج اور زندگی کے احوال سے واقف نہیں ہیں، واقف ہوں اور پہچانیں اور سبق لیں اور اگر ابتک حضرت کے بارے میں ناواقفی کی وجہ سے اُن کے جو غلط خیالات رہے ہیں ان کی اصلاح ہو۔

غالبًا آپ کو بھی اس میں شبہ نہ ہو گا کہ اس مقصد کا تقاضا یہی ہے کہ وہ لوگ کتاب کو ٹھنڈے دل سے پڑھ سکیں۔

اس بارے میں میں نے گاندھی جی کی ایک بات سے سبق لیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی اختلافی معاملہ کے بارے میں میں ایک آرٹیکل لکھتا ہوں پھر میں اس نقطۂ نظر سے اُس پر نظر ثانی کرتا ہوں کہ اُس میں کوئی فقرہ ایسا تو نہیں لکھا گیا جس سے میرے مخالفین کا دل دکھے اور وہ میرے ہم خیال اور قریب ہونے کے بجائے اور دور ہو جائیں، اس نظر ثانی میں مجھے کبھی کبھی ایک فقرہ ایسا نظر آتا ہے جو میرے مخالفین کے لئے ناگواری کا باعث بن سکتا ہے لیکن مجھے یہ مشکل پیش آتی ہے کہ وہی فقرہ ادبی حیثیت سے پورے آرٹیکل کی جان ہوتا

---

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

ہے اور میرا دل اس کے نکالنے یا بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا لیکن میں اصل مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے دل پر جبر کر کے اُس فقرہ کو نکال دیتا ہوں۔

گاندھی جی کی یہ بات اب سے کم از کم پچاس ساٹھ سال پہلے کہیں پڑھی تھی، یاد ہے کہ اُس میں یہ بات بہت مختصر الفاظ میں لکھی گئی تھی جس کو میں اس طول طویل عبارت میں ادا کر سکا ہوں۔

بعد میں ایک وقت خیال آیا کہ یہ سبق تو قرآن مجید کا دیا ہوا ہے، ولا تستوی الحسنة ولا السیّئة، ادفع بالتی هی احسن، فاذا الذی بینك وبینه عداوة كانه ولی حمیم، وما یلقاها الا الذین صبروا، وما یلقاها الا ذو حظ عظیم۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اُسی کی توفیق سے ممکن حد تک اِس کے مطابق عمل کی کوشش کرتا ہوں ـــــــ مودودی صاحب مرحوم کے بارے میں جو لکھا ہے آپ نے اُس کو تو پڑھا ہے اُس کے بعد خمینی اور شیعیت کے بارے میں جو کچھ اللہ کی توفیق سے لکھا وہ بھی شاید آپ نے پڑھا ہو، اِن دونوں کتابوں کے بارے میں مودودی صاحب اور خمینی صاحب کے بہت سے معتقدین اور بعض شیعہ حضرات نے بھی جو اعتراف کیا ہے وہ اِسی کا نتیجہ ہے۔

بیماری کی اس حالت میں جو آپ دیکھ چکے ہیں جس میں میرے لئے مختصر خطوط لکھانا بھی آسان نہیں رہا ہے یہ طول طویل خط آپ کو لکھا رہا ہوں، صرف اس لئے کہ آپ کی کتاب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی مخالفین (مسلم لیگ کے زعماء و ڈاکٹر اقبال کے معتقدین اور ہمارے تھانوی حلقہ کے حضرات بھی) ٹھنڈے دل سے پڑھ سکیں اور حضرت کے مقام کو پہچانیں اِس طرح آپ کی محنت با مقصد اور بار آور ہو۔

اگر آپ میری طرح "سفید ریش بزرگ" نہ ہوگئے ہوتے تو میں خط کے خاتمہ میں لکھتا۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیر دانا را

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم ضیاء الرحمٰن محمود

(۱۴)

محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ
لکھنؤ

۱۹؍جون ۱۹۹۰ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادرِ عزیز مکرم(۱) ! زیدت حسناتکم

سلام ورحمت ـــــ خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔ گذشتہ مہینے مئی کے شمارے میں آپ کا مضمون شائع ہوا تھا، اس کو پڑھوا کر سنا تو آپ کو میں نے خط لکھایا تھا، آپ کی طرف سے میرے اُس خط کی وصولیابی کی اطلاع نہ ملنے سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ غالباً میرا خط آپ کو نہیں ملا، اس لئے مختصراً اپنی رائے پھر لکھا رہا ہوں۔

آپ نے جس محنت اور تحقیق سے مضمون لکھا۔
بفضلہٖ تعالیٰ آپ کا تعلق دین کی دعوت اور امت میں دین کی
کہ آپ نے محنت و تحقیق کے لئے ایسا موضوع منتخب کیا جس
اور اس کی اصلاح کی فکر سے کوئی تعلق نہیں۔

میرے عزیز بھائی! آپ نے اپنے اس مطالعہ میں محسوس کیا ہوگا کہ صحابۂ کرام اور ان کے تابعین نے اِس کام کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ کہ اب قیامت تک بھی یہ قطعی اور یقینی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ ولادت باسعادت کی تاریخ کیا تھی۔

میرے بھائی! امت جس میں ہم اور آپ بھی داخل ہیں، مریض ہے اور مرض بھی شدید سے شدید تر ـــــــ اللہ تعالیٰ ہمیں آپکو توفیق دیں کہ علاج اور اصلاحِ حال کی فکر کریں اور جو محنت اس کے لئے کی جاسکے اس سے دریغ نہ کریں۔ یہ اس وقت کا جہاد ہے اللہ تعالیٰ توفیق دیں اور قبول فرمائیں تو اسکی رضا اور جنت کی امید ہے، رب کریم توفیق عطا فرمائے۔ دعاؤں کا محتاج اور دعاگو ہوں اس وقت حال یہ ہے کہ بمشکل یہ سطریں لکھا سکا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود

---

(۱) جناب قطب الدین ملا صاحب، بیلگام۔

توازن واعتدال

۱- جناب عتیق احمد طارق صاحب
۲- جناب بشیر احمد شاکر صاحب کشمیر
۳- مولانا محمد شعیب اللہ صاحب بنگلور
۴- مولانا یاسین علی صاحب ممباسہ، کینیا، مشرقی افریقہ

از: محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۱۳/جون ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہٗ تعالیٰ

عزیز مکرم عتیق احمد طارق صاحب(۱) سلام ورحمت

آپ کا پورے پانچ صفحے کا خط ملا۔

آپ کو میرا حال معلوم نہیں، اس لئے معذور سمجھتا ہوں۔

کبر سنی کے شدید ضعف کے علاوہ مختلف امراض و عوارض اور ہائی بلڈ پریشر کے نتیجہ میں مستقل صاحب فراش ہوں، قریباً بارہ سال سے مسجد کی حاضری سے بھی محرومی ہے، میرا بستر ہی میری مسجد ہے . آنے والے خطوط اکثر دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں اور جواب لکھنا ضروری ہو تو دوسروں ہی سے جواب لکھاتا ہوں۔

جس مقصد کے لئے آپ نے اتنا طول طویل خط لکھ

ضرورت نہ ہوتی، آپ یہ سمجھ کر اپنے آپ کو مطمئن کر سکتے

متعلق جو کچھ لکھا (جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے) وہ اپنے علم کے

اسکے خلاف جو ایک کتاب کے حوالوں سے لکھا ہے کتاب کے مصنف

مطابق لکھا ہے۔ ان صاحب کا جو حقیقی حال ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اللہ تعالیٰ اپنے علم ہی کے مطابق ان کے بارے میں فیصلہ فرمائے گا۔

اگرچہ بعض ایسے ثقہ لوگوں کے ذریعہ جو ان صاحب کے ساتھ آخری زمانہ میں بھی قریبی تعلق رکھتے تھے مجھے اسکے خلاف معلوم ہے جو آپ نے ایک کتاب کے حوالہ سے لکھا ہے، لیکن مجھے بالکل اصرار نہیں ہے کہ میری معلومات صحیح ہوں، بلکہ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے میری معلومات غلط ہوں اور آپ نے ایک کتاب کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہو۔ آئندہ اس سلسلہ میں خط و کتابت سے بالکل معذور سمجھا جائے۔

الفرقان میں اپنے حال کا بار بار اعلان کیا گیا ہے اور مخلصوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ شدید ضرورت ہی سے اس عاجز کو خط لکھیں اور تا امکان مختصر لکھیں۔ آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

---

(۱) پتہ محفوظ نہیں ہے۔

۱۲/اکتوبر ۱۹۸۷ء

(۲)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

مخلص مکرم جناب بشیر احمد بیگ صاحب(۱) احسن اللہ تعالیٰ الیکم والینا

سلام ورحمت! عنایت نامہ مورخہ ۲/اکتوبر موصول ہوا، معلوم ہوا کہ الفرقان آپ کے پاس جاتا ہے، آپ نے بار بار اس میں پڑھا ہوگا کہ میں بہت ضروری اور مختصر ہی خط وکتابت کر سکتا ہوں، اسکے باوجود آپ نے یہ عنایت نامہ تحریر فرمایا، میرا حال یہ ہے کہ آنیوالے خطوط دوسرے صاحب سے پڑھوا کر سنتا ہوں، اور جو خط لکھوانا ہوتا ہے وہ بھی دوسرے ہی سے لکھواتا ہوں، آپکا یہ عنایت نامہ طویل جواب کو چاہتا ہے، مختصراً عرض کرتا ہوں۔

حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ جس خدا ترس عالم دین نے جس زمانے میں مولانا مودودی مرحوم کے بارے میں یا کسی کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس وقت کے اپنے معلومات کی بنیاد پر کی ہے، مجھے کم از کم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ، مولانا سید مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمۃ کے بارے میں معلوم ہے کہ ایک وقت ان حضرات نے مودودی صاحب مرحوم کے بارے میں بہت اچھی رائے کا اظہار فرمایا، اور دوسرے وقت اس سے بالکل مختلف۔ میرے نزدیک یہ دیانتداری اور خدا ترسی کی بات ہے۔

خود میرا حال اور میری سرگذشت یہ ہے کہ میں نے ۳۳ء میں موصوف کا رسالہ ترجمان القرآن دیکھا اور اس کے مطالعہ سے برابر ان کی قدر بڑھتی رہی، پھر ایک وقت آیا کہ ان کے مضامین الفرقان کے صفحات میں برابر شائع ہوتے رہے، اور میرے قلبی تعلق میں اضافہ ہی ہوتا رہا، اسکا آخری درجہ یہ تھا کہ ۱۹۴۱ء میں میرے اور ان کے مشورہ سے طے ہوا کہ جماعت کی تشکیل کیجائے، چنانچہ ہم خیال حضرات کو دعوت دی گئی، لاہور میں مولانا موصوف کی قیام گاہ پر اجتماع ہوا، اس میں جماعت کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا، میں نے ہی مولانا موصوف کی امارت کی تحریک کی اور حاضرین سے کہا کہ اس جماعت کے امیر میں جو صلاحیتیں اور صفات ہونی چاہیں وہ ہمارے اس مجمع میں مجموعی حیثیت سے مولانا موصوف ہی میں ہم سب سے زیادہ ہیں۔ (یہ میرا اسوقت کا خیال تھا اور گویا میری اس مجمع کے سامنے مولانا موصوف کے بارے میں یہ شہادت تھی) چنانچہ حاضرین نے. . . . . میری تحریک اور تجویز کو قبول کر لیا اور

---

(۱) سری نگر۔ کشمیر

مولانا موصوف کو ہم سب نے امیر تسلیم کر لیا، مولانا نے خود ہی مجھے نائب امیر بنایا۔

کچھ عرصے کے بعد مولانا موصوف کے بارے میں میرے معلومات اور خیالات میں فرق آنا شروع ہوا اور خیالات میں تبدیلی کا یہ عمل حالات کے ساتھ جاری رہا، اسکا آخری درجہ یہ تھا کہ میں نے اپنی سرگذشت کو تفصیل سے لکھنا اور شائع کر دینا ضروری سمجھا۔

اب جب یہ بات علانیہ طور پر سامنے آئی کہ جن لوگوں کی ذہنی تربیت خود مولانا موصوف کی صحبت و رفاقت، اور ان کے لٹریچر کے مطالعے ہی سے ہوئی تھی، انھوں نے یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ خمینی نے پوری صراحت اور صفائی کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم دل سے ایک دن بھی ایمان نہیں لائے، وغیرہ وغیرہ، خمینی کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلا
ملا دیئے اور اس کے برپا کئے ہوئے انقلاب کو خالص "اسلامی انقلاب"
اپنے پروپیگنڈے کے تمام ذرائع صرف کر کے تمام مسلمانوں سے
——— تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس شر
سے بچالیا، میرا یہ بھی خیال ہے اور میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ خود مولا
حالات میں تبدیلی کے ساتھ فرق آتا رہا، اپنے آخری دور میں انھوں نے وہ رویہ اپنایا ... وہ پہلے شدت سے مخالفت اور تردید کرتے رہے تھے۔

اب وہ اس دنیا سے جا چکے، ان کا حق ہے کہ ہم ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں، یہ عاجز ان کے لئے حسب توفیق دعاء مغفرت کرتا ہے اور خود اپنے کو مغفرت کا سب سے زیادہ محتاج سمجھتا ہے۔

دعاؤں کا محتاج و طالب اور آپ کے لئے دعا گو ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

....

۲۰/اگست ۱۹۸۷ء یکشنبہ

(۳)

باسمہ سبحانہ و تعالی

محترمی و مکرمی جناب مولانا محمد شعیب اللہ صاحب(۱) احسن اللہ تعالی الیکم و الینا

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! عنایت نامہ مورخہ ۱۵/ محرم الحرام موصول ہوا، غالبًا الفرقان نظر سے نہیں گذرتا، اس میں بار بار اعلان کیا گیا ہے کہ میں ہائی بلڈ پریشر کا مریض اور اس کے علاوہ مختلف امراض و عوارض میں مبتلا ہوں، اس لئے بہت ضروری اور مختصر خط و کتابت ہی کر سکتا ہوں۔

بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خطوط پڑھوا کر سنتا ہوں اور جوابات دوسرے حضرات سے لکھواتا ہوں، آپ کا عنایت نامہ خود ہی پڑھا، اگر معذوری نہ ہوتی تو جواب کچھ تفصیل سے لکھتا، اب مختصر ہی لکھا سکتا ہوں، اللہ تعالی اس کو نافع بنائے۔

میرا حال یہ ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی حیات کے آخر دور میں اور اسکے بعد طویل مدت تک دینی دعوت کے اس کام سے جو تبلیغ کے نام سے معروف ہو گیا ہے، قلبی اور عملی تعلق نصیب رہا، لیکن اب قریبًا دس بارہ سال سے ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اس حال میں ہوں کہ میرا بستر ہی میری مسجد ہے اسلئے اس دینی کام سے عملی تعلق سے گویا محرومی ہے، لیکن قلبی تعلق بفضلہٖ تعالی نصیب ہے، اور کام کرنے والے حضرات سے رابطہ رہتا ہے۔

ہر دور میں کام سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں میں اس طرح کی غلطیاں رہی ہیں، جس طرح کی ایک غلطی کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے، جس زمانے میں کام کرنے والوں کی تعداد محدود، چند سو بھی نہیں تھی تو اسطرح کی غلطیوں میں مبتلا بہت کم لوگ نظر آتے تھے، اور اللہ تعالی کی توفیق سے ان کی اصلاح بھی جلدی ہو جاتی تھی، لیکن اب جب کام کرنے والے صرف ایک ملک ہندوستان میں لاکھوں ہیں، تو ایسی غلطیوں میں مبتلا لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہونا قدرتی بات ہے۔ لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ اسطرح کی غلطیاں ان میں دعوت کے اس کام

---

(۱) مدرسہ مسیح العلوم، بینگلور، کرناٹک

نے پیدا کی ہیں؟ یا ان کی طبیعت اور مزاج میں ان کا مادہ پہلے سے موجود تھا؟

میں اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر مطمئن ہوں کہ ہمارے زمانے کے عام مسلمانوں میں اس طرح کے فساد کا مادہ بہت عام ہے۔ میرے علم میں ہے کہ کام کے مرکز نظام الدین میں ہر علاقے کے خواص کو چند روز کیلئے بلایا جاتا ہے، ان دنوں میں کام کے اصول اور اس طرح کی غلطیوں کی اصلاح کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی جاتی ہے، بالخصوص دینی مدارس، علماء، و مشائخ، اور خانقاہوں کی عظمت دلوں میں بٹھانے کی کوشش کیجاتی ہے۔

مرکز سے اور اجتماعات سے جماعتوں کی روانگی کے وقت جو ہدایات دی جاتی ہیں ان میں بھی اس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور دعا میں اہتمام سے یہ جز شامل رہتا ہے، اسکے باوجود جیسا کہ آپ کا مشاہدہ ہے کام سے تعلق رکھنے والے عوام میں بہت سوں کے اندر اس طرح کی غلطیاں رہتی ہیں، اور اس عاجز کا خیال ہے کہ جب بھی ایسے عام وسیع پیمانے پر ابـ[illegible]
ناگزیر ہے ـــــ اس صورت حال میں اس بات کو بہت دخل
بہت کم نصیب ہیں، اگر ہر شہر میں ایک دو عالم کام کی ذمہ دار[illegible]
غلطیوں پر انشاء اللہ بہت کچھ قابو پایا جاسکتا ہے، لیکن یہ فطری با[illegible]
والے عوام اسی عالم دین سے زیادہ متاثر ہو سکتے ہیں، جن کو وہ دیکھیں کہ وہ [illegible]
مالی قربانی دے رہے ہیں، اور انھوں نے اپنے کو اس دینی خدمت کیلئے وقف کر دیا ہے۔(۱)

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

---

(۱) خط میں اسی مسئلے پر اور کچھ مشورے بھی تھے۔ مگر جگہ کی قلت کے پیش نظر بس اتنا ہی حصہ دیا جاسکا جس کا اس مجموعۂ خطوط کے عنوان سے تعلق تھا۔(مرتب)

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
(۴)
لکھنؤ (الہند)
۱۲؍فروری ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالی
مخلص مکرم محب محترم جناب مولانا یاسین علی صاحب (۱)

احسن اللہ تعالی الیکم و الینا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خدا کرے آپ بہمہ وجوہ بخیریت ہوں۔

انتہائی ندامت کے ساتھ آپ کو یہ خط لکھا رہا ہوں، جیسا کہ آپ کو الفرقان سے معلوم ہوتا رہا ہوگا کہ قریباً چار مہینے سے میں مریض ہوں، درمیان میں مرض شدید رہا اور کچھ دن ایسے گذرے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی زندگی کے آخری دن ہیں، پھر بفضلہٖ تعالی افاقہ نصیب ہوگیا، اب اس حال میں ہوں کہ خطوط کے جوابات لکھا دیتا ہوں۔ آپ کا ایک عنایت نامہ بہت مدت پہلے (غالباً اکتوبر ۸۸ء) کا آیا ہوا اس زمانۂ علالت کے جمع شدہ ڈاک میں رکھا رہا، ابتک اسکا جواب لکھانے کی نوبت نہیں آئی حالانکہ (آپ کے) اس (خط) کے جواب میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے تھی، لیکن تاخیر ہوئی اور کئی مہینے کی تاخیر ہوئی جسکو اپنی تقصیر سمجھتا ہوں اور معذرت خواہ ہوں۔

معارف الحدیث کی تمام جلدوں کی سواحلی زبان میں ترجمے کی میری طرف سے اجازت ہے بلکہ میں اس کو اپنے ساتھ احسان سمجھوں گا اور شکر گزار ہوں گا۔

میں نے اپنے نزدیک ان احادیث کی تشریح میں مسلکی تعصب کی بنا پر بے انصافی نہیں کی ہے جنکا تعلق فقہی اختلافی مسائل سے ہے، ہاں یہ بات میرے پیش نظر ضرور رہی ہے کہ برصغیر ہند میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی غالب اکثریت جو حنفی المسلک ہے اسکو اپنے مسلک کے بارے میں بے اطمینانی نہ ہو، میں نے اسکو دینی مصلحت سمجھا ـــــ آپ کے علم میں ہوگا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً فیوض الحرمین میں تحریر فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تین وصیتیں میرے ذاتی رجحان کے خلاف فرمائیں ـــــ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اپنے ملک میں جاکر وہاں کے عامۂ مسلمین کے رویہ کے خلاف رویہ (مسلک) اختیار کرنا ـــــ ظاہر ہے کہ اسکا مقصد یہی تھا کہ ان کے خلاف عمل کرنے سے امت میں انتشار پید

(۱) ممباسہ، کینیا، مشرقی افریقہ

ہو ـــــ غالباً آپ کے علم میں ہوگا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں کہیں اپنے اسم گرامی کے ساتھ "الحنفی عملاً والشافعی درساً" لکھا ہے۔

بہر حال اس صورت حال کا لحاظ کرتے ہوئے کہ سواحلی زبان بولنے والوں کی اکثریت شافعی المسلک ہے، کتاب الصلوۃ میں یا جہاں بھی معارف الحدیث مین فٹ نوٹ لکھنے کی ضرورت سمجھی جائے وہ ضرور لکھا جائے، میرے نزدیک یہ بھی دینی مصلحت ہے ـــــ اگر مناسب سمجھا جائے تو کتاب کے شروع میں محترم مترجم صاحب کی طرف سے پیش لفظ یا مقدمہ کے طور پر جو کچھ لکھا جائے، اس میں اس عمل کا اور اسکے لئے خوش دلی سے میری اجازت کا ذکر کر دیا جائے۔

خود میرا حال یہ ہے کہ میں رفع یدین اور ترکِ رفع اور آمین بالجہر اور آمین بالسر دونوں کو ثابت بالسنۃ یقین کرتا ہوں، لیکن بیچارے ناواقف غیر عالم عوام کو انتشار ا، ...
بچانے کے لئے عمل حنفی مسلک ہی کے مطابق کرتا ہوں لیکن ...
والے کے عمل کو بھی ثابت بالسنۃ سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ جو ...
سے آپ کو اپنے سوال کا پورا جواب مل گیا ہوگا۔ آپ سے بھ...
کے لئے فلاح دارین کی دعا کرتا ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

۱- جناب مولانا یعقوب کاوی، ڈیوزبری، یارک شائر، انگلینڈ
۲- ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی، ڈربن
۳- جناب عبدالرحمٰن کوندو، سری نگر۔ کشمیر
۴- جناب سید طاہر محمود، نئی دہلی
۵- جناب سید اصغر علی، بمبئی

(۱)

۱۹؍مارچ ۱۹۸۰ء

باسمہ سبحانہ

برادر مکرم محترم جناب مولانا یعقوب کاوی صاحب(۱) احسن اللّٰہ الیکم و الینا

سلام و رحمت

گرامی نامہ مورخہ ۲۱-۲-۱۹۸۵ء کئی ہفتہ پہلے موصول ہو گیا تھا، طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے جواب اتنی تاخیر سے دے رہا ہوں، معذرت خواہ ہوں۔

(۱) میں 'المجمع الفقہی' کا رکن نہیں ہوں، رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کا رکن ہوں۔ اپنی معذوری کی وجہ سے دس سال سے اس کے
تھا، اس حال میں بالکل نہیں ہوں کہ ایسے سفر کر سکوں۔
ہمارے بر صغیر پر اور پورے عالم اسلام میں پڑ رہے تھے جسطر
نیم مردہ سے یہ کتاب لکھوائی اسی طرح انہی اثرات نے اس
آمادہ کر دیا۔ فروری مارچ ۸۵ء کا الفرقان آج یا کل انشاء اللہ ڈاک سے روانہ ہوگا، اس سے اس اجمال کی تفصیل معلوم ہو جائے گی۔

(۲) دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے کتاب کو غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو کر دوسرا چھپ گیا ہے۔ پاکستان میں میری اجازت سے بلکہ میری خواہش پر ایک ادارہ نے اسکو چھاپا تھا، لکھا ہے کہ ڈھائی ہزار چھاپی تھی، تین ہفتہ میں ختم ہو گئی، وہاں بھی دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی اسکو میرے لئے وسیلۂ مغفرت بنائے۔

(۳) شیعہ اثنا عشریہ کے کفر و ارتداد پر اب سے قریباً ساٹھ سال پہلے ایک فتویٰ(۲) کی شکل میں شائع ہوا تھا اس پر اس وقت کے ہمارے تمام اکابر کی تصدیق و توثیق ہے۔ ارادہ ہے کہ ایک مقدمہ اور کچھ اضافہ کے ساتھ اسکو پھر شائع کیا جائے۔ اس دور کے ہمارے علماء کو بھی اسکا علم نہیں ہے۔ دعاؤں کا محتاج اور دعا گو ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

---

(۱) ڈیوزبری، یارک شائر۔ انگلینڈ (۲) لفظ نہیں پڑھا گیا

(۲)

محمد منظور نعمانی
۲۷؍جون ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ
برادرم مکرم ومحترم ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی صاحب(۱)
احسن اللّٰہ تعالیٰ الیکم و الینا
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عنایت نامہ مورخہ ۲۹؍رمضان المبارک (۱۶؍مئی) قریباً ایک مہینے پہلے موصول ہو گیا تھا اس سے بہت کچھ وہ معلوم ہوا جو معلوم نہ تھا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

آپ نے میری کتاب ''ایرانی انقلاب'' کے بارے میں جو اظہار خیال فرمایا ہے اس سے فطری طور پر مسرت ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہیکہ جس میں انکسار کو ذرہ برابر دخل نہیں کہ میں فطری طور پر مصنف اور صاحب قلم نہیں ہوں، ادیب بھی نہیں ہوں، میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت ہی محدود ہے، روزمرّہ کی بول چال میں جو الفاظ استعمال کرتا ہوں وہی تحریر میں استعمال کرتا ہوں، جب کسی چیز کا داعیہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور اسکو ضروری سمجھتا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اسکی مدد سے کچھ ہو جاتا ہے۔ خاصکر اس کتاب کا معاملہ یہ ہے کہ میں نے یہ ایسی حالت میں لکھی کہ ہائی بلیڈ پریشر اور بعض دوسرے امراض میں ابتلا کیوجہ سے لکھنے کے قابل نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا شدید داعیہ دل میں پیدا فرمادیا تھا اور اسی حال میں یہ کتاب لکھی ہے مقصد صرف یہی تھا کہ سنّیوں کی ناواقف دنیا خاصکر ہمارے علماء شیعیت کی حقیقت سے واقف ہو جائیں کیونکہ یہ بات آنکھوں کے سامنے آگئی تھی کہ ایرانی انقلاب کے بعد سے شیعیت ایک زندہ دعوت و تحریک بن گئی ہے اور پورا عالم اسلام اور خاصکر حرمین شریفین ان کا اولیں نشانہ ہیں۔ ہاں دعا کا اہتمام بھی نصیب رہا، میں تمنا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کتاب کو یہ مقبولیت ہوگی، معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اشاعت کے بعد دو سال سے کم عرصہ میں پاکستان میں مختلف اداروں اور مکتبوں کی

---

(۱) ڈربن یونیورسٹی ،ڈربن، ساؤتھ افریقہ۔ افسوس کہ مکتوب الیہ حال ہی میں انتقال فرماگئے۔ یہ ابتداء میں بہت پُرجوش حامیٔ ''انقلاب ایران'' تھے۔ تبدیلی کس طرح آئی اس کا علم نہیں ہو سکا۔ شاید اسی کتاب کا اثر ہو، جیسا کہ اور بہت لوگوں پر ہوا۔

طرف سے اور اہل خیر حضرات کی طرف سے دو لاکھ سے زیادہ اسکے نسخے شائع ہوئے۔ اس سے اپنے بارے میں بفضلہٖ تعالیٰ کوئی خوش فہمی نہیں ہوئی۔ میں اپنا حال جانتا ہوں اسلئے اسکو منجانب اللہ سمجھا (وما بکم من نعمۃ فمن اللہ)

(۳)

۱۹ مارچ ۱۹۸۸ء

باسمہ سبحانہٗ وتعالیٰ

مخلص محترم جناب عبدالرحمن کوندو صاحب!

سلام ور

خدا کرے آپ ہر طرح بعافیت ہوں۔

قریباً ایک مہینہ ہوا یا اس سے بھی کچھ زیادہ مدر

مولانا رحمت اللہ میر صاحب نے اطلاع دی تھی کہ یہاں کشمیر میں پر چھاپہ مار کر میری کتاب "ایرانی انقلاب خمینی اور شیعیت" اور مولانا علی میاں کی کتاب "دو متضاد تصویریں" کے نسخے پولیس نے اٹھالئے اور ضبط کر لئے۔

مولوی رحمت اللہ میر صاحب نے اس اطلاع کے ساتھ علماء کے ایک اجتماع کی کاروائی اور اس سلسلہ میں ایک تجویز یا میمورنڈم بھیجا تھا۔

یہاں جب اطلاع پہونچی تو مولانا علی میاں نے اس سلسلہ میں میر واعظ فاروق صاحب کو خط لکھا، جسکے جواب کا انتظار رہا۔ آج سے دو تین دن ہی پہلے مجلس مشاورت کا ایک جلسہ تھا، مولانا علی میاں تشریف لے گئے تھے آج ہی واپس آئے ہیں انھوں نے مجھے فون پر بتلایا کہ میر واعظ مولانا فاروق صاحب بھی جلسہ میں شرکت کیلئے تشریف لائے تھے میں نے ان سے اپنے خط کا ذکر کیا انھوں نے بتلایا کہ آپ کا خط مجھے نہیں ملا اصل معاملہ کے بارے میں انھوں نے بتلایا کہ پولیس میں جماعت اسلامی کے حلقہ کا جو عنصر ہے یا جو شیعہ افسر ہیں انھوں نے یہ کاروائی بطور خود کی ہے۔ حکومت کی سطح پر اس طرح کی کوئی کاروائی نہیں ہوئی، یہ بھی کہا کہ اب میں جا کر اس سلسلہ میں کوشش کروں گا۔

مولانا رحمت اللہ میر صاحب وغیرہ بعض حضرات کے خطوط سے قریباً ایک مہینہ پہلے جب میرے علم میں یہ بات آئی تھی تو خیال تھا کہ آپ بھی مجھے تحریر فرمائیں گے اور اس سلسلہ میں آپ حضرات نے کوئی کوشش فرمائی ہوگی، میں اس وقت سے برابر آپکے عنایت نامہ کا منتظر رہا گمان ہے یہ کہ آپ نے تحریر فرمایا ہوگا جو ڈاک کی بد نظمی کے نتیجہ میں مجھ تک نہیں پہونچ سکا۔

بہر حال یہ عریضہ اس لئے لکھا رہا ہوں کہ اس سلسلہ میں جو کاروائی کی گئی ہو اس سے مطلع فرمایا جائے یہ یقین ہے کہ آپ نے اور آپ جیسے حضرات نے کوئی کوشش ضرور فرمائی ہوگی۔

امید ہے کہ الفرقان برابر نظر سے گذرتا ہوگا اور مارچ کے شمارے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے الفرقان کی خصوصی اشاعت "خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ"کو، ویسی ہی مقبولیت عطا فرمائی جیسی میری کتاب "خمینی اور شیعیت" کو عطا فرمائی گئی تھی، خود مجھ کو اسکی توقع نہیں تھی کیوں کہ تکفیر کے فتوے بہت بدنام ہو چکے ہیں، میں نے تو اپنا دینی اور ایمانی فرض سمجھ کر کیا تھا اور خیال تھا کہ بہت سے اپنے بھی شاید اسکو پسند نہ کریں لیکن اللہ کی شان میری پہلی کتاب "ایرانی انقلاب خمینی اور شیعیت" کی اشاعت پر تو ملامت اور گالیوں کے سینکڑوں خطوط آئے تھے، جو زیادہ تر جماعت اسلامی کے حلقہ کے لوگوں کے تھے اور چند شیعہ صاحبان کے بھی، لیکن اِس خاص نمبر کی اشاعت پر آج تک ایک خط بھی کسی صاحب کا نہیں آیا، جنھوں نے ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا ہو، یہ سب من جانب اللہ ہے، میں تو سمجھتا تھا کہ اس کی اشاعت پر ملامت کے تیروں کی مجھ پر بوچھار ہوگی، لیکن جیسا کہ عرض کیا اس طرح کا ایک خط بھی کسی کی طرف سے آج تک بھی نہیں آیا، فللّٰہ الحمد و لہ الشکر۔

بشرط ملاقات و یاد و سہولت مولانا مسعودی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، اُن سے اور آپ سے بھی دعا کی درخواست۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
محمد منظور نعمانی
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود قاسمی

(۴)

عزیز مکرم ڈاکٹر طاہر محمود(۱) احسن اللّٰہ تعالیٰ الیکم والینا
سلام ورحمت

خدا کرے آپ ہر طرح بعافیت ہوں۔

میں آپ سے واقف ہوں اور آپ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ آپ کے والد صاحب مرحوم ومغفور کے ذریعہ آپ کے جو حالات معلوم ہوتے رہتے تھے وہ بھی حافظہ میں ہیں۔

امید ہے کہ آپ مجھ سے واقف ہوں گے اور میں آپ کو
میں مریض ہوں۔ شروع دسمبر سے علالت شدید ہو گئی تھی
لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور کچھ اور مہلت دیدی۔ وہی ر
واستغفار کے خاص اہتمام کے ذریعہ اپنی زندگی کی تقصیرات
کی توفیق عطا فرمائے جو میرے لئے آخرت میں مغفرت ورحمت ...

میں اسوقت یہ خط ایک خاص مسئلہ سے متعلق لکھارہا ہوں۔ خود لکھنے کے قابل نہیں ہوں، پچھلے دنوں شدید علالت کے دور میں ایک عزیز ایرانی حکومت کی طرف سے تہران سے نکلنے والا رسالہ 'راہ اسلام' لائے اور بتایا کہ اسمیں انجم قدر صاحب کے نام آپ کا ایک خط شائع ہوا ہے وہ ان عزیز نے مجھ کو پڑھ کر بھی سنایا۔ اس وقت ارادہ کر لیا تھا کہ اگر زندہ رہا تو آپ کو اس سلسلہ میں کچھ لکھوں گا۔

غالباً آپ کے علم میں نہ ہو گا کہ گذشتہ دو تین سالوں میں اثنا عشری مذہب کی حقیقت اور اسکے بارے میں متقدمین ومتأخرین علماء کرام کے موقف سے عام مسلمانوں اور خاص کر عصر حاضر کے علماء کرام کو واقف کرانے کی کوشش ایک دینی فریضہ سمجھ کر اس عاجز نے کی ہے۔

خود میرے لئے اسکا محرک کیا ہوا اور میں نے اسکو کیوں اپنا دینی فریضہ سمجھا یہ آپ کو الفرقان کے ان دو خصوصی شماروں سے معلوم ہو جائے گا جو میں آپ کو انشاء اللہ بھجواؤں گا، میں آپ کو یہ زحمت دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان دونوں شماروں میں جو کچھ میرے قلم سے لکھا گیا

---

(۱) حال چیئرمین اقلیتی کمیشن دہلی۔

ہے آپ اسکو بغور ملاحظہ کریں اور بغیر اس لحاظ کے کہ میری عمر زیادہ ہے اور بغیر اس تعلق کے لحاظ کے جو آپ کے والد مرحوم و مغفور کا مجھ سے تھا، آپ کو جو غلطی نظر آئے بے تکلف اس کی نشاندہی کریں۔ ان دونوں شماروں میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اسمیں بنیادی باتیں یہ ہیں۔

۱- کفر و اسلام کی حقیقت اور ان کے درمیان حد فاصل۔ اس بارے میں میں نے جو لکھا ہے اسمیں اگر آپ غلطی محسوس کریں تو ضرور نشاندہی کریں۔

۲- میں نے اثنا عشریہ کی بنیادی کتابوں اور اسکے مستند ترجمانوں کی عبارتیں نقل کر کے ان کے صرف تین عقیدوں پر گفتگو کی ہے۔ (۱) شیخین (حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ) کے مومن ہونے سے انکار اور کفار و مشرکین کی طرح ان کے "مخلد فی النار" ہونے کا عقیدہ۔ (۲) قرآن مجید کے محرّف ہونے کا عقیدہ۔ (۳) یہ عقیدہ کہ امامت نبوت سے بالاتر ہے اور ہمارے بارہ اماموں کا درجہ تمام انبیاء سابقین سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

یہ تینوں عقیدے تمام علماء امت کے نزدیک موجب کفر ہیں۔ ان میں سے پہلے اور آخری عقیدے کا زمانۂ حاضر کے اثنا عشریہ کو بھی انکار نہیں ہے۔ ان کے علماء مجتہدین ان دونوں عقیدوں کے بارے میں متفق ہیں۔ ہاں! تحریف قرآن کے عقیدہ کا ہمارے دور کے اکثر علماء شیعہ انکار کرتے ہیں۔ لیکن ان کے علمائے متقدمین میں صرف چار وہ ہیں جنھوں نے عقیدۂ تحریف سے انکار کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ کو الفرقان کے شماروں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ خود ان کے اکابر علماء و مصنفین نے اسکا اقرار کیا ہے کہ ان حضرات کا انکار مصلحت کی بنا پر تقیہ کے طور پر تھا۔

الفرقان کے ان شماروں میں آپ یہ بھی ملاحظہ کریں گے کہ اثنا عشریہ، حضرات خلفاء ثلاثہ اور ان کے رفقاء صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کافر و منافق یا کم سے کم فاسق اور ظالم و غاصب اور دنیا پرست ہونے کا جو عقیدہ رکھتے ہیں اس عقیدہ کیساتھ از روئے عقل بھی یہ بات ناممکن ہے کہ وہ قرآن کو تحریف سے محفوظ مان سکیں اور ہماری آپ کی طرح قرآن پر ان کا ایمان ہو۔ کیوں کہ یہ انکو بھی مسلّم ہے کہ موجودہ قرآن کو انہی نے مرتب اور شائع کرایا ہے۔

یہاں جو کچھ مختصر طور پر میں نے لکھا ہے آپ اسکو انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ الفرقان کے شماروں میں پڑھیں گے۔ میری ان باتوں میں جہاں آپ کو غلطی نظر آئے اسکی ضرور نشاندہی کریں۔ میں بہر حال ایک بشر ہوں، مجھ سے غلطی ممکن ہے، اگر میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے اس بارے میں غلطی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یقین کیساتھ امید ہے کہ

میں آپ کی نشاندہی کے شکریہ کے ساتھ الفرقان میں اپنی غلطی کا اقرار واعتراف اور اس سے رجوع شائع کردوں گا۔ الفرقان کی طویل زندگی میں کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔

میں اِس حال میں اسوقت نہیں ہوں کی کسی سے بھی اس مسئلہ پر کوئی بحث کر سکوں اور اس تحریر کا مقصد ہرگز بحث ومباحثہ نہیں ہے، بلکہ صرف یہی چاہتا ہوں کہ آپ اگر غلطی محسوس کریں تو اسکی نشاندہی کردیں، امید ہے کہ آپ کی مختصر تحریر بھی انشاء اللہ میرے لئے کافی ہوگی۔

الفرقان کے جو خصوصی شمارے آپ کو بھیجے جارہے ہیں جنکا براہ راست تعلق تکفیر کے مسئلہ سے ہے ان کے مطالعہ سے یہ بھی آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلسلہ میں سب سے پہلے میں نے اس موضوع سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ اسمیں صرف اثنا عشریہ کی بنیادی اور مستند کتابوں سے مذہب شیعہ کو پیش کیا گیا تھا۔ خمینی صاحب کے ...
ان کی کتاب ہی سے لکھا گیا تھا۔ اسمیں میں نے شیعہ مذہب
کی تردید بھی نہیں کی تھی بس صرف خاص کر تعلیم یافتہ اہل
کیلئے ان چیزوں کو پیش کردیا گیا تھا۔ آپ اگر اسکا مطالعہ کر...
مل جائے گی ورنہ لکھدیا جائے میں انشاء اللہ یہاں سے بھجوادوں گا۔ ...
بھی مطالعہ فرمائیں لیکن الفرقان کے ان دو شماروں کے مطالعہ کے بعد۔

اگر ایرانی حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل آپکی نظر سے گزرتے ہونگے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اس عاجز اور محترم مولانا علی میاں کے بارے میں مسلسل پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ یہ دونوں سعودی حکومت کے ایجنٹ ہیں جیسا کہ مختلف لوگوں نے مجھ سے بیان کیا ہے۔

امید نہیں ہے کہ آپ اس طرح کی بدگمانی کریں گے لیکن احتیاطاً آپکو لکھتا ہوں آپکو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ سعودی عربیہ ہی میں نہیں بلکہ تمام خلیجی حکومتوں میں شیعیت کے خلاف تقریر و تحریر کی سخت ممانعت ہے۔ میری کتاب جسکا میں نے اوپر ذکر کیا اسکا داخلہ سعودی مملکت میں گذشتہ سال تک ممنوع تھا اور خلیجی ممالک میں اب بھی ممنوع ہے۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

شیعہ حضرات کی جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے میرا اندازہ ہے کہ وہ آپکو دہلی

لائبریریوں میں آسانی سے مل جائینگی۔ میرے پاس وہ سب موجود ہیں ہر حوالہ دیکھا جاسکتا ہے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

دعاگو اور دعاؤں کا محتاج

محمد منظور نعمانی

(بقلم عبید الرحمن سنبھلی)

(۵)

محمد منظور نعمانی

۲۴ر ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ

باسمہ سبحانہ وتعالی

عنایت فرمائے بندہ جناب سید اصغر علی صاحب(۱)

سلام ورحمت!

اب سے قریباً پچاس سال پہلے پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کا اردو ایڈیشن شائع ہوا تھا، میں نے اسی زمانے میں اسکو دیکھا تھا، شائد آپکو معلوم ہو جواہر لال نہرو لامذہب تھے، انھوں نے اپنی اس سوانح حیات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندو مذہب... عجیب مذہب ہے، اس سے کسی طرح پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، میں کہتا ہوں کہ میں کسی مذہب کو نہیں مانتا، ہندو دھرم کو بھی نہیں مانتا، لیکن میں پھر بھی ہندو ہوں۔

واقعہ ایسا ہی ہے، سناتن دھرمی جنکا دین و مذہب مورتی پوجا (بت پرستی) ہے وہ بھی ہندو، اور آریہ سماج جو مورتی پوجا کا کھنڈن کرتے ہیں اور اسکو مہاپاپ سمجھتے ہیں، وہ بھی ہندو۔

چار ویدوں کو خدا کی الہامی کتاب ماننے والے آریہ سماجی بھی ہندو اور ان ویدوں کو خرافات کا مجموعہ کہنے والے جینی بھی ہندو، الغرض ہندو ہونے کیلئے کوئی عقیدہ ضروری نہیں، آپ مذہب اسلام کو بھی ہندو دھرم ہی کی طرح سمجھتے ہیں کہ بارہ اماموں کو سب نبیوں سے افضل ماننے والے شیعہ اور خاص طور سے خمینی بھی مسلمان ہیں اور اس عقیدے کی بنیاد پر انکو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھنے والے علماء بھی مسلمان ہیں، قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کی محفوظ کتاب مجید ماننے والے ہم لوگ بھی مسلمان ہیں اور اسکو محرف اور مبدل ماننے والے شیعہ بھی مسلمان ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ فاروق اور حضرت عثمانؓ اور دیگر اکابر صحابہ جنکے

(۱) بمبئی۔

مومن صادق اور جنتی ہونے کی شہادت قرآن مجید نے دی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں ان کے فضائل ومناقب بیان فرمائے اور ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی ان کو ایسا ہی سمجھنے والے ہم لوگ بھی مسلمان ہیں اور ان کو کافر ومنافق بتلانے والے خمینی اور ان کے ہم مذہب شیعہ بھی مسلمان ہیں۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کو (معاذ اللہ) کافرہ اور منافقہ کہنے والے اور لکھنے والے شیعہ بھی مسلمان ہیں اور قرآن پاک کے الفاظ میں ان کو امہات المومنین اور رسول اللہؐ کی پاک اور مقدس اور واجب الاحترام بیویاں ماننے والے سنّی بھی مسلمان ہیں۔

خمینی کو اتحاد اور وحدت اسلامی کا داعی وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جسکو اللہ نے دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والی عقل نہ دی ہو، سات آٹھ سال سے مسلسل عراق سے جنگ ہورہی ہے، جس میں دونوں طرف سے لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتر چکے

ہی کہتے تھے اور جنگ بندی کی ساری کوششیں صرف خمینی کی

ہے پھر ہر سال حج کے موقعہ پر خمینی کے بھیجے ہوئے ایرانی ح

فساد برپا کرتے ہیں اور اس سال جو فساد برپا کیا اس سب کا ذمہ

اسلامی کا علمبردار ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اس نے ہم کو دیکھنے والی

حقائق کو سمجھنے والی عقل بھی، آپ نے سکھوں کی مثال دی ہے کہ ہم مسلمانوں کو سکھوں سے سبق حاصل کرنا چاہئے، کیا کوئی ہوش وعقل رکھنے والا ایسی بات کہہ سکتا ہے؟ سکھ کیا کررہے ہیں؟ وہ اپنے پڑوسی بے قصور ہندوؤں کو قتل کررہے ہیں، لوٹ مار کررہے ہیں، بسوں کو روک روک کر ہندو مسافروں کو اتار کر ان کو گولیوں سے موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جو سکھ ان کے اس قتل وغارتگری میں ان کے ساتھ نہیں ہے، ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں.

آپ کا مشورہ یہ کہ ہم مسلمان بھی یہی راستہ اختیار کریں، جو شخص دین اسلام کی حقیقت اور اسکے حدود سے اتنا ناواقف ہو اور عقل وخرد سے اتنا محروم ہو وہ اسکا مستحق ہے کہ اسکو مشورہ دیا جائے کہ وہ دین اسلام کی حقیقت اسکی حدود، اور احکام کا علم حاصل کرلے، اور اسکے لئے عقل سلیم کی دعا کی جائے۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

محمد منظور نعمانی. لکھنؤ
۱۵ مارچ ۱۹۸۸ء

(۱)

با سمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادر مکرم(۱) ! احسن اللّٰہ تعالیٰ الیکم والینا ووفقنا لما یحبہ ویرضاہ
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا ملفوف مکتوب مورخہ ۱۸ر فروری وقت پر مل گیا تھا، اور میں نے کسی سے
پڑھوا کر سن بھی لیا تھا لیکن جو میرے عزیز خطوط کے جوابات لکھتے
وطن ہفتہ عشرہ کی نیت سے گئے تھے اللہ کی مشیت کہ وہاں جا
بعد پرسوں واپسی ہوئی ہے، اس زمانہ کی ڈاک جمع ہوتی رہی،
میں رکھا رہا، کل سے جمع شدہ ڈاک کے جوابات ان سے لکھا رہا
ہوگی، امید ہے کہ معذور تصور کریں گے

آپ نے میری لکھی ہوئی بعض تحریروں کا حوالہ دیکر میرے بارے میں جس حسنِ ظن کا اظہار فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس طرح کی تحسیات سے اس عاجز کو اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی، میں فطری طور پر صاحبِ قلم اور مصنف نہیں ہوں جو کچھ لکھا گیا وہ اللہ تعالیٰ نے لکھوادیا۔ فلہ الحمد ولہ الشکر۔

کرم نامہ میں دار العلوم دیوبند سے متعلق میرے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا اور دریافت کیا ہے اس سے اندازہ ہوا کہ بہت سے دوسرے حضرات کی طرح آپ بھی واقعات سے بہت ہی ناواقف ہیں، اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے۔

میں یہ سطریں لیٹے لیٹے اس حال میں لکھا رہا ہوں کہ گذشتہ رات نیند بہت کم آئی صبح اس کمی کو پورا کرنے کیلئے خواب آور دوا کھائی، کوئی اثر نہیں کیا، صفائی سے کہنا ضروری سمجھتا ہوں اگر آپ کے بارے میں حسن ظن نہ ہوتا تو دار العلوم کے بارے میں ایک لفظ بھی لکھا نا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن چونکہ خاص طور سے آپ کے اس مضمون کی وجہ جو آپ نے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات پر لکھا ہے، آپ کے بارے میں ایک اچھا تصور

(۱) مولانا احمد نصر بنارسی، بنارس، یوپی۔

وقت اب تک نہ آسکا۔ پچھلے دنوں جناب کی شدید علالت اور علاج کیلئے دہلی ہسپتال میں داخلہ کی خبر اخبار میں پڑھی تھی تو ارادہ کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپکو صحت عطا فرمائے تو اب کسی وقت کا انتظار کئے بغیر ہی عریضہ لکھوں گا۔ کل ایک صاحب ملے جو حال ہی میں دیوبند گئے تھے اور جناب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے انھوں نے جناب کے ضعف و نقاہت کا حال بتایا تو اب وہ سب کچھ لکھنے کا ارادہ ترک کر کے جو لکھنا چاہتا تھا اسوقت صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دارالعلوم کے سلسلہ میں بدقسمتی سے جو اختلاف ہمارے درمیان پیدا ہوا جسکا کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مجلس شوریٰ کے ایک رکن کی حیثیت سے میرا بھی اس میں حصہ رہا، اس سلسلہ میں میں نے جو لکھا، یا عملاً کیا اگرچہ یہ سمجھ کر لکھا، یا کیا کہ یہ دارالعلوم اور جماعت کا مجھ پر حق ہے اور اگر میں نے اس میں کوتاہی کی تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اسکی جوابدہی کرنی پڑیگی ——

تاہم میں بشر ہوں، خطا اور نفس و شیطان کے شر سے محفوظ نہیں ہوں (وما ابرئ نفسی ان النفس لامّارۃ بالسوء) بالکل ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں جناب کے حق میں مجھ سے تعدّی (زیادتی) ہوئی ہو۔ اس کے لئے عاجزانہ طور پر معافی کا طالب و سائل ہوں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم" کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاف اور آخرت کے مواخذہ سے بری فرما کر اس عاجز پر احسان فرمائیں گے۔

اس اختلاف کے زمانے میں بھی اپنے لئے باعث خیر و سعادت سمجھ کر جناب کے لئے بھی دعا کرتا رہا ہوں اور خود دعا کا محتاج و طالب ہوں۔ مکرر عرض ہے کہ جناب کے ضعف و نقاہت کا جو حال معلوم ہوا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس وقت صرف اتنا ہی عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں ۔اللہ تعالیٰ جناب کو اپنے فضل و کرم سے صحت و توانائی عطا فرمائے تو انشاء اللہ اصلاح ذات البین ہی کی غرض سے وہ چند باتیں عرض کروں گا جو عرض کرنا چاہتا تھا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اس کا موقع عطا فرمائے۔ اور اس کو میرے لئے جناب والا کے لئے اور دارالعلوم اور پوری جماعت کے لئے نافع بنائے۔ وما ھو علی اللہ بعزیز۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

(۳)

۱۴؍ جون ۱۹۸۸ء

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

برادر مکرم و محترم جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب(۱) !

احسن اللّٰہ تعالٰی الیکم و الینا

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ خدا کرے مزاج بعافیت ہو اور دار العلوم [illegible]
خیریت ہو، اسوقت تو دار العلوم میں داخلہ کا سلسلہ جاری ہو گا، اللہ
فرمائے۔

ماہ مبارک میں آپ کا عنایت نامہ مل گیا تھا جس سے [illegible]
کی حاضری کی سعادت کا حال معلوم ہو گیا تھا، میں نے اس کے
جس میں عرض کیا تھا کہ لکھنؤ تشریف آوری کا ارادہ جلدی نہ فرمایا جائے، میں [illegible]
تک زیادہ مصروف رہوں گا، اب تو شوال ختم ہو رہا ہے اور میری مصروفیت اب تک ختم نہیں ہو سکی، جس کام میں مشغول ہوں، اللہ تعالیٰ اسکو آسان فرمائے، انجام تک پہونچائے اور قبول فرمائے۔

پرسوں ہی جناب حاجی علاؤ الدین صاحب کے حادثۂ انتقال کی اطلاع ہوئی، اللہ تعالیٰ کامل مغفرت و رحمت سے نوازے، بہت ہی باتوفیق بندے تھے، ہر کار خیر میں پورے اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ حصہ لیتے تھے، برسوں سے قلب کے مریض تھے، لیکن اسی حال میں دینی تقاضوں پر برابر سفر کرتے تھے، اُن کی رحلت کا حادثہ دار العلوم کے لئے بھی بڑا حادثہ ہے، میرا ان سے تعلق قریباً چالیس سال سے تھا، میں نے ان کو بہت ہی مخلص اور بے مثال آدمی پایا، عالم فاضل کچھ نہ تھے، عامی تھے، لیکن دین کا فہم اور عام معاملہ فہمی بھی اللہ تعالیٰ نے خاص درجہ کی عطا فرمائی تھی، ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ بمبئی اور گجرات کے اپنی جماعت کے تمام اہل خیر و مخلصین کا اعتماد ان کو حاصل تھا۔

---

(۱) مہتمم دار العلوم دیوبند۔

جب تک میں سفر سے معذور نہیں تھا بعض سالوں میں کئی کئی دفعہ بمبئی جانا ہوتا تھا، اب قریباً بارہ تیرہ سال سے بمبئی جانا نہیں ہو سکا اسلئے میں نہیں جانتا کہ ان کے حلقہ کے کون صاحب انکا بدل ہو سکتے ہیں، دارالعلوم کے لئے یہ مسئلہ بہت اہم ہے، میرا خیال ہے کہ اس بارے میں سب سے زیادہ رہنمائی مولانا محمد عمر پالنپوری صاحب سے حاصل ہو سکے گی، اللہ تعالیٰ دارالعلوم کو ان کا بہتر بدل عطا فرمائے۔

آپ سے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ پر کاموں کا بوجھ بہت زیادہ ہے، فطری طور پر کام اور فکر کا اثر صحت پر پڑتا ہے، کسی بھی مناسب آدمی کو منتخب کیجئے جو کاموں میں آپ کا معاون بن کر بوجھ ہلکا کر دے۔

میرا خیال ہے کہ شوال میں دارالعلوم میں آپ کی موجودگی خاص طور سے ضرور ہی رہتی ہے۔ انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں اُس کام سے فارغ ہو جاؤنگا، جس میں مشغولیت رہتی ہے اسکے بعد اگر آپ کے لئے لکھنؤ تشریف لانا آسان ہو تو ضرور تشریف لائیں۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ میری معذوری اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ سفر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، والحمد للہ علی کل حال۔

دارالعلوم کے حالات تو انشاء اللہ آپ کی تشریف آوری پر ہی معلوم ہو سکیں گے، حسبِ توفیق دعا کا اہتمام نصیب ہو جاتا ہے، خود دعاؤں کا سخت محتاج و طالب ہوں۔

والسلام
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۴)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
۵/ محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

محترمی و معظمی جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب زید مجدکم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دو تین دن پہلے مولانا اسعد میاں تشریف لائے تھے، ان سے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ شوریٰ کا اجلاس غالباً صفر کے پہلے ہفتہ میں ہو گا، کل دعوت نامہ۔ اطلاع نامہ بھی پہونچ گیا۔

مستقل ضعف اور امراض و عوارض کے علاوہ ادھر کئی دن سے طبیعت خراب چل رہی ہے، اسلئے اس وقت صرف اتنا ہی لکھتا ہوں کہ ایجنڈے میں ایک دفعہ یہ بھی لکھ دی جائے کہ محمد منظور نعمانی کا خط اور قابل غور تجویز۔

میں جلدی ہی وہ خط لکھا سکوں گا —— میرے سامنے کوئی نئی بات بھی نہیں ہے، لیکن دارالعلوم کے حق میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسے وہ ارکان حضرات جو سفر کر کے اجلاس شوریٰ میں شرکت سے معذور ہو چکے ہیں وہ مستعفی ہو کر جگہ خالی کر دیں اور باہم مشورہ اور غور و فکر سے ان کی جگہ دوسرے ارکان منتخب کر لئے جائیں اور دارالعلوم کی مصلحت کا اگر یہ تقاضا ہو (اور غالباً ہو گا) کہ ان کا تعلق دارالعلوم سے باقی رہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ایسے حضرات ارکان کو مشیر خصوصی یا مشیر اعزازی یا سرپرست اعزازی بنادیا جائے۔

یہ عذر صحیح نہیں ہے کہ دستور میں اس عہدہ کا کہیں ذکر نہیں۔

عرض کر چکا ہوں، مجلس شوریٰ کے اختیارات کے آخری دفعہ

پورا اختیار دیا گیا ہے —— اس سے پہلے مجلس نے آپ کو مد

بعد مولانا عبد المالک کاندھلوی اور مولانا عبد القادر آزاد کے

نے کی تھی اس میں مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کو

دستور میں نہ مددگار مہتمم کا کوئی عہدہ ہے اور نہ صدر مہتمم کا —— یہ دونوں فیصلے اسی اختیار کی بنا پر کئے گئے تھے جو دستور میں مجلس کے اختیارات کے آخری دفعہ میں دیا گیا ہے۔

میں نے مولانا اسعد میاں سے اس بات کا تفصیل سے ذکر کیا تھا اور اصرار کیا تھا۔ اس سلسلۂ گفتگو میں مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ حکیم عبد الجلیل صاحب سے بھی استعفا لیا جا سکتا ہے۔

مجلس شوریٰ کے ہونے والے اجلاس میں مرحوم و مغفور حاجی علاؤالدین صاحب کی جگہ رکن کے انتخاب کا مسئلہ بھی سامنے آئیگا، میں پہلے بھی غالباً آپ کو لکھ چکا ہوں کہ اس سلسلہ میں مولانا محمد عمر پالنپوری صاحب سے ضرور رہنمائی حاصل کی جائے، میرا ارادہ بھی خط کے ذریعہ مولانا موصوف کی رائے دریافت کرنے کا ہے۔

آپ نے اپنے گرامی نامہ میں لکھنؤ تشریف آوری کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا، اگر تشریف آوری ہوئی تو تفصیلی باتیں ہو سکیں گی۔

دارالعلوم کی برابر فکر رہتی ہے، اب اس وقت اس عاجز کی سب سے بڑی فکر یہی ہے

لیکن یہ معذور، دور افتادہ بس آپ حضرات کو مشورہ ہی دے سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہی کر سکتا ہے ——— دار العلوم کے لئے اور آپ کے لئے دعا کی توفیق برابر ملتی رہتی ہے لیکن اللہ پاک کی ذات بڑی بے نیاز ہے، پھر بھی اسکی رحمت اور اسکی صفت، بندوں کی دعاؤں کی استجابت پر نظر رکھتے ہوئے ہمکو امید کے ساتھ دعا کرنی چاہئے، انہ سمیع مجیب الدعوات خود دعاؤں کا سخت محتاج و طالب ہوں۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۵)

۱۶؍ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
۲۹؍ ستمبر ۱۹۸۸ء

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

محترمی و معظمی مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب! احسن اللّٰہ تعالی الیکم و الینا

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

گرامی نامہ مورخہ ۱۷؍ ستمبر ر ۴؍ صفر المظفر موصول ہوا، اس میں جو کچھ تحریر فرمایا گیا ہے علم میں آیا۔

میں کئی سال سے آپ حضرات سے اصرار کر رہا ہوں کہ جو ارکان اپنی معذوریوں کی وجہ سے دار العلوم کی مجلس شوریٰ میں شرکت نہیں کر سکتے اُن سے استعفا حاصل کر کے ان جگہوں پر ارکان کا انتخاب کر لیا جائے، میں نے اب سے دو تین سال پہلے جب استعفا پیش کیا تھا تو غالبًا یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ استعفا منظور ہو جانے کے بعد میں خود ان حضرات سے اسکے لئے درخواست کر سکوں گا، اور میں ایسا ہی کرتا لیکن جب تک میں خود معذوری کے باوجود رکن ہوں مجھے کسی دوسرے سے درخواست کرنے کا کوئی جواز نہیں، اس لئے بھی میں مناسب سمجھتا ہوں کہ میرا استعفا قبول فرما لیا جائے۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ مولانا مفتی منظور احمد صاحب کانپور واپس ہونے کے بجائے رائے پور تشریف لے گئے، اس طرح ان کو بذریعہ کار رائے پور سے لایا جا سکا ورنہ مجلس تو ملتوی ہو چکی تھی۔

صورت حال یہ ہے کہ میں اور میری طرح کم سے کم تین حضرات اور ہیں جو معذوری کیوجہ سے دیوبند تک سفر نہیں کر سکتے اور دو تین حضرات ایسے ہیں جن کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ وہ شرکت کا ارادہ ہی نہیں فرمائیں گے، ایسی صورت میں ممکن ہے کہ بار بار کورم پورا نہ ہونے کیوجہ سے التواء کا فیصلہ کرنا پڑے اور ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بہت نامناسب اور موجودہ نظام کے لئے بہت مضر ہے ـــــ اب میری اصرار کے ساتھ رائے ہے کہ شوریٰ کے آئندہ جلسہ سے پہلے کم از کم دو حضرات کا استعفا حاصل کرنے کی کوشش کرلی جائے جو امید ہے کہ بخوشی اس کے لئے راضی ہو جائیں گے، اور آئندہ شوریٰ کے ایجنڈے میں ان کے استعفا اور بصورت منظوری ان کی جگہ انتخاب کا مسئلہ بھی درج ہو، اگر ایسا نہیں ہوا تو میں دارالعلوم کی خیر خواہی کا حق اور اپنا فرض سمجھونگا کہ اپنی طرف سے قطعی طور پر استعفا پیش کردوں اور اس کے ساتھ اپنے جیسے دو تین معذور حضرات سے درخواست کروں اور ان کو اپنے استعفے کی فوٹو کاپی بھی بھیج دوں۔

مولانا غلام رسول خاموش صاحب کے انتخاب کی ا۔
غالباً لکھ چکا ہوں کہ میں خود ان صاحب سے واقف نہیں
علاؤالدین صاحب کے صاحبزادوں کے علاوہ بمبئی اور گجرات ۔
میں مشورہ حاصل کیا تھا، سب نے انھیں کا نام بتایا، اللہ تعالیٰ ان کے انتخاب و دارالعلوم ـــ ن میں خیر کا باعث بنائے۔

گرامی نامہ سے مقدمہ کی صورت حال معلوم ہوئی، کل ۲۸ر کو فریق ثانی کا جواب داخل ہو چکا ہوگا اور ۴ر اکتوبر کو انشاء اللہ بحث بھی ہو جائیگی، خدا کرے التواء نہ ہو، دارالعلوم کے لئے اور آپ کے لئے دعا کے اہتمام کی توفیق نصیب رہتی ہے، لیکن ہم عاجز بندے بس مانگ ہی سکتے ہیں، اور رب کریم کے کرم پر اعتماد کر کے پوری امید کے ساتھ مانگتے رہنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی فکر اور محنت و کاوش اور دعاؤں کو قبول فرمائے، فطری طور پر ظاہری اور باطنی قوتوں میں ضعف تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے، اب بس ایمان پر خاتمہ اور آخرت میں رحمت و مغفرت کی فکر ہے، اپنے کو بالکل خالی ہاتھ پاتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے امید ہے۔ آپ سے اسکے لئے خاص طور سے دعا کی درخواست ہے۔

والسلام
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۶)

۲۵؍ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

برادر معظم و محترم جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب!

احسن اللّٰہ تعالٰی الیکم و الینا

سلام و رحمت ______ خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

عنایت نامہ کل شام موصول ہوا، پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی، سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، محض اسکا فضل و کرم ہے وہی ادائے شکر کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ نے سفر بکار دار العلوم کیا اور مصارف سفر کی خطیر رقم کا بوجھ اپنے ہی اوپر ڈلا اگر چہ واقعہ یہ ہے کہ میں اگر مجلس شوریٰ میں شریک ہوتا تو میں بھی اصرار کے ساتھ یہی مشورہ دیتا کہ کم از کم ہوائی جہاز کا کرایہ ضرور دار العلوم سے لیا جائے، لیکن آپ نے جو کچھ کیا اور لوجہ اللہ ہی کیا وہ بہت ہی اچھا کیا، اللہ تعالیٰ اس قربانی کو قبول فرمائے۔

میری رائے یہ ہے کہ آپ کے ذریعہ سے نہیں مولانا اسعد میاں کے ذریعہ یہ بات سب کے علم میں آئے یہ ان نیکیوں میں سے ہے جن کا اظہار اس زمانے میں افضل بلکہ ضروری ہے تاکہ دوسروں کو بھی اس رویہ کے اپنانے کی اور اس راستہ پر چلنے کی کسی درجہ میں رغبت اور ہمت ہو۔

دار العلوم کے غالبًا تیسرے مہتمم مولانا محمد منیر علیہ الرحمۃ کا واقعہ آپ کے علم میں ہوگا، اس کے بعد قریبًا ایک صدی پوری ہونے والی ہے، میرا خیال ہے کہ پوری اس صدی میں اس طرح کا واقعہ نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق آپ کو دنیا و آخرت میں اس کا صلہ عطا فرمائے۔

اس وقت خط لکھنے کا خاص محرک یہ بھی ہوا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں نے سفر سے پہلے آپ دونوں حضرات کی لکھنؤ تشریف آوری کیلئے لکھا تھا، آپ نے اس کا حوالہ دے کر تحریر فرمایا ہے کہ انشاء اللہ عید کے بعد جلدی ہی آپ دونوں حضرات تشریف لائیں گے۔

مجھے عرض کرنا ہے کہ اُس بات کے بارے میں اب جلدی نہیں ہے، اطمینان سے تشریف آوری کا پروگرام بنایا جائے، میں بھی بظاہر وسط شوال تک زیادہ مصروف رہوں گا۔

دعاؤں کا سخت محتاج ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کے لئے آپ کے حق کے مطابق دعا کا اہتمام اس بندۂ مسکین کو عطا فرمائے۔

غالب گمان ہے کہ برادر مکرم و محترم مولانا اسعد میاں مدنی اپنے معمول کے مطابق معتکف ہونگے، ان کی خدمت میں بھی بشرط یاد و سہولت سلام مسنون اور دعا کی درخواست، بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ بھی یہ عریضہ ملاحظہ فرمالیں۔

والسلام
استکتبہ محمد منظور نعمانی
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمد

(۷)

محمد منظور نعمانی
۱۰؍مارچ ۱۹۸۹ء؍ ۲ شعبان ۱۴۰۹ھ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ
برادر عزیز و مکرم مولانا رشید احمد الاعظمی صاحب (۱)!

احسن اللہ تعالیٰ الیکم والینا

سلام ورحمت ـــــ خدا کرے حضرت مولانا مدظلہ العالی کا مزاج گرامی اب بالکل بعافیت ہو، اور آپ سب حضرات بھی بخیر ہوں۔

عنایت نامہ مورخہ ۲۶؍رجب ۱۴۰۹ھ کل موصول ہوا۔ یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت مدظلہ کا مزاج گرامی اب بخیر ہے۔ (اس عریضہ کے کاتب عزیزم مولوی ضیاء الرحمٰن قاسمی سلمہ نے ابھی بتلایا کہ ان کو آج ہی باوثوق ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مدظلہ گورکھپور تشریف لے گئے ہیں، یہ معلوم کرکے مزید مسرت ہوئی کہ بفضلہٖ تعالیٰ اب اس حال میں ہیں کہ سفر فرما سکتے ہیں۔)

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا دعوت نامہ جو مہتمم صاحب نے ۲۱؍فروری کو روانہ

(۱) ابن حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مئو، یوپی۔

فرمایا تھا یہاں مجھے ۷؍مارچ کو ملا ہے، نہایت افسوس اور قلق ہے کہ میری معذوری اب اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ چند قدم چل کر بیت الخلاء پہونچنا بھی مشکل ہو گیا ہے، اپنی اس حالت کیوجہ سے گذشتہ دو سالوں کی کسی شوریٰ میں بھی شرکت نہیں ہو سکی، میری طرف سے حضرت مدظلہ سے عرض کیا جائے کہ ممکن ہو تو زحمت برداشت فرما کر شوریٰ میں شرکت کیلئے دیوبند کا سفر فرمالیا جائے ـــــ میں نے کل ہی مہتمم صاحب کو خط لکھایا ہے کہ وہ کسی مناسب آدمی کو خط لیکر حضرت کی خدمت میں مئو بھیج دیں جو حضرت کی مرضی کے مطابق سفر کا انتظام ریزرویشن وغیرہ کا نظم بھی کر سکے۔

معلوم ہوا ہے کہ مولانا عبدالحلیم صاحب زید مجدہم کی صحت کی خرابی اور ضعف کی وجہ سے شوریٰ میں شرکت کی بہت کم توقع ہے، ان کے بارے میں بھی میں نے مہتمم صاحب کو لکھا ہے۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب حضرات اکابر کی سرپرستی اور تعاون کے بڑے حاجت مند اور مستحق ہیں۔

دعوت نامہ حضرت کی خدمت میں پہونچ چکا ہو گا، شوریٰ کی تاریخ ۱۹؍۲۰؍۲۱؍شعبان مطابق ۲۸؍۲۹؍۳۰؍مارچ لکھی ہے۔

حضرت مدظلہ العالی کی خدمت میں سلام اخلاص ونیاز اور دعا کی درخواست ـــــ آپ سے بھی دعاؤں کا طالب ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مدظلہ کے اور آپ حضرات کے حق کے مطابق دعا کا اہتمام کما حقہ اس عاجز کو نصیب فرمائے اور قبول فرمائے۔

والسلام علیکم
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

نفیٔ ذات
اور
فکرِ آخرت

بنام

۱- حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم لاجپوری، راندیر
۲- حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی، پشاور
۳- حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی، پشاور
۴- مولانا جمیل احمد صاحب، حیدر آباد، دکن
۵- مولانا محمد یوسف لدھیانوی، کراچی۔ پاکستان
۶- جناب عبد الرشید صاحب، راولپنڈی۔ پاکستان
۷- حافظ محمد قطب الدین صاحب، بیلگام، کرناٹک
۸- " " " "
۹- " " " "

(۱)

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
۲۰/مارچ ۱۹۸۹ء

مخدومی و معظمی حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری
رادت فیوضکم و برکاتکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
قریباً دو ہفتے پہلے گرامی نامہ موصول ہو کر باعث شرف ہوا
حضرت! میں اس حال میں ہوں کہ آنے والے خطو
لکھانا ہو تو دوسروں ہی سے لکھاتا ہوں، خود چند سطریں لکھنا بھی
کے کاتب صاحب (جو یہ عریضہ لکھ رہے ہیں) ان دنوں اپنے وط
پر جو کچھ الفرقان کے لیے لکھانا تھا اس میں مصروف ہو گئے تھے اس
خطوط کے جواب میں تاخیر ہوتی رہی۔

آج جمع شدہ ڈاک کا جواب لکھانا شروع کیا ہے، پہلا عریضہ حضرت کی خدمت ہی میں لکھا رہا ہوں۔

گرامی نامہ سے جناب والا کا حال معلوم ہوا، الحمد للہ بڑا مبارک حال ہے۔ جسمانی ضعف اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے مطابق اس کے حکم ہی سے ہے "آنچہ از دوست می رسد نیکو است"۔

حضرت! میرا حال یہ ہے جیسا کہ غالباً پہلے بھی عرض کیا ہوگا، قریباً بارہ تیرہ سال سے بستر ہی میری مسجد ہے، اب سے چند مہینے پہلے تک جمعہ کے دن کسی طرح قریب کی مسجد تک چلا جاتا تھا اب اس سے بھی محرومی ہے۔

ادھر چند مہینے سے کھانسی بخار وغیرہ کی شکایت ہو گئی تھی، الحمد للہ اب نہیں ہے، البتہ ضعف خاصا باقی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خاصی عمر عطا فرمائی، جو کرنا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا، بڑی تقصیر رہی، بس ارحم الراحمین کی رحمت ہی سے امید ہے، اللھم ان مغفرتک اوسع من ذنوبی، ورحمتک

ارجیٰ عندی من عملی، ہی سہارا ہے۔

اب سب سے بڑی حاجت بس یہی ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں ایمان، اعمال مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت، نعمتوں پر شکر، گناہوں سے استغفار کے اہتمام اور عافیت سے پورے ہو جائیں، وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے اور ارحم الراحمین محض اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادیں۔

آپ سے بھی اسی دعا کا طالب اور سائل ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حق کے مطابق آپ کے لئے دعا کا اہتمام اس عاجز کو نصیب فرمائے۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۲)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

معظمی و محترمی مولانا محمد اشرف سلیمانی* صاحب دامت فیوضکم و برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے عریضہ کے جواب میں آخری گرامی نامہ غالباً اوائل رمضان المبارک میں مل گیا تھا جس میں جناب نے مطلع فرمایا تھا کہ اس عاجز نے جو عریضہ حضرت مولانا مفتی زین العابدین صاحب کے ذریعہ ارسال کیا تھا وہ بھی موصول ہو گیا تھا اس میں حضرت مولانا فقیر محمد صاحب دامت برکاتہم کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا تھا اس سے دل بے حد متاثر ہوا۔ بے تکلف عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ عام عادت کے خلاف اپنی اس کم نصیبی پر دیر تک روتا رہا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خود حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ اور انکے اکثر اجلہ خلفاء سے عقیدت و محبت اور نیاز مندانہ تعلق نصیب رہا اور انکی عنایتیں اور شفقتیں بھی بفضلہ تعالیٰ نصیب رہیں لیکن حضرت مولانا فقیر محمد صاحب دامت برکاتہم سے قریبی زمانے تک بالکل ناواقف رہا۔ اور اب سفر سے معذور ہو جانے کی وجہ سے امید بھی نہیں کہ حضرت

* پشاور، پاکستان۔

ممدوح کی خدمت میں حاضری اور زیارت نصیب ہو سکے۔
اسی کے ساتھ شدت سے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ ان سے غائبانہ بیعت (بیعت عثمانی) کی درخواست کروں عزیزم مولوی خلیل الرحمٰن سجاد سلمہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے تعلیمی قیام کے دوران حضرت کے بارے میں کچھ جانتے رہے اور صرف زیارت اور طلب دعا کیلئے انکی خدمت میں کبھی کبھی حاضر بھی ہوتے رہے۔ انہوں نے یہ بتلایا کہ حضرت کے مزاج پر اخفاء کا غلبہ ہے۔ بہت ہی کم لوگ ہیں جو انکو جانتے ہیں۔
میں نے ان سے مشورہ کیا کہ میں اس مقصد سے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھنا چاہتا ہوں وہ خود بھی آپ کا گرامی نامہ پڑھ کر بہت متاثر ہوئے تھے انھوں نے بتلایا کہ جدہ کے نور ولی خاندان کے بھائی حاجی محمد نور عبد القادر نور ولی اور حاجی محمد ولی عبد اللہ نور ولی حضرت ممدوح سے عقیدتمندانہ اور نیاز مندانہ تعلق رکھتے ہیں منورہ میں انہی حضرات کے "بستان" میں ہوتا ہے انکے ذریعہ
حسن اتفاق سے میرے ایک بہت ہی مخلص اور ... ۹ رمضان مبارک کو عمرہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے میں نے ...
لفافہ پر حضرت ممدوح کا اسم گرامی لکھ کر جدہ کے اپنے دوستوں کے پاس ان کے ذریعہ ... دیا۔ اور ان کو مکلف کیا کہ وہ میرا عریضہ حتی الوسع جلد ہی مدینہ منورہ حضرت مکتوب الیہ دامت برکاتہم کی خدمت میں پہنچا دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ عریضہ جلدی ہی حضرت ممدوح کی خدمت میں پہنچ جائیگا میں نے اس عریضہ میں اپنا حال لکھ کر غائبانہ بیعت کی درخواست کی ہے اور اسکا اظہار کر دیا ہے کہ اسوقت اسکا محرک آپ کا گرامی نامہ ہوا ہے۔
میں اب ضعف کے جس حال میں ہوں کچھ کرنے کے لائق تو نہیں ہوں۔ امید یہ ہے کہ اسطرح مجھے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے سلسلہ کی برکات سے بھی حصہ مل جائیگا۔ بفضلہٖ تعالی حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کی ارشادی تعلیمات سے مجھے مناسبت نصیب رہی ہے اور میں نے ان کو اپنے لئے شمع راہ سمجھا ہے۔
آپکا ممنون اور شکر گذار ہوں کہ آپ کے گرامی نامہ ہی نے یہ داعیہ پیدا کیا اور وہی اس کا محرک ہو۔ جزاکم اللہ تعالی کما یلیق بشانہ الکریم۔
امید ہے کہ یہ عریضہ ماہ مبارک کے عشرہ اخیرہ میں وصولیابی سے مشرف ہو جائیگا۔
کراچی کے ایک دوست آئے ہوئے ہیں کل واپسی ہے۔ انکے حوالہ کر دینے کا ارادہ ہے۔ وہ انشاء

اللہ لاہور یا کراچی پہنچ کر حوالہ ڈاک کر دینگے۔ دعاؤں کا بہت ہی محتاج و طالب ہوں۔
والسلام

(۴)

معظمی و مخدومی حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی صاحب!
دامت فیوضکم و برکاتکم
وعلیکم السلام ورحمت اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ ومرضاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۵ / رجب المرجب ۱۴۰۹ھ موصول ہو کر باعث شرف ہوا۔ حضرت والا جب لکھنؤ تشریف لے گئے تھے تو دہلی پہونچکر غالباً دفتر جمعیۃ علماء ہند سے گرامی نامہ تحریر فرمایا تھا، جس میں روانگی سے پہلے دوبارہ میرے پاس تشریف نہ لاسکنے کے وجوہ واسباب تفصیل سے تحریر فرمائے تھے اور میرے بارے میں اپنے ایسے حسن ظن کا اظہار فرمایا تھا جس کا میں قطعاً مستحق نہیں ـــــ کیا عرض کروں میرا کیا حال ہے؟...... ....

حضرت! صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ میری عمر کچھ زیادہ ہے اور اپنے سلسلہ کے اکابر و مشائخ کی زیارت اور ان کی خدمت میں مجھے حاضری کا اللہ تعالی نے بہت موقعہ عنایت فرمایا، لیکن جو کچھ خود کرنا چاہئے تھا وہ چونکہ نہیں کیا اور اس میں بڑا قصور رہا اس لئے حال یہ ہے کہ اگرچہ ٹوٹا پھوٹا نماز روزہ نصیب ہے، لیکن باطن کی اصلاح نہ ہو سکی۔

حضرت کی عمر اگرچہ مجھ سے کم ہے لیکن مجھے بفضلہٖ تعالی آپ کے ساتھ وہی عقیدت ہے جو اپنے سلسلہ کے مشائخ کے ساتھ ہے۔

مجھے جو کچھ امید ہے بس اللہ تعالی کی رحمت، حضور کی شفاعت، اللہ کے مقبول بندوں کی دعاؤں سے ہے، لجاجت کے ساتھ درخواست ہے کہ خصوصیت کے ساتھ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالی اپنے خاص کرم سے رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود قاسمی

(۴)

از طرف محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
نظیر آباد لکھنؤ
۲ر محرم الحرام ۱۴۰۹ھ

باسمہ سبحانہ و تعالی

برادر محترم محبّ مکرم مولانا جمیل احمد صاحب* احسن اللہ تعالی الیکم والیناـ
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حضرت! الفرقان میں میں نے اپنا مختصر حال اسی لئے لکھ دیا تھا کہ آپ جیسے حضرات دعا فرمائیں۔

قمری حساب سے میری عمر ماہ شوال میں ۸۵ ہو کر ۸۶ واں سال شر...
عنایت نامہ کا حق تھا کہ اپنا حال تفصیل سے لکھتا لیکن پہلے ق...
کے بعد سے آشوب چشم کی تکلیف شروع ہوئی جس سے ابھی ...
اللہ تعالی اپنے رحم و کرم سے صحت و شفاء عطا فرمائے اور جو تکلیـ...
سیئات بنائے۔

محترم بھائی جمیل صاحب! بظاہر تو دین کی خدمت کے کاموں میں خدا داد عمر کا بڑا حصہ گذرا۔ بغیر ادنیٰ انکسار کے عرض کرتا ہوں کہ آخرت میں کام آنے والا وہی عمل ہے جو خاصاً لوجہ اللہ ہو لیکن اپنے کسی عمل کے بارے میں اس اعتبار سے اطمینان نہیں ہے، اس لئے بس اللہ تعالی کی صفت رحمت و مغفرت کا اور اسکے مقبول بندوں کی دعاؤں ہی کا آسرا ہے، خاص کر حضور کا تعلیم فرمایا ہوا یہ کلمۂ استغفار اپنے حسب حال ہے۔ اللھم ان مغفرتك اوسع من ذنوبی ورحمتك ارجی عندی من عملی ـــــ یہ اللہ تعالی کا فضل و کرم ہے کہ اپنی بدحالی کا احساس ہے آخرت کی فکر نصیب ہے۔

بظاہر ہم آپ دونوں ہی زندگی کی آخری منزل میں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ہی کی تعلیم فرمائی ہوئی یہ دعا حسب توفیق نصیب ہے۔ "اللھم اجعل خیر عمری آخرہ وخیر عملی خواتیمہ وخیر ایامی یوم القاك فیہ" اللہ تعالی آپ کے حق کے مطابق آپ کے لئے دعا کا اہتمام اس عاجز کو نصیب فرمائے، آپ دعاؤں میں یاد فرماتے ہیں، اللہ تعالی اپنی شان عالی کے

---

* ادارۂ ملیہ، ملک پیٹھ، حیدر آباد، دکن۔

مطابق اس کا صلہ عطا فرمائے گا۔ عزیزم اشفاق احمد سلمہ کو سلام ودعا۔
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(۵)

باسمہ تعالیٰ

صفر المظفر ۱۴۰۴ھ، مطابق ۱۹۸۴ء

صدیقی المحترم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب[*]!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ مورخہ ۲۲/ محرم موصول ہوکر موجب منّت و مسرت ہوا، عریضہ کا جواب یا اطلاع رسید نہ ملنے کی وجہ سے خیال ہو گیا تھا کہ شاید وہ ڈاک سے ضائع ہو گیا۔ آپ تک نہیں پہونچ سکا۔ اب گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ آپ پر اللہ تعالی کا یہ انعام ہوا تھا کہ ان دنوں آپ سفر حج میں تھے اب واپسی پر میرا عریضہ ملاحظہ فرمایا۔ اللہ تعالی آپ کے اس حج اور اس سفر کے عمرات اور ان کے سلسلہ کے تمام مناسک و افعال اور دعوات صالحہ کو اپنی شان عالی کے مطابق قبول فرمائے اور آپ کے لئے اور آپ کے اہل تعلق کے لئے مغفرت کا وسیلہ بنائے اور اس کے انوار و برکات آپ کی روح میں اس طرح پیوست فرمادے کہ قبر میں بھی ساتھ جائیں۔

دارالعلوم دیوبند کے المیہ کے سلسلہ میں حضرت قاری صاحب علیہ الرحمۃ کی حیات میں اور ان کے حادثہ وفات کے بعد الفرقان میں جو کچھ لکھا گیا اس کے بارے میں گرامی نامہ سے جناب کی رائے اور تاثر معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا، اور دل کی فکر و تشویش میں کمی ہوئی اور اسی کی وجہ سے دل میں کچھ عرض کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ ورنہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہونے کی وجہ سے اب خطوط بہت مختصر ہی لکھتا یا لکھاتا ہوں۔ یہ عریضہ بھی ایک عزیز سے لکھا رہا ہوں۔

مولانا! واقعہ یہ ہے کہ جو مقدر تھا وہ ہو چکا، لیکن خاص کر ان کی وفات کے بعد سے دل بہت متاثر ہے اور جب خیال آجاتا ہے تو رنج اور افسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ

---

[*] مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی، کراچی (پاکستان)

مغفرت ورحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔ درجات بلند فرمائے اور اس سلسلہ میں جو غلطیاں ہم سے یا ان سے ہوئیں اپنی شان کرم سے ان کو معاف کردے۔ انہ عفو کریم۔

مولانا! "بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ"۔ مجھے اپنے ظاہری وباطنی عیوب ومعاصی کا علم ہے جو ایسے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ رحم وکرم کا معاملہ نہ فرمائے تو خیریت نہیں ہے۔ اور قاری صاحب مرحوم مغفور کے تو صرف ان ہی اقدامات کو میں غلط سمجھتا ہوں جو دارالعلوم کے بارے میں عمر کے آخری دور میں ان کی طرف سے ہوئے، بالخصوص دارالعلوم کے "دستور اساسی" اور اس کی "مجلس شوریٰ" کو کالعدم قرار دینے کا اقدام، جو دارالعلوم کے حق میں یقیناً انتہائی درجہ کی خطرناک بات تھی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی فطرت اور ان کے عمر بھر کے طرز عمل کے خلاف تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کی فطری انتہائی درجہ کی نرم مزاجی اور کبر سنی کی پیدا کی ہوئی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اس غلط اور ناممکن بات کے لئے ان کو تیا
بھی نہیں سکتے تھے، یہی چیز اس اختلاف اور خلفشار کی بنیاد
ہوئے۔ فی ما بیننا وبین اللہ دل اس پر مطمئن ہے کہ دارالعلوم
ہم ارکان شوریٰ نے جو رویہ اختیار کیا وہ صحیح بلکہ ہمارا فرض تھ
غلطی سے ہم میں سے کوئی محفوظ نہیں ہے۔

بہر حال میں تو ان کے صرف اس عمل اور اس سلسلہ کے اقدامات کو غلط سمجھتا ہوں جو رائے اور فکر کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ان کی جن حسنات اور جن کمالات سے واقف ہوں ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں ان کو حفظ قرآن کی دولت عطا فرمائی۔ وہ زندگی بھر ان کا وظیفہ رہا، پھر وہ علم دین کی نعمت عظمیٰ سے بھی نوازے گئے۔ ہم نے آپ نے ان کو دیکھا وہ شرافت نفس اور خلق حسن کا مجسمہ تھے، ان کے مواعظ حسنہ سے ہزاروں بندگان خدا کو ہدایت ملی ہوگی، نماز روزے کی اور ذکر وتلاوت پھر دوسرے اعمال خیر کی توفیق ہوئی ہوگی، اس سب کے علاوہ خود اپنی قریباً ۸۰ سال کی مختلف النوع عبادات اور دینی خدمات وحسنات کا بھی ذخیرہ اپنے ساتھ لے کر اس دنیا سے گئے ہیں، اور آخرت میں فیصلہ کسی ایک عمل پر نہیں بندہ کے مجموعۂ اعمال پر ہوگا۔ "فمن ثقلت موازینہ فاولئک ھم المفلحون" اور "فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیۃ"۔

ظاہر ہے کہ ان کی ان بیشمار حسنات وخدمات کے مقابلہ میں دارالعلوم کے سلسلہ کی اس غلطی کی کیا حیثیت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا منشور رحمت ہے۔ "ان الحسنات یذھبن السیئات"

اس سب کو سامنے رکھ کر قریب بہ یقین امید ہوتی ہے کہ وہ انشاء اللہ "اولئك هم المفلحون" اور "فهو في عيشة راضية" والے زمرے میں ہوں گے۔

اور اس کے برعکس یہ عاجز اپنے کو رذائل اور معاصی کا مجسمہ ہی دیکھتا اور سمجھتا ہے ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم ہے کہ اپنی اس حالت کا احساس اور فکر نصیب ہے۔ اور اسی کی طرف سے توبہ و استغفار کی توفیق بھی ملتی رہتی ہے۔ دعائے ماثور "اللهم ان معفرتك اوسع من ذنوبي ورحمتك ارجى عندي من عملي "کو خاص طور سے اپنے حسب حال پاتا ہوں اس لئے غرق معاصی ہونے کے باوجود ارحم الراحمین کی رحمت کا امیدوار ہوں اور جیسا کہ جناب نے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے اس کی بھی امید رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ رب کریم ہم کو ان بندوں میں شامل فرمادے جنکے بارے میں ارشاد ہوا ہے ونزعنا ما في صدورهم من غل اخوانا على سرر متقابلين۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بقلم محمد حسان نعمانی

(۶)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الاول ۸۶ھ

باسمه سبحانه و تعالیٰ

میرے عزیز و مکرم بھائی (۱) احسن الله اليكم و اليناو علیکم السلام ورحمۃ اللہ

اپنی بات آپ تک پہنچانے کا ذریعہ صرف الفاظ (بشکلِ تحریر) ہی ہو سکتے ہیں پھر ایسا کوئی آلہ معلوم نہیں جس سے آپ یہ جان سکیں کہ یہ الفاظ بالکل حقیقت کے مطابق ہیں ان میں انکسار اور تواضع بھی نہیں ہے۔

آپ نے میرے پہلے خط کو غالباً تواضع پر محمول کیا ہے اللہ تعالیٰ آپ جیسے محبین کے حق ظن کی برکت سے اس عاجز پر اپنا فضل فرمائے۔

آپ ہی بتائیے کہ جس بندہ کو حق الیقین کے طور پر یہ معلوم ہو کہ وہ اس دولت نسبت سے خالی ہے اور "او کہ خود گم است "کا مصداق ہے اس کے لیے کیسے درست ہے کہ وہ یہ ذمہ داری قبول کرے۔ برسوں سے میرا معمول ہے کہ حضرت قدس سرہ کے ارشاد کی تعمیل

(۱) جناب عبد الرشید صاحب لدھیانوی۔ مدینہ پائپ اسٹور۔ راولپنڈی

میں صرف بیچارے ان عوام کو جن میں بظاہر کوئی خاص استعداد نہیں ہوتی ان کے کہنے پر بس توبہ کرادیتا ہوں اور ان کے ساتھ الحمد للہ خود بھی توبہ کرلیتا ہوں۔ پھر اگر ان میں سے کسی میں آگے چلنے کی استعداد محسوس ہوتی ہے تو کہدیتا ہوں کہ اب تم حضرت شیخ مدظلہ کی خدمت میں یا اللہ کے جس بندہ سے مناسبت دیکھو چلے جاؤ، میں تمہارے لیے خط بھی لکھدوں گا۔ یہ میں ازراہ امانت ضروری سمجھتا ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے پیشے نے اللہ کے ان بندوں کی نگاہوں میں بڑا بنادیا ہے جو بس میری کتابیں پڑھتے ہیں اور ان کو حسن ظن بھی نصیب ہے۔ لیکن میں خود دھوکہ میں نہیں ہوں۔ بہر حال آپ مجھ سے جو خدمت لینا چاہتے ہیں اس کا میں اہل نہیں ہوں۔

دعا کے لیے کوئی اہلیت شرط نہیں ہے اس لیے اس کا پکا وعدہ کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ایفا نصیب فرمائے، ایک مشورہ بھی دے سکتا ہوں اگر کسی ط
رکعت صلوٰۃ توبہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس
اقدس قدس سرہ کے ہاتھ پر آپ نے کی تھی اور ا۔
حضرت اقدس کی تعلیم و تلقین کی رہنمائی میں معمول و
حضرت شیخ سے اور اگر اس ناکارہ ہی سے جی چاہے تو مجھ سے مشورہ کرتے۔ اگر بیعت اس پر مطمئن ہوجائے تو پھر کسی نئی بیعت کی مطلق ضرورت نہیں۔ اصل ہادی اور مرشد تو اللہ تعالیٰ ہیں اور حضرت اقدس اور مشائخ سلسلہ کی روحانیت کے فیوض و برکات کا تسلسل باذن اللہ تعالیٰ جاری ہے۔ میں دعا کا محتاج اور طالب و سائل ہوں اور آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

(۷)

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
۳/جمادی الاول ۱۹۸۶ء

باسمہٖ تعالیٰ

برادرم و عزیزم حافظ محمد قطب الدین(۱) زیدت حسناتکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے عزیز بھائی! یہ تو صحیح ہے کہ اہل اللہ سے تعلق خاص کر اس زمانے میں ضروری

(۱) مدرسہ تعلیم القرآن۔ ذاکر نگر

نافع اور فتنوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے لیکن جن صاحب نے اس سلسلہ میں آپ کو میرا نام اور پتہ بتلایا ان کو غلط فہمی ہے، میں ایک گنہگار بندہ ہوں لیکن بفضلہٖ تعالیٰ اپنے گنہ گاری کا شعور اور فکر رنج و افسوس ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ استغفار کی توفیق نصیب ہے، اور اس بنا پر اپنی بداعمالیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید ہے، وہ غفور رحیم ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ دعائیں گنہ گاروں کی بھی قبول فرماتا ہے، دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کی تکلیف کو دور فرمادے۔

اپنی بیماری کی شفا کے لئے اور دوسری دنیوی ضرورتوں کے لئے بھی دعا کرنا عبادت ہے بلکہ حدیث شریف میں ہے دعا عبادت کا جوہر اور مغز ہے، تو بعض بندوں کی دعائیں اللہ تعالیٰ اس لئے دیر سے قبول فرماتا ہے کہ وہ برابر دعا کرتے رہیں۔ اور اس طرح ان کی دینی ترقی ہوتی رہے لیکن ہم ضعیف بندے ہیں، اس لئے ہمیں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرنی چاہئے کہ جلدی شفا دیکر تکلیف سے نجات عطا فرمائے۔

اپنے لئے دعا کریں اور میرے واسطے بھی۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۸)

عزیز مکرم محترم احسن اللہ تعالیٰ الیہا و الیکم

ابھی ابھی آپکا اخلاص نامہ مؤرخہ ۲۲ر رمضان المبارک ملا، پڑھ کر بہت دل خوش ہوا۔
اللہ تعالیٰ اسی طرح برابر توفیق دیتا رہے اور ان اعمال میں ترقی اور استقامت عطا فرمائے۔

آپ میرے لیے ضرور اہتمام سے دعا کرتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپکے حق کے مطابق آپکے لیے دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ انشاء اللہ یہ ملاقات سے زیادہ نفع مند ہوگا۔ میں تو اپنے حالات کی وجہ سے مسجد کی حاضری تک سے معذور ہوں۔ آپ جیسے مخلص دوستوں اور ان کے اعمال اور ان کی دعاؤں کو اپنے لیے وسیلہ نجات سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری اس امید اور گمان کو غلط نہ فرمائے۔

ایک بات اگر آپ سے زبانی نہیں کہی ہے تو پورے اخلاص کے ساتھ اب لکھتا ہوں۔
مجھ سے اس طرح کا تعلق رکھنے والے دوستوں میں جس طرح کا تعلق آپ سے رہا ہے جن کو

تبلیغ کے کام سے اللہ تعالیٰ نے مناسبت عطا فرمائی ہے میں یہ مشورہ دینا ان کے اخلاص کا حق سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب! سے بیعت کا تعلق قائم کرلیں۔ اس سے ان کو انشاء اللہ زیادہ نفع ہوگا اور میرے تعلق میں ذرہ برابر فرق نہیں آئے گا۔ لیکن حضرت مولانا دامت برکاتھم کے سامنے اس کا اظہار بالکل نہ کیا جائے کہ پہلے کسی شخص سے تعلق ہو چکا تھا اگر اس کا اظہار ہوا تو غالباً مولانا قبول نہیں فرمائیں گے۔ میں متعدد مخلص دوستوں کو جن کا تبلیغ سے اچھا تعلق ہے یہ مشورہ دے کر اصرار کے ساتھ اس پر عمل بھی کرا چکا ہوں۔ آپ کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ میری یہ رائے اور میرا یہ مشورہ ہے۔ دعاؤں کا محتاج و طالب اور دعا گو ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم خلیل

(۹)

باسمہ تعالیٰ

عزیز و مکرم (۱)! وفقنا اللہ و ایاکم لمایحب و یرضیٰ
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اخلاص نامہ ابھی ملا۔ مجھے افسوس ہے اور دکھ ہے کہ کسی وہم کی وجہ سے آپ کا دل دکھا حقیقت اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھے اپنا حال حق الیقین کے درجہ میں معلوم ہے اور میں اس سے ڈرتا ہوں کے قیامت میں اس پر موخذاہ ہو کہ اللہ کے مخلص بندوں نے اپنے حسن ظن کی بناپر تجھ سے وہ تعلق قائم کرلیا تھا جو اصحاب ارشاد سے قائم کیا جاتا ہے اور تو نہ اس کا اہل تھا اور نہ اس سلسلہ میں انکی خدمت کرسکا۔

بس اسی احساس کی بنا پر آپ جیسے دوستوں کو اسطرح کا مشورہ دینا اور اپنا حال بتادینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلئے رائے اور مشورہ تو اخلاص و محبت کے ساتھ اب بھی وہی ہے لیکن اسکے بعد بھی اگر آپ موجودہ صورت کو ہی اپنے لیے انسب اور انفع سمجھیں تو مجھے کوئی عذر

---

(۱) جناب قطب الدین ملا صاحب۔ بیلگام

نہیں۔ ہدایت وارشاد کا اصلی سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے وہ میری بھی دستگیری فرمائے اور آپکی بھی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر آپ میرے مخلصانہ مشورہ پر عمل کریں تو آپ کے ساتھ جو قلبی اور روحی تعلق ہے انشاء اللہ اس میں کوئی فرق نہ آئیگا آپ کے لیے دل سے دعا گو اور خود دعاؤں کا بیحد محتاج ہوں۔

بیلگام اور لکھنؤ کے درمیان بہت مسافت ہے صرف میری وجہ سے بس سے اتنا طویل سفر ہرگز نہ کیا جائے "بعد منزل نشود در سفر روحانی" اگر کسی سلسلہ سے ادھر کا کوئی سفر ہو تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے اعتکاف اور دوسرے اعمال و مجاہدات کو قبول فرمائے اور اپنے خاص فضل سے اخلاص واستقامت عطا فرمائے ———————— شاید اسکا ذکر بھی آپ سے نہیں آیا کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی سوانح پر نظر ثانی کر کے اسکو انگریزی میں منتقل کرایا گیا ہے "ملفوظات" سے ۴۰ ملفوظ منتخب کر کے "ملفوظات" کے ایک باب کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ عنقریب طباعت شروع ہونے والی ہے اس پر مقدمہ بھی از سر نو لکھا گیا ہے، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اسکے لیے نافعیت اور مقبولیت مقدر فرمائے۔

والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(۱) جناب اعجاز الدین انصاری صاحب، بھوپال
(۲) جناب اعجاز الدین انصاری صاحب، بھوپال
(۳) جناب قطب الدین ملا، بلگام
(۴) جناب قطب الدین ملا، بلگام
(۵) جناب قاری عبدالحق صاحب، ارس سعودی عربیہ
(۶) جناب انیس صاحب
(۷) جناب عبدالسلام صاحب پیپارسٹی۔ جے پور
(۸) جناب اوپیندر ناتھ اشک صاحب

(۱)

لکھنؤ

۸/مارچ ۱۹۷۰ء

باسمہ سبحانہ

برادر عزیز و مکرم!(۱) زیدت حسنا تکم ——— سلام مسنون

ملفوف اخلاص نامہ ہفتہ عشرہ پہلے پہونچ گیا تھا

(۱) پابندی کے ساتھ ذکر کی توفیق بڑی دولت ہے اللہ تعالیٰ استقامت اور ترقی نصیب فرمائے۔ اور چلتے پھرتے دھیان و ذکر کی توفیق تو بہت ہی بڑی نعمت ہے۔

(۲) کوشش کیجئے کہ تلاوت اور مناجات کا ناغہ نہ ہو چاہے ایک ہی رکوع اور ... دعائیں ہو جائیں۔ اہتمام کیجئے۔ ناغہ بڑا خسارہ ہے۔

(۳) آپ نے حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کی خد برکات کا ذکر کیا ہے، بلا شبہ حضرت کی ذات گرامی اللہ تعالیٰ کی ایسوں کی محبت بہت بڑی سعادت ہے۔ حدیث پاک میں ہے المرء ...

(۴) حضرت شیخ الحدیث کے ہاں ڈاک کا اہتمام ہے اگر چہ روز آنے والے خطوط کی تعداد پچاس سے بڑھ جاتی ہے، کچھ خطوط رہ بھی جاتے ہونگے۔

(۵) اللہ تعالیٰ آپ کیلئے دعا کا اہتمام نصیب فرمائے، خود دعاؤں کا بہت محتاج ہوں اور مخلصوں کی دعاؤں سے بہت امید رکھتا ہوں اسوقت لفافہ نہیں ملا اسلئے کارڈ ہی لکھدیا کہ زیادہ تاخیر نہ ہو۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

(۲)

لکھنؤ

۳/ربیع الثانی دوشنبہ

محبی مخلصی(۲)! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

(۱) الحمد للہ حالت بحیثیت مجموعی قابل شکر ہے اللہ تعالیٰ ترقی عطا فرمائیں۔

---

(۱) اعجاز الدین صاحب انصاری، بھوپال۔ (۲) ایضاً۔

(۲) بس ان ہی معمولات کو جاری رکھئے۔

(۳) استغفار سے دل کا لگاؤ اللہ کی نعمت ہے حدیث میں ہے وہ بندہ بہت ہی کامیاب ہے جسکے صحیفۂ اعمال میں استغفار زیادہ ہو۔

(۴) عشا کے بعد تہجد کی نیت سے جو ۴؍ رکعت نفل آپ پڑھتے ہیں انکو اس وقت تک جاری رکھئے جبتک آخر شب میں تہجد کی مستقل عادت نہ ہو جائے آخر شب میں نہ اٹھ سکنے والوں کیلئے عشا کے ساتھ تہجد پڑھنے میں بھی انشاء اللہ پورا ثواب ہے۔ بجائے چار رکعت کے آٹھ رکعت زیادہ بہتر ہے اگر چہ تہجد کی سنت چار سے بھی ادا ہو جاتی ہے وتر ان کے بعد پڑھنا افضل ہے۔

(۵) ابھی کسی اضافہ کی ضرورت نہیں موجودہ معمولات ہی میں کیفیت بڑھانے کی کوشش کرتے رہئے!۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ درود شریف بھی میں نے بتلایا تھا یا نہیں اگر نہ بتلایا ہو تو اسکا طریقہ اور تعداد مجھ سے عند الملاقات زبانی دریافت کر لیجئے گا۔

دوستوں کیلئے دعا کرتا ہوں اور انکی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

انشاء اللہ پرسوں چہار شنبہ روانہ ہو کر جمعرات کو بھوپال پہونچوں گا۔

والسلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ

(۳)

۱۵؍ مارچ ۱۹۶۷ء

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

برادر عزیز مکرم(۱)!

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپکا خط مورخہ ۲؍ مارچ ملا حالات معلوم ہوئے۔

تسبیحات میں تو بہت ہی کم وقت صرف ہوتا ہے اگر اسکی بھی پابندی نہ ہو سکے تو اپنے ہی ساتھ بے انصافی ہے۔ غالباً میں نے بتایا ہوگا کہ اگر کسی دن مقرر وقت پر تسبیحات پوری نہ کی جا سکیں تو

---

(۱) قطب الدین ملا صاحب، بیلگام۔ کرناٹک۔

دوسرے وقت انکو پورا کرلینا چاہئے۔ اگر دل میں انکی اہمیت ہوگی تو انشاء اللہ توفیق ملتی رہیگی۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان عالی کے مطابق غفور رہیں بندہ کی بے فکری کبھی کبھی محرومی کا سبب بن جاتی ہے لیکن انکی رحمت کی صفت غالب ہے آئندہ کیلئے اہتمام اور پابندی کا عزم کر لیجئے انشاء اللہ توفیق ملتی رہیگی۔ تسبیحات تو راستہ سے آشنائی پیدا کرنے کا ابتدائی ذریعہ ہیں اگلی منزلوں کی طلب ہونی چاہئے۔

خوابوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے ایک غیر اختیاری چیز ہے تاہم آپکا خواب اچھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپکی روح میں بلند پروازی کی استعداد رکھی ہے۔ آپ اگر اس راستہ پر چلیں گے تو اللہ تعالیٰ فضل فرمائیگا۔ نہ چلنے کی صورت میں یہ استعداد بھی ضائع ہو جائیگی۔

امتحان کیلئے بھی دعا کرتا ہوں۔ نمازوں اور تسبیحات کے بعد

وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر لیجئے۔ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ

سید محمد اقبال صاحب اور رحمت صاحب کو جواب سلام

والسلام

محمد منظور نعمانی

(۴)

۲۸؍جون ۱۹۷۶ء

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

عزیز مکرم محترم(۱) احسن اللّٰہ تعالیٰ الیکم و الینا

اخلاص نامہ مورخہ ۱۵؍جون وقت پر مل گیا تھا، حسب عادت جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ آپ نے اپنا جو حال لکھا ہے بہت سے اللہ کے بندوں کا یہ تجربہ ہے کہ حج کے سفر میں ایسا ہو جاتا ہے۔ کہ آدمی سمجھتا ہے کہ میں جو پونجی لیکر آیا تھا وہ بھی کھو دی اور کچھ بھی نصیب نہیں ہے عارفین کو کہتے سنا ہے کہ یہ بہت اچھی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے ہم سب امراض کا شکار ہیں۔ اگر اس طرح کی واردات کبھی نہ ہو تو اعجابِ نفس میں مبتلا ہو کر برباد

---

(۱) قطب الدین ملا صاحب، بیلگام (کرناٹک)

ہو جائیں۔ حق یہ ہے کہ کسی کے پاس کچھ نہیں کبھی کبھی اسکا تجربہ کرا کے علاج فرمادیا جاتا ہے۔ سراسر کرم ہے، اللہ تعالیٰ شکر کی توفیق دے۔ اور عاجزانہ دعا کو آپکا اور میرا بھی حال بنادے۔

الحمد للہ میں اپنے حال سے کچھ آگاہ ہوں آپ جیسے دوستوں کی محبت کو اچھی علامت سمجھتا ہوں اپنے پاس ہے کچھ نہیں۔

مخلص عزیز مکرم سید محمد اقبال صاحب کو جواب سلام، انکے لئے بھی دعا کرتا ہوں اور خود دعاؤں کا بے حد محتاج ہوں۔ غائبانہ دعا سب سے قیمتی ہدیہ اور تحفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں روحانی ملاقات ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دولت بھرپور نصیب فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ
محمد منظور نعمانی

(۵)

۳؍اکتوبر ۱۹۸۹ء
محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

برادر مکرم جناب حافظ قاری عبدالخالق صاحب (۱)!
وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ ہر طرح بخیر عافیت ہوں۔ ۱۹؍اگست کا لکھا ہوا اخلاص نامہ غالباً ستمبر کے پہلے یا دوسرے عشرہ میں مل گیا تھا، اس سے چند ہی روز پہلے آپکو ایک خط لکھایا جاچکا تھا جس میں آپکے اس عنایت نامہ کے وصولیابی کی اطلاع تھی جسکے ساتھ آپکا چار سو کا ڈرافٹ بھی موصول ہوا تھا، امید ہے کہ میرا لکھایا ہوا وہ خط بھی آپکو ملا ہوگا اسکے بعد سے طبیعت ناساز رہی اور ایسے خطوط کے جوابات ملتوی ہوتے رہے جو مختصر نہیں لکھائے جاسکتے تھے اسلئے آپکے آخری عنایت نامہ مورخہ ۱۹؍اگست کا جواب ابتک نہیں لکھا جاسکا، میں نے ابھی پڑھوا کر سنا ہے، مختصر چند باتیں لکھا رہا ہوں۔

(۱) آپ میرے بارے میں بہت مبالغہ کرتے ہیں میں بالکل اس حال میں نہیں ہوں جو آپ گمان کررہے ہیں، بے تکلف لکھانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئندہ اس بارے میں احتیاط

---

(۱) الرس، سعودی عربیہ۔

فرمائیں۔ میں اپنا حال خوب جانتا ہوں، اسلئے میرے بارے میں مجھے کچھ لکھنا غیر ضروری ہی نہیں نامناسب ہے، مجھے اس سے گرانی ہوتی ہے۔

(۲) آپ نے بیعت کی بات لکھی ہے، یاد آتا ہے پہلے بھی میں لکھا چکا ہوں، آپکو کسی سے بیعت کی ضرورت نہیں، ہمارے مرحوم و مغفور معظم محترم بھائی مولانا حافظ فتح محمد صاحب سے جو بیعت آپ نے کی تھی وہی کافی ہے۔

(۳) معلوم ہوا کہ آپ کے اہل و عیال دہلی میں ہیں ان کی وجہ سے آپ جب چاہیں اور مناسب سمجھیں دہلی کا سفر کریں، اگر اس وقت ملاقات کی نیت سے لکھنو کا بھی سفر کیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

(۶)

۲۳/ رمضان ۱۰ھ بروز جمعہ
محمد منظور نعمانی

باسمه سبحانه و تعالیٰ
میرے عزیز بھائی انیس صاحب!(۱) حفظکم اللّٰہ تعالیٰ و عافکم
سلام ورحمت

آپکا خط ملا پڑھوا کر سنا، آپکے علم میں نہیں ہے میں زیادہ دن سے بیمار اور صاحب فراش ہوں، خود لکھنے پڑھنے سے بالکل معذور ہوں۔ لیکن میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کے خط کا جواب لکھواؤں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بعض صحابہ کو بڑے سخت شیطانی وسوسے آتے تھے انھوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت! ایسے وسوسے آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا ان سے بہتر ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ حالت اسکی دلیل ہے کہ تمہیں پورا ایمان نصیب ہے اور ایمان کی دولت عزیز ہے۔

---

(۱) پتہ دستیاب نہیں ہے۔

یہ عاجز آپکو یقین دلاتا ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ پورے صاحب ایمان ہیں، ان خیالات کو وسوسہ سمجھنا اور ان سے تکلیف اور پریشانی محسوس کرنا اور پریشان اور رنجیدہ ہونا اسکی دلیل ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ آپکا قلب مومن ہے۔

نماز یا قرآن پاک کی تلاوت میں لذت اور حلاوت نہ ہونے سے کوئی نقصان نہیں بلکہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکو اس پر زیادہ اجر و ثواب عطا فرمائیگا کہ لذت اور حلاوت نہ ہونے کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نماز پڑھتے ہیں اور اجر و ثواب کیلئے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں ۔ اللہ کے بعض بندوں پر کبھی ایسے حالات آجایا کرتے ہیں لیکن چند روز میں وہ کافور ہو جاتے ہیں اور ان سے پریشانی اور تکلیف کا احساس ان کی دینی اور ایمانی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔

ایک مختصر عمل لکھا تا ہوں

صبح نماز فجر سے پہلے یا نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسی طرح رات کو عشاء کی نماز کے بعد گیارہ دفعہ درود شریف، اسکے بعد ایک سو ایک دفعہ یہ مختصر دعا" اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَلْبِىْ عَلٰى دِيْنِكَ" پھر گیارہ دفعہ درود شریف پڑھنے کا تین ہفتے کیلئے معمول بنالیجئے اور ہر نماز کے بعد دعا بھی کیجئے کہ اے اللہ تو شیطانی وسوسے سے میری حفاظت فرما اور تین بار کلمہ شریف پڑھ لیا کیجئے۔

یہ عاجز بھی آپکے لئے دعا کرتا ہے امید ہے کہ انشاء اللہ آپ جلد اس حالت سے نجات پا جائیں گے، خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ
بقلم محمد ضیاء الرحمن قاسمی

(۷)

۲۶/مارچ ۱۹۸۸ء
محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

برادرم عبدالسلام صاحب(۱) ! عافاکم اللّٰہ تعالیٰ

آپکا خط ملا، حال معلوم ہوا، عا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپکو کامل صحت وعافیت عطا فرمائے

---

(۱) پی پاڑ۔ ضلع جے پور۔

آئندہ بھی اللہ تعالیٰ آپکے لئے اس دعا کے اہتمام کی توفیق عطا فرماتا رہے۔
عزیزم عبد العلیم سلمہ کی بچی کی ولادت کا حال معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ اسکے لئے خیر و برکت مقدر فرمائے، حدیث شریف میں ان لوگوں کو جنت کی بشارت سنائی گئی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بچیاں عطا فرمائی ہیں اور انکو بوجھ نہ سمجھیں خوش دلی سے انکی کفالت اور تربیت کریں رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے تو چھوٹی عمروں میں ہی وفات پاگئے تھے چار صاحبزادیوں نے عمر پائی انکی شادیاں بھی ہوئیں ان میں سے بھی تین کی وفات حضور ﷺ کی حیات ہی میں ہو گئی صرف حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا باقی رہیں وہ بھی حضور ﷺ کی وصال کے چھ مہینے بعد وفات پاگئیں۔ بہر حال بیٹیاں بچیاں بھی بڑی نعمت ہیں اللہ تعالیٰ عبد العلیم سلمہ کو ولد صالح بھی عطا فرمائے۔ بچوں کا نام رکھنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسکے لئے دوسروں سے مشورہ کیا جائے، معمولی بات ہے تاہم لکھتا ہوں "صدیقہ خاتون" صادقہ خاتون "سعیدہ خاتون" میں سے کوئی نام رکھ لیا جائے۔
خود دعاؤں کا طالب ہوں۔

محمد منظور
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۸)

۲۹/۳/۱۹۸۹ء
محمد منظور نعمانی
لکھنؤ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ
مہربانم اوپندر ناتھ اشک صاحب!
اللہ تعالیٰ ہمارے آپکے ساتھ فضل وکرم کا معاملہ فرمائے۔
میری عمر چھیاسی ۸۶/ سال ہے مختلف امراض وعوارض کے علاوہ ہائی بلڈ پریشر کا بھی مریض ہوں، ایک ایکسڈنٹ کی وجہ سے چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا ہوں، آنے والے خطوط دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں کچھ لکھانا ہو تو دوسروں ہی سے لکھاتا ہوں۔

آپکا عنایت نامہ ایسے وقت آیا تھا کہ میرے خطوط کے کاتب صاحب اپنے وطن گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو دوسرے ضروری کاموں میں مصروف رہے اسلئے خط کا جواب بہت تاخیر سے لکھا جارہا ہے معذرت خواہ ہوں۔

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کو آپ کو مرنے کے بعد کی فکر ہے لیکن آجکل زیادہ تر لوگ اس سے غافل ہیں، حالانکہ یہ مسئلہ ہماری زندگی کے دوسرے تمام مسائل سے زیادہ لائق فکر ہے

آپ نے جو دریافت فرمایا ہے اسکا جواب لکھنا میرے لئے مشکل ہے اور آپ کیلئے اسکا سمجھنا بھی مشکل ہوگا۔ اگر کبھی لکھنو تشریف لانا ہوا اور خدا نے چاہا تو زبانی عرض کرسکونگا۔
ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے میں بات بھی زیادہ دیر تک نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ مجھکو اور آپکو ہدایت عطا فرمائے۔

فقط

والسلام علیٰ من اتبع الھُدیٰ
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

اصلاح رسوم

۱- جناب عبدالرحمٰن کوندو صاحب، سری نگر، کشمیر
۲- جناب انوار حسین صاحب سنبھل، ضلع مراد آباد
۳- مولانا حکیم محمد احسن صاحب سنبھل، ضلع مراد آباد
۴- عزیزہ عائشہ سلّمہا بنت جناب حافظ محمد اقبال صاحب مہتمم مدرسہ فرقانیہ گونڈہ
۵- معجز حسین صاحب وشاہدہ بیگم، سنبھل (مراد آباد)

از طرف محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ
لکھنؤ، ۴؍جون ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ
مخلص مکرم جناب عبدالرحمٰن کوندوصاحب(۱) زید لطفکم
سلام ورحمت

گرامی نامہ مورخہ ۱۷؍مئی موصول ہوا۔ آج کل ضعف بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ دو مہینے سے بصارت میں بہت کمی آگئی ہے۔ خطوط دوسروں سے پڑھوا کر سنتا ہوں۔ کسی کتاب سے کوئی مضمون نکلوانا ہو تو دوسروں ہی سے اس کو نکلوا کر سنتا ہوں۔ اگر یہ معذوری نہ ہوتی تو جہیز سے متعلق آپ کی کتاب "فتنۂ جہیز" کت :

یاد آتا ہے کہ اب سے چند سال پہلے الفرقان میں جہیز
علم کے مضامین پاکستان کے کسی موقر رسالے سے نقل ہو کر شا
کیا گیا تھا کہ جہیز جو نکاح و شادی کے لوازم میں سے ہو گیا ہے قط
ہی سمجھتا ہے۔

بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۲)

۷؍ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ
عزیزم انوار حسین اور عزیزہ مسلمہ(۲) سلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم
سلام ورحمت

خدا کرے تم سب بخیر و عافیت ہو۔
فون کے ذریعہ عزیزی مولوی عبدالمومن سلمہ (۳) کا پیام ملا تھا کہ تم لوگوں نے عام رواج کے مطابق بچی کے ساتھ جہیز دینے کے لئے تیاری کرلی ہے جسکے لئے مومن ہرگز

---

(۱) سری نگر، کشمیر۔ (۲) برادرزادی بنت حاجی محمود حسین مرحوم سنبھل، ضلع مراد آباد، یوپی۔ (۳) برادرزادہ (ابن مولانا حکیم محمد احسن قاسمی مرحوم)

رضامند نہیں ہیں، ان کی طرف سے گویا نکاح کی شرط یہ ہے کہ ایک پیسے کا سامان بھی نہیں آئے گا۔

مجھے یہ کہنا ہے کہ جس طرح عبدالمومن کہیں وہی ہونا چاہئے، حضور کی تمام ازواج مطہرات کا نکاح اسی طرح ہوا، آپ کی سب صاحبزادیوں کا نکاح بھی اسی طرح ہوا، حضرت فاطمہؓ کو جہیز میں کچھ دینے کی بات غلط مشہور ہو گئی ہے۔ حدیث شریف میں ہے امت میں بگاڑ پیدا ہو جانے کے وقت میرے طریقہ کو زندہ کرنے والے کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ شکر ادا کرو کہ خود عبدالمومن سلمہٗ کو اس پر اصرار ہے اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہی اپنے بھائی یحیٰ کو اس کے لئے تیار کیا تھا اور یحیٰ کی شادی اسی طرح ہوئی۔ بہرحال مجھے یہ لکھنا ہے کہ میری بھی شدت سے یہی رائے ہے، یوں سمجھو کہ تم دونوں کو میرا حکم ہے کہ مولوی عبدالمومن سلمہٗ جس طرح چاہتے ہیں اسی طرح شادی ہو آخرت میں جب اس کا اجر و ثواب سامنے آئے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ کتنا عظیم نیک کام ہوا ہے۔

اگر کچھ سامان تیار کرالیا گیا ہے تو وہ دوسری بہن کے کام آسکتا ہے۔ میں نے یہ خط ضروری سمجھ کر طبیعت کی سخت خرابی کی حالت میں لکھایا ہے، تم دونوں کو اور سب کو سلام و دعا۔ خود دعاؤں کا محتاج ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم ضیاء الرحمٰن

(۳)

از محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ

۱۴؍جنوری ۹۲ء

باسمہ سبحانہ وتعالی

برادرِ عزیز گرامی قدر مولوی حکیم محمد احسن(۱)! حفظکم اللہ تعالی وعافاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تمھارا حال آنے والوں کے ذریعے معلوم ہوتا رہتا ہے۔ حسب توفیق صحت کے لحاظ سے حالت کی بہتری پر شکر اور مزید کے لئے دعا بھی کرتا ہوں ـــــ اس وقت خود اس حال میں ہوں کہ چند سطریں لکھانا بھی مشکل ہیں ـــــ لیکن دل کے

---

(۱) سب سے چھوٹے حقیقی بھائی، جنھوں نے ۴؍مئی ۱۹۹۴ء کو انتقال فرمایا۔

شدید تقاضے سے لکھانے کا ارادہ کیا ہے ——— اس کے مخاطب تمھارے سارے فرزندانِ عزیز بھی ہیں بلکہ میرے لئے زیادہ ضرورت انھیں کو لکھانے کی ہے اللہ تعالی کے خاص فضل وکرم سے رضی میاں سلمہ کا رشتہ طے ہو گیا ہے اور مقررہ تاریخ بھی قریب ہی ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس رشتہ کے سلسلے میں بات چیت میں میرا بھی نام آیا ہے اگر میں کسی طرح بھی عزیزم مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جانے کے لائق ہوتا تو خود ہی چاندپور جاتا لیکن میرا حال یہ ہے کہ غالبًا کئی مہینے سے اپنے کمرے کے اندر سے مکان کے صحن تک جانا نہیں ہوا ہے۔ والحمد لله علی کل حال۔

میری انتہائی خواہش ہے کہ شادی کی یہ تقریب ایک مثالی نمونہ ہو۔ میرا خیال ہے اور مجھے بتایا بھی گیا ہے کہ نور چشمی شمیمہ (۱) کے بھائی جن پر اللہ تعالی کا اس وقت خاص فضل ہے ان کی خواہش یہی ہو گی کہ یہ تقریب "شاندار" طریقے پر انجام
خواہش یہ ہے اور معلوم ہے مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اللہ
شریک حال ہیں کہ یہ تقریب اُس طرح انجام پائے جیسی
دیندار گھرانہ سمجھا جاتا ہے اور جس کے دروازہ پر جلی حروف
کے لئے میرے سامنے ایک مثال ہے۔ سہارنپور کے مشہور اور
صاحب مرحوم شاید تم کو یاد ہوں، یہ دار العلوم کے ہماری طالب علمی کے زمانہ میں بھی سہارنپور کے سب سے بڑے ڈاکٹر کی حیثیت سے معروف اور مرجع تھے اور پھر حضرت رائے پوری، حضرت مدنی نور اللہ مرقدھما کے آخری مرض میں معالج رہے، ان کے اکلوتے بیٹے محسن تھے۔ ان کے نکاح کا واقعہ ہے، ان کے والد ڈاکٹر برکت علی صاحب مرحوم نے ان کو بٹھا کر شادی کے سلسلے کے مصارف پر بات چیت کی، اندازہ ہوا قریب۔/۲۰،۰۰۰ (اس زمانے کے بیس ہزار) خرچ ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا محسن! ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ بیس ہزار اسی طرح خرچ ہوں جس طرح شادیوں میں عام طور پر خرچ ہوا کرتے ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ پوری رقم مصارف خیر میں صرف کی جائے اور شادی سادہ طریقۂ سنت پر ہو جائے محسن نے بڑی خوش دلی سے دوسرے طریقہ کو پسند کیا۔ چنانچہ اس رقم کا ایک بڑا حصہ مظاہر علوم دار العلوم دیوبند اور اسلامیہ کالج سہارنپور کو اور کچھ غرباء وغیر ھم ضرورت مندوں کو دیدیا گیا۔

پھر معلوم ہوا کہ اس کے نتیجہ میں سہارنپور میں بہت سے گھرانوں میں اسی طرح

---

(۱) بنتِ حکیم صاحب مرحوم، اہلیہ عتیق الرحمٰن اور والدۂ رضی الرحمٰن سلمہ

شادیاں کی گئیں۔ یقیناً ان سب کا اجر و ثواب ڈاکٹر برکت علی صاحب مرحوم اور ان کے بیٹے محسن کے حصے میں بھی آئیگا۔ من سنّ فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها یوم القیامة او کما قال ﷺ۔

میری دلی خواہش ہے کہ رضی سلمہ کی یہ شادی بہت سادہ طریقہ سے انجام پائے۔ عام رواجی طریقوں پر کم سے کم خرچ کیا جائے۔ جو کچھ خرچ کرنا ہو تو اپنا مدرسہ اور اپنی مسجد (۱) بہترین مصرف ہیں۔ فریق ثانی سے بھی یہی کہہ دیا جائے۔ چاندپور جانے والوں کی تعداد دس بیس سے زیادہ نہ ہو۔ شادی کی مد میں خرچ کم سے کم ہو۔ اور یہ وہ نیکی ہے جس کا اعلان اور اس کی تشہیر مناسب اور باعث اجر و ثواب ہے۔ اگر ایسا ہی ہوا تو مناسب سمجھوں گا کہ ''الفرقان'' میں بھی اس کا ذکر کیا جائے۔ حضور کا ارشاد ہے۔ ''اعظم النکاح برکة ایسره مؤنة''۔ ہم جیسوں کے لئے یہی مواقع ہیں جہاں یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ ہم اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کریں یا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک کے احکام کی پیروی اور عقل کے تقاضے کے مطابق چلیں

آج کل کے ولیمے قطعاً سنت نہیں ہیں بلکہ اکثر معصیت کے حکم میں آتے ہیں، سنن ابن ماجہ کے حاشیے میں ولیمہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ کانت سنة والآن صارت بدعة (غالباً یہی الفاظ ہیں) یہاں تک لکھا کر چور ہو گیا ہوں۔ عزیزہ شمیمہ سلمہا بھی اس کی مخاطب ہیں، امید ہے کہ رضی سلمہ بھی بخوشی اس کے لئے راضی ہوں گے۔

حسّان سلمہ کے بارے میں بھی میری یہی رائے ہے کہ وہ نہ جائیں امید ہے کہ مولوی سجاد اس وقت تک آجائیں گے ان کا جانا میرے نزدیک مناسب ہوگا۔

فقط والسلام

(۴)

از طرف محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ ۴؍ جون ۱۹۸۹ء
لکھنؤ

باسمه سبحانه تعالیٰ

عزیزۂ من بیٹی عائشہ (۲) اسلمکم اللہ تعالیٰ و عافاکم

و علیکم السلام ورحمة اللہ و برکاته

---

(۱) جامعۃ مدینۃ العلوم اور مدینہ مسجد، انجمن معاون الاسلام۔ سنبھل (۲) بنت حافظ محمد اقبال صاحب مہتمم مدرسہ فرقانیہ گونڈہ۔ یوپی

بیٹی تمہارا خط ملا، میں ایسے حال میں ہوں کہ خود تو خط پڑھ بھی نہیں سکتا لیکن طویل خط پڑھوا کر سننا بھی مشکل ہوتا ہے۔ تمہارا خط پڑھوا کر سنا، مجھے یقین ہے کہ

تم نے جو کچھ لکھا ہے صحیح اور سچ لکھا ہے، لیکن جو کچھ ہوا بہت غلط ہوا ، شادی بیاہ کے سلسلہ میں جو طریقے عام طور سے ہندوستان میں رائج ہیں وہ قریباً سب ہی خلاف سنت و شریعت ہیں لیکن قریباً سب ہی ان میں مبتلا ہیں، ان میں اور نئی رسموں کا اضافہ کرنا بہت ہی غلط کام ہے، اگر پہلے سے یہ رواج نہیں تھا کہ رشتہ طے ہونے کے بعد انگوٹھی اور جوڑا پہنایا جائے تو تم نے یہ کر کے ایک غلط قسم کے رسم کی بنیاد ڈالدی جو اللہ کے بہت سے بندوں کے لئے مصیبت کا باعث بنے گی۔ اسی طرح لڑکی والوں کی طرف سے مٹھائی وغیرہ کا آنا اور تمہارا قبول کر لینا بہت غلط کام ہوا ہے۔ رسمیں اسی طرح شروع ہوتی ہیں پھر وہ سب کے لئے لازمی سی ہو جاتی ہیں بہت سے غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو کچھ ہو چکا (ہو گیا) اب خاندان والوں غلطی ہوئی لیکن نہ جاننے کی وجہ سے ہوئی۔

ان بری رسموں اور رواجوں کی اصلاح کے لئے جہا لڑکی والوں سے کہلوادو کہ ہم نکاح اور شادی سنت و شریعت کے مطابق ۔۔ چ ہ یں۔ پ لوگ بھی ایسا ہی کریں ایک حدیث شریف ہے۔ " اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ "زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جس میں بار کم ہو۔

(۵)

عزیزان من معز حسین وشاہدہ سلمہما[۱]! سلام ورحمت

[۱] میری رائے تو یہ تھی کہ (بارات) میں صرف تینوں بھائی اور مولوی زکریا چلے جائیں ان کے سوا اور کوئی نہ جائے لیکن معلوم ہوا کہ حسان میاں کے چند دوست پہلے سے جانا طے کیے ہوئے ہیں اور راشد[۲] ان کو دعوت دے گئے ہیں ۔ بہر حال ۱۲ سے ۱۵ ہو جائیں گے۔

---

[۱] یہ خط برادر عزیز میاں محمد حسان نعمانی کے رشتے کے سلسلے میں لکھا گیا۔ (مرتب) [۲] برادر عزیز مرحوم ابن مولانا حکیم محمد احسن صاحب مرحوم۔

[۲] یہ لوگ ۲۰ ستمبر کی صبح انشاء اللہ پہلی بس سے مراد آباد سے سنبھل پہونچیں گے صرف دن بھر رہیں گے۔ اسی دن رات کی ٹرین سے لکھنؤ کے لئے واپسی ہو جائے گی۔

[۳] میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے اوپر زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور شادی کو مصیبت نہ بناؤ۔

[۴] میرے لئے یا ہمارے ہاں کسی آدمی کے لئے کپڑے ہرگز نہ بنائے جائیں۔ کوثر اور حمیرا کے لئے بھی نہ بنائے جائیں۔ اگر آئیں گے تو واپس کر دیئے جائیں گے۔ ہاں اپنی بچی کے لئے کپڑے بناؤ۔ اس میں بھی میرا مشورہ ہے کہ ہمارے جوڑے بہت کافی ہیں۔ انشاء اللہ ساری عمر اچھے کپڑے اللہ کی طرف سے ملتے رہیں گے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ حسان میاں کی والدہ مرحومہ کے نکاح کے موقع پر میں نے صرف ایک یا دو جوڑے کپڑے بنوائے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساری عمر اچھے سے اچھے کپڑے ملتے رہے۔

[۵] میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ خدا کے فضل سے گھریلو زندگی کی ساری چیزیں موجود ہیں تمھیں اپنی بچی کے لئے کسی چیز کی فکر کی ضرورت نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ غلط طریقوں کو چھوڑ کے صحیح طریقوں کو اپنائیں۔

محمد منظور نعمانی

۹ رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ

••••••••••••••••••••••••••

دلِ دردمند

تعزیت۔ عیادت۔ تسلّی

(۱) مولانا مفید الدینؒ صاحب
(۲) مولانا محفوظ الحسن صاحب سنبھلی مقیم دہلی
(۳) مولانا عطاء اللہ قاسمی۔ چرد آنوں۔ ضلع مونگیر
(۴) جناب ریاض اللہ صدیقی اٹاوہ
(۵) عزیزہ فاضلہ صاحبہ۔ سنبھل ضلع مراد آباد
(۶) جناب اسماعیل منصوری صاحب۔ بمبئی
(۷) مولانا انظر شاہ صاحب۔ دیوبند
(۸) حاجی احمد صالح جی و حاجی عبد الرزاق صالح جی۔ ساؤتھ افریقہ
(۹) عزیزہ کنیز فاطمہ گاندھی نگر بستی
(۱۰) جناب محمد خلیل اللہ صاحب۔ لیسٹر۔ برطانیہ

(۱)

محمد منظور نعمانی
۱۶؍ جنوری ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

محترمی و معظمی جناب مولانا مفید الدین صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شاید کسی ذریعہ سے جناب کے علم میں آگیا ہو کہ یہ عاجز قریباً ... عل...
اور صاحب فراش ہے، انھیں دنوں میں مولانا ضیاء الحسن صا...
میں شدت آئی میرے دو تین عزیز دار العلوم ندوۃ العلماء میں
حال معلوم ہوتا رہا انتہائی رنج و قلق ہے کہ بیماری اور معذ...
وعیادت نہ کر سکا حسب توفیق دعا کا اہتمام نصیب رہا پھر وہ وقت
دنیا سے اٹھا لینے کا فیصلہ فرمایا گیا۔ اِناّ للہِ وَاِناّ الیہ راجعون۔ یقیناً ہمارے آپ ... ن ییے وہ
وقت آنا ہے۔

مولانا مرحوم و مغفور جب ہسپتال پہونچا دیئے گئے۔ میرے عزیز برابر جاتے اور مجھے بتلاتے کہ مولانا مرحوم پر بظاہر اللہ تعالیٰ کا غیر معمولی فضل ہے وہ، اس دنیا اور اہل دنیا کو خیر آباد کہکر سفر آخرت اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری کی تیاری میں مشغول ہیں مجھے انکے حالات سنکر بڑا ہی رشک آتا، حق یہ ہے کہ ایسی موت پر ہزار زندگیاں قربان۔ انکے متعلقین جس میں انکی زوجہ مکرمہ اور خود آپ بھی شامل ہیں، تعزیت سے زیادہ مبارک باد کے مستحق ہیں اگر یہ عاجز معذور نہ ہوتا تو مولانا مرحوم مغفور سے تعلق کا حق تھا کہ میں اپنے احساسات انکے اہل تعلق کو پہنچانے کیلئے مئو کا سفر کرتا، اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا فرمائے کہ مولانا مرحوم کیلئے مغفرت ورحمت اور درجات عالیہ کی اور انکے پسماندگان خاص کر آپکی صاحبزادی ان کی اہلیہ مکرمہ اور بچوں کیلئے صبر کی توفیق اور اپنے خاص الخاص کرم سے ان کی سرپرستی کیلئے دعا کا اہتمام نصیب فرمائے۔

---

(۱) مولانا مرحوم دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاد حدیث تھے۔ ان کی تعزیت کے سلسلے میں یہ خط مرحوم کے خسر صاحب کو لکھا گیا تھا۔

اپنی صاحبزادی صاحبہ کو میرا اسلام پہونچائیں اور یہ کہ میں رنج و غم میں ان کا شریک ہوں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتا ہوں کہ وہ آپکے حق کے مطابق دعا کا اہتمام نصیب فرمائے۔
یہ عریضہ جواب طلب نہیں ہے۔ وصولیابی کی اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔
آپ کی دعاؤں کا محتاج اور طالب ہوں، اور آپ کے لئے دعا گو۔
والسلام

(۲)

محمد منظور نعمانی
۱۲ر ستمبر ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ
مکرم محترم مولانا محفوظ الحسن صاحب (۱) زیدت حسناتکم
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مجھے اپنی بیٹی حمیرا تسنیم سلمہا کے خط سے آپکی اہلیہ مکرمہ کے انتقال کی اطلاع ہوئی یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ سنبھل ہی میں ہیں اسلئے یہ سطریں لکھارہا ہوں خدا کرے آپ تک پہونچ جائیں۔

میں دو دفعہ اس مرحلہ سے گزرا ہوں، تجربہ ہے کہ دل پر کیا گزرتی ہے اور زندگی کے نظام پر کیا اثر پڑتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کیلئے اس سلسلہ کی مشکلات کو آسان فرمائے اور نعم البدل عطا فرمائے معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی سب سے پہلی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جو اوّل مومنات تھیں اور حقیقی اور وسیع معنی میں رفیقۂ حیات، انکی مفارقت کا شدید صدمہ حضور ﷺ کو پہونچا، اولاد بھی چھوڑی، آپکو یہ سنّت بھی نصیب ہوئی جو غیر اختیاری ہے، اللہ تعالیٰ اس صدمہ کا اجر اپنی شانِ عالی کے مطابق آپکو آخرت میں عطا فرمائے۔

آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ اِنَّ لِلّٰہ ما اخذ و لہ مااعطی و کل شئی عندہ باجلٍ مسمّی فلتصبر ولتحتسب۔

---

(۱) مولانا محفوظ الحسن سنبھلی، مقیم دہلی۔ ان کے والد مولانا نجم الحسن صاحب مرحوم والد ماجدؒ کے شاگردوں میں اور راقم الحروف (عتیق) کے استادوں میں تھے۔

یہ خط جواب طلب نہیں ہے اطلاع رسید کی بھی ضرورت نہیں۔ اسکے باوجود کچھ تحریر فرمانا چاہیں تو تحریر فرمائیں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ
بقلم محمد ضیاءالرحمن محمود القاسمی

(۳)

محمد منظور نعمانی
۲۷؍اگست ۱۹۸۸ء۔ ہفتہ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ
برادر عزیز مکرم مولوی عطاءاللہ قاسمی صاحب(۱)

سلام ورحمت

مونگیر وغیرہ بہار کے اضلاع میں زلزلہ کی خبریں اخبارات میں آرہی ہیں، قدرتی طور پر بڑی فکر ہے، اس وقت یہ خط اسی مقصد سے لکھا رہا ہوں کہ اپنی خیریت سے مطلع کریں۔

گزشتہ سال کے سیلاب سے آپکے گھر کا بڑا حصہ منہدم ہو گیا تھا آپنے لکھا تھا کہ ایک کوٹھری رہ گئی ہے، جس میں ہم باپ بیٹی رہتے ہیں خدا کرے حالیہ زلزلہ سے وہ متاثر نہ ہوئی ہو۔

محمد عارف سلمہ نے آپکا خط پہونچادیا تھا یہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ اسکا خاصہ حصہ آپنے خود اپنے قلم سے لکھا، اس سے یہ اندازہ کرکے اطمینان ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک آنکھ میں اتنی روشنی باقی ہے کہ کچھ لکھ پڑھ بھی سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ اسکو باقی اور محفوظ رکھے۔ محمد عارف سلمہ نے یہ بتلایا تھا کہ آپکا ارادہ خود لکھنو آنے کا ہے اور صرف میری وجہ سے۔

میری رائے یہ ہے کہ آجکل سفر میں تکلیف بھی بہت ہوتی ہے اور مصارف بھی بہت ہوتے ہیں، اسلئے میرا مشورہ یہ ہے کہ میری وجہ سے آنے کا ارادہ مت کیا جائے۔ حسب توفیق برابر دعا کرتا ہوں۔

---

(۱) چرواآنواں۔ ضلع مونگیر، بہار مولانا عطاءاللہ صاحب قاسمی الفرقان کے قریباً ابتدائی زمانے سے ۱۹۴۸ء تک والد ماجدؒ کے رفیق اور ناظم دفتر رہے۔ اب وطن میں قیام فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپکو ہر طرح عافیت سے رکھے اور عزیزہ فاطمہ کی طرف سے بھی آپکو اطمینان عطا فرمادے، اِنه رؤف بالعباد وانه علی کل شئی قدیر ——————

خود دعاؤں کا محتاج وطالب ہوں۔

اپنا پتہ لکھوا کر لفافہ سادہ رکھوار ہا ہوں، مختصر لفظوں میں اپنی خیریت سے مطلع کر دیا جائے، عزیزہ انیس فاطمہ کو بھی سلام مسنون۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ
محمد منظور نعمانی
بقلم محمد ضیاء الرحمن محمود القاسمی

(۴)

محمد منظور نعمانی
۲۳، اگست ۱۹۹۱ء

باسمه سبحانه وتعالیٰ

عزیزم(۱) سلمکم اللّٰه تعالیٰ وعافاکم
وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا الملفوف خط بھی ملا جیسا کہ تم نے لکھا ہے حسان میاں نے مجھکو اسی وقت آپ کے والد ماجد مرحوم کے حادثۂ رحلت کی اطلاع دی تھی جب انکو یہ اطلاع ملی تھی۔ میرا مستقل معمول ہے کہ جب کسی بھی ایسے صاحب کے اس دنیا سے جانے کی اطلاع ہوتی ہے جن سے کچھ بھی تعلق یا تعارف ہو حسب توفیق انکے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔ اسکے بعد بھی جب خیال آجائے تو حسب توفیق دعا کرتا ہوں اور بصیغۂ عموم تو تمام ہی اہل تعلق اور عام مومنین و مومنات کیلئے دعاءِ مغفرت ورحمت کا اہتمام ہر نماز میں نصیب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے جیسا تعلق تھا اللہ تعالیٰ انکے حق کے مطابق دعا کا اہتمام اس عاجز کو نصیب فرمائے.. آپ سب بھائیوں، بہنوں اور والدہ محترمہ کیلئے صبر جمیل اور آخرت

(۱) ریاض اللہ صدیقی، اٹاوہ، یوپی۔

میں اس صدمہ کے اجر کی دعا کا اہتمام اللہ تعالیٰ اس عاجز کو نصیب فرماتا رہے۔

خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

اب سب سے بڑی سخت حاجت بس یہ ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں ایمان، اعمال مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت اور عافیت کے ساتھ پورے ہوں، مقرر وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے اور اَرحم الرحمیں صرف اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادیں۔

والدہ صاحبہ کو سلام مسنون اور ان سے بالخصوص دعا کی درخواست۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بقلم ضیاء الرحمٰن قاسمی

(۵)

محمد منظور نعمانی

۱۲ر ستمبر ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

میری عزیزہ فاضلہ (۱) سلمکم اللہ تعالیٰ وعافاکم

سلام ورحمت

عزیزم مولوی محمد عمران سلمہ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ حمیرا سلمہا کا خط ملا اس سے تمہاری بڑی بیٹی کے حادثہ انتقال کی اطلاع ہوئی۔ اِناّ للہِ وَاِناّ الیہِ رٰجعُوْن۔

جوان صاحب اولاد بیٹی کے انتقال کا صدمہ ایک فطری بات ہے اللہ تعالیٰ تمکو اسکا پورا پورا اجر آخرت میں عطا فرمائے اور مرحومہ کے بچوں کی وہی پوری سرپرستی فرمائے۔

تمہیں معلوم ہوگا کہ حضور ﷺ کی تین صاحبزادیاں جوانی کی عمر میں جن میں سے دو صاحبِ اولاد بھی تھیں حضور ﷺ کی حیات میں ہی انکا انتقال ہوا، فطری طور پر حضور ﷺ کو بڑا صدمہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مصیبت اور صدمے کے موقع پر اِنّا للہِ وَاِنّا اِلیہِ راجعُوْن۔ کہنے کی تعلیم فرمائی ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ جب کسی بندے یا بندی کو کوئی صدمہ پہونچے تو وہ یقین تازہ

---

(۱) حقیقی بھانجی، مقیم سنبھل ضلع مراد آباد۔

کر لے اور اپنے دل کو یاد دلائے کہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں وہی مالک ہے اسکو اختیار ہے کہ جس بندے یا بندی کو جس حال میں چاہے رکھے اور ہم سب اسکے حضور میں پہونچیں گے، پھر وہ اپنی خاص رحمت سے ہمکوان صدموں کا بھی اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

میری عزیزہ! جب تمہارے دل پر صدمے کا اثر ہو اور خیال آئے تو دل اور زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ پڑھ کر اپنے دل کو سمجھاؤ، انشاء اللہ اس سے سکون حاصل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم اور سب سے زیادہ مہربان ہے آخرت میں جب وہ اپنے بندوں اور بندیوں کو دنیا میں پہونچنے والی تکلیفوں اور صدموں کا اجر و ثواب عطا فرمائیگا تو وہ بندے اور بندیاں کہینگے کہ کاش! ایسے صدمے ہمکو دنیا میں ہر روز پہونچا کرتے۔

تم مرحومہ بیٹی کیلئے مغفرت کی دعا کرو انکے بچوں کیلئے بھی دعا کرو اور اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے صبر کی توفیق اور اجر مانگو اس سے انشاء اللہ تمہارے دل کو سکون ہوگا۔

میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ میری اور تمہاری دعاؤں کو قبول فرمائے عزیزم فطین میاں سلمہ اللہ تعالیٰ کو سلام مسنون، ان کیلئے بھی دعا کرتا ہوں اور تمہاری اور انکی دعاؤں کا طالب ہوں

والسلام

استکتبہ محمد منظور نعمانی

بقلم ضیاء الرحمن القاسمی

(۶)

محمد منظور نعمانی

۹ر رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

مخلص مکرم بھائی اسماعیل منصوری صاحب(۱) ! زید لطفکم

سلام ورحمت

۳ر ۴ر دن ہوئے مولوی حسان سلمہ نے بتلایا کہ آپکا خط آیا ہے جس میں والدہ ماجدہ مرحومہ کے انتقال کی اطلاع ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

---

(۱) خود مکتوب الیہ کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ الفرقان میں ذکر آچکا ہے۔ بمبئی کے ان اہل تعلق میں تھے جن سے والد ماجد کو بہت ہی انس تھا اور انکے فہم و تقویٰ کی بڑی قدر فرماتے تھے۔

مشہور حدیث ہے یقیناً آپ کے علم میں ہو گی کہ جنّت تمہاری والدہ کے قدموں کے نیچے ہے۔ آپ کے بارے میں جو اندازہ ہے اسکی بنا پر قریباً یقین ہے کہ مرحومہ و محترمہ کی خدمت کر کے جنت کا یہ استحقاق حاصل کر لیا ہو گا، اب بظاہر وہ راستہ بند ہو گیا ہے لیکن ایک دوسرا راستہ کھلا ہوا ہے وہ مرحومہ کیلئے برابر دعا کرنا۔

حدیث شریف میں ہے کہ یہاں سے جانے کے والوں کیلئے جب کوئی دعاء خیر کرتا ہے توان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص کرم اور عافیت ہوتی ہے تو وہ بندہ (یابندی) دریافت کرتے ہیں کہ یہ تازہ عنایت کیسی ہے تو بتلایا جاتا ہے کہ تمہارے فلاں عزیز نے تمہارے لئے یہ دعا کی ہے یا کوئی عمل خیر کر کے ایصال ثواب کیا ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انکو اس عزیز کے بارے میں کسی قدر خوشی ہوتی ہو گی اور کس قدر محبت تازہ ہوتی ہو گی یہ دروازہ ہمارے آپ کیلئے برابر کھلا ہوا ہے۔

قرآن مجید میں والدین کیلئے مغفرت ورحمت کی
اس عالم میں پہونچنے کے بعد برابر اپنے عزیزوں خاصکر یا
اشتیاق رہتا ہو گا، اللہ تعالیٰ ہمکو آپکو توفیق دے کہ اپنے ۔
سے والدین کیلئے بھی مانگا کریں، قرآن مجید میں حضرت ابراہیم [illegible]
اعفر لی ولوالدی وللمو مبین یوم یقوم الحساب ۔

بندہ کا کچھ حال تازہ شمارے (جنوری فروری) سے معلوم ہو گیا ہو گا خود اس خط کی عبارت کی بے ربطی سے بھی آپ کچھ اندازہ کر سکیں گے، علاوہ دوسری تکلیفوں کے بولنا مشکل ہے، سننا بہت زیادہ مشکل ہے، آلہ کے ذریعہ بھی مشکل سے سن پاتا ہوں، والحمد للہ علی کل حالٍ۔

پچھلے دنوں بمبئی کے مسلم کش فسادات کی خبریں سنتا تھا آپ جیسے دوستوں کے بارے میں بڑی فکر ہوتی تھی لیکن مولانا علی میاں اور محمد بھائی کے درمیان جو فون سے باتیں ہوتی رہیں ان سے اتنا تو اطمینان ہوا کہ اپنے خاص احباب بفظلہ محفوظ ہیں اللہ کے جو بندے اس فسادات میں شہید ہوئے انکے لئے اور جنکو کوئی بھی نقصان پہونچا انکے لئے بھی بس دعا ہی کر سکا۔

اب بس اپنے بارے میں یہ فکر ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں، ایمان اعمال صالحہ کی توفیق، نعمتوں پر شکر، گناہوں سے استغفار کے اہتمام اور عافیت کے ساتھ پورے ہوں، مقرر وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے اور ارحم الراحمین محض اپنے رحم وکرم سے

مغفرت فرمادیں۔

آپ سے بھی اسی دعا کا طالب ہوں اور آپ جیسے دوستوں کیلئے اللہ تعالیٰ سے اسی دعا کی توفیق مانگتا ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم ضیاء الرحمٰن محمود

(۷)

محمد منظور نعمانی
۲۹/ ذیقعدہ ۱۴۱۱ھ

باسمہ سبحانہ تعالی

برادر مکرم مولانا محمد انظر شاہ کشمیری صاحب(۱) احسن اللہ تعالیٰ الیکم والینا

سلام ورحمت

خدا کرے آپ معہ متعلقین بخیر وعافیت ہوں۔

میں اس وقت یہ سطریں ایک خاص ضرورت سے لکھا رہا ہوں۔

مولانا مسعودی علیہ الرحمہ کے بارے میں الفرقان میں کچھ لکھانے کا ارادہ ہے اس سلسلہ میں مجھے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا حضرت الاستاد امام العصر نور اللہ مرقدہ سے مولانا مسعودی مرحوم کا قرابت کا بھی کوئی تعلق تھا؟ میرا خیال ہے کہ یہ بات آپ سے معلوم ہو سکتی ہے۔

خدا کرے یہ میرا خط آپکو جلدی مل جائے اور آپکا جواب جلدی آجائے، آئندہ ماہ جولائی کا شمارہ زیر ترتیب ہے اسی کیلئے لکھانے کا ارادہ ہے۔

گزشتہ سال رمضان المبارک میں میں نے ایک خط آپ کو لکھایا تھا جسکا تعلق میری ایک ذاتی ضرورت سے تھا، اسی مضمون کا ایک خط برادر مکرم مولانا محمد سالم صاحب کو لکھایا تھا انکا جواب بھی مل گیا تھا، اللہ تعالیٰ انکو اپنی شانِ عالی کے مطابق جزائے خیر عطا فرمائے۔ لیکن آپکی

(۱) ابن حضرت علامہ انور شاہ استاد دار العلوم (وقف) دیوبند

طرف سے جواب نہیں آیا کچھ دن تک یہ خیال رہا کہ آپ شاید سفر میں ہوں، زیادہ دن گزرنے کے بعد خیال کر لیا کہ ممکن ہے میرا خط آپکو نہ ملا ہو یا آپ نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا ہو، اگر پہلی والی بات ہو یعنی میرا وہ خط آپکو نہ ملا ہو تو برادرم مولانا محمد سالم صاحب سے دریافت کر لیں، میرا اندازہ ہے کہ میرا وہ خط انھیں یاد ہوگا۔ اگر ان سے معلوم ہو جائے تو اس بارے میں بھی چند سطریں لکھدی جائیں . وأجركم على الله۔

یہ عاجز بندہ دعا کرتا ہے اور دعاؤں کا محتاج و طالب ہے اب سب سے بڑی حاجت بس یہ ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں، ایمان اعمال مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت، نعمتوں پر شکر، گناہوں سے استغفار کے اہتمام اور عافیت سے پورے ہو جائیں، مقرر وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے، اور ارحم الراحمیں محض اپنے رحم و کرم

بشرط یاد و سہولت برادران مکرم مولانا محمد سالم

سلام پہونچادیا جائے اور ان حضرات سے بھی دعا کی درخواست

والسلام

محمد منظور

نوٹ قریباً دوڈھائی سال سے خود کچھ لکھنے سے معذور ہو چکا ہوں جو کچھ لکھنا لکھانا ہوتا ہے دوسرے ہی کے قلم سے لکھاتا ہوں ———— والسلام آخراً

(۸)

محمد منظور نعمانی عفااللہ عنہ

۹رمارچ ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

برادران مکرم و محترم جناب حاجی احمد صالح جی و حاجی عبدالرزاق صالح جی(۱)

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

آپ حضرات کی طرف سے لکھے ہوئے خط کی فوٹو کاپی بمبئی سے ایک لفافہ میں پرسوں

---

(۱) ساؤتھ افریقہ۔

۷ر مارچ کو موصول ہوئی، حادثہ کے تفصیلات کا علم ہوا، دل دکھا اور متاثر ہوا، ہم عاجز بندے اللہ تعالیٰ رحیم و کریم سے دعا ہی کر سکتے ہیں وہی اپنے رحم و کرم سے قبول فرمائے اور جو عزیز حادثہ میں زخمی یا مجروح ہوئے ان سب کو کامل صحت عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہم کو اور آپکو ایمان نصیب فرمایا اور اسکی بنیاد پر یقین ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کی مشیت اور حکم سے ہوتا ہے، اہل ایمان کو جو تکلیف پہونچتی ہیں اور جو صدمے ان پر آتے ہیں وہ انکے حق میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کی ایک شکل ہے، ایک طرف یہ تکلیفیں کفارۂ سیئات بنتی ہیں دوسری طرف ان صاحب ایمان مجروحین کو اور ان کے بڑے چھوٹے عزیزوں قریبوں کو دعاؤں کی وہ کیفیت نصیب ہوتی ہے جو اسکے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور وہ دعائیں انکے حق میں رفعِ درجات کا وسیلہ بنتی ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اشد الناس بلاء الا نبیاء ثم الامثل فالامثل یعنی اس دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف انبیاءؑ پر آتی ہیں انکے بعد ان لوگوں پر جو دینی لحاظ سے دوسرے سب لوگوں سے افضل ہوں اسکے بعد درجہ بدرجہ افضل لوگوں پر۔

اس سب کے باوجود ہم ضعیف اور کمزور بندوں کو اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت کی اور تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنے ہی کی دعا کرنی چاہئے، یہ بھی حضور ﷺ کی تعلیم ہے۔

والسلام

بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۹)

محمد منظور نعمانی

۲۰ر مارچ ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ

عزیزہ بہن کنیز فاطمہ (۱)! سلام و رحمت

آپکا خط پہونچا تھا میری طبیعت ناساز تھی اب بفضلہٖ تعالیٰ کچھ بہتر ہے اس وجہ سے جواب تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔

آپ نے اپنے بیٹے محمد طاہر کا جو حال لکھا ہے اسکو سنکر دکھ اور افسوس ہوا یہ بندہ اللہ تعالیٰ سے صرف دعا ہی کر سکتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکی ذہنی اور دماغی اصلاح فرمائے

---

(۱) گاندھی نگر، بستی۔

جو حال آپ نے لکھا ہے وہ میرے نزدیک ایک طرح کا مرض ہے میرا مشورہ ہے کہ کسی اچھے ماہر ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے علاج کرایا جائے۔ دعا کا بھی اہتمام کیا جائے۔

تعویذ لکھنا میرا معمول نہیں بس دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے آپ کیلئے اور آپ کے صاحبزادہ کیلئے بھی دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ دعا کا خاص اہتمام نصیب فرمائے اور اپنے کرم سے قبول فرمائے۔

خود دعاؤں کا محتاج اور طالب ہوں۔ خاصکر اس دعا کا کہ، جب تک زندگی ہے ایمان اور ایمان والے اعمال اور عافیت کے ساتھ پوری ہو، وقت آنے پر ایمان کے ساتھ اٹھالیا جائے، اور ارحم الراحمیں محض اپنے رحم و کرم سے مغفرت فرمادیں۔

بقلم

(۱۰)

محمد منظور نعمانی
۱۳ر دسمبر ۱۹۸۹ء

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

عزیزم محمود میاں(۱) سلمکم اللّٰہ تعالیٰ وعافاکم

سلام ورحمت

خدا کرے آپ معہ متعلقین بخیر وعافیت ہوں۔

کئی ہفتہ گزر گئے آپکا خط ملا تھا، میں نے پڑھوا کر سنا، اس سے کاروباری صورت حال معلوم کر کے دلی صدمہ اور دکھ ہوا، یہ عاجز بندہ دعا ہی کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بار بار دعا کا اہتمام نصیب ہوا، اور انشاء اللہ برابر دعا کرتا رہوں گا۔

میرے عزیز! یہ تو تم کو معلوم ہو گا کہ اس دنیا میں تکلیفیں حضرات انبیاءؑ اور اولیاء کرام کو بھی ہوتی ہیں وہ ان حضرات کیلئے آخرت میں درجاتی ترقیات کا وسیلہ بنیں گی، ایک حدیث شریف کا مضمون ہے کہ اس دنیا میں جس ایمان والے بندہ یا بندی کو جو تکلیف پہونچے اسکا بدلہ

(۱) مقیم لیسٹر، (انگلینڈ) مکتوب الیہ بریلی کے اس خاندان کی یادگار ہیں جس سے بہت ہی عزیز گھریلو تعلق کا رشتہ استوار رہا۔ ان کے والد پروفیسر خلیق احمد مرحوم بریلی کالج میں استاذ تھے۔ یہ پورا خاندان تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہو گیا تھا۔

آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نہ کسی شکل میں دیا جائے گا لیکن ہم آپ ضعیف بندے ہیں ہمیں تکلیف اور تنگی دفع کرنے کیلئے اور عافیت اور خوشی حاصل کرنے کیلئے دنیوی تدبیریں اور محنتیں بھی کرنا چاہئیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرتے رہنا چاہئے۔

ایک مختصر سی دعا وضو کے درمیان حضور ﷺ سے ثابت ہے اس میں رزق کی وسعت کیلئے بھی دعا ہے بہت سے بندوں کا تجربہ ہے کہ اس دعا کا اہتمام کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں رزق کی وسعت بھی عطا فرماتا ہے دعا یہ ہے ' وضو کرتے وقت ایک یا زائد دفعہ پڑھی جائے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي	اے اللہ میرے گناہ معاف فرمادے
وَوَسِّعْ لِيْ فِي دَارِي	اور میرے گھر میں وسعت عطا فرما!
وَبَارِكْ لِي فِيْ رِزْقِيْ	اور میرے رزق میں برکت عطا فرما!

ایک خاص عمل رزق میں وسعت و برکت کیلئے ہمارے بزرگوں کے تجربے میں یہ رہا ہے، عشاء کہ نماز کے بعد باوضو (آپ اپنے گھر میں یا مسجد میں) رو بہ قبلہ بیٹھ کر پہلے گیارہ بار درود شریف پڑھیں پھر چودہ سو چودہ (۱۴۱۴) مرتبہ "یاوَهَّابُ" پھر ایک سو ایک بار "یاوَهَّابُ اهَبْ لِيْ منْ نعْمَةِالدُّنْيا وَالآخِرَةِ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ" پھر گیارہ بار درود شریف۔

وهّاب ۔ اللہ تعالیٰ کے بابرکت ناموں میں سے ایک نام ہے جسکا مطلب ہے۔ عطا فرمانے والا داتا۔

يَا وَهَّابُ، کہتے وقت دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔" يَا وَهَّابُ هَبْ لِيْ مِنْ نعمَةِ الدُّنيا والآخرة انك اَنْت الْوَهَّاب" کا مطلب ہے اے عطا فرمانے والے داتا مجھے دنیا اور آخرت کی نعمتیں عطا فرما! تو عطا فرمانے والا داتا ہے۔

ہر نماز کے بعد تسبیح فاطمہ اور کم سے کم تین دفعہ استغفار اور درود شریف کا بھی حتی الوسع اہتمام کیا جائے۔

یہ عاجز دعا کرتا ہے اور خود دعاؤں کا محتاج و طالب ہے اپنی اہلیہ مکرمہ کو بھی سلام فرمادیں اگر ہمارے بھائی پروفیسر لئیق احمد صاحب (اپنے والد ماجد) کی خدمت میں خط لکھیں تو ان کو اور آپ کی والدہ محترمہ ہماری قمری بہن کو میری طرف سے سلام لکھ دیں، دعا بھی کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

محمد منظور نعمانی

بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

دور معذوری اور فکرِ ملّت

"لیکن ترے خیال سے غافل نہیں"

۱- حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، لکھنؤ
۲- جناب منظور احمد صاحب، مالیگاؤں

☆☆☆☆☆☆☆☆

محمد منظور نعمانی
۵ر نومبر ۱۹۸۸ء

(۱)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

صدیق محترم و معظم(۱) احسن اللہ تعالی الیکم والینا
سلام ورحمت اکل عزیزم مکرم مولوی محمد غیاث الدین صاحب آئے تھے، انھوں نے آپ کا عنایت فرمایا ہوا 'المرتضیٰ' کا نسخہ پہونچایا، مجھے بھی اشتیاق تھا، انشاء اللہ ضرور پڑھوا کر سنوں گا۔

معلوم ہوا تھا کہ 'المرتضیٰ' کے رسم اجراء کی جو تقریب ہو
لئے مولانا رحمانی زید مجدھم اور پروفیسر خلیق نظامی صاحب اور خاہ
تشریف لا رہے ہیں۔ غالب گمان یہی ہے کہ ان حضرات کا قیام
ہوگا ـــــ افسوس ہے کہ میں بالکل اس حال میں نہیں ہوں کہ اس موقع پر
اگر حاضر ہوتا تو خود ہی ان حضرات سے عرض کرتا، اب آپ سے اور مولانا رحمانی زید مجدہم سے گذارش ہے کہ بابری مسجد کے قضیہ نے جو خطرناک شکل اختیار کرلی ہے اس موقعہ پر جمع ہونے والے حضرات کی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی بیان دیدیا جائے ـــــ اور اگر اس مقصد کے لئے وسیع پیمانے پر خواص اہل الرائے واصحاب دانش کا اجتماع بلانے کی رائے ہو جائے تو اس کے بارے میں فیصلہ فرمالیا جائے ـــــ ۲۶ر نومبر کو دہلی میں بابری مسجد کے سلسلہ میں جو کانفرنس بلائی جاری ہے اندیشہ ہے کہ اس کے بعد مسئلہ اور زیادہ خطرناک ہو جائے۔

مجھے احساس ہے کہ میں علیل ہوں اور اس وقت کی میری رائے بھی علیل ہے لیکن اس مسئلہ کی خطرناکی کے احساس سے آپ حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنے کا شدید داعیہ ہے۔ جس میں اسلام اور امت مسلمہ کی خیر ہو، اللہ تعالیٰ اس کی طرف رہنمائی فرمائے اور مقدرو میسر فرمادے۔

والسلام
بقلم ضیاء الرحمٰن محمود

---

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ

لکھنؤ

۱۶رجون ۱۹۷۵ء

(۲)

باسمہ سبحانہ

برادر مکرم بھائی منظور احمد صاحب(۱) زیدت حسناتکم

سلام مسنون !

خدا کرے ہر طرح عافیت ہو۔ اور سب احباب و مخلصین بخیر ہوں۔

پچھلے مہینے مئی میں بڑودہ سے ایک صاحب ملا صالح بھائی کا ایک خط ملا تھا اس کی لفظ بلفظ نقل میں اس خط کے ساتھ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس میں مالیگاؤں کا بھی ذکر ہے۔ میں نے بہت سوچا کہ اس معاملہ سے متعلق مالیگاؤں میں کس کو خط لکھوں، غور و فکر کے بعد میں نے یہ مناسب سمجھا کہ میں خط بھیج تو آپ کو دوں۔ آپ وہاں کے علماء اور دوسرے خواص میں سے وہاں کے حالات کے لحاظ سے جن کے بارے میں یہ سمجھیں کہ وہ اس طرف خصوصی توجہ کریں گے آپ ان کو میرا یہ خط پہونچادیں۔

غالباً مناسب یہ ہوگا کہ صرف دو چار مخلص اور صاحب فہم حضرات شروع میں اس بارے میں غور اور مشورہ کریں، پھر جن دوسرے حضرات کو مناسب سمجھیں شریک کریں۔

ملا صالح بھائی نے خط میں داؤدی بوہرہ جماعت کے اندر جس انتشار اور خلفشار کا ذکر کیا ہے اس کا ذکر اخبارات میں بھی آچکا ہے۔ بلاشبہ اس وقت اس کا بڑا امکان اور بڑی امید ہے کہ اگر صحیح طور پر ان لوگوں میں کام کیا جائے تو اللہ کے ہزاروں بندے ہدایت یاب ہو جائیں۔ یہ واقعہ ہے کہ داؤدی بوہرہ جماعت کے عقائد اسلامی عقائد سے بالکل مختلف ہیں۔ اور ان میں سے اگر کچھ لوگ اس مسلک کو چھوڑ کر صحیح اسلامی عقائد قبول کر لیتے ہیں تو عند اللہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی غیر مسلم کا اسلام قبول کر لینا۔ اس وقت ہم لوگوں پر یہ خاص فرض عائد ہوتا ہے کہ پہلے پورے غور و فکر سے طریقہ کار سوچیں اور ان لوگوں میں کام کریں، یہ کام بہت خاموشی سے ہونا چاہئے۔ غالباً انفرادی ملاقاتیں زیادہ مفید ہوں گی۔ اور مقامی حضرات ہی یہ کام اچھی طرح کر سکیں گے۔ مالیگاؤں میں اہل علم اور اہل فہم بھی ہیں اور الحمد للہ دوسرے مخلصین بھی

---

(۱) مالیگاؤں، مہاراشٹر۔

ہیں، میں یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اس خاص کام کی طرف توجہ دلاؤں۔ اس کام پر آخرت میں بڑے اجر و ثواب کی امید ہے، شاید یہی مغفرت کا وسیلہ بن جائے۔

گذشتہ سال دیوبند میں جو حادثہ مجھے پیش آیا تھا اس کے بعد سے میں سفر بہت کم کرتا ہوں، غیر معمولی شدید ضرورت ہو تو سفر کرتا ہوں، بظاہر اس کام کے سلسلہ میں میرے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر طریقۂ کار سے متعلق مشورہ کے سلسلہ میں میرا کہیں جانا مفید ہو سکتا ہو تو میں اس کام کے لئے سفر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

میں نے اسی طرح کے خطوط سورت، راندیر اور بمبئی کے بعض مخلصین کو بھی لکھے ہیں۔

میرے قلب پر اس کام کا بہت سخت تقاضا ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ اگر اخلاص و
دانشمندی اور خاموشی کیساتھ یہ کام کیا گیا تو اللہ تعالیٰ آپ حضر
ہدایت یاب کردے گا۔ اور عجب نہیں کہ یہی کام ہماری آپ کی
کہ اوپر لکھ چکا ہوں، حضرات علماء کرام اور دوسرے مخلص
حضرات کو میرا یہ خط دکھایا جائے۔ یہ گویا میری طرف سے ا
درخواست ہے۔ آپ صرف وسیلہ اور قاصد ہیں وہ اس مسئلہ پر باہم غور [illegible] ورہ کر [illegible] یں۔ اللہ
تعالیٰ دلوں میں صحیح تدبیر ڈالے اور اس کار خیر میں ہماری آپ کی رہنمائی فرمائے۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم محمد حسان نعمانی

۱- مہتمم مدرسہ فلاح دارین، ترکیسر
۲- جناب بھائی اسرار احمد صاحب، لکھنؤ
۳- جناب رئیس علی صاحب، رحیم آباد، ضلع لکھنؤ
۴- مولانا نیاز احمد رحمانی صاحب، (جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لابورڈ، مونگیر، بہار)

محمد منظور نعمانی
۲۶/مارچ ۱۹۸۸ء

محترمی و مکرمی(۱) احسن اللہ تعالیٰ الیکم و الینا
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ الحمد للہ اس حال میں ہوں کہ کوئی خاص اذیت اور تکلیف نہیں ہے، کبرسنی کے ضعف کے علاوہ امراض و عوارض بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو کفارۂ سیئات اور آخرت میں نجات کا وسیلہ بنائے۔

یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ اس سال دارالعلوم فلاح دارین سے ۲۲ طلبہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے، اللہ تعالیٰ ان حضرات کے علم میں برکت عطا فرمائے، اخلاص نصیب فرمائے، اور علم دین و نیابتِ نبوّت کی ذمہ داریوں کا صحیح احسا[illegible] فرمائے، علم دین کے ہم طلبہ اور مشتغلین کے لئے حضرت [illegible] لرزا دینے والی ہے، جو مشکوۃ المصابیح میں بھی صحیح مسلم کی [illegible] ہے(۲)۔

افسوس ہے کہ ہمارے طبقہ میں علمی انحطاط کے ساتھ بلکہ [illegible] کی کمی ہے، حالانکہ ہمارے مدارس کے نصاب میں حدیث کی پہلی کتاب مشکوۃ اور آخری کتاب صحیح بخاری دونوں کا آغاز مشہور حدیث پاک "انما الاعمال بالنیات الح" سے کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کا احساس اور اہتمام نصیب فرمائے۔

یہ عاجز دعاؤں کا سخت محتاج و طالب ہے، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کے لئے اور دارالعلوم کے لئے دعا کا کماحقہ اہتمام نصیب فرمائے اور قبول فرمائے۔

محترمی مولانا عبداللہ صاحب زید مجدہم کی خدمت میں سلام مسنون، اُن سے بھی دعا کا طالب ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود

---

(۱) مہتمم صاحب دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر۔ سورت (۲) حدیث میں دین کا علم نام و نمود کے لئے حاصل کرنے والوں کا یہ انجام بتایا گیا ہے کہ وہ سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ ان لوگوں کے ساتھ ایسے ہی شہیدوں اور نیک کاموں میں خرچ کرنے والے مالداروں کا بھی یہی انجام بتایا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے اس کے راوی بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اس حدیث ——— (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۲)

محمد منظور نعمانی
۷/اپریل ۱۹۸۸ء

مخلص مکرم بھائی اسرار احمد صاحب ! زیدت حسناتکم
سلام ورحمت!

اس وقت آپ کے مدرسہ جیلانیہ میں دستار بندی کا جلسہ جاری ہوگا، کل شام مجھے اس کا دعوت نامہ اطلاع نامہ آپ کی طرف سے کسی صاحب نے پہونچایا تھا، افسوس ہے کہ اپنی معذوری کیوجہ سے میں اس میں شرکت کی سعادت سے محروم ہوں۔

خاص کر ہمارے اس زمانہ میں حفظ قرآن کی توفیق اللہ تعالیٰ کا بڑا خاص انعام ہے، اللہ کا جو بندہ اپنے کم سن بچے کو حافظِ قرآن بنانا چاہتا ہے وہ اپنے پیارے بچے پر کم عمری میں بڑا بوجھ ڈالتا ہے۔ پھر یہ ایسا بوجھ ہے کہ زندگی میں کبھی بھی بچہ اس سے فارغ اور بے فکر نہ ہوگا، زندگی بھر یاد رکھنے کی محنت کرنی پڑیگی، اور دنیا میں زندگی بھر کی اس محنت سے کوئی دنیوی نفع حاصل نہ ہو سکے گا، اسلیئے اللہ کے جو بندے اپنے بچوں کو قرآن پاک حفظ کراتے ہیں، ان کے سامنے اللہ کی رضا اور آخرت کے ثواب کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا، میرے نزدیک اس وقت یہ خصوصیت صرف حفظِ قرآن کو حاصل ہے، اس کا اجر وصلہ اللہ تعالیٰ اپنی شانِ عالی کے مطابق آخرت میں بچوں کے والدین کو اور خود اس حافظ کو عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت کے سمجھنے کی توفیق ہم سب مسلمانوں کو عطا فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود قاسمی

کو بیان کرنا چاہا تو تین دفعہ ایسا ہوا کہ شروع کرتے اور مارے دہشت کے بیہوش ہو جاتے۔ اس حدیث کی ترمذی شریف (ابواب الزہد) کی روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ حدیث معاویہؓ کے سامنے بیان ہوئی تو ان کا روتے روتے یہ حال ہوا کہ گویا ہلاک ہو جائیں گے۔ (مرتب)

(۳)

محمد منظور نعمانی
۲ر جولائی ۱۹۸۸ء

عزیزم میاں رئیس علی صاحب(۱) سلمکم اللہ تعالیٰ وعافاکم
سلام ورحمت، خدا کرے آپ اور سب متعلقین بخیر وعافیت ہوں۔

ہمارے مخلص ترین دینی بھائی اور دوست آپ کے والد ماجد مرحوم شیخ فیاض علی صاحب کے حادثۂ انتقال کے بعد آپ نے جب پہلی دفعہ آم کی فصل آنے پر ان کے معمول کے مطابق آم بھیجے تھے تو اُس کے ساتھ مجھے خط بھی لکھا تھا، اس میں آپ نے لکھا تھا کہ میں والد صاحب مرحوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کو یہ آم بھیج رہا ہوں

جو صاحب آم اور آپ کا یہ خط لائے تھے وہ دیگر

گذشتہ سال بھی ایسا ہی ہوا تو میں نے آپ کو خط لکھا تھا غالبًا
رحیم آباد ہاؤس لکھنؤ کے پتہ پر لکھا تھا یا باقی نگر کے پتہ پر)
کوئی صاحب آپ کی طرف سے آم پہونچا گئے، مجھے بعد میں
ہوں، یہ ایک صاحب کے ذریعہ رحیم آباد ہاؤس بھیجونگا، اگر وہاں
نہیں باقی نگر رہتا ہے تو پھر ڈاک سے باقی نگر روانہ کردیا جائیگا، خدا کرے پہونچ جائے۔

مجھے آپ کو صرف یہ لکھنا ہے کہ مرحوم ومغفور بھائی شیخ فیاض علی صاحب کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ آم کی فصل آنے پر وہ آموں کا تحفہ بھیجتے (اللہ تعالیٰ ان کے ہر بار کے تحفے کو قبول فرمائے اور اس کے حساب میں جنت کے بہتر سے بہتر پھل ان کو عطا فرمائے۔) بلکہ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر دو تین مہینے کے بعد تشریف لاتے، ان کی نوٹ بک میں کچھ سوالات لکھے ہوئے ہوتے وہ دریافت فرماتے، میں اگر جواب دے سکتا تو جواب دیدیتا، بہر حال وہ سال میں کم سے کم چار پانچ مرتبہ ملاقات بھی فرماتے اور کچھ دینی خدمت بھی لیتے۔

میرے عزیز! شاید آپ کو معلوم ہو کہ میں ایکسیڈنٹ کے نتیجہ میں قریباً تیرہ سال سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہوں، میرا بستر ہی میری مسجد ہے ــــــ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں خود کبھی کبھی رحیم آباد ہاؤس آیا کرتا۔ بہر حال آپ سے کہنا یہ ہے کہ آپ کا تحفہ بسر وچشم قبول۔ آپ کے لئے اور آپ کے گھرانے کے لئے دعا بھی کرتا ہوں لیکن اپنے والد صاحب مرحوم و

---

(۱) رحیم آباد، ضلع لکھنؤ

مغفور کے نقش قدم پر چلنے والی بات جب صحیح ہوگی جب کبھی کبھی آپ اُن کی طرح میرے پاس آنے کی زحمت بھی برداشت کریں اور مجھے کچھ دینی خدمت کرنے کا موقعہ ملے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دینی و دنیوی سارے معاملات میں آپ کو اپنے مرحوم و مغفور والد صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی پوری توفیق عطا فرمائے، اور اس کا فضل و کرم ہر طرح آپ کے شامل حال رہے۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود القاسمی

(۴)

محمد منظور نعمانی
۲۷ر فروری ۱۹۸۹ء

برادر مکرم جناب مولانا نیاز احمد رحمانی صاحب(۱) ! رید مجدکم
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فیس رکنیت کی یاددہانی کے سلسلہ میں عنایت نامہ کل موصول ہوا۔ میرا یہ مستقل معمول ہے کہ رکنیت کی فیس کے بارے میں جب بھی یاددہانی کی جاتی ہے میں روانہ کرادیتا ہوں۔ مجھے اتنی بات یاد ہے کہ ۱۹۸۷ء کے اواخر میں آپ کی طرف سے اسی طرح یاددہانی فرمائی گئی تھی، میرے ذمہ اس وقت تک کی فیس جو واجب الادا تھی وہ میں نے روانہ کرادی تھی، مجھے مقدار صحیح یاد نہیں، آپ نے ایک سو پینتیس (۱۳۵) تحریر فرمائے ہیں، یہی رقم بھیجی گئی ہوگی۔

مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں جو عریضہ لکھا تھا، اس میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ آئندہ سال ختم ہونے سے پہلے یاددہانی فرمادی جائے، میرے لئے یہ آسان ہے کہ ہر سال کی فیس اسی سال میں روانہ کرادی جائے ——— بہر حال میرے خیال اور میری یاد کے مطابق

(۱) دفتر جنرل سکریٹری، مسلم پرسنل لا بورڈ، مونگیر، بہار۔

۱۹۸۸ء کی فیس میرے ذمہ واجب الادا ہے، ۸۹ء شروع ہوا ہے، اسکے نصف آخر میں کسی وقت بھی یاد دہانی فرمادی جائے، بشرط حیات انشاءاللہ حسب معمول روانہ کرادونگا۔

اس وقت ۸۸ء کی فیس مبلغ پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر روانہ کرائی جارہی ہے۔

دعاؤں کا محتاج وطالب اور دعا گو ہوں۔

بشرط یاد و سہولت حضرت مولانا منت اللہ صاحب زید مجدہم کی خدمت میں سلام مسنون اور دعا کی درخواست۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ
بقلم محمد ضیاء الرحمٰن محمود
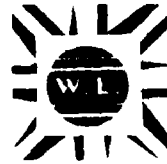
جناب فضل حق عارف خیر آبادی

"گلشنِ علم و عمل کی پڑ گئی مدّھم بہار"

پیکرِ صدق وصفا تو خادمِ دینِ متیں
آسمانِ علم کا عزت نشاں ماہ مبیں

اہلِ دل اہلِ نظر کی صف میں تھا تو با کماں
عصر حاضر میں نہیں ملتی کوئی تیری مثال

سونی سونی علم کی محفل ہے اب تیرے بغیر
مطمئن ہو زندگی مشکل ہے اب تیرے بغیر

تو حدیثِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکتہ داں وترجماں
ملتِ بیضاء کا تو بیشک تھا میر کارواں

پاک ظاہر، پاک باطن، پاک طینت، پاکباز
اپنے ہمعصروں میں حاصل تھا تجھے اِک امتیاز

قوم اِک انگشتری اس کا نگینہ تیری ذات
محفلِ علمائے دیں میں آبگینہ تیری ذات

تیری ذات خاص خوش اخلاق و خوش اطوار تھی
شاہراہِ دین و ملت تجھ سے پر انوار تھی

تو بلا شبہ خدائے پاک کا منظور تھا
تیرا "نعمانی" لقب ہر چار سو مشہور تھا

مسلکِ دیوبند کا تو ترجمان و حق نگار
یعنی پوری زندگی تیری رہی سنّت شعار

تیری حق گوئی سے بدعت کا ہوا سینہ فگار
اہل بدعت تیری ضربوں سے ہوئے زار و نزار

رحلتِ منظور نعمانیؒ سے عارف سوگوار
گلشنِ علم و عمل کی پڑ گئی مدھم بہار

☆☆☆

کارزارِ حیات میں!

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ
آمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ
لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا
بِأَمْوَالِھِمْ وَأَنْفُسِھِمْ فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ أُولٰٓئِکَ ھُمُ
الصّٰادِقُوْنَ

"مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اسکے رسول پر، پھر شک میں نہیں پڑے، اور جہاد کیا
اپنے مال اور اپنی جانوں سے، اللہ کی راہ میں، یہی ہیں سچے۔" [القرآن ۴۹/۱۵]

[اس مضمون میں اقتباسات کی کثرت اور طوالت کی وجہ سے
اقتباس کی کتابت کا طرز عام طرز سے کچھ مختلف کر دینا پڑا ہے۔]

عتیق الرحمٰن سنبھلی

بانوے/چورانوے سالہ زندگی

منزل بہ منزل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیدائش

آپ کے آبائی وطن سنبھل کے میونسپل بورڈ والے سرکاری اندراجات کو اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تو آپ نے ۱۸؍ جنوری ۱۹۰۶ء (مطابق ۲۲؍ ذی قعدہ ۱۳۲۳ھ) کو اس خاکدانِ عالم میں قدم رکھا، لیکن خود آپ کی اپنی ایک تحریر کی رو سے آپ کی پیدائش کا مہینہ شوال ۱۳۲۳ھ ہے۔ (جسکی مطابقت جنوری ۱۹۰۶ء کے بجائے دسمبر ۱۹۰۵ء سے ہوتی ہے) آپ کی یہ تحریر الفرقان بابت ماہ ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ میں شائع ہونے والے آپ کے ایک مضمون "میری زندگی کے تجربات اور خاص خاص واقعات" کی تمہید میں پائی گئی ہے۔ اس میں فرمایا ہے کہ "اس نامۂ سیاہ" محمد منظور (عفاعنہ ربہ الغفور) کی عمر بھی اس گزرے ہوئے شوال میں چالیس سال پوری ہو گئی"۔ اس بیان کی رو سے یہ سمجھا جانا چاہئے کہ میونسپل بورڈ کے کاغذات میں اندراج کچھ دیر سے ہوا۔ یہ اندراج اگر صحیح وقت پر ہوتا تو جنوری ۱۹۰۶ء کے بجائے دسمبر ۱۹۰۵ء کی کوئی تاریخ آپ کی تاریخ پیدائش کے خانے میں درج ہوتی (۲)۔

۔ شمسی سال کے حساب سے عمر تقریباً بانوے سال ہوئی۔ اور قمری حساب سے پورے چورانوے سال۔

(۲) مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا بیان ہے کہ ایک صحبت میں انکی موجودگی میں یہ فرمایا تھا کہ "میری تاریخ پیدائش ۱۸؍ شوال ۱۳۲۳ھ ہے" اور اس کو انھوں نے نوٹ کر لیا تھا۔ اس بیان سے جہاں قمری مہینے کی تاریخ معلوم ہو جاتی ہے وہاں دسمبر ۱۹۰۵ء کے بارے میں بھی متعین ہو جاتا ہے کہ اسکی ۱۶ تاریخ تھی۔

خاندانی ماحول

سنبھل کے بارے میں تو تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ہندوستان میں تُرکانِ احرار کی ابتدائی آمد ہوئی تو ان کی ایک بڑی تعداد نے سنبھل اور اس کے قرب وجوار کو وطن بنالیا۔ آپ کا گھرانہ، بلکہ سنبھل کا وہ پورا محلّہ (دیپا سرائے) جس میں یہ گھرانہ آباد ہے انہی تُرکانِ احرار کی یادگار ہے۔ آپ کے والد ماجد (اور راقم الحروف کے دادا صاحبؒ م ۱۹۴۸ء) کے بارے میں الفرقان میں بھی آچکا ہے۔ اور گذشتہ سال شائع ہونے والی کتاب "تحدیث نعمت" میں بھی ذکر ہوا ہے کہ وہ دین اور دنیا ہر لحاظ سے نہایت خوش قسمت لوگوں میں سے تھے۔ صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ کی دولت سے مالا مال ہو نیکی بناپر "صوفی" نام کا جزء بن گیا تھا۔ یعنی صوفی احمد حسین یا صوفی جی کہلاتے تھے۔ اور اللہ نے دنیاوی رفاہیت کے ساتھ عزت ووجاہت بھی باوجود بالکل سادہ صوفیانہ ودرویشانہ رہن سہن کے، اتنی عطا فرمائی تھی کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی جوان کے محلے میں قدم رکھتا لازم تھا کہ ان کے دروازے پر تھوڑی دیر ضرور بیٹھے۔ اولاد کے معاملے میں بھی اللہ نے انھیں بہت خوش قسمت کیا تھا۔ مجموعی طور پر انکے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ اور اللہ کے کرم سے سب کے سب دین کے معاملے میں اپنے والد کے نقش قدم ہی پر رہے۔

والد ماجد (یعنی حضرت بانیٔ الفرقان) ان میں چوتھے نمبر پر تھے، آپ کے اوپر دو بھائی شیخ غلام امام صاحب اور مولوی محمد حسن صاحب اور ایک بہن تھیں۔ ان کی والدۂ ماجدہ کے انتقال کے بعد دادا صاحب (صوفی احمد حسین صاحب) نے عقد ثانی فرمایا تو ان دوسری اہلیہ کے بطن سے سب سے پہلے آپ (والد ماجد) کو وجود ملا، آپ کے بعد تین بھائی اور دو بہنیں علی الترتیب یوں تھے۔ حاجی محمود حسین صاحب، حلیمہ بی بی، مولوی حکیم محمد احسن صاحب، ساجدہ خاتون اور محمد عارف صاحب۔ (۱) راقم الحروف کو الحمد للہ ان سب کو (سوائے محمد عارف صاحب) کم

---

(۱) ان میں سے محمد عارف صاحب تو بچپن ہی میں انتقال کر گئے باقی سب نے اتنی عمر اللہ کے فضل سے بہر حال پائی کہ اپنے بعد اولا چھوڑی۔ اور دادا جان مرحوم کی نیکی ونیک نیتی کے طفیل ان سب کی اولاد میں بھی دین وشریعت کا اتنا لحاظ قائم رہا اور ہے کہ اب بھی یہ گھرانہ صالحین ہی کا گھرانہ شمار ہوتا ہے۔ محمد عارف صاحب مرحوم کے سوا جو پانچ بیٹے صاحب اولاد ہوئے ان میں سے ایک کے یہاں تو نرینہ اولاد نہ تھی بیٹیاں ہی تھیں۔ ایک بیٹا ہوا جو بچپن ہی میں انتقال کر گیا باقی چار میں سے ہر ایک کی اولاد میں کم از کم ایک عالم دین ضرور ہے۔ مولوی زکریا صاحب استاذ حدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ ہمارے بڑے تایا شیخ غلام امام مرحوم کے فرزند ہیں جو کہ خود عالم نہ تھے، ان کے سب سے بڑے بیٹے (محمد فضیل صاحب) بھی عالم تھے جن کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے استاذ ندوہ مولانا محمد عارف سنبھلی ہمارے مرحوم چچا محمود حسین صاحب کے بیٹے ہیں۔ یہ چچا بھی خود عالم نہ تھے، سب سے چھوٹے چچا مولوی محمد احسن صاحب کے چھ بیٹوں میں سے بھی دو عالم ہیں، اور جامعہ مدینۃ العلوم سنبھل کے ذمہ دار ہیں، تایا مولوی محمد حسن صاحب کے یہاں بیٹا نہ تھا، مگر سب بیٹیوں کو باقاعدہ ترجمہ قرآن پڑھایا، اور ان میں سے ایک اپنے زیادہ تبلیغی ذوق کی وجہ سے مولون ہی کہلاتی ہیں۔

وبیش اچھی طرح دیکھنے کی سعادت ملی۔ سب میں اپنے والد کی نیکیوں اور طور طریق کا عکس تھا۔ غالباً سبھی تہجد گذار تھے، اور بیٹوں میں سے تین تو باقاعدہ فارغ التحصیل عالم دین تھی، جن میں ایک حضرت والد ماجد (بانئ الفرقان) ہیں۔

تعلیم

تعلیم کی سرگذشت بھی الفرقان کے صفحات میں بعض موقعوں پر آچکی ہے اور "تحدیث نعمت" میں بھی مجملاً ذکر آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سال کی عمر تک تعلیمی حال بالکل ہی ناقابل رشک تھا۔ اس کی کچھ تفصیل "میری زندگی کے تجربات" والے مضمون میں ملتی ہے۔

ابتدائی تعلیم

"قرآن شریف ناظرہ اور معمولی سی اردو پڑھانے کے بعد ہی فارسی
کے بعد بہت چھوٹی عمر ہی میں (یعنی عمر کے غالباً آٹھویں یا نویں سال میں) عرذ
شروع کرادی گئی۔ میرا اندازہ ہے کہ اگرچہ میں اس ہی عمر میں عربی کی ابتدائی تعلیہ
ہے کہ "میزان الصرف" اور "صرف میر" و"نحو میر" وغیرہ کے ذریعے ہمارے ہ ...
ونحو کی ابتدائی تعلیم کا جو مشکل طریقہ عموماً رائج ہے، میری سمجھ ابھی اس سے استفادہ کرنے کے قابل نہیں ہوئی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ استاد کی مار کے ڈر سے میں گردانیں اور قاعدے بھی زبانی یاد کرلیتا تھا لیکن کچھ نہ سمجھتا تھا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ہر پڑھا ہوا سبق در حقیقت میرے لئے بے پڑھا ہی رہتا تھا اور جب میری تعلیمی خامی دیکھ کر یا کسی دوسری وجہ سے میرے گھر والے مجھے ایک مکتب یا ایک مدرسے سے دوسرے کسی مکتب یا مدرسہ میں بھیجتے تھے تو وہاں کے استاذ مجھے پھر پیچھے ہٹا دیتے تھے اور مجھے وہی پڑھی ہوئی کتاب پھر پڑھانی شروع کی جاتی تھی، اور غضب یہ ہے کہ پھر اسی طریقہ سے پڑھائی جاتی تھی جس سے میں اس عمر میں استفادہ کے قابل نہیں تھا۔ مجھے اب یاد بھی نہیں رہا کہ ان دنوں میں کتنی دفعہ میں نے کون کون کتاب کہاں کہاں پڑھی ہاں اتنا یاد ہے کہ "میزان" سے لے کر "علم الصیغہ" اور "ہدایت النحو" تک قریباً ہر کتاب ہی میں نے دو تین بار ضرور مختلف مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھی ہے اور مجھے یاد نہیں کہ ان پڑھانے والے بزرگوں میں سے کسی نے مجھے اس طریقہ سے پڑھانے کی کوشش کی ہو جو طریقہ میری اس وقت کی عمر اور فہم کے مناسب ہو سکتا تھا اور جس کا میں متحمل ہو سکتا تھا۔

ایک تو وہ عمر ہی کھیل کود اور پڑھنے لکھنے کے کام سے جان چرانے کی تھی پھر تعلیم کے اس غلط طریقہ نے پڑھنے کی طرف سے دل اور بھی اچاٹ کر رکھا تھا اور مجھے خوب یاد ہے کہ گھر پہ اور مدرسہ میں پٹنے کے خوف کے سوا کوئی اور محرک اور داعیہ مدرسہ جانے اور سبق پڑھنے کے لئے گویا تھا ہی نہیں۔ افسوس ہے کہ اس غیر شعوری تعلیم میں اس طرح میرے پانچ، چھ برس ضائع ہوئے۔

اس کے بعد میں ایک نئے استاذ کی خدمت میں پہونچایا گیا(۱)۔ انھوں نے میری حالت جانچنے کے بعد مجھ سے فرمایا

---

(۱) تحدیث نعمت میں ان استاذ محترم کا نام مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانویؒ بتایا گیا ہے۔

کہ اگر خود تمہارا ارادہ پڑھنے کا ہو تو ہم تم کو از سر نو پڑھائیں گے، لیکن تمہارا وقت زیادہ خراب نہیں ہوگا، چنانچہ انھوں نے پڑھ شروع کیا اور چونکہ ان کا طریقۂ تعلیم صحیح تھا نیز عمر کے ساتھ میری سمجھ کا درجہ بھی بڑھ گیا تھا اسلئے اب جو کچھ وہ پڑھا اور بتاتے وہ بحمد للہ اچھی طرح ذہن کی گرفت میں آجاتا تھا جس کی وجہ سے سبق کی بہت زیادہ مقدار بھی طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام پچھلے پانچ چھ برس میں نہیں ہوا تھا وہ بحمد اللہ یہاں پانچ چھ مہینے سے بھی کچھ کم ہی میں ہو گیا اور اب خو اپنی طبیعت بھی پڑھنے کے لئے کھل گئی ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت میں صرف میں فصول اکبری اور نحو میں کافیہ اور منطق میں مرقات تک کی کتابیں میں نے پڑھ لیں اس کے بعد سنبھل کے مشہور درسی عالم حضرت مولانا کریم بخش صاحب (م ۱۳۶۱ھ) کی نگرانی اور خدمت میں دیکر میں مئو (ضلع اعظم گڑھ) بھیج دیا گیا(۱)۔ جہاں کے ایک مدرسہ میں مولا موصوف صدر مدرس تھے میں پورے تین سال اس مدرسہ کا طالب علم رہا اور ان تین سالوں میں درسی متوسطات قریب قریب پوری ہو گئیں، جہاں تک یاد ہے غالبًا میں نے میر زاہد رسالہ مع حواشی علام یحیٰی، شرح ہدایہ، الحکمۃ للمیبذی، حسامی، شرح عقائد نسفی، دیوان متنبی، تک کی درسی کتابیں ان تین سالوں میں اسی مدرسہ میں پڑھیں۔ حسن اتفاق سے یہاں مجھے دو تین ساتھی ایسے مل گئے جو بڑی محنت سے پڑھتے تھے انھیں دیکھ کر مجھے بھی محنت کا شوق ہوا اور اس جذبۂ مسابقت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسا اوقات رات کے دو تین بجے تک میں اپنی زیر درس کتابوں کے مذاکرہ یا مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔

اس کے بعد استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب مرحوم وطن عزیز سنبھل ہی کے ایک مدرسے میں صدر مدرس ہو کر وہیں رہ گئے، میں بھی اس سال وہیں رہا اور اس تمام سال میں صرف معقول کی بقیہ درسی (اور بعض غیر درسی بھی) کتابیں پڑھیں یعنی حمد اللہ، قاضی مبارک، بحر العلوم، شرح سلم، میر زاہد ملا جلال، اسکا حاشیہ بحر العلوم، صدرہ، شمس بازغہ، خیالی، میر زاہد امور عامہ، توضیح تلویح، اسکے علاوہ دینیات میں اس سال جلالین کے صرف ابتدائی چند پارے بھی پڑھے، چونکہ حضرت استاد مرحوم کی مجھ پر خاص عنایات تھیں اور ان معقولی کتابوں کے درس میں انھیں خاص امتیاز حاصل تھا اور میں بھی اس زمانہ میں واقعی "طالب علم" بنا ہوا تھا، یعنی مطالعہ وغیرہ میں بہت محنت صرف کرتا تھا، اسلئے ان "معقولات" میں مجھے امتیاز حاصل تھا یہاں تک کہ شمس بازغہ اور میر زاہد امور عامہ کے تو غالبًا دو ہی چار سبق پڑھ کر حضرت استاذ کو زحمت دینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اور خود ہی ان دونوں کتابوں کو اس طرح دیکھ ڈالا کہ چند مہینوں کے بعد جب دار العلوم دیوبند جانا ہوا تو داخلہ کے امتحان میں بھی ان دونوں کتابوں کو غالبًا میں نے لکھایا تھا۔"

طالب علمی کے آخری دو سال
دار العلوم دیوبند میں

"اپنی تعلیم کی جس منزل کا میں نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے، یہاں تک پہونچتے پہونچتے "معقولات" میں تو اگرچہ میں نے مروجہ درسی کتابوں سے گذر کر بعض غیر درسی کتابیں بھی پڑھ ڈالی تھیں، لیکن دینیات کا حال یہ تھا کہ "ہدایہ اولین" بھی نہیں پڑھی تھی ہاں جیسا کہ ابھی عرض کیا صرف جلالین کے ابتدائی تین چار پارے ضرور پڑھے تھے اور اُس کے بعد یہ اندازہ کر کے کہ کتاب بہت آسان ہے سبق میں حاضر ہونا ہی چھوڑ دیا تھا (اگرچہ دوسرے رفقائے درس نے کتاب قریب قریب ختم ہی

---

(۱) یہاں مئو سے پہلے کے ایک سال کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ "تحدیث نعمت" کے مطابق حضرت مولانا کریم بخش صاحب کے ساتھ پہلا سال دہلی کے مدرسہ عبد الرب میں گزرا تھا، جو شوال ۳۹ھ تا شعبان ۴۰ھ تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا کریم بخش صاحبؒ دار العلوم مئو، تشریف لے گئے اور تین سال وہاں رہے۔

کر کے چھوڑی) بہر حال مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ تعلیم کی اس منزل تک میں "دینیات" میں گویا کورا تھا، رمضان مبارک ۱۳۴۳ھ میں آگے کی تعلیم کیلئے جب دارالعلوم دیوبند جانے کا میں نے ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ جو کتابیں وہاں جاکر میں پڑھنا چاہتا ہوں، وہاں کے قانون کے مطابق، فقہ میں کم از کم ہدایہ اولین اس سے پہلے پڑھی ہوئی ہونا چاہیے، چنانچہ میں نے رمضان ہی میں ہدایہ اولین کا مطالعہ کرلیا اور شوال ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوگیا اور دو سال میں اپنی باقی نصابی تعلیم کی میں نے یہاں تکمیل کی، پہلے سال میں مشکوٰۃ شریف، شرح نخبۃ الفکر، ہدایہ اخیرین اور دیوان حماسہ وسبعہ معلقہ، یہ کتابیں باقاعدہ "مدرسہ کے اسباق" کے طور پر پڑھیں اور اسکے علاوہ ہیئت میں تصریح وشرح چغمنی اور فلسفہ میں شرح اشارات طوسی، یہ تینوں کتابیں بھی اسی سال دارالعلوم ہی کے اساتذہ سے خارجی طور پر پڑھیں۔ دوسرا پورا سال دورہ حدیث مع تفسیر بیضاوی سورہ بقرہ میں لگا"۔

دورۂ حدیث والے سال کے بارے میں یہاں بس اتنے ہی الفاظ ہیں۔ لیکن "تحدیث نعمت" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سال آپ کی تعلیمی زندگی کا اہم تر [illegible] تھا [illegible] سال بھی تھا۔ وہاں اسکی کچھ تفصیل اسی اہمیت کے ساتھ آئی۔

"دوسرے سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں شریک ہوا، یوں تو اُس وقت [illegible]
فن کے امام اور صلاح و تقویٰ اور تعلق مع اللہ میں صاحب مقام تھے۔ لیکن ان میں [illegible]
العلام حضرت مولانا محمد انور شاہ قدس سرہٗ کا خاص الخاص مقام تھا۔ جنھوں نے [illegible]
کہ چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں اس شان کا بھی کوئی متبحر عالم ہو [illegible]

اساتذہ کے اعتبار سے اس خوش نصیبی کے علاوہ خود اپنے طالب علمانہ حال کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

"میں طالب علمی کے زمانہ میں، خاص کر دارالعلوم کی طالب علمی کے دو سالوں میں صرف طالب علم تھا۔ اور اول و آخر دلچسپی بس درس و مطالعہ سے تھی"(ص ۴۴)

خاص کر آخری سال کے بارے میں لکھا ہے کہ -

"یہ پورا سال اس طرح گزرا تھا کہ دن رات کے اکثر اوقات میں حدیث شریف کی کتابوں ہی سے اشتغال رہتا تھا"(ص ۳۰)

اور پھر اس محنت ودلچسپی کا پھل آپ نے اس شکل میں پایا کہ امتحان کے گیارہ پرچوں میں سے پانچ میں آپ کے نمبر اعلیٰ ترین مفروضہ نمبروں (۵۰) سے بھی زیادہ تھے۔ (جو وہاں کی ایک روایت ہے کہ ممتحن اگر جوابات سے بہت خوش ہوتا ہے تو کچھ نمبر اپنی طرف سے بڑھا سکتا

---

(۱) حضرت شاہ صاحب کے علاوہ آپ کے باقی اساتذۂ دارالعلوم کے اسماء گرامی آپ کی تحریر کے مطابق یہ ہیں۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں، حضرت مولانا سراج احمد رشیدی، حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی، حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی۔ (الفرقان اپریل ۸۰ ص ۳۳)

ہے۔) تین پرچوں میں پورے پچاس تھے اور صرف تین پرچوں میں ۵۰ سے ایک یا دو تین نمبر کم۔ نتیجۂ امتحان کی یہ تفصیل ہمارے سامنے مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند (مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب) کے اس مضمون کے ذریعے آئی ہے جو اسی نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ جس مین نتیجہ امتحان کا پورا چارٹ نقل ہوا ہے۔

یہ شعبان ۱۳۴۵ھ کی بات ہے جس میں دارالعلوم میں آپ کا دوسرا اور آخری سال تمام ہوا۔ اور اسکے ساتھ ہی رسمی طالب علمی کا دور بھی ختم ہو گیا۔

فراغت کے بعد

دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد آپ نے آئندہ ہی سال سے اپنے بزرگوں کا پسندیدہ شغل تدریس اختیار فرمایا۔ سنبھل کا مدرسہ محمدیہ جو آپ کے محلے ہی میں واقع تھا اور اسی میں آپ کی اپنی تعلیم کی ابتداء بھی ہوئی، شوال ۱۳۴۵ھ، ۱۹۲۷ء میں وہیں سے آپ کی تدریسی خدمات کا آغاز ہوا۔ "تحدیث نعمت" میں "تعلیم سے فراغت" کے بعد کے زیر عنوان تحریر فرمایا ہے کہ -

"شعبان ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت ہوئی۔ اسکے اگلے سال اپنے وطن کے مدرسۂ محمدیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد یہی سلسلہ تین سال تک امروہہ (۱) کے ایک مدرسے میں قائم رہا جو اپنے جائے وقوع محلہ چلہ کی مناسبت سے مدرسہ (اسلامیہ) چلہ کے نام سے معروف تھا"۔

تدریس کے ساتھ ساتھ دین کی مناظرانہ خدمات بھی:

"زندگی کے تجربات و خاص خاص واقعات" کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے کہ بعض خاص اتفاقی وجوہات سے زمانہ طالب علمی ہی میں مناظرہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اُس وقت مناظرہ کے تین بازار خاص طور سے گرم تھے، [۱] آریہ سماج سے مناظرہ کا بازار جس میں شردھانند جی کی شدھی سنگھٹن کی تحریک نے اُس وقت خاص گرمی پیدا کر دی تھی، [۲] قادیانی مناظروں کا بازار جس کو مرزا صاحب آنجہانی ہی خود قائم کر گئے تھے اور "بہر کوچہ و بازار مرزائیت کے چرچے" کے لئے جوان کی ایک اچھی تدبیر تھی، [۳] تیسرا بازار "اہل بدعت" سے مناظرہ تھا، یہ اگرچہ تحریک خلافت کے اثر سے کئی برس تک ٹھنڈا پڑا رہا یہاں تک کہ گمان ہو سکتا تھا کہ شاید یہ اپنی موت مر گیا۔ لیکن ۱۳۴۳ھ میں حجاز پر سلطان ابن سعود والی نجد کے تسلط نے اس مردہ میں پھر اچانک جان ڈال دی اور پھر اس میں خوب گرمی آگئی۔

بہر حال راقم سطور جس زمانہ مین، دارالعلوم دیوبند کا "طالب علم" تھا مناظرہ کے ان تینوں میدانوں سے اسے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ "طالب علمی" کا سفر ختم کر کے تدریسی شغل کے ساتھ اس معرکہ آرائی میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

---

(۱) یہ سنبھل ہی کی طرح ضلع مرادآباد (اتر پردیش) کا ایک قدیم مشہور قصبہ ہے، سنبھل سے بہ جانب شمال، اب شاید ضلع کا نام کچھ اور ہو گیا ہے۔ یعنی ایک نیا ضلع بن گیا ہے۔

اس کے بعد ان تین میں سے اپنے خاص مناظرانہ میدان کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"قادیانیوں اور آریوں سے مناظرہ کرنے والوں کی چونکہ کوئی خاص کمی نہ تھی اس لئے ان دونوں فریقوں سے تو مناظروں کا اتفاق دو چار دفعہ سے زیادہ نہیں ہوا، لیکن "اہل بدعت" یعنی مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے وہ مقلدین یا پسماندگان جن کو اپنے مثبت اور ایجابی عقیدوں سے زیادہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ، حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ وغیرہ بزرگانِ دیوبند کے (معاذاللہ) کافر اور خارج از اسلام ثابت کرنے پر اصرار رہتا ہے چونکہ اس پارٹی کے زباں دراز مقرروں اور مناظرہ کے مدعیوں کے تعاقب سے متوسلین دیوبند میں سے کسی اور کو اس زمانہ میں دلچسپی نہ تھی اور میری دلچسپی اس بارہ میں حد افراط کو پہونچی ہوئی تھی، اس لئے اس فریق سے مناظروں کی نوبت بہت زیادہ آئی۔

یہ خدمت دلچسپی سے بڑھ کر شوق بن گئی:

"آگے فرماتے ہیں۔" بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس پارٹی میں بھی کوئی مناظر مناظرہ کا ایسا شوقین
میرا حال تھا۔ بلکہ اگر ان میں سے کسی کو مجھ سے آدھی چوتھائی بھی مناظرہ کی دھت ہوتی
ہفتہ بھی مناظرہ سے خالی نہ جایا کرتا، یہ واقعہ ہے کہ بعض دفعہ مجھے کسی ذریعہ سے اط
مناظر فلاں جگہ پہونچا ہوا ہے تو میں اپنے ہی کرایہ سے وہاں پہونچ گیا۔ اور "مان نہ مان"
کسی طرح مناظرہ کی صورت پیدا کر ہی لی۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض دفعہ فریق مخالف
تک کا سفر خرچ دینا بھی اپنے ذمہ کر لیا اور دیا اور ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سب کچھ طے
ہو جانے کے باوجود جب فریق ثانی کے مناظر تاریخ مقررہ پر نہ پہونچے تو ان کو بذریعہ تار نوٹس دیکر کہ اگر آپ نہیں آئیں گے تو آپ کو سارا ہرجہ خرچہ ادا کرنا پڑے گا۔ آنے پر مجبور کر دیا اور مناظرہ کر کے چھوڑا۔ غرض مناظرہ کا شوق کیا تھا اچھا خاصہ طوفان تھا، جو روز افزوں طغیانی ہی پر تھا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اللہ کی عنایت سے اور بظاہر اسباب اپنی تیاری اور اس راہ کے داؤ گھات سے واقف ہو جانے کی وجہ سے بھی ہر میدان میں پالی اپنے ہی ہاتھ رہتی تھی غرض یہ چیز بھی اس شوق کی ہمت افزائی کا ایک بڑا باعث ہوئی"۔

الفرقان کا اجراء

اس مناظرانہ ذوق کے زمانے میں اور اسی کے زیر اثر الفرقان کے اجراء کا فیصلہ کیا۔ اور وہ بھی عین مولانا احمد رضا خاں صاحب کے مرکز بریلی سے، یہ فیصلہ شوال ۵۲ھ۔ فروری ۳۴ء کے ایک مناظرانہ قضیے ہی کا نتیجہ تھا۔ تحدیث نعمت میں اسکی پوری تفصیل آئی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس مہینے کے لئے ایک بہت اہم بلکہ تاریخی نوعیت کا مناظرہ لاہور میں ہونا طے ہوا تھا۔ اہمیت یہ تھی کہ مناظرہ کی بابت فیصلے کے لئے تین نہایت مؤثر اشخاص کو حکم بنانا طے ہوا تھا۔ اور ان حضرات نے منظور بھی کر لیا تھا۔ ان تین میں سے ایک علامہ اقبال تھے۔ مقصد یہ تھا کہ فریقین کی بحث سن کر حکم حضرات جس فریق کے حق میں بھی فیصلہ دیدیں کہ متنازع مسائل میں اس کا

موقف صحیح ہے۔ یا اس حد تک صحیح اور اس حد تک غلط ہے۔ اس کو دونوں فریق تسلیم کر لیں اور پھر روز روز کی معرکہ آرائی اور اسی کے ساتھ افتراق بین المسلمین کی نامبارک صورت ختم ہو جائے۔ لیکن فریق ثانی نے ہر گفتنی اور ناگفتنی طریقہ اختیار کر کے اس فیصلہ کن مناظرہ کا انعقاد ناممکن بنا دیا۔ بس یہی چیز اس فیصلہ کا باعث ہوئی کہ ایک ماہنامہ جس کا خیال کافی دنوں سے ذہن میں چل رہا تھا اب بلا تاخیر الفرقان کے نام سے جاری کر دیا جائے اور فوری کام اسکے ذریعہ یہ کیا جائے کہ لاہور کے مجوزہ مناظرے کیلئے جو مباحث طے ہوئے تھے ان پر اپنی بحث اس کے صفحات میں پیش کرتے ہوئے فریق ثانی سے کہا جائے کہ وہ اسکے جواب میں جو کچھ کہنا چاہے تحریری شکل میں پیش کرے اسے بھی شائع کیا جائے گا اور پھر دونوں طرف کی مکمل بحث ان ہی ججوں کے سامنے پیش کر دی جائیگی جو مناظرۂ لاہور کیلئے طے ہوئے تھے۔ چنانچہ الفرقان نامی یہ ماہنامہ محرم ۱۳۵۳ھ مطابق مئی ۱۹۳۴ء سے جاری ہوا اور معرکۃ القلم کے عنوان سے وہ بحث اسکی پہلی ہی اشاعت سے قسط وار نکلنا شروع ہو گئی۔

الفرقان کے اجراء کی یہ مبیّنہ تقریب ایسا ظاہر کرتی ہے کہ یہ گویا دین کی بس مناظرانہ خدمت ہی کیلئے جاری ہوا تھا۔ مگر اس کے جو مقاصد اس کی پہلی ہی اشاعت میں بیان کئے گئے وہ اس سے بالکل مختلف اور اسلام کی خدمت کا ایک وسیع تر تصور دیتے ہیں اور اس میں شائع ہونے والے مضامین کی جو نوعیت شروع ہی سے رہی وہ اس بیان مقاصد کی تصدیق کرنے والی ہے مقاصد کا یہ بیان حسب ذیل تھا

"الفرقان" کا مقصد اور مسلک

"الفرقان" کا اصل مقصد صرف دین الٰہی کی اشاعت اور توحید و سنت کی حمایت و حفاظت ہے۔ اور اسی مقصد کو لیکر وہ عالم وجود میں آیا ہے۔ اور اس مبارک مقصد کی تکمیل کے لئے جو لائحہ عمل اس وقت اس کے سامنے ہے وہ اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اسی سے ہمارے ناظرین کو "الفرقان" کی حکمتِ عملی بھی معلوم ہو جائیگی "الفرقان" انشاء اللہ اقوام عالم کے سامنے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وہ محاسن پیش کرے گا جنکی نظیر سے دنیا کے مذاہب اور بانیان مذاہب کی تاریخ عاجز اور یقیناً عاجز ہے۔

"الفرقان" حتی الامکان معارف قرآنیہ کی نشر و اشاعت کا خاص اہتمام کرے گا کیونکہ قرآن اسلام کا ایک زندہ اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے اور وہی خدا کا وہ آخری پیغام ہے جو قیامت تک کے لئے انسانوں کی ہدایت کا کفیل بن کر آیا۔

"الفرقان" بعون اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتباع سنت کی روح پھونکے گا کیونکہ اس کا نہایت راسخ عقیدہ ہے کہ ہماری صلاح و فلاح اسی سے وابستہ ہے اور ہمارے اسلاف کا عروج جس نے دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اسی اتباع اور اقتداء کا مرہون منت تھا ہمارا ایمان ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل بھی صرف جناب رسالت مآب ﷺ کے نقش قدم کی پیروی ہی سے خوش گوار ہو سکتا ہے، حضرت امام مالک کا کیسا حقیقت افروز ارشاد ہے "لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا" اس امت کے

آخری دور کی اصلاح بھی صرف اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے اس کے دورِ اوّلین کی اصلاح ہوئی۔

"الفرقان" اُن بدعات اور مشرکانہ رسوم کے خلاف زبردست جہاد کرے گا جنھوں نے فرزندانِ توحید کے دین و دنیا کو برباد کر دیا ہے۔ اور جن کے زہریلے اثرات سے مسلمانوں کا ایمان تک محفوظ نہیں۔

"الفرقان" خدا پرستی کا حامی اور مخلوق پرستی کا سخت دشمن ہے وہ چاہتا ہے کہ انسان کی جبین نیاز صرف واحد قہار کے جلال و جبروت کے سامنے جھکے اسی لئے صلیب پرستی، بُت پرستی کی طرح، قبر پرستی، پیر پرستی، نفس پرستی، وغیرہ کو بھی وہ خلاق فطرت کی شدید بغاوت اور انسانیت کی سخت ترین اہانت سمجھتا ہے، لہٰذا اسکے خلاف بھی وہ زبردست جہاد کرے گا، اور قوم سے اس لعنت کے دور کرنے کے لئے اپنی ساری طاقت صرف کر دے گا۔

"الفرقان" کا مقصد بلا وجہ کسی جماعت یا کسی شخص سے الجھنا اور اس کو نیچا دکھانا یا اس پر غصہ اُتارنا اور اس کی پگڑیاں اچھالنا ہرگز نہیں وہ صرف اعلائے کلمۃ الحق کے لئے میدان میں آیا ہے، البتہ اگر کوئی خدا کا بائی اس کے اصل مقصد میں حائل ہوگا تو وہ اس کا بھی مقابلہ کرے گا لیکن اس میں بھی اس کی روش قرآن حکیم کی تعلیم کردہ اصول "وجادلهم بالتی هی احسن" سے متجاوز نہ ہوگی۔" (شمارہ ا جلد ا محرم الحرام ۱۳۵۳ھ)

اسی پہلی اشاعت میں جہاں تردید بریلویت والے مضامین ہیں وہیں ہم "قرآن اور زمانہ حال کے مسلمان" جیسا ادارتی مضمون بھی پاتے ہیں جو اس بات کی مکمل ... مقاصد میں اسلام کی خدمت کا جو وسیع تر تصور سامنے آیا تھا وہ محض ... اور با معنی بات تھی، اور ایسے مضامین کم و بیش ہر شمارے ہی میں ... پورا مضمون تو یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا مگر ایک دو اقتباسات د... ارشاد ہوتا ہے

"میری قوم کے نوجواں شاید مجھے دیوانہ بتائیں گے مگر میں تو یہی کہوں گا کہ ہماری حیات کا راز صرف اتباع قرآں ہی میں مضمر ہے۔ قرآن ہی ہر دور کی آزمودہ دوا اور ہمارے ہر مرض کا مجرب علاج ہے۔ آج اگر مسلماں اس کتاب الٰہی کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیں تو انکی ساری کمزوریاں ابھی دور ہو جاتی ہیں۔ وہ دنیا میں ایک باعزت قوم ہوں گے، ان کی غلامی کی زنجیریں دیکھتے دیکھتے کٹ جائیں گی۔ مگر ہائے اس بد نصیبی کا کیا علاج کہ آج ہم ہی میں کے بہت سے گم کردہ راہ اپنی ترقی کی راہیں اغیار کے بنائے ہوئے قوانین اور مغضوبین وضالین کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں"۔ (ص ۱۷)

مزید:

"میں یہاں یہ بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے مرض کا علاج صرف قرآن پاک کے شیریں الفاظ کی تلاوت یا اسکے پاکیزہ معانی کی سیر سے نہیں ہو سکتا بلکہ ضرورت اسکی ہے کہ امت اس صحیفۂ آسمانی کو اپنی زندگی کا دستور العمل بھی بنائے، ہمارے اسلاف قرآن مجید سے صرف تلاوت ہی کا کام نہ لیتے تھے۔ اور نہ صرف علمی ذوق پورا کرنے کیلئے اسکے معانی کی سیر کے عادی تھے بلکہ وہ اسکو کلام اللہ ہونے کے ساتھ انسانی زندگی کا مکمل نصاب بھی سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ اسکے فیوض سے بہرہ مند ہوئے"۔ (ص ۱۸)

لیکن یہ بالکل قدرتی تھا کہ جو چیز الفرقان کے اجراء کے فوری فیصلے کی تقریب بنی تھی اس کا اثر کچھ دن تو ضرور ہی غالب رہے۔ چنانچہ دو تین سال تک اس میں بریلوی مذہب اور اسکی

پھیلائی ہوئی مشرکانہ بدعات و خرافات کی تردید اور اس سلسلے کی مناظرانہ سرگرمیوں ہی کا رنگ غالب رہا۔ اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس میدان میں چونکہ یہ ایک غیر معمولی گرج چمک والے انداز کی یا حضرت مرحوم کے اپنے الفاظ میں ایک "طوفانی" انداز کی سرگرمی تھی اس لئے ایک جوش و خروش والے استقبال کی روح بھی اس نے لوگوں میں پھونک دی تھی۔ آیئے اس استقبال کا ایک نمونہ بھی دیکھتے چلیں۔۔ .... یہ جناب رہبر اعظمی مرحوم کی خیر مقدمی نظم ہے جو ۱۳۵۵ھ کے سالنامے میں شائع ہوئی

الفرقان کا خیر مقدم

از جناب رھبر اعظمی مبارکپوری

شبستان ضلالت میں وہ چمکی برقِ نورانی
برستا ہے سماء فیض سے اک نورِ ایقانی

بڑھایا دست قدرت نے وہ جام نور عرفانی
ہوئی مخمورِ صہبائے حقیقت چشم انسانی

نہ ہو کیوں صفحۂ عالم پر الفرقان لاثانی
زبان ہے اسکی سحبانی، مضامیں اسکے حسانی

ہے دنیائے صحافت میں مثال نیر اعظم
جہاں بھر میں اسی کی ہے درخشانی و تابانی

تری ہر ہر رگ جاں میں ہے پنہاں جذبۂ صادق
تیرے ہر قطرۂ خون جگر میں جوش ایمانی

ترا ہر نغمہ جان آفریں تسکیں دہِ خاطر
تری ہر بات وجہ اندمال زخم پنہانی

الٹ کر رکھدیا واللہ تو نے تختۂ باطل
فضا میں اڑگیا ہے دامن تدبیر شیطانی

وہ شمشیر ہدایت ہے کہ جسکے خوف و دہشت سے
کلیجہ شرک وبدعت کا وہ دیکھو ہوگیا پانی

تلاطم خیز موجیں مستتر ہیں جس کے دامن ہیں
وہ الفرقان علم دین کا ہے بحر عرفانی

پلائے جا پلائے جا وہی پھر بادۂ دوشیں
ہو جس کی جرعہ کیشی باعث تنویر ایمانی

یہی وہ رہبر کامل ہے جو منزل دکھائے گا
کوئی ہو رافضی یا قادیانی یا رضاخانی

لیکن جیسے ایک طرف خیر مقدم کیلئے جوش وخروش تھا دوسری طرف ایسے ہی ناراضگی کا غیظ وغضب بھی، چنانچہ اشاعت کے دوسرے ہی سال (۵۴ھ) کے چوتھے شمارے میں ہم قتل کی اس دھمکی کی خبر بھی پڑھتے ہیں کہ

"اگر تو بار نہیں آیا اور تیرا یہی حال رہا تو بہت جلدی تجھے مزہ چکھا دیا جائے گا بہت سے سی تیرے خون کے پیاسے ہیں۔"

قتل کی یہ دھمکی بظاہر اس مناظرے کا نتیجہ تھی جو الفرقان کی اشاعت کے دوسرے ہی سال محرم ۵۴ء میں عین بریلوی حضرات کے مدرسے جامعہ رضویہ میں ہوا۔ اور ـــــ جیسا کہ اس سال کے شمارہ (۲) میں لکھا گیا ـــ اس مناظرہ کی ابھی پہلی بحث بھی تمام نہ ہوئی تھی کہ مناظرے کے بریلوی اسٹیج سے ایک شر انگیز انداز میں "واجب القتل واجب القتل" کے نعرے کے ساتھ ہڑبونگ کا آغاز ہوا۔ اور مناظرے کا جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ اس دھمکی کے جواب میں جو ایک دو صفحے الفرقان میں لکھے گئے تھے اُن کی چند سطریں بھی نقل کر دی جائیں تو زندگی کی اس منزل کے احوال میں کا ایک ضروری جزو فی الجملہ سامنے

"اب سے پہلے ۵۱ھ میں بھی حسکہ میں ایک مناظرے ہی کے سلسلے میں دوران میں اس قسم کے گمنام خطوں کے ذریعے دو دفعہ ایسی ہی بردلانہ دھمکیاں دی گئی

آگے اپنا یہ عقیدہ ظاہر کرنے کے بعد کہ موت وحیات

ہے کہ:

"اسی کے ساتھ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو موت راہ حق میں آئے در حقیقت وہ موت نہیں بلکہ ایک دائمی اور لازوال زندگی کا پیش خیمہ ہے"

اور اس کے آگے یہ دعا آتی ہے اور یہی قصے کی جان ہے

"اے موت وحیات کے مالک! اے شہیدوں کو دائمی زندگی عطا کرنے والے! مجھے بھی اپنی راہ میں موت دے کر اپنی رحمت کے آغوش میں لے لے۔ ساتھ ہی میری یہ بھی دعا ہے کہ خداوندا! اگر میری موت تیرے کسی بندے ہی کے ہاتھ سے مقدر ہے تو میرا قاتل اسکو بنا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان نہو، میں نہیں چاہتا کہ کوئی بدقسمت مسلمان میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگے اور میری وجہ سے جہنم میں جائے"۔

بریلویت سے ماسوا مناظرے

صاحب الفرقان کی مناظرانہ سرگرمیوں کے رخ کا اصل میدان اگرچہ بریلویت ہی رہی لیکن اس سلسلے میں اُن کے اوپر نقل کئے گئے بیان سے یہ خیال کرنا صحیح نہو گا کہ آریہ سماج اور قادیانیت سے مناظروں کا جو میدان اس زمانے میں گرم تھا اس میدان میں وہ بالکل نہیں اترے۔

آریہ سماج سے انکے کئی مناظروں کی روداد جو الفرقان کے دور اشاعت میں پیش آئے، ہمیں الفرقان ہی کے صفحات میں ملتی ہے اور اس ضمن میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض مناظرے الفرقان کے دور اشاعت سے پہلے ہو چکے تھے۔ اس سلسلے کے پہلے مناظرے کی روداد الفرقان کی پہلی جلد کے شمارہ نمبر (۱۰۔۹۔اور ۱۲) میں ملتی ہے۔ یہ مناظرہ اسی سال یعنی ۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء پنڈت گوپی چند دہلوی سے بریلی ہی میں ہوا۔ اس کے بعد اگلے سال انھیں دنوں نومبر ۳۵ء میں ایک دوسرے آریہ سماجی مناظر پنڈت رام چندر دہلوی سے آپ کا مناظرہ بریلی ہی میں اور سابق مناظرے کی طرح کئی دن تک ہوا۔ اس کی روداد الفرقان کے متعدد شماروں میں قسط وار نکلی ہے۔ پہلی قسط شمارہ (۹۔۸ جلد ۲) میں شائع ہوئی تھی۔

قادیانیوں سے کسی مناظرے کی روداد ہمیں الفرقان میں نہیں ملتی، اگرچہ قادیانیت کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ بظاہر اس گروہ سے آپ کا کوئی مناظرہ الفرقان کے دور میں نہیں ہوا۔ البتہ الفرقان ہی کی فائل سے معلوم ہوتا ہے کہ الفرقان کے اجراء سے قبل ۱۹۲۸ء میں جو کہ امروہہ میں آپ کی مدرسی کا یہ پہلا سال تھا ایک ایسے مناظرے کا اتفاق حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی اور حضرت مولانا مرتضٰی حسن صاحب چاندپوری کی معیت میں پیش آیا تھا۔ اس کا تذکرہ ہمیں اپریل ۱۹۸۰ء کے الفرقان میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ کی وفات پر لکھے گئے آپ کے تعزیتی مضمون میں ملتا ہے، تحریر فرمایا گیا ہے کہ

"غالباً ۱۹۲۸ء کا کوئی مہینہ تھا کہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی اچانک بغیر کسی اطلاع کے امروہہ تشریف لائے، کسی نے مجھے اطلاع دی اور بتلایا کہ تم سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔ میں خود فوراً ہی حاضر خدمت ہو گیا، فرمایا کہ اس وقت صرف تم کو ساتھ لینے کے لئے راستے میں ٹرین سے اترا ہوں۔ ضلع میرٹھ میں کوئی قصبہ انچولی ہے۔ وہاں قادیانیوں سے مناظرہ طے ہو گیا ہے۔ اس مناظرے نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ معلوم ہوا ہے کچھ لوگوں کے قادیانی ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ایک صاحب جو مولانا کے ساتھ تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کل ہی مجھے لینے کے لئے انچولی سے لکھنؤ پہونچے تھے، میری طبیعت کئی دن سے خراب چل رہی تھی لیکن میں نے پہونچنا ضروری سمجھا اور یہ طے کر لیا کہ امروہہ سے تم کو ساتھ لے لونگا۔ اب پہلی ٹرین سے تم کو میرے ساتھ میرٹھ چلنا ہے۔ ممکن ہے مناظرہ تمھیں کو کرنا ہو۔ الغرض ہم لوگ میرٹھ کے لئے روانہ ہو گئے وہاں سے رات کے وقت انچولی پہونچے، معلوم ہوا کہ دیوبند سے حضرت مولانا سید مرتضٰی حسن صاحبؒ اور مولانا محمد شفیع صاحبؒ اور کچھ اور حضرات بھی ہم سے پہلے تشریف لا چکے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مناظرہ تین دن ہوگا۔ پہلے دن مسئلہ ختم نبوت پر اور دوسرے تیسرے دن صدق و کذب مرزا پر جس میں پہلے دن قادیانی مناظر مدعی ہوگا اور مرزا غلام احمد کے دعوی نبوت و مسیحیت کی صداقت ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور دوسرے دن مسلمانوں کا نمائندہ مناظر مدعی ہوگا اور مرزا کا کذاب ہونا ثابت کرے گا۔ معلوم ہوا کہ مناظرے کے یہ موضوعات اور یہ ترتیب فریقین کے مقامی لوگوں نے پہلے سے طے کر رکھی ہے۔

مشورے سے طے ہوا کہ پہلے دن مسئلہ ختم نبوت پر مناظرہ مجھے کرنا ہوگا، دوسرے دن حضرت مولانا لکھنوی اور

آخری دن حضرت مولانا چاندپوری مناظرہ فرمائیں گے ــــــ چنانچہ ایسا ہی ہوا ــــــ مناظرے میں ایک ایسے معاون کا وجود بہت مفید ہوتا ہے جس کی زیر بحث مسئلہ کے مالہ وماعلیہ پر خود بھی پوری نظر ہو اور حسب ضرورت و موقع کتابوں کے حوالے نکال کر مناظر کو دیتا رہے اور خود مناظر کو کتابوں سے حوالے نکالنے کا کام نہ کرنا پڑے۔ اس مناظرے میں یہ مدد مجھے جیسی مولانا محمد شفیع صاحبؒ سے ملی، کبھی کسی مناظرے میں کسی سے ایسی مدد نہیں مل سکی، معلوم ہوتا تھا کہ ختم نبوت کے موضوع کے متعلق مجھے جن حوالوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی وہ مفتی صاحب کو گویا حفظ تھے۔"

مفتی صاحب کی اس مدد کی کچھ تفصیل کرنے کے بعد فرماتے ہیں

"اس مناظرے میں مناظر تو میں ہی تھا لیکن مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے گویا "روح القدس" بنادیا تھا۔"

اس حوالے کی بدولت قادیانیوں سے آپ کے ایک مناظرے کا علم ہمیں ہو جاتا ہے، لیکن اس کی کوئی مفصل روداد دستیاب نہیں اسلئے کہ یہ الفرقان کے اجراء کے بہت پہلے کا ہے۔ اس کے برعکس مناظرے کے میدان کے تیسرے گروہ آریہ سماج کے ساتھ آپ کے دو مناظروں کی بہت تفصیلی رودادیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، الفرقان کے صفحات میں موجود ہیں۔ آریہ سماج کے ساتھ آپ کے ان مناظروں کا ایک پہلو یہاں قابل [illegible]

آریہ سماج سے مناظروں کا ایک قابل ذکر پہلو

قادیانیوں سے مناظرہ ہو یا بریلوی حضرات سے دونوں [illegible]
عالم سے بھی جس نے محنت سے تحصیل علم کی ہو اور ذہ[illegible]
موضوعات پر بآسانی حاوی ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اسلئے کہ ان سب [illegible]
اُسی علم دین سے ہے جس کی وہ بنیادی تحصیل کر چکا ــــــ اور جیسا کہ ذکر آئے گا، بریلوی حضرات سے مناظرے کے موضوعات پر تو صاحب الفرقان نے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں تیاری کر لی تھی ــــــ لیکن آریہ سماج سے سنجیدہ مناظرے کے موضوعات ایک مختلف چیز ہوتے تھے۔ ان موضوعات پر جب ہم آریہ سماج سے مناظروں میں آپ کی بحثیں پڑھتے ہیں تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ جیسے آپ پیدائشی طور ہی پر مناظرانہ صلاحیتیں لے کر آئے تھے۔

پنڈت رام چندر دہلوی سے ان کا مناظرہ (یکم نومبر ۳۵ء) وید کی الہامیت اور اس کے ساتھ تناسخ (آواگمن) کے مسئلوں پر تھا اس کا صرف ایک اقتباس آپ کی اس صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔

وید کو الہامی کتاب مانا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے حضرت بانیٔ الفرقان نے فرمایا تھا کہ ایک الہامی کتاب کیلئے لازمی طور پر یہ [illegible] ری ہے کہ وہ مخلوق کے پاس ایسے ذریعے سے پہونچے جو قابل اعتبار

ہو۔ ورنہ خدائے پاک کی طرف سے یہ (معاذ اللہ) بڑی بے انصافی ہوگی کہ لوگوں کو اس کے ماننے کا پابند بنایا جائے۔ اور یہ انتہائی لازمی اور بنیادی شرط بھی وید کے حق میں نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ خود از روئے وید یہ بات ابھی تک طے نہیں ہے کہ ویدوں کا الہام جن پر ہوا وہ انسان تھے یا کچھ اور ان ملہمین کے بارے میں ویدوں کے اندر خود بانئ آریہ سماج سوامی دیانند جی کے بقول چار لفظ ملتے ہیں۔ "اگنی، وایو، آدتھ، انگرا" اور از روئے لغت یہ چاروں لفظ غیر ذی شعور اور بے حس عناصر کے نام ہیں، علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ انسان تھے تو انکی شخصیتیں متعین نہیں ہیں، سماجی حضرات چار رشیوں کو مانتے ہیں۔ اور پورانک لوگ چار منہ والے برہما کو۔ اس کے جواب میں پنڈت رام چندر جی نے جو تقریر کی وہ تقریر اور اس کا جواب پڑھ کر وہ بات اچھی طرح محسوس کی جاسکتی ہے جس کے احساس نے یہاں اسکو ہمارے لئے قابل تذکرہ بنایا

پنڈت رام چندر جی دہلوی

"مولوی صاحب کا اعتراض میں نے سمجھا، اصل بات یہ ہے کہ مولوی صاحب سنسکرت زباں سے واقف نہیں ہیں۔ ورنہ آپ کو یہ شبہات پیدا ہی نہیں ہوتے، مولوی صاحب! جس طرح عربی فارسی وغیرہ اور زبانوں میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں اسی طرح سنسکرت میں بھی بعض لفظوں کے متعدد معانی آتے ہیں پس اسی اصول پر "اگنی وآیو، ادتھ، انگرا" عناصر کو بھی کہتے ہیں اور یہی رشیوں کے بھی نام ہیں، آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جنکا نام اگنی ہے اور یہ بات کلام کے موقع سے معلوم ہو جاتی ہے کہ یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔ اور اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ حق خدا کا بھی نام ہے اور حق ایک اخبار بھی نکلتا ہے، تو اگر کوئی شخص کہے کہ حق چھپ گیا یا حق پھٹ گیا تو کیا کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ خدا چھپ گیا یا خدا پھٹ گیا۔ بس جیسے کہ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق اخبار چھپ گیا یا پھٹ گیا ویسے ہی جب ویدوں میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگنی، وایو، آدتھ، انگرا، پر ویدوں کا الہام ہوا تو خود بخود یہ سمجھ لیا جائے گا کہ یہ رشیوں کے نام ہیں۔ کیوں کہ بے جان عناصر پر الہام نہیں ہوتا اور برہما کسی شخص خاص کا نام نہیں بلکہ وہ صفت ہے اور چو مکھ کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع اس کے چار منہ تھے۔ کیوں کہ یہ تو بالکل خلاف عقل ہے۔ آج تک ایسا کوئی بھی آدمی نہیں دیکھا گیا جس کے چار منہ ہوں بلکہ جس طرح سات زبانوں کے جاننے والے کو ہفت زباں کہہ دیتے ہیں اسی طرح جس شخص نے چار ویدوں کا علم رشیوں سے حاصل کیا تھا اس کو چو مکھ برہما لکھ دیا گیا ہے۔

منوسمرتی جس کو پورانک لوگ بھی مانتے ہیں اس میں بھی ویدوں کا ظہور "اگنی، وایو وغیرہ رشیوں سے لکھا ہے، نہ کہ خود برہما جی سے، تو یہ غلط ہے کہ برہما جی یا ویاس جی پر ویدوں کا الہام ہوا ہو، بلکہ انھوں نے ویدوں کو رشیوں سے حاصل کیا تھا، لہذا آپ کا اعتراض صحیح نہیں۔

(پنڈت جی نے اپنی اس تقریر میں اپنی تائید کیلئے جو وید منتر پڑھے تھے، افسوس ہے کہ ہم اپنی ناواقفی کی بنا پر یہاں انکو درج نہیں کر سکے لیکن ساری تقریر کا خلاصہ صرف اسی قدر تھا۔") (مرتب روداد)

مولانا صاحب

پنڈت جی! مجھے تو آپ کے ساتھ بہت زیادہ حسن ظن تھا مگر افسوس کہ وہ غلط ثابت ہو رہا ہے۔ میرے اعتراض کی

بنیاد یہ تھی کہ ار روئے وید "اگنی، وایو وغیرہ کا انسان ہونا ثابت نہیں بلکہ یہ صرف سوامی جی کی ایک اٹکل ہے، آپ نے اسکا جواب یہ دیا کہ اگنی وغیرہ کے معانی عناصر کے بھی آتے ہیں اور وہ رشیوں کے نام بھی ہیں اور سمجھانے کیلئے آپ نے "حق" کی مثال بھی دی ہے کہ وہ خدا کا نام بھی ہے اور اسی نام سے ایک اخبار بھی نکلتا ہے، حالانکہ یہ آپ کا مغالطہ ہے کیوں کہ لفظ "حق" کے متعلق تو یہ معلوم ہے کہ وہ اخبار کا نام بھی ہے لیکن اگنی وایو وغیرہ کے متعلق اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ انسانوں کے بھی نام ہیں، بلکہ یہ صرف آپ کی اور سوامی جی کی اٹکل ہے اور وہ بھی صرف اس بنیاد پر کہ خدا کے کلام کا ظہور غیر ذی شعور پر نہیں ہو سکتا، گویا صرف اسی مجبوری سے آپ ان کا انسان ہونا مان رہے ہیں کہ عناصر پر خدا کے کلام کا ظہور آپ کی سمجھ میں نہیں آتا ورنہ ویدوں میں اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں ہے اور وہ عقلی وجہ بھی بالکل کمزور ہے۔ اسلئے کہ جب ایک انسان گراموفون کے بے جان ریکارڈ کے ذریعے سے دوسروں کو اپنا کلام سنا سکتا ہے، سنیماؤں میں تصویروں کو گویا (بولتا) دکھلا سکتا ہے تو اگر پرمیشور غیر ذی شعور عناصر کے ذریعے سے دنیا کو اپنا کلام سنائے تو عقلاً اس میں کوئی استحالہ نہیں۔

بہر حال میرا یہ اعتراض بدستور باقی رہا کہ ارروئے وید اگنی، وایو، ادتھ، انگرا کا انسان ہونا ابھی تک معلوم نہیں بلکہ وہ سوامی جی کا محض عقلی خیال ہے اور وہ بھی نہایت کمزور۔

دوسری بحث یہ تھی کہ ملہمین وید کو اگر انسان ہی فرض کر لیا جائے تب بھی خود حاملان وید میں ان کی شخصیتوں کے متعلق اختلاف ہے، آپ حضرات چار رشیوں کو وید کا ملہم مانتے ہیں اور قدیم ہندو (پورانک)، برہما کے متعلق ہے۔

اس کے جواب میں آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برہما انہوں نے وید کا علم انھیں رشیوں سے حاصل کیا تھا" یہ جواب بھی غیر متعلق ہے، بحث نہیں کہ برہما جی کون تھے؟ بلکہ میرا اعتراض صرف یہ ہے کہ حاملان وید میں اختلاف ہے۔ اور آپ خود بھی اس اختلاف کا انکار نہیں کر سکتے، خود سوامی جی مہاراج نے اس بھومکا (ص ٣٦) پر کیا ہے۔ پس آپ نے جو جواب دیا ہے وہ در حقیقت پورانکو کو دیے کا ہے۔ میں تو صرف اختلاف کا ناقل ہوں اور آپ حضرات کا یہ اختلاف ہی میرے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وید کی تاریخ تاریکی میں ہے۔ اگر ملہمین وید کے متعلق خود وید میں کوئی صاف اور کھلی ہوئی تصریح ہوتی یا تواتر سے معلوم ہوتا کہ فلاں پر وید کا نزول ہوا، آج حاملین وید میں یہ اختلاف نہ ہوتا جس طرح کہ قرآن مجید کے متعلق آج کوئی ایسا اختلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی اسکا پورا پورا یقین رکھتے ہیں کہ اس کتاب (قرآن مجید) کو الہام کے دعویٰ کے ساتھ دنیا کے سامنے داعیٔ اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے پیش فرمایا اور در حقیقت جو چیز تواتر کے ساتھ منقول ہو اسمیں کبھی کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا پس الہام وید کے متعلق آپ لوگوں کا یہ اختلاف اسکی زبردست دلیل ہے کہ یہ مسئلہ پہلے ہی سے تاریکی میں رہا ہے۔

تیسرا اعتراض میرا یہ تھا کہ بحث سابق سے قطع نظر کر کے ویدوں کا ملہم خواہ بقول سماج، اگنی، وایو، ادتھ، انگرا، کو مانا جائے یا عام ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق برہما جی کو یا ویاس جی کو۔ بہر حال ان سب کی زندگی کے حالات نامعلوم ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس کیریکٹر اور کیسے چال چلن کے انسان تھے، اگر ویدوں میں اس کے متعلق کچھ ذکر ہو تو آپ فرمائیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ وید اس بارے میں بالکل خاموش ہیں بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ویدوں سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ انسان بھی تھے یا نہیں، کیرکٹر تو بعد کی چیز ہے۔(۱)

---

(۱) الفرقان شعبان ور مضان ۱۳۵۴ھ

بوارق الغیب کی تالیف

زندگی کے اس مناظرانہ دور کی ایک خاص قابل ذکر بات "بوارق الغیب" نامی کتاب کی تالیف بھی ہے۔ بریلی اور دیوبندی مکتب فکر کا ایک خاص اختلافی نقطہ مسئلہ "علم غیب" کے نام سے مشہور ہے۔ بریلویت رسول اللہ ﷺ کے لئے اسی کامل علم غیب کا دعویٰ کرتی ہے، جو اللہ جل جلالہ کی صفت ہے۔ اور یہ اہل دیوبند کی نظر میں قطعی شرک ہے۔ وہ کلی علم غیب کو صرف اللہ کے لئے مخصوص مانتے ہیں۔ اس کتاب کا موضوع قرآن وحدیث کی روشنی میں اسی مسئلہ کا فیصلہ ہے۔ اور اپنے موضوع پر یہ فیصلہ کن اور حرف آخر مانی گئی ہے۔ اس کی اہمیت صرف "حرف آخر" ہونے میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ اس درجے کے کام کا آغاز مصنف نے اپنی طالب علمی ہی کے زمانے میں کر دیا تھا۔ اور اس وقت میں اس میدان کی سب سے نامور شخصیت مولانا سید مرتضیٰ صاحب چاندپوریؒ نے جب یہ ارادہ سنا تو ان کی نوعمری کے باوجود یہ توقع کی وہ اس کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ الفرقان کا اجراء ہونے تک یہ کتاب چھپ نہیں سکی تھی۔ اس لئے الفرقان میں اس کی قسط وار اشاعت کا اعلان کرتے ہوئے اس کے تعارف میں جو صفحے لکھے گئے ہیں ان سے ہمیں اس کی تالیف کی یہ اہم تاریخی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا ہے۔

"قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ ۱۳۴۲ھ میں حکومت حجاز کے انقلاب نے ہندوستان کے اندر سنت وبدعت کی قدیمی جنگ کو از سر نو تازہ کر دیا تھا اور بناء علی القبور، نذر غیر اللہ، عرس، فاتحہ، میلاد، علم غیب کے فرسودہ مباحث پھر معرکۃ الآرا بن گئے تھے یہاں تک کہ حجاز میں تو چند ہی روز کے بعد کامل امن وامان ہو گیا۔ مگر ہندوستان میں جو مذہبی جنگ چھڑی اس کے شرارے برابر بلند ہی ہوتے رہے یہاں تک کہ علماء کرام کے علاوہ مدیران اخبارات وجرائد نے بھی ان مباحث کی تحقیق میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اسی وقت بعض اخباری مضامین دیکھ کر مسئلۂ علم غیب کے متعلق ایک مختصر رسالہ لکھنے کا ارادہ ہوا، یہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا، اور میں مرکز علوم اسلامیہ دار العلوم دیوبند میں اپنی تعلیم کے آخری درجات پورے کر رہا تھا، حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب مد ظلہٗ سے میں نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا، مولانا نے فرمایا کہ ہمارے حضرات نے اس مسئلے پر اب تک جو رسائل لکھے ہیں ان سب میں قدر ضرورت پر اکتفا کیا گیا ہے، اور مخالفین نے خلط مبحث کرنے کے لئے بڑے بڑے رسالے لکھ ڈالے ہیں لہذا اگر اس موضوع پر کچھ لکھنا ہے تو ہمت کر اور ایک مبسوط رسالہ لکھ دے۔ جس میں اپنے دلائل بھی کافی شافی ہوں، اور مخالفین کے دلائل کا جواب بھی بالاستیعاب ہو، کام یقیناً بڑا تھا اور حکم بھی بہت بڑے کا اللہ کا نام لے کر قلم اٹھایا اور اسی طالب علمی کے زمانے میں لکھنا شروع کر دیا۔ مگر اس سال دورۂ حدیث کی مشغولیت کی وجہ سے بہت تھوڑا وقت ملا تاہم اتنا ہوا کہ جو خالی وقت ملتا میں اس میں دار العلوم کے کتب خانے میں جا بیٹھتا اور کتابوں کے حوالے نقل کر لاتا، اسی سال تعلیم کے ختم ہونے کے ساتھ دار العلوم کے قیام کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور میں اپنے وطن سنبھل چلا آیا، یہاں آکر تعلیم کا کام شروع کر دیا، اسکی مصروفیت اور کسی وسیع کتب خانے کے نہ ہونے کی وجہ سے اس عرصے میں رسالے کا کام بالکل بند رہا، اسکے بعد تقریباً تین سال میرا قیام امروہہ میں رہا، وہاں کے مدارس کے کتب خانوں میں دینی کتابوں کا ذخیرہ اگرچہ کچھ کم نہ تھا، لیکن

تعلیم کی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے تالیف کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنا ایک سال صرف اس رسالے کی تکمیل کے لئے خالی کرلیا۔ اور ادھر اُدھر سے کتابیں جمع کر کے ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گیا، چار پانچ مہینے کی مسلسل محنت اور جاں کاہی نے کام کو قریب ختم پہ پہونچادیا، اور میں کتاب کے اکثر حصہ کی ترتیب و تشکیل سے بھی فارغ ہو گیا۔ ۱۹۳۱ء مطابق ۱۳۵۰ھ ستمبر کا مہینہ تھا کہ ایک مناظرہ کے سلسلے میں مجھے ضلع گجرات، پنجاب جانا پڑا۔ اور میری پس غیبت میں میرے مکان سے کتاب کا پورا مسودہ غائب ہو گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مجھے اس کا کس قدر صدمہ ہوا اور میرے دل پر کیا گذری اسکا تحریر میں آنا دشوار ہے۔ ہمت نے اس قدر شکست کھائی کہ اس کے بعد میں نے بار بار اس کو از سر نو لکھنا چاہا لیکن دل ودماغ نے صاف جواب دے دیا۔ اور میں ایک عرصے تک قلم نہ اٹھا سکا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اعادہ تصنیف سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ حضرت مولانا سید محمد مرتضی حسن صاحب مد ظلہ العالی کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کو پھر از سر نو لکھنے کا حکم فرمایا، میں نے اسی ہمت شکنی اور حوصلہ افسکنی کا عذر کیا، لیکن ممدوح نے ایک نہ سنی اور فرمایا کہ اللہ کے بھروسے پر لکھنا شروع کر، امتثالاً للامر ۱۳۵۱ھ میں، میں نے پھر اسکو لکھنا شروع کیا اور الحمد للہ تعالیٰ کہ اس کے فضل و کرم سے ۱۳۵۲ھ میں دوبارہ وہ مکمل ہو گئی۔ "(۱)

بوارق الغیب کی تصنیف کے اس قصے میں ہماری ملت ۔۔۔ ہے جو کسی دار العلوم یا کسی یونیورسٹی میں تحصیل علم کر رہے ۔۔۔ باندھ لے اور کسی موضوع کا حق ادا کرنے کی ٹھان لے تو وہ اپنی ۔۔۔ سکتا ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو چاہے کتنی ہی سندیں اور ڈگریاں حاصل

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خون جگر کے بغیر

بوارق سے بھی پہلی کتاب

بوارق تو خالص علمی اور تحقیقی انداز کی کتاب ہے، جو طالب علمی سے فراغت کے پانچ سال بعد مکمل ہوئی، اس سے پہلے کی ایک مناظرانہ رنگ کی کتاب ان کے قلم سے ۱۳۴۸ھ میں، جبکہ ان کی عمر ۲۴-۲۵ سال کی تھی، بعض بریلوی اعتراضات کے جواب میں سیف یمانی کے نام سے نکلی، اس میں بھی ان کی محنت، بھرپور توجہ اور دلچسپی نے وہ رنگ پیدا کر دیا تھا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جیسی عظیم اور محتاط شخصیت نے ایسے الفاظ میں اس پر تقریظ ثبت فرمائی جن میں ذرا سا بھی کوئی تحفظ اور ریزرویشن نہیں تھا۔ اور اس بات کا جو درجہ ہے اسے جاننے والے جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بعد الحمد والصلوٰۃ احقر اشرف علی عفی عنہ نے رسالہ "سیف یمانی" بالاستیعاب دیکھا جو بعض

---

(۱) الفرقان محرم ۱۳۵۴ھ، ص ۵۵-۵۴

اہل اہواء کے اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا ہے، تحقیقی جواب بھی ہے اور الزامی بھی۔ بلا مبالغہ اس کو جَادِلهُم بِالَّتِی هِیَ احسَن کا مصداق پایا۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو اس نصرت حق پر جزائے خیر عطا فرمائے اور رسالہ کو سرمایۂ رشد وہدایت بنادے،(۱)

والسلام

اور وقت کے بہت بڑے فاضل اور مناظر، صاحبِ علم و عمل، ناظم تعلیمات مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ نے تو پورے ایک صفحے کی تقریظ کا خاتمہ ان الفاظ پر فرمایا تھا:

''میں اخیر میں اس حقیقت کا اظہار بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ علامہ محترم کو میں ایک سال قبل مولوی منظور صاحب کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل میں اپنی ذہنیت بدلنے پر مجبور ہوا اور مولانا مولوی محمد منظور صاحب کہنے لگا۔ لیکن اس تصنیف لطیف کے غیر فانی نقوش نے میرے قلب کو علامہ محترم حضرت مولانا مولوی عم فیوضہم کہنے پر مجبور کر دیا۔''(۲)

ایک اور سبق

ہر کام میں محنت اور خونِ جگر شامل کرنے کے سبق کے ساتھ ایک دوسرا سبق بھی اس جانے والی ہستی سے لینے کا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ غیر معمولی درجے کی تقریظوں کے تمغے کتاب میں ایک مرتبہ چھاپ دینے کے بعد مستقل طور سے سینے پہ سجا کے اس نے نہیں رکھے کہ یہی خودی کے پاسبانوں کا طریق ہے۔ اس کتاب کی عمر قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی راقم الحروف (عتیق) کی۔ مگر اس کے ہوش سنبھالنے کے بعد اس سال (۱۹۹۸ء) سے پہلے جب کہ اتفاق سے اس کا مذکورہ پاکستانی ایڈیشن دستیاب ہو گیا، یہ کتاب سامنے نہ پڑی تو ان تقریظوں کا علم بھی اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ پوری عمر میں یہ پہلا موقع ہے کہ یہ ستر (۷۰) سالہ تاریخی مرتبہ رکھنے والی تقریظات علم میں آئی ہیں۔

مناظرانہ دور کا اختتام

مناظرانہ سرگرمیوں کا یہ دور قریب قریب دس سال رہا۔ ''میری زندگی کے تجربے. . .'' والے مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ ''اواخر ۵۵ھ میں راقم کا آخری مناظرہ پنجاب (سلانوالی) میں ہوا جس کے بعد یہ مشغلہ بالکل چھوٹ ہی گیا''

---

(۱) سیف یمانی (ص ۵) پاکستانی ایڈیشن، شائع کردہ مکتبہ دار العلوم فیض محمدی، خالد آباد، لائلپور۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۴۹/۱۳۴۸ھ میں ہندوستان سے نکلا تھا۔ بعض تقریظوں پر ذی قعدہ ۴۸ھ کی تاریخ بھی درج ہے۔
(۲) ایضاً

راقم السطور نے ہوش سنبھالنے کے بعد والد ماجد کا جو مزاج دیکھا اسکی بنا پر بریلوی حضرات سے ان کے مناظروں کی روداد پڑھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کی ان رودادوں کے مطابق بریلوی مناظر جیسا لایعنی بلکہ ایک حد تک غیر شریفانہ اور پھکڑبازانہ رویہ اختیار کرتے تھے تو وہ کیسے چار چار دن تک اس رویے کو بھگتتے رہا کرتے تھے؟(۱) یہ حیرت اُن کا یہ بیان تجربوں والے مضمون میں پڑھ کر فی الجملہ دور ہوئی جس میں مناظرہ سے متعلق اپنی ایک دھن اور لگن والی کیفیت کا بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

"مختلف بازیوں کے شوقینوں کو شاید اپنی باریوں کی اتنی دھن نہ ہوگی جتنی مجھے ان دنوں اس مناظرہ بازی کی دھن لگی ہوئی تھی، اب کبھی اپنی اس کیفیت کو یاد بھی کرتا ہوں تو بعض اوقات تنہائی میں بھی ہنسی آجاتی ہے مگر خیریت ہوئی کہ یہ بحرانی کیفیت غالباً چار پانچ سال سے زیادہ نہیں رہی اور بعد میں جیسا کہ چاہیے تھا طبیعت سیر ہو کر حالت اعتدال پہ آگئی اور پھر مزید تین چار سال گذرنے کے بعد تو طبیعت میں آہستہ آہستہ اِس سے ابا اور انکار کی کیفیت بھی پیدا ہونے لگی۔"(۲)

جو لوگ والد مرحوم کے مزاج سے قریبی واقفیت نہیں رکھتے یا اُن کے ساتھ کسی خاص حسنِ ظن کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ ایسا گمان بھی کرسکتے ہیں کہ ا
کے رویے کو خواہ مخواہ ایک مخاصمانہ جذبے سے خراب دکھانے
کی رودادیں آریہ سماجیوں کے ساتھ ہونے والے مناظروں کی
کسی منصف مزاج غیر کیلئے اس بدگمانی کی گنجائش نہیں چھوڑتیں
ایک اقتباس اوپر گذرا ہے۔ اُسکی روداد کے آغاز میں ہم الفرقان ہی سے ۔ ۔
کی تعریف پاتے ہیں کہ :

"ہمیں کھلے دل سے اعتراف ہے کہ پنڈت جی کی گفتگو بھی نہایت مہذب اور سنجیدہ تھی۔"

(الفرقان ج ۲، ش ۸-۹، ص ۸۹)

ایک نئی منزل کا رخ اور اُس کا محرک

مناظرانہ سرگرمیوں سے طبیعت کا رُخ ہٹ کر جس نئی منزل کی طرف مڑا اس کے سب سے اہم محرک (۳) کے بیان میں "زندگی کے تجربات و خاص واقعات" میں تحریر فرمایا ہے کہ

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا رسالہ "ترجمان القرآن" اُس زمانہ میں حیدرآباد دکن سے نکلتا تھا۔ اُس میں موصوف

---

(۱) یہ تمام رودادیں حال ہی میں لاہور کے ایک ادارے نے "فتوحات نعمانیہ" کے نام سے چھاپ دی ہیں۔

(۲) اور اس بیان کے ساتھ اگر اُن کے اِن مناظروں کا اصل محرک بھی ذہن میں رکھا جائے جس نے اُنھیں اس میدان میں اُتارا یعنی توحید و سنت کے دفاع اور شرک و بدعت سے جنگ کا جذبہ تو پھر یہ بجائے خود بھی آدمی میں ہر طرح کی لغویات کو برداشت کا حوصلہ پیدا کرسکنے والی چیز ہے۔ (۳) یعنی دوسرے محرکات بھی تھے مثلاً تجربے سے یہ یقیں کہ بریلوی علماء جان بوجھ کر لوگوں گمراہ کررہے ہیں۔

نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا، اس سلسلۂ مضامین نے دل و دماغ کو ایک دم چونکا دیا اور بالکل یوں نظر آنے لگا کہ جن مباحث اور مسائل پر مناظرے کرنے اور رسائل لکھنے میں ہم لگے ہوئے ہیں، ان میں ہماری اس مصروفیت کی مثال اُس مالی کی سی ہے جو اپنی ساری جدوجہد اس کام میں صرف کر رہا ہے کہ اپنے باغ کے پھلوں کو شپّر جیسے پرندوں کے نقصان سے بچائے یا چلتے پھرتے چرندے، درختوں کے پتوں پر جو منہ مار جاتے ہیں اُن سے درختوں کی حفاظت کرے اور اسی کی حفاظتی تدبیروں میں اپنا دن رات ایک کر رہا ہو۔ لیکن سارے باغ کے درختوں کی جڑوں میں نہایت خطرناک قسم کی اور سب درختوں کو برباد کر دینے والی دیمک جو لگ رہی ہو اور جس کی وجہ سے سارا باغ ہی معرض فنا میں ہو، اُس سے وہ کم نظر مالی غافل ہو۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی ہی کے ان مضامین نے ابتداءً چونکایا پھر جوں جوں خود غور کیا یہ احساس، یقین کا درجہ اختیار کرتا گیا تا آنکہ ایک منکشف حقیقت بن کر وہ دل و دماغ پر اس طرح چھا گیا کہ جذبات کا رخ یکسر پلٹ گیا۔ اب دل و دماغ نے پچھلے مشاغل میں دلچسپی لینے سے انکار کر دیا۔ اور چند ہی روز کے بعد یہ کیفیت ہو گئی کہ مناظروں میں زیر بحث آنے والے جن مسائل کے متعلق مجھے خواب میں بھی دلائل سوجھتے تھے اور صحیح سوجھتے تھے اور جن کی تائید یا تردید میں پچاسوں کتابوں کی سیکڑوں عبارتیں بقید صفحہ نوک زبان رہتی تھیں ان مسائل پر بھی بولنے یا لکھنے کے لئے وقت نکالنا طبیعت پر بار ہونے لگا۔(۱)"

یہ الفرقان کی اشاعت کے چوتھے سال (۱۳۵۶ھ) کی بات ہے۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس منزل پر پہونچ کر اللہ پاک کی طرف سے ایک عجیب و غریب دستگیری ہوئی۔ "الفرقان" کا "مجدد الف ثانی نمبر" نکالنا طے ہوا اور یہ واقعہ ہے کہ جس وقت "مجدد نمبر" نکالنے کا ارادہ کیا تھا اس وقت اس کا تصور بھی نہ تھا کہ اس ذریعہ سے

---

(۱) عبارتوں کے نوک زبان رہنے کے سلسلے میں ایک خاص واقعہ بھی اس موقع پر درج فرمایا ہے۔ اور وہ قابل ذکر ہی ہے۔ "راقم کا جو آخری مناظرہ پنجاب میں ہوا اُس میں یہ واقعہ پیش آیا کہ میرے مخاطب مناظر نے عینی شرح بخاری سے ایک عبارت اپنے مدعا کی تائید میں پیش کی، میں نے اسی کتاب سے اُس کا جواب دینے کے لئے عینی کی وہی جلد اُن مناظر صاحب سے مانگی کیونکہ میرے ساتھ اُس وقت وہاں عینی نہیں تھی، اُن حضرت نے عینی دینے سے صاف انکار کر دیا، میں نے کہا اچھا میں عبارت پڑھتا ہوں آپ عینی کا فلاں صفحہ دیکھئے! یہ مناظر صاحب، اتنے "معقول" اور "معقولیت پسند" آدمی تھے کہ فوراً بولے "مولوی صاحب! مناظرہ میں جس کتاب کی عبارت جس کو پیش کرنا ہو وہ کتاب ہی سے پڑھ کر سنائے تو سنی جائے گی۔ اپنی یادداشت سے کوئی فریق کوئی عبارت پیش نہیں کر سکتا" اُن سے ہر چند کہا گیا کہ آپ کی یہ شرط اصول مناظرہ کے خلاف ہے۔ "اصول مناظرہ کی درسی کتاب "رشیدیہ" بھی دکھائی گئی، لیکن وہ ایسے ہی "بھلے آدمی" تھے کہ یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ اس شرط کے عائد ہونے سے "محمد منظور" کے لئے میدان استدلال تنگ ہو جائیگا اور ہر حوالہ کو کتاب سے نکال کر پیش کرنے میں اس کا کافی وقت لگا کرے گا۔ وہ اس لغو و لایعنی بلکہ جاہلانہ شرط پر اڑ گئے، بالآخر میں نے اُن کی اس شرط کو قبول کر لیا، لیکن (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے) کیا یہ کہ جس کتاب کی جو عبارت پیش کرنی ہوئی اگر وہ کتاب ساتھ نہیں تھی یا نکالنے میں زحمت سمجھی تو اُس کی ہم تقطیع دوسری کوئی کتاب ہاتھ میں لیکر مگر کتاب کے نام اور صفحہ کا بھی حوالہ صحیح دے کے اصل عبارت حافظہ سے پڑھ دی اور آخر مناظرہ تک شائد دسوں دفعہ یہی کارروائی کرنی پڑی لیکن بیچارے اُن مناظر صاحب کو شاید آج تک بھی اس کی خبر نہ ہو (نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیّأت اعمالنا ولا حول ولا قوۃ الا باللہ)۔

افکار و جذبات کی اصلاح و تربیت کا اتنا عظیم فائدہ خود اپنی ذات کو بھی حاصل ہوگا (۱) بہر حال "مجدد نمبر کی تیاری کے سلسلہ میں حضرت امام ربانی کی زندگی اور ان کے مکتوبات کا مطالعہ ناچیز نے شروع کیا، اس راہ میں جو سب سے بڑی چیز اس عاجز کو حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ مولانا مودودی کے چونکانے سے طبیعت میں جو ایک وقتی انقلاب پیدا ہو گیا تھا "مکتوبات امام ربانی" کے مطالعہ سے اس کی صحیح تربیت اور تہذیب کا سامان مل گیا۔"

اور پھر فرماتے ہیں کہ

"اپنے افکار و جذبات کے جس انقلاب کا اوپر میں نے ذکر کیا اور جس کی تہذیب و تربیت الحمد للہ مکتوبات امام ربانی سے ہوئی اس کے بعد ضمیر کا تقاضہ ہوا کہ جس مقصد کے ادراک اور جس ضرورت کے احساس نے یہ اضطراب پیدا کیا ہے (یعنی "احیاء دین" کے لئے جدوجہد اور اصل دین کی جڑوں کو جمانے، مضبوط کرنے اور جہالت وجاہلیت کے سخت زہریلے اثرات سے اسے صاف کرنے اور محفوظ رکھنے کی ہمہ گیر کوشش) غرض طبیعت میں ہیجان کے ساتھ ایک تقاضا تھا کہ اس مقصد کے لئے جو کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور جو بحالت موجودہ کیا جاسکتا ہے اپنے کو اس میں مصروف کر دیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام بیٹھے بیٹھے مقالے یا رسالے لکھ دینے یا جلسوں میں تقریریں کرنے اور وعظ کہہ دینے کی طرح کا کوئی آسان انفرادی کام نہ تھا، بلکہ اس کے لئے ضرورت تھی ایک ہمہ گیر دعوت لیکر اٹھنے اور جدوجہد کا ایک مختلف الجہات نظام قائم کر دینے کی۔ اپنی ہستی کو بھی میں نے بار بار اس لحاظ سے جانچا اور تولا کہ کیا اس عظیم کام کا بیڑا میں خود اٹھا سکتا ہوں؟ ہوں؟ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہر دفعہ میرا اندازہ اپنے متعلق یہی قائم ہوا کہ اس کام کی علا وجھ اٹھانے کے لئے بعض حسن خاص صلاحیتوں کی ناگزیر درجہ میں ضرورت ہوتی ہے میں مجھ میں بہت زیادہ کمزوری ہے۔ اپنے متعلق اس اندازہ پر مطمئن ہونے کے بعد عظیم کا بیڑا اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اور نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن اگر کوئی اور اللہ کا جائے تو پھر اپنے کو اس کے ساتھ لگا دینا چاہئے۔

اس وقت اس جستجو میں میرے ہی جیسے مضطرب جذبات کے حامل چند بندگان خدا کا پتہ بھی لگا اور میں مستقل سفر کر۔کر کے ان کی خدمتوں میں حاضر بھی ہوا، لیکن اس وقت کی میری یہ تگ ودو نتیجہ کے لحاظ سے لاحاصل ہی رہی اور قریباً دو تین سال تک حیرانی اور سرگردانی سی رہی۔ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ خاص اسی مقصد کے لئے اپنی آرزوؤں کے مطابق ہی، مولانا مودودی کی دعوت پر انہی کی امارت وقیادت میں "جماعت اسلامی" کا نظام بنا، اس عاجز نے بھی اس کی دعوت پر بڑھ کر لبیک کہا، مگر افسوس ہے کہ خلاف توقع بعض مایوسیوں اور بے اطمینانیوں کے درمیان میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کے مقصد سے قلبی محبت اور اس کے اساسی اصول سے دیانتدارانہ موافقت کے باوجود ایک ہی سال کے بعد میں اپنے آپکو اُس نظام سے علیحدہ کر لینے پر مجبور ہو گیا" (تجربات وخاص واقعات)

مایوسی اور اس کی دردناکی

یہ شکست آرزو اور نامرادیٔ امید کی بڑی دردناک کہانی ہے۔ اور اس پر ایک پوری

(۱) اس دور میں مجدد الف ثانی نمبر شاہ ولی اللہ نمبر الفرقان کے بڑے معرکے کے اور اعلیٰ علمی معیار کے دو ایسے نمبر شائع ہوئے تھا جو علمی اور دینی حلقوں میں آج تک یاد کئے جاتے بلکہ لائق استفادہ سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک خاص نمبر اس وقت کی ہنگامہ خیز تحریک "خاکسار تحریک" پر بھی خاصے کی چیز تھی۔ ان نمبروں پر ان شاء اللہ اس مضمون کے آخر میں کچھ لکھا جائے گا۔

کتاب "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت " لکھی جاچکی ہے۔ مگر اختصار کے ساتھ کچھ بیان یہاں بھی ضروری ہے۔

آپ کی دینی وملی سرگرمیوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایک بات بہت واضح طور پر نظر آئے گی کہ جس بات کو اس سلسلے میں حق اور فرض جانا اس کے لئے سب کچھ کر گذرنا اور کسی سے نہ ڈرنا، یہی ان کی مناظرانہ زندگی کے ہر ورق سے عیاں ہے۔ اور یہی پھر اس دوسری منزل کی طرف چل پڑنے میں ہوا جس کار جحان مودودی صاحب کی تحریروں نے پیدا کیا۔ وہ دیوبند کے ساختہ وپرداختہ تھے۔ انھیں دیوبند اور بزرگان دیوبند سے بے حد تعلق بھی تھا۔ اور انکی غایت درجہ خوش قسمتی کہ تمام اکابر دیوبند ان کی کم عمری کے باوجود انھیں وہ درجہ دیتے تھے جو شاید اُس وقت ان کے کسی اور ہم عمر کا نہ تھا۔ بالفاظ دیگر وہ ان کے منظور نظر تھے۔ یہ چیز الفرقان کے ابتدائی فائلوں میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اور یکجا طور سے ایک حد تک "تحدیث نعمت" نامی اُنکی کتاب میں ملتی ہے۔ یہ اُنکی اُن دینی سرگرمیوں کی وجہ سے تھا جو وہ مناظروں کے میدان میں اور الفرقان کے صفحات پر ایک دھن اور لگن کے ساتھ اور بھرپور عالمانہ انداز پر انجام دے رہے تھے۔ اسی کے ساتھ عملاً اگرچہ وہ سیاسی نہ تھے لیکن ذہن وفکر کی حد تک ملی سیاست میں جمعیۃ العلماء ہند کی راہ کو، جو بالفاظ دیگر جماعت دیوبند ہی کی سیاسی راہ تھی، نہ صرف صحیح سمجھتے تھے۔ بلکہ باضابطہ اس کے ممبر بھی تھے۔ "تحدیث نعمت" کے دوسرے باب میں ۳۸-۷-۳ء کے ایک موقع پر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی اس خواہش کا ذکر کرتے ہوئے کہ ان کے نمائندے کی حیثیت سے مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت قبول کرلی جائے، اس سے معذرت کے سلسلہ میں اپنا عذر یہی بیان کیا گیا ہے کہ "میں اس وقت جمعیۃ علماء سے باضابطہ وابستہ تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اُسی کے سیاسی مسلک کو اصولی اور بنیادی طور پر صحیح سمجھتا تھا۔ اگرچہ بعض معاملات میں میری مستقل رائے تھی۔"

مودودی صاحب کے مضامین جن سے تاثر شروع ہوا، ابتداء میں اگرچہ کسی ایسی نوعیت کے نہ تھے کہ ان اکابر کے مذہبی یا سیاسی فکر سے ٹکراتے ہوں۔ مگر ۳۸-۷-۳ء آتے آتے وہ سیاسی طور سے تو کلیۃً اور کسی حد تک مذہبی طور سے بھی اِن اکابر دیوبند کے اور خاص طور سے جمعیۃ علماء کے فکر سے ٹکرانے لگے تھے۔ لیکن آپ نے اس مرحلے میں بھی جب مودودی صاحب ہی کے فکر کو بنیادی طور پر صحیح سمجھا تو پھر اُس کا یہ ٹکراؤ بھی مودودی صاحب کی طرف بڑھتے جانے سے نہیں روک سکا۔ کہ کسی چیز کو حق جان لینے کے بعد یہی افتادِ طبع تھی۔

جمعیۃ سے رسمی ممبری کا تعلق قائم رہا اور وہ بظاہر اس لئے کہ اپنے نئے سیاسی فکر کی طرف، جسے وہ مودودی صاحب کے نظریے کے مطابق عین تقاضائے دین واسلام جان رہے تھے، اپنے ان بزرگوں اور دوستوں کو بھی متوجہ کرنے کی کوشش دوستانہ اور عقیدت مندانہ ماحول میں کرتے رہ سکیں۔ اور اُن کے وہ تعلقات بحال رہ سکیں جو انھیں عزیز اور محترم رہے۔ چنانچہ وہ یہ کوشش کرتے ہوئے، جس کے بھرپور نشانات ۵۶ھ سے ۶۰ھ تک کے الفرقان میں پائے جاتے ہیں، شعبان ۶۰ھ/اگست ۴۱ء میں مودودی صاحب کی امارت میں "جماعت اسلامی" قائم کرنے کی منزل تک پہونچ گئے، اور یہ اُس کے بعد تھا جب کہ جمعیۃ علماء کے اخبار الجمعیۃ میں مودودی صاحب پر وہ سخت تنقیدی حملے شروع ہو چکے تھے جن میں ان کو "خطبہ فروش، چالاک تاجر" جیسے الفاظ سے یاد کیا گیا تھا۔ اور الفرقان نے اس کا نوٹس لیا تھا۔ (شمارہ ۵، جلد ۵، ۱۳۵۷ھ)

انھوں نے جماعت میں صرف شرکت ہی نہیں کی تھی، وہ جماعت کو قائم کر ... میں مودودی صاحب کے شانہ بشانہ تھے، اور اسکو قائم رکھنے اور بڑھا... بہت آگے۔ مولانا علی میاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) ... راغب کیا، مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم جو سترہ سال تک جما... جماعت کی طرف لانے میں اُن کا کسی نہ کسی حد تک حصہ ضرور ... مولانا مرحوم کی رکنیت اور ان سے ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھے گئے مولانا اصلاحی کے اس فقرے کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے.

"میں مودودی صاحب کو نہیں جانتا، تمھیں جانتا ہوں، اگر مودودی صاحب کل کو کسی غلط راستے پر چل پڑے تو میں خدا کے سامنے تمھیں پکڑ کے پیش کروں گا کہ ان سے پوچھئے، میرے ذمہ دار بھی یہی ہیں۔"(۱) [ص ۴۷]

"جماعت کی تاسیس و تشکیل کے بعد جماعت کے سلسلے میں میرا کام" کے عنوان سے

---

(۱) اتفاق سے ٹھیک انہی دنوں میں کہ یہ مضمون تیار ہو رہا تھا، مولانا اصلاحی مرحوم کے جاری کردہ ماہنامہ تدبّر لاہور کا اصلاحی نمبر آیا۔ جس کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مولانا اصلاحی کا رکنیت میں نام بھی بانیٔ الفرقان (مولانا نعمانیؒ) نے از خود ہی لکھا دیا تھا۔ جسے مولانا اصلاحی نے مرؤتاً قبول کر لیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ مولانا کو سرائے میر سے دار الاسلام پٹھان کوٹ (مرکز جماعت اسلامی) منتقل ہو جانے پر مجبور کرنے والے بھی مولانا مودودی کے ساتھ مولانا منظور نعمانی تھے۔ ان میں سے پہلی بات کیلئے تو، باوجود بالکل خلاف قیاس ہونے کے، مولانا اصلاحی کے حوالے کے احترام میں کچھ گنجائش نکالی جا سکتی تھی، مگر دوسری بات اس قدر قطعی طور سے خلاف واقعہ ہے کہ وہ پہلی بات کو بھی قابل اعتبار نہیں چھوڑتی۔ مولانا اصلاحی سرائے میر سے دار الاسلام پٹھان کوٹ اُس وقت منتقل ہوئے ہیں جب مولانا نعمانی اس سے بہت پہلے جماعت کو چھوڑ چکے تھے۔ اور یہ بات سرگزشت کے اُس اولیں بیان میں آگئی تھی جو مارچ/اپریل ۱۹۵۸ء کے الفرقان میں شائع ہوا۔

سرگزشت میں تحریر فرماتے ہیں.

"اجتماع سے واپس آکر الفرقان کے شوال کے شمارہ میں، میں نے -- "ایک دینی تحریک کا تعارف" کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا جس میں پوری تفصیل سے اس اجتماع اور جماعت اسلامی کی تاسیس و تشکیل کا تذکرہ کیا۔ اور اس کے مقصد و نصب العین اور دعوت و طریق کار کی وضاحت کی
اپنے نزدیک اس عاجز نے اس مضمون میں انتہائی دلسوزی و دردمندی اور پوری قوت و اعتماد کے ساتھ عام مسلمانوں، بالخصوص خواص امت کو جماعت میں شرکت یا کم از کم تعاون کی دعوت دی تھی۔
میرا خیال ہے کہ "جماعت اسلامی" کی ایسی مکمل، اتنی مدلل دعوت کی وضاحت اُس وقت تک خود مولانا مودودی صاحب کے قلم سے "ترجمان القرآن" میں بھی نہیں آئی تھی واقعہ یہ ہے کہ میں اس زمانہ میں جماعت کی دعوت و وکالت کے جذبہ سے سرشار تھا، جہاں جانا ہوتا اور جس مجلس میں بات کرنے کا اتفاق ہوتا، اکثر یہی میری گفتگو کا موضوع ہوتا، حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میرے بعض دینی اکابر کو میرا یہ اقدام ناپسند ہے لیکن میں اپنے اقدام کو بالکل صحیح اور اپنے ان اکابر کو یہ خیال کرکے معذور سمجھتا تھا کہ اُن کے سامنے وہ صورت حال اور وہ پوری بات نہیں ہے جو میرے سامنے آگئی ہے۔" [ص ۴۳-۴۲]

اور اس سب پر مزید، مودودی صاحب کے فکر و نظر سے یگانگت کی یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ بقول خود

"اس زمانے میں، میں مولانا مودودی سے اتنا متاثر تھا کہ اُن کی اصطلاحوں اور اُنہی کی زبان میں بولتا تھا، مثلاً اسلام کو ایک "انقلابی تحریک" کہتا تھا"۔

اسکی مثال میں اُس زمانے کی بمبئی میں کی گئی اپنی تقریروں کے ایک مربوط سلسلے کا حوالہ اس موقع پر خاص طور سے دیا ہے، جو خطباتِ بمبئی کے نام سے پہلے الفرقان میں اور پھر الگ کتابی شکل میں شائع ہوئی تھیں، اور جن کی حیثیت آپ کی طرف سے جماعتِ اسلامی کی تمہید کی تھی۔ اور واقعۃً یہ تقریریں مودودی صاحب کی زبان اور اصطلاحات میں ایسی ڈوبی ہوئی تھیں کہ جس کسی نے حضرت بانئ الفرقان کا وہ دور نہیں دیکھا سنا ہے، البتہ بعد کے دور سے آشنا ہے، اور اچھی طرح آشنا ہے، اس کیلئے یقین کرنا مشکل ہوگا کہ یہ واقعۃً مولانا نعمانی ہی کی تقریریں ہیں۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے، اس مشکل کو حل کرنے کا بھی انتظام فرماگئے ہیں۔ الفرقان کی جلد [۴۷] (۱۹۷۹ء) کے آخری شمارے میں نگاہِ اولیں کے زیر عنوان تحریر فرمایا کہ:

"الحمد للہ اس شمارے پر الفرقان کے ۴۷ سال پورے ہوگئے ہیں . قریباً نصف صدی کی اس مدت میں راقم سطور نے الفرقان کے ہزارہا صفحات میں یا اسکے علاوہ جو کچھ لکھا، اس میں یقیناً بہت سی غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں ایک اصولی بات تو یہ عرض کرنی ہے کہ اگر کسی وقت میں نے کسی مسئلے اور کسی معاملے میں ایک رائے ظاہر کی اور اُس کے بعد کسی زمانے میں اس سے مختلف رائے ظاہر کی تو بعد والی تحریر کو پہلی تحریر کا ناسخ سمجھنا چاہئے "

اور یہ وضاحتی تحریر آئی بھی ہے ایسے موقع پر کہ اُسکے متصلاً بعد "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت" والا مضمون شروع ہوا ہے۔ پس بزبانِ حال اس میں

صاف اشارہ مل جاتا ہے کہ اس وضاحت کا خصوصی تعلق مودودی صاحب کی رفاقت والے زمانہ کی تحریروں سے ہی ہے۔

بہر کیف مودودی صاحب کی امارت میں جماعت بنی، یہ کام لاہور میں ہوا تھا جہاں مودودی صاحب مقیم تھے۔ آئندہ کیلئے فیصلہ ہوا کہ جماعت کا مرکز شہری ماحول سے دور بنایا جائے۔ جس کے نتیجے میں پٹھانکوٹ کے قریب ایک صاحب خیر مسلمان کی دارالاسلام کے نام سے بنائی ہوئی عمارتوں میں یہ مرکز قائم ہوا۔ اوّلاً مودودی صاحب وہاں پہونچ گئے، اور اُن کے دون تین ہفتے بعد (شعبان ۶۱ھ جولائی ۴۲ء میں) آپ بھی (مع راقم السطور عتیق کے)۔

اپنی سرگزشت میں اس مرحلے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"میرے قیام کو ابھی ایک ہی ہفتہ گزرا ہوگا کہ میرے سامنے بعض چیزیں ایسی آئیں جن سے معلوم ہوا کہ احکام شریعت کی جس درجے کی پابندی، یا کہنا چاہئے کہ جس درجے کا عملی تقویٰ جماعت کے ہر رکن کیلئے شرطِ لازم قرار دیا گیا تھا خود مولانا مودودی نے اپنے کو ابھی تک اُس کا پابند نہیں بنایا ہے۔ اور یہ کہ جماعت کی تاسیس سے چندروز پہلے والی تنہائی کی گفتگو سے تقویٰ اور شریعت کی پابندی کے بارے میں مولانا کا جو حال میں نے سمجھا تھا واقعہ میں ان کا ... ان میں اس قدر تہاون اور اتنی سہل انگاری ہے جو مقام تقویٰ کے بالکل منافی ہے۔"

اس صورت حال کے نتیجے میں فرماتے ہیں کہ

"اب میرے سامنے ایک سخت مشکل الجھن آگئی، اور وہ یہ کہ جماعت ... امارت کی تحریک خود میں نے پیش کی تھی اور سب کے سامنے میں نے اپنے اس اطمینان ... علم و عمل اور اپنی فکری صلاحیتوں کے لحاظ سے جماعت کی امارت کیلئے موزوں ترین آدمی ہیں اور ان ... میں امیر کیلئے ضروری قرار دی گئی ہیں ... یہ گویا میری طرف سے مولانا کے بارے میں ایک شہادت تھی جو میں نے اس وقت کی اپنی معلومات کی بنا پر ادا کی تھی۔ اب ... مجھے معلوم ہوا کہ ان کا حال وہ نہیں ہے جو ان کے بتلانے سے میں نے سمجھا تھا۔ اور جس کا میں نے بار بار اپنے زبان و قلم سے اظہار کیا۔ اب میں محسوس کرتا تھا کہ اس نئے علم و انکشاف کے بعد بھی اسی طرح میرا رکن جماعت بنا رہنا ایک ایسی عملی شہادت ہے جس کا غلط اور خلاف واقعہ ہونا مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اور یہ ایک طرح کا نفاق ہے۔" (ص ۵۴۔ ۵۳)

اوپر پیش کی گئی تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے جن سے گذر کر والد مرحوم دارالاسلام میں بس جانے کی نیت سے پہونچے تھے، جماعت سے رشتہ توڑنے اور الٹے پاؤں دارالاسلام سے واپس چلے آنے کا خیال جس قدر بھاری ہو سکتا ہوگا اسکا تصور مشکل نہیں ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ جماعت کے نظریے، مقاصد اور طریق کار سے دل و دماغ کے تعلق میں کوئی ادنیٰ فرق نہیں پڑا ہے۔ وہ اسی طرح عزیز و محبوب ہیں جس طرح روز اوّل سے تھیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ امیر جماعت کے بارے میں دی ہوئی شہادت غلط ثابت ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس فیصلے میں

مہینوں لگ گئے ـــــــ اگرچہ دار الاسلام سے واپسی کو التوا میں نہیں رکھا گیا۔ یہ ایک دو ہفتے کے بعد ہی عمل میں آگئی۔ اور پھر جماعت کی رکنیت ترک کرنے کا وہ فیصلہ بھی بالآخر تین چار مہینے کے غور و فکر کے بعد ہو گیا۔ جس میں قدرتی طور سے ان تمام نوخیز امیدوں اور آرزوؤں کا خون تھا جو جماعت کی تاسیس سے وابستہ کی گئی تھیں۔ اور گویا وہ منزل کھوٹی ہو گئی جس کے لئے مودودی صاحب کی امارت میں رختِ سفر باندھا گیا تھا۔

منزل بچ گئی

مگر نہیں یہ در حقیقت منزل کو کھوٹی ہونے سے بچانے کا ایک ربانی انتظام ثابت ہوا۔ منزل در حقیقت اُس وقت کھوٹی ہوتی جب وہ اپنی شہادت کے مسئلے کا کوئی اور حل تلاش کر کے اپنے آپ کو جماعت سے وابستہ رکھتے۔ حتی کہ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبدالغفار حسن اور جناب عبدالجبار غازی کی طرح ۱۶۔۱۷ سال گذار کر اس نتیجے پر پہونچتے کہ بڑے دھوکے میں رہے اور اسوقت جا کے آنکھ کھلی جب جسم و جان اور دل و دماغ کی قوتوں کا بڑا حصہ محض اضاعت نذر ہو چکا۔

معاملے کی نوعیت کسی طرح بھی ایسی نہیں نظر آتی کہ وہ اس کے حل کے لئے جماعت سے اپنی وابستگی ترک کرنے کو سوچیں۔ شوریٰ کے بااثر حضرات کے ذریعے یا پوری شوریٰ کے ذریعے مودودی صاحب کو یقیناً آمادہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں۔ اور جو کمی کوتاہی ہے، اس کا ازالہ کر دیں۔ سرگذشت میں اس معاملے پر مودودی صاحب سے گفتگو کا جو تذکرہ ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کو اصلاح حال پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ اور اس طرح ”جھوٹی شہادت“ کا مسئلہ ختم ہو جاتا۔ مگر اسکے بجائے ذہن میں شدّت کے ساتھ استعفے کی بات آنا۔ اور اُسی کو مسئلے کا واحد حل سمجھنا۔ جبکہ جماعت، اسکی پالیسی، اسکے مقاصد و نظریات سب ہی انھیں حسب سابق عزیز اور علیحدگی کا تصور نہایت شاق تھا۔ جبکہ مودودی صاحب کے بارے میں اس علم وانکشاف سے یہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے لائق امارت ہونے میں کلام ہو گیا ہو۔ یہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے تحت رکنیت ناجائز معلوم ہونے لگی ہو۔ جیسا کہ یہ سب کچھ سرگزشت میں صراحۃً آیا ہے! معاملے کے یہ سب پہلو صاف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ ترک رکنیت کا خیال اور فیصلہ اپنے ذہن کی پیداوار نہیں تھا۔ یہ ایک من جانب اللہ بات تھی۔ کہ اُن کو اس سفر کے اس حسرتناک انجام سے بچایا جائے جس سے قافلے کے دوسرے لوگ آگے چل کر دوچار ہوئے۔

اصل فیصلہ کہاں سے اور کیسے آیا؟

"تحدیث نعمت" (باب دوم) میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے ایک نو مسلم میواتی رفیق حضرت حاجی عبدالرحمٰن صاحبؒ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس تذکرے میں ان کی خصوصیات میں سے مستجاب الدعوات ہونے کے بیان میں آتا ہے کہ حضرت مولانا الیاس صاحب کی وفات (رجب ۱۳۶۳ھ) کے اگلے ہی دن میوات کے ایک تبلیغی اجتماع میں جانا ہوا۔ نظام الدین کے دوسرے اکابر کے ساتھ میانجی عبدالرحمٰن بھی شریک سفر تھے، واپسی میں میانجی نے اصرار کر کے مجھے اپنی بیل گاڑی میں، جو ان کے کسی معتقد کی تھی بٹھالیا، اور پھر راستے کی اس تنہائی میں فرمایا کہ میں نے تنہائی میں ایک بات پوچھنے کے لئے آپ کو ساتھ بٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ

"کوئی دو ڈھائی برس پہلے کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا، ٹھیک دوپہر کا وقت تھا، میں کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے اپنی عادت کے مطابق حجرے کے کواڑ بند کر کے سونے کے ارادے سے لیٹ گیا تھا کہ حضرت جی [illegible] دروازہ پر آکر دستک دی اور آہستہ سے فرمایا کہ "حاجی عبدالرحمٰن اگر تم جاگ رہے ہو تو [illegible] بات کرنی ہے۔" میں اگرچہ جگ رہا تھا ابھی سویا نہیں تھا، لیکن میں نے دروازہ نہیں [illegible] اس وقت آرام کرلیں، بات تو پھر بھی ہو جائے گی ــــ میں نے سوچا اگر میں درو[illegible] اور پھر ان کے آرام کا وقت نہیں رہے گا، تو میں نے ان کے آرام کے خیال سے [illegible] نے تھوڑا انتظار فرما کے پھر وہی کہا کہ "حاجی عبدالرحمٰن اگر تم جگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو [illegible] ہے" ــــ میں نے اس کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا اور کوئی جواب نہیں دیا تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنے حجرہ میں آرام کرلیں ــــ لیکن وہ اس کے بعد بھی واپس نہیں گئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی فرمایا ــــ میں نے مجبور ہو کر دروازہ کھول دیا اور ان سے کہا کہ میں جگ تو رہا تھا لیکن میں اس لئے نہیں بولتا تھا کہ آپ اس وقت باتیں شروع کریں گے تو آرام نہیں کر سکیں گے، بات تو آرام کرنے کے اور ظہر کے بعد بھی ہو سکتی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ تقاضہ تھا کہ تمہیں اٹھا کے ابھی بات کروں۔ اس کے بعد حضرت جی نے تمہارا (راقم السطور محمد منظور نعمانی) کا نام لیکر فرمایا کہ ان کو جانتے ہو؟ میں نے کہا مجھے تو یاد نہیں، فرمایا وہ جن کا بریلی سے رسالہ نکلتا ہے اور وہ بدعات کا اور اہل بدعات کا رد کرتے ہیں ــــ میں نے کہا ہاں ان کو تو جانتا ہوں۔ فرمایا وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں، اسی وقت ان کے لئے دُعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنکو وہاں سے نکال لے۔ پھر حضرت مجھے ساتھ لیکر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ مجھے ساتھ کھڑا کر کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی، پھر مجھ سے فرمایا کہ ان کے لئے اللہ سے دعا کرو اور اللہ سے مانگو، خود بھی دعا فرمائی۔"

یہ پورا واقعہ بیان کر کے حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تمہارا قصہ کیا تھا اور تم کہاں گئے تھے، میں نے حضرت جی سے پوچھا بھی نہیں ــــ اگر تم بتا سکو اور بتانا مناسب سمجھو تو بتلاؤ کہ تم کہاں گئے تھے جس کی حضرت جی کو اتنی فکر تھی؟(۱)

---

(۱) تحدیث نعمت ص ۲۲۷-۲۲۶

حاجی عبد الرحمٰن صاحب کی یہ بات نقل کر کے فرماتے ہیں

"میں نے ان کی بتلائی ہوئی مدت اور موسم کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں "جماعت اسلامی" کے ایک اساسی رکن کی حیثیت سے اسکے اُس وقت کے مرکز اور مستقر (دار الاسلام جمال پور ضلع گورداسپور) میں جاکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ وغیرہ چند رفقاء جماعت کے ساتھ مقیم ہو گیا تھا۔" (ص ۲۲۷)

اس واقعے کو سننے کے بعد اس بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ملتی کہ جماعت کو چھوڑ دینے کا فیصلہ جو عام منطق کے اعتبار سے نا قابل فہم تھا۔ وہ دراصل اپنے ذہن کا فیصلہ تھا ہی نہیں وہ اوپر سے، ایک اللہ والے کی قوتِ قلب کے ذریعہ، اس بندے کے ذہن پر اس کی بھلائی کی خاطر اتارا گیا تھا۔ اور وہ نافذ ہو کر رہا۔ یہی بات، اس واقعۂ دعا کو سن کر، اس بندے کے ذہن نے بھی اپنے الفاظ میں اس طرح تسلیم کی ــــــ چنانچہ آگے اس قصے کی تکمیل ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

"وہاں (دار الاسلام) پہونچ کر چند ہی روز کے بعد میرے قلب کی جو ایک خاص کیفیت ہو گئی تھی۔ اور جس شدید اندرونی کشمکش میں، میں مبتلا ہو گیا تھا (جس کے نتیجے میں بالآخر چند ہی مہینے بعد میں جماعت سے مستعفی بھی ہو گیا) جس کے کچھ ظاہری اسباب و وجوہ بھی تھے، لیکن حاجی عبد الرحمٰن صاحب سے مذکورہ بالا واقعہ سن کر دل میں یقین سا پیدا ہو گیا کہ میری اُس قلبی کیفیت اور اندرونی کشمکش میں اصل عامل ان دونوں بزرگوں کی دعا ہی تھی۔ والعلم عند اللہ۔" (ص ۲۸-۲۲۷)

مذکورہ بالا "کشمکش" اور جن "ظاہری اسباب" سے وہ پیش آئی اس کے تذکرے میں لکھا گیا ہے کہ اس واقعے سے مجھے اتنا سخت رنج اور صدمہ ہوا کہ شاید ہی عمر میں اس سے پہلے کوئی اتنا بڑا صدمہ ہوا ہو

عالم اسباب میں بظاہر اسی صدمہ کا اثر تھا کہ (دار الاسلام سے واپس ہونے کے) دو ہی چار دن بعد میں بیمار پڑ گیا ــــــ اور دو دن تو ایسے گذرے کہ تیمارداروں کو زیست کی امید بھی کم تھی۔" (۱)

حضرت خضر علیہ السلام نے جب بے قصور بلکہ اپنے محسن ملاّحوں کی کشتی کو نقصان پہونچایا تو ان کو کیا کچھ صدمہ نہ ہوا ہو گا۔ جبکہ رفیقِ سفر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی ضبط نہ کر سکے تھے۔ مگر بعد میں اس کا راز کھلا کہ ان غریب ملاّحوں کی بھلائی اسی میں تھی ــــــ بالکل یہی قصہ یہاں نظر آتا ہے کہ ایک نیک دل مسافر کو، وقت کے ایک "خضر" کے ہاتھوں، اسکی منزل کھوٹی ہونے سے بچانے کا انتظام فرمایا گیا تھا۔ اگرچہ اس انتظام میں اس کے لئے فوری طور پر بڑی ہی شدید تکلیف کا سامان تھا اور وقت کے ایسے "خضر" ہر زمانے میں ہوتے ہی رہے ہیں۔

---

(۱) مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت (ص ۶۱)

بقول حضرت اقبال -

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ انکو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں، اپنی آستینوں میں
جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو(۱) موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے، اہل دل کے سینوں میں؟

اور اس خضر کی تو مسافر پر بہت پہلے سے نگاہ تھی -

الفرقان کی فائلیں بھی بتاتی ہیں اور اسکے بعد اب آخر میں آکر "تحدیث نعمت" کے صفحات نے دکھا دیا ہے کہ آپ نے وقت کے بزرگوں، خاص کر بزرگان دیوبند، سے ہمیشہ نیاز مندانہ اور مؤدبانہ تعلق رکھا اور اسکے لئے اس کی بھی شرط نہ تھی کہ کوئی خاص مناسبت ہو۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ وقت کے اُن بزرگوں میں تھے جن سے آپ کو 'بقول خود' دلی احترام اور عظمت کے باوجود کوئی خاص مناسبت نہ تھی۔ تحدیث نعمت کے تذکرے کے پہلے ہی صفحے پر یہ بات آئی ہے لیکن دوسری طرح:

اس دعا والے واقعے کے بعد والا سال (ستمبر ۴۲ء)
ہونے والے صدمات کے باعث آپ (والد ماجد) کے لئے
اور اسکے زیر اثر آپ نے ذہنی و قلبی سکون کے لئے اپنا ایک

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی خانقاہ میں اسکی بعض خصوصیات کی وجہ سے گزارا۔ جہاں آپ کو مطلوبہ وقتی سکون کے ساتھ وہ ایک وراثت بھی دوبارہ ملی جو کسی وقت ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی، اس کی تفصیل "تحدیث نعمت" میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے تذکرہ میں پڑھی جاسکتی ہے۔ رخصت کے وقت حضرت شاہ صاحب نے وصیت فرمائی کہ حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ) کے یہاں زیادہ جایا کریں، اور اس پر عدم مناسبت کا عذر سن کر حضرت کی بلند مقامی کے بارے میں بڑے بلند الفاظ فرمائے۔ واپس ہوتے ہوئے سہارنپور پہونچے تھے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کے یہاں حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی نازک علالت کی اطلاع ملی تو وہیں سے دہلی کا قصد کرلیا۔ وہاں پہونچ کر جو کچھ پیش

---

(۱) بجھی ہوئی شمع۔ (۲) ذی قعدہ / دسمبر ۴۲ء میں آپ کے چھوٹے بھائی حاجی محمود حسین صاحب نے ۳۶ سال کی عمر میں پانچ بچے چھوڑ کر نہایت مختصر بیماری میں انتقال فرمایا اور رمضان / ستمبر ۴۳ء میں رفیقۂ حیاتؒ (راقم السطور کی والدہ ماجدہؒ) بھی اسی طرح آناً فاناً راہی آخرت ہوئیں۔

آیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے الفرقان بابت ماہ جمادی الاولیٰ والاخری ۱۳۶۳ھ ر ۱۹۴۴ء میں تحریر فرماتے ہیں

"اب سے کوئی تین برس پہلے کی بات ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں دو ایک دفعہ حاضری کا اتفاق ہوا تو ممدوح نے بڑے درد اور قلق کے ساتھ یہ شکوہ فرمایا کہ "تم میرا ساتھ نہیں دیتے" ـــــ اس زمانے میں مولانا کے اس شکوے کو میں سنتا تھا اور بس ٹال جاتا تھا۔ کیوں کہ مولانا کی تبلیغی جدوجہد کے متعلق میری جو معلومات تھیں اور جو کچھ میں اندازہ کرتا تھا اس کی بنیاد پر اگرچہ اس کو ایک اچھی دینی خدمت اور باعث اجر کوشش یقین کرتا تھا لیکن میری سمجھ میں اسکی کوئی ایسی غیر معمولی اہمیت نہیں آتی تھی جس کی وجہ سے میں اسکو اسی بات کے اپنے دوسرے مشاغل پر ترجیح دینا ضروری سمجھتا اور اپنے اوقات کا کوئی بڑا حصہ اس میں لگا دینے کا فیصلہ کر لیتا۔

پھر مذکورہ بالا وجہ کی کچھ تفصیل کرنے کے بعد فرماتے ہیں

"بہر حال یہی وجہ تھی کہ میں نے مولانا کے شکوہ کو کئی بار سنا اور خاموشی سے ٹال دیا، ہاں کبھی کسی بڑے اور عام اجتماع کے موقع پر وعظ و تقریر کے لئے یاد فرمایا تو چلا بھی گیا اور تبلیغ کی اہمیت و ضرورت پر تقریر بھی کر دی

الغرض عرصہ تک مولانا کے کام اور ان کی جدوجہد کے بارے میں میرا خیال یہی رہا۔ اس مدت میں کئی بار مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا اور غالباً ہر دفعہ ہی مولانا نے ساتھ نہ دینے اور دور دور رہنے کی شکایت فرمائی اور کام میں حصہ لینے کے لئے کہا، لیکن میں نے نہ کبھی وعدہ کیا اور نہ کبھی ارادہ ہی قائم ہوا۔"

اسکے آگے اس حاضری کا قصہ بیان کرتے ہوئے جو ۱۹۴۳ء کے آخر میں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کی بنا پر ہوئی تھی، لکھتے ہیں

"کافی رات گئے "بستی نظام الدین" پہونچا (جہاں ایک مسجد کا حجرہ مولانا کی قیام گاہ ہے) جن دوستوں سے ملاقات ہوئی ان سے معلوم ہو گیا کہ کئی دن سے بخار میں بے حد شدت ہے۔ میں نے تاکید اان سے کہہ دیا کہ آپ میں سے کوئی صاحب مولانا کی خدمت میں جائیں تو صبح سے پہلے میری اطلاع نہ کریں، اگر اسی وقت خبر ہو گئی اور بلوا کر گفتگو کرنے لگے تو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی ـــــ لیکن اطلاع ہو گئی اور اسی وقت مجھے حجرہ میں طلب فرمالیا، بخار بے حد تیز تھا، کھانسی کی شدید تکلیف تھی، ضعف بھی بے حد تھا، بایں ہمہ میرے پہونچتے ہی بستر سے اٹھنے لگے، میں نے باصرار گزارش کی کہ اسی طرح آرام فرماتے رہیں لیکن ایک نہ سنی گئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے، میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی طبیعت ناساز ہے اور کمزوری بہت زیادہ ہے آرام ہی فرمائیں۔

ارشاد فرمایا ـــ اجی کیسی بیماری اور کہاں کی کمزوری، بس تم لوگوں کا بیمار ڈالا ہوا ہوں، تمھارا ہی ستایا ہوا ہوں، آجاؤ کام کرنے لگو، انشاء اللہ اچھا ہو جاؤں گا ـــ میں نے پھر عرض کیا حضرت تشریف رکھیں! میں تو حاضر ہی ہوں ـــــ فرمایا نا! وعدہ کرو! ـــــــ میں نے اپنے دل میں یہ سوچ کر کہ ایسی حالت میں تجھے مولانا کی بات ٹالنی نہ چاہئے، عرض کیا "انشاء اللہ وقت دونگا اور کچھ کام کرونگا"۔

میرے اس عرض کرنے پر بھی لیٹے تو نہیں، ہاں! نیچے بچھے ہوئے مصلے پر دیوار سے سہارا لگا کر بیٹھ گئے اور ایک خاص انداز میں فرمایا۔"

اسکے بعد جو کچھ ارشاد الفرقان میں نقل ہوا ہے اس کی یہاں ضرورت نہیں۔ بس

صرف یہی دکھانا تھا کہ اس "خضرِ وقت" کی نگاہ اس "مسافر" پر پہلے سے تھی۔ وہ اسے اپنے کام کی چیز جانتا تھا اور اس دن کا آرزو مند تھا جب کہہ سکے کہ "آمد آں یارے کہ ما می خواستیم" اور بظاہر یہی وجہ ہوگی کہ اس مسافر کے حالات معلوم یا منکشف ہو کر اس دل کے لئے خصوصی بے چینی کا باعث بنے اور پھر اس بے چینی نے اس دعا کی شکل اختیار کی جو تیر بہ ہدف بن کے نکلی۔

اللهم احسن اجره وقدّس سرّه۔

جملہ معترضہ

واقعہ یہ ہیکہ والد ماجد مرحوم کے مودودی صاحب سے اسطرح متأثر ہونے کو — جس کا اوپر کچھ بیان آیا — ایک تقدیری امر کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ فی الواقع کوئی جوڑ کی بات تھی ہی نہیں۔ سب سے پہلی بات جو مودودی صاحب کی اُس زمانے کی تحریریں پڑھنے سے سامنے آتی ہے اور مابہ الفرق ہے وہ انکا انداز تکلم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی آدمی آسمان ہفتم [ے] سے بول رہا ہے۔ اور باقی ساری دنیا بونوں اور احمقوں پر مشتمل
اس طرز تکلم سے کوئی مناسبت اس زمانے میں بھی نہ تھی۔ پھ
تنقیدی تحریروں میں پایا جاتا تھا جس سے والدؒ کا قلم اپنے مناظرا
مشکل ہی سے آشنا رہا (۱) اور تیسری بات طرز تحریر اور طرز خطاب
مغز خطاب کی ہے، اس پر نظر کر کے بھی حیرت ہوتی ہے کہ کیسے یہ تحریریں ... ہوئے۔ ۱۹۴۰ء کی ان کی ایک مایہ ناز اور شہرہ آفاق تحریر علیگڑھ یونیورسٹی میں دیا گیا خطبہ (لیکچر) "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کے عنوان پر ہے۔ بلا ادنی مبالغے کے سچ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی "اسلامی حکومت" کا تصور ہے جو زمین پر نہیں بلکہ خلا میں قائم ہونے جارہی تھی۔ اسکو عالمی اور ازلی زمینی حقائق سے ذرہ برابر سروکار نہ تھا — چنانچہ جیسے چند سال بعد زمینی حقائق کا تجربہ ہوا وہ خطبہ "قصہ ماضی" بن گیا۔ اور جس شدّت سے کل جن چیزوں کو ناقابل قبول بتایا

---

(۱) اور اگر کبھی کسی کو اس قسم کی شکایت کا موقع مل گیا تو پھر تلافی کے لئے اس حد تک ان کا جانا کہ مناظروں میں ان کے خاص دریدہ دہن اور فحاش بریلوی مقابل مولوی حشمت علی خاں نے بھی اگر شکایت کی تو، اس بات پر حدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہ حشمت علی خاں صاحب کو بھی احساس ہوا کہ کوئی لفظ غیر مہذب اور دل آزار بھی ہوتا ہے، لکھا کہ "ہم مولوی حشمت علی صاحب کے اس احساس کی قدر کرتے ہیں اور بلا کسی اعتذار کے اعتراف کرتے ہیں کہ بے شک یہ الفاظ دل آزار ہیں، اور اس حیثیت سے کہ وہ الفرقان میں شائع ہوئے ان کو مجھ سے مؤاخذہ کا حق ہے اور میں نادم ہوں"

(الفرقان ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ ص ۳)۔

گیا تھا اُسی شدّت سے انھیں ناگزیر بتایا جانے لگا۔ اس ہوائیت کے علاوہ اس خطبے کی دوسری قابل توجہ یہ چیز تھی کہ اسلامی حکومت کے موضوع کا خطبہ اور کتاب وسنت کے کسی بھی حوالے سے خالی! گویا تمام تر ایک طبع زاد تصور (اور آئیڈیا) تھا۔ مگر تخلیق کا فن اور قلم کا آرٹ تھا کہ یہ خطبہ ایک خاصے کی چیز بنا رہا۔

الغرض اسے ایک تقدیری امر ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان باتوں کے باوجود مودودی صاحب کی طرف ایسا رجحان ہوا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ملاقاتوں اور قریب سے دیکھنے کے بعد طبیعت کو سخت دھکا بھی لگا کہ تحریری دعوت اور عملی حالت میں بڑا فرق ہے۔ اور اسلئے ایک بار ان کی طرف سے قطعی مایوسی کا فیصلہ بھی کر لیا (سرگزشت ص ۲۹) مگر دو ڈھائی سال کسی اور موزوں تر آدمی کی تلاش کرنے اور اس میں ناکامی کے بعد طبیعت پھر ایک بار موصوف ہی کے لئے نرم ہوئی اور کتابت تقدیر اپنا کام کر گئی۔

تقدیری عمل کے پیچھے بھی اسباب کا سلسلہ تو ہوتا ہی ہے، ان اسباب کی نشاندہی بڑی حد تک سرگزشت ہی سے ہو جاتی ہے۔ نوعمری میں تحریک خلافت کا وہ دور دیکھا تھا جس میں ملک کے بعض علاقوں میں (خصوصاً مؤ [سابق ضلع اعظم گڑھ] جہاں وہ اس وقت تعلیم پا رہے تھے) کچھ وقت کے لئے اسلامی نظام حکومت، جس کے لئے خلافت کی تحریک نے جوش بھر دیا تھا، عملاً قائم بھی ہو گیا تھا۔ پھر دیوبند پہنچے تو وہاں ان جذبات کو اور غذا ملی کہ وہاں شیخ الہند کی تحریک اور قربانیوں کے تذکرے تازہ تھے۔ فراغت کے بعد جمعیۃ علمائے ہند سے باقاعدہ تعلق قائم کر لیا جو ان جذبات اور ان یادوں کی وارث تھی۔ غرض ہندستان میں اسلامی حکومت کا احیاء یا کم از کم مسلمانوں کے ایک خود مختارانہ شرعی نظام کے لئے جذبے کے وہ وارث تھے۔ انڈیا ایکٹ ۳۵ء کے بعد جو صوبائی حکومتوں کے لئے الیکشن ہوئے اور پھر بیشتر صوبوں میں کانگریسی حکومتیں بنیں، اس کے تجربے نے ذہن کو اس بارے میں مشکوک کر دیا کہ جمعیۃ کی جو پالیسی کانگریس کے ساتھ اس مفروضہ پر اشتراک و تعاون کی چل رہی ہے کہ آزاد ہندستان میں وہ مسلمانوں کو ایک آزاد و خود مختار شرعی نظام قائم کرنے کا موقع دے گی۔ یا نہیں تو اس کے علی الرغم ایسا کیا جا سکے گا، یہ فی الواقع ایک صحیح پالیسی ہے؟ اسی حالت میں مودودی صاحب نے، جن سے وہ کئی سال پہلے سے متاثر ہوتے آ رہے تھے اپنے رسالے ترجمان القرآن میں ملک کے آئندہ سیاسی نقشے پر اظہار خیال شروع کیا، مودودی صاحب کے اس سلسلۂ مضامین نے ان کے شک کو تیقن سے بدل دیا جس کے بعد انھوں نے کوشش کی کہ جمعیۃ کی قیادت میں بھی اس کا احساس کیا جائے، اس

سلسلے کے مضامین بھی اس زمانے میں الفرقان میں نکلے ہیں(۱)۔ لیکن اس کی کچھ زیادہ توقع کرنے کی گنجائش بظاہر نہیں پائی جاتی تھی۔ اسلئے جیسے ہی خود مودودی صاحب نے اسلام اور اسلامی نظام زندگی کے لئے ایک نقشۂ کار پیش کیا ان کے دل ودماغ نے اسے قبول کرلیا اور حرکت پسند طبیعت فوراً عمل کے لئے مستعد بھی ہوگئی۔

یہ ہے مختصراً ان اسباب کا قصہ جو اس تقدیر امر کو ظہور میں لے آئے والعلم عند اللہ۔ لیکن واقعے میں یہ مودودی صاحب کا پیش کردہ نقشۂ عمل تھا بالکل ایک غیر عملی نقشہ کار، اور بس یہ اللہ کی غیر معمولی مہربانی بانئ الفرقان علیہ الرحمہ پہ ہوئی کہ ان کا زیادہ وقت اس خیالی نقشۂ عمل پر ـــــ جس کا بنیادی فکر "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" میں پایا جاتا ہے ـــــ ضائع نہیں ہونے دیا گیا۔ **فالحمد للہ**

حفاظت جس سفینے کی انھیں منظور ہوتی ہے
کنارے تک اُسے خود لا کے طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

واپسی بخدمتِ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ

آیئے، اب حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت کر بیچ میں یہ جملہ معترضہ در پیش ہوگیا تھا۔

حضرت مولاناؒ سے ان کے اصرار پر ان کے احترام میں جو وعدہ مجلس میں ایک شرح صدر والے وعدے میں اُس وقت بدل گیا جب مولانا نے اپنے کام کی کچھ وضاحت چند جملوں میں فرمائی ـــــ اور پھر ایسی وضاحتوں کا سلسلہ قائم رہا ـــــ مثال کے طور پر الفرقان کے اُسی شمارے میں حضرت مولاناؒ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے

"ہماری اس (دعوتی) تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو "جمیع ما جاء به النبیؐ" سکھانا (یعنی اسلام کے پورے علمی وعملی نظام سے امت کو وابستہ کردینا) یہ تو ہے ہمارا اصل مقصد ـــــ رہی قافلوں کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کلمہ ونماز کی تلقین وتعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی "الف، ب، ت" ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہمارے قافلے پورا کام نہیں کرسکتے، ان سے تو بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ ہر جگہ پہونچ کر اپنی جد وجہد سے ایک حرکت وبیداری پیدا کردیں اور غافلوں کو متوجہ کر کے وہاں کے مقامی اہل دین سے وابستہ کرنے کی اور اس جگہ کے دین کی فکر رکھنے والوں (علماء وصلحاء) کو بیچارے عوام کی اصلاح پر لگادینے کی کوشش کریں۔ ہر جگہ پر اصلی کام تو وہیں کے کارکن کرسکیں گے اور عوام کو زیادہ فائدہ اپنی ہی جگہ کے اہل دین سے استفادہ کرنے میں ہوگا۔ البتہ اس کا طریقہ ہمارے ان آدمیوں سے سیکھا جائے جو ایک عرصہ سے افادہ واستفادہ اور تعلیم وتعلم کے اس طریقے پر عامل ہیں اور اس پر بڑی حد تک قابو پاچکے ہیں۔"

---

(۱) الفرقان جلد (۶) ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء

یہ وہ راہ عمل تھی جسے پاکر بانیٔ الفرقان نے گویا وہ چیز پالی جسکی ان کی روح کو جستجو تھی۔ اس پر ان کے شرح صدر میں پھر کبھی فرق نہیں پڑا۔ اس چیز (راہ عمل) کی پوری تشریح ان کے اس سلسلے کے اوّلین مقالے "نصرتِ دین اور اصلاح مسلمین کی ایک کوشش" میں ملتی ہے۔ جس کا خاتمہ اسکی ان سطروں پر ہوتا ہے۔ (یہ مقالہ جمادی الاولیٰ والاخری ۱۳۶۳ھ کے الفرقان میں شائع ہوا تھا)۔

اس تحریک اوراس کے طریقہ کار کی ہمہ گیری

"امید ہے کہ ناظرین کرام نے یہاں تک کی گزارشات سے اس تحریک کے مقاصد، اس کی ہمہ گیری اور اس کی دور رسی کو سمجھ لیا ہوگا، اور اندازہ فرمالیا ہوگا کہ -

یہ تحریک دین کی "عمومی تعلیم وتربیت" کے اُس نبوی طریق کو زندہ کرنے اور رواج دینے کی براہ راست کوشش ہے جس نے قرنِ اوّل کے سارے مسلمانوں کو علم عمل اور سعی وجہد کا کامل نمونہ بنادیا تھا اور اب بھی اگر اُس کا عام رواج ہوجائے تو یقیناً موجودہ "مسلمان قوم" قرآن والی "امت مسلمہ" اور "خیر امت" بن سکتی ہے۔

نیز یہ تحریک مسلمانوں میں دین کی خدمت ونصرت کا جذبہ عام کرنے اور ان کو نصرت کے اس صحیح راستہ پر لگانے کی فی زماننا بہترین صورت ہے جس راستہ سے خود رسول اللہ ﷺ نے اور آپ کے صحابہ نے دین کی نصرت کی تھی۔

علیٰ ہذا مسلمانوں کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے سے قریب کرنے، ملی جلی زندگی گذارنے، اسلامی مساوات و مواسات کا عادی بنادینے اور اخوۃ اسلامیہ کو پھر سے زندہ کرنے کی بھی یہ حکیمانہ اسکیم ہے۔

اسی طرح ایمان ویقین کی تجدید وتکمیل، تزکیۂ اخلاق اور تعمیر سیرت کو مسلمانوں میں عام کرنے، نیز ذکر وفکر اخلاص واحسان، مراقبۂ آخرت، اور اللہ کی خشیت جو مسلمانوں کے عمومی اوصاف ہونے چاہئے تھے مگر ہماری بد قسمتی سے اب چند خانقاہ نشیں بزرگوں کی خصوصیت بن کے رہ گئے ہیں (اور اب تو وہاں بھی عام طور سے بس اللہ کا نام ہی ہے۔ الا من شاء اللہ) تو ان خصائص واحوال کو پھر سے مسلمانوں میں بطریق عموم پھیلانے کی بھی یہ بہترین عملی تدبیر ہے۔

اس سب کے ساتھ یہ تحریک، مقصدِ رسالت کی نیابۃً حفاظت، تبلیغ ودعوت کے فریضہ کی ادائیگی، اور "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے اجراء کی بھی براہ راست کوشش ہے" (الفرقان جمادین ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء)

اور یہاں سے بانیٔ الفرقان کی زندگی کے ساتھ الفرقان کا بھی ایک نیا دور شروع ہوگیا۔ جس میں اُس کی اصل دعوت یہی تھی جسے قرآن پاک کے مختصر الفاظ میں یا اَیُّھا الّذِیْنَ آمنُوا آمِنُوا۔ اے مسلمانو! سچے ایمان والے بن جاؤ۔ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ دور پوری یکسوئی کے ساتھ تقریباً ۶۱-۱۹۶۰ء / ۱۳۸۰ھ تک رہا لیکن اس کی خصوصی اہمیت آخر دم تک دل میں رہی۔ "تحدیث نعمت" میں اپنے اس دور حیات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"میرا احساس ہے کہ اپنی ذات اور الفرقان دونوں سے جس قدر کام اس راہ میں لینا اس عاجز کے لئے ممکن ہوا وہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات وانعامات میں سے غیر معمولی درجے کا بڑا انعام واحسان ہے۔" [ص ۱۸، طبع اول ۱۹۹۷ء]

یکسوئی میں فرق

تبلیغی دعوت میں عملی یکسوئی کے ساتھ بھی ذہن حالاتِ حاضرہ سے کبھی بے نیاز نہیں رہا تھا۔ پابندی سے اور غور سے اخبار دیکھنے کی عادت تھی اور ملکی و ملّی حالات کے بارے میں اپنی سوچی سمجھی رائے رہتی تھی۔ اسی کا قدرتی اثر تھا کہ ۱۹۶۰ء کے قریب انھیں یوپی کے ایک ضلع میں انجام دی جانے والی ایک نہایت اہم ملّی خدمت کا علم ہوا جس کی نوعیت تقاضہ کرتی تھی کہ وہ پورے صوبے میں ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیلے۔ یہ خدمت تھی 'مسلمان بچوں کے دین وایمان کو ان خطرات سے محفوظ کرنے کا انتظام کرنا جو صوبے کے سرکاری نظام تعلیم کے زیر اثر صاف طور سے سامنے آگئے تھے۔ انھوں نے اس خدمت کو بھی تبلیغی جدوجہد کے پہلو بہ پہلو اپنے وقت میں شریک کرنا لازم سمجھا۔ یہ کام دینی تعلیمی کونسل کے قیام کے ذریعے صوبے کے پیمانے پر شروع ہوا اور الحمد للہ ہو رہا ہے۔ اسکے بعد ۶۱ء ختم ہونے جا رہا تھا کہ۔ الفاظ "تحدیث نعمت" "ملک میں مسلم کشی کا ایک بھیانک سلسلہ آناً فاناً
رہے تھے کہ یہ ۱۹۴۷ء کی طرح کا وقتی ابال نہیں تھا"۔ چنانچہ ا
میں مزید فرق ڈالا اور ایسے مسائل کے سلسلے میں اب تک ذہن
عارضی اور وقتی صورت حال ہے اور مسلمانوں میں دینی اور ایما
اس صورت حال کی تبدیلی کیلئے بجائے خود کافی ہوگی۔" اس ذہن کے مطابق [illegible]
اب اپنے ایک دینی وملی فرض سے روگردانی کے ہم معنی نظر آنے لگا۔

ندائے ملت کا اجراء

اس ضمن میں پہلا قدم اپنی ملت کی ذہنی و فکری رہنمائی کے لئے ندائے ملت اخبار کے اجراء کی شکل میں اٹھا، یہ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ایک بڑا بھاری بوجھ تھا جو انھوں نے اٹھانے کی ہمت کی۔ اس کے لئے ایک ٹرسٹ بنایا گیا۔ یہ زمانہ مولانا علی میاں صاحب کی رفاقت کا تھا، ان کو اس ٹرسٹ کا صدر بنایا گیا۔ بوجھ اٹھانے میں پوری شرکت کرنے والے نوجوان ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی تھے اور ادارت کی ذمہ داری راقم السطور کی۔ ہندستان کی مسلم صحافت کی تاریخ میں اس کے ابتدائی چھ سالہ دور (۶۲ء تا ۶۸ء) نے جو نقش قدم چھوڑا ہے وہ شاید بلا اختلاف مسلم ہے۔

مسلم مجلس مشاورت

ندائے ملت جاری ہوئے دو ہی سال ہوئے تھے کہ ۱۹۶۴ء میں بہار، بنگال اور اڑیسہ میں

صوبوں میں پھیلی ہوئی ساڑھے چار سو میل کی پٹی میں وہ بھیانک مسلم کش فسادات ہوئے کہ تمام پچھلے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ اس کی دلدوز خبریں معلوم کر کے آپ نے اس علاقے (جمشید پور، راوڑ کیلا اور رانچی) کا سفر کیا اور دل پر پتھر رکھ کر وہ تمام دردناک مناظر دیکھے جو یہ فسادات اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اسی طرح سے متأثر ہونے والوں میں دوسرے بہت سے حضرات بھی تھے۔ پرانے کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود نے اس موقع پر ایک خاص طریقے کے متحدہ مسلم پلیٹ فارم کا تصور پیش کیا جسے حضرت بانیٔ الفرقان نے، ان کے رفیق خاص مولانا علی میاں صاحب نے اور جماعت اسلامی کے محمد مسلم صاحب مرحوم نے خاص طور سے آگے بڑھانے میں مدد کی۔ جس کے نتیجے میں مسلم مجلس مشاورت کے نام سے ایک متحدہ مسلم پلیٹ فارم کی تشکیل ۹؍اگست ۶۴ء کو ہوئی مگر —— اس کو جیسے نظر لگ گئی اور "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود" کا مصداق بن گیا۔ اس کی زیادہ تفصیل کے لئے دیکھئے "تحدیث نعمت"۔

مسلم مجلس مشاورت کے تجربے کا اثر

امت میں ایمانی زندگی کی تبلیغی دعوت و محنت کی اوّلین اہمیت کے ساتھ ساتھ ملت کے دوسرے مسائل کے سلسلے میں اسکی رہنمائی اور ذہن سازی سے ان کا ذہن کبھی اس لئے بے نیاز نہیں رہ سکا کہ وہ حالات حاضرہ سے واقفیت کی بھی فکر رکھتے تھے۔ مگر مشاورت کے تجربے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے جس کا وہ پہلے سے بھی احساس رکھتے تھے۔ کہ امّت میں فی الحال اجتماعی کاموں کی صلاحیت دور دور تک نہیں ہے۔ اس سے دنیا تو کیا سنورتی، الٹے آخرت خطرے میں پڑتی ہے۔ اس لئے مجبوراً انفرادی کام پر ہی قناعت کرنا پڑے گی۔ یعنی جو کچھ ایک آدمی کے اپنے بس میں ہے اُسے اپنے طور پر انجام دے۔ حتی کہ ایسی مخلصانہ اور بے غرضانہ انفرادی کوششیں اپنے دائرۂ اثر کو پھیلاتی ہوئی امت میں ایک عمومی شعور اور بے غرضانہ خدمت کا مزاج پیدا کردیں —— اس فیصلے پر پہونچنے میں زیادہ دخل ان کے اس تجربے کا تھا کہ دنیاوی لحاظ سے لاحاصل ثابت ہونے والا یہ "کھیل" آخرت کے پہلو سے بہت خطرناک ہے۔ باہمی چپقلش ہوتی ہے، بدگمانیاں ہوتی ہیں اور بدگوئیاں! —— راقم السطور کا اپنا خیال یہ ہے کہ اس فیصلے میں والد مرحوم کی حساسیت کو بھی دخل تھا۔ اُنھیں غلط قسم کی باتیں بالکل ہی برداشت نہ ہوتی تھیں، اور اجتماعی کاموں میں ایسی باتوں سے مفر نہیں، البتہ یہ بات اپنی جگہ درست ہی ماننی پڑے گی کہ اُمّت سے بی بحیثیتِ مجموعی اجتماعی تقاضوں کا وہ شعور ہی جیسے سلب ہوگیا ہے جس پر قرآنی ہدایت.

وَاَمرُهم شُورىٰ بَينَهُم (الشوریٰ-۳۸) اور اُن کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہے۔

کی بنیاد ہے۔

اس تجربے کے بعد

مجلس مشاورت کا یہ تجربہ ۶۸ء میں تمام ہوا۔ اسکے بعد ۱۹۷۲ء میں ہم ان کو مسلم پرسنل لا کے مسئلے پر ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کی تشکیل و تاسیس میں سرگرم عمل دیکھتے ہیں۔ لیکن اسکی نوعیت مجلس مشاورت قسم کے اجتماعی کاموں سے ذرا مختلف تھی اور ایسی ہی ثابت ہو رہی ہے۔ مزید برآں اس کی تحریک ملک میں مسلم پرسنل لا کے خلاف اٹھتی ہوئی فتنہ آرائی کے تدارک کیلئے دارالعلوم دیوبند کی ایک دینی ذمہ داری کے طور پر وجود میں آئی تھی اور وہ دارالعلوم کے نہایت اہم ذمہ داروں میں (یعنی سینئر ترین رکن شوریٰ) تھے۔ یہ بورڈ جو بلا تفریق ہر مسلک اور مکتب فکر کے نمائندوں پر مشتمل تھا، اس وقت کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب کی سرکردگی میں سرگرم عمل ہو صاحب ہی اسکے سربراہ رہے۔ رحمة الله عليه

دورِ معذوری کی داغ بیل

مسلم پرسنل لابورڈ کی تاسیس کو ڈیڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ دیوبند سے سفر (۷۳ء) میں دیوبند پہنچ کر رکشہ اُلٹ جانے کا حادثہ پیش آیا اور اسمیں کولھے کی ہڈی کا جوڑ (Hip joint) کھل گیا۔ غیر معمولی درجہ کا تکلیف دہ حادثہ تھا۔ مگر اللہ نے کرم فرمایا، چند مہینے علاج معالجے کے بعد اُس کے اثرات نوے پچانوے فی صدی جاتے رہے اور معمول کے مطابق نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ لیکن اندرونی طور پر معالجے میں کوی کسر بظاہر رہ گئی تھی۔ جس کے اثرات دو سال کے بعد ایسی شکل میں ظاہر ہوئے کہ چند دن موت و حیات کی کشمکش کی صورت رونما ہی اور پھر یہاں سے اُس مستقل معذوری کا آغاز ہو گیا جس معذوری کے عالم میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ دو سال بعد یعنی (۷۵ء) کا قصہ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ یہ ملک کے ایک بڑے اہم تاریخی موقع پر، اپنی ملت کے سلسلے میں اپنے اُس احساس ذمہ داری کا ایک تقاضہ پورا کرنے میں پیش آیا تھا جس احساسِ ذمہ داری نے انھیں تبلیغی محنت و دعوت کے سلسلے میں اپنے کامل شرحِ صدر کے باوجود ندائے ملت کے اجراء اور مسلم مجلس مشاورت کو وجود میں لانے کی

جدو جہد پر مجبور کیا تھا۔ اور اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں بے ریا و بے غرض خدمت کا وہ ایک یادگار نمونہ سامنے آتا ہے جو ان کے فرزندان ملت کے لئے گویا خاموش عملی نصیحت ہے کہ اپنی ملت کی خدمت اس طرح کرو کہ اگر ہو سکے تو بس تم جانو اور تمہارا اللہ۔ یہ واقعہ انھیں کے قلم کا لکھا ہوا ——— یا لکھایا ہوا ——— الفرقان اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء میں بایں الفاظ شائع ہوا ہے

"عرفت ربّی بفسخ العزائم رمضان مبارک (مطابق ستمبر ۱۹۷۶ء) کے شمارہ کی ترتیب و تیاری اور اس طرح کے دوسرے کاموں سے میں شعبان میں بالکل فارغ ہو گیا تھا اور نیت یہ تھی کہ رمضان مبارک بالکل یکسوئی سے گذرے۔ اسی نیت اور ارادہ کے تحت میں نے رمضان مبارک کے دنوں اور راتوں کے لئے اپنا نظام الاوقات بھی مرتب کر لیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کچھ اور تھی ——— ۳۰ شعبان کو جمعہ کا دن تھا۔ عصر کے قریب ٹیلیفون سے اطلاع ملی کہ ہمارے محترم مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی (شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کا ابھی اپنے مکان پر انتقال ہو گیا۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون) نماز عصر سے فارغ ہو کر وہاں پہونچا۔ مولانا مرحوم سے خاص تعلق رکھنے والے چند حضرات اور بھی پہونچ چکے تھے۔ پہلے اس کے امکانات پر غور کیا گیا کہ رات ہی میں تدفین ہو جائے لیکن اس میں ناقابل عبور مشکلات نظر آئیں تو یہ طے ہوا کہ تدفین صبح ہو چنانچہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر مولانا مرحوم کے مکان پر پہونچا اسی وقت مولانا کو غسل دیا گیا۔ قریباً گیارہ بجے تدفین سے فراغت ہوئی رفیق محترم مولانا علی میاں اسی وقت دہلی اور سہارن پور کے سفر سے واپس ہوئے تھے مولانا کو بعض اہم معاملات کے بارے میں اس عاجز سے گفتگو فرمانی تھی ظہر تک ہم دونوں اس میں مشغول رہے، ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایسا ہی کوئی اور کام سامنے آگیا اور شام تک اس میں مصروفیت رہی، بمشکل تھوڑا سا قرآن شریف پڑھا جا سکا ——— رمضان المبارک کا پہلا دن اس طرح پورا ہوا ——— مولانا علی میاں رائے بریلی تشریف لے گئے اور ان سے جس اہم معاملے میں گفتگو ہوئی تھی اسی سلسلے میں یہ طے ہوا کہ کل صبح مجھے بھی رائے بریلی پہونچنا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد رائے بریلی کے لئے روانہ ہو گیا، وہاں ظہر تک مسلسل اسی معاملے میں گفتگو ہوتی رہی اسکے بعد فوراً ہی ٹرین سے لکھنؤ واپسی ہوئی اور عصر کے قریب مکان پر پہونچ گیا۔ یہ رمضان مبارک کی دوسری تاریخ اور اتوار کا دن تھا ——— یہ بھی اسی طرح ختم ہو گیا ——— ان دو دنوں میں مجھے آرام کرنے کا بھی موقع بالکل نہیں ملا اس لئے تھک کر چور ہو گیا تھا۔ لیکن کسی تکلیف یا بیماری کا احساس بالکل نہیں تھا۔ رات کو تراویح بھی معمول کے مطابق مرکز کی مسجد میں ادا کی اس کے بعد عادت کے مطابق سویا اور اپنے وقت پر بیدار ہو گیا۔ سحر وغیرہ سے فارغ ہو کر فجر کی نماز مسجد میں پڑھی، نماز کے بعد قریباً آدھ گھنٹہ کچھ بیان بھی کیا اور اُس سے فارغ ہو کر حسب معمول کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ اس وقت تک بھی کسی قسم کی تکلیف یا بیماری کا احساس نہیں تھا اسی حال میں نیند آگئی۔ قریباً ایک گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ ڈھائی سال پہلے ایک ایکسیڈینٹ کے نتیجے میں بائیں ٹانگ جو رحمی ہو گئی تھی (اور خدا کے فضل سے جسکا کوئی اثر بعد میں باقی نہیں رہا تھا) اس میں سخت تکلیف ہے۔ اور کولھے پر بلکہ ٹانگ کے پورے بالائی حصہ پر ورم آگیا ہے، اور میرے لئے زمیں پر قدم رکھنا بھی مشکل ہے۔ بخار بھی ہو گیا تھا لیکن ٹانگ کی شدید تکلیف کی وجہ سے مجھے اس کا بالکل احساس نہیں تھا ——— مرض کا حملہ اچانک بالکل اس طرح ہوا جیسے فالج اور لقوا وغیرہ مفاجاتی امراض کا حملہ ہوا کرتا ہے ——— علاج شروع ہوا، دوا کے استعمال کے لئے روزہ بھی قضا کر دینا پڑا لیکن ٹانگ کی تکلیف تیز رفتاری سے بڑھتی رہی اور اسی طرح بخار بھی ——— رات اسی بے چینی اور تکلیف میں گذری دوسرے دن اس کیفیت میں یہ اضافہ ہوا کہ ہچکیاں آنا شروع ہو گئیں اور مسلسل فاقوں کے باوجود مستقل ایک ہی حالت میں رہنے سے پیٹ میں نفخ کی کیفیت پیدا ہو گئی ——— اگلے دن تک بھی اس کیفیت میں کوئی فرق نہیں واقع نہیں ہوا بلکہ ٹانگ کی تکلیف اور نفخ میں اضافہ ہوتا

رہا۔اس پر مستزاد یہ کہ تیسرے دن سے بخار یکساں رہنے کے بجائے تیزی سے گھٹنے بڑھنے لگا۔دن میں دو تین بار شدید لرزہ کے ساتھ بخار بڑھتا تھااور سارے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی ——— یہ صورت حال میرے تیمارداروں کے لئے قدرتی طور پر پریشان کن تھی ——— ایک ڈاکٹر جو بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں ان کو میری بیماری کی اطلاع دی گئی،وہ آئے اور میری یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ مجھے بلڈیوریا کا شبہ ہے اس لئے خون اور پیشاب کا ٹسٹ فوراً کرایا جائے۔تیمارداروں نے اس کا انتظام کیااور اگلے ہی دن ٹسٹ کی رپورٹوں سے ڈاکٹر صاحب کے شبہ کی تصدیق ہو گئی،معلوم ہوا کہ بلڈیوریا ہے،اور آناً فاناً خطرناک حد تک پہونچ چکا ہے ——— میں اس مرض سے اور اس کی سنگینی سے واقف نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے تیماردار اور معالج خاصے فکر مند ہیں۔اس نئے اور غیر متوقع مرض کے انکشاف کے بعد میرے تیمارداروں نے ایک دوسرے کرم فرما ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیااور انکے مشورہ سے اس مرض کے خصوصی ماہر ایک ڈاکٹر کا علاج شروع ہوا۔

میرا اپنا حال یہ تھا کہ مجھے علالت کے پہلے ہی مرحلہ سے اصل احساس ٹانگ کی تکلیف کا تھا،جو رفتہ رفتہ میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔دوسرے بخار کے اضطراب اور نقع کی اذیت اور مسلسل بے خوابی نے ان تین چار دنوں میں مجھے اس درجہ نڈھال اور بے حال کر دیا تھا کہ میرے لئے آنکھیں کھولنا اور اپنے گھر والوں کو پہچاننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔اور بعد میں تیمارداروں نے بتلایا کہ کسی وقت بالکل ہذیانی کیفیت ہو جاتی تھی ———اسی حالت میں بلڈیوریا کے ماہر معالج ان ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع ہوا۔اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جلدی ہی افاقہ ہونے لگا۔اس درمیان میں ڈاکٹروں کی [illegible] خون اور پیشاب ٹسٹ کرایا جاتا رہااور ہر مرتبہ کی رپورٹ سے مرض میں تخفیف ہی ظا[illegible] ہو گیا ———البتہ ٹانگ کی تکلیف ابھی تک جوں کی توں بر قرار تھی اور بخار بھی برا[illegible] اسپتال میں داخلے کا فیصلہ کیا گیااور ایمبولنس کے ذریعہ مجھے اسپتال پہونچا دیا گیا،و[illegible] ڈاکٹروں نے بتلایا کہ کوئی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہے بلکہ جوڑی ایکسیڈینٹ سے مجروح ہو[illegible] ہے اور اس کا علاج بس آرام اور ورزش ہے۔چنانچہ ورزش شروع ہو گئی اور بخار وغیرہ [illegible] لگتے رہے الغرض اس طرح علاج چلتا رہا۔دس بارہ دن اسپتال میں رہنے کے بعد اندارہ ہوا کہ یہ علاج گھر پر بھی اسی طرح جاری رہ سکتا ہے،اس لئے ڈاکٹروں کی اجازت سے گھر آنے کا فیصلہ کر لیا گیا،چنانچہ ۲۸ ویں روزے کو اسپتال سے گھر واپسی ہوئی اور وہی علاج گھر پر ہوتا رہا۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے سامنے بندے کی عاجزی اور بے بسی کی رمضان مبارک کے صرف دو روزے نصیب ہو سکے اور سارا مہینہ اس طرح گذرا کہ صرف فرض نمازیں کسی طرح لیٹے لیٹے اشاروں سے ادا ہو جاتی تھیں۔اور ان کے بارہ میں بھی اس قدر بے اطمینانی تھی کہ میں ان سب کو صحت کے بعد واجب الاعادہ سمجھتا تھا یفعل اللہ مایشاء ویحکم مایرید۔"

خدمت؟

س خاصی لمبی تحریر میں ہم کو کہیں بھی کسی ملی خدمت کا ذکر نظر نہیں آتا۔ایک مولانا محمد اویس صاحب مرحوم کی تجہیز و تکفین کا بس ذکر ہے وہ خدمت کہاں ہے؟وہ خدمت ہے حضرت مولانا علی میاں صاحب سے گفتگو کے حوالے میں لپٹی ہوئی اور پھر مزید گفتگو کے لئے رائے بریلی کے سفر کے حوالے میں لپٹی ہوئی۔اب اسکی تفصیل میں آیئے۔

ستمبر۷۶ءکا یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب راقم السطور (عتیق) اس سے ایک ہی ماہ قبل لندن جا پہونچا تھا۔ اس لئے کچھ تفصیل معلوم نہ تھی۔ اور بعد میں خطوط سے معلوم ہوئی تو اپنے حافظے کی خرابی سے وہ زیادہ دیر پوری طرح ذہن میں محفوظ نہ رہی تھی۔ اس مضمون کے لئے الفرقان کے فائلوں کی ورق گردانی کی تو اس موقع پر پہنچ کر تفصیل کا تجسس ہوا۔ برادر عزیز میاں خلیل الرحمٰن سجاد نے بتایا کہ وہ لکھنؤ سے رائے بریلی کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہمراہ تھے۔ اور واقعہ یہ تھا کہ اندرا گاندھی کے دور کی ایمرجنسی کا زمانہ تھا۔ جس میں جبری نسبندی کی مہم جیسی السناک زیادتیاں ہوئی تھیں اور ہو رہی تھیں۔ مولانا علی میاں نے کچھ لوگوں کے توجہ دلانے پر اپنی اس حیثیت سے، اندرا جی کو ان معاملات پر توجہ دلانے کیلئے خط لکھا کہ وہ رائے بریلی ہی سے (جو مولانا کا آبائی شہر ہے) پارلیمنٹ کیلئے منتخب ہوئی تھیں۔ اور مولانا ایک معروف ہستی تھے۔ اس پر تو وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ البتہ ایک دن یکا یک وزیر اعظم کی طرف سے قصر صدر جمہوریہ (راشٹر پتی بھون) میں لنچ میں شرکت کی دعوت پہنچی۔ مولانا نے خیال فرمایا کہ یہ شاید انھیں خطوط کا غیر معمولی اکرام و اعزاز کے انداز میں جواب ہے (۱)۔ اس لئے اُن دنوں کے معمول کے مطابق حضرت والد ماجد سے مشورہ کیا۔ اور پھر جب جانے کی رائے ہوگئی تو پرائم منسٹر سے جو کچھ کہنا تھا اس کو ایک خط کی صورت میں قلمبند کر کے اور اسکی انگریزی کرا کے لے گئے۔ یہ دہلی کے اس سفر سے واپسی تھی جس کا حوالہ الفرقان کی مذکورہ بالا تحریر میں دیا گیا ہے کہ واپسی پر "مولانا کو بعض اہم معاملات کے بارے میں اس عاجز سے گفتگو فرمانی تھی"۔ اور اسکے بعد دوسرے دن جو رائے بریلی کا سفر ہوا جس سے واپس آکر ٹانگ میں تکلیف ہوئی۔ اُس کا قصہ یہ تھا کہ محترمہ اندرا گاندھی کے معتمد خاص محمد یونس خاں صاحب کے بارے میں مولانا کے یہاں اطلاع آئی ہوئی تھی کہ وہ ملنے کے لئے رائے بریلی آنا چاہتے ہیں اور قدرتی طور پر یہ سمجھا گیا کہ وہ اسی سلسلے میں آرہے ہونگے۔ مولانا ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ حضرت والد ماجد بھی اس موقع پر شریک گفتگو ہوں، اسلئے کہ بظاہر اسکا موضوع وہی ہوگا جس کے لئے اندرا جی کو خطوط لکھے گئے تھے۔ پس یہ وجہ تھی کہ دوسرے دن (دوسرے روزے کو) رائے بریلی کا سفر ہوا اور بڑی طویل گفتگو یونس خان سے رہی۔

راقم السطور نے جب ارادہ کیا کہ اس واقعہ کو اس خاص نمبر میں لاتا ہے تو از راہ احتیاط مناسب سمجھا کہ خود حضرت مولانا (علی میاں) سے اس کی تصدیق ہو جائے اور یہ سوچتے ہی ذہن

---

(۱) حالانکہ بات کچھ اور نکلی اگرچہ وہ مقصد بھی پورا ہو گیا جس کے خیال سے مولانا نے سفر فرمایا تھا اور مسئلے پر گفتگو ہوئی۔

مولانا کی کتاب "کاروانِ زندگی" کی طرف گیا کہ اس میں یہ واقعہ یقیناً آیا ہوگا اسلئے اسے دیکھ لینا کافی ہے۔ واقعہ پوری تفصیل سے کتاب کی جلد دوم میں نکلا مگر شروع سے آخر تک والد ماجد کا ذکر اس میں کہیں اشارۃً کنایۃً بھی نہیں تھا۔ اس چیز نے تو بڑے شش و پنج میں ڈال دیا کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس معاملے میں مولانا نے والد ماجد کی شرکت اتنی ضروری سمجھی ہو، اور پھر جس کے نتیجے میں ایسی تکلیف انھوں نے مول لے لی ہو۔ اس کے تذکرے میں کہیں انکا نام ہی سرے سے نہ آئے! اور دوسری طرف یہ کہ سجاد میاں ایسی خواہ مخواہ کی کہانی تو نہیں گڑھ سکتے۔ پس اب ناگزیر ہو گیا کہ حضرت مولانا کی خدمت میں جایا جائے۔ حاضر ہوا، استفسار کیا کہ مولانا محمد اویس صاحب کے انتقال کے دن وہ کیا مسئلہ تھا جس کے بارے میں والد ماجد نے لکھا ہے کہ آپ سے لمبی گفتگو کی ضرورت رہی اور پھر اسی سلسلے میں اگلے دن رائے بریلی جانا پڑا؟ مولانا نے "کچھ بھی یاد نہ ہونے" کا اظہار فرمایا، پر خدا بھلا کرے مولانا محمد رابع صاحب کا کہ اُن کی وہاں موجودگی کام آگئی، انھوں نے حضرت مولانا کو پورا قصہ اختصار سے یاد دلایا اور اس طر[illegible] واقعہ [illegible] تفصیل مصدّق (Confirmed) ہو گئی۔ جو اوپر برادرم سجاد میاں کے [illegible]
حضرت مولانا کے حافظے کی بابت ادھر برابر سننے میں آ رہا تھا کہ [illegible]
نے یاد داشت بہت متاثر کر دی ہے، معلوم ہوا کہ واقعی بہت [illegible]
بر قرار رکھے۔

تو یہ ہے ۷۶ء کا وہ ایک تاریخی واقعہ جس کے سلسلے میں راحت و آرام [illegible] وہ تکلیف انھوں نے مول لی جس نے رفتہ رفتہ آخر دم تک کے لئے بالکل ہی صاحب فراش کر دیا مگر اس تکلیف کے اس طویل بیان نے جو الفرقان کے حوالے سے اوپر نقل ہوا اصل معاملے پر ایسا اخفا کا پردہ ڈالا گیا ہے کہ کسی کو اس کی اہمیت کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔

دورِ معذوری کی ایک المناک آزمائش

مارچ ۸۰ء میں دار العلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس ہونا طے ہوا۔ اس اجلاس میں دار العلوم کی تاریخی عظمت اور نیک شہرت کو گویا نظر لگ گئی اور اسکے درمیان ہی میں ایک خانہ جنگی کی بنیاد پڑ گئی۔ پھر جہاں تک بات پہونچی اب وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ لوگ اس سے عام طور پر واقف ہیں اور اپنے اپنے رجحان، طرز فکر، یا پسند ناپسند کے مطابق رائے رکھتے ہیں۔ یہ ان تمام لوگوں کے لئے بڑی آزمائش کا وقت تھا جو دار العلوم سے کوئی ذمہ دارانہ تعلق رکھتے تھے۔ بانیٔ الفرقان علیہ الرحمہ بھی انھیں میں سے تھے۔ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے صرف کہنے کو سینئر ترین رکن

نہ تھے بلکہ روز اول سے اس رکنیت کی ذمہ داری کو عملاً ایک بڑی بھاری ذمہ داری کے طور پر نبھاتے آرہے تھے۔ اس بالکل نئی قسم کی اور بظاہر نہایت دور رس آزمائش میں انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ اس بارے میں غور و فکر کرنے کے بعد انھوں نے جس طرز عمل کو اپنی ذمہ داری سمجھا اسکو اختیار کر لیا۔ اور پھر آخر تک وہ اس پر قائم رہے حتی کی قضیہ فیصل ہوا۔

''تحدیث نعمت'' میں اس المناک قضیے کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا گیا ہے کہ:

''واقعہ یہ ہے کہ اس عاجز نے تو واقعہ سے آٹھ دس سال پہلے ارادہ کیا تھا کہ شوریٰ کی رکنیت سے استعفے دیدوں۔ اس لئے کہ جن معاملات کی بدولت یہ واقعہ رونما ہوا وہ اس وقت اس درجے پر پہنچ چکے تھے کہ اُن کے جواز کی میرے نزدیک کوئی شکل نہ تھے اور اصلاح کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے ایک ہی راستہ نظر آتا تھا کہ بحیثیت رُکن شوریٰ اس سلسلے میں جو ذمہ داری مجھ کو اپنے اوپر نظر آتی ہے، اُس سے اپنے آپ کو سبکدوش کرلوں۔'' (ص ۹۹)

اس کے آگے اس سلسلے میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے مشورہ کا ذکر فرمایا کے، جن سے وہ اپنے اس قسم کے اہم معاملات میں مشورے کے عادی تھے، لکھتے ہیں کہ حضرت والا نے میری رائے سے اتفاق نہ فرمایا، اور فرمایا کہ ان حالات میں بھی میں تمھارا دارالعلوم میں رہنا مفید سمجھتا ہوں۔ عند اللہ بری الذمہ ہونے کیلئے اتنا کافی ہے کہ روک ٹوک کرتے رہو۔'' چنانچہ میں نے اس مشورے کو قبول کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اور اپنے بس بھر روک ٹوک کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسکے بعد فرماتے ہیں:

''حتی کہ جشن صد سالہ کے موقع پر مولانا اسعد میاں کی صدارت میں ''مؤتمر ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند'' کا قیام اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی صدارت میں ''تنظیم فضلائے دارالعلوم دیوبند'' کے قیام نے اس لاوے کے پھوٹ پڑنے کا اعلان کر دیا جو ایک مدت سے پک رہا تھا۔ اور اُس کے نتیجے میں حضرت مہتمم صاحب مرحوم کی طرف سے اسعد میاں کے ''خطرے'' کی روک تھام کے لئے جو اقدامات دارالعلوم کے اندرونی معاملات میں شروع ہوئے انھوں نے معاملات کے اس بگاڑ کو جو اس عاجز کے استعفے کے ارادے کا باعث ہوا تھا تیز رفتار بھی کر دیا اور پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک رخ پر بھی ڈالدیا۔

کاش حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے مولانا اسعد میاں کے کسی اقدام کے مقابلے میں خود سے کوئی فیصلہ اور اقدام کرنے کے بجائے معاملہ شوریٰ کے سامنے رکھا ہوتا بلکہ اس پر چھوڑا ہوتا۔ اس لئے کہ یہ اُسی کے دائرۂ اختیار کی چیز تھی، تو یہ نزاع جس شکل میں اپنے انجام کو پہنچا اُس سے کوئی بہتر شکل نکل آتی'' [ص ۱۰۰-۹۹]

''تحدیث نعمت'' میں اُس قضیے کا تذکرہ محض ضمناً آیا تھا اور اسی لئے بہت مختصر۔ اس لئے کہ یہ تو اول سے آخر تک محض ایک آزمائش تھی نہ کہ کوئی فضل و نعمت۔ اصل تذکرہ دارالعلوم سے اپنے تعلق اور اُسکی حتی الامکان خدمت کی طویل توفیق کا تھا۔ پھر بھی اس میں قضیہ کی وہ بنیادی صورت پوری طرح منقح (Elucidated) ہو گئی ہے جس پر اس قضیے میں

اُنکارویہ اور اُن کا موقف مبنی رہا۔ اور وہ یہ کہ مولانا اسعد میاں کے ایک ایسے اقدام پر جو حضرت قاری صاحب کیلئے یقیناً پریشان کن ہو سکتا تھا، حضرت موصوف نے جو تدارکی اقدامات دارالعلوم کے اندرونی معاملات میں بالکل اپنے طور پر شروع کردئے، حالانکہ وہ شوریٰ کے دائرۂ اختیار کے تھے، یہ غیر آئینی اقدامات ہی ـــــ جن کا سلسلہ برابر آگے ہی بڑھتا گیا ـــــ اُن کے (بانیٔ الفرقان کے) اس رویے اور موقف کا باعث بنے جو انھیں عنداللہ اپنی ذمہ داری نظر آیا۔

حضرت مہتمم صاحب مرحوم کے اُن ''غیر آئینی'' اقدامات کے برابر آگے ہی بڑھتے جانے کی تفصیلات اس زمانے کے الفرقان میں آتی رہی ہیں(۱)۔ یہاں اُن تمام تفصیلات میں جانے کا تو موقع نہیں۔ البتہ صرف ایک اقدام کی طرف اشارہ سے معاملات کی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ اقدام تھا ۴؍اکتوبر ۸۱ء کو دہلی میں ''ہمدردان دارالعلوم'' کا اجتماع بلایا جانا، جس میں شوریٰ کی کوئی شرکت نہیں تھی۔ اور اِس اجلاس میں شوریٰ کے متبادل کے طور پر (یعنی اسکو برخاست کرکے) ۱۱- اشخاص کی ایک ایڈھاک کمیٹی بنائی گئی۔ اور ے
دستور دارالعلوم میں تبدیلیوں کیلئے۔

یہ وہ صورت حال تھی جس میں حضرت بانیٔ الفرقان
طاقت سے، اپنی معذوریوں کے باوجود، مزاحم ہونے کا فیصلہ
اراکین ہمرائے تھے۔ مگر اُن میں متعدد ایسے حضرت تھے جن کی را ـــ
کا دارالعلوم کے معاملات میں دخیل ہونا کچھ ایسا ہی حکم رکھتا تھا جیسا اُسے حضرت مہتمم صاحب (قاری طیب صاحبؒ) اپنے لئے سمجھتے تھے۔ جبکہ اُن کا دخیل ہونا اس وقت گویا ایک ہو کر رہنے والی بات بن گیا جب حضرت مہتمم صاحب نے نے شوریٰ سے لڑائی مول لے لی۔ اور پھر دارالعلوم کے اندر کا ماحول بھی اپنے خلاف دیکھ کر اُسے غیر معینہ مدت کیلئے بند کردیا۔ طلباء کو باہر نکلوادیا۔ مجلس شوریٰ بھی اپنا جلسہ دارالعلوم کے اندر نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے میں مولانا اسعد میاں طلبہ کی طرف اپنی اعانت اور سرپرستی کا ہاتھ بڑھاتے تو کون سے طلبہ اسے رد کرنے کو سوچ سکتے تھے؟ اور شوریٰ کی طرف دست تعاون دراز کرتے تو کس جواز کے ماتحت شوریٰ اُن کا ہاتھ جھٹک سکتی تھی؟ اور جب ایسا نہیں ہو سکتا تھا تو پھر کون انھیں اُس وقت دارالعلوم میں دخیل ہونے سے روک سکتا تھا جبکہ لڑائی کا فیصلہ شوریٰ اور طلباء کے حق میں نکلتا؟ جیسا کہ نکلا۔ اور

---

(۱) واضح رہے کہ حضرت والد صاحب اِن اقدامات کو دراصل حضرت مہتمم صاحب کے اردگرد کے کچھ مفاد پرست لوگوں کا کام سمجھتے تھے۔ جو حضرت مہتمم صاحب کی کبرسنی اور نرمی سے فائدہ اٹھا کر وہ لوگ کر رہے تھے۔ یہ بات الفرقان کی تحریروں میں رار مذکور ہوتی رہی ہے۔

نکلنا ہی تھا۔

الغرض شوریٰ کے یہ ارکان جو اسعد میاں کی شرکت کا تصور پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے تو اپنا موقف بدل دیا۔ اور اب معاملے کو مہتمم صاحب بمقابلہ شوریٰ کے بجائے بمقابلہ اسعد میاں قرار دے کر مہتمم صاحب کی حمایت میں آجانے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر حضرت بانیٔ الفرقان نہ صرف اپنے لئے بلکہ واقعہ میں ان حضرات کیلئے بھی اس موقف کا کوئی جواز نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا اور اُسے یقیناً چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اسعد میاں کیلئے "اس کا موقع (تو) حضرت مہتمم صاحب کے ناعاقبت اندیش حلقے ہی نے فراہم کیا ہے"۔(۱)" یعنی اب کس کے بس کی بات تھی کہ وہ اگر اس موقعے سے فائدہ اُٹھانا چاہیں تو اُن کو روکدیتا؟ اس لئے اُن کے نزدیک اب واحد صورت یہی رہ گئی تھی کہ اسعد میاں کے دخیل ہونے کے امکان کو قبول کیا جائے۔ اور ان سے اگر واقعی دارالعلوم کے کسی مفاد کو خطرہ ہے تو شوریٰ اُن کی روک تھام کیلئے بھی اپنا فرض ادا کرے جیسا کہ مہتمم صاحب اور ان کے حلقے کے مقابلے میں ابتداءً وہ ایک متفقہ موقف کے ذریعے کررہی تھی۔

مگر صحیح یا غلط، اِن حضرات کا موقف یہی رہا۔ اور اس طرح حضرت والد ماجد کا موقف کئی نہایت باوزن ارکانِ شوریٰ کی رفاقت وہم آہنگی سے محروم ہوگیا۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ واقعی معنی میں جو ان کے ہم پلہ حضرات تھے وہ تقریباً سب ہی اُن کا ساتھ چھوڑ گئے۔ مگر اُن کیلئے بات اصول کی تھی۔ انھوں نے ذرہ برابر بھی اپنے تنہارہ جانے کی فکر نہیں کی، آخر تک شوریٰ کے حق کی لڑائی اپنی معذوریوں کے باوجود پورے اعتماد کے ساتھ لڑی اور شوریٰ کی حاکمیت بحال ہوئی۔

اُن کی رائے کسی کے نزدیک غلط تھی تو وہ غلط بھی ہوسکتی ہے۔ وہ بشر تھے۔ اُن کے طریق کار اور طرزِ عمل میں غلطی تھی؟ تو وہ بھی ہوسکتی ہے، مگر ایک بات ان کی رائے کے مخالفین کی بڑی ہی ناانصافی پر مبنی ہے۔ یہ کہ انھوں نے دارالعلوم اسعد میاں کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس لئے کہ یہ اگر واقعہ ہے۔ تو اس کا موقع حضرت مہتمم صاحبؒ اور اُن کے حاشیہ نے اسعد میاں کیلئے فراہم کیا۔ اور اُسکی روک تھام کیلئے اُن معزز ارکان شوریٰ نے ہمت دکھانے سے انکار کیا جو شوریٰ کے ابتدائی متفقہ موقف کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ نہ رکھ سکے۔ اب ان میں سے سوائے ایک ہستی کے سب مرحوم ہوچکے۔ اللہ تعالیٰ سب کے ساتھ بہتر معاملہ فرمائے۔ کسی

---

(۱) الفرقان فروری ۱۹۸۲ء ص ۱۹

سے بھی کوئی خطا ہوئی ہو تو در گزر فرمائیے۔

والد ماجد کو اس کا تو آخر دم تک اطمینان تھا کہ انھوں نے جو کچھ کیا، اپنی عند اللہ ذمہ داری کے ماتحت انھیں یہی کرنا تھا۔ مگر اس کا رنج بھی برابر رہا کہ حضرت قاری صاحب جیسی محترم ہستی سے اُنھیں معرکہ آرا ہونا پڑا۔ اور اپنے دل و ضمیر کی صفائی کی بنا پر یہ امید رہی کہ اگر اللہ نے خاتمہ ایمان پر کیا تو اسکی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ ہم دونوں کو اُس زمرے میں شامل کرے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا	اور ہم دور کریں گے اُن کے دلوں میں سے کدورت کہ
علی سرر متقابلین [الحجر ۱۵]	سب بھائی بھائی کی طرح ہیں تختوں پر بیٹھے آمنے سامنے۔

الغرض یہ اُن کی زندگی کا نہایت کربناک ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اہم درجے کا تاریخی بلکہ تاریخ ساز باب ہے۔ زیادہ تفصیلات کے خواہشمندوں کو الفر[illegible] طرف رجوع کرنا ہوگا۔

معذوریوں میں اضافہ

اور ایک نئے معرکے کی بساط

دار العلوم کے قصّے نے انھیں جسمانی و روحانی اور ذہنی و قلبی طور پر جس قدر بھی نہ تھکا دیا ہو تا کم تھا۔ بڑا طویل اور بڑا کربناک قضیہ تھا۔ مگر اس قضیے سے باہر نکل کر جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک نئے معرکے کی بساط اُن کیلئے بچھی ہوئی ہے۔ یہ تھی قائد انقلاب ایران (۱۹۷۹ء) آیۃ اللہ خمینی صاحب کی "امامت"۔ جسے بے پناہ پروپیگنڈے کے ذریعے جمیع عالم اسلام کیلئے واجب الاطاعت بنایا جا رہا تھا۔ اور یہ پروپیگنڈہ جس کیلئے گویا ایرانی دولت کے خزانے کھولدئے گئے تھے اس کے اثرات نے اہل سنت کی آبادیوں میں اس حد تک رونما ہونا شروع کر دیا تھا کہ وہ جدید تعلیم یافتہ نوجوان جو اپنے دینی رجحان کی وجہ سے "اسلام پسند" کہلاتے ہیں اور دین کے ایک خاص تصوّر کے پیرو ہونے کی وجہ سے "اسلامی حکومت" کا نعرہ اُن کیلئے غیر معمولی کشش رکھتا ہے وہ اہل سنّت میں اس "امامت" کے پرجوش داعی بن گئے۔ حالانکہ یہ خالص شیعی عقیدے اور تصور والی امامت تھی۔ اور سنّیت کیلئے زہر قاتل۔ جسے شیعہ سنی اتحاد و یگانگت کے غلاف میں لپیٹ کر محض ایک دھوکے کا سیاسی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

الفرقان کا بانی، جسے حق و باطل کے تفرقے کی روز ازل سے اہمیت رہی تھی، اُس کیلئے

یہ صورت حال قدرتی طور پر ناقابل برداشت تھی۔ عمر گو اسی (۸۰) ہو چکی تھی۔ بیماریاں اور معذوریاں بھی ساتھ تھیں۔ مگر اُس نے کمر ہمت باندھی اور اپنے خیال میں اپنے دین حق کے ساتھ وفاداری کا آخری حق ادا کرنے کی نیت سے اس سیلاب بلاخیز کی مزاحمت کا تن تنہا ہی منصوبہ بنایا۔ جو یہ تھا کہ شیعیت، خمینیت اور ایرانی انقلاب کی واقعی حقیقت کو اس طرح آشکارا کردیا جائے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر صاف صاف سامنے آئے۔ یہ منصوبہ آپ کی آخری کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" کی شکل میں تکمیل پذیر ہوا، (جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔) اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کی وہ مثال ثابت ہوا کہ بلاشبہ اور قطعاً بلاشبہ، معاصر تاریخ تصنیفِ اسلامی میں اسکی کوئی دوسری مثال نہیں پائی جاتی۔ ایک ایسا شخص جس نے اپنا خاص کوئی حلقہ نہیں بنایا، کوئی جماعت نہیں بنائی، کہیں اسکے خاص ماننے والوں کے ادارے اور مرکز نہیں وجود میں آئے۔ مگر سُنّی آبادی کا شاید کوئی ملک بچا ہو جس میں یہ کتاب وہاں کی مقامی زبان میں آپ سے آپ نہ ترجمہ کرلی گئی ہو۔ اور یوں وہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا میں پھیل گئی۔

اس تدارک کی منصوبے کو عمل میں لانے کے لئے اس اسی (۸۰) سالہ معذور انسان کو کیا کچھ اور کیسے ذاتی حالات میں کرنا پڑا اس کے لئے کتاب کے پیش لفظ کی یہ سطریں کچھ اندازہ دیتی ہیں:

جب ایرانی انقلاب کے سلسلے کے اس پروپیگنڈے اور اُس کے اثرات کو دیکھ کر اس موضوع پر لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا اور میں نے اسکو دینی فریضہ سمجھا تو شیعیت سے ذاتی اور براہ راست واقفیت کیلئے (۱) میں نے مذہب شیعہ کی بنیادی اور مستند کتابوں کا اور خود امام خمینی کی تصانیف کا مطالعہ ضروری سمجھا۔ چنانچہ گزشتہ تقریباً ایک سال میں کہ عمر اسی (۸۰) سے متجاوز ہو چکی ہے۔ اور اس عمر میں ظاہری و باطنی قویٰ میں جو ضعف و اضمحلال فطری طور پر پیدا ہونا چاہئے۔ وہ پیدا ہو گیا ہے۔ اُسکے علاوہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بھی ہوں اور اسکی وجہ سے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت بہت متاثر ہو گئی ہے۔ بہر حال اسی حالت میں ان کتابوں کے کئی ہزار صفحات پڑھے " [ص ۲۲-۲۱]

اور اس بیان میں جو بات وہ اپنے مزاج اخفاء اور انکسار کے مطابق صاف نہیں کہ سکتے تھے وہ حضرت مولانا علی میاں نے کتاب کے مقدمے میں فرمادی۔ ارشاد فرماتے ہیں:

" انھوں نے اس محنت اور انہماک کے ساتھ کام شروع کیا کہ بارہا اُن کی صحت خطرے میں پڑ گئی اور اہل تعلق کو اس بارے میں فکر و تشویش لاحق ہو گئی۔ مگر مولانا اپنی افتاد طبع اور زندگی بھر کے معمول کے مطابق اپنے کو اس سے باز نہیں رکھ سکے۔ انھوں نے شروع سے شیعیت کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ [ص ۱۶]

اور یہ نامساعد و ناموافق ذاتی حالات کا بیان اپنا کوئی احسان قوم پر جتانے کیلئے نہیں تھا۔

---

(۱) اس سے اوپر کی سطروں میں اپنی اس واقفیت کا حال بیان کیا ہے جو براہ راست شیعہ مآخذ سے نہ تھی۔

یہ مزاج ہی نہ پایا تھا۔ بلکہ صرف اس مقصد سے کہ لوگ توجہ کریں اور غور سے کتاب کو پڑھیں۔ تاکہ دین حق میں باطل کی ملاوٹ کیلئے اٹھی ہوئی یہ تحریک پروان نہ چڑھنے پائے۔ اور خلافت راشدہ سے عداوت رکھنے والوں حکومت کو اسلامی حکومت نہ مان لیا جائے۔ اور الحمد للہ یہ مقصد مصنف علیہ الرحمۃ کی توقعات سے کہیں زیادہ —— ہزاروں گنا زیادہ —— بڑھ کر پورا ہوا۔

اس مقصد کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں صاحب نے کتاب کے مقدمے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ مقصد کی غیر معمولی اہمیت کے ساتھ کتاب کی اہمیت پر بھی بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ فرماتے ہیں

"عقیدہ کی اہمیت' ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل میں خطرناک حد تک کم ہوتی جا رہی ہے، اور یہ بڑی تشویش انگیز اور قابل فکر بات ہے، انبیاء اور غیر انبیاء کی دعوتوں میں اور ان کی جدوجہد کے مقاصد اور محرکات میں سب سے بڑی حد فاصل یہی عقیدہ ہے جس پر وہ کسی سمجھوتہ اور ادنے پونے سودا کر لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں رد و قبول، پسندیدگی، ناپسندیدگی کا معیار اور وصل و فصل کی شرط ہی عقیدہ ہوتا ہے، یہ دین (جو مسلمانوں کی ساری کمزوریوں کے باوجود) اپنی اصلی شکل میں اس وقت تک موجود ہے، اسی 'عقیدہ' کے معاملہ میں صلابت و استقامت اور حمیت و غیرت کا رہین منت ہے اس سلسلہ میں کسی باجبروت طاقت اور کسی وسیع سے وسیع تر بادشاہی کے سامنے سپر ڈالنے پر سکوت جائز نہیں سمجھا، چہ جائیکہ مسلمانوں کے دنیاوی منافع اور اختلاف و تفریق کرتے، امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) کا خلق قرآن کے عقیدہ میں نہ صرف مسلمانوں کے سب سے بڑے فرماں رواؤں خلیفہ مامون الرشید (فرزند خلیفہ ہارون رشید) اور معتصم ہو جانا اور تازیانوں اور زنداں کی تکلیف برداشت کرنا۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی (م ہزارۂ دوم)، دعوائے امامت و اجتہاد اور وحدت ادیان کی مخالفت کرنا پھر جہانگیر کے عہد تک اس کو اس وقت تک جاری رکھنا جب تک مغلیہ حکومت کا رخ بدل نہیں گیا، اس کی دو مثالیں ہیں، ورنہ تاریخ اسلام اپنے اندر "کلمۃ حق عند سلطان جائر" اور "لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" کی بیسیوں تابناک مثالیں رکھتی ہے، یہ سلطان جائر کبھی شخصی بادشاہ ہوتا ہے کبھی رائے عامہ، کبھی شہرت عام، کبھی دل فریب کامیابیاں اور بلند و بانگ دعاوی۔ اور تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ آخر الذکر صورتیں زیادہ آزمائش کی چیزیں ہیں۔

حقیقت میں اسلام کی حقیقی تعلیم اور صحیح عقیدہ وہ دریا ہے جو کبھی اپنا رخ نہیں بدلتا اور کبھی پایاب نہیں ہو سکتا، سیاسی طاقتیں، وقتی انقلابات، حکومتوں کا قیام و زوال اور دعوتیں اور تحریکیں موجیں ہیں جو آتی اور گزر جاتی ہیں، دریا اگر صحیح رخ پر بہہ رہا ہے اور آب جاری ہے تو کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر عقیدہ میں فساد آ گیا تو گویا دریا نے اپنا رخ بدل دیا اور اس میں آب صافی کے بجائے گندا اور ناصاف پانی بہنے لگا، اسلئے فساد عقیدہ اور زیغ و ضلال کے ساتھ کوئی دعوت و تحریک کسی ملک کا عروج و اقبال، کسی معاشرہ کی جزئی اصلاح یا کسی فساد و خرابی کو دور کرنے کا دعویٰ یا وعدہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس میں اس ملت کی بقا اور دین کی حفاظت کا راز مضمر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جو اپنے اپنے دور کے علماء، خادمین دین اور محافظین شریعت و سنت کو اس دشوار اور بعض اوقات ناخوشگوار فرض کو ادا کرنے پر مجبور کرتی رہی ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی یہ فاضلانہ اور محققانہ کتاب 'ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت' ہے"۔

جنابِ خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں استفتاء

اس کتاب (ایرانی انقلاب) کے مضامین کا آخری عنوان تھا "حضرات علمائے کرام کی خدمت میں" اسکے تحت لکھا گیا تھا کہ

"اس کتاب میں آپ نے اثنا عشریہ کی مستند ترین کتابوں اور ان کے مسلّم علماء و مجتہدین کی واضح تصریحات کی روشنی میں ملاحظہ فرمایا کہ ان کے اساسی عقیدۂ امامت کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ کہ اس کا درجہ نبوت سے برتر اور ائمہ کا مقام و مرتبہ انبیاء و مرسلین سے بالاتر ہے۔ اور وہ خداوندی صفات و اختیارات کے بھی حامل ہیں، اور یہ کہ حضرات خلفاء ثلثہ اور ان کے رفقاء تمام اکابر صحابہ، منافق، اللہ و رسول کے غدار، جہنمی اور لعنتی ہیں۔ اور ام المومنین عائشہؓ اور حصہؓ منافقہ تھیں۔ انھوں نے زہر دے کر حضور ﷺ کو ختم کیا۔ اور قرآن مجید محرف ہے۔ ان کے علاوہ بھی اثنا عشریہ کے جو معتقدات آپ کے سامنے آئے امید ہے کہ اس کے بعد آپ اس مذہب اور اس کے پیروؤں کے اسلام سے تعلق کے بارے میں کتاب و سنت کی روشنی میں قطعیت کے ساتھ فیصلے فرماسکیں گے۔ آپ اُمت امین ہیں اور زیغ و ضلال سے امت کی حفاظت آپ کا فریضہ ہے۔
واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔"

علماء امت کی خدمت میں اس گذارش کی اشاعت کے بعد آپ کو اپنا یہ بھی فرض معلوم ہوا کہ ایسے اہم معاملے میں صرف اتنے ہی پر اکتفانہ کریں۔ بلکہ ایک استفتاء بھی مرتب کردیں۔ تاکہ علماء کرام کو غور و فکر میں آسانی بھی ہو۔ اور بات ٹل نہ جائے۔ چنانچہ ایک مفصل استفتاء ۱۹۸۶ء میں تیار فرمادیا گیا۔ اور پھر اس کے جوابات کی پہلی قسط الفرقان کے ایک خاص نمبر کی شکل میں دسمبر ۱۹۸۷ء میں اور دوسری قسط مئی ۱۹۸۸ء کی خاص اشاعت کی شکل میں شائع ہوئی۔ اور اتنی بڑی تعداد میں ان جوابات کے حاصل کرنے کے لئے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی ادارۂ علماء مشکل سے چھوٹا ہوگا، اس بیمار و نزار بوڑھے انسان کو ایسی حالت میں کہ اسکے پاس ایک معمولی سے کاتب خطوط کے سوا نہ کوئی سکریٹریٹ تھا نہ پروفیشنل اسٹینو' جسقدر تعب اٹھانے اور بوڑھی ہڈیوں کو گھلانے کی ضرورت پڑی ہوگی، اسے کسی بیان کی ضرورت نہیں، مگر یہ کام بھی اللہ نے ان کی خواہش کے مطابق ان سے لے ہی لیا۔ حصہ دوم (۸۸ء) کے مقدمے میں فرماتے ہیں

"یہاں یہ عاجز اپنے رب کریم کے شکر کے ساتھ اس کا اظہار بھی مناسب سمجھتا ہے کہ جب میں نے شیعہ اثنا عشریہ اور خمینی کے بارے میں استفتاء مرتب کرکے حضرات علماء کرام کا فتوی حاصل کرنے اور اس کے شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو میرا خیال بلکہ غالب گمان تھا کہ ماضی قریب بعض لوگوں کے کفر کے غلط فتووں کی وجہ سے تکفیر کا فتوی بہت بدنام ہوگیا ہے اس لئے مختلف حلقوں کی طرف سے مجھ پر ملامت کے تیروں کی بوچھار ہوگی اور ممکن ہے کہ بہت سے حضرات جو اصل مسئلہ میں پورا اتفاق رکھتے ہیں وہ بھی اسکو مناسب نہ سمجھیں۔ لیکن یہ عاجز اس صورت حال میں جس کا ذکر استفتاء کی تمہید اور مقدمہ میں بھی کیا جاچکا ہے فیما بینی و بین اللہ اس کو اپنا دینی فریضہ سمجھتا تھا اس لئے ارشاد ربانی یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ

لائم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے کو ملامت کے تیروں کا نشانہ بننے کے لئے تیار کیا اور اسی فیصلہ کے نتیجہ میں الفرقان کا وہ خاص نمبر گذشتہ دسمبر میں شائع ہوا، جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

یہ عاجز اس کو اپنے کریم پروردگار کا خاص کرم ہی سمجھتا ہے کہ آج تک ایک خط بھی ایسا نہیں آیا جس میں اس فتوائے تکفیر اور اس کی اشاعت کے اقدام کو غلط یا نامناسب ہی قرار دیا گیا ہو ——اس کے برعکس لاتعداد خطوط ایسے موصول ہوتے رہے جن میں لکھا گیا کہ یہ اس وقت کا اہم دینی فریضہ تھا جس کے ادا کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی"۔

سفرِ حرمین شریفین

فتنۂ خمینیت کے خلاف اس مہم کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مطالعہ شیعیت کے نتیجے میں اس فتنے کا عملاً سب سے زیادہ خوفناک پہلو آپ کے سامنے یہ تھا کہ حرمین شریفین پر اقتدار اس کا خاص نشانہ ہے۔ آپ رابطۂ عالم اسلامی کے رکن اساسی تھے۔ مگر ۷۶ء سے ٹانگ کی معذوری کے سبب اس کے جلسوں میں شرکت نہیں کرپارہے تھے۔ ۸۵ء کے اجلاس کا دعوت نامہ آیا تو مطالعۂ شیعیت کے اسی خوفناک تاثر کے ماتحت ا
سفر کرلیں۔ تاکہ وہاں کے خواص کو اس خطرے کی طرف کما حقہ
بظاہر وہاں توجہ کے بالکل آثار نہیں تھے۔ چنانچہ معذوری کی بنا پر د
خود اٹھا کر اس ارادے کی تکمیل کی۔ اگرچہ واپسی بہت مایوسانہ ہوئی
خطرے کا احساس نہیں کیا گیا جب تک کہ دو سال بعد ۸۷ء میں ایرا
موقع پر وہ خونریز ہنگامہ نہ ہوا جس میں کئی سو آدمی مارے گئے۔ حد یہ ہے کہ "ایرانی انقلاب" والی کتاب کا وہاں داخلہ بھی بند رہا۔ الفرقان بابت فروری مارچ ۸۵ء میں اس سفر حجاز کا ذکر آیا ہے۔

حسن ختام

شیعیت اور خمینیت کے بارے میں اپنے اس کام کو جو اُن کی عملی زندگی کا آخری کام ثابت ہوا، وہ اپنے علم اور فہم دین کی روشنی میں ان کاموں میں سے ایک —— بلکہ شاید سب سے برتر —— سمجھتے تھے جن پر اپنے اللہ سے وہ امید لگائے تھے کہ ذریعۂ مغفرت کے طور پر قبول فرمالئے جائیں گے۔ اور دنیا میں اُن کے اِس کام کی عزت و مقبولیت اِن شاء اللہ آخرت کے لئے ایک امید افزا علامت ہی ہے۔

یہ بانوے رچورانوے سالہ زندگی کے اُس وقت تک کی اجمالی سرگزشت ہے جس وقت تک آپ کچھ بھی کارکردگی کے قابل رہے۔ اسکے بعد زندگی کے تقریباً آٹھ سال آپ

کو ملے، مگر ضعفِ پیری اور عوارض و معذوری کی حالت میں مذکورۂ بالا شدید محنت طلب اور فکر و توجہ طلب مہمات کی انجام دہی نے جسمانی اور دماغی قوتوں کو بالکل نچوڑ ڈالا تھا۔

صرف معارف الحدیث کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ۱۹۹۲ء تک قائم رکھ سکے۔ اور اُسکے بعد کے ۴-۵ سال میں تو گویا وقتِ آخر کے انتظار میں گزرے۔ اور اس "انتظار" کے زمانے میں بھی بظاہر اُنکی زندگی کچھ "منزلیں" طے کرتی رہی، مگر اِن منزلوں کا نام ہم جیسے عامی نہیں جانتے۔ ہاں اُن کے صبر و ثبات، رضا و استقامت اور روز بروز بڑھتی ہوئی توجہ الی اللہ کی کیفیت سے محسوس کھلے طور پر ہوتا تھا کہ زندگی اب بھی ٹھیری ہوئی نہیں ہے۔ منزلوں کا سفر جاری ہے۔ حتی کہ ۲۷/ذی الحجہ بروز یکشنبہ ۱۴۱۷ھ / ۴ مئی ۱۹۹۷ء کو یہ مسافر حیات ابدی کی منزل سے ہم کنار ہو گیا۔ غفر اللہ لہٗ و قدس سرہٗ

الفرقان کے تین خاص نمبر

اور تدریس حدیث

بیانِ منازل (یا سنگہائے میل) اختتام تک پہونچ گیا۔ لیکن دو اہم عنوان جن کی جگہ درمیان میں تھی، ان کے بیان کی کوئی موزوں صورت ان کی واقعی جگہ پر نہ بن سکی۔ مجبوراً انھیں آخر میں رکھنا طے کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک ہے، الفرقان کے تین خاص نمبر۔ اور دوسرا تدریس حدیث۔

الفرقان کے خاص نمبر

الفرقان کی خاص اشاعتیں یوں تو بہت سی ہیں جن کا سلسلہ شاہ اسمٰعیل شہید نمبر ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے لیکن زیادہ اہمیت والے نمبر تین ہیں جن میں سے دو کی اہمیت تو دوسروں کی نظر میں بھی غیر معمولی قرار پائی اور وہ الفرقان اور اسکے بانی مدیر کا ایک نہ صرف دینی بلکہ علمی کارنامہ بھی آج تک مانے جاتے ہیں۔ اور ان کا اس حیثیت سے حوالہ آتا ہے۔ یہ ہیں حضرت مجدد الف ثانی نمبر (۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء) اور حضرت شاہ ولی اللہ نمبر (۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء)۔ تیسرا خاص نمبر جو صرف حضرت مرحوم کے ایک مقالے پر مشتمل تھا، یعنی "خاکسار تحریک علم و عقل کی روشنی میں"۔ یہ اوروں سے قطع نظر خود آپ کی اپنی نظر میں ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اسلئے مناسب معلوم ہوا ہے کہ اس کو بھی یہاں کے قابل ذکر نمبروں میں شامل کیا جائے۔

ان تینوں خاص نمبروں کی مشترک اہمیت یہ تھی کہ یہ ملت کو ایک پیغام دیتے تھے جس کی اُس وقت کے حالات میں خاص ضرورت تھی۔ اور یہ ضرورت مجدد الف ثانی نمبر اور شاہ ولی اللہ نمبر کے حق میں تو بلا شبہ آج بھی اُسی طرح قائم ہے۔ یہ دونوں بزرگ اس برّ صغیر میں اپنے اپنے وقت کے ایسے مجدد اور حکیم پیدا ہوئے تھے کہ آج بھی انکے کام اور انکے پیغام کی روشنی کی ہمارے لئے وہی قدر و قیمت ہے جو انکے زمانے میں تھی۔ بلکہ آج کے ہندوستان میں جبکہ اسلام کو فنا کر دینے کے منصوبے بالکل برہنہ ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ ان کی قیمت کا درجہ اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ اور مجدد الف ثانی نمبر تو خاص طور پر نکالا ہی اس وقت گیا تھا جب ۱۹۳۵ء کے انڈین ایکٹ کی رو سے ہندستانیوں کی صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان میں اسلام کے لئے مستقبل کے ہندستان کا وہ پُر خطر چہرہ دکھائی دیا جو اس وقت ہمارے سامنے بالکل برہنہ شکل میں ہے (۱)۔ اس لحاظ سے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہئے کہ یہ ایک بڑی خاص توفیق ایزدی تھی کہ الفرقان کو اسکے بالکل ابتدائی دور میں ——— اور اس دور میں جبکہ اسکا ہر شمارہ مالی بحران کا مسئلہ لئے ہوئے تھا ——— تین تین چار چار سو صفحات کے بلند معیار کے یہ نمبر نکالنے کا شرف ملا اور بلا شبہ یہ حضرت بانیٔ الفرقانؒ کے سفر حیات میں بڑی اہمیت کے سنگ میل ہیں سے ہیں۔

خاکسار تحریک پر ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء میں نکلنے والا خاص نمبر بھی ایک خاص اہمیت رکھتا تھا کہ وہ اسلامی شان و شوکت کی بحالی کے نام پر علامہ عنایت اللہ مشرقی کی اٹھائی ہوئی ایک ایسی گمراہ کن تحریک کے توڑ کے طور پر نکلا تھا جس تحریک کی طاقت کا ان دنوں یہ عالم تھا کہ وہ صوبائی حکومتوں سے مسلح ٹکر کے حوصلے دکھا رہی تھی۔ اور بالآخر اس ٹکراؤ میں وہ سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب کی حکومت کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ اس نمبر کی کتابی اشاعت کے مقدمے میں مولانا علی میاں صاحب نے اس تحریک میں پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی، حسن بن صباح والی باطنی تحریک سے کھلی مشابہتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی زیادہ خطرناک اور زیادہ قابل فکر خصوصیت ان الفاظ میں بتائی تھی کہ

"لیکن ہم کو اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان دونوں تحریکوں میں ایک عظیم الشان فرق بھی ہے، فرق یہ ہے کہ باطنی تحریک آخر وقت تک مسلمانوں کی ہمدردی و اعانت سے محروم رہی اور مسلمانوں کے ہر طبقے نے اس کو اسلام سے قطعاً خارج اور مذہب کے خلاف اعلان جنگ سمجھا اور اسکو یہودیت اور عیسائیت سے بڑھ کر اسلام کے لئے خطرہ تصور کیا لیکن خاکسار تحریک کے ساتھ مسلمانوں کا طرز عمل کچھ مختلف ہے۔"

---

(۱) ملاحظہ ہو الفرقان (نگاہ اولیں نومبر ۱۹۵۷ء / ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ)۔

اس "مختلف طرز عمل" کی قدرے مختصر تشریح اسی خاص نمبر میں شائع ہونے والے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے مکتوب کی ان سطروں میں ملتی ہے۔

" مسلمانوں سے میری مایوسی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ میں حیران ہوں کہ جس قوم میں ایسے ذلیل طریقے فروغ پاسکتے ہیں اور جو اتنے پست اخلاق اور گھٹیا درجے کے آدمیوں کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اس کا اخلاقی وقار دنیا میں کیسے باقی رہ سکتا ہے۔ دو چار یا ہزار دو ہزار آدمی ایسے ہوتے تب بھی کوئی بات نہ تھی۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ لاکھوں مسلماں اس کے پیچھے ہیں، لاکھوں اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے بکثرت اخبارات اسکی حمایت کر رہے ہیں۔ اور بعض بڑی ذمہ دار مسلمان انجمنیں اسکی تائید پر ہیں "

یہ تھی اس نمبر کی وہ خاص اہمیت جس کی بناپر یہ ضخامت میں کمتر اور صرف ایک مقالے پر مشتمل ہونے کے باوجود اسکا مستحق ٹھہرتا ہے کہ اسے حضرت بانیٔ الفرقان کے سفر حیات کا ایک سنگ میل قرار دیا جائے۔ یہ ایک تنہا اور نہتے شخص کے ہاتھوں ایک ایسی فوجی تحریک کا بھرپور پوسٹ مارٹم تھا جس نے حسن بن صباح والی تحریک کو بھی اس لحاظ سے پیچھے چھوڑ دیا تھا کہ اس کی پشت پر لاکھوں جذباتی مسلمان تھے اور دیوانہ وار تھے! پھر نہ صرف یہ تحریر کا کام کیا گیا بلکہ عملاً ایک تحریک بھی اسکے خلاف اٹھانے کی بھرپور شروعات کی مگر پھر اس مشرقی تحریک کی حماقتیں خود ہی اس کے خاتمے کیلئے کافی ہو گئیں۔

تدریس حدیث

شروع میں گذر چکا ہے کہ تعلیم سے فراغت کے بعد چار سال تدریس علم دین کی خدمت بھی اپنے اساتذہ اور اکابر کے طریقے پر انجام دی لیکن اسکے بعد یہ سلسلہ آزادانہ خدمت دین کے لئے ترک کر دیا۔ یہ ۱۹۳۱ء / ۱۳۵۰ھ کی بات ہے اس کے بعد لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں جو (۱۹۴۶ء سے آخر دم، یعنی ۱۹۹۷ء تک قائم رہا) یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حلیم عطا صاحب کے بیمار ہو جانے سے صحیح بخاری اور مسلم شریف کا درس بند ہو جاتا ہے۔ یہ شوال ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ تب اس کے لئے آپ (حضرت والد ماجد سے) خواہش کی جاتی ہے کہ شاہ صاحب کی صحت بحال ہونے تک یہ سبق پڑھادیئے جائیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ پانچ سال تک قائم رہا اور تحدیث نعمت میں اس کا تذکرہ ایک خاص ضمن میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے مجھ سے کہا گیا کہ جب تک شاہ صاحب صحت یاب ہوں اور درس کے لائق ہو سکیں میں دو گھنٹے کے لئے دارالعلوم آکر یہ دو سبق پڑھادیا کروں اس کے لئے مشاہرہ کی بھی پیش کش کی گئی اتفاق سے اس سال ان دونوں کتابوں کی پڑھنے والی جماعت میں بعض ایسے طلبہ بھی تھے جو اس عاجز سے گہرا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے،

اور میرے دل میں ان کی قدر تھی، انھوں نے بھی اس کے لئے اصرار کیا اور خود مجھے بھی اس کے تعلیمی نقصان کا احساس تھا۔ میں نے اپنے مستقل ضروری مشاغل اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دار العلوم کے ذمہ دار حضرات سے عرض کیا کہ میں روزانہ دو گھنٹے تو نہیں دے سکتا، اتنا کر سکتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے لئے آ کر صرف صحیح مسلم کا سبق پڑھایا کروں، شاہ صاحب جب صحت یاب ہو جائیں گے تو وہ بخاری شریف پڑھا دیں گے، اس طرح اس جماعت کا تعلیمی نصاب بھی پورا ہو جائے گا ـــ میں اس ایک گھنٹہ کا کوئی مشاہرہ اور معاوضہ نہیں لوں گا، البتہ میری آمد و رفت رکشہ سے ہوگی، اس کا کرایہ دار العلوم کی طرف سے ادا کر دیا جایا کرے گا ـــ یہی طے ہو گیا اور میں ایک گھنٹہ کے لئے دار العلوم آ کر صحیح مسلم کا درس دینے لگا۔ شاہ صاحب کا علاج جاری تھا، امید تھی کہ انشاء اللہ کچھ عرصہ میں شفایاب ہو کر وہ درس کا سلسلہ جاری کر سکیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ چند مہینے کے بعد مرض کا اختتام اُن کے سفر آخرت پر ہوا۔ (رحمه الله رحمه الابرار الصالحين)۔

میں جو مسلم شریف پڑھا رہا تھا بفضلہ تعالیٰ تعلیمی سال کے اختتام تک وہ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جب دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا تو دار العلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے پھر مجھ سے کہا گیا کہ اب میں مستقل دو گھنٹے دے دیا کروں اور حدیث کے دو سبق پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر لوں۔ میں اپنے دوسرے مستقل مشاغل کی وجہ سے اس وقت بھی اپنے کو اس کے لئے آمادہ نہیں کر سکا، میں نے عرض کیا کہ جب تک شاہ صاحب مرحوم کی جگہ کسی استاد حدیث کا انتظام ہو میں ایک گھنٹہ جس طرح اب تک دیتا رہا ہوں انشاء اللہ دیتا رہوں گا۔ چنانچہ اس کے بعد بھی روزانہ ایک گھنٹہ کے [illegible]
سبق پڑھاتا رہا ـــ دو تین سال اسی طرح گزر گئے اور شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم
نہیں ہو سکا تو پھر دار العلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے اصرار کے ساتھ فرمایا
پیش نظر رکھتے ہوئے اس ذمہ داری کو بہر حال قبول کر لوں اور روزانہ صرف دو گھنٹے کے
سبق پڑھا دیا کروں اور اس کے لئے معقول مشاہرہ کی پیش کش بھی کی گئی۔

میں نے اگرچہ طالب علمی سے رسمی فراغت کے بعد ۳-۴ سال تک [illegible]
خدمت بھی انجام دی تھی لیکن اس کے بعد کسی مدرسہ سے ملازمت کا تعلق نہیں رکھا۔ طبیعت آزاد رہ کر ہی حسب توفیق کام کرنے کی عادی ہو گئی اور اسی کو اپنے لئے بہتر سمجھا (بعض تلخ تجربے بھی اس کا سبب تھے) ـــ اس وجہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء کی اس پیش کش کو قبول کرنے پر بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوئی ـــ دوسری طرف یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ حدیث شریف اور صرف حدیث شریف کی مستقل تدریسی خدمت کا موقع مل رہا ہے، اس سے انشاء اللہ خود مجھے بھی علمی اور دینی نفع ہوگا اور مشاہرہ کی شکل میں دنیوی منفعت بھی ہے، وہ بھی اللہ کی نعمت ہے اور طبیعت کا انکار شاید نفس کے استکبار اور استنکاف کی وجہ سے ہے جو با تنخواہ ملازمت کو اپنے لئے گھٹیا درجہ کی بات سمجھنے لگا ہے، اور اگر ایسا ہے تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔

اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر کافی غور فکر کے بعد بھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تو مشورہ کے لئے سہارنپور حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوری بات عرض کی(۱)۔"

آگے حضرت شیخ الحدیث کے اس مشورے کا ذکر ہے کہ پیش کش قبول کرنا مناسب ہے۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا اور درس حدیث کا یہ سلسلہ پھر کئی سال چلا۔ غالباً ۱۹۶۳ء تک۔
اس سلسلۂ درس کے بارے میں حضرت مولانا علی میاں صاحب جو ان دنوں ندوے

---

(۱) تحدیث نعمت باب دوم۔ تذکرہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ ص ۳۰۲ تا ۳۰۵۔

کے معتمد تعلیمات تھے، اور بظاہر انھیں کے اصرار سے یہ خدمت قبول کی گئی ہو گی، مولانا محمد عمران خانصاحب کے نام، ۱۹۶۰ء میں، لکھے گئے ایک خط میں اپنا جو تاثر بیان فرماتے ہیں اس پر یہ بیان تدریس حدیث ختم کیا جاتا ہے

"دارالعلوم کی بڑی خوش قسمتی اور اقبال مندی ہے کہ اس نے مولانا محمد منظور صاحب جیسا نامور عالم اور راسخ العلم متکلم و محدث تدریس کے لئے حاصل کر لیا۔ ان کا وجود ہندستان و پاکستان کے بڑے سے بڑے ادارہ اور جامعہ کے لئے موجب فخر و وقعت تھا۔ واقعہ یہ ہے میں ان کو دیوبند کی مسند حدیث کے لئے ہر دوسرے عالم سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی بہت سی صلاحیتیں اور کمالات عطا فرمائے ہیں جس کی وجہ سے بالخصوص تدریس حدیث کے لئے ان سے بہتر آدمی ملنا مشکل ہے، پھر ان کا اخلاص، اصابت رائے، معاملہ فہمی، قوت فیصلہ، اشتراک عمل کا جذبہ اور وسیع ذہن ایسی خداداد صلاحیتیں ہیں کہ ان کا وجود دارالعلوم کے اس مجموعہ میں کسی نوع سے بھی مفید اور بیش قیمت ہے(۱)"

بہت کچھ ان صفحات میں آگیا۔ پھر بھی سب کچھ کہاں؟ کہ ایک نمبر کے مقالے کی ضخامت میں، کم از کم اپنے جیسی اہلیت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ نوّے سالہ بھرپور زندگی کے کل عنوانات کو اس میں سمیٹ لے۔ ع "سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے"۔

☆☆☆

---

(۱) حیات عمران از پروفیسر مسعود الرحمٰن خان۔ مکتبہ دین و دانش۔ بھوپال ص ۱۷۲

حضرت بانیٔ الفرقان کی تصنیفی وتالیفی یادگاریں

[ا]

وہ ضخیم، متوسط اور مختصر کتابیں اور کتابچے جن کا سلسلۂ اشاعت برابر قائم ہے۔ اور دستیاب رہتی ہیں۔

۱- اسلام کیا ہے؟ ——— اردو، ہندی،
۲- دین وشریعت ——— اردو، انگریز
۳- قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اردو ——— (ہندی ایڈیشن
۴- معارف الحدیث مکمل ۷ جلدیں ——— (آٹھویں اور آ
بہت جلد منظر عام پر آرہی ہے)
۵- تذکرہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ
۶- ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ
۷- بوارق الغیب حصہ اول۔ یا مسئلہ علم غیب کا قرآنی فیصلہ
۸- بوارق الغیب حصہ دوم ——— نیا ایڈیشن نئی کتابت کے ساتھ زیر طبع
۹- حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات
۱۰- شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات
۱۲- تصوف کیا ہے؟
۱۳- کلمۂ طیبہ کی حقیقت
۱۴- نماز کی حقیقت
۱۵- برکات رمضان

۱۶- آپ حج کیسے کریں؟ اردو ——————— (ہندی ایڈیشن زیر طبع)
۱۷- آسان حج ——————— اردو و ہندی ایڈیشن (انگریزی زیر طبع)
۱۸- عقیدۂ علم غیب
۱۹- مسئلۂ حیات النبیؐ کی حقیقت
۲۰- قرب الٰہی کے دو راستے
۲۱- منتخب تقریریں
۲۲- دینی مدارس کے طلباء سے ایک خطاب
۲۳- آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور آپ کی منزل کیا ہے؟
۲۴- میری طالب علمی
۲۵- انسانیت زندہ ہے ——————— اردو، ہندی ایڈیشن
۲۶- مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف
۲۷- تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات
۲۸- قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟
۲۹- قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ
۳۰- کفر و اسلام کے حدود اور قادیانیت
۳۱- تذکرہ حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ
۳۲- قرآن و حدیث کی سو دعائیں
۳۳- الفیۃ الحدیث
۳۴- ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت
۳۵- خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ (۲ حصے)
۳۶- تحدیث نعمت

[۲]

وہ کتابیں اور رسالے جن کے نام معلوم ہیں مگر کتب خانہ الفرقان کے شروع دور کے بعد ان کی اشاعت کا سلسلہ قائم نہیں رہا۔ البتہ ان میں کی بعض کتابیں اب کچھ دن سے پاکستان میں شائع ہو رہی ہیں۔

۱- سیف یمانی.

غالباً سب سے پہلی تصنیف ہے۔ جس میں اکابر دیوبند اور مسلک دیوبند پر اعتراضات کے نہایت مؤثر جوابات دیئے گئے ہیں۔

٢- مومن کی پہچان از روئے قرآن.

اسلامی توحید کے عنوان پر اس مختصر رسالہ میں قبر پرستی، وغیرہ کی نہایت دلکش انداز میں تردید کی گئی ہے۔

٣- ستہ ضروریہ:

(١) علم غیب، (٢) توسل، (٣) استعانت بغیر اللہ، (٤) عرس، (٥) سماع مزامیر اور (٦) نذر لغیر اللہ۔ ان چھ مسائل کی شرعی تحقیق۔

٤- ہدایات قادریہ یا ہماری گیارھویں شریف:

مروجہ گیارہویں شریف۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ... روشنی میں۔

٥- حاضر و ناظر:

آنحضرت ﷺ کے بارے میں "حاضر و.

٦- تیجہ:

تیجہ، دسویں وغیرہ رسوم مروجہ بعد الموت کے بارے میں ایک جامع رسالہ۔

٧- خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں:

علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک پر ایک نہایت مدلل اور مکمل مقالہ مذہب و سیاست کی روشنی ہیں۔

٨- ایک ہفتہ چند دینی مراکز میں:

کچھ دینی مراکز میں حاضری کی ایک تاریخی داستان۔

٩- خاکسار تحریک کیوں قابل قبول نہیں:

خاکسار تحریک سے متعلق ایک بصیرت افروز تقریر۔

١٠- خطبات بمبئی:

اسلام بحیثیت نظام کامل پر آٹھ مسلسل تقریروں کا مجموعہ

۱۱-نصرت دین ـــــ اصلاح مسلمین کی ایک کوشش:
حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تبلیغی واصلاحی تحریک کے مقاصد اور طریقہ کار کی توضیح میں ایک جامع و مفصل رسالہ۔

۱۲- میری زندگی کے چند تجربے:
چالیس سال کی عمر تک کے اپنے قابل ذکر تجربات اور زندگی کے اہم واقعات۔

۱۳-اسلام اور موجودہ مسلمان قوم:
ایک دعوتی مقالہ۔

۱۴-دعوت احیاءدین یادینی انقلاب کی ایک جدوجہد۔
مضمون عنوان سے ظاہر ہے۔

۱۵-دعوت اصلاح و تبلیغ۔
اصلاح و تبلیغ کے موضوع پر تین اہم مقالوں کا مجموعہ۔

۱۶-اسلام اور نظام سرمایہ داری۔

[۳]

اور کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو لکھی گئیں، حتیٰ کہ بعض کی کتابت بھی ہو گئی۔ مگر چھپنے کا مرحلہ رہ گیا۔ اور پھر وہ عدم توجہ سے ضائع ہو گئیں۔ اس لئے کہ حضرت مصنف کی ذہنی و فکری توجہات کسی دوسری سمت مرکوز ہو گئیں۔ آپ کی معروف تصنیف "فیصلہ کن مناظرہ" (یامعرکۃ القلم) کے مقدمے میں بغیر نام کے ایسی کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔ اور اسکے ساتھ افسوس بھی کہ ان کتابوں کی حق تلفی ہوئی۔ بہت کام کی تھیں۔ اور بڑی محنت سے لکھی گئی تھیں۔ ان کا تعلق سنت وبدعت (یادیوبندیت وبریلویت) کے مسائل سے تھا۔

قاری محمد مسلم غازی

بیاد

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

اے کہ تیری ذات تھی صد افتخار علم و فضل　　علم سے تجھ کو شرف، تو تھا نثارِ علم و فضل

تیری رحلت پر ہیں گریاں سب مراکز علم کے　　الفراق اے شیخِ دیںؒ، اے تاجدار علم و فضل

منفرد انداز سے کی تو نے شرحِ دینِ حق!!　　تو رہا تا زن

مسلک قرآن و سنت کا تو اک روشن دماغ　　فخر زہد واتق

خانقاہوں، مدرسوں میں غم کی چھائی ہے گھٹا　　آج سونی ہو گئی ہے رہگذارِ علم و فضل

وہ ریاضت روز و شب کی دین قیم کے لئے　　اب کہاں دنیا میں وہ روشن منارِ علم و فضل

اب کہاں ہنگامہ تعلیمِ قرآن و حدیث　　روٹھ گئی دنیا سے گویا اب بہار علم و فضل

یہ تدبر، یہ تعقل، اور یہ فکرِ عمیق　　اے فدائے شاہِ دیں، اے شہسوارِ علم و فضل

تھا زمانے بھر میں یکتا تیرا اسلوب بیاں　　اب نہ دیکھے گا کوئی ایسا نکھارِ علم و فضل

جس سے پاک و ہند کے روشن رہے دیوار و در بجھ گیا ہے آہ اک ایسا شرارِ علم و فضل

نطق وہ کہ جیسے ہو جبریل خود محوِ کلام بہہ رہا ہو جیسے کوئی آبشارِ علم و فضل

لمحہ لمحہ زندگی کا، عزم و ہمت کی مثال اُس کی ساری زندگی آئینہ دارِ علم و فضل

علم اُس کا علمِ نافع، اور عمل مقبولِ حق اُس کی ہستی ایک بحرِ بے کنارِ علم و فضل

کارگاہِ زیست میں اُس کے مراتب ہیں بلند ذات سے اُس کی تھا قائم اعتبارِ علم و فضل

س کے علم و فکر کی پھیلی ہے ہر سو روشنی مستفید اُس سے ہوئے مردانِ کارِ علم و فضل

ٹھ گیا دنیا سے اک طاعت گزار شاہ دیں ہو گیا اوجھل نظر سے کوہسارِ علم و فضل

خ نعمانی کا مدفن مرجع اہل کمال قبر یہ اُس کی نہیں، یہ ہے مزارِ علم و فضل

اِس جہاں سے آج وہ انسان رخصت ہو گیا
جس سے قائم تھا زمانے میں وقارِ علم و فضل

☆☆☆

MA FOUNDATION

PROUDLY ANNOUNCES THE OPENING OF
EDUCATIONAL CENTRE
IN NAME OF

MA ACADEMY OF APPLIED EDUCATION
(MAAAE)

ALL TYPES OF
COMPUTER EDUCATION,
ENGLISH SPEAKING
&

PERSONALITY DEVELOPMENT
COURSES
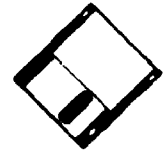
------- *FACILITIES* -------

- Air conditioned Hi Tech Computer Lab.
- Internet and Multimedia
- Separate Batches for Girls.
- Maximum Practical Time on Computers

SPECIAL CONCESSIONS AND SCHOLARSHIP SCHEMES

With Best Compliments From :

MA ACADEMY OF APPLIED EDUCATION

50 Mohd. Ali Lane, Gwynne Road, Aminabad.
Lucknow - 18. PH : 211751, Mobile : 98390-10008.

ہماری دعا ہے کہ

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمۃ کی یاد میں

شائع ہونے والی ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی خاص اشاعت

عنداللہ و عندالناس مقبول ہو

اس زبردست تاریخی اشاعت پر ہم

ادارہ الفرقان کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں